13

مرتبہ
مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

کلیاتِ پریم چند

13

پچاس افسانے

مرتبہ

مدن گوپال
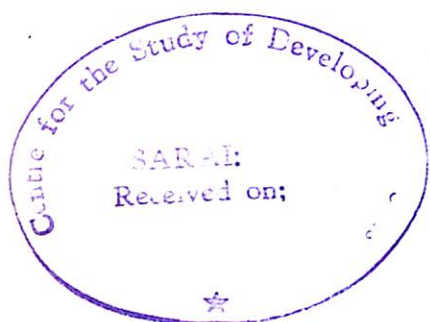
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)

ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

پیش لفظ

ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن منظرعام پر آئیں۔ قومی اردو کونسل پریم چند کی تمام تحریروں کو "کلیات پریم چند" کے عنوان سے 22 جلدوں میں ایک مکمل سٹ کی صورت میں شائع کررہی ہے۔ ان جلدوں میں پریم چند کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبار اصناف یکجا کیے جارہے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

ناول : جلد 1 سے جلد 8 تک، افسانے : جلد 9 سے جلد 14 تک،
ڈرامے : جلد 15 و جلد 16، خطوط : جلد 17،
متفرقات : جلد 18 سے جلد 20 تک، تراجم : جلد 21 و جلد 22

"کلیاتِ پریم چند" میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے اہم کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حسبِ ضرورت پریم چند کے ماہرین سے بھی ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔

کلیات کو زمانی اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ سن اشاعت اور اشاعتی ادارے کا نام شائع کرنے کا التزام بھی رکھا گیا ہے۔

"کلیات پریم چند" کی یہ جلدیں قومی اردو کونسل کے ایک بڑے منصوبے کا نقش اوّل ہیں۔ اس پروجکٹ کے تحت اردو ادب کے ان ادبا و شعرا کی کلیات شائع کی جائیں گی جو کلاسیکی حیثیت اختیار کرچکی ہیں۔ پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے کی اس پہلی کاوش میں کچھ خامیاں اور کوتاہیاں ضرور راہ پاگئی ہوں گی۔ اس سلسلے میں قارئین کے مفید مشوروں کا خیر مقدم ہے۔

اگر پریم چند کی کوئی تحریر/ تحریریں دریافت ہوتی ہیں تو آئندہ ایڈیشنوں میں انھیں شامل کیا جائے گا۔

اردو کے اہم کلاسیکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کے انتخاب اور ان کی اشاعت کا فیصلہ قومی اردو کونسل کے ادبی پینل نے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی سربراہی میں کیا۔ ادبی پینل نے اس پروجکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کرکے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری رہنمائی کی۔ قومی اردو کونسل ادبی پینل کے تمام ارکان کی شکرگزار ہے۔ ''کلیات پریم چند'' کے مرتب مدن گوپال اور پروجکٹ اسسٹنٹ ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

امید ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح ''کلیاتِ پریم چند'' کی بھی پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

فہرست

پیش گفتار

منشی پریم کا شمار اردو کے اولین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان سے پہلے پریوں کے قصے اور طلسمی واقعات پر مبنی کہانیاں ہوتی تھیں۔ ہریجنوں اور کسانوں کے ساتھ ظلم اور بے انصافی، بے جوڑ شادیاں اور لوٹ کھسوٹ کے واقعات جو سماج کو گھن کی طرح سے کھائے جارہے تھے، ان کا ذکر ادب میں اس لیے نہیں ہوتا تھا کیونکہ ادیبوں کا کام سماجی اصلاح نہیں بلکہ ادبی تفریح اور ادب کو اعلیٰ معیاروں پر پیش کرنا تھا۔ سماجی واقعات کے بارے میں صرف اخبارات لکھتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی مرضی کے مطابق ہے اور اللہ کی مرضی کے خلاف انسان کا دخل ممکن نہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب سماجی بیداری کی لہر اٹھ کھڑی ہوئی تو لامحالا ادیب بھی اس بیداری سے متاثر ہوئے۔ پریم چند نے خاص طور سے ان اثرات کو قبول کیا اور کہا کہ تفریح مہیا کرانا بھانڈوں اور نقادوں کا کام ہے۔ مصنف کا فرض ہے کہ ادب کو سیاسی سماجی اور مذہبی اصلاحات کا ذریعہ بنائے۔ جب ادیب ہاتھ میں قلم اٹھائے تو اسے احساس ہونا چاہیے کہ وہ سماج کی گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالے گا اور سوتے ہوؤں کو جگائے گا۔ اگر وہ یہ کام نہیں کرسکتا تو وہ ناکام مصنف ہے۔

پریم چند کی پہلی کہانی کا عنوان تھا "دنیا کا سب سے انمول رتن"۔ یہ کہانی اور اس دور کی چار اور کہانیوں (شیخ مخمور، یہ میرا وطن ہے، صلحہ ماتم، عشق دنیا اور حب وطن) کو سوز وطن مجموعہ میں زمانہ پریس نے اپریل 1908 میں نواب رائے کے نام سے

شائع کیا۔

پریم چند کے اپنے الفاظ میں، ''اس وقت ملک میں تقسیم بنگال کی شورش برپا تھی اور کانگریس میں گرم دل کی بنیاد پڑ چکی تھی''۔ ان پانچوں کہانیوں میں حب وطن کا ترانہ گایا گیا تھا۔ دیباچے میں لکھا تھا۔ ''ہر ایک قوم کا علم ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے۔ جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے ہیں اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینے میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہورہے تھے۔ اس زمانے کی ادبی یادگار بجز عاشقانہ غزلوں اور چند سفلہ قصوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے جب قوم کے نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاح تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص و حکایات زیادہ تر اصلاحی اور تجدیدی کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے اور حب وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر اُبھارنے لگے۔ کیوں کر ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقین ہے کہ جیوں جیوں ہمارے خیال رفع ہو جائیں گے اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئی نسل کے جگر پر حب وطن کی عظمت کا نقطہ جمائیں''۔ سوز وطن کا اشتہار اگست 1908 میں زمانہ میں شائع ہوا۔ اشتہار شاید مصنف نے آپ ہی لکھا تھا، یہ تھا۔

''سوز وطن سوز وطن سوز وطن''۔

''زمانہ کے مشہور اور مقبول مضمون نگار منشی نواب رائے کی تازہ ترین اور بہترین اردو زبان میں حسن و عشق، وصل و فراق، عیاری و مکاری، جنگ و جدل وغیرہ کی بہت سی داستانیں موجود ہیں اور ان میں بعض بہت ہی دلچسپ ہیں۔ مگر ایسے قصے جن میں سوز وطن کی چاشنی ہو، جن میں حب وطن ایک ایک حرف سے ٹپکے، اس وقت تک معدوم تھے۔ اس کتاب میں پانچ قصے لکھے گئے اور سب دردِ وطن کے جذبات سے پُر ہیں۔ ممکن ہے کہ انھیں پڑھ کر ناظرین کے دل میں وطن کی الفت کا پاک جذبہ موجزن

ہو جائے۔ بیانیہ نہایت لطیف اور دلکش ہے اور اندازِ بیان رقت آمیز۔ سائز چھوٹا، لکھائی چھپائی عمدہ، کاغذ اعلیٰ قسم کا سودیشی قسم اول اور نیز معمولی سودیشی کاغذ پر۔ قیمت چار آنہ قسم دوم معمولی سودیشی کاغذ پر قیمت تین آنہ۔ چھ جز کی کتاب اس قیمت پر مفت ہے"۔

فرمائش بنام مینیجر زمانہ، نیا چوک، کانپور۔

سوز وطن کے تبصرے آریہ گزٹ، سوراجیہ، ہندوستان وغیرہ میں شائع ہوئے۔ فروری 1909 میں نواب رائے نے سوزِ وطن کی ایک کاپی ہندی کے مشہور رسالہ سرسوتی کے ایڈیٹر کو تبصرہ کے لیے بھیجی۔ ایڈیٹر مہاویر پرساد دویدی نے لکھا "اس کتاب کی رچنا اردو کے مشہور ادیب نواب رائے نے کی ہے۔ قیمت 4 آنہ، ملنے کا پتہ بابو وجے نرائن لال نیا چوک کانپور"۔ یہ وجے نرائن لال نواب رائے کے ہم عمر اور سوتیلی ماں کے بھائی تھے اور نواب رائے کے گھر پر ہی رہتے تھے۔ مصنف نواب رائے کا پتہ اس طرح پبلک کے سامنے آگیا۔

سوزِ وطن زمانہ پریس میں چھپی تھی۔ غلطی سے زمانہ پریس کے نام کو کتاب پر نہیں دیا گیا۔ اس وقت کے قانون کے تحت یہ ایک جرم تھا۔ پولیس نے تفتیش شروع کردی، اور انھیں پتہ چلا کہ کتاب کا مصنف نواب رائے ایک سرکاری ملازم ہے جس کا اصل نام دھنپت رائے ہے۔ اطلاع حکام تک پہنچی۔ ضلع کے کلکٹر نے دھنپت رائے کو طلب کیا اور جیسا پریم چند نے "اپنی کہانی" میں لکھا ہے۔ دھنپت رائے سے سوزِ وطن کی ہر کہانی کے بارے میں جانکاری حاصل کرکے کہا کہ ان سب کہانیوں میں Sedition (بغاوت) بھرا ہے۔ اگر تم مغل راج میں ہوتے تو تمھارے ہاتھ کاٹ دیے جاتے۔ شکر ہے برٹش سرکار ہے۔ جتنی کاپیاں پڑی ہیں ان کو کلکٹر کے حوالے کردو"۔ دھنپت رائے کو تاکید بھی کی گئی کہ آگے سے لکھنا بند کرو۔ اگر لکھو تو سرکاری محکمے کی اجازت لے کر۔

ادھر نواب رائے کے افسانوں کی شہرت اور اُدھر یہ پابندی۔ ایک قصہ "آتش کدۂ گناہ" زمانہ کے دفتر میں پڑا تھا۔ دیانرائن نگم نے اس کے مصنف کا نام نواب رائے کے بجائے "افسانہ کہن" لکھا۔ یہ مارچ 1910 کے زمانہ میں چھپا۔ اپریل 1910 کے شمارے میں ایک اور افسانہ چھپا۔ عنوان تھا "سیر درویش" اس پر مصنف کا نام نواب رائے ہی دیا گیا، مگر اپریل اور مئی کی قسطوں پر کوئی نام نہیں۔ صرف جملہ حقوق محفوظ لکھا

گیا۔ اگست 1910 کے شمارے میں ایک قصہ چھپا "رانی سارندھا" مصنف کا نام نہیں دیا گیا۔

سرکاری حکم کی تعمیل سے بچنے کے لیے دھنپت رائے نے ایک نیا قلمی نام اختیار کیا۔ یہ تھا پریم چند۔ اس کے نام سے شائع ہونے والی پہلی کہانی تھی "بڑے گھر کی بیٹی"۔ یہ دسمبر 1910 کے زمانہ کے شمارے میں شائع ہوئی۔ نام میں کچھ جادو تھا۔ یہ قصہ دنیا بھر کی زبانوں سے ٹکر لے سکتا تھا۔ کیونکہ اس نام کو دیانرائن نگم نے ہی تجویز کیا تھا، یہ نام صرف زمانہ کے لیے ہی محدود تھا۔ ایک نیا رسالہ ادیب نکلا تھا اس کے ایڈیٹر تھے ان کے دوست پیارے لال شاکر میرٹھی۔ اس میں مصنف کا نام اس طرح لکھا جاتا تھا۔ "د۔ر" (دھنپت رائے)

پریم چند کے افسانے بہت مقبول ہوئے۔ دھوم مچ گئی۔ اردو سے ہندی میں ترجمے ہوئے اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ان کے ترجمے شائع ہونے لگے۔ پریم چند نے سوچا پچیس افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جائے، وہ افسانے تھے، ماتما، وکرما دتیہ کا تیغہ، بڑے گھر کی بیٹی، رانی سارندھا، راج ہٹ، راجہ ہردول، نمک کا داروغہ، عالم بے عمل، گناہ کا اگن کنڈ، بے غرض محسن، آہ بیکس، آلہا، خون سفید، صرف ایک آواز، اندھیر، بانکا زمیندار، تریا چرتر، سوت، شکاری راج کمار، کرموں کا پھل، مناؤن، مرہم، اماوس کی رات، غیرت کی کٹار، منزل مقصود۔ افسانے مقبول تھے مگر پبلشروں کا قحط تھا۔ کوئی شائع کرنے کو تیار نہ تھا۔ پریم چند نے فیصلہ کیا کہ اسے زمانہ پریس سے شائع کرایا جائے۔ دیانرائن سے شرکت کی بات کی۔ اگر نقصان ہوا تو آدھا آدھا۔ زمانہ پریس کو پیشگی درکار تھی مگر منیجر نے مطلع کیا کہ ان کو رسالہ سے ملنے والی رقم پیشگی رقم سے زیادہ ہے۔ خیر خط و کتابت شروع ہوئی۔ یکم اکتوبر 1913 کو پریم چند نے دیا نرائن نگم کو لکھا "غالباً پریم پچیسی اب شب بلا تک نہ چھپ سکے گی ...... اگر آپ کا پریس اتنا وقت ہی نہ نکال سکے تو میں بدرجہ مجبوری یہ التماس کروں گا کہ یا تو میرے 72 روپے عطا فرمائیں یا پریم پچیسی کے ½4 جزو چھپے ہوئے ریل کے ذریعے میرے پاس بھیج دیں۔ غالباً میں ان درخواستوں میں غیر معقولیت سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ میں کسی دوسرے پبلشر کو ڈھونڈوں گا۔ صرف دیباچہ اور ٹائیٹل کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ بھی نہ ہو سکا تو شہد اور

کھی لگا کر ان اوراق پریشاں کو چاٹوں گا اور سمجھوں گا کہ زر خود میخورم، یا میوۂ در محنت خود میخورم۔ بہرحال آپ جو کچھ فیصلہ کریں جلد کریں اور مجھے مطلع فرمائیں۔ قیامت کے انتظار میں بیٹھنے سے تو یہی بہتر ہے کہ جو کچھ اس وقت ملتا ہے مل جائے"۔

اگلے ہی مہینے : "آپ میری کتاب (جلد اوّل) جلدی سے چھپوا دیجیے تاکہ اس کی قدردانی دیکھ کر دوسرے حصے میں ہاتھ لگے اور کچھ منافع بھی ہو۔ کیا کہوں آپ نے مجھے اچھالنے میں کوئی کسر نہیں رکھی، خوب اچھالا، مگر میں ہی قسمت کا لنڈورا ہوں کہ پرواز نہیں کر سکتا بلکہ نیچے گرنے کے لیے ڈرتا ہوں"۔ بعد میں پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا کہ پریم پچیسی میں نے اپنے خرچ پر زمانہ پریس سے چھپوائی تھی۔

پریم پچیسی دو حصوں میں شائع ہوئی تھی۔ حصہ اول کو چھپنے میں دو سال لگ گئے۔ یہ 1914 میں شائع ہوئی۔ پریم پچیسی کی کاپیاں تبصرہ کے لیے ارسال کی گئیں۔ اشتہار چھپوائے گئے۔ کاپیاں اعلیٰ ادیبوں اور نقادوں کو بھی بھیجی گئیں تاکہ ان کی رائے آئے اور ان کا رسائل میں دیے جانے والے اشتہاروں میں استعمال کیا جاسکے۔ الناظر لکھنؤ کے ستمبر 1915 کے شمارے میں ایک اشتہار شائع ہوا جس میں ڈاکٹر محمد اقبال کی رائے درج ہے۔ علامہ اقبال نے مصنف کو تحریر فرمایا تھا "آپ نے اس کتاب کی اشاعت سے اردو لٹریچر میں ایک نہایت قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نتیجہ خیز افسانے جدید اردو لٹریچر کی اختراع ہیں۔ میرے خیال میں آپ پہلے شخص ہیں جس نے اس راز کو سمجھا ہے اور سمجھ کر اس سے اہل ملک کو فائدہ پہنچایا ہے۔ ان کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف انسانی فطرت کے اسرار سے خوب واقف ہے اور اپنے مشاہدات کو ایک دلکش زبان میں ادا کرسکتا ہے"۔

منشی جی کی کہانیاں اردو میں مقبول تو تھیں مگر کتابی صورت میں یہ بکتی نہیں تھیں۔ 2/ مارچ 1917 کو پریم چند نے دیانرائن نگم کو لکھا "پریم پچیسی حصہ دوم میں ذرا سرگرمی فرمایئے۔ جلدی ختم ہو جائے۔ ابھی بہت کچھ چھپوانا ہے۔ اگر پہلی منزل میں اتنا رُکے تو پھر اتنی لمبی زندگی کہاں سے آئے گی۔ تعطیل گرما کے پہلے ختم ہو جانا ضروری ہے"۔

پریم پچیسی حصہ دوم کے بارے میں امتیاز علی تاج کو لکھا کہ "اس کے چھپوانے

کا کام شروع کردیا ہے۔ اور یہ یکم جولائی 1917 تک پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا"۔
زمانہ کے مدیر نے لکھا "یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ منشی پریم چند کے افسانوں نے پبلک میں کتنی شہرت حاصل کی ہے۔ یہ امر تسلیم ہے کہ صاحب موصوف کے زبردست اور عظیم قلم نے اپنے جادو بھرے قصوں میں اخلاقی اوصاف، حب وطن و حسن و عشق کی بولتی چالتی تصویریں اور ان کے نہایت پاکیزہ پہلو کو نرالے ڈھنگ میں دکھائے ہیں۔ پریم پچیسی حصہ دوم میں ایسے دلچسپ اور پُر اثر قصے درج کیے گئے ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شائقین جو منشی پریم چند صاحب کے جادو نگار کا نتیجہ دیکھنا چاہتے ہیں قیمت ایک روپیہ"۔

پریم پچیسی کا حصہ اول 1914 میں شائع ہوا تھا حصہ دوم 1918 میں۔ ایک سال بعد پریم چند نے نگم کو لکھا کہ "آپ کے منیجر کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم پچیسی حصہ دوم کی کل 119 جلدیں نکلی ہیں۔ اس حساب سے تو شاید کتاب میری زندگی میں بھی نہ نکل سکے گی"۔

اس ناامیدی کے برعکس وہ پریم بتیسی کی اشاعت کے لیے تیار تھے۔ دو حصوں میں بتیس قصے تھے : سر پُر غرور، راجپوت کی بیٹی، نگاہِ ناز، بیٹی کا دَھن، دھوکا، پچھتاوا، شعلۂ حسن، اناتھ لڑکی، پنچایت، سوت، بانگِ سحر، مرضِ مبارک، قربانی، دفتری، دو بھائی، بازیافت، بوڑھی کاکی، بینک کا دیوالا، زنجیر ہوس، سوتیلی ماں، مشعلِ ہدایت، خنجر وفا، خوابِ پریشاں، راہِ خدمت، حج اکبر، آتما رام، ایمان کا فیصلہ، فتح، دُرگا کا مندر، خونِ حرمت، اصلاح اور جگنو کی چمک۔ اگست 1919 میں نگم کو لکھا کہ "ذرا منیجر صاحب زمانہ سے دریافت کرکے مطلع کریں کہ بتیسی کی چھپائی فی جز کتنی ہوگی۔ اس معاملے میں مجھے امید ہے کہ آپ کے امکان میں جتنی رعایت ہوگی اس سے دریغ نہ فرمائیں گے"۔ تین مہینے بعد "پریم بتیسی کے مضامین کی ترتیب بھیجتا ہوں کتاب شروع کردیجیے"۔

کچھ ہی دنوں بعد پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا "پریم بتیسی حصہ اول چھپ رہی ہے۔ غالبًا دو مہینے میں تیار ہوجائے گی۔ کیا آپ پریم بتیسی کا حصہ دوم اپنے اہتمام (دارالاشاعت) سے شائع نہیں کرسکتے۔ بازارحسن تو ابھی معلوم نہیں کب تک تیار ہو۔ اس اثنا میں اگر بتیسی حصہ دوم آپ شائع کرسکیں تو خوب ہو۔ کچھ قصے آپ ہی کے

دونوں پرچوں میں نکلے ہیں بقیہ میں دے دوں گا۔ کوئی دس جزو کی کتاب ہوگی"۔ امتیاز علی تاج پریم بتیسی حصہ دوم کی اشاعت کے لیے تیار ہوگئے۔ پریم چند نے 30 ستمبر 1919 کو لکھا "حصہ دوم کے لیے میں نے کون کون سے قصے تجویز کیے تھے۔ ان کی فہرست مجھے بھیج دیجیے۔ مجھے یاد نہیں آتا"۔ "مسطر 21 سطروں کا ہونا چاہیے (کیونکہ) اسی پر حصہ اول چھپ رہا ہے۔ کاغذ میں نے حصہ اول کے لیے بیس پاؤنڈ کا لگایا ہے اگر آپ بھی یہی کاغذ لگائیں تو دونوں حصوں میں یکسانیت آجائے اور تب قیمت بھی یکساں رکھی جائے گی۔ گھٹیا کاغذ لگانا بے جوڑ ہوگا"۔ 16 دسمبر 1919 کے خط میں "کاغذ برا نہیں ہے۔ اس پر چھپنے دیجیے۔ چھپے ہوئے فارم رد کر دینے سے نقصان ہوگا۔ میرا کاغذ ان سے کہیں بہتر ہے۔ لیکن مضائقہ نہیں۔ سستا کاغذ رہے گا تو کتاب بھی ارزاں ہوگی۔ مسطر یہی رکھا جائے مگر کاتب کو تاکید کر دی جائے کہ مکالمے ہمیشہ نئی سطروں سے شروع کیا کرے"۔ چار مہینے بعد 22 اپریل 1920 کو "معلوم نہیں کاغذ دستیاب ہوا یا نہیں۔ میرے ہندی پبلشر کلکتہ سے آپ کے پاس ہر قسم کا کاغذ سُستے کے ساتھ بھیجنے پر آمادہ ہیں۔ نصف قیمت پیشگی درکار ہوگی۔ اگر آپ اسے منظور فرمائیں تو کاغذ آجائے گا"۔ 16 جون 1920 "سن کر خوشی ہوئی کہ کاغذ آگیا اور پریم بتیسی کی کتابت مکمل ہوگئی اب تو اسے چھپوا بھی ڈالیں۔ حصہ اول بھی غالبًا آخر جولائی تک تیار ہوجائے گا۔ جولائی تو کیا اگست آخر تک۔ حصہ اول ابھی تک دیانرائن نگم صاحب کی بے توجہی کے سبب معرض التوا میں پڑا ہوا ہے۔ مگر امید ہے کہ حصہ دوم کا شائع ہونا تازیانے کا کام دے گا۔ اور یہی میری غرض تھی"۔

دیانرائن نگم کو کاغذ کے دستیاب ہونے میں مشکلات تھیں۔ پریم چند نے 10 دسمبر 1920 کو لکھا "پریم بتیسی کا ٹائٹل ابھی لگایا یا نہیں؟ اب تو للللہ دیر نہ کیجیے۔ جیسا کاغذ ملے اچھا یا بُرا بڑھیا یا گھٹیا، براؤن، کالا، پیلا، نیلا، سبز، سرخ، نارنگی، لیکن ٹائٹل چھپ چھپوا دیجیے اور کتاب کی چھ سو جلدیں (قسم اول 500، قسم دوم 100) لاہور بھجوا دیجیے"۔ دس دن بعد "بتیسی کا پیکٹ ملا۔ ٹائٹل دیکھ کر رُو دیا۔ بس اور کیا لکھوں۔ کتاب کی مٹی خراب ہوگئی۔ آپ نے بہتر کاغذ نہ پاکر وہ کاغذ استعمال کرلیا ہوگا۔ غالبًا کتاب کی تقدیر میں اس طرح بگڑنا لکھا تھا۔ خیر فی الحال چلنے دیجیے۔ لاہور والوں سے کہہ دوں گا کہ وہ ٹائٹل بدل ڈالیں۔ آپ کے یہاں بھی اچھا کاغذ ملتے ہی ٹائٹل بدلنا پڑے گا۔ کچھ نقصان

ہوگا مگر غم نہیں"۔

پریم چند نے دیانرائن نگم کو پھر لکھا "پریم بتیسی ابھی تیار ہوکر نہیں آئی۔ ٹائٹل پیج میں زیادہ تردد اور جلدیں تیار ہونے کی امید نہ ہو تو آپ اس کی سات سو جلدیں بغیر ٹائٹل کے لاہور دفتر کہکشاں کو روانہ کردیں۔ وہ اپنا ٹائٹل چھپوا کر لگالیں گے اجرت مجھ سے وضع کرلیں گے"۔

پریم بتیسی کے دیباچے میں پریم چند نے لکھا "میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ پریم پچیسی کئی سال ہوئے شائع ہوا تھا۔ جہاں تک معاصر اخباروں کا تعلق ہے انھوں نے میری ناچیز کاوش کی داد دی لیکن شائقین پر اس کا بہت کم اثر ہوا۔ پہلا اڈیشن ختم ہونے میں کم و بیش پانچ سال لگ گئے۔ یہ قدردانی بہت حوصلہ انگیز تو نہ تھی۔ لیکن مصنف کو تصنیف کے سوا چارہ نہیں۔ اس لیے یہ دوسرا مجموعہ پریم بتیسی کے نام سے اردو پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ پہلے مجموعہ کی نسبت اس کا زیادہ چرچا ہو۔ یا سارا تومار اشاعت کے گودام ہی میں پڑا سڑے۔ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوچکا۔ اب صرف یہی آرزو ہے کہ ایک منتخب مجموعہ پریم چالیسا یا پریم پچاسا کے نام سے اور نکل جائے۔ بس یہی زندگی کا ماحصل ہوگا اور اسی پر قناعت کروں گا"۔

پریم بتیسی حصہ دوم کے بارے میں امتیاز علی تاج کو 30 اکتوبر 1920 کو لکھا "پریم بتیسی دیکھا، باغ باغ ہوگیا۔ مجھے یہ مجموعہ نہایت پسند آیا۔ کتابت اور جلی ہوتی تو بہتر ہوتا، تب قیمت اور زیادہ رکھنی پڑتی فی الجملہ کتاب خوب چھپی ہے۔ اور میں اس کے لیے آپ کا تہہِ دل سے ممنون ہوں۔ دیکھیں پبلک اس کی کیا قدر کرتی ہے۔ پہلا حصہ بھی شاید اس ماہ میں تیار ہوجائے۔ میں نے زمانہ کو لکھ دیا ہے کہ آپ کے یہاں پانچ سو کتابیں بھیج دیں"۔

اپنے دوست دیانرائن نگم کے زمانہ پریس سے اتنے پریشان تھے کہ جب زمانہ پریس کے منیجر نے پریم چند کو لکھا کہ پریم پچیسی کے دونوں حصے ختم ہوچکے ہیں اور انھوں نے دوسرے ایڈیشن کے لیے اصرار کیا تو پریم چند نے امتیاز علی تاج کو (14 ستمبر 1920) لکھا کہ "میں نے عہد کرلیا ہے کہ زمانہ کی گردش میں نہیں پڑوں گا، اگر آپ اسے نکال سکیں تو بہتر ہے"۔

پریم چند کے افسانوں کے ترجمہ ہندی اور دوسری زبانوں میں بھی چھپنے لگے، ہندی میں تو ان کا خاص استقبال ہوا۔ پریم چند کے ایک دوست مَنن دویدی گجپوری تحصیلدار نے پریم چند سے کہا کہ وہ ہندی میں بھی لکھیں۔ ہندی کے مشہور رسالے سرسوتی دسمبر 1915 میں پریم چند کی پہلی کہانی "سوت" شائع ہوئی۔ اردو میں اسی عنوان سے یہ پریم بتیسی میں شامل کی گئی۔

ہندی میں پریم چند کے افسانوں کی دھوم مچ گئی۔ جہاں اردو میں ناشروں کا قحط تھا وہاں ہندی کے ناشروں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ جون 1917 میں ان کا پہلا ہندی مجموعہ "سپت سروج" ہندی پستک ایجنسی گورکھپور نے شائع کیا۔ اس میں سات کہانیاں (بڑے گھر کی بیٹی، سوت، سجنتا کا ڈنڈ، پنچ پرمیشور، نمک کا داروغہ، اپدیش اور پریکشا) شامل تھیں۔ اس کے دیباچے میں گجپوری نے لکھا:

"اردو سنسار کے ہندو مہارتھیوں میں پریم چند جی کا استھان بہت اونچا ہے۔ انیک ناموں سے آپ کی پستکیں اردو سنسار کی شوبھا بڑھا رہی ہیں۔ اردو پتروں نے آپ کی رچناؤں کی مکت کنٹھ سے پرشنسا کی ہے۔ ہرش کی بات ہے کہ ماترِ بھاشا ہندی نے کچھ دنوں سے آپ کے چت کو آکرشت کیا ہے۔ پریم چند نے اُسے پوجنارتھ ناگری مندر میں پرویش کیا اور ماتا نے اسے ہردلے سے لگا کر اپنے اس لیش شالی پُتر کو اپنایا ہے۔ اس پرتبھا شالی لیکھک مہانُوبھاو نے اتنی جلدی ہندی سنسار میں اپنا نام کر لیا ہے کہ آشچریہ ہوتا ہے۔ آپ کی کہانیاں ہندی سنسار میں انوٹھی چیز ہیں۔ ہندی پتر پتریکائیں آپ کے لیکھوں کے لیے لالائت رہتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا وِچار ہے کہ آپ کی گلپیں ساہتیہ مارتنڈ رویندر بابو کی رچناؤں سے ٹکر لیتی ہیں۔ ایسے وِدوان اور پرسدّھ لیکھک کے وشیہ میں لکھنا اناوشیک اور انوچت ہوگا"۔

اگلے سال بمبئی کے ہندی گرنتھ رتناکر نے نو قصوں کو "نوندھی" کے عنوان سے مجموعہ شائع کیا۔ قصے تھے: راجہ ہردول، رانی سارندھا، مریادا کی بیدی، پاپ کا اگنی کنڈ، جگنو کی چمک، دھوکا، اماوس کی رات، پچھتاوا، ممتا۔ اسی سال گورکھپور کی ہندی پستک ایجنسی نے تیسرا مجموعہ پریم پورنا شائع کیا۔ اس میں پندرہ افسانے شامل کیے گئے۔ افسانے تھے: ایشوریہ نیائے، شنکھ ناد، خون سفید، غریب کی ہائے، دوبھائی، بیٹی کا دھن، دھرم

سنکٹ، درگا کا مندر، سیوا مارگ، شکاری راج کمار، بلیدان، بودھ، سچائی کا اپہار، مہاتیر تھ۔

جہاں پریم بتیسی کی 1920 میں اشاعت کے بعد آٹھ سال تک اردو کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا وہاں انھیں آٹھ سالوں میں ہندی میں پریم پچیسی (اردو کی کتاب سے مختلف افسانے تھے)۔ ٹالسٹائی کی 22 کہانیاں، بڑے گھر کی بیٹی، نمک کا داروغہ، لال فیتہ، بینک کا دیوالہ کے علاوہ پریم پرسون (گیارہ قصے)، پریم دوادشی (12 قصے)، پریم پرتگیا (19 قصے)، پریم پرمود (17 کہانیاں)، اگنی سمادھی (8 قصے) اور شانتی شائع ہوئے۔

29 اگست 1928 کے خط میں پریم چند نے نگم کو لکھا تھا، ''اپنی کہانیوں کے ایک مجموعہ کو میں نے یہاں خود چھپوانا شروع کیا ہے۔ دس فارم چھپ گئے ہیں۔ شاید ایک فارم اور ہو۔ اس کا نام رکھا ہے خاک پروانہ۔ اس میں چودہ کہانیں ہیں۔ کپتان، خاک پروانہ، ملاپ، بڑے بابو، فکر دنیا، ستیاگرہ، تالیف، مستعار گھڑی، نغمۂ روح، عجیب ہولی، دعوت، مزار آتشیں، خودی، نادان دوست۔ زمانہ کے اکتوبر نومبر 1928 شمارہ میں اشتہار تھا اور فروری 1929 میں تبصرہ۔ (دوسرے گیلانی پریس کے ایڈیشن میں علاحدگی اور تحریک شامل کر دی گئیں)۔

اسی سال (1928 میں ہی) خواب و خیال کے نام سے ایک مجموعہ لاہور کے لاجپت رائے اینڈ سنز نے شائع کیا۔ اس میں مندرجہ ذیل چودہ کہانیاں تھیں۔ نوک جھونک، دست غیب، لال فیتہ، موٹھ، شطرنج کی بازی، مایۂ تفریح، نخل امید، فلسفی کی محبت، فتح، عبرت، خودی، دعوتِ شیراز، شدھی، ستی۔

اسی سال ایک اور مجموعہ، انڈین پریس الہٰ آباد سے چھپوایا۔ یہ تھا فردوسِ خیال، اس میں بارہ افسانے تھے : نزولِ برق، بھوت، توبہ، ڈگری کے روپے، تہذیب کا راز، بھاڑے کا ٹٹو، راہِ نجات، سوا سیر گیہوں، لیلیٰ، عفو، مریدی، نیک بختی کے تازیانے۔ 23 اپریل 1930 دیانرائن نگم کو لکھے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان افسانوں کا ہندی سے اردو میں ترجمہ پریم چند نے خود کیا۔

آٹھ سال قبل ستمبر 1920 میں پریم چند نے تاج صاحب کو ایک قصہ بھیجا تھا۔ عنوان تھا "دفتری"۔ اسی خط میں تاج کو مطلع کیا کہ یہ قصہ پریم چالیسی کا پہلا قصہ ہوگا۔ مگر چالیسی کی اشاعت نو سال بعد ہو سکی۔ اور یہ نہ تو زمانہ پریس سے، نہ ہی دارالاشاعت

سے بلکہ اسے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور سے شائع کیا۔ اس کے ناشر سعید مبارک علی نے خود پریم چند سے لکھنؤ میں ملاقات کی اور سوزِ وطن اور پریم چالیسی، خانہ پروانہ اور کربلا کی اشاعت کے لیے اجازت مانگی اور یہ بھی پوچھا کے صفحے میں کتنی سطریں ہوں۔
پریم چالیسی کے بارے میں اب مزید معلومات نہیں ہے۔ بس یہی معلوم ہے کہ پریم چالیسی 1930 میں دو حصوں میں شائع ہوئی۔ اس میں شائع ہوئے قصے یوں ہیں۔
حصہ اول میں : چوری، قزاقی، انتقام، رام لیلا، دین داری، سہاگ کا جنازہ، داروغہ کی سرگزشت، خانۂ برباد، کشمکش، الزام، منتر، انسان کا مقدس فرض، استعفیٰ، کفارہ، دیوی، قوم کا خادم، ترسول، مندر، بُھنی، آنسوؤں کی ہولی۔ حصہ دوم میں : مجبوری، چکمہ، ابھاگن، حسرت، دیوی، جنت کی دیوی، سزا، دو سکھیاں، ماں، بیوی سے شوہر، پوس کی رات، جلوس، لیلیٰ، حرز جاں، مزار الفت، عفو، جہاد، امتحان، بند دروازہ۔
مارچ 1934 نرائن دت سہگل نے لاہور سے تیرہ کہانیوں کا مجموعہ آخری تحفہ شائع کیا۔ قصے تھے : جیل، آخری تحفہ، طلوع محبت، دو بیل، ادیب کی عزت، ڈیمانسٹریشن، نجات، شکار، آخری حیلہ، قاتل، وفا کی دیوی، برات، ستی۔
اردو گھر دہلی سے 1936 میں زادِ راہ شائع ہوئی۔ اس میں پندرہ کہانیاں تھیں : آشیاں برباد، ڈامل کا قیدی، قہر خدا کا، بڑے بھائی صاحب، لعنت، لاٹری، خانۂ داماد، فریب، زیور کا ڈبہّ، وفا کی دیوی، زادِ راہ، مِس پدما، حقیقت، ہولی کی چھٹی۔
اپنی وفات سے تین سال پہلے پریم چند نے ”میرے بہترین افسانے“ (جو کتاب منزل کشمیری گیٹ، لاہور 1933 نے شائع کی تھی) کے دیباچہ میں لکھا تھا: ”میرے دوست مدت سے مصر تھے کہ میں اپنی کہانیوں کا ایک ایسا نمائندہ مجموعہ منتخب کردوں جس کے مطالعہ سے لوگ زندگی کے متعلق میرے نظریات معلوم کر سکیں۔ یہ انتخاب اس مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں میں نے محض ان کہانیوں کو چنا ہے جنھیں میں پسند کرتا ہوں اور جنھیں جدا جدا نوعیت کے نقادوں نے بھی سراہا ہے“۔ یہ کہانیاں ہیں : راہِ نجات، منتر، مہاتیرتھ، پنچ پرمیشور، رانی سارندھا، دو بیل، شطرنج کی بازی، ستی، پرائشچت، سجان بھگت۔
عصمت ڈپو دلی نے پریم چند کی وفات کے بعد 1937 میں دودھ کی قیمت شائع

کیا، اس میں نو کہانیاں ہیں : عصمت، کسم، وفا کا دیوتا، اکسیر، عیدگاہ، سکون قلب، ریاست کا دیوان، دودھ کی قیمت، زاویہ نگاہ۔

پریم چند نے 19 مارچ 1935 کو حسام الدین غوری کو لکھا تھا "واردات چھپ رہا ہے"۔ اس میں تیرہ افسانے ہیں : گلی ڈنڈا، مفت کرم داشتن، بدنصیب ماں، انصاف کی پولس، بیوی، مالکن، شکوہ شکایت، روشنی، معصوم بچہ، سوانگ، شانتی، قاتل کی ماں، غم نداری، بُز بخر۔

دودھ کی قیمت کے بعد پریم چند کے قصوں کا کوئی مصدقہ مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ 1978 میں میں نے تیس قصوں کا ایک مجموعہ مکتبہ جامعہ کو اشاعت کے لیے دیا تھا۔ کاپی رائٹ کی وجہ سے یہ کئی سال تک شائع نہیں ہوسکا۔ تب میں نے اسے واپس لے کر سٹار پبلشر کو دے دیا کچھ سال بعد پتہ چلا کہ وہ مسودہ گم ہوگیا۔ اس میں بہت سی وہ کہانیاں تھی جو گوینکا کے اپراپتیہ ساہتیہ میں پیش کی گئی ہیں۔

پریم چند کی وفات سے قبل اردو اور ہندی میں ان کی لگ بھگ پچاس تصانیف شائع ہوچکی تھیں۔ تاریخ وار فہرست پیش ہے۔ (1) سوز وطن، (2) سیر درویش، (3)روٹھی رانی، (4) پریم پچیسی (حصہ اول)، (5) سپت سروج، (6) نوندھی، (7) پریم پورنما، (8) پریم پچیسی (حصہ دوم)، (9) پرم بتسی (حصہ اول)، (10) پریم بتیسی (حصہ دوم)، (11) پریم پرتما، (12) نمک کا داروغہ، (13) پنچ پرمیشور، (14) پریم پچیسی (ہندی)، (15) ٹالسٹائے کی کہانیاں، (16)پریم پرسون، (17) بینک کا دیوالہ، (18) پریم دوادشی، (19) پریم پرتکیا، (20)پریم پرمود، (21) شانتی، (22) اگنی سادھی، (23) خاک پروانہ، (24) خواب و خیال، (25)فردوس خیال، (26) پریم چترتھی، (27) پریم تیرتھ، (28) پانچ پھول، (29)سپت سُمن، (30) سمر یاترا، (31) پریم چالیسی (حصہ اول)، (32)پریم چالیسی (حصہ دوم)، (33)پریم گنج، (34) پریرنا، (35) سروسریشٹھ کہانیاں، (36) میرے بہترین افسانے، (37)پنچ پرسون، (38) آخری تحفہ، (39) نوجیون، (40)پریم پی یوش، (41) مرتک بھوج، (42)نجات، (43) مان سروور (حصہ اول)، (44)مان سروور (حصہ دوم)، (45)زادِ راہ، (46)دودھ کی قیمت، (47) واردات، (48)دیہات کے افسانے، (49) جیل، (50)گرامیہ جیون کی کہانیاں۔

افسانوں میں مذکورہ بالا نمبر 2، 3، 13، 17، 30، 34، 41، 42 وغیرہ شاید ایسی کہانیاں تھیں جنھیں صرف ایک کہانی کے طور پر پیش کیا گیا۔ کچھ دو یا تین، چار، پانچ، چھ، سات، نو، بارہ، پندرہ، سترہ کہانیوں کے مجموعہ بھی تھے۔

وفات کے تھوڑا پہلے پریم چند نے مان سروور کے عنوان سے دو مجموعے شائع کیے تھے۔ ان میں 53 قصے تھے۔ اس کے بعد ان کے بڑے بیٹے شری پت نے ایک مجموعہ "کفن" شائع کیا جس میں بارہ قصے تھے۔ اس کے علاوہ 150 قصے ہندی اور اردو کے رسالوں میں تلاش کرا نھیں مان سروور کے اگلے چھ حصوں میں شائع کیا۔ پھر 1962 میں پریم چند کے چھوٹے بیٹے امرت رائے نے 56 کہانیوں کو زمانہ اور دوسرے اردو ہندی رسالوں سے اکٹھا کرکے گپت دھن کے دو حصوں میں شائع کیا۔ اس کے کئی سال بعد شری پت رائے نے سولہ کہانیاں پیش کیں۔ کمل کشور گوئنکا نے ان سولہ کے علاوہ سولہ اور قصے ڈھونڈ نکالے۔ انھیں پریم چند کے 'اپراپیہ ساہتیہ' میں شائع کیا۔

مان سروور (آٹھ حصے) کفن، گپت دھن (دو حصے) اور پریم چند کے اپراپیہ ساہتیہ میں شائع ہوئے افسانوں کے علاوہ دو کہانیاں قاتل اور بارات اردو میں پریم چند کے نام سے چھپی ہیں اور یہی دونوں کہانیاں شیورانی دیوی کے مجموعے ناری ہردے میں بھی چھپی ہیں۔ میں نے 1959 میں امرت رائے کو خط لکھ کر پوچھا بھی تھا (شیورانی دیوی حیات تھیں) ایسا کیوں؟ جواب نہیں آیا میرا خیال ہے یہ کہانیاں پریم چند کی ہی ہیں۔ اردو کا متن تو انھیں کا ہے۔

مان سروور (حصہ چار) کی "سمسیا" وہی افسانہ ہے جو مان سروور (آٹھ) میں "وشم سمسیا" کے عنوان سے ہے۔ گوئنکا کے پریم چند کا اپراپیہ ساہتیہ میں روئے سیاہ وہی کہانی ہے جو اسی کتاب میں پرتگیا کے عنوان سے ہے۔ گوئنکا کے اپراپیہ ساہتیہ میں "پرتشٹھا کی ہتیا" وہی افسانہ ہے جو گپت دھن میں "عزت کا خون" کے عنوان سے شامل ہے۔ اسی طرح "بہنی" بھی دوبار شامل ہوگئی ہے۔ مان سروور حصہ دوم کی "نیائے" وہی افسانہ ہے جو گپت دھن میں "نبی کا نیتی نرواہ" کے عنوان سے شائع ہوا۔ "لال فیتہ" اور "وفا کی دیوی" کسی ہندی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ تقریباً 100 ہندی کہانیاں ہیں جن کا اردو ترجمہ نہیں شائع ہوا ہے۔

کچھ محقق بمبوق اور پلشم کے نام سے شائع شدہ کہانیوں کو پریم چند کی کہانیاں سمجھتے ہیں میرے خیال میں یہ ٹھیک نہیں۔ پلشم مشہور فلمی ایکٹرس مینا کماری کے نانا پیارے لال شاکر میرٹھی کا قلمی نام تھا جنھوں نے دیانرائن نگم کے ساتھ کام کیا تھا اور بعد میں ادیب کے مدیر بنے۔ بمبوق کے نام سے ایک ادیب زمانہ میں لکھتے تھے مگر وہ اپنے نام کے ساتھ ایم ایس سی بھی لکھتے تھے۔ نیرنگ خیال میں ایک خواتین انیس فاطمہ بن بمبوق کے نام سے لکھتی تھیں۔ جب بمبوق کی کہانیاں شائع ہوئیں اس وقت پریم چند بہت مقبول تھے۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس نام سے افسانے لکھتے۔ یہاں یہ لکھنا بھی واجب ہوگا کہ ایک دوسرے پریم چند بھی تھے۔ جنھوں نے اپنے مجموعوں کو لاہور سے چھپوایا تھا۔ یہ اپنے نام کے بعد ایم.اے. لکھتے تھے جبکہ منشی پریم چند صرف بی.اے. ہی تھے۔ ایک محقق کے مطابق ان کے اس نام سے 17 مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ راقم الحروف نے کچھ مجموعوں کو عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں دیکھا ہے۔

کچھ محققین نے داراشکوہ کا دربار کو افسانوں میں شامل کرنا چاہا ہے۔ یہ ستمبر 1908 میں لاہور کے ماہ وار رسالہ آزاد میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ نہیں انشائیہ ہے۔ پریم چند تاریخی واقعات کو موضوع بناکر افسانے ضرور لکھتے تھے جیسے امتحان، نزول برق، دل کی رانی، زنجیر ہوس، مگر ان سب میں وہ ڈرامائی کیفیت پیدا کردیتے تھے۔ داراشکوہ کا دربار میں مغل بادشاہ شاہ جہاں کے فرزند عظیم کی زندگی کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تو مضمون ایسے ہی ہے جیسے پریم چند کا کراوم ویل پر مضمون۔ اسے اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا جارہا ہے۔ ایسا ہی ایک اور مضمون ہے بھرت۔ اسے بھی افسانوں کی فہرست میں نہیں رکھا گیا ہے۔

ابتدائی دور سے پریم چند کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ رابندرناتھ ٹیگور کی کہانیوں کے اردو ترجمے کیے تھے اور شائع کرائے تھے۔ ان کی تفصیل دستیاب نہیں ہے ٹالسٹائی کی بیس سے زیادہ کہانیوں کے ترجمے بھی کیے۔ کچھ کہانیاں بچوں کے لیے ہیں۔ جیسے جنگل کی کہانیاں یا کتے کی کہانی۔ ان کہانیوں کو بھی پریم پچاسا میں شامل نہیں کیا گیا۔

1907 میں نواب رائے کا شائع ہونے والا ایک قصہ تھا روٹھی رانی۔ یہ ہندی

سے ترجمہ تھا۔ اس کے آخر میں لکھا تھا "ماخوذ و ترجمہ از ہندی نواب رائے" اس قصہ کے مصنف تھے منشی دیوی پرساد ساکن جودھپور، جن کے والد اجمیر کی درگاہ کے نائب رہ چکے تھے۔ دیوی پرساد فارسی اور ہندی کے مصنف تھے ریاست جودھپور میں ہندی کو سرکاری زبان بنوانے میں سرگرم تھے۔ تقریباً ساٹھ ہندی کتابوں کے مصنف تھے۔ مغل بادشاہوں اور راجستھان کے مہاراجاؤں پر کتابیں لکھی تھیں۔ ایک کتاب کا عنوان تھا "روٹھی رانی"۔ منشی دھنپت رائے جو نواب رائے کے نام سے رسائل میں لکھتے تھے (اور آگے چل کر پریم چند بنے) اس کتاب سے متاثر ہوئے اور اس کا اردو ترجمہ کرکے اسے زمانہ کے اپریل تا اگست 1907 کے شماروں میں شائع کرایا۔ مدیر دیانرائن نگم نے اسے قصہ کا خطاب دیا ہے۔ اور اسے ایک کتابچہ کی شکل میں بھی چھاپ کر زمانے کے دفتر سے فروخت بھی کیا تھا۔ اس کے ٹائٹل پر بھی لکھا تھا، "ایک قصہ"۔ میں نے یہ معلومات اپنی کتاب پریم چند لٹریری بایوگرافی میں پیش کی تھی۔ امرت رائے نے روٹھی رانی کو ایک ناول قرار کرکے منگلاچرن میں شائع کیا۔ حالانکہ زمانہ میں کوئی ناول شائع نہیں ہوا۔ میں بھی دیانرائن نگم کی طرح روٹھی رانی کو قصہ مانتا ہوں اور اسے پریم پچاسا میں شامل کیا ہے۔

پریم پچاسا کی چھ جلدوں میں ایک درجن سے زائد افسانے ایسے ہیں جو بنگالی، انگریزی اور روسی کے افسانوں کے ترجمے ہیں۔ پریم چند کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ حیرانی اس بات کی ہے کہ ایک میٹرک پاس اسکول ماسٹر بندیل کھنڈ کے جنگلوں میں بسے، گاؤں یا چھوٹے قصبوں میں اسکول کا معائنہ کرنے والا کہاں سے ڈکنس، ہاتھرن اوسکروائلڈ، ٹیگور کو تلاش کرکے پڑھتا اور افسانے لکھتا تھا۔ ان افسانوں کے ترجموں کو پریم چالیسا میں شامل کیا ہے کچھ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہیں۔ انگریزی کی کتابوں کے علاوہ وہ روسی اور فرانسیسی مصنفوں کی کتابوں کے انگریزی ترجمے پڑھتے، اگر ان کہانیوں سے متاثر ہوتے تو ان کے پلاٹ کو لے کر اردو میں کہانی لکھ ڈالتے تھے۔ مگر یہ ذکر نہ کرتے کہ یہ افسانے کہاں سے ماخوذ ہیں۔ عام طور پر ترجموں کے اختتام پر نواب رائے یا د۔ر۔ (دھنپت رائے) لکھتے تھے مگر اصل مصنف کا نام نہیں دیتے تھے۔ "سگِ لیلیٰ" میں کرداروں کے نام وہی ہیں جو اصل افسانے میں ہے مگر یہ افسانہ کس کا لکھا ہے اس کی کوئی جانکاری نہیں۔ کبھی ماحول

بدیشی ہوتا کبھی ہندستانی، چارلس ڈکنس کی ایک کہانی کے کردار سے متاثر ہوکر "اشکِ ندامت"، لکھی اس کے کردار بدیشی ہیں۔ کبھی کبھی بنگلہ کہانیوں کے ہندی ترجمے کو لے کر اسے اردو میں لکھ ڈالتے۔ جیسے دھوکے کی ٹٹی، خوفِ رسوائی، اپنے فن کا استاد، قاتل، یہ بالکل ترجمے نہیں تھے بنگلہ (ہندی ترجمے) تھیم کو لے کر لکھتے تھے۔ اور ان کہانیوں کو صرف اردو رسائل میں ہی چھپواتے تھے۔ رتن ناتھ سرشار کی سیر کہسار کو ہندی میں پروت یاترا کے نام سے لکھا۔ یہ کسی اردو مجموعے میں شائع نہیں ہوا۔ پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا تھا کہ اشکِ ندامت اور آبِ حیات کے بعد وہ ترجمہ نہیں کریں گے۔ حقیقت برعکس ہے انھیں جب کوئی افسانہ اچھا لگتا تھا تو اس کے بنا پر افسانہ لکھ کر رسائل کو بھیج دیتے۔ ایک بار قبول کیا کہ انھوں نے Eternal City کے ایک جزو سے متاثر ہوکر ایک کہانی "وشواس" لکھی ہے۔ ایک روسی فنکار کپتین سیو جنھوں نے پریم چند کا ہندی میں مطالعہ کیا تھا۔ مجھے 1950 میں بتایا تھا کہ پریم چند کی ایک کہانی گورکی کی کہانی سٹی آف یبلوڈیول کا ترجمہ سا تھا۔ ایک اور کہانی چیخوف کی کہانی کا۔ ایک افسانہ تھا قیدی۔

امتیاز علی تاج کو 3 جولائی 1919 کو لکھا "کل میں نے چمپا کو خاص طور سے پڑھا۔ مصنف نے خوب لکھا ہے۔ اگر کوئی ہندو صاحب ہیں تو خیر اور اگر مسلمان صاحب ہیں تو ان کی قلم کی داد دیتا ہوں۔ قصہ خوب بنایا گیا ہے۔ سری کانت کا کیریکٹر قابل تعریف ہے۔ میں نے اس قصہ کو ہندی میں ترجمہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے"۔

دسمبر 1942 میں راقم الحروف نے پریم چند کے فرزند شری پت رائے سے پیشکش کی تھی کہ پریم چند کے افسانوں کو ایک سلسلے میں شائع کریں (میری خط و کتابت ڈاکٹر شیام سنگھ ششی کی کتاب "پریم چند کے مدن گوپال" ہندی میں شائع ہو چکی ہے) مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔ بعد میں ایک دو ناشروں سے غیر رسمی بات ہوئی۔ کوئی اشاعت کے لیے تیار نہ ہوا۔ پریم چند کی پیدائش کے ایک سو سال بعد ان کی بہت تقریبیں ہوئی ہیں مگر اس طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ اب قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان نے جس اسکیم کو اپنایا ہے اس کے تحت دیگر تنقیحات کے علاوہ ان کے تمام افسانوں کو پریم پچاسا کی چھ جلدوں میں پیش کیا جارہا ہے۔

کلیات کی ان جلدوں میں وہ تمام قصے شامل ہیں جو پریم چند نے پہلے اردو میں

لکھے اور وہ بھی جن کی تخلیق پہلی بار ہندی میں اور ان کی حیات میں اردو میں بھی شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ وہ تمام قصے بھی ہیں جو صرف ہندی میں شائع ہوئے اور جنھیں پہلی بار اردو کے قارئین کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔ کونسل نے ان قصوں کو ترجمہ کے بجائے انھیں اردو رسم الخط میں پیش کیا ہے۔ کونسل کا یہ بھی فیصلہ تھا کہ ان کے تمام ناولوں، مضامین اور قصوں کو تاریخ وار پیش کیا جائے۔

پریم چند کے اردو ہندی افسانوں کا تقابلی مطالعہ میں نے 1957 میں کیا تھا اور دو حصوں میں ایک فہرست تیار کی تھی جس میں یہ بتایا گیا کہ کون سا افسانہ کب اور کہاں ہندی، اردو میں شائع ہوا اور کس مجموعہ میں شامل ہے۔ اس کی ایک کاپی گوینکا لے گئے تھے دوسری میرے پاس ابھی تک محفوظ ہے لیکن آج تک شائع نہ کرا سکا۔ 1962 میں امرت رائے نے صرف 224 ہندی افسانوں کی فہرست پیش کی تھی اس کے سات سال بعد ڈاکٹر جعفر رضا نے ایک فہرست تیار کی تھی پھر رادھا کرشن نے اور شیلس زیدی نے بھی ایک فہرست شائع کی، مگر کسی بھی فہرست میں مکمل اور مستند جانکاری نہیں۔

پریم چند بعض اوقات قصہ کا عنوان بدل دیتے تھے۔ ایک کہانی تھی دوا اور دارو۔ اس کا نام بدل کر کپتان کر دیا۔ شامتِ اعمال کو بدل کر خاکِ پروانہ کر دیا۔ موت اور زندگی کی جگہ امرت، حسن و شباب کو بدل کر کشمکش کر دیا گیا، ہندی میں آگا پیچھا، سکونِ قلب کو بدل کر شانتی۔ زمانہ میں شائع کہانی معمہ کو بدل کر سمسیا کردیا۔ ایک مجموعے میں وِشم سمسیا بھی اسی کا نام رکھا۔

قارئین کو مدنظر رکھتے ہوئے پریم چند کرداروں کے نام بھی بدل دیتے تھے۔ کہکشاں میں ایک افسانہ حج اکبر شائع ہوا تھا اس میں کردار تھے۔ صابر حسین، شاکرہ نصیر عباسی جب یہ ہندی میں شائع ہوا تو کردار تھے۔ رودر منی، سکھدا، کیلاسی، دو بھائی (جو زمانہ میں شائع ہوئی تھی) کے کردار تھے کرشن، بلدیو، واسودیو، یشودھا، رادھا۔ اس پر دوستوں نے اعتراض کیا۔ ایڈیٹر کو خط لکھ کر صفائی پیش کی۔ جب یہ کہانی ہندی رسائل میں چھپی تو کرداروں کے نئے نام تھے۔ شیودت، کیدار، کلاوتی، مادھو وغیرہ۔ ایک کہانی آتما رام کے متعلق کہکشاں کے مدیر امتیاز علی تاج کو لکھا۔ "یہ اس قدر ہندو ہوگئی ہے کہ کہکشاں کے لائق نہیں آپ خود ہندو سہی مگر آپ کے ناظرین تو ہندو نہیں"۔

کرداروں کے نام بدلنے کی وجہ سے اور ترجمہ میں ترمیم کی وجہ سے ہندی اور اردو میں قصوں کے تقابل میں کافی دقتیں پیش آتی ہیں کچھ رسالوں کو چھوڑ کر باقی کی زندگی پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ سید علی اکبر اکبرآبادی نے 1910 میں آگرہ سے ادیب نکالا جو صرف ایک سال چلا پھر نوبت رائے نظر نے اسی نام سے الہٰ آباد سے شائع کیا۔ یہ تین سال چلا۔ لکھنؤ سے برج نرائن چکبست نے 1918 میں صبح امید نکالا۔ 1926 میں ان کی وفات ہوئی۔ سدرشن نے لاہور سے چندن نکالا جو کچھ ہی سال چلا۔ زمانہ ہی صرف ایک ایسا رسالہ تھا جو 1902 سے لے کر 1945 تک شائع ہوا۔ کہکشاں، تہذیب نسواں، پھول اور شاہکار کچھ سال کے بعد بند کر دیے گئے۔ مگر زمانہ کی فائلیں کچھ لائبریریوں میں دستیاب تو ہیں مگر سب شمارے مشکل سے ملتے ہیں۔ کچھ شماروں سے صفحات بھی غائب ہیں۔ زمانہ کے علاوہ دوسرے کم عمر رسالوں کی فائلوں کے بارے میں میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ کچھ پُرانے رسالوں کی فائلیں جنھیں میں نے پچاس سال پہلے دیکھی تھی اب غائب ہیں۔ آج ادیب، العصر، کہکشاں، عصمت، ذخیرہ، نیرنگ خیال، صبح امید، ہمدرد، آزاد، تہذیب نسواں، پھول، ہزار داستان کے شماروں کی عدم موجودگی میں سارے قصص کی نقل اور ترتیب اور حواشی میں ساری تفصیلات دینے کا کام بھی آسان نہیں ہے۔

جب پریم چند نے عدم تشدد کے بعد سرکاری نوکری سے استعفیٰ دیے دیا تو ان کی آمدنی کا اہم ذریعہ افسانے ہی تھے۔ ناول سے انھیں بہت کچھ نہیں ملا، نہ ہی افسانوں کے مجموعوں سے۔ ان کی حیات میں شاید ہی کسی اردو کتاب کا دوسرا تیسرا ایڈیشن نکلا ہو بہت سے ناشروں نے انھیں رائلٹی بھی نہیں دی۔ 1941 میں مجھے سید گیلانی صاحب نے بتلایا تھا کہ پریم چالیسی کی بہت سی کاپیاں پڑی تھیں اور انھوں نے شری پت رائے کو لکھا تھا کہ لاگت کی رقم دے کر وہ ان کاپیوں کو لے جائیں۔

پریم چند کے زیادہ افسانے ہندی میں شائع ہوتے پھر ان کا ترجمہ رسائل یا اخبار میں شائع ہوتا۔ پریم چند کوشش کرتے کہ افسانے کو اردو اور ہندی رسائل کو ایک ساتھ ہی بھیجیں۔ اردو سے ہندی اور ہندی سے اردو میں ترجمہ خود کرتے یا کسی شاگرد یا دوست سے کروا کر رسالوں کو بھیج دیتے تھے۔ ایک بار نگم کو لکھا کہ ترجمہ اقبال ورما سحر

ہنگامی سے کروالیں۔ کبھی کبھی ان کے ہندی کے افسانوں کا اردو میں ترجمہ بغیر اجازت کر دیا جاتا جو اصل افسانے سے مختلف ہوتا۔ اکتوبر 1922 کو دیانرائن نگم کو ایک خط میں لکھا ”زمانہ کے لیے ایک مضمون لکھا۔ اس کا ہندی ترجمہ کلکتہ کے ایک رسالے میں نکلا تھا۔ میں نے مضمون صاف کیا مگر ہندی میں نکلنے کے تیسرے دن ہی اس کا ترجمہ لاہور کے پرتاپ میں نظر آیا...... حالانکہ لاہوری ترجمہ بالکل بھدا ہے مگر قصہ تو وہی ہے۔“ یہی کیفیت کچھ اور قصوں کی بھی ہو سکتی ہے۔

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ پریم چند کو افسانہ نگاری میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اردو ہندی رسالوں سے فرمائش آتی رہتی تھیں۔ پریم چند قصہ لکھتے۔ رسالہ کو بھیج دیتے، یہ چھپ جاتا، رسالہ کی کاپی آتی، اسے دیکھتے۔ کبھی دوست اور احباب پڑھنے کے لیے لے جاتے اس کی تعریف ہوتی اور پریم چند بھول جاتے کون لے گیا۔ عام طور پر واپس بھی کوئی نہ کرتا تھا، مگر انھیں، تو اس کی اشاعت اور معاوضہ کی فکر تھی معاوضہ آیا بات ختم ہوگئی۔ جب نئے مجموعے کی اشاعت کی بات شروع ہوتی تب دماغ پر زور ڈالا جاتا۔ اگر قصہ یاد آگیا اور قصہ دستیاب نہیں ہوا تو ایڈیٹر کو نقل کے لیے لکھتے۔ اگر قصہ یاد نہیں رہا تو اسے اس مجموعے میں شامل نہیں کیا جاسکا۔ اور جب یاد آگیا تو اس کی نقل یا اس کی کاپی کرواکر کسی دوسرے رسالے کو بھیج دیتے اور پھر بعد کے مجموعے میں شامل کرلیتے۔ ایک دو مثال پیش کرنا چاہوں گا۔

جون 1910 کے زمانہ میں ایک قصہ چھپا شکار، جب پریم پچیسی یا پریم بتیسی کے لیے قصے اکٹھے کررہے تھے تو اس کا دھیان نہیں آیا، اکتوبر 1931 میں اسے چندن میں شائع کروایا اور اسے آخری تحفہ میں شامل کیا گیا۔ ایک اور کہانی تھی ملاپ، یہ زمانہ جون 1913 میں شائع ہوئی تھی۔ پندرہ سال بعد اسے خاکِ پروانہ میں شامل کیا گیا۔ ایک افسانہ دونوں طرف سے زمانہ مارچ 1911 میں شائع ہوئی۔ کسی مجموعہ میں نہیں ہے۔

عام طور پر پریم چند کے قصے 10، 15 صفحات کے ہوتے تھے مگر کچھ قصے ایسے بھی ہیں جن کی ضخامت 50، 60 صفحات ہیں، روٹھی رانی، دو سکھیاں وغیرہ۔ کچھ کہانیاں اتنی چھوٹی ہیں کہ کہانی لفظ کا استعمال زیب نہیں دیتا۔ جیسے بانسری (یہ صرف 8 یا 10 لائنس کی کہانی ہے) کہکشاں لاہور کے جس شمارہ میں یہ کہانی چھپی تھی اس کی فہرست

میں لکھا تھا بانسری۔ (کہانی مصنف پریم چند) گیلانی الکٹرانک پریس کے مالک سید مبارک شاہ گیلانی نے 1941 میں راقم الحروف کو بتلایا تھا کہ جب پریم چالیسی چھپ رہی تھی تو انھوں نے پریم چند کو ایک خط لکھا کہ فارم چھپ رہا ہے۔ دو صفحے خالی ہیں، کچھ لکھ دیجیے اور پریم چند نے دو صفحے کی کہانی لکھ دی۔ شاید اس کہانی کا عنوان تھا، دیوی۔ ایک دوسری تھی قوم کا خادم۔ بند دروازہ وغیرہ اسی صف میں آتے ہیں۔ اس مجموعہ میں ایک اپورن کہانی بھی شامل ہے جسے ڈاکٹر گوینکا نے ڈھونڈھ نکالا ہے۔

ایک دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ وفات سے دس پندرہ سال پہلے پریم چند نے لگ بھگ بیس افسانے لکھے جن کا تعلق ان کے بچپن یا معلّمی کے زمانے کے تجربات سے ہے۔ قزاقی، بڑے بھائی صاحب، چوری، گلی ڈنڈا، میری پہلی رچنا، ہولی کی چھٹی، جیون سار، میری کہانی، آپ بیتی، ڈھپورسنگھ، لال فیتہ، مفت کرم داشتن، لاٹری، دفتری، شکوہ و شکایت، نغمہ روہ وغیرہ۔

ان مضامین کو اور پریم چند سے انگریزی بنگلہ یا روسی سے ترجمہ کو اس مجموعہ میں شامل کرنے پر اعتراض ہوسکتا ہے مگر پریم چند کے لڑکوں نے خود انھیں افسانوں کے مجموعوں میں شائع کیا ہے۔ اس لیے ان ترجموں کو پریم پچاسا میں شامل کیا گیا ہے۔ ایک درجن طنزیہ کہانیاں ہیں جن کا مرکزی کردار موٹے رام شاسٹری ہے۔ اس کو لے کر عزت ہتک کا دعوا بھی ہوا تھا۔

پریم چند کے افسانوں کی پہلی تخلیق سوز وطن کی پانچ کہانیوں کا موضوع تھا حب الوطنی۔ اسے برٹش سرکار نے باغی قرار دیا اور انھیں حکم ہوا کہ وہ بغیر اجازت لکھنا بند کردیں اور اگر لکھیں تو باقاعدہ اجازت لے کر۔ ان دنوں پریم چند بنڈیل کھنڈ میں دورہ کرتے تھے یہاں بندیلوں اور راجپوتوں کی شادی کے قصے سنتے تھے۔ ہندستان کے قدیم بہادروں کے قصوں کو قلم بند کرنا اور عوام میں ذرا اعتماد پیدا کرنا حب الوطنی کا دوسرا پہلو تھا۔ انھوں نے کرشمۂ انتقام، راجا ہردل، رانی سارندھا، وکرمہ دتیہ کا تیغہ، گناہ کا اگن کنڈ وغیرہ کتنے ہی قصے لکھے۔

سیاسی حالات کے ساتھ ہی پریم چند نے سماجی مذہبی اقتصادی حالات کا بھی جائزہ لیا اور عوام کے مسائل کو سمجھنے اور انھیں حل کرنے کی کوشش کی۔ سماج مذہب

اور گھر کی کمزوریوں اور توہمات سے پردہ اٹھایا تاکہ عوام انھیں دور کرنے کے لیے کمر کسیں۔

1918 میں پریم چند نے نگم کو لکھا کہ ان کی معراج زندگی تھی ایک اچھے اخبار کی ایڈیٹری جو کسانوں کا حامی اور مددگار ہو۔

پریم چند کی پیدائش گاؤں میں ہوئی تھی تا زندگی دیہاتی زندگی سے ان کا نزدیک کا رشتہ رہا۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں گاؤں کے مسائل کو خصوصی اہمیت دی اور ان کو اپنے قصوں کا موضوع بنایا۔ کسانوں، مزدوروں اور پچھڑے طبقوں جیسے دھوبی، کرمی، نائی، چمار کی پریشانیوں پر گہرائی سے غور کیا۔ انھیں پرکھا اور محسوس کیا کہ ایک طرف تو تھی ان کی نیکی اور سچائی کی زندگی اور دوسری طرف تھی مہاجنوں، مذہب کے ٹھیکداروں، زمیندار کے اہلکاروں اور سرکاری حکاموں کی زبردستی اور مکاری اور بے ایمانی۔ کسان کی زندگی میں جدوجہد ہے، محنت ہے اور فاقہ مستی ہے۔ اپنے افسانوں میں پریم چند نے ان کا سچا اور صحیح نقشہ پیش کیا۔ ان کے کردار جیتے جاگتے انسان ہیں جو آج بھی گاؤں اور شہر کی گلیوں میں چلتے پھرتے ہیں۔ مصنف کا فرض ہے کہ غربت اور امیری کے درمیان فرق کو دور کیا جائے۔ ادب کو زندگی اور اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ اردو ادب میں پریم چند نے ہماری معاشرتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر پیش کی۔ ان کے افسانوں میں ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کے مسائل اور دشواریوں کی سچی تصویر پیش کی گئی ہے۔ خانہ داری کے مختلف پہلو ان کے کرداروں اور سیاسی بیداری کی تحریک میں کندھے سے کندھا ملا کر شرکت پیش کی ہے۔ پریم چند سماج اور گھر کی کمزوریوں پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں جیسے گھاس والی، مالکن، سبھاگی، سہاگ کی ساڑی، بڑے گھر کی بیٹی، آشیاں برباد، قاتل کی ماں، ستی، علاحدگی، سمر یاترا، اجلاس، ان افسانوں میں کتنی ہی مثالیں ہیں جہاں عورتیں دشواریاں کا سامنا کرتی ہیں۔

پچھڑے لوگوں کا ایک طبقہ ہے ہریجنوں کا جنھیں آج دلت کہا جاتا ہے۔ غریبوں کے ہمدرد پریم چند ان پر ظلم و ستم کی صحیح دردناک تصویر پیش کرتے ہیں۔ جیسے ٹھاکر کا کنواں، طلوع محبت، نیچ ذات کی لڑکی، نجات، دودھ کی قیمت، جرمانہ وغیرہ ان کے کتنے ہی قصے ہیں جنھیں پڑھ کر رونا آتا ہے اور ان کے لیے ان کی سخت مخالفت بھی

ہوئی۔ ایک طبقے نے انھیں نفرت کا پرچارک تک کہا۔

پریم چند ہندو مسلم اتحاد کے بڑے علم بردار بھی تھے۔ ان کے لیے دیہات کی زندگی اور روایات، باہمی محبت اور رواداری کا نمونہ تھی۔ فرقہ وارانہ نفرت کی فضا ہندستان کے دیہات میں بالکل نہیں ہے۔ پریم چند کے کتنے ہی کردار (ہندو مسلم) کندھے سے کندھا ملا کر چلتے ہیں۔ پنچایت میں ہندو مسلم شریک ہوتے ہیں۔ پریم چند اور امن پسندی برادرانہ برتاؤ کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔

کتنے ہی قصوں میں جیسے پنچایت، قربانی، سفید خون، سجان بھگت، سوا سیر گیہوں، بانکا زمیندار، پوس کی رات، ہولی کی چھٹی، پچھتاوا، بانگ سحر، بیٹی کا دھن، اندھیر، مشعلِ ہدایت میں دیہاتی زندگی کے روشن پہلو پیش کرتے ہیں۔ ان میں دیہاتی فضا پیش کی گئی ہے۔ دیہات کے الفاظ اور محاورات جو صرف بول چال میں زبان پر ہوتے تھے پریم چند نے ادب میں داخل کرکے انھیں اپنی سلیس اور عام فہم پُر لطف زبان اور دلکش اچھوتے انداز بیان میں پیش کیا۔ یہی پریم چند کی قوت تخلیق کا راز ہے کسانوں اور پچھڑے طبقوں کے دکھ درد کی کہانی پڑھ کر قارئین مصنف کے ساتھ مسکراتے ہیں۔ قہقہے لگاتے ہیں یا سینے پر ہاتھ رکھ کر آنسو بہاتے ہیں۔

پریم چند قصے کیسے لکھتے تھے۔ اس بارے میں ان کے ایک خط کو پڑھیے جسے انھوں نے فروری 1934 میں نیرنگ خیال کے ایڈیٹر کو لکھا تھا:

''میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر محض واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اسی میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقیت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کیرکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں۔ لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

میں جب تک کوئی افسانہ اول سے آخر تک ذہن میں نہ جما لوں لکھنے نہیں بیٹھتا۔ کیرکٹروں کا اختراع اس اعتبار سے کرتا ہوں کہ افسانے کے حسبِ حال ہوں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پُر لطف واقعہ پر رکھوں۔ اگر افسانے

میں نفسیاتی کلائمکس موجود ہوں تو خواہ وہ کسی واقعہ سے تعلق رکھتا ہو میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ ابھی میں نے ہندی میں ایک افسانہ لکھا ہے جس کا نام ہے ''دل کی رانی''۔ میں نے تاریخ اسلام میں تیمور کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھا تھا جس میں حمیدہ بیگم سے اس کی شادی کا ذکر ہے۔ مجھے فوراً اس تاریخی واقعہ کے ڈرامائی پہلو کا خیال آیا۔ تاریخ میں کلائمکس کیسے پیدا ہو۔ اس کی فکر ہوئی۔ حمیدہ بیگم نے بچپن میں اپنے باپ سے فنِ حرب کی تعلیم پائی تھی اور میدانِ جنگ میں کچھ تجربہ بھی حاصل کیا تھا۔ تیمور نے ہزارہا ترکوں کو قتل کردیا تھا۔ ایسے دشمنِ قوم سے ایک ترک عورت کس طرح مانوس ہوئی؟ یہ عقدہ حل ہونے سے کلائمکس نکل آتا ہے۔ تیمور وجیہہ نہ تھا۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس میں ایسے اخلاقی و جذباتی محاسن پیدا کیے جائیں جو ایک عالی نفس خاتون کو اس کی طرف مائل کرسکیں۔ اس طرح وہ قصہ تیار ہوگیا۔ کبھی کبھی سنے سنائے واقعات ایسے ہوتے کہ ان پر افسانہ کی بنیاد آسانی سے رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن کوئی واقعہ محض لچھے دار اور چست عبارت میں لکھنے اور انشا پردازانہ کمالات کی بنیاد پر افسانہ نہیں ہوتا۔ میں ان میں کلائمکس لازمی چیز سمجھتا ہوں اور وہ بھی نفسیاتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افسانے کے مدارج اس طرح قائم کیے جائیں کہ کلائمکس قریب تر آتا جائے۔ جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے تو میں اس موقعہ سے ضرور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی کیفیت افسانے کی روح ہے۔

میں سست رفتار بھی ہوں۔ مہینے بھر میں شاید میں نے دو افسانے سے زیادہ نہیں لکھے۔ بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیریکٹر تو سب مل جاتے ہیں لیکن نفسیاتی بنیاد بمشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہوجانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی۔ مگر ان چند سطور سے افسانہ نویسی کے حقائق نہیں بیان کرسکتا۔ یہ ایک ذہنی امر ہے سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بن جاتے ہیں۔ لیکن شاعری کی طرح اس کے لیے بھی اور ادب کے ہر شعبہ کے لیے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے پلاٹ بناتی ہے۔ ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے، تاثر لاتی ہے ادبی خوبیاں جمع کرتی۔ نادانستہ طور پر آپ ہی آپ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں قصہ ختم ہوجانے کے بعد میں اسے خود پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے کچھ ندرت، کچھ جدّت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ

حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے تو میں اسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں
ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہوگیا۔ حالانکہ فیل اور پاس دونوں افسانے شائع ہو جاتے اور اکثر ایسا
ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیل سمجھا تھا اسے احباب نے بہت پسند کیا اس لیے
میں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا"۔

پریم چند نے "میرے بہترین افسانے" کے دیباچہ میں لکھا تھا، ان کے قصوں
کی تعداد تین سو ہے۔ ان افسانوں کو "کلیات پریم چند کی چھ جلدوں (جلد 9، جلد 10، جلد
11، جلد 12، جلد 13 اور جلد 14) میں پیش کیا گیا ہے۔

مدن گوپال

علاحدگی

(۱)

بھولا مہتو نے پہلی عورت کے مر جانے کے بعد دوسری سگائی کی تو اس کے لڑکے رگھو کے لیے مصیبت کے دن آ گئے۔ رگھو کی عمر اس وقت کل دس سال کی تھی۔ مزے سے گاؤں میں گلّی ڈنڈا کھیلتا پھرتا تھا۔ نئی ماں کے آتے ہی چکّی میں جتنا پڑا۔ پنّا حسین عورت تھی اور حسن کے ساتھ غرور ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے کوئی موٹا کام نہ کرتی۔ گوبر رگھو نکالتا، بیلوں کو سانی رگھو دیتا، رگھو ہی گھر کے جھوٹھے برتن مانجتا۔ بھولا کی آنکھیں کچھ ایسی پھریں کہ اسے اب رگھو میں برائیاں ہی نظر آتیں۔ پنّا کی باتوں کو وہ رواج قدیم کے مطابق آنکھیں بند کر کے مان لیتا تھا۔ رگھو کی شکایتوں کی مطلق پرواہ نہ کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رگھو نے شکایت کرنی چھوڑ دی۔ کس کے سامنے روئے؟ باپ ہی نہیں سارا گاؤں اس غریب کا دشمن تھا۔ بڑا ضدی لڑکا ہے، پنّا کو تو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ بیچاری اس کا دلار کرتی ہے، کھلاتی پلاتی ہے، یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ دوسری عورت ہوتی تو نباہ نہ ہوتا۔ وہ تو کہو پنّا اتنی سیدھی ہے کہ نباہ ہوتا جاتا ہے۔ زبردست کی شکایتیں سب سنتے ہیں کمزور کی فریاد کوئی نہیں سنتا۔ رگھو کے دل میں ماں کی جانب سے روز بروز مغائرت بڑھتی جاتی تھی یہاں تک کہ آٹھ سال گزر گئے اور ایک دن بھولا کے نام موت کا پیغام آ پہنچا۔

پنّا کے چار بچّے تھے۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی۔ اتنا بڑا خرچ اور کمانے والا

کوئی نہیں۔ رگھو اب کیوں کوئی بات پوچھنے لگا؟ یہ بات مانی ہوئی تھی اپنی بیوی لائے گا اور الگ رہے گا۔ بیوی آکر اور بھی آگ لگائے گی۔ پنّا کو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ مگر کچھ بھی ہو وہ رگھو کی دست نگر بن کر گھر میں نہ رہے گی۔ جس گھر میں اس نے راج کیا اس میں اب لونڈی نہ بنے گی۔ جس لونڈے کو اپنا غلام سمجھا اس کا منھ نہ تاکے گی۔ وہ حسین تھی، ابھی اس کی عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ اس کا حسن ابھی پوری بہار پر تھا،وہ کوئی دوسرا گھر کر لے گی۔ یہی نہ ہو گا لوگ ہنسیں گے۔ ہنسنے دو۔ اس کی برادری میں کیا ایسا ہوتا نہیں؟ یا محض ٹھاکر تھوڑے ہی تھی کہ ناک کٹ جائے گی۔ گھر میں چاہے جو کچھ کروں باہر پردہ ڈھکا رہے۔ یہاں تو سنسار کو دکھا کر دوسرا گھر کر سکتی ہوں۔ رگھو کی دبیل بن کر کیوں رہوں؟

بھولا کو مرے ایک مہینہ گزر گیا تھا۔ شام ہو گئی تھی۔ پنّا اسی تشویش میں پڑی ہوئی تھی کہ یکا یک اسے خیال آیا لڑکے گھر میں نہیں ہیں۔ بیلوں کے آنے کا وقت ہے۔ کہیں راستے میں نہ پڑ جائیں۔ اب دروازہ پر کون ہے جو ان کی نگرانی کرے گا؟ رگھو تو یہی چاہے گا کہ نہ کچلتے ہوں تو کچل جائیں۔ میرے لڑکے تو اسے پھوٹی آنکھوں نہیں بھاتے۔ کبھی ہنس کر نہیں بولتا۔ گھرسے باہر نکلی تو دیکھا رگھو سامنے جھونپڑے میں بیٹھا اوکھ کی گنڈیریاں بنا رہا ہے۔ تینوں لڑکے اس کے سامنے کھڑے ہیں اور چھوٹی لڑکی اس کی گردن میں ہاتھ ڈالے اس کی پیٹھ پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ ماں کو آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ آج تو یہ نئی بات ہے شاید دنیا کو دکھاتا ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو کتنا چاہتا ہوں؟ اور من میں چھری رکھی ہوئی ہے۔ گھات ملے تو جان ہی لے لے۔ کالا سانپ ہے کالا سانپ۔ تند لہجہ میں بولی تم سب کے سب وہاں کیا کر تے ہو؟ گھر میں آؤ۔ سانجھ کا بیرا ہے، گورو آتے ہوں گے۔

رگھونے التجا کی نظروں سے دیکھ کر کہا میں تو ہوں ہی کا کی، ڈر کس بات کا ہے۔

بڑا لڑکا کیدار بولا۔ کا کی، رگھو دادا نے آج ہمارے لیے دو گاڑیاں بنادی ہیں۔ یہ دیکھ۔ ایک پر ہم اور کھنو بیٹھیں گے، دوسری پر لچھمن اور جھنیا۔ دادا دونوں

گاڑیاں کھینچیں گے۔

یہ کہہ کر وہ ایک کونے سے دو چھوٹی چھوٹی گاڑیاں نکال لایا۔ چار چار پہیے لگے ہوئے تھے۔ بیٹھنے کے لیے تختے تھے اور روک کے لیے دونوں طرف بازو لگے ہوئے تھے۔

پنّا نے تعجب سے پوچھا'' گاڑیاں کس نے بنائی''؟

کیدار نے کچھ چڑھ کر کہا۔ رگھو دادا نے بنائی ہیں اور کس نے۔ بھگت کے گھر سے بسولا اور رکھانی مانگ لائے اور چٹ پٹ بنادیں۔ کھوب دوڑتی ہے کا کی۔ بیٹھ کھنو میں کھینچوں۔

کھنو گاڑی میں بیٹھ گیا۔ کیدار کھینچنے لگا۔ چر چر کا شور ہوا گویا گاڑی بھی اس کھیل میں لڑکوں کے ساتھ شریک ہے۔ لچھمن نے دوسری گاڑی میں بیٹھ کر کہا۔ دادا کھینچو۔

رگھو نے جھنیا کو بھی گاڑی میں بٹھا دیا اور گاڑی کھینچتا ہوا دوڑا تینوں لڑکے تالیاں بجانے لگے۔ پنّا تعجب آمیز نظروں سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی یہ وہی رگھو ہے یا کوئی اور ؟

تھوڑی دیر کے بعد دونوں گاڑیاں لوٹیں۔ لڑکے گھر میں جا کر ہوائی سیر کے تجربات بیان کرنے لگے۔ کتنے خوش تھے سب! گویا ہوائی جہاز پر بیٹھ آئے ہوں۔

کھنو نے کہا: ''کا کی سب پیڑ دوڑ رہے تھے''۔

لچھمن اور بچھیاں کیسی بھاگیں۔ سب کی سب دوڑیں۔

کیدار : کا کی، رگھو دونوں گاڑیاں ایک ساتھ کھینچ لے جاتے ہیں۔

جھنیا سب سے چھوٹی تھی۔ اس کی قوت اظہار حرکات اور نگاہوں تک محدود تھی۔ تالیاں بجا بجاکر ناچ رہی تھی۔

کھنو : اب ہمارے گھر گائے بھی آجائے گی کا کی۔رگھو دادا نے گردھاری سے کہا ہے کہ ہمیں ایک گائے لادو۔گر دھاری بولا کل لاؤں گا۔

کیدار : تین سیر دودھ دیتی ہے کا کی۔ کھوپ دودھ پئیں گے۔

اتنے میں رگھو بھی اندر آ گیا۔ پنّا نے سرزنش کی نگاہ سے دیکھ کر پوچھا ''کیوں

رگھو تم نے گردھاری سے کوئی گائے مانگی ہے''؟

رگھو نے عذر خواہانہ انداز سے کہا ''ہاں مانگی تو ہے۔ کل لادے گا''۔

پنّا : روپے کس کے گھر سے آویں گے یہ بھی سوچا ہے ؟

رگھو : سب سوچ لیا ہے کاکی۔ میرے یہ موہر نہیں ہے۔ اس کے پچیس روپے مل رہے ہیں۔ پانچ روپے بچھیا کے مجرا دوں گا۔ بس گائے اپنی ہو جائے گی۔

پنّا سناٹے میں آ گئی۔ اب اس کا منکر دل بھی رگھو کی شرافت اور محبت کو نہ جھٹلا سکا۔ بولی ''موہر کیوں بیچے دیتے ہو، گائے کی ابھی کون جلدی ہے ؟ہاتھ میں پیسے ہو جائے تو لے لینا۔ سونا سونا گلا اچھا نہ لگے گا۔ اتنے دنوں گائے نہیں رہی تو کیا لڑکے نہیں رہے ؟

رگھو ناصحانہ انداز سے بولا '' بچوں کے کھانے پینے کے یہی دن ہیں کاکی۔ اس عمر میں نہ کھایا تو پھر کیا کھائیں گے۔ موہر پہننا مجھے اب اچھا بھی نہیں لگتا۔ لوگ سمجھتے ہوں گے باپ مر گیا ہے اور اسے موہر پہننے کی سوجھی ہے۔

بھولا مہتو گائے کی فکر ہی میں چل بسے۔ نہ روپے آئے نہ گائے ملی۔ مجبور تھے۔ رگھو نے وہ مشکل کتنی آسانی سے حل کر دی۔آج زندگی میں پہلی بار پنّا کو رگھو پر اعتبار آیا۔ اس کے لیے مادرانہ الفت کے دروازے بند تھے۔ آج وہ پہلی بار کھلے۔ بولی ''جب گہنا ہی بیچنا ہے تو اپنی موہر کیوں بیچوگے میری ہنسلی لے لینا؟

رگھو : نہیں کاکی وہ تمھارے گلے میں بہت اچھی لگتی ہے۔مردوں کو کیا، موہر پہنیں چاہے نہ پہنیں۔

پنّا، چل میں بوڑھی ہوئی مجھے اب ہنسلی پہن کر کیا کرنا ہے ؟ تو ابھی لڑکا ہے تیرا سونا گلا اچھا نہ لگے گا۔

رگھو مسکرا کر بولا ''تم ابھی سے کیسے بوڑھی ہو گئیں۔ گاؤں میں کون تمھارے برابر ہے ؟

رگھو کی اس سادہ لوحانہ تنقید نے پنّا کو شرمندہ کر دیا۔ اس کے روکھے، مرجھائے چہرہ پر تازگی دوڑ گئی۔

(۲)

پانچ سال گذر گئے۔ رگھو کا سا جفاکش، ایماندار، بات کا دھنی دوسرا کسان گاؤں میں نہ تھا۔ پنّا کی مرضی کے بغیر وہ کوئی کام نہ کرتا۔ اس کی عمر اب ۲۳ سال کی ہو گئی تھی۔ پنّا بار بار کہتی بھیّا بہو کو بدا کرالاؤ کب تک وہ نیہر میں پڑی رہے گی۔سب لوگ مجھی کو بدنام کرتے ہیں کہ یہی بہو کو نہیں لانے دیتی۔ مگر رگھو ٹال دیتا تھا۔ کہتا ابھی جلدی کیا ہے؟ اسے اپنی بیوی کے رنگ ڈھنگ کی کچھ خبر ہو گئی تھی۔ ایسی عورت کو گھر میں لاکر وہ درد سر نہ مول لینا چاہتا تھا۔

آخر ایک دن پنّا نے پر بضد ہو کر کہا" توتم نہ جاؤگے نہ"؟

کہہ دیا ابھی کوئی جلدی نہیں ہے۔

تمھارے لیے جلدی نہ ہوگی۔ میرے لیے توجلدی ہے۔ میں آج کومی بھیجتی ہوں۔

پچھتاؤ گی کاکی۔ اس کا مجاج اچھا نہیں ہے۔

تمھاری بلا سے۔ جب میں اس سے بولوں گی ہی نہیں تو کیا ہوا سے لڑے گی۔ روٹیاں تو بنا دے گی۔ مجھ سے اب بھیتر باہر کا سارا کام نہیں ہوتا۔ میں آج بلائے لیتی ہوں۔

بلانا چاہتی ہو بلالو۔ مگر پھر یہ نہ کہنا کہ یہ مہریا کو ٹھیک نہیں کرتا۔ اس کا گلام ہو گیا ہے۔

نہ کہوں گی۔ جا کر دو ساڑیاں اور مٹھائیاں لیتا آ۔

تیسرے دن ملیا میکے سے آ گئی۔ دروازہ پر نقارہ بجا۔شہنائیوں کی خوش آیند صدا بلندہوئی۔ منھ دکھاوے کی رسم ادا ہوئی۔ بہو کو دیکھ کر سب دنگ رہ گیں۔وہ اس خار زار میں گل صدبرگ تھی۔ گیہواں رنگ تھا، غنچہ کا سا دہن، بیضاوی چہرہ، ٹھڈی کھنچی ہوئی، رخساروں پر دلاویز سرخی، بڑی بڑی نکیلی پلکیں، آنکھوں میں ایک عجیب التجا، ایک دلکش معصومیت، رگھو اسے دیکھتے ہی اپنی ساری خودداریاں بھول گیا۔ صبح کے وقت ملیا کنوئیں سے پانی کا گھڑا لے کر چلتی تو اس کا گندمی رنگ طلوع

کی سنہری کرنوں سے کندن ہو جاتا۔ گویا بسنت اپنی ساری خوشبو اور شگفتگی اور مستانہ پن لیے مسکراتی چلی جاتی ہو۔

(۳)

ملیا میکے ہی سے شمشیر برہنہ آئی تھی۔ میرا شوہر چھاتی پھاڑ کر کام کرے اور پنّا رانی بنی بیٹھی رہیں۔ان کے لڑکے رئیس زادہ بنے گھومیں۔ ملیا سے یہ برداشت نہ ہوگا۔ وہ کسی کی گلامی نہ کرے گی۔ اپنے لڑکے تو اپنے ہوتے نہیں۔ بھائی کس کے ہوتے ہیں؟ جب تک پر نہیں کھلے ہیں رگھو کو گھیرے ہوئے ہیں۔ جوں ہی ذرا سیانے ہوئے پر جھاڑ کر نکل جائیں گے۔ بات بھی نہ پوچھیں گے۔

ایک دن اس نے رگھو سے کہا: تمھیں اس طرح گلامی کرنی ہو تو کرو۔ مجھ سے تو نہ ہو گا۔

رگھو : تو پھر کیا کروں؟ تو ہی بتا۔ لڑکے ابھی گھر کا کام کر نے لائق بھی تو نہیں ہیں۔

ملیا : لڑکے راوت کے ہیں۔ کچھ تمھارے نہیں ہیں۔یہی پنّا ہیں جو تمھیں دانہ دانہ کو ترساتی تھیں۔ سب سن چکی ہوں۔ میں لونڈی بن کر نہ رہوں گی۔ روپے پیسے کا مجھے کچھ حساب نہیں ملتا۔ نہ جانے تم کیا لاتے ہو اور وہ کیا کرتی ہیں۔ ڈھائی سو کا گڑ بکا۔ روپے کہاں گئے۔مجھے دیکھنے کو بھی نہ ملے۔ تم سمجھتے ہو روپے گھر ہی میں تو ہیں مگر دیکھ لینا جو تمھیں ایک پھوٹی کوڑی بھی ملے۔

رگھو : تو گھر کی مالکن بن جائے گی تو دنیا کیا کہے گی۔ یہ تو سوچ۔

ملیا : دنیا جو چاہے کہے۔ دنیا کے ہاتھوں بکی نہیں ہوں۔ دیکھ لینا بھاڑ لیپ کر ہاتھ کالا ہی رہے گا۔ پھر تم اپنی ماں اور بھائی بہنوں کے لیے مرو۔ میں کیوں مروں؟

رگھو نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسے جس بات کا خوف تھا وہ سر پڑ ہی گئی۔ اور اتنی جلد۔ اب اگر اس نے بہت تتھمبو کیا تو سال چھ مہینہ اور کام چلے گا۔ بس۔ آگے یہ ڈونگا چلتا نظر نہیں آتا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی؟

ایک دن پنّا نے مہوئے کا سکھاون ڈالا۔ برسات شروع ہو گئی تھی۔ بکھار میں

اناج گیلا ہو رہا تھا۔ ملیا سے بولی۔ بہو جرا دیکھتی رہنا، میں تب تک تالاب سے نہاتی آؤں۔

ملیا نے لاپروائی سے کہا " مجھے نیند آرہی ہے۔ تم بیٹھ کر دیکھو۔ ایک دن نہ نہاؤ گی تو کیا ہو گا؟

پنّا نے ساڑی اٹھا کر رکھ دی۔ نہانے نہ گئی۔ ملیا کا وار خالی گیا۔

کئی دن کے بعد ایک شام کو پنّا دھان روپ کر لوٹی تو اندھیرا ہو گیا تھا۔ دن بھر کی بھوکی تھی۔ امید تھی کہ جاتے جاتے بہو کھانا دے دے گی۔ مگر یہاں دیکھا تو چولہا ٹھنڈا پڑا ہوا تھا اور بچے مارے بھوک کے تڑپ رہے تھے۔ لمیا نے تعجب سے پوچھا"کیا آج ابھی چولہا نہیں جلا"؟

کیدار نے کہا "آج تو دوپہر کو بھی چولہا نہیں جلا کاکی۔ بھابی نے کچھ بنایا ہی نہیں۔

پنّا : تو تم لوگوں نے کھایا کیا؟

کیدار : کچھ نہیں۔ رات کی روٹیاں تھیں۔ کھنو اور چھمن نے کھائیں۔ میں نے ستو کھایا۔ پنّا۔ اور بہو؟

کیدار : وہ تو پڑی سو رہی ہیں۔ کچھ نہیں کھایا۔

پنّا نے اسی وقت چولہا جلایا اور کھانا پکانے بیٹھ گئی۔ آٹا گوندھتی تھی اور روتی تھی۔ کیا نصیب ہے ! دن بھر کھیت میں جلی گھر آئی تو چولہے کے سامنے جلنا پڑا۔

کیدار کا چودھواں سال تھا۔ بھابی کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر ساری کیفیت سمجھ رہا تھا۔ بولا۔ کاکی بھابی اب ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں۔

پنّا نے چونک کر پوچھا، کیا کچھ کہتی تھی؟

کیدار : کہتی کچھ نہیں تھی۔ مگر ان کے من میں ہے یہی بات، پھر تم کیوں نہیں اسے چھوڑ دیتیں۔ جیسے چاہے رہے، ہمارا بھی بھگوان ہے۔

پنّا نے دانتوں سے زبان دبا کر کہا "چپ، میرے سامنے ایسی بات کبھی بھول کر بھی نہ کرنا۔ رگھو تمھارا بھائی نہیں تمھارا باپ ہے۔ ملیا سے کبھی بولوگے تو سمجھ لینا جہر کھالوں گی۔

(۴)

دسہرہ کا تہوار آیا۔ اس گاؤں سے کوس بھر پر ایک پُروے میں میلہ لگتا تھا۔ گاؤں کے سب لڑکے میلہ دیکھنے چلے۔ پنّا بھی لڑکوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہوئی۔ مگر پیسے کہاں سے آئیں۔ کنجی تو ملیا کے پاس تھی۔

رگھو نے آ کر ملیا سے کہا ''لڑکے میلے جا رہے ہیں۔ دو دو آنے پیسے سبھوں کو دے دے''۔

ملیا نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔''پیسے گھر میں نہیں ہیں''۔

رگھو : روپئے تو ابھی تیلہن بیچ کر لایا تھا۔ کیا اتنی جلد اٹھ گئے؟

ملیا : ہاں اٹھ گئے۔

رگھو : کہاں اٹھ گئے جرا سنوں۔ آج تیوہار کے دن لڑکے میلا دیکھنے نہ جائیں گے۔

ملیا : اپنی کاکی سے کہو پیسے نکالیں۔ گاڑ کر کیا کریں گی؟

کھونٹی پر کنجی لٹک رہی تھی۔ رگھو نے کنجی اتاری اور چاہا کہ صندوق کھولے کہ ملیا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی'' کنجی مجھے دے دو نہیں تو ٹھیک نہ ہو گا۔ میں ایک پیسہ نہ دوں گی۔ کھانے پہننے کو بھی چاہیے، کاگذ کتاب کو بھی چاہیے، پھیں پھاٹے کو بھی چاہیے، اس پر سے میلہ دیکھنے کو بھی چاہیے۔ ہماری کمائی اسی لیے نہیں ہے کہ دوسرے کھائیں اور مونچھوں پر تاؤ دیں''۔

پنّا نے رگھو سے کہا''بھیا۔ لڑکے میلہ دیکھنے نہ جائیں گے۔ پیسے کیا ہوں گے''؟

رگھو نے غضبناک ہو کر کہا '' میلہ دیکھنے کیوں نہ جائیں گے؟ سارا گاؤں جا رہا ہے۔ ہمارے ہی لڑکے نہ جائیں گے۔''

رگھو نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور لڑکو ں کو پیسے نکال کر دے دیے۔ مگر جب کنجی ملیا کو دینے لگا تو اس نے اسے آنگن میں پھینک دیا اور منہ لپیٹ کر لیٹ رہی۔ لڑکے میلہ دیکھنے نہ گئے۔

اس کے بعد دو دن گذر گئے۔ ملیا نے کچھ نہیں کھا یا۔ پنّا بھی بھوکی رہی۔ رگھو کبھی اسے مناتا، کبھی اسے۔ پر نہ یہ اٹھتی، نہ وہ۔ آخر رگھو نے حیران ہو کر ملیا

سے پوچھا۔ کچھ منھ سے تو کہہ، تو چاہتی کیا ہے؟ ملیا نے زمین کو مخاطب کر کے کہا'' میں کچھ نہیں چاہتی، مجھے میرے گھر پہونچا دو''۔

رگھو : اچھا اٹھ بنا کھ: پہونچا دوں گا۔

ملیا نے رگھو کی طرف دیکھا۔ رگھو اس کی صورت دیکھ کر ڈر گیا۔ وہ ملاحت، وہ شوخی، وہ دلاویزی، غائب ہو گئی تھی۔ دانت نکل آئے تھے، آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ انگارے کی سی لال آنکھوں سے دیکھ کر بولی'' اچھا تو کاکی نے یہ صلاح دی ہے ! یہ منتر پڑھایا ہے تو یہاں ایسی کچی نہیں ہوں تم دونوں کی چھاتی پر مونگ دلوں گی۔ ہو کس پھیر میں۔

رگھو : اچھا مونگ ہی دل لینا۔ کچھ کھاپی لے گی تبھی تو مونگ دل سکے گی۔

ملیا : اب تو جبھی منھ میں پانی ڈالوں گی جب گھر الگ ہو جائے گا۔ بہت جھیل چکی، اب نہیں جھیلا جاتا۔

رگھو سکتے میں آ گیا۔ ایک منٹ تک تو اس کے منھ سے آواز ہی نہ نکلی۔ علاحدگی کا اسے کبھی خواب میں بھی خیال نہ آیا تھا۔ اس نے گاؤں میں دو چار خاندانوں کو الگ ہوتے دیکھا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا۔ روٹی کے ساتھ لوگوں کے دل بھی الگ ہو جاتے ہیں۔ اپنے ہمیشہ کے لیے غیر ہو جاتے ہیں۔ پھر ان میں وہی ناتا رہ جاتا ہے جو گاؤں کے اور آدمیوں میں۔ رگھو نے دل میں ٹھان لیا تھا کہ اس بلا کو اپنے گھر میں قدم رکھنے نہ دوں گا۔ مگر ہونہار کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ آہ! میرے منھ کالکھ لگے گی۔ دنیا یہی کہے گی کہ باپ کے مر جانے پر دس سال بھی ایک میں نباہ نہ ہو سکا اور پھر کس سے الگ ہو جاؤں؟ جن کو گود میں کھلایا، جن کو بچوں کی طرح پالا، جن کے لیے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائیں انھیں سے الگ ہو جاؤں۔ اپنے پیاروں کو گھر سے نکال باہر کروں۔ اس کی آنکھیں آبگوں ہو گئیں۔ آخر اس نے مستقل انداز سے کہا '' تو کیا چاہتی ہے کہ میں اپنے بھائیوں سے الگ ہو جاؤں بھلا سوچ تو دنیا کیا کہے گی؟

ملیا : تو دنیا کو لے کر رہو، میرا سب کے ساتھ نباہ نہ ہو گا۔

رگھو : تو تو الگ ہوجا، مجھے کیوں اپنے ساتھ گھسیٹتی ہے ؟

ملیا : تو مجھے کیا تمھارے گھر میں مٹھائی ملتی ہے ؟ میرے لیے کیا سنسار میں جگہ نہیں ہے ؟

رگھو : تیری جیسی مرضی۔ جہاں چاہے رہ۔میں اپنے گھر والوں سے الگ نہیں ہو سکتا۔ جس دن اس گھر میں دو چولہے جلیں گے۔ اس دن میرے کلیجے کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔ میں یہ چوٹ نہیں سہ سکتا۔ تجھے جو تکلیف ہو وہ میں دور کر سکتا ہوں۔مال اسباب کی مالکن تو ہے ہی۔ اناج پانی بھی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ اب رہ کیا گیا ہے۔ اگر تو کچھ کام دھندھا نہیں کرنا چاہتی مت کر۔ بھگوان نے مجھے سمائی دی ہوتی تو میں تجھے تنکا تک نہ اٹھانے دیتا۔ تیرے یہ سکمار ہاتھ پاؤں محنت مجوری کرنے کے لیے بنائے ہی نہیں گئے ہیں۔ مگر کیا کروں۔ اپنا کچھ بس نہیں ہے۔ پھر بھی تیرا جی نہ چاہے کوئی کام مت کر، مگر مجھ سے الگ ہونے کو نہ کہہ۔ تیرے پیروں پڑتا ہوں۔

ملیا نے آنچل سر سے کھسکایا اور ذرا قریب آکر بولی'' میں کام کرنے سے نہیں ڈرتی، نہ بیٹھے بیٹھے کھانا چاہتی ہوں۔ مگر مجھ سے کسی کی دھونس نہیں سہی جاتی۔ تمھاری کاکی گھر کا کام دھندھا کرتی ہیں تو اپنے لیے کرتی ہیں، اپنے بال بچوں کے لیے کرتی ہیں۔ مجھ پر کوئی احسان نہیں کرتیں۔ پھر مجھ پر دھونس کیوں جماتی ہیں۔ انھیں اپنے بچے پیارے ہوں گے۔ مجھے تو تم ہی ہو۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ نہیں دیکھ سکتی کہ سارا گھر تو چین کرے، جرا جرا سے بچے تو دودھ پییں اور جس کے بل بوتے پر گرہستی تھمی ہوئی ہے وہ مٹھے کو ترسے۔ کوئی اس کا پوچھنے والا نہ ہو۔ جرا اپنا منھ تو دیکھو۔ کیسی صورت نکل آئی ہے۔ جو رات دن کام کرے گا اور کھانے کو وہی روکھی روٹیاں پائے گا۔ اس کا کیا حال ہوگا۔ اوروں کے تو چار برس میں اپنے پٹھے تیار ہو جائیں گے۔ تم تو دس برس میں کھاٹ پکڑ لوگے۔ یہ سب مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ بیٹھ جاؤ، کھڑے کیوں ہو، کیا مار کر بھاگوگے،یا میں تمھیں جبرجستی باندھ لوں گی،یا مالکن کا حکم نہیں ہے؟سچ کہتی ہوں تم بڑے کٹھ کلیجے ہو۔ میں جانتی کہ ایسے نرموہئے سے پالا پڑے گا تو اس گھر میں بھول کر بھی نہ آتی۔ آتی بھی تو من نہ لگاتی۔ مگر اب تو تم سے من لگ گیا۔ گھر جاؤں تو من یہیں رہے گا

اور تم ہو کہ میری بات نہیں پوچھتے۔۔

ملیا کی یہ رسیلی، دلجویانہ باتیں رگھو پر بے اثر ثابت ہوئیں۔ وہ اسی رکھائی سے بولا'' ملیا یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ الگ ہونے کا دھیان کرتے ہی میرا من نہ جانے کیسا ہو جاتا ہے؟ یہ چوٹ مجھ سے نہ سہی جائے گی''۔

ملیا نے مضحکہ اڑا کر کہا'' تو چوڑیاں پہن کر اندر بیٹھو نہ، لاؤ میں مونچھیں لگالوں۔ میں تو سمجھتی تھی تم میں بھی کچھ کس بل ہے۔ اب دیکھتی ہوں تو نرے مٹی کے لونڈے ہو''۔

پنّا دالان میں کھڑی دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ اب اس سے نہ رہا گیا۔ سامنے آ کر رگھو سے بولی جب وہ الگ ہونے پر تلی ہوئی ہے تو تم کیوں اسے جبردستی ملائے رکھنا چاہتے ہو؟ تم اسے لے کر رہو۔ ہمارے بھگوان مالک ہیں۔ جب مہتو مر گئے تھے اور کہیں روکھ کی بھی چھاؤں نہ تھی جب اس بکھت بھگوان نے پناہ دیا تو اب کیا ڈر؟ اب تو بھگوان کی دیا سے تینوں لڑکے سیانے ہو گئے ہیں۔ اب کوئی چنتا نہیں؟

رگھو نے آنسو بھری آنکھوں سے پنّا کو دیکھ کر کہا'' کاکی تو بھی پگلا گئی ہے کیا۔جانتی نہیں دو روٹیاں ہوتے ہی دو من ہو جاتے ہیں۔

پنّا : جب وہ مانتی ہی نہیں تو تم کیا کروگے؟ بھگوان کی یہی مرجی ہو گی تو کوئی کیا کرے گا؟ پرالبدھ میں جتنے دن ایک ساتھ رہنا لکھا تھا اتنے دن رہے۔ اب اس کی یہی مرجی ہے تو تم کیا کروگے؟ تم نے میرے بال بچوں کے لیے جو کچھ کیا وہ میں بھول نہیں سکتی۔ تم نے ان کے سر پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو آج ان کی نہ جانے کیا گت ہوتی؟ نہ جانے کس کے درواجے پر ٹھوکریں کھاتے ہوتے؟نہ جا نے کہاں کہاں بھیک مانگتے پھرتے۔ تمھارا جس مرتے دم تک گاؤں گی۔ اگر میری کھال تمھارے جوتے بنانے کے کام آئے تو کھوسی سے دے دوں۔ چاہے تم سے الگ ہو جاؤں لیکن جس گھڑی تم پکاروگے کتے کی طرح دوڑی آؤں گی۔ یہ بھول کر بھی مت سوچنا کہ تم سے الگ ہو کر میں تمھارا برا چیتوں گی۔ جس دن تمھارا ان بھل میرے من میں آئے گا اسی دن بِس کھا کر مرجاؤں گی۔ بھگوان کرے تم

دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو، مرتے دم تک یہی آسیس میرے روئیں روئیں سے نکلتی رہے گی۔ اور لڑکے بھی اگر اپنے باپ کے ہیں تو مرتے دم تک تمھارا پوس مانیں گے۔
یہ کہہ کر پنا روتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ رگھو وہیں بت کی طرح کھڑا رہا۔ آسمان کی طرح ٹکٹکی لگی ہوئی تھی اور آنکھوں سے آنسوں جاری تھے۔

(۵)

پنا کی باتیں سن کر ملیا سمجھ گئی کہ اب اپنے پوبارہ ہیں۔ گھر میں جھاڑو لگایا، چولہا جلایا اور کنوئیں سے پانی لانے چلی۔ اس کی ٹیک پوری ہو گئی تھی۔

گاؤں میں عورتوں کے دو فریق ہوتے ہیں۔ ایک بہوؤں کا، دوسرا ساسوں کا۔ بہوئیں مشورے اور ہمدردی کے لیے اپنے فریق سے مخاطب ہوتی ہیں، ساسیں اپنے فریق سے۔ دونوں کی پنچائتیں الگ ہوتی ہیں۔ جارحانہ اور مدافعانہ مسئلے وہیں سوچے جاتے اور طے ہوتے ہیں۔ ملیا کو کنوئیں پر دو تین بہویں مل گئیں۔ ایک نے پوچھا آج تو تمھاری بڑھیا بہت رو دھو رہی تھی۔

ملیا نے فاتحانہ مسرت سے کہا'' اتنے دنوں سے گھر کی مالکن بنی ہوئی ہیں، راج پاٹ چھوڑتے کسے اچھا لگتا ہے۔ بہن میں ان کا برا نہیں چاہتی لیکن ایک آدمی کی کمائی میں کہاں تک برکت ہوگی؟ میرے بھی تو کھانے، پینے، پہننے اوڑھنے کے دن ہیں، ابھی ان کے پیچھے مرو، پھر بال بچے ہو جائیں ان کے پیچھے مرو۔ ساری زندگی روتے ہی کٹ جائے۔

بہو : بڑھیاں یہی چاہتی ہے کہ یہ سب جنم بھر لونڈی بنی رہیں۔ موٹا جھوٹا کھائیں اور پڑی رہیں۔

دوسری بہو : کس بھروسے پر کوئی مرے۔ اپنے لڑکے تو بات نہیں پوچھتے، پرائے لڑکوں کا کیا بھروسا۔ کل ان کے ہاتھ پیر ہو جائیں گے پھر کون پوچھتا ہے؟ اپنی اپنی مہریوں کا منھ دیکھیں گے۔ پہلے ہی سے پھٹکار دینا اچھا ہے۔ پھر تو کوئی کلک نہ ہوگا۔

تیسری بہو : بڑھیا کے رونے دھونے میں نہ آ جانا نہیں پھر وہی چھیچھا لیدر ہو گی۔

ملیا پانی لے کر گئی۔ ایک دوسرا چولہا نکال کر جلایا۔ روٹیاں بنائیں اور رگھو سے بولی۔ جاؤ نہا آؤ، روٹی تیار ہے۔

رگھو نے گویا سنا ہی نہیں۔ سر پر ہاتھ رکھے دروازہ کی طرف تاکتا رہا۔

ملیا : کیا کہتی ہوں کچھ سنائی دیتا ہے۔ سویرا نہیں ہے۔ بارہ بج رہے ہیں۔

رگھو : سن تو رہا ہوں۔ کیا بہرا ہوں؟ روٹی تیار ہے تو جا کر کھالے۔ مجھے بھوکھ نہیں ہے۔

ملیا نے دوبارہ کچھ نہ کہا۔ جا کر چولھا بجھا دیا۔ روٹیاں اٹھا کر چھینکے پر رکھ دیں اور منھ ڈھانپ کر لیٹ رہی۔ یہ فاقے کا تیسرا دن تھا۔

ذرا دیر میں پنا نے آ کر رگھو سے کہا " کھانا تو تیار ہے بھیا، نہا دھو کر کھالو۔ بہو تین دن کی بھوکھی ہے"۔

رگھو نے جھنجھلا کر کہا" کا کی تو گھر میں رہنے دے گی کہ منھ میں کالک لگا کر کہیں نکل جاؤں۔ کھانا تو کھانا ہی ہے آج نہ کھاؤں گا کل کھاؤں گا۔ پیٹ پر بھی کوئی بس ہے۔ لیکن ابھی مجھ سے نہ کھایا جائے گا۔ کہاں ہیں لڑکے؟ دکھائی نہیں دیتے۔ انھیں تو کھلا پلا دے۔

پنا کے لیے اب چولہا جلانا لازم ہو گیا۔ جب تک وہ کھانا بنا کر لڑکوں کو نہ کھلائے گی خود نہ کھائے گی، رگھو ہرگز نہ کھائے گا۔ اتنا ہی نہیں اسے رگھو سے بیر مول لینا پڑے گا۔ اسے طعنے سے چھیدنا پڑے گا۔ اس کے دل میں جلی کٹی باتوں سے مغائرت کا بیج بونا پڑے گا۔ اس کے بغیر گذارے کی کوئی صورت نہیں۔ ورنہ غیرت مند رگھو یوں ہی فاقے کرتے کرتے ایک دن بیمار ہو جائے گا اور شاید جان پر کھیل جائے۔ یہ سوانگ بھرتے ہوئے پنا کو روحانی عذاب ہو رہا تھا۔ اس کے منھ سے رگھو کے لیے گالیاں کیسے نکلیں گی؟ وہ کیسے اسے کوسنے دے گی؟ کیسے اسے جلائے گی؟ بڑا مشکل معاملہ تھا۔ رگھو اسے کتنی بے وفا، کتنی بے مروت، کتنی بے رحم سمجھے گا؟ مگر اور کوئی تدبیر نہ تھی۔ یہ سوچ کر اس نے چولہا جلایا۔ کھانا بنایا۔ کیدار اور کھنو مدرسے سے آگئے تھے۔ پنا نے انھیں کھانے کو بلایا۔ کیدار بولا " بھیا نے تو ابھی کھایا ہی نہیں"۔

پنّا نے آنکھیں چرا کر کہا۔" وہ اب تمھارے ساتھ نہ کھائیں گے دیکھتے نہیں ہو ملیا مہنا متھ مچائے ہوئے ہے۔

کیدار : بھیا اسے ڈانٹتے کیوں نہیں؟

پنّا : ڈانٹا تو بہت مگر وہ مانتی ہی نہیں تو کیا کریں؟ ابھی تک منہ میں پانی نہیں ڈالا ہے۔

کھنو : تو کیوں اماں ہم لوگ الگ گھر میں رہیں گے؟

پنّا : چپ چاپ بیٹھ کر کھا۔ بک بک مت کر۔

لڑکوں نے کھانا کھا لیا تو پنّا کھانے بیٹھی لیکن لقمہ حلق کے نیچے نہ اترتا تھا۔ لڑکوں کو دکھانے کے لیے اس نے بڑی مشکل سے دو چار لقمے پانی کے زور سے اتارے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ آج کئی برسوں کے بعد ایسا ہوا کہ اس نے رگھو کو کھلائے بغیر خود کھایا چاہے کھانے کا بہانہ ہی نہ کیا ہو۔ پھر باہر آکر رگھو سے بولی تم جا کر کھاتے کیوں نہیں؟ کیا ہمارے اوپر جان دوگے؟

رگھو نے خطا وار نظروں سے دیکھ کر کہا" لڑکے کھا چکے"۔

پنّا : میرے لڑکوں کو کچھ کہو گے تو کہے دیتی ہوں۔ یہاں تمھاری پرواہ نہیں ہے۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی۔ تم روٹھوگے تو میرا کیا بگڑ جائے گا۔ اپنے پسینہ کی کمائی کھاتی ہوں کچھ تمھارا دیا نہیں کھاتی۔ رگھو نے حیرت کی نگاہ سے دیکھا۔ پنّا اس قدر گرم کیوں ہو رہی ہے؟ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ بولا۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا کاکی۔

پنّا : تو مجھ سے کیا کہے گا؟ کیا میں تیری دبیل ہوں؟ یہاں تو بھگوان کے دیے چار چار لڑکے ہیں۔

لڑکے کھانا کھا کر باہر نکلے تھے۔ سامنے باغ میں ہوا کے جھونکوں سے آم گر رہے تھے۔ گاؤں کے لڑکے درختوں کے نیچے جمع تھے۔ آم گرتے ہی کئی کئی ساتھ دوڑتے تھے۔ ایک پاتا تھا۔ باقی شرمندہ ہو جاتے تھے۔ لو چل رہی تھی۔ بدن جھلسا جاتا تھا۔ مگر آم کی دھن میں کسی بات کی سدھ نہ تھی۔ کیدار اور اس کے بھائی للچائی ہوئی نظروں سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہیں

بھیا ڈانٹ نہ بیٹھیں یہ دھڑکا لگا ہوا تھا۔ لیکن جب پنّا اور رگھو میں جھگڑا ہونے لگا تو انھوں نے سمجھ لیا اب علاحدگی پوری ہو گئی پھر بھیا کا کیا خوف؟

کیدار بولا: کھنو چلو آم مار لائیں خوب گر رہے ہیں۔

کھنو : دادا جو بیٹھے ہیں۔

کیدار : دادا تو الگ ہو گیے۔ اب ان سے کیا مطلب؟

کھنو : نہ بھائی میں نہ جاؤں گا۔

بچھمن نے متانت سے کہا ''تو اب ہم کو کوئی مارے گا تب بھی دادا نہ بولیں گے؟

کیدار : واہ تب کیوں نہ بولیں گے؟

یہ کہتا ہوا کیدار چپکے سے باغ کی طرف کھسکا۔ اس کی جرات دیکھ کر کھنو اور بچھمن کی ہمت بھی بندھی۔ وہ بھی سرک گئے۔

یکا یک رگھو کی نگاہ ان پر پڑگئی۔ پنّا کا وہ کٹار کا سا تیز وار اسے یاد نہ رہا۔ بولا ''دیکھ لڑکے باغ میں جا رہے ہیں۔ لو چل رہی ہے''۔

پنّا : اب ان کا کون پچھتر ۔ باگ میں جائیں، پیڑ پر چڑھیں، ندی میں ڈوبیں، تم سے مطلب۔ پنّا کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ رگھو نے ناریل کھمبے سے لگا کر رکھ دیا اور باغ کی طرف دوڑا۔

(۶)

رگھو لڑکوں کو لے کر باغ سے لوٹا تو ملیا جھونپڑے میں کھڑی تھی۔ بولی ''اب کھانے چلتے ہو کہ اب بھی نہیں۔ رگھو نے جھنجھلا کر کہا '' کھانا کہیں بھاگا جاتا ہے۔ ایک وقت نہ کھاؤں گا تو کون مرا جاتا ہوں؟ کیا تو سمجھتی ہے آج گھر میں چھوٹی بات ہو گئی ہے؟ تو نے گھر میں چولہا نہیں جلایا میرے کلیجے میں آگ لگائی ہے۔ مجھے گھمنڈ تھا اور چا ہے کچھ ہو جاوے مگر میرے گھر میں پھوٹ کا روگ نہ آنے پائے گا۔ پر تو نے میرا گھمنڈ چور چور کر دیا اور تجھے کیوں الجام دوں؟ پرالبدھ کی بات ہے۔

ملیا : ہاں ہاں سن تو چکی۔ جن کے نام پر تم دانہ پانی چھوڑے بیٹھے ہو انھوں نے مجھ سے لڑکوں کو کھلایا، آپ کھایا اور اب چین کر رہی ہیں۔ تم ان پر جان دیتے ہو وہ بات بھی نہیں پوچھتیں۔ مور پیا بات نہ پوچھیں مور سہاگن ناؤں۔

رگھو نے ایک ٹھنڈی آہ کھینچ کر کہا '' گھاؤ پر نمک نہ چھڑک ملیا۔ مجھے چپ چاپ پڑا رہنے دے۔ تیرے کارن ہی آج کاکی بھی مجھے گھڑکیاں سنا گئی ہے۔ سب پرالبدھ کی بات ہے۔ جن چیزوں کو میں اپنی سمجھتا تھا وہ اب میری نہ رہیں گی۔ سامنے وہ ہرے بھرے پودھے دیکھتی ہے وہ مرے ہی لگائے ہوئے ہیں۔ مگر اب کوئی ان پر کلہاڑی بھی چلائے تو میں نہیں بول سکتا۔ اب کھیتوں میں مینڈھیں پڑ جائیں گی، گھر میں دیوار کھینچ جائیں گی، بیل بدھیے بٹ جائیں گے۔ نہ جا نے کون کون سی درگت سہنی پڑے گی؟ جن کو گود میں کھلایا انھیں سے اب لاگ ڈانٹ کرنی پڑے گی، ان کے منھ سے روٹیاں چھین کر کھانی پڑے گی۔ یہ سب گرہستی میں نے جوڑی تھی اور آج اپنے ہی ہاتھوں اپنی ہی لگائی ہوئی کھیتی اجاڑنی پڑے گی۔ جا مجھے چھوڑ دے۔ ابھی مجھ سے کچھ نہ کھایا جائے گا۔

ملیا : میں کسم رکھا دوں گی۔ نہیں چپکے سے چلے چلو۔

رگھو : دیکھ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ اپنی ضد چھوڑ دے۔

ملیا : ہمارا ہی لہو پیے جو کھانے نہ اٹھے۔

رگھو نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا یہ تو نے کیا، کیا ملیا؟ میں تو اٹھ ہی رہا تھا۔ چل کھالوں۔ نہانے دھونے کون جاتا ہے ؟ دیر ہو گئی ہے۔ لیکن کہے دیتا ہوں کہ چاہے چار کی جگہ چھ روٹیاں کھا جاؤں، چاہے تو مجھے گھی کے مٹکے میں ڈبو دے پر یہ داگ میرے دل سے نہ مٹے گا۔

ملیا : داگ واگ سب مٹ جائے گا۔ پہلے سب کو ایسا ہی لگتا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو ادھر کیسی چین کی بنسی بج رہی ہے ؟ وہ تو منا رہی تھیں کہ کسی طرح یہ سب الگ ہو جائیں؟ اب وہ پہلے کی سی چاندی تو نہیں ہے کہ جو کچھ گھر میں آیا سب گائب۔ اب کیوں ساتھ رہنے لگیں؟ چین سے بنایا کھایا۔ ایک بار چھوٹے منھ سے بھی کہا آؤ بھیا کھالو۔

رگھو نے حسرت ناک لہجہ میں کہا" اسی کا تو مجھے گم ہے۔ کاکی سے مجھے ایسی آسا نہیں تھی۔

رگھو کھانے بیٹھا تو لقمے زہر کے گھونٹ سے لگتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا روٹیاں بھوسی کی ہیں۔ کوئی مزہ ہی نہیں۔ دال بالکل پانی سی لگتی تھی، پانی بھی حلق کے نیچے نہ اترتا تھا۔ دودھ کی طرف دیکھا تک نہیں۔ دو چار لقمے کھا کر چلا آیا جیسے کسی عزیز کا ماتم کر کے لوٹا ہو۔

اس گھر پر آج نحوست برس رہی تھی۔ اس کی دیواریں کتنی بوسیدہ ہو گئی تھیں؟ دروازہ کتنا چھوٹا ہو گیا ہے گویا کوئی سایۂ غم اس گھر پر چھا گیا ہو۔ گویا کسی کی روح ماتم کر رہی ہو۔

رات کا کھانا بھی اسی طرح کھایا کیا قسم پوری کی۔ مگر رات بھر اس کا دل بے چین رہا۔ ایک نامعلوم دہشت اس کے دل پر مسلط ہو رہی تھی۔ جیسے بھولا دروازہ پر بیٹھا بسور رہا ہو۔ وہ بار بار چونک کر اٹھا۔ بھولا اس کی طرف تیز حقارت آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ دونوں وقت کھانا کھاتا تھا پر جیسے دشمن کے گھر۔ بھولا کی ماتم کناں تصویر اس کی آنکھوں سے نہ اترتی تھی۔راتوں کو اسے نیند نہ آتی۔ وہ گاؤں میں نکلتا تو اس طرح منھ چرائے، سر جھکائے گویا گئوہتیا کی ہو۔

(۷)

پانچ سال گذر گئے۔ رگھو اب دو لڑکوں کا باپ تھا۔ آنگن میں دیوار کھینچ گئی تھی۔ کھیتوں میں مینڈیں ڈال دی گئی تھیں۔ مویشی تقسیم کر لیے گیے تھے۔ کیدار کی عمر اب سولہ سال کی ہو گئی تھی۔ اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا اور اب کھیتی کا کام کرتا تھا۔ کھنو ابھی پرائیوٹ امتحان دینا چاہتا تھا۔ پر پڑھنا اس کا بھی چھوٹ چکا تھا۔ صرف چھمن اب تک مدر سے جاتا تھا۔ پنّا اور ملیا دونوں ایک دوسرے کی صورت سے جلتی تھیں۔ مگر ملیا کے دونوں لڑکے اکثر پنّا ہی کے پاس رہتے تھے۔ وہی انھیں ابٹن ملتی، وہی کاجل لگاتی، وہی گود میں لیے لیے پھرتی۔ ان خدمتوں کے صلہ میں

ملیا کی زبان پر شکریہ کا ایک لفظ بھی نہ تھا۔نہ پتا اس کی طالب تھی۔ وہ جو کچھ کرتی تھی بے غرض کرتی تھی۔ اس کے اب دو دو لڑکے کام کرنے والے تھے۔ لڑکی کھانا پکا لیتی تھی وہ خود اوپر کا کام کاج کرتی تھی۔ اس کے برعکس رگھو اپنے گھر کا اکیلا تھا۔ وہ بھی نیم جاں، شکستہ حال، قبل ازوقت بوڑھا، ابھی تیس سال بھی عمر نہ تھی لیکن بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ کمر جھک چلی تھی۔ کھانسی بھی آنے لگی تھی۔ یاس و ناکامی کی زندہ تصویر۔ کھیتی پسینہ کی ہے۔ وہ ٹھہرا اکیلا۔ کھیتوں کی خدمت جیسی چاہیے نہ ہوتی تھی۔اچھی فصل کہاں سے آتی۔ کچھ مقروض بھی ہو گیا تھا۔ یہ فکر اور بھی مارے ڈالتی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اب اسے کچھ آرام ملتا۔ اتنے دنوں کی شبانہ روز مشقت کے بعد اب بار کچھ ہلکا ہوتا لیکن ملیا کی خود غرضی اور ناعاقبت اندیشی نے لہراتی ہوئی کھیتی میں آگ لگا دی۔ اگر سب ساتھ ہوتے تو وہ اس وقت پنشن پاتا۔ مزے سے دروازے پر بیٹھا ناریل پیتا۔ بھائی کام کرتے وہ صلاح بتاتا۔ مگر وہ موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ اب تو فکروں کا ہجوم روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ آخر اسے دھیما دھیما بخار رہنے لگا۔ پہلے کچھ پروا نہ کی۔ سمجھا آپ ہی آپ اچھا ہو جائے گا۔ مگر جب کمزوری بڑھنے لگی تو دوا کی فکر ہوئی۔ جس نے جو بتایا وہ کھالیا۔ ڈاکٹروں یا ویدوں کے پاس جانے کی توفیق کہاں؟ اور ہوتی بھی توروپئے خرچ کر دینے کے سوا اور نتیجہ ہی کیا تھا؟ تپ کہنہ کا علاج ہی کیا تھا؟نہ وہ بسنت مالتی کا سیون کر سکتا تھا اور نہ کامل آرام و سکون کے ساتھ مقوی غذائیں کھا سکتا تھا۔ ضعف بڑھتا گیا۔ پنّا اب بھی موقع پاتی تو اس کو تشفی دیتی تھی لیکن اس کے لڑکے اب رگھو سے بات بھی نہ کر تے تھے۔ دوا دارو تو کیا کرتے؟ اس کا اور مذاق اڑاتے۔ بھیا سمجھتے تھے ہم لوگوں سے الگ ہو کر سونے کی اینٹ رکھ لیں گے۔ بھابی بھی سمجھتی تھیں سونے سے لد جاؤں گی۔ اب جان سے مر رہے ہیں۔ دیکھیں کون پوچھتا ہے؟ بہت ہائے ہائے بھی اچھا نہیں ہوتا۔ آدمی کام اتنا ہی کرے جتنا ہو سکے۔ یہ نہیں کہ روپیہ کے لیے جان ہی دے دے۔ رگھو کا قصور انھوں نے اب تک معاف نہ کیا تھا۔ کیدار ماں کے سمجھانے پر جواب دیتا۔ چل میں کھوب سمجھتا ہوں۔ ان کی جگہ میں ہوتا تو ڈنڈے سے بات کرتا، مجال تھی کہ عورت یوں جد

کرتی۔ یہ سب بھیا کی چال تھی۔ سب سدھی بدی تھی۔

آخر ایک دن رگھو کی ٹمٹماتی ہوئی شمع حیات بجھ گئی۔ موت نے ساری فکروں کا خاتمہ کر دیا۔

(۸)

ملیا کے لیے اب زندگی تاریک ہوگئی۔ اس کا غرور پامال ہو گیا۔ جس زمین پر اس نے اپنے منصوبوں کی دیوار کھڑی کی تھی وہ نیچے سے کھسک گئی تھی۔جس کھونٹے کے بل پر وہ اچھل رہی تھی وہ اکھڑ گیا تھا۔ بچاری دونوں لڑکوں کو لیے رویا کرتی۔ گاؤں میں کسی کو منھ دکھانے کی ہمت نہ ہوتی ہر ایک شخص اس سے یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ گھمنڈ کے مارے پاؤں زمین پر نہ رکھتی تھی۔ آخر مل گئی سزا کہ نہیں؟ اب اس گھر میں کیسے نباہ ہوگا؟ وہ کس کے سہارے رہے گی؟ کس کے بل پر کھیتی ہو گی؟ بے چارہ رگھو بیمار تھا، نیم جاں تھا مگر جب تک رہا اپنا کام کرتا رہا۔ ضعیف کے مارے اکثر سر پکڑ کر بیٹھ جاتا اور ذرا دیر دم لے کر پھر ہاتھ چلانے لگتا۔ اب کون کھیتی سنبھالے گا؟ سارے کام پھیلے پڑے تھے۔ اناج کی ڈاٹھیں کھلیان میں پڑی تھیں۔ اوکھ الگ سوکھ رہی تھی۔ وہ اکیلی کیا کیا کرے گی؟ پھر سینچائی اکیلے آدمی کا تو کام نہیں۔ تین آدمی درکار ہوں گے۔ مزدوروں سے کام لے تو مزدوری کہاں سے لائے؟ پھر اس وقت مزدور ملنے مشکل۔ آدمیوں کے لیے کھینچا تانی ہو رہی تھی۔ کیا کرے کیا نہ کرے؟ لیکن اب بھی اسے اپنے الگ ہونے کا پچھتاوا نہ تھا۔ کم سے کم اب کھیت تو اپنے تھے۔ تب تو شاید حصہ بھی نہ ملتا۔ سب کی لونڈی بن کر رہنا پڑتا۔

اس طرح تیرہ دن گذر گئے۔ کریا کرم سے فراغت ہوئی۔ دوسرے دن اس نے علی الصباح دونوں بچوں کو گود میں اٹھایا اور اناج مانڑنے چلی۔ کھلیان میں پہنچ کر اس نے ایک کو تو درخت کے نیچے گھاس کے نرم بچھاون پر سلا دیا اور دوسرے کو وہیں بٹھا کر اناج مانڑنے لگی۔ بیلوں کو ہانکتی تھی اور روتی تھی۔ کیا اسی لیے بھگوان نے اسے جنم دیا تھا؟ دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہو گیا؟ انھیں دنوں پچھلے سال

بھی اناج مانڑا گیا تھا وہ رگھو کے لیے لوٹے میں شربت اور مٹر کا چبینہ لے کر آتی تھی۔ آج کوئی اس کے آگے ہے نہ پیچھے۔ یکایک بچہ کا رونا سن کر اس نے ادھر تاکا تو بڑا لڑکا کہہ رہا تھا بیا تُپ رہو۔ تُپ رہو۔ دھیرے دھیرے اس کے منھ ہاتھ پھیرتا تھا۔ پھر خود لیٹ کر اس کے سینہ سے لپٹ گیا۔ اسے اٹھانے کی طاقت نہ تھی بھیا کو کیسے چپ کرے۔ جب یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی تو اس نے بھی رونا شروع کر دیا۔

اسی وقت پنّا دوڑی ہوئی آئی اور چھوٹے بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کرتی ہوئی بولی ''لڑکوں کو مجھے کیوں نہ دے آئیں بہو؟ ہائے ہائے بچارہ دھرتی پر پڑا لوٹ رہا ہے۔ جب میں مرجاؤں تو جو چاہے کرنا۔ ابھی تو میں جیتی ہوں الگ ہو جانے سے بچّے تو نہیں پرائے ہو گئے۔

ملیا نے کہا '' تمھیں بھی چھٹی نہیں تھی اماں'' کیا کرتی؟

پنّا : تو تیرے یہاں آنے کی جلدی کیا تھی؟ ڈانٹھ مانڑ نہ جاتی۔ تین تین لڑکے تو ہیں اور کس دن کام آئیں گے؟ کیدار تو کل ہی مانڑنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا پہلے اوکھ میں پانی دے لو تب اناج مانڑلینا۔ مڑائی تو دس دن بعد بھی ہو سکتی ہے۔ اوکھ کی سنچائی نہ ہوئی تو سوکھ جائے گی۔ کل سے اوکھ میں پانی چڑھا ہوا ہے۔ پرسوں تک کھیت پر جائیں گے۔ تب مڑائی بھی ہوجائے گی۔ تجھے وسواس نہ آئے گا جب سے بھیا مرے ہیں کیدار کو بڑی چنتا ہو گئی ہے۔ سو سو بار پوچھتا ہے۔ بھابی بہت روتی تو نہیں ہیں۔ دیکھ لڑکے بھوکھے تو نہیں ہیں؟ کوئی لڑکا روتا ہے تو دوڑا آتا ہے دیکھ اماں کیا ہوا؟ بچہ کیوں روتا ہے؟ کل رو کر بولا'' اماں میں جانتا کہ بھیا نہ رہیں گے تو ان کی کچھ سیوا کر لیتا۔ کہاں جگائے جگائے اٹھتا تھا اب پہر رات سے اٹھ کر کام میں لگ جاتا ہے۔ کھنوا کل جرا سا بولا ہم اپنی اوکھ میں پانی دے لیں گے تب بھیا کی اوکھ میں دیں گے۔ اس پر کیدار نے اسے ایسا ڈانٹا کہ کھنکوا کے منھ سے پھر بات نہ نکلی۔ بولا کیسی تمھاری اور کیسی ہماری اوکھ۔ بھیا نے جلا نہ لیا ہوتا تو آج یا تو مر گئے ہوتے یا کہیں بھیک مانگتے ہوتے۔ آج تم بڑے اوکھ والے بنے ہو۔ یہ انھیں کا پُن پرتاپ ہے کہ آج بھلے بنے بیٹھے ہو۔ پرسوں

گئی تو منڈیا میں چپ چاپ بیٹھا رو رہا تھا۔ پوچھا کیوں روتا ہے؟ تو بولا ''اماں بھیا اسی الگوجھے کے دکھ سے مرگئے۔ نہیں ابھی ان کی امر ہی کیا تھی؟ یہ اس بکھت نہ سو جھتا تھا نہیں کیوں ان سے بگاڑ کرتے؟ تمھیں اب وہ الگ نہ رہنے دے گا بہو۔ کہتا ہے بھیا ہمارے لیے مر گئے تو ہم بھی ان کے بال بچوں کے لیے مر جائیں گے۔

ملیا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور دل احسان کے بوجھ سے دبا جاتا تھا۔ جن سے اسے طعنہ اور انتقام کا خوف تھا وہ اتنے مہربان اور غمگسار ہو گئے تھے۔ آج پہلی بار اس کا دل علاحدگی پر نادم ہوا۔ پنّا کی فراخ دلی کے مقابلہ میں اپنی تنگ خیالی کتنی افسوسناک تھی؟

(۹)

اس واقعہ کو پانچ سال گذر گئے۔ پنّا اب بوڑھی ہو گئی ہے۔ کیدار گھر کا مالک ہے۔ ملیا گھر کی مالکن ہے۔ کھنو اور لچھمن کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ مگر کیدار ابھی تک کنوارا ہے۔ کہتا ہے میں شادی نہ کروں گا۔ کئی جگہوں سے بات چیت ہوئی۔ کئی سگائیاں آئیں مگر کیدار نے حامی نہ بھری۔ پنّا نے کمپے لگائے، جال پھیلائے پر وہ نہ پھنسا۔ کہتا عورتوں سے کون سکھ، مہریا گھر میں آئی اور آدمی کا مجاج بدلا۔ پھر جو کچھ ہے وہ مہریاہے۔ ماں، باپ، بھائی بند سب بے گانے ہو گیے۔ کوئی اپنا ہے تو وہ مہریا ہے۔ جب بھیا جیسے آدمی کا مجاج بدل گیا تو پھر دوسروں کی کیا گنتی؟ دو لڑکے بھگوان نے دے دیے ہیں اور کیا چاہیے؟ بنا بیاہ ہوئے دو لڑکے مل گئے جسے اپنا سمجھو وہ اپنا ہے، جسے گیر سمجھو وہ گیرہے۔

ایک دن پنّا نے کہا تو بیاہ نہ کرے گا تو تیرا بنس کیسے چلے گا؟

کیدار : میرا بنس تو چل رہا ہے۔ دونوں لڑکوں کو اپنا ہی سمجھتا ہوں۔

پنّا : سمجھنے ہی پر ہے تو تو نے ملیا کو اپنی مہریا سمجھا ہو گا۔

کیدار نے جھینپتے ہوئے کہا۔ تم تو گالی دیتی ہو اماں۔

پنّا : گالی کیسی؟ تیری بھابی ہی تو ہوتی ہے۔

کیدار : میرے جیسے لٹھ گنوار کو وہ کیوں پوچھنے لگی؟
پنّا : تو کرنے کو کہہ تو میں اس سے پوچھوں۔
کیدار : نہیں اماں۔ کہیں رونے گانے نہ لگے۔ مانے گی نہیں۔
پنّا : تیرا من ہو تو میں باتوں باتوں میں اس سے پوچھوں۔
کیدار : میں نہیں جانتا۔ جو چاہے کر۔

پنّا کیدار کے دل کی بات سمجھ گئی۔ لڑکے کا دل حسین ملیا پر آیا ہوا ہے پر شرم اور خوف اور لحاظ سے کچھ نہیں کہتا۔ اسی دن اس نے ملیا سے کہا ''کیا کروں بہو من کی لالسا من ہی میں رہی جاتی ہے۔ کیدار کا گھر بھی بس جاتا تو میں نسچنت ہوجاتی۔

ملیا : وہ تو کرنے ہی نہیں کہتے۔
پنّا : کہتا ہے ایسی عورت ملے جو گھر میں میل سے رہے تو کر لوں۔
ملیا : ایسی عورت کہاں ملے گی؟ کہیں ڈھونڈھو۔
پنّا : میں نے تو ڈھونڈھ لیا ہے۔
ملیا : سچ، کس گاؤں کی ہے؟
پنّا : ابھی نہ بتاؤں گی۔ مُدا یہ جانتی ہوں کہ اس سے کیدار کی سگائی ہوجائے تو گھر بن جائے اور کیدار کی زندگی بھی پھل جائے۔ نہ جانے لڑکی مانے گی کہ نہیں؟
ملیا : مانے گی کیوں نہیں اماں؟ ایسا سندر کماؤ برادر کہاں ملاجاتا ہے؟ اس جنم کا کوئی سادھو مہاتما ہے۔ نہیں تو لڑائی جھگڑے کے ڈر سے کون ایسا کرتا ہے؟ کہاں رہتی ہے؟ میں جا کر اسے منا لاؤں۔
پنّا : بتادوں! وہ تو ہی ہے۔

ملیا شرما کر بولی'' تم تو اما جی گالی دیتی ہو''۔

پنّا : گالی کیسی؟ دیور ہی تو ہے۔
ملیا : بھلا مجھ جیسی بڑھیا کو وہ کیوں پوچھیں گے؟
پنّا : وہ تجھی پر دانٹ لگائے بیٹھا ہے۔ تیرے سوا کوئی اور عورت اسے بھائی ہی نہیں۔ ڈر کے مارے کہتا نہیں پر اس کے من کی بات میں جانتی ہوں۔ تجھے پا کر وہ پھولا نہ سمائے گا۔

بیوگی کے غم سے مرجھائی ہوئی ملیا کا زرد چہرہ کنول کی طرح سرخ ہو گیا۔ دس سال میں جو کچھ کھویا تھا وہ ایک لمحہ میں سود کے ساتھ مل گیا۔ وہی تازگی، وہی شگفتگی، وہی ملاحت، وہی دلکشی۔

ملیا کو ایسا معلوم ہوا رگھو سامنے کھڑا اسے دعائیں دے رہا ہے۔

یہ افسانہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری کے اکتوبر 1929 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا الگوجھا۔ یہ مانسروور نمبر ایک میں شامل ہے۔ اردو میں یہ کانپور کے ماہنامہ زمانہ کے فروری 1930 کے شمارے میں شائع ہوا۔ خاک پروانہ میں شامل ہے۔

غمی

مجھے جب کوئی کام جیسے بچوں کو کھِلانا، تاش کھیلنا، ہار مونیم بجانا، سڑک پر آنے جانے والوں کو دیکھنا نہیں ہوتا تو اخبار اُلٹ لیا کرتا ہوں۔ اخباروں میں پہلے ان مقدموں کی رپورٹ پڑھتا ہوں، جس میں کسی استری کی چرچا ہوتی ہے، جیسے آشنائی کے یا بھگالے جانے کے، یا طلاق کی یا بلاتکار کے۔ وِشیش کر بلاتکار کے مقدمے میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں، تنمے ہو جاتا ہوں۔

کل سنیوگ سے اخبار میں ایسا ہی ایک مقدمہ مل گیا۔ میں سنبھل گیا۔ تابع دار سے چلم بھر وائی اور گھڑی دو گھڑی اَسیم آنند کی کلپنا کر کے اخبار پڑھنے لگا۔

یکا یک کسی نے پُکارا، ''بابو جی''۔

مجھے یہ مداخلت بے جا، بُری تو لگی، لیکن کبھی کبھی اسی طرح نمنترن بھی آجایا کرتے ہیں۔ اس لیے میں نے کمرے کے باہر آکر آدمی سے پوچھا، ''کیا کام ہے مجھ سے؟ کہاں سے آیا ہے؟''

اُس آدمی کے ہاتھ میں نہ کوئی نمنترن پتر تھا، نہ نمنترِت سجّنوں کی ناماولی۔ اس سے میرا کرودھ اور دہک اٹھا۔ میں نے انگریزی میں دو چار گالیاں دیں اور اس کی جواب کی اپیکشا کرنے لگا۔

آدمی نے کہا، ''بابو بھگی رتھ پرساد کے گھر سے آیاہوں۔ ان کے گھر میں غمی ہوگئی ہے''۔

میں نے چنتت ہو کر پوچھا، ''کون مر گیا ہے؟''

آدمی: حضور، یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ بس اتنا ہی کہا ہے کہ غمی کی سوچنا دے آ''۔

یہ کہہ کر وہ چلتا بنا اور میرے من میں بھرانتی کا طوفان چھوڑ گیا۔ کون مر گیا۔ استری تو بیمار نہ تھی نہ کوئی بچہ ہی بیمار تھا۔ پھر مر کون گیا؟ اچھا سمجھ گیا۔ استری کا بال بچہ ہونے والا تھا۔ اسی میں کچھ گول مال ہوگیا ہوگا۔ بے چاری مرگئی ہوگی۔ گھر اُجڑ گیا۔

کئی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ کون انھیں پالے گا؟ اور تو اور اس جاڑے پالے میں ندی جانا اور وہ بھی ننگے پیر اور رات کو ندی میں اسنان۔ اس کی مِرتیو کیا ہوئی ہماری مرتیو ہوئی۔ یہاں تو ہوا سے زکام ہوا کرتا ہے، رات کو نہانا تو موت کے منھ میں جانا ہے۔

اس سوچ میں کئی منٹ موڑھ بنا کھڑا رہا۔ پھر گھر میں جاکر کپڑے اُتارے، دھوتی لی اور ننگے پاؤں چلا۔ بھگی رتھ پرساد کے گھر پہنچا تو چراغ جل گئے تھے۔ دُوار پر کئی آدمی میری ہی طرح دھوتیاں لیے ایک تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔

میں نے پوچھا، ''آپ لوگوں کو تو معلوم ہوگا کون مر گیا ہے؟''

ایک مہاشے بولے، ''جی نہیں۔ نائی نے تو اتنا ہی کہا تھا، غمی ہو گئی ہے۔ شاید استری کا دیہانت ہو گیاہے۔ بھگی رتھ لال کو بُلانا چاہیے۔ دیر کیوں کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں، کفن منگوالیا ہے یا نہیں۔ ابھی تو کہیں بانس پھانس کا بھی پتہ نہیں۔ ساری رات مرن ہے۔''

میں نے دُوار پر جاکر پُکارا، ''کہاں ہو بھائی، کیا ہم لوگ اندر آجائیں؟ چارپائی سے تو اُتار لیا ہے نہ''۔

بھگی رتھ پرساد ایک منٹ میں پان اور الائچی کی طشتری لی، فلالین کا کُرتا پہنے پان کھاتے ہوئے باہر نکلے۔ باہر بیٹھی ہوئی شوق منڈلی انھیں دیکھ کر چکِت ہوگئی۔ یہ بات کیا ہے؟ نہ لاش، نہ کفن، نہ رونا، نہ پیٹنا، یہ کیسی غمی ہے؟ آخر میں نے ڈرتے ڈرتے کہا، ''کون یعنی کس کے وِشے میں، یہی آدمی جو آپ نے بھیجا تھا؟ تو کیا دیر ہے؟'' بھگی رتھ نے کُرسی پر بیٹھ کر کہا، ''پہلے آرام سے بیٹھیے، تب

وہ بات ہوگی''۔ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا بات سولہوں آنے ٹھیک ہے؟''

''تو پھر جلدی کیجیے، رات ہوگئی ہے— کون ہے''۔

بھگی رتھ نے اب کی گمبھیر ہو کر کہا، ''وہی جو سب سے پیارا میرا متر، میرے جیون کا آدھار، میرا سروسو، بیٹے سے بھی پیارا، استری سے بھی نکٹ، میرے آنند کی مرتیو ہوگئی۔ ایک بالک کا جنم ہوا، پر میں اسے آنند کا وِشے نہیں، شوک کی بات سمجھتا ہوں۔ آپ لوگ جانتے ہیں میرے دو بالک موجود ہیں۔ انھیں کا پالن میں اچھی طرح نہیں کر پاتا۔ دودھ بھی کبھی نہیں پلا سکتا، پھر اس تیسرے بالک کے جنم پر میں آنند کیسے مناؤں؟ اس نے میرے سکھ اور شانتی میں بڑی بھاری بادھا ڈال دی۔ مجھ میں اتنی سامرتھ نہیں کہ اس کے لیے دائی رکھ سکوں۔ ماں اس کو کھلائے۔ ان کا پالن کرے یا گھر کے دوسرے کام کرے؟ غرض یہ ہوگا کہ مجھے سب کام چھوڑ کر اس کی سوشر دشا کرنی پڑے گی۔ دس پانچ منٹ جو منورنجن یا سیر میں جاتے تھے اب اس کے ستکار کی بھینٹ ہوں گے۔ میں اسے وپتی سمجھتا ہوں۔ اور اس لیے اس جنم کو غمی کہتا ہوں۔ آپ لوگوں کو کشٹ ہوا۔ چھما کیجیے۔ آپ لوگ گنگا اسنان کے لیے تیار ہو کر آئے۔ چلیے۔ میں بھی چلتا ہوں۔ اگر شوک کو کندھے پر رکھ کر چلنا ہی ابھیشٹ ہو تو میرے تاش اور چوسر کو لیتے چلیے۔ انھیں چِتا میں جلا دیں گے۔ وہاں میں گنگا جل ہاتھ سے لے کر پرتیگیا کروں گا کہ اب ایسی مہان مورکھتا پھر نہ کروں گا۔

ہم لوگوں نے خوب قہقہے مارے، دعوت کھائی اور گھر چلے آئے۔ پر بھگی رتھ پرساد کا کتھن ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔

(یہ کہانی متوالہ کلکتہ اگست 1929 میں شائع ہوئی۔ یہ اپراپیہ ساہتیہ میں شامل ہے۔ اردو میں پہلی بار شائع ہو رہی ہے۔)

خانہ داماد

جیٹھ کی دوپہر تھی، ہری دھن ایک کھیت میں پانی دے کر آیا اور باہر بیٹھا رہا۔ گھر میں سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آرہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ کھن کھن کے آواز بھی آرہی تھی۔ اس کے دونوں سالے اس کے بعد آئے اور گھر میں چلے گئے، ان دونوں کے لڑکے بھی آئے اور اسی طرح گھر میں داخل ہوگئے۔ مگر ہری دھن اندر نہ جاسکا۔ ادھر ایک مہینہ سے اس کے یہاں جو برتاؤ ہو رہا تھا اور خصوصاً کل اسے جیسی ڈانٹ سہنی پڑی تھی وہ اس کے پیروں میں بیڑیاں سی ڈالے ہوئے تھی۔ کل اس کی ساس ہی نے تو کہا تھا کہ میرا جی تم سے بھر گیا۔ میں کوئی تمھاری زندگی بھر کا ٹھیکہ لیے بیٹھی ہوں کیا؟ سب سے بڑھ کر اس کی بیوی کے بے دردانہ سلوک نے اس کے دل کو پاش پاش کردیا۔ وہ بیٹھی ہوئی اس ساری ڈانٹ پھٹکار کو سنتی رہی۔ مگر اس کے منہ سے ایک مرتبہ بھی تو نہ نکلا کہ اماں! کیوں ان کی بے عزتی کر رہی ہو؟ چپ چاپ بیٹھی سنتی رہی۔ شاید میری درگت پر وہ خوش ہو رہی تھی، اس گھر میں وہ کیسے جائے۔ کیا پھر وہی گالیاں کھانے۔ وہی دل آزار باتیں سننے کے لیے اور آج اس گھر میں زندگی کے دس سال گذر جانے پر یہ حال ہو رہا ہے۔ کیا میں کسی سے کام کم کرتا ہوں۔ دونوں سالے میٹھی نیند سوتے رہتے ہیں اور میں بیلوں کو چارہ پانی دیتا ہوں۔ چھانٹی کاٹتا ہوں۔ وہاں سب لوگ پل پل پر چلم دیتے ہیں۔ میں آنکھیں بند کیے اپنے کام میں لگا رہتا ہوں۔ شام کو گھر والے گانے بجانے چلے جاتے ہیں۔ میں بڑی رات تک بھینسیں دوہتا رہتا ہوں۔ ان سب

کاموں کے لیے یہ انعام مل رہا ہے کہ کوئی مجھے کھانے کو بھی نہیں پوچھتا۔ الٹی اور گالیاں ملتی ہیں۔ اس کی عورت گھر سے ڈول لے کر نکلی اور بولی" ذرا اسے کنویں سے کھینچ تو لو گھر میں ایک بوند پانی نہیں ہے۔

ہری دھن ڈول لے کر کنویں پر گیا اور پانی بھر لایا۔

اسے زور سے بھوک لگ رہی تھی۔ سمجھا اب کھانے کو بلانے آوے گی مگر عورت ڈول لے کر اندر گئی تو وہیں کی ہوکر رہ گئی۔ ہری دھن تھکا ماندہ بھوک سے بے قرار پڑا پڑا سوگیا۔ دفعتاً اس کی بیوی نے آکر جگایا۔

ہری دھن نے پڑے پڑے کہا "کیا ہے۔ کیا پڑا بھی نہ رہنے دے گی؟ کیا اور پانی چاہیے؟"

گمانی سخت لہجہ میں بولی "غراتے کیوں ہو۔ کھانے کو بلانے آئی ہوں۔"

ہری دھن نے دیکھا اس کے دونوں سالے اور بڑے سالے کے دونوں لڑکے کھانا کھائے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ اس کے بدن میں آگ لگ گئی۔ میری اب یہ نوبت پہنچ گئی کہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھا بھی نہیں سکتا۔ یہ لوگ مالک ہیں میں ان کی جھوٹی پتیلی چاٹنے والا ہوں، میں ان کا کتا ہوں، جسے کھانے کے بعد روٹی کا ٹکڑا پھینک دیا جاتا ہے۔ یہی گھر ہے جس میں آج سے دس برس پہلے اس کی کتنی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ سالے غلام بنے رہتے تھے۔ بیوی پوجا کرتی تھی تب اس کے پاس روپیہ تھا جائیداد تھی۔ اب وہ مفلس ہے اس کی ساری جائیداد کو ان ہی لوگوں نے تو برباد کردیا۔ اب اسے روٹیوں کے بھی لالے پڑے ہیں۔ اس کے دل میں ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا کہ اسی وقت اندر جاکر ساس اور سالوں کو خوب لعنت ملامت کرے مگر ضبط کر کے رہ گیا۔ پڑے پڑے بولا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے، نہیں کھاؤں گا۔"

گمانی نے کہا "نہ کھاؤ گے میری بلا سے! ہاں نہیں تو، کھاؤ گے تو تمھارے ہی پیٹ میں جائے گا کچھ میرے پیٹ میں تھوڑا چلا جائے گا۔"

ہری دھن کا غصہ آنسو بن گیا۔ یہ میری بیوی ہے جس کے لیے میں نے سب کچھ سواہا کردیا۔ مجھے الو بنا کر یہ سب لوگ نکال دینا چاہتے ہیں۔ وہ اب

کہاں جائے کیا کرے۔اس کی ساس آکر بولی ''چل کر کھا کیوں نہیں لیتے جی۔ روٹھتے کس سے ہو؟ یہاں تمھارے نخرے اٹھانے کا کسی میں بل بوتہ نہیں ہے۔ جو دیتے ہو وہ نہ دینا اور کیا کروگے۔ تم کو بیٹی بیاہی ہے کچھ تمھاری زندگی بھر کا ٹھیکہ تو نہیں لیا ہے۔''

ہری دھن نے پیچ وتاب کھا کر کہا۔''اماں میری غلطی تھی۔ میں ویسا ہی سمجھ رہا تھا اب میرے پاس دھرا ہی کیا ہے کہ تم میری زندگی کا ٹھیکہ لوگی جب میرے پاس روپیہ تھا، میں سب کچھ تھا اب غریب ہوں تو تم کیوں بات پوچھو گی۔'' بوڑھی ساس بھی منہ پھیلائے اندر چلی گئی۔

(۲)

بچوں کے لیے باپ ایک فالتو سی چیز، ایک تکلف ہے جیسے گائے کے لیے کھلی یا بابوؤں کے لیے چٹنی۔ ماں روٹی دال ہے۔ چٹنی عمر بھر نہ ملے تو ہرج ہی کیا ہے؟ مگر روٹی دال ایک دن بھی نہ ملے تو پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ باپ کا درشن کبھی کبھی صبح و شام مل جاتا ہے۔ وہ بچہ کو اچھالتا ہے پیار کرتا ہے اور کبھی کبھی اسے گود میں لے کر انگلی پکڑ کر سیر کرانے لے جاتا ہے یہ بھی اس کے فرائض کی حد ہے۔ وہ پردیس چلا جائے۔ بچہ کو پرواہ نہیں ہوتی، مگر ماں تو بچہ کے لیے سب کچھ ہے۔ اور ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا۔ باپ کہیں ہو، اسے پرواہ نہیں، اسے تو صرف ایک اچھالنے کدانے والا آدمی چاہیے۔ مگر ماں تو اس کی اپنی ہی ہونی چاہیے۔ سولہ آنے اپنی، وہی روپ، وہی رنگ، وہی پیار، وہی سب کچھ مگر وہ نہیں ہے تو گویا بچہ کی زندگی کا چشمہ خشک ہوجاتا ہے۔ پھر تو وہ شیوجی کا نادیا ہے جس پر پھول پانی چڑھانا لازمی نہیں اختیاری ہے۔

ہری دھن کی ماں کا آج دس سال ہوئے انتقال ہوگیا تھا اس وقت وہ بیاہا جا چکا تھا وہ سولہ سال کا تھا۔ اس کے مرتے ہی اسے معلوم ہوا کہ میں کتنا بے کس ہوں جیسے اس گھر پر اس کا حق ہی نہ رہا۔ بہنوں کی شادیاں ہوچکی تھیں۔ بھائی کوئی نہ تھا۔ بے چارہ گھر میں جاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا، اماں کے لیے روتا تھا مگر ماں

کے سائے سے خوف کھاتا تھا جس کوٹھری میں اس کی جان نکلی تھی، ادھر وہ نظر تک نہ اٹھاتا تھا۔ گھر میں ایک بوا تھی جو ہری دھن کو بہت چاہتی تھی۔ اسے اب دودھ زیادہ ملتا کام بھی کم کرنا پڑتا۔ بوا بار بار پوچھتی۔ بیٹا کیا کھاؤگے؟ باپ بھی اسے اب زیادہ پیار کرتا۔ اس کے لیے ایک گائے الگ منگوادی تھی۔ کبھی کبھی اسے کچھ پیسے دیتا کہ جس طرح چاہے خرچ کرے۔ مگر یہ سارے مرہم اس زخم کو مندمل نہ کر سکتے تھے جس نے دل کو مجروح کر دیا تھا۔ یہ لاڈ پیار بار بار اس کی ماں کی یاد دلاتا۔ ماں کی جھڑکیوں میں جو مزہ تھا وہ کیا اس پیار میں تھا؟ پہلے وہ تندرست تھا مانگ مانگ کر کھاتا تھا، لڑلڑ کر کھاتا تھا اچھی سے اچھی چیزیں دی جاتی تھیں مگر اسے بھوک نہ تھی۔

سال بھر تک وہ اسی حالت میں رہا۔ پھر تغیر واقع ہوا۔ ایک نئی عورت جسے لوگ اس کی ماں کہتے تھے۔ اس کے گھر میں آئی اور دیکھتے دیکھتے کالی گھٹا کی طرح اس کی چھوٹی سی نیا پر چھا گئی۔ ساری ہریالی اجالے پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا۔ ہری دھن نے اس نقلی ماں سے بات تک نہ کی۔ اس کے پاس کبھی گیا تک نہیں۔ ایک روز گھر سے نکلا اور سسرال چلا گیا۔

باپ نے بار بار بلایا مگر اس کے جیتے جی وہ پھر گھر نہ آیا۔ جس دن باپ کے انتقال کی خبر ملی اسے ایک قسم کی حسد آمیز مسرت ہوئی اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔

اس نئی دنیا میں آکر ہری دھن کو پھر ایک مرتبہ ماں کی سی محبت کا سکھ ملا اس کی ساس کسی رشی کے بروان کی طرح اس کی بے لطف زندگی کو دلچسپیوں سے معمور کردیا۔ اس میں ہریالی پیدا ہوگئی۔ سالیوں کی چھیڑ چھاڑ میں، ساس کی شفقت میں، سالوں کے مذاق میں اوربیوی کی محبت میں اس کے دل کی ساری مرادیں پوری ہوگئیں۔ ساس کہتی بیٹا تم اس گھر کو اپنا سمجھو، تم میری آنکھوں کے تارے ہو وہ اس سے اپنے لڑکوں کی بہوؤں کی شکایت کرتی۔ دل میں سمجھتا تھا کہ ساس مجھے اپنے بیٹوں سے زیادہ چاہتی ہیں۔ باپ کے مرتے ہی وہ گھر گیا اور اپنے حصہ کی جائیداد فروخت کر کے روپیہ کی تھیلی لیے ہوئے واپس آگیا۔ اس کی دوگنی قدر و منزلت

ہونے لگی۔ اس نے ساری پونجی ساس کے چرنوں پر رکھ کر اپنے کو خوش نصیب سمجھا۔ اب تک اسے کبھی کبھی گھر کی یاد آجاتی تھی اب بھول کر بھی اس کی یاد نہ آتی تھی گویا وہ گھر اس کی زندگی کا خوفناک واقعہ تھا جسے بھول جانا ہی بہتر تھا وہ سب سے پہلے اٹھتا۔ سب سے زیادہ کام کرتا۔ اس کی محنت و تندہی دیکھ کر گاؤں کے لوگ دانتوں تلے انگلی دباتے تھے۔ اس کے خسر کی قسمت کو سراہتے تھے جسے ایسا داماد ملا تھا لیکن جوں جوں دن گذرتے گئے اس کی خاطر داری میں کمی واقع ہوتی گئی وہ پہلے دیوتا تھا پھر گھر کا آدمی اور بالآخر وہ گھر کا غلام ہوکر رہا۔ روٹیوں میں بھی خلل واقع ہوا۔ توہین ہونے لگی اگر گھر کے لوگ بھوکے مرتے اور ان کے ساتھ ہی اسے بھی مرنا پڑتا تو اسے ذرا بھی شکایت نہ ہوتی۔ لیکن جب وہ دیکھتا کہ اور لوگ تو مونچھوں کو تاؤ دے رہے ہیں۔ صرف میں ہی دودھ کی مکھی بنا دیا گیا ہوں تو اس کے دل سے ایک آہ سرد نکل جاتی۔ ابھی وہ صرف پچیس ہی سال کا تو تھا اتنی عمر اس گھر میں کیسے کٹے گی۔

اور تو اور اس کی بیوی نے بھی آنکھیں پھیر لیں یہ اس کی مصیبت کا سب سے دردناک پہلو تھا۔

(۳)

ہری دھن ادھر تو بھوکا پیاسا فکر وتشویش کی آگ میں جل رہا تھا اور ادھر مکان کے اندر ساس اور دونوں سالوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ گمانی بھی ہاں میں ہاں ملاتی جاتی تھی۔

بڑے سالے نے کہا۔ ''ہم لوگوں کی برابری کرتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ کسی نے ان کی عمر بھرکا ٹھیکہ تھوڑے ہی لیا ہے۔ دس سال ہوگئے اتنے دنوں میں کیا دوتین ہزار نہ کھا گئے ہوں گے۔

چھوٹا سالا بولا۔ ''مجور'' (مزدور) ہو تو آدمی جھڑکے بھی ڈانٹے بھی۔ اب انھیں کوئی کیا کہے، نہ جانے ان سے کبھی پنڈ چھوٹے گا بھی یا نہیں۔ اپنے دل میں کہتے ہوں گے میں نے دوہزار روپے انھیں دے رکھے ہیں یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے دوہزار

روپے کب کے صاف ہوگئے۔ سوا سیر ایک جیو کو چاہیے۔''

ساس نے بڑی متانت سے کہا ''بڑی بھاری خوراک ہے۔''

گمانی ماں کے سر سے جوں نکال رہی تھی بولی۔ ''نکمے آدمی کو کھانے کے سوا کام ہی کیا رہتا ہے۔''

بڑا سالا بولا ''کھانے کی کوئی بات نہیں ہے جسے جتنی بھوک ہو اتنا کھائے مگر کچھ پیدا بھی تو کرنا چاہیے۔ سمجھتے نہیں کہ مہمانی میں کتنے دن کٹے ہیں۔

چھوٹے سالے نے کہا۔''میں تو ایک دن کہہ دوں گا آپ اپنی راہ لیجیے۔ آپ کا قرضہ نہیں کھایا ہے۔''

گمانی اپنے گھر والوں کی ایسی ایسی باتیں سن کر اپنے شوہر سے نفرت کرنے لگتی۔ اگر وہ باہر سے چار پیسے لاتا تو اس گھر میں اس کی کتنی آؤ بھگت ہوتی وہ بھی رانی بن کر رہتی۔ نہ جانے کیوں کہیں باہر جاکر کماتے ان کی نانی مرتی ہے۔

گمانی کے جذبات وخیالات ابھی بالکل طفلانہ تھے۔ اس کا اپنا کوئی گھر نہ تھا۔ اسی گھر کے نفع ونقصان کا خیال اسے بھی تھا۔ وہ بھی اس مسئلہ کو انھیں الفاظ میں سمجھتی اور انھیں نگاہوں سے دیکھتی جیسا کہ اس کے گھر والے۔ ''سچ تو یہ ہے دو ہزار میں کیا کسی کو مول لیں گے۔ دس سال میں دوہزار ہوتے ہی کیا ہیں۔ دو سو ہی تو سال بھر کے ہوئے۔ کیا دو آدمی سال بھر میں دوسو بھی نہ کھائیں گے۔ پھر کپڑے لتے دودھ گھی سبھی کچھ تو ہے۔ دس سال تو ہوگئے ایک پیتل کا چھلا بھی نہیں بنا۔ گھر سے نکلتے تو جیسے ان کے پران جاتے ہیں۔ جانتے ہیں جیسے پوجا پہلے ہوتی تھی ویسے ہی ہوتی رہے گی یہ نہیں سوچتے کہ پہلے اور بات تھی اب اور بات ہے۔ بہو پہلے سسرال جاتی ہے تو اس کا کتنا مہاتم ہوتا ہے۔ ڈولی سے اترتے ہی باجے بجتے ہیں.......... گاؤں محلے کی عورتیں اس کا منہ دیکھنے کے لیے آتی ہیں اور روپیہ بھی دیتی ہیں۔ مہینوں اسے گھر بھر سے اچھا کھانے کو ملتا ہے اچھا پہننے کو۔ کوئی کام نہیں لیا جاتا۔ لیکن چھ مہینے بعد کوئی اس کی بات بھی نہیں پوچھتا وہ گھر بھر کی لونڈی ہوجاتی ہے۔ ان کے گھر میں میری بھی تو وہی گت ہوتی۔ پھر رونا کاہے کا۔ جو یہ کہو، کہ میں تو کام کرتاہوں تو یہ تمھاری بھول ہے۔ مجبوری کی اور

بات۔ آدمی ڈانٹتا بھی ہے مارتا بھی ہے جب چاہتا ہے رکھتا ہے جب چاہتا ہے نکال دیتا ہے۔ کس کر نکال کام لیتا ہے یہ نہیں کہ جب جی میں آیا پڑ کر سو رہے۔

(۴)

ہری پڑا ہوا اندر ہی اندر سلگ رہا تھا کہ اس کے دونوں سالے باہر آئے۔ بڑے صاحب بولے۔ ''بھیا! اٹھو۔ تیسرا پہر ڈھل گیا۔ کب تک سوتے رہو گے۔؟''

ہری دھن فوراً اٹھا اور تیز لہجہ میں بولا۔ ''کیا تم دونوں نے مجھے الو سمجھ لیا ہے۔''

دونوں ششدر رہ گئے۔ جس آدمی نے کبھی زبان نہیں کھولی۔ ہمیشہ نوکر کی طرح ہاتھ باندھے حاضر رہا وہ آج یکایک اتنا خود دار ہوجائے یوں آستین چڑھا کر کھڑا ہوجائے۔ یہ انھیں ہوش میں لانے کے لیے کافی تھا کوئی جواب نہ سوجھا۔

ہری دھن نے دیکھا ان دونوں کے قدم اکھڑ گئے ہیں۔ بس وہ دھکا دینے کی زبردست خواہش کو روک نہ سکا۔ اسی طرح بولا۔ میرے بھی آنکھیں ہیں اندھا نہیں ہوں۔ نہ بہرا ہوں۔ چھاتی پھاڑ کر کام کروں اور اس پر بھی کتا سمجھا جاؤں ایسے گدھے کہیں اور ہوں گے۔''

اب بڑے سالے بھی گرم ہو پڑے۔ ''تمھیں کسی نے یہاں باندھ تو نہیں رکھا ہے۔''

ہری دھن لاجواب ہوگیا۔ کوئی بات نہ سوجھی

بڑے نے پھر اسی لہجہ میں کہا۔ ''اگر تم یہ چاہو کہ جنم بھر مہمان بنے رہو اور تمھارا ویسا ہی آؤ بھگت ہوتا رہے تو یہ بات ہمارے بس کی نہیں ہے۔''

ہری دھن نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ''کیا میں تم لوگوں سے کم کام کرتا ہوں۔''

بڑے نے کہا۔ ''یہ کون کہتا ہے۔''

ہری : ''یہ تو تمھارے گھر کی ریت ہے کہ جو سب سے زیادہ کام کرے وہی بھوکوں مارا جائے

بڑے : ''تم خود کھانے نہیں گئے کیا کوئی تمھارے منہ میں ڈال دیتا؟''

ہری نے ہونٹ چبا کر کہا۔ ''میں خود کھانے نہیں گیا۔ کہتے تمھیں لاج نہیں آتی؟''
بڑے : ''نہیں آئی تھی تمھیں بہن بلانے؟''

ہری دھن کی آنکھوں میں خون اتر آیا دانت پیس کر رہ گیا۔

چھوٹے سالے نے کہا۔ ''اماں تو آئی تھیں تم نے کہہ دیا بھوک نہیں ہے تو کیا کرتیں؟''

ساس بھی اندر سے لپکی آرہی تھی۔ سن کر بولی۔ ''کتنا کہہ کر ہار گئی کوئی اٹھے نہ تو میں کیا کروں؟''

ہری دھن نے زہر، خون اور آگ سے بھرے ہوئے لہجہ میں کہا۔ تو کیا میں تمھارے لڑکوں کا جھوٹا کھانے کے لیے ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ تم لوگ کھا کر میرے سامنے روکھی روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دو۔''

بڑھیا نے اینٹھ کر کہا ''تو کیا تم میرے لڑکوں کی برابری کروگے۔''

ہری دھن شکست کھا گیا۔ بڑھیا نے ایک جملہ سے اس کا کام تمام کردیا۔ اس کی تنی ہوئی بھنویں ڈھیلی پڑگئیں۔ آنکھوں کی آگ مدھم پڑگئی۔ پھڑکتے ہوئے نتھنے ساکت ہوگئے۔ کسی چوٹ کھائے ہوئے آدمی کی طرح وہ زمین پر گر پڑا۔ 'کیا تم میرے لڑکوں کی برابری کرو گے؟'' یہ جملہ ایک لمبے بھالے کی طرح اس کے سینہ میں چبھتا چلا جارہا تھا نہ دل کی حد تھی نہ بھالے کی انتہا۔''

(۵)

کل گھر بھر نے کھانا کھایا مگر ہری دھن نہ اٹھا وہیں دروازے پر ایک ٹاٹ پڑا تھا۔ اسے اٹھا کر الگ کنویں پر لے گیا اور جگت پر بچھا کر پڑ رہا۔

رات زیادہ ہوچکی تھی آسمان کی فضائے بسیط میں لامحدود ستارے لڑکوں کی طرح کھیل رہے تھے۔ کوئی ناچتا تھا کوئی کودتا تھا۔ کوئی ہنستا تھا۔ کوئی آنکھیں بند کر کے پھر کھول دیتا تھا۔ تھوڑی دیر میں کوئی بہادر لڑکا ایک لمحہ میں اس وسیع فضا کو پار کر جاتا اور نہ جانے کہاں جاکر چھپ جاتا.......... ہری کو اپنا بچپن یاد آیا جب وہ اسی طرح کھیلا کرتا تھا۔ اس کی روشن یاد ستاروں کی طرح چمک اٹھی وہ اس کا چھوٹا

سا گھر وہ آم کا باغ جہاں کیریاں چنا کرتا تھا۔ سب اسے یاد آنے لگے۔ پھر ماتا بھری ماں کی موہنی صورت اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ آنکھوں میں کتنا درد کتنا رحم تھا۔ اسے معلوم ہوا گویا ماں آنکھوں میں آنسو بھرے اسے سینہ سے لگانے کے لیے ہاتھ پھیلائے اس کی طرف چلی آرہی ہے اور وہ اس کی دلکش تصویر میں محو ہوکر رہ گیا ہے۔ گویا ماں نے اس کو سینہ سے لگالیا ہے۔اور وہ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے۔ وہ رونے لگا۔ زاروقطار رونے لگا۔ اسی خود فراموشی کی حالت میں اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے ''ماں تم نے مجھے اتنا بھلا دیا۔ دیکھو تمھارے پیارے لال کی کیا گت ہو رہی ہے۔ کوئی اسے پانی کو بھی نہیں پوچھتا۔ کیا جہاں تم ہو وہاں میرے لیے جگہ نہیں ہے۔''

دفعتاً گمانی نے آکر پکارا کیا سوگئے۔ تم چل کر کھا کیوں نہیں لیتے۔ کب تک کوئی تمھارے لیے بیٹھا رہے ؟

ہری اٹھ بیٹھا اور ایک تلوار سی نیام سے نکال کر بولا ''بھلا تمھیں میری سدھ تو آئی۔ میں نے کہہ دیا تھا مجھے بھوک نہیں ہے۔''

گمانی ''تو کے (کتنے) دن نہ کھاؤ گے۔''

ہری : ''اس گھر کا پانی نہ پیئوں گا تجھے میرے ساتھ چلنا ہے یا نہیں؟''

ان مصمم ارادوں سے بھرے ہوئے الفاظ کو سن کر گمانی سہم گئی۔ بولی ''کہاں جارہے ہو؟''

ہری نے گویا نشہ میں کہا۔''تجھے اس سے کیا مطلب؟ میرے ساتھ چلے گی یا نہیں پھر پیچھے سے نہ کہنا کہ مجھ سے نہیں کہا۔''

گمانی معترضانہ لہجہ میں بولی۔ ''تم بتاتے کیوں نہیں کہاں جارہے ہو؟''

''تو میرے ساتھ چلے گی یا نہیں؟''

''جب تک تم نہ بتاؤ گے میں نہیں جاؤں گی۔''

''تو یہ معلوم ہوگیا تو نہیں جانا چاہتی۔ مجھے اتنا ہی پوچھنا تھا۔ نہیں تو میں اب تک آدھی دور نکل گیا ہوتا۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ گمانی۔ ''سنو تو سنو تو'' پکارتی

رہی مگر اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

(۶)

پانچ گھنٹے کی مسافت ہری دھن نے تین گھنٹے میں طے کی۔ جب وہ اپنے گاؤں کے آم والے باغوں کے قریب پہنچا تو اس کی ماں کی یاد سے بھرا ہوا تخیل افق کی سنہری گود میں کھیل رہا تھا۔ ان درختوں کو دیکھ کر اس کا بے قرار دل ناچنے لگا۔ مندر کا سنہرا کلس دیکھ کر وہ اس طرح دوڑا گویا کہ ایک جست میں وہ اس کے اوپر جا پہنچے گا۔ وہ تیزی سے دوڑا جا رہا تھا۔ گویا اس کی ماں آغوش کھولے اس کو بلا رہی ہے۔ جب وہ آموں کے باغ میں پہنچا جہاں ڈالیوں پر بیٹھنے سے اسے ہاتھی کی سواری کا مزہ ملتا تھا۔ جہاں کے کچے بیر اور لسوڑوں میں ایک روحانی الفت تھی وہ بے اختیار بیٹھ گیا اور زمین پر سر جھکا کر رونے لگا۔ گویا ماں کو اپنی مصیبت کی داستان سنا رہا تھا۔ وہاں کی ہوا میں، وہاں کی روشنی میں گویا اس کی ماں کی ایک بہت بڑی سی مورت بس رہی تھی۔ وہاں کی چپہ چپہ زمین ماں کے قدموں کے نشانات سے مقدس بنی ہوئی تھی۔ ماں کے محبت بھرے الفاظ گویا اب تک اس فضا میں گونج رہے تھے۔ وہاں کی آب وہوا میں نہ جانے کون سا امرت تھا جس نے اس کے افسردہ دل کو ایک مرتبہ پھر امنگوں سے بھر دیا۔ وہ ایک درخت پر چڑھ گیا اور آم توڑ کر کھانے لگا۔ ساس کی وہ سخت کلامی، بیوی کی وہ بے اعتنائی اور ساری ذلت یہ سب باتیں وہ بھول گیا۔ اس کے پاؤں پھول رہے تھے۔ تلوے جل رہے تھے مگر اس مسرت کی محویت میں اسے کسی بات کا خیال نہ تھا۔

یکا یک باغ کے رکھوالے نے پکارا ''یہ کون اوپر چڑھا ہوا ہے رے؟ اتر ابھی نہیں تو ایسا پتھر کھینچ کر ماروں گا کہ وہیں ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

اس نے گالیاں بھی دیں مگر ان گالیوں میں اس وقت ہری دھن کو بڑا لطف آرہا تھا۔ وہ ڈالیوں میں چھپ گیا۔ اس نے کئی آم کاٹ کاٹ کر نیچے گرائے۔ اور زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ایسی خوشی سے بھری ہوئی ہنسی اس نے بہت دنوں سے نہ ہنسی تھی۔

رکھوالے کو یہ ہنسی پہچانی ہوئی سی معلوم ہوئی، مگر ہری دھن یہاں کہاں وہ تو سسرال کی روٹیاں توڑ رہا ہے۔ کیسا ہنسوڑ تھا، کتنا چلبلا، نہ جانے بیچارے کا کیا حال ہوا۔ پیڑ کی ڈال سے تالاب میں کود پڑا تھا۔ اب گاؤں میں ایسا کون ہے؟''

ڈانٹ کر بولا ''وہاں بیٹھے بیٹھے ہنسو گے تو ساری ہنسی نکال دوں گا۔ نہیں تو سیدھے اتر جاؤ۔''

وہ گالیاں دینے ہی والا تھا کہ ایک گٹھلی آکر اس کے سر پر لگی وہ سر سہلاتا ہوا بولا ''یہ کون شیطان ہے، نہیں مانتا۔ ٹھہر وہیں آکر خبر لیتا ہوں۔'' اس نے اپنی لاٹھی نیچے رکھ دی اور بندروں کی طرح جھٹ اوپر چڑھ گیا۔ دیکھا تو ہری دھن بیٹھا مسکرا رہا ہے۔ متحیر ہو کر بولا۔ ''ارے ہری دھن تم یہاں کب آئے۔ اس پیڑ پر کب سے بیٹھے ہو۔''

دونوں بچپن کے ساتھی وہیں گلے ملے۔

''یہاں کب آئے، چلو گھر چلو، بھلے آدمی! کیا وہاں آم بھی میسر نہ ہوتے تھے۔''

ہری دھن نے مسکرا کر کہا۔ ''منگرو، یہاں کے آموں میں جو لذت ہے وہ کہیں کے آموں میں نہیں ہے۔ گاؤں کا کیا رنگ ڈھنگ ہے۔''

منگرو : سب چین چان ہے بھیا! تم نے تو جیسے ناتا ہی توڑ دیا اس طرح کوئی اپنا گاؤں چھوڑ دیتا ہے۔ جب سے تمھارے دادا مرے ساری گرہستی چوپٹ ہوگئی اور چھوٹے چھوٹے لڑکے ہیں ان کے لیے کیا ہوتا ہے۔''

ہری دھن مجھے اب اس گرہستی سے کیا واسطہ ہے۔ بھائی میں تو اپنا لے دے چکا۔ مجوری تو ملے گی ناتمھاری گیا (گائیں) میں ہی چرایا کروں گا۔ مجھے کھانے کو دے دینا۔

منگرو نے شک کے لہجہ میں کہا۔ ''ارے بھیا کیسی باتیں کرتے ہو؟ تمھارے لیے جان تک حاضر ہے۔ کیا سسرال میں نہ رہو گے۔ کوئی چنتا نہیں۔ پہلے تو تمھارا گھر ہی ہے اسے سنبھالو۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ان کو پالو۔ تم نئی اماں سے ناہک (ناحق) ڈرتے تھے بڑی سیدھی ہیں بیچاری۔ بس اپنی اماں ہی سمجھو۔ تمھیں

پا کر تو نہال ہوجائیں گی۔ اچھا گھر والی کو بھی تو لاؤ گے۔''
ہری دھن : اس کا منہ اب نہ دیکھوں گا۔ میرے لیے وہ مرگئی۔''

''تو تمھاری دوسری سگائی ہو جائے گی اب کے ایسی عورت لادوں گا کہ اس کے پیر دھو دھوکر پیوگے۔ پر کہیں پہلی آگئی تو؟''
ہری: ''وہ نہ آئے گی۔''

(۷)

ہری دھن اپنے گھر پہنچا تو دونوں بھائی، بھیا آئے۔ کہتے ہوئے اندر دوڑے گئے اور ماں کو خبر کردی۔

اس گھر میں قدم رکھتے ہی ہری دھن کو ایسے دلی سکون کا احساس ہوا گویا وہ اپنی ماں کی گود میں بیٹھا ہوا ہے۔ اتنے دنوں ٹھوکریں کھانے سے اس کا دل نرم ہوگیا تھا۔ جہاں پہلے گھمنڈ تھا، ضد تھی، شیخی تھی۔ وہاں اب مایوسی تھی، شکست تھی، طلب تھی۔ مرض کا زور گھٹ چکا تھا اب اس پر معمولی دوا بھی اثر نہ کر سکتی تھی۔ قلعہ کی دیواروں میں سوراخ ہوگئے تھے اب اس میں داخل ہوجانا مشکل نہ تھا۔ وہی گھر جس سے وہ ایک دن برداشتہ خاطر ہو چکا تھا۔ اب آغوش کھولے ہوئے پناہ دینے کو تیار تھا۔ بے یار ومددگار ہری دھن اس سہارے کو پاکر بالکل مطمئن ہوگیا۔

شام کو اس کی سوتیلی ماں نے کہا ''بیٹا تم گھر آگئے۔ ہمارے دھنیہ بھاگ۔ اب ان بچوں کو پالو ماں کا ناتا نہ سہی، باپ کا ناتا تو ہے۔ مجھے ایک روٹی دے دینا۔ کھاکر ایک کونے میں پڑی رہوں گی۔ تمھاری اماں سے میری بہن کا ناتا ہے۔ اس ناتے سے بھی تم میرے لڑکے ہو۔''

ماں کے لیے ترسنے والے ہری دھن کو سوتیلی ماں کے روپ میں اپنی ماں کا درشن ہوا۔ گھر کے ایک ایک گوشے میں ماں کی یاد کا جلوہ چاندنی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ وہی سوتیلی ماں کے چہرے پر نظر آرہا تھا۔

دوسرے روز ہری دھن پھر کندھے پر ہل رکھے ہوئے کھیت کو چلا، اس کے چہرے پر خوشی تھی اور اس کی آنکھوں میں غرور تھا اب وہ کسی کا سہارا لینے والا نہیں

بلکہ سہارا دینے والا تھا۔ کسی کے در کا بھکاری نہیں بلکہ اپنے گھر کا نگہبان تھا۔

ایک روز اس نے سنا کہ گمانی نے دوسرا شوہر کر لیا، وہ ماں سے بولا۔ ''تم نے سنا گمانی نے دوسرا گھر کرلیا۔''

کاکی نے کہا۔ ''گھر کیا کرے گی ٹھٹھا ہے۔ برادری میں ایسا اندھیر۔ پنچایت نہیں عدالت تو ہے۔''

ہری نے کہا۔ ''نہیں کاکی بہت اچھا ہوا۔ لاؤ۔ مہابیر سوامی کو لڈو چڑھاؤں۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ کہیں پھر میرے گلے نہ آپڑے۔ بھگوان نے میری سن لی۔ میں وہاں سے اپنے من میں ٹھان کر چلا تھا کہ اب کبھی اس کا منہ نہ دیکھوں گا۔

یہ افسانہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری کے نومبر 1929 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا گھرجمائی۔ مانسروور نمبرا میں شامل ہے۔ اردو میں یہ زادہ راہ میں شائع ہوا۔

گھاس والی

(۱)

ملیا ہری ہری گھاس کا گٹھا لے کر لوٹی تو اس کا گیہواں رنگ کچھ سرخ ہو گیا تھا۔ اور بڑی بڑی مخمور آنکھیں کچھ سہی ہوئی تھیں۔ مہابیر نے پوچھا کیا ہے ملیا؟ آج کیسا جی ہے ؟ ملیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور منہ پھیر لیا۔

مہابیر قریب آ کر پوچھا۔ کیا ہوا ہے۔ بتاتی کیوں نہیں؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟ امّاں نے ڈانٹا ہے؟ کیوں اتنی اداس ہے ؟

ملیا نے سسک کر کہا۔ کچھ نہیں ہوا کیا ہے۔ اچھی تو ہوں۔

مہابیر نے ملیا کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر پوچھا۔ چپ چاپ روتی رہے گی۔ بتائے گی نہیں۔

ملیا نے سرزنش کی انداز سے کہا۔ کوئی بات بھی ہو۔ کیا بتادوں۔!

ملیا اس خار زار میں گل صد برگ تھی۔ گیہواں رنگ تھا۔ غنچہ کا سا منہ، بیضاوی چہرہ، ٹھوڑی کھچی ہوئی، رخساروں پر دلآویز سرخی، بڑی بڑی نکیلی پلکیں آنکھوں میں ایک عجیب التجا۔ ایک دلفریب معصومیت، ساتھ ہی ایک عجیب کشش۔ معلوم نہیں چماروں کے اس گھر میں یہ اپسرا کہاں سے آ گئی تھی۔ کیا اس کا نازک پھول سا جسم اس قابل تھا کہ وہ سر پر گھاس کی ٹوکری رکھ کر بیچنے جاتی۔ اس گاؤں میں بھی

ایسے لوگ موجود تھے۔ جو اس کے تلوؤں کے نیچے آنکھیں بچھاتے تھے۔ اس کی چتونوں کے لیے ترستے تھے۔ جن سے اگر وہ ایک بات بھی کرتی تو نہال ہو جاتے لیکن ملیا کو آئے سال بھر سے زائد ہو گیا۔ کسی نے اسے مردوں کی طرف تاکتے نہیں دیکھا۔ وہ گھاس لیے نکلتی تو اس کا گندمی رنگ طلوع کی سنہری کرنوں سے کندن کی طرح دمک اٹھتا۔ گویا بسنت اپنی ساری فرحت اور شگفتگی اور مستانہ پن لیے مسکراتی چلی جاتی ہو۔ کوئی غزلیں گاتا۔ کوئی چھاتی پر ہاتھ رکھتا۔ پر ملیا آنکھیں نیچی کیے اپنی راہ چلی جاتی تھی۔ لوگ حیران ہو کر کہتے اتنا غرور! اتنی بے نیازی! مہابیر میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں۔ ایسا جوان بھی تو نہیں۔ نہ جانے کیسے اس کے ساتھ رہتی ہے۔ چاند میں گہن لگ جاتا ہوگا۔

مگر آج ایک ایسی بات ہو گئی جو چاہے اس ذات کی دوسری نازنینوں کے لیے دعوت کا پیغام ہوتی۔ ملیا کے لیے زخم جگر سے کم نہ تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ ہوا آم کے بور کی خوشبو سے متوالی ہو رہی تھی۔ آسمان زمین پر سونے کی بارش کررہا تھا۔ ملیا سر پرٹوکری رکھے گھاس چھیلنے جا رہی تھی کہ دفعتاً نوجوان چین سنگھ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ ملیا نے چاہا کہ کترا کر نکل جائے مگر چین سنگھ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا: ملیا! کیا تجھے مجھ پر ذرا بھی رحم نہیں آتا۔

ملیا کا وہ پھول سا چہرہ شعلہ کی طرح دہک اٹھا۔ وہ ذرا بھی نہیں ڈری۔ ذرا بھی نہیں جھجھکی۔ جھوا زمین پرگرادیا اور بولی: مجھے چھوڑ دو نہیں تو میں چلاتی ہوں۔

چین سنگھ کو آج زندگی میں یہ نیا تجربہ ہوا۔ نیچی ذاتوں میں حسن کا اس کے سوا اور کام ہی کیا ہے کہ وہ اونچی ذات والوں کا کھلونا بنے۔ ایسے کتنے ہی معرکے اس نے جیتے تھے۔ پرآج ملیا کے چہرے کا وہ رنگ، وہ غصہ، وہ غرور، وہ تمکنت دیکھ کر اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے خفیف ہوکر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ملیا تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ چوٹ کی گرمی میں درد کا احساس نہیں ہوتا۔ زخم ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو ٹیس ہونے لگتی ہے۔ ملیا جب کچھ دور نکل گئی تو غصہ اور خوف اور اپنی بے کسی کے احساس سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے کچھ دیر تک تو ضبط کیا۔ پھر سسک سسک کر رونے لگی۔ اگر وہ اتنی غریب نہ ہوتی تو کسی کی

مجال تھی کہ اس طرح اس کی آبرو لوٹ لیتا۔ وہ روتی جاتی تھی اور گھاس چھیلتی جاتی تھی۔ مہابیر کا غصہ وہ جانتی تھی۔ اگر اس سے کہہ دے تو وہ اس ٹھاکر کے خون کا پیاسا ہوجائے گا۔ پھر نہ جانے کیا ہو! اس خیال سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اسی لیے اس نے مہابیر کے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔

(۲)

دوسرے دن ملیا گھاس کے لیے نہ گئی۔ ساس نے پوچھا تو کیوں نہیں جاتی اور سب تو چلی گئیں۔ ملیا نے سر جھکا کر کہا۔ میں اکیلی نہ جاؤں گی۔

ساس نے کہا۔ اکیلے کیا باگھ اٹھالے جائے گا۔ کیوں اوروں کے ساتھ نہیں چلی گئی۔

ملیا نے اور بھی سر جھکا لیا اور نہایت دبی ہوئی آواز میں بولی۔ میں اوروں کے ساتھ نہ جاؤں گی۔

ساس نے ڈانٹ کر کہا۔ نہ تو اوروں کے ساتھ جائے گی۔ نہ اکیلی جائے گی تو پھر کیسے جائے گی؟ صاف صاف کیوں نہیں کہتی کہ میں نہ جاؤں گی تو یہاں میرے گھر میں رانی بن کر نباہ نہ ہوگا۔ کسی کو چام نہیں پیارا ہوتا۔ کام پیارا ہوتا ہے۔ تو بڑی سندر ہے تو تیری سندرتا لے کر چاٹوں ۔ اٹھا جھوا اور جا گھاس لا۔

دروازہ پرنیم کے درخت کے سایہ میں کھڑا مہابیر گھوڑے کو مل رہا تھا۔ اس نے ملیا کو رونی صورت بنائے جاتے دیکھا پر کچھ بول نہ سکا۔ اس کا بس چلتا تو ملیا کو کلیجہ میں بٹھالیتا۔ آنکھوں میں چرا لیتا۔ لیکن گھوڑے کا پیٹ بھرنا تو ضروری تھا۔ گھاس مول لے کرکھلائے تو بارہ آنے سے کم خرچ نہ ہوں۔ ایسی مزدوری ہی کیا ملتی ہے۔ مشکل سے ڈیڑھ دو روپے۔ وہ بھی کبھی ملے کبھی نہ ملے۔ برا ہو ان موٹر لاریوں کا۔ اب یکے کو کون پوچھتا ہے مہاجن سے ڈیڑھ سو روپے قرض لے کر یکہ اور گھوڑا خریدا تھا۔ اس کے سود کے بھی نہیں پہنچتے۔ اصل کا ذکر ہی کیا۔ظاہرداری کی نہ جی چاہتا ہو نہ جا، دیکھی جائے گی۔

ملیا نہال ہو گئی۔ آنگوں آنکھوں میں محبت کا سرور جھلک اٹھا۔ بولی گھوڑا

کھائے گا کیا؟

آج اس نے کل کا راستہ چھوڑ دیا اور کھیتوں کی مینڈھوں سے ہوتی ہوئی چلی۔ بار بار خائف نظروں سے ادھر ادھر تاکتی جاتی تھی۔ دونوں طرف اوکھ کے کھیت کھڑے تھے۔ ذرا بھی کھڑکھڑاہٹ ہوتی تو اس کا جی سن سے ہوجاتا۔ کوئی اوکھ میں چھپا بیٹھا نہ ہو۔ مگر کوئی نئی بات نہ ہوئی۔ اوکھ کے کھیت نکل گئے۔ آموں کا باغ نکل گیا۔ سینچے ہوئے کھیت نظر آنے لگے۔ دور ایک کنوئیں پر پُر چل رہا تھا۔ کھیتوں کی مینڈھوں پر ہری ہری گھاس جمی ہوئی تھی۔ ملیا کا جی للچایا۔ یہاں آدھ گھنٹہ میں جتنی گھاس چھل سکتی ہے اتنی خشک میدان میں دوپہر تک بھی نہ چھل سکے گی۔ یہاں دیکھتا ہی کون ہے؟ کوئی پکارے گا تو چپکے سے سرک جاؤں گی۔ وہ بیٹھ کر گھاس چھیلنے لگی اور ایک گھنٹہ میں اس کا جھابا آدھے سے زیادہ بھر گیا۔ اپنے کام میں اتنی محو ہوگئی کہ اسے چین سنگھ کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ یکایک آہٹ پاکر سر اٹھایا تو چین سنگھ کھڑا تھا۔

ملیا کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ جی میں آیا بھاگ جائے۔ جھابا وہیں الٹ دے اور خالی جھابا لے کر چلی جائے۔ پر چین سنگھ نے کئی گز کے فاصلہ ہی پر رک کر کہا۔ ڈر مت، ڈر مت، بھگوان جانے میں تجھ سے کچھ نہ بولوں گا۔ خوب چھیل لے میرا ہی کھیت ہے۔

ملیا کے ہاتھ مفلوج سے ہو گئے۔ کھرپی ہاتھ میں جم سی گئی۔ گھاس نظر ہی نہ آتی تھی۔ جی چاہتا تھا دھرتی پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں، زمین آنکھوں کے سامنے تیر نے لگی۔

چین سنگھ نے دلاسا دیا۔ چھیلتی کیوں نہیں۔ میں تجھ سے کچھ کہتا تھوڑا ہی ہوں۔ یہیں روز چلی آیا کر۔ میں چھیل دیا کروں گا۔

ملیا بت بنی بیٹھی رہی۔ اس کے سینے میں اب اتنی دھڑکن نہ تھی۔

چین سنگھ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور بولا۔ تو مجھ سے اتنا کیوں ڈرتی ہے۔ کیا تو سمجھتی ہے میں تجھے ستانے آیا ہوں۔ ایشور جانتا ہے کل بھی تجھے ستانے کے لیے تیرا ہاتھ نہیں پکڑا تھا، تجھے دیکھ کر آپ ہی آپ ہاتھ بڑھ گئے۔ مجھے کچھ

سدھ ہی نہ رہی۔ تو چلی گئی تو میں وہیں بیٹھ کر گھنٹوں روتا رہا۔ جی میں آتا تھا اس ہاتھ کو کاٹ ڈالوں۔ کبھی جی چاہتا تھا زہر کھالوں۔ تبھی سے تجھے ڈھونڈھ رہا ہوں۔ آج تو ادھر سے چلی آئی۔ میں سارے ہار میں مارا مارا پھرا کیا۔ اب جو سزا تیرے جی میں آوے دے۔ اگر تو میرا سر بھی کاٹ لے تو گردن نہ ہلاؤں گا۔ میں شہدا ہوں لچّا ہوں۔ لیکن جب سے تجھے دیکھا ہے نہ جانے کیوں میرے من کی ساری کھوٹ مٹ گئی۔ اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ تیرا کتا ہوتا اور تیرے پیچھے پیچھے چلتا۔ تیرا گھوڑا ہوتا تب تو تو کبھی کبھی میرے منہ پر ہاتھ پھیرتی۔ تو مجھ سے کچھ بولتی کیوں نہیں۔ کسی طرح یہ چولا تیرے کام آوے۔ میرے من کی یہی سب سے بڑی لالسا ہے۔ روپیہ، پیسہ، اناج، پانی، بھگوان کا دیا سب کچھ گھر میں ہے۔ بس تیری دیا چاہتا ہوں۔ میری جوانی کام نہ آوے۔ اگر میں کسی کھوٹ سے یہ باتیں کررہا ہوں۔ بڑا بھاگوان تھا۔ مہابیر کہ ایسی دیوی اسے ملی ؟

ملیا چپ چاپ سنتی رہی۔ پھر سر نیچا کر کے بھولے پن سے بولی۔ تو تم مجھے کیا کرنے کو کہتے ہو؟

چین سنگھ نے اور قریب آ کر کہا بس تیری دیا چاہتا ہوں۔

ملیا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا شرمیلا پن نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ چبھتے ہوئے لفظوں میں بولی تم سے ایک بات پوچھوں۔ برا تو نا مانو گے؟ تمھارا بیاہ ہو گیا ہے یا نہیں؟

چین سنگھ نے دبی زبان سے کہا۔ بیاہ تو ہو گیا ہے ملیا! لیکن بیاہ کیا ہے۔ کھلواڑ ہے۔

ملیا کے لبو ں پر ایک حقارت آمیز تبسم نمودار ہو گیا۔ بولی اگر اسی طرح مہابیر تمھاری عورت کو چھیڑتا تو تمھیں کیسا لگتا؟ تم اس کی گردن کاٹنے پر تیار ہو جاتے کہ نہیں؟

بولو! کیا سمجھتے ہو مہابیر چمار ہے تو اس کے بدن میں لہو نہیں ہے۔ شرم نہیں آتی ہے۔ اپنی ابّت آبرو کا خیال نہیں ہے! میرا روپ رنگ تمھیں بھاتا ہے۔ کیا مجھ سے بہت سندر عورتیں شہر میں، ندی کے گھاٹ پر، نہیں گھوما کرتیں۔ میرا منہ ان

کے تلووں کی برابری بھی نہیں کرسکتا۔ تم ان میں سے کسی سے کیوں دیا نہیں مانگتے؟ کیا ان کے پاس دیا نہیں ہے مگر تم وہاں نہ جاؤگے۔ کیوں کہ وہاں جاتے تمھاری چھاتی دہلتی ہے۔ مجھ سے دیا مانگتے ہو۔ اسی لیے تو کہ میں چمارن ہوں، نیچ جات ہوں۔ اور نیچ جات کی عورت جرا سی آرجو بنتی، یا جرا سے لالچ، یا جرا سی گھڑکی دھمکی سے کابو میں آجاتی ہے۔ کتنا سستا سودا ہے! ٹھاکر ہو نہ، ایسا سستا سودا کیوں چھوڑنے لگتے۔

چین سنگھ پر گھڑوں پانی پڑگیا۔ بلکہ سیکڑوں جوتے پڑگئے۔ خفت آمیز لہجہ میں بولا۔ یہ بات نہیں ہے ملیا۔ میں سچ کہتا ہوں۔ اس میں اونچ نیچ کی بات نہیں ہے۔ سب آدمی برابر ہیں۔ میں تو تیرے چرنوں پر سر رکھنے کو تیار ہوں۔

ملیا طنز سے بولی۔ اسی لیے تو کہ جانتے ہو میں کچھ کر نہیں سکتی۔ جا کر کسی کھترانی یا ٹھکرائن کے چرنوں پر سر رکھو تو معلوم ہو کہ چرنوں پر سر رکھنے کا کیا پھل ملتا ہے۔ پھر یہ سر تمھاری گردن پر نہ رہے گا۔

چین سنگھ مارے شرم کے زمین میں گڑا جاتا تھا۔ اس کا منہ اتنا خشک ہو گیا تھا جیسے مہینوں کی بیماری کے بعد اٹھا ہو۔ منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ ملیا اتنی ذی فہم ہے اس کا اسے گمان بھی نہ تھا۔

ملیا نے پھر کہا۔ میں بھی روز بازار جاتی ہوں۔ بڑے بڑے گھروں کا حال جانتی ہوں۔ مجھے کسی بڑے گھر کا نام بتادو۔ جس میں کوئی سائیس، کوئی کوچوان، کوئی کہار، کوئی پنڈت، کوئی مہراج نہ گھسا بیٹھا ہو۔ یہ سبھی بڑے گھروں کی لیلا ہے۔ اور وہ عورتیں جو کچھ کرتی ہیں ٹھیک کرتی ہیں۔ ان کے مرد بھی تو چمارنوں اور کہارنوں پر جان دیتے پھرتے ہیں۔ لینا دینا برابر ہو جاتا ہے۔ بیچارے غریب آدمیوں کے لیے یہ راگ رنگ کہاں؟ مہابیر کے لیے سنسار میں جو کچھ ہوں میں ہوں۔ وہ کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ سنجوگ کی بات ہے کہ میں جرا سندر ہوں لیکن میں کالی کلوٹی ہوتی تب بھی مہابیر مجھے اسی طرح رکھتا۔ اس کا مجھے بھروسا ہے۔ میں چمارن ہو کر بھی اتنی کمینہ نہیں ہوں کہ جو اپنے اوپر بھروسہ کرے، اس کے ساتھ دگا کروں۔ ہاں مہابیر اپنے من کی کرنے لگے۔ میری چھاتی پر مونگ

دلے تو میں بھی اس کی چھاتی پر مونگ دلوں گی۔تم مرے روپ ہی کے دیوانے ہو نہ؟ آج مجھے ماتا نکل آئے۔ کالی ہو جاؤں تو میری طرف تاکو گے بھی نہیں۔ بولو جھوٹ کہتی ہوں؟

چین سنگھ انکار نہ کرسکا۔

ملیا نے اسی ملامت آمیز لہجہ میں کہا لیکن میری ایک نہیں، دونوں آنکھیں پھوٹ جائیں تب بھی مہابیر کی آنکھ نہ پھرے گی۔ مجھے اٹھاوے گا، بٹھاوے گا، کھلاوے گا، سلاوے گا۔ کوئی ایسی سیوا نہیں ہے جو وہ اٹھا رکھے۔تم چاہتے ہو میں ایسے آدمی سے دگا کروں۔ جاؤ اب مجھے کبھی نہ چھیڑ نا۔نہیں اچھا نہ ہو گا۔

(۳)

جوانی کا جوش ہے، حوصلہ ہے، عزم ہے، رحم ہے، قوت ہے، اور وہ سب کچھ جو زندگی کو روشن، پاکیزہ اورمکمل بنا دیتا ہے۔ جوانی کا نشہ ہے۔نفس پر وری ہے۔ رعونت ہے۔ ہوس پرستی ہے۔ خودمطلبی ہے۔ اور وہ سب کچھ جو زندگی کو بہیمیت، زوال اور بدی کی جانب لے جاتاہے۔ چین سنگھ پر جوانی کا نشہ تھا۔ ملیا نے ٹھنڈے چھینٹوں سے نشہ اتار دیا۔ عورت جتنی آسانی سے دین اور ایمان کو غارت کرسکتی ہے۔ اتنی ہی آسانی سے ان کو قوت بھی عطا کرسکتی ہے۔ وہی چین سنگھ جو با ت بات پر مزدوروں کو گالیاں دیتا تھا۔ آسامیوں کو پیٹتا تھا اب اتنا خلیق، اتنا متحمل، اتنا منکسر ہو گیا تھا کہ لوگوں کو تعجب ہو تا تھا۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک دن شام کو چین سنگھ کھیت دیکھنے گیا۔ پر چل رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک جگہ نالی ٹوٹ گئی ہے اور سارا پانی بہا چلا جا رہا ہے۔ کیاری میں بالکل پانی نہ پہونچتا تھا۔ مگر کیاری برالنے والی عورت چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اس کی ذرا بھی فکرنہیں تھی کہ پانی کیوں نہیں آتا۔ پہلے یہ لاپروائی دیکھ کر چین سنگھ آپے سے باہر ہو جاتا۔ اس عورت کی پورے دن کی مزدوری کاٹ لیتا اورپر چلانے والوں کو گھڑکیاں جماتا۔ پر آج اسے غصہ نہیں آیا۔ اس نے مٹی لے کر نالی باندھ دی اور بڑھیا کے پاس جا کر بولا۔ تو یہاں بیٹھی ہے اور پانی سب

بہا جا رہا ہے۔

بڑھیا کی روح فنا ہو گئی۔ گھبرا کر بولی۔ ابھی کھل گئی ہو گی۔ راجہ میں جاکر بند کیے دیتی ہوں۔

بڑھیا تھرتھر کانپتے دیکھ کر چین سنگھ نے اس کی دلجمعی کرتے ہوئے کہا: بھاگ مت! میں نے نالی بند کر دی ہے۔۔ بڑھو کئی دن سے نہیں دکھائی دیئے۔ کہیں کام دھندہ کرنے جاتے ہیں کہ نہیں؟

بڑھیا کا سکڑا ہوا چہرہ چکنا ہو گیا۔ بولی۔ آج کل تو ٹھالی بیٹھے ہیں۔ بھیا! کہیں کام نہیں لگتا۔

چین سنگھ نے نرمی سے کہا: تو ہمارے یہاں لگاوے۔ تھوڑا سا سن رکھا ہے کات دیں۔

یہ کہتا ہوا وہ کنوئیں کی جانب چلا گیا۔ وہاں چار پر چل رہے تھے۔ پر اس وقت دو ہکولے بیر کھانے گئے ہوئے تھے۔ چین سنگھ کو دیکھتے ہی باقی مزدوروں کے ہوش اڑ گئے۔ اگر ٹھاکر نے پوچھا دو آدمی کہاں گئے۔ تو کیا جواب دیں گے۔ سب کے سب ڈانٹے جائیں گے۔ بچارے دل میں سہمے جا رہے تھے۔ کہ دیکھیں سر پر کون آفت آتی ہے۔

چین سنگھ نے پوچھا وہ دونوں کہاں گئے ؟

ایک مزدورے ڈرتے ڈرتے کہا۔دونوں کسی کام سے ابھی چلے گئے ہیں بھیا!

دفعتاً دونوں مزدور دھوتی کے ایک کونے میں بیر بھرے آت دکھائی دیے۔ دونوں خوش خوش چلے آرہے تھے۔ چین سنگھ پر نگاہ پڑی تو پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ اب نہ آتے بنتا ہے نہ جاتے۔ دونوں سمجھ گئے کہ آج بے طرح مار پڑی۔ شاید مزدوری بھی کٹ جائے۔ شش و پنج کی حالت میں کھڑے تھے کہ چین سنگھ نے پکارا۔ آؤ ! بڑھ آؤ! کیسے بیر ہیں؟ ذرا مجھے بھی دکھاؤ۔ میرے ہی باغ کے ہیں نہ؟

دونوں اور بھی تھرا اٹھے۔ آج ٹھاکر جیتا نہ چھوڑے گا۔ شاید سر کے بال بھی نہ بچیں۔ بھگو بھگو کر لگائے گا۔

چین سنگھ نے پھر کہا۔ جلدی سے آؤ جی، کھڑے کیا ہو۔ مکر پکی پکی سب

میں لے لوں گا۔ کہے دیتا ہوں۔ ذرا ایک آدمی لپک کر گھر سے تھوڑا سا نمک تو لے لو۔ (مزدوروں سے) چھوڑ دو پر، آؤ بیر کھاؤ۔ اس باغ کے بیر بہت میٹھے ہوتے ہیں۔ کام تو کرنا ہی ہے۔

دونوں خطاواروں کو اب کچھ تشفی ہوئی۔ آ کر سارے بیر چین سنگھ کے سامنے رکھ دیے۔ ایک مزدور نمک لانے دوڑا۔ ایک نے کنوئیں سے لٹیا ڈور سے پانی نکالا۔ چین سنگھ چرسے کا پانی نہ پیتا تھا۔ آدھ گھنٹہ تک چاروں پر بندر ہے۔ سبھوں نے خوب بیر کھائے۔ جب سب بیر اڑ گئے تو ایک مجرم نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ بھیاجی! آج جان بکسی ہو جائے۔ بڑی بھوکھ لگی تھی۔ نہیں تو کام چھوڑ کر نہ جاتے۔

چین سنگھ نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ تو اس میں برائی کیا ہوئی۔ میں نے بھی تو بیر کھائے۔ آدھ گھنٹہ کا ہرج ہوا۔ اتنا ہی تو تم چاہوگے تو گھنٹہ بھر کا کام آدھ گھنٹہ میں کر لوگے۔ نہ چاہوگے تو دن بھر میں بھی گھنٹہ بھر کا کام نہ ہوگا۔

چین سنگھ چلا گیا۔ تو چاروں باتیں کرنے لگے۔

ایک نے کہا: مالک اس طرح رہے تو کام کرنے میں جی لگتا ہے۔ یہ نہیں کہ ہر دم چھاتی پر سوار۔!

دوسرا : میں نے تو سمجھا آج کچا ہی کھا جائے گا۔

تیسرا : کئی دن سے دیکھتا ہوں۔ مجاج کچھ نرم ہو گیا ہے۔

چوتھا : سانجھ کو پوری مجوری ملے تو کہنا۔

پہلا : تم تو ہو گوبر گنیس۔ آدمی کا رکھ نہیں پہچانتے۔

دوسرا : اب خوب دل لگا کر کام کریں گے۔

تیسرا : جب انھوں نے ہمارے اوپر چھوڑ دیا تو ہمارا بھی دھرم ہے کہ اپنا کام سمجھ کر کام کریں۔

چوتھا : مجھے تو بھیا ٹھاکر پر اب بھی بسواس نہیں آتا۔

(۴)

ایک دن چین سنگھ کو کسی کام سے کچہری جانا تھا۔ پانچ میل کا سفر تھا۔ یوں تو وہ برابر اپنے گھوڑے پر جایا کرتا تھا۔ پر آج دھوپ تیز تھی سوچا یکے پر چلا چلوں۔ مہابیر کو کہلا بھیجا مجھے بھی لیتے جانا۔ کوئی نو بجے مہابیر نے پکارا۔ چین سنگھ تیار بیٹھا تھا۔ چٹ پٹ یکے پر بیٹھ گیا۔ مگر گھوڑا اتنا دبلا ہو رہا تھا۔ یکے کی گدی اتنی میلی اور پھٹی ہوئی۔ سارا سامان اتنا بوسیدہ کہ چین سنگھ کو یکّے پر بیٹھتے شرم آتی تھی۔ پوچھا یہ سامان کیوں بگڑا ہوا ہے۔ مہابیر! تمھارا گھوڑا تو کبھی اتنا دبلا نہ تھا۔ کیا آج کل سواریاں کم ہیں؟

مہابیر نے کہا۔ مالک! سواریاں کم نہیں ہیں۔ مگر لاریوں کے سامنے یکّے کو کون پوچھتا ہے۔ کہاں دو، ڈھائی، تین کی مجوری کرکے گھر لوٹتا تھا۔ کہاں اب بیس آنے کے پیسے بھی نہیں ملتے۔ کیا جانور کو کھلاؤں۔ کیا آپ کھاؤں۔ بڑی بپت میں پڑا ہوا ہوں۔ سوچتا ہوں یکہ، گھوڑا بیچ باچ کر آپ لوگوں کی مجوری کروں۔ پر کوئی گاہک نہیں لگتا۔ زیادہ نہیں تو بارہ آنے تو گھوڑے ہی کو چاہیے۔ گھاس اوپر سے۔ جب اپنا ہی پیٹ نہیں چلتا تو جانور کو کون پوچھے؟

چین سنگھ نے اس کے پھٹے ہوئے کرتے کی طرف دیکھ کر کہا۔ دو چار بیگھے کی کھیتی کیوں نہیں کر لیتے۔ کھیت مجھ سے لے لو۔

مہابیر نے معذوری کے انداز سے سر جھکا کر کہا۔ کھیتی کے لیے بڑی ہمت چاہیے مالک! میں نے بھی سوچا ہے کوئی گاہک لگ جائے تو یکّے کو اونے پونے نکال دوں۔ پھر گھاس چھیل کر بجار لے جایا کروں۔ آج کل ساس بہو دونوں گھاس چھیلتی ہیں۔ تب جاکر دس بارہ آنے پیسے نصیب ہوتے ہیں۔

چین سنگھ نے پوچھا۔ تو بڑھیا بجار جاتی ہوگی؟

مہابیر شرماتا ہوا بولا۔ نہیں راجہ! وہ اتنی دور کہاں چل سکتی ہے۔ گھر والی چلی جاتی ہے۔ دوپہر تک گھاس چھیلتی ہے۔ تیسرے پہر بجار جاتی ہے۔ وہاں سے گھڑی رات گئے لوٹتی ہے۔ ہلکان ہو جاتی ہے۔ بھیا۔ مگر کیا کروں تکدیر سے کیا جور!

چین سنگھ کچہری پہنچ گیا۔ مہابیر سواریوں کی ٹوہ میں شہر کی طرف چلا گیا۔ چین سنگھ نے اسے پانچ بجے آنے کو کہہ دیا۔

کوئی چار بجے چین سنگھ کچہری سے فرصت پا کر باہر نکلا۔ احاطے میں پان کی دکان تھی۔ احاطہ کے باہر پھاٹک سے ملا ہوا ایک برگد کا درخت تھا۔ اس کے سایہ میں بیسیوں ہی یکے، تانگے، بگھیاں کھڑی تھیں۔ گھوڑے کھول دیے گیے تھے۔ وکیلوں، مختاروں اور افسروں کی سواریاں یہیں کھڑی رہتی تھیں۔ چین سنگھ نے پانی پیا۔ پان کھایا اور سوچنے لگا۔ کوئی لاری مل جائے تو ذرا شہر کی سیر کر آوں۔ کہ یکایک اس کی نگاہ ایک گھاس والی پر پڑگئی۔ سر پر گھاس کا جھابا رکھے سائیسوں سے مول بھاؤ کر رہی تھی۔چین سنگھ کا دل اچھل پڑا۔ یہ تو ملیا ہے۔ کتنی ہی ٹھنی، کئی کوچبان جمع ہوگئے تھے۔ کوئی اس سے مذاق کرتا تھا۔ کوئی گھورتا تھا۔ کوئی ہنستا تھا۔

ایک کالے کلوٹے کوچبان نے کہا۔ ملیا۔ گھاس تو اڑکے چھ آنے کی ہے۔

ملیا نے نشہ خیز آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ چھ آنے پر لینا ہے تو وہ سامنے گھسیارنیں بیٹھی ہیں۔ چلے جاؤ۔ جو چار پیسے کم میں پاجاؤگے۔ میری گھاس تو بارہ آنے ہی میں جائے گی۔

ایک ادھیڑ کوچبان نے فٹن کے اوپر سے کہا۔ تیرا جمانا ہے۔ بارہ آنے نہیں ایک روپیہ مانگ بھائی۔ لینے والے جھک ماریں گے۔ اور لیں گے۔ نکلنے دے وکیلوں کو اب دیر نہیں ہے۔

ایک تانگے والے نے جو گلابی پگڑی باندھے ہوئے تھا کہا۔ بڑھو کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ اب ملیا کا مجاج کاہے کو ملے گا۔

چین سنگھ کو ایسا غصہ آرہا تھا کہ ان بدمعاشوں کی جوتوں سے خبر لے۔ سب کے سب اس کی طرف کیسا ٹکٹکی لگائے تاک رہے ہیں۔گویا آنکھوں سے پی جائیں گے۔ اور ملیا بھی یہاں کتنی خوش ہے۔ نہ لجاتی ہے، نہ جھجھکتی ہے، نہ بگڑتی ہے۔ کیسا مسکرا مسکرا کر، رسیلی چتونوں سے دیکھ دیکھ کر، سر کا آنچل کھسکا کھسکا کر، منہ موڑ موڑ کر باتیں کر رہی ہے۔ وہی ملیا جو شیرنی کی طرح تڑپ اٹھی تھی۔

ذرا دیر میں وکیل مختاروں کا ایک میلا سا نکل پڑا۔ کوچبانوں نے بھی چٹ پٹ گھوڑے جوتے۔ ملیا پر چاروں طرف عینک بازوں کی مشتاق، مستانہ، قدردانہ،

ہولناک نظریں پڑنے لگیں۔ ایک انگریزی فیشن کے بھلے آدمی آکر اس فٹن پر بیٹھ گئے اور ملیا کو اشارے سے بلایا۔ کچھ باتیں ہوئیں۔ ملیا نے گھاس پائدان کے پاس رکھی۔ ہاتھ پھیلاکر اور منہ موڑکر کچھ لیا۔ پھر مسکرا کر چل دی۔ فٹن بھی روانہ ہو گئی۔

چین سنگھ پان والے کی دکان پر خود فراموشی کی حالت میں کھڑا تھا۔ پان والے نے دکان بڑھائی۔ کپڑے پہنے اور کیبن کا دروازہ بند کر کے نیچے اترا تو چین سنگھ کو ہوش آیا۔ پوچھا کیا دکان بند کردی؟

پان والے نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ اس کی دوا کرو ٹھاکر صاحب! یہ بیماری اچھی نہیں ہے۔

چین سنگھ نے استعجاب سے پوچھا۔ کیسی بیماری؟

پان والا بولا۔ کیسی بیماری؟ آدھ گھنٹہ سے یہاں کھڑے ہو جیسے بدن میں جان ہی نہیں ہے۔ ساری کچہری خالی ہوگئی۔ مہتر تک جھاڑو لگا کرچل دیے۔ تمھیں کچھ خبر ہوئی؟ جلدی دوا کر ڈالو۔

چین سنگھ نے چھڑی سنبھالی اور پھاٹک کی طرف چلا کہ مہابیر کا یکہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔

(۵)

یکہ کچھ دور نکل گیا تو چین سنگھ نے پوچھا۔ آج کتنے پیسے کمائے مہابیر؟

مہابیر نے ہنس کر کہا۔ آج تو مالک دن بھر کھڑا ہی رہ گیا۔ کسی نے بیگار میں بھی نہ پکڑا اوپر سے چار پیسے کی بیڑیاں پی گیا۔

چین سنگھ نے ذرا پس و پیش کے بعد کہا۔ میری ایک صلاح مانو۔ عزت ہماری اور تمھاری ایک ہے تم مجھ سے ایک روپیہ روز لے لیا کرو۔ بس، جب بلاؤں تو یکہ لے کر آجاؤ۔ تب تو تمھاری گھر والی کو گھاس کو لے کر بازار نہ آنا پڑے گا۔ بولو منظور ہے ؟

مہابیر نے مشکور نظروں سے دیکھ کر کہا۔ مالک آپ ہی کا تو کھاتا ہوں۔ پرجا بھی آپ ہی کا ہوں۔ جب مرجی ہو بلوا لیجیے.........آپ سے روپے.........۔

چین سنگھ نے بات کاٹ کر کہا۔ نہیں میں تم سے بے کار نہیں لینی چاہتا تم

مجھ سے ایک روپیہ روز لے جایا کرو۔ گھر والی کو گھاس لے کر بازار مت بھیجا کرو۔
ہاں دیکھو! ملیا سے بھول کر بھی اس کی چرچا نہ کرنا۔ نہ اور کسی سے کچھ کہنا۔

کئی دنوں کے بعد شام کو ملیا کی ملاقات چین سنگھ سے ہو گئی۔ وہ آسامیوں سے لگان وصول کر کے گھر کی طرف لپکا جا رہا تھا کہ اسی جگہ جہاں اس نے ملیا کی بانہہ پکڑی تھی۔ ملیا کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اس نے ٹھٹک کر دیکھا تو ملیا دوڑی چلی آرہی تھی۔ بولا: کیا ہے ملیا؟ دوڑ مت! میں تو کھڑا ہوں۔

ملیا نے ہانپتے ہوئے کہا: اب میں گھاس بیچنے نہیں جاتی۔ کئی دن سے تم سے ملنا چاہتی تھی۔ پر تم کہیں ملتے نہ تھے۔ اور تمھارے گھر جا نہ سکتی تھی۔ آج تمھیں دیکھ کر دوڑی اس پیپل کے پاس سے دوڑی آرہی ہوں......۔

چین سنگھ نے پیپل کی طرف دیکھ کر معذرت کے انداز سے کہا۔ ناحق اتنی دور دوڑی۔ پسینے پسینے ہو رہی ہے۔ تو نے بڑا اچھا کیا کہ بازار جانا چھوڑ دیا۔

ملیا نے پوچھا: تم نے مجھے کبھی گھاس بیچتے دیکھا ہے کیا۔؟

چین سنگھ: ہاں ایک دن دیکھا تھا۔ کیا مہابیر نے تجھ سے سب کچھ کہہ ڈالا۔؟ میں نے تو منع کر دیا تھا۔

ملیا: وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتا۔

دونوں ایک لمحہ تک خاموش کھڑے رہے۔ یکایک ملیا نے مسکرا کر کہا۔ یہیں تم نے میری بانہہ پکڑی تھی۔

چین سنگھ شرمندہ ہو کر بولا: اس کو بھول جاؤ مولا دیوی۔ مجھ پر نہ جانے کون بھوت سوار تھا۔

ملیا نے بھرائی آواز میں کہا: اسے کیوں بھول جاؤں۔ اسی ہاتھ پکڑنے کی لاج تو نبھا رہے ہو۔ گریبی آدمی سے جو چاہے کرا دے۔ تم نے مجھے ڈوبنے سے بچالیا۔

پھر دونوں چپ ہو گئے۔

ذرا دیر بعد ملیا نے شرارت آمیز انداز سے پوچھا۔ تم نے سمجھا ہوگا۔ میں ہنسنے بولنے میں مگن ہو رہی تھی۔؟ کیوں؟

چین سنگھ نے زور دے کر کہا۔ نہیں ملیا مجھے ایسا خیال ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں آیا۔ اتنا کمینہ نہ سمجھ؟

ملیا مسکرا کر بولی۔ مجھے تم سے یہی آسا تھی۔
ہوا سینچے ہوئے کھیتوں میں آرام کرنے جارہی تھی۔ آفتاب افق کی گود میں آرام کر نے جا رہا تھا۔ اور اس دھندلی روشنی میں کھڑا چین سنگھ ملیا کی مٹتی ہوئی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

یہ افسانہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری کے دسمبر 1929 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مانسرور نمبر ا میں شامل ہے۔ اردو میں پریم چالیسی میں شامل ہے۔

حرزِ جاں

(۱)

بہت دنوں کی بات ہے۔ میں ایک بڑی ریاست کا معتمد ملازم تھا۔ حسب عادت مرنجان مرنج، صلح کل، ریاست کی فرقہ بندیوں سے محترز، نہ ادھر نہ ادھر اپنے کام سے کام۔ محل میں آئے دن نئے نئے شگوفے کھلتے رہتے تھے۔ نئے نئے تماشے ہوتے رہتے تھے۔ نئی نئی سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ مجھے کسی فریق سے سروکار نہ تھا۔ شاید اسی لیے راجہ صاحب کی مجھ پر عنایت رہتی تھی۔ راجہ صاحب غیور، باحمیت، آزاد اور کسی قدر خود پرور فرماں روا تھے۔ رزیڈنٹ کی خوشامدیں کرنا انھیں گوارا نہ تھا۔ جن اخباروں سے دوسری ریاستیں بدظن تھیں اور اپنے حدود میں ان کے داخلہ کی ممانعت کردی تھی۔ وہ سب ہماری ریاست میں بے تکلف آتے تھے۔ کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔ ایک دو بار رزیڈنٹ کی جانب سے اس کی تحریک ضرور ہوئی تھی۔ پر راجہ صاحب نے مطلق پرواہ نہ کی۔ اپنے اندرونی انتظامات میں وہ کسی غیر کی مداخلت پسند نہ کرتے تھے۔ اس لیے رزیڈنٹ بھی ان سے بدظن تھا۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ راجہ صاحب دور اندیش، کفایت شعار، خوش انتظام، بے دار مغز آدمی تھے۔ یہ بات نہ تھی۔ وہ نہایت عیش پسند، رنگین مزاج بلکہ شہوت پرور تھے۔ رنواس میں درجنوں ہی رانیاں تھیں۔ پھر بھی آئے دن نئی چڑیاں آتی رہتی تھیں۔ اس مد میں مطلق کفایت یا کنجوسی نہ کی جاتی تھی۔ حسن پروری ان

کی طبیعت ثانی ہو گئی تھی۔اس کے لیے وہ دین ایمان تک قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ مطلق العنان رہنا چاہتے تھے۔ اور چونکہ یوروپین حکام انھیں قیود کا پابند رکھنا چاہتے تھے۔ وہ انھیں چڑانے کے لیے ایسے معاملوں میں غیرمعمولی جرأت کر بیٹھتے تھے جن میں انھیں رعایا کی رعایت وحمایت کا پورا اعتماد ہوتا تھا۔

ادھر کچھ دنوں سے ایک پنجابی عورت رانو اس میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے متعلق طرح طرح کی افواہیں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا تھا بازاری طوائف ہے۔ کوئی ایکٹریس بتلاتا تھا۔ کوئی بھلے گھر کی لڑکی۔ حسن کے اعتبار سے اسے لاثانی نہ کہا جاسکتا تھا۔ مگر راجہ صاحب اس پر دل و جان سے فدا تھے۔ انتظامی معاملات میں یوں بھی انھیں دلچسپی نہ تھی۔ مگر اب تو وہ فنا فی العشق ہو گئے تھے۔ اس کے لیے علیٰحدہ محل تعمیر ہو رہا تھا۔ روزانہ نئے نئے تحائف آتے رہتے تھے۔ اس کی آرائش کے لیے یورپ سے تصویریں اور ظروف منگوائے گئے تھے۔ اسے گانا اور ناچنا سکھانے کے لیے اٹلی اور فرانس اور جرمنی کے استاد بلائے گئے تھے۔ ساری ریاست میں اسی کا دور دورہ تھا۔ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ آخر اس حسینہ میں ایسی کیا صفت ہے جس نے راجہ صاحب کو اس قدر از خود رفتہ بنا رکھا ہے؟

ایک دن رات کو میں کھانا کھا کر لیٹا ہی تھا کہ راجہ صاحب نے یاد فرمایا۔ تعجب ہوا کہ اس وقت خلاف معمول کیوں طلبی ہوئی؟ میں راجہ صاحب کے خاص معتمدوں میں نہ تھا۔ اس وجہ سے دہشت بھی ہوئی کہ کہیں کوئی آفت تو آنے والی نہیں ہے۔ ریاستوں میں ایسے اتفاقات کم نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کسی بد اندیش نے میری شکایت کردی ہو۔ فوراً تیار ہوا اور بادل ناخواستہ ترساں لرزاں راجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیکن پہلی نگاہ ہی میں میرے اندیشے مٹ گئے۔ راجہ صاحب کے چہرہ پر غصہ کی جگہ حسرت اور غم چھایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں ایک التجا تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔

کیوں جی سردارصاحب! تم نے کبھی محبت کی ہے؟ کسی کی محبت میں اپنے آپ کو فراموش کیا ہے؟

میں نے بے تکلفانہ گفتگو سنی تو سمجھ گیا کہ اس وقت ادب و لحاظ کی ضرورت

نہیں۔ راجہ صاحب کسی ذاتی معاملہ میں مجھ سے بے تکلف مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔
بولا۔''حضور ایسا تو کبھی اتفاق نہیں ہوا''۔

راجہ صاحب نے میری طرف خاصدان بڑھا کر کہا۔ سچ! تم بڑے خوش نصیب ہو۔ اچھا ہوا کہ تم اس جال میں نہیں پھنسے۔ یہ خوش رنگ سنہرا جال ہے۔ یہ میٹھا مگر قاتل زہر ہے۔ یہ دل فریب مگر نگاہ سوز نظارہ ہے۔ یہ وہ نغمہ شیریں ہے جو انسان کو ہمیشہ کے لیے جہنم کے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے......!

انھوں نے گلاس شراب سے بھرا اور ایک چسکی لے کر بولے:

جانتے ہو! میں نے اس سرفراز کے لیے کتنی ذلتیں اٹھائیں۔ میں اس کے آبرو کے اشارہ پر اپنا یہ سرقلم کر کے اس کے پیروں پر رکھ سکتا تھا۔ یہ ساری ریاست اس کے قدموں پر نثار کر سکتا تھا۔ انھیں ہاتھوں سے میں نے اس کا پلنگ بچھایا ہے۔ اسے حقہ بھربھر کر پلایا ہے۔ اس کے کمرہ کی خاک روبی کی ہے۔ وہ پلنگ سے اترتی تھی تو میں اس کی زیرپائی سیدھی کرتا تھے۔ ان خدمتوں میں مجھے کتنا لطف حاصل ہوتا تھا۔ کتنی خوشی ہوتی تھی۔ تم سے بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے جاکر میں اس کی رضا کا غلام ہو جاتا تھا۔ امارت اور ریاست کا غرور میرے دل سے کافور ہو جاتا تھا۔ اس انکسار میں مجھے کائنات کی دولت مل جاتی تھی۔ مگر اس ظالم نے مجھ سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ شاید وہ مجھے اپنے قابل ہی نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے یہ تمنا ہی رہ گئی کہ وہ ایک بار اپنی ان مستانہ رسیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی۔ ایک بار ان شنگرفی ہونٹوں سے میری طرف مسکراتی۔ میں نے سمجھا تھا شاید وہ پرستش ہی کی چیز ہے۔ شاید اس کی فطرت ہی اس طرح بے نیاز واقع ہوئی ہے۔ شاید اس میں درد و محبت کا احساس ہی نہیں ہے۔ شاید وہ ان رموز سے ناآشنا ہے۔ ہاں میں نے سمجھا تھا۔ شاید ابھی الہڑپن اسے اظہار میں مانع ہے۔ میں اس امید سے اپنے دل محزوں کو تسکین دیتا تھا کہ کبھی تو میری جاں نثاریاں سپھل ہوں گی۔ کبھی تو اس کے جذبات خفتہ بیدار ہوں گے۔

راجہ صاحب یکایک خاموش ہو گئے۔ پھر قدم شیشے کی طرف دیکھ کر مطمئن انداز سے بولے۔ میں اتنا بدصورت تو نہیں ہوں کہ کوئی حسینہ مجھ سے اس قدر احتراز کرے۔

راجہ صاحب نہایت وجیہہ آدمی تھے۔ اونچا قد، فراخ سینہ، سیب کا سا رنگ، مردانہ حسن کی تصویر۔

میں نے دلیرانہ لہجہ میں کہا۔ اس معاملہ میں تو فطرت نے حضور کے لیے غیرمعمولی فیاضی سے کام لیا ہے۔

راجہ صاحب کے چہرہ پر ایک ہلکا سا مایوسانہ تبسم نظر آیا۔ مگر پھر وہی حسرت طاری ہوگئی۔ بولے سردار صاحب! میں نے اس بازار حسن کی خوب سیر کی ہے۔ تسخیر اور وشی کرن کے جتنے نسخے ہیں۔ ایک ایک سے واقف ہوں۔ مگر جن نسخوں سے میں نے اب تک ہمیشہ فتح پائی ہے وہ سب اس موقعہ پر بے اثر ثابت ہوئے۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس پیکر حسن میں حس ہی نہیں۔ مگر افسوس! کل مجھ پر اس بے نیازی اور بے التفاتی کا راز کھل گیا۔ آہ! کاش یہ راز ابھی کچھ دنوں اور مجھ سے پوشیدہ رہتا۔ کچھ دنوں اور میں اسی عالم بے خودی میں اسی بے خبری میں پڑا رہتا۔

راجہ صاحب کے چہرہ پر حسرت کی جگہ کرختگی وتندی کا شعلہ نمودار ہوا۔ دیکھیے یہ وہ خطوط ہیں جو کل مجھے خفیہ طور پر ہاتھ لگے ہیں۔ میں اس وقت اس امر کی تفتیش کرنا بے کار سمجھتا ہوں کہ یہ خطوط میرے پاس کس نے بھیجے۔ اسے یہ کہاں ملے۔ یہ سرفراز کے کسی بداندیش کی کار روائی ہوگی۔ مجھے تو صرف یہ تحقیق کرنا ہے کہ خطوط اصلی ہیں یا مصنوعی۔ مجھے ان کے اصلی ہونے میں ذرہ برابر بھی شک نہیں ہے۔ میں نے سرفراز کی تحریر دیکھی ہے اس کی گفتگو کا اندازہ کیا ہے۔ اس کی زبان پر جو الفاظ چڑھے ہوئے ہیں میں ان سے خوب مانوس ہوں۔ ان خطوط میں وہی تحریر ہے۔ سرمو فرق نہیں۔ وہی انداز، وہی بیان ہے، وہی الفاظ ہیں۔ ادھر میں تو ایک نگاہ تبسم کے لیے ترستا ہوں۔ ادھر یاروں کے نام عاشقانہ خطوط لکھے جاتے ہیں۔ شکوے شکایات رنگین کے دفتر کھولے جاتے ہیں۔ ان خطوط کو میں نے پڑھا ہے۔ پتھروں کا دل کر کے پڑھا ہے۔

راجہ صاحب کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

خون کا گھونٹ پی پی کر پڑھا ہے۔ اور اپنی بوٹیاں نوچ نوچ کر پڑھا ہے۔

آنکھوں سے خون کے قطرے نکل نکل آئے ہیں۔

اف! یہ دغا! یہ تریا چلتر! میرے محل میں رہ کر میری ناز برداریوں کے سایہ میں زندگی کی بہترین نعمتوں کا لطف اٹھا کر، میری خاک روبیوں اور جاں نثاریوں کو پیروں سے کچل کر یہ راز ونیاز کے خط لکھے جاتے ہیں۔ مجھے کھارے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ دوسرے پر آب مقطر کی بارش کی جا رہی تھی۔ میرے لیے ایک چٹکی بھر آٹا نہیں۔ دوسرے کے لیے خوان نعمت حاضر کیا جا رہا تھا۔

اف! تم قیاس نہیں کرسکتے کہ ان خطوط کو پڑھ کر میری کیا حالت ہوئی؟

پہلا ولولہ جو میرے دل میں آیا وہ یہ تھا کہ اسی وقت تلوار لے کر جاؤں اور اس بے درد کے سامنے اسی کے پیروں پر یہ تیغ اپنے سینے میں چبھا لوں۔ اسی کی آنکھوں کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر، تڑپ تڑپ کر مرجاوں۔ شاید میرے بعد وہ میری محبت کی قدر کرے۔ میرے خون کے گرم فوارے اس کے پتھر جیسے دل کو پگھلا دیں۔ اس بے رحم کو معلوم ہو کہ محبت کیا شے ہے۔ لیکن دل کے نہ معلوم کس گوشہ سے آواز آئی۔ یہ سراسر حماقت ہے! تم مرجاوگے اور یہ ساحرہ تمھارے زر و جواہر سے دامن بھرے۔ تمھارے عطیات سے گرانبار، دل میں تمھاری حماقت پر ہنستی ہوئی دوسرے دن اپنے گلشن میں چلی جائے گی۔ اور دونوں تمھاری دولت کے مزے اڑائیں گے۔ اور تمھاری مضطر کو تڑپائیں گے۔

سردار صاحب! یقین مانیے۔ یہ آواز مجھے اپنے ہی دل کے کسی گوشہ سے آئی۔ میں نے اسی وقت تلوار کمر سے نکال کر رکھ دی۔ یہ خیال ترک کر دیا۔ ایک ہی لمحہ میں انتقام کا ولولہ پیدا ہوا۔ دل میں ایک شعلہ سا اٹھا۔ اف! کتنی جاں سوز تھی وہ لپٹ، کتنا بیتاب کن تھا وہ اشتعال۔ ایک ایک روئیں سے آگ نکل رہی تھی۔ اٹھا کہ اسی وقت جا کر اس کے ظلم وستم کا خاتمہ کر دوں۔ جن آنکھوں کی ایک نگاہ کے لیے اپنی جان نثار کرتا تھا انھیں ہمیشہ کے لیے بند کر دوں۔ ان قاتل زہریلے لبوں کو ہمیشہ کے لیے سیاہ کر دوں۔ جس سینہ میں اتنا تغافل، اتنی بے مہری، اتنی بے وفائی بھری ہو۔ اسے چیرکر پیروں سے کچل ڈالوں۔ خون سا سر پر سوار ہو گیا۔ سرفراز کی ساری دل ربائیاں، ساری رعنائیاں، ساری خوش اندازیاں،

مکروہ معلوم ہونے لگیں۔ اس وقت اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ سرفراز کو کسی نے قتل کر ڈالا ہے تو شاید میں قاتل کے پیروں کو بوسہ دیتا۔ اگر سنتا کہ وہ نزع کی حالت میں ہے تو اس کے دم توڑنے کا تماشہ دیکھتا۔ میں خون کا مصمم ارادہ کر کے دوہری تلواریں کمر سے لگائے اس کے حریم ناز میں داخل ہوا۔ جس دروازہ پر جاتے ہی دل میں امید و بیم کی کشمکش ہونے لگتی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس وقت مجھے سفاکانہ مسرت ہوئی۔

سردار صاحب! ان کیفیات اور جذبات کا ذکر نہ کروں گا جو اس وقت میرے دل پر طاری ہوئیں۔ زبان میں اتنی طاقت ہو بھی تو دل کو اس سے ہیجان میں لانا مناسب نہیں۔ میں نے کمرہ میں قدم رکھا۔ سرفراز خواب ناز میں مست تھی۔ اسے دیکھ کر میرے دل پر ایک عجیب رقت طاری ہوئی۔ جی ہاں وہ غیظ وغضب نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ اس کی بجائے رقت کا غلبہ ہوا۔ اس کی کیا خطا ہے؟ اگر اس کی یہی خطا ہے جو میری ہے تو مجھے اس سے انتقام لینے کا کیا حق ہے؟ اگر وہ اپنے محبوب کے لیے اتنی ہی مضطرب اتنی ہی بیتاب، اتنی ہی از خود رفتہ ہے جتنا میں ہوں تو اس کی کیا خطا ہے؟ جس طرح میں اپنے دل سے مجبور ہوں کیا وہ بھی اپنے دل سے مجبور نہیں ہوسکتی ہے؟ اگر مجھے کوئی عورت گرفتار کر لے اور زر و جواہر سے میری محبت خریدنا چاہے تو کیا میں اس کا دل بھرنے لگوں گا؟ شاید نہیں۔ میں موقع پاتے ہی راہ فرار اختیار کروں گا۔ یہ میری بے انصافی ہے۔ ستم ناروا۔ اگر مجھ میں وہ اوصاف ہوتے جو اس کے نامعلوم آشنا میں ہیں تو کیوں اس کی طبیعت میری جانب مائل نہ ہوتی؟ مجھ میں وہ اوصاف نہیں ہیں جو وہ اپنے محبوب میں دیکھنا چاہتی ہے۔ اگر مجھے کڑوی چیز اچھی نہیں لگتی تو میں قدرتاً حلوائی کی دکان کی طرف جاؤں گا جو مٹھائیاں بیچتا ہے۔ ممکن ہے رفتہ رفتہ میرا مذاق بدل جائے۔ اور میں کڑوی چیز پسند کرنے لگوں۔ لیکن جبراً تلوار کی نوک پر کوئی مجھے کڑوی چیز کی طرف رغبت نہیں دلاسکتا۔

ان خیالات نے مجھے نرم کر دیا۔ وہ صورت جو مجھے ایک لمحہ پہلے مکروہ معلوم ہوتی تھی۔ پھر صدگنا دلربا نظر آئی۔ اب تک میں نے اس کو محو خواب نہ دیکھا تھا۔

عالم خواب میں اس کا حسن زیادہ پاکیزہ اور لطیف نظر آیا۔ جیسے بارش کے بعد پھول۔ بیداری میں وہ اجتماعی کشش نہ تھی۔ نگاہ کبھی آنکھوں کے بوسے لیتی، کبھی لبوں کے، کبھی رخساروں کے۔ اس عالم خواب میں اس کا جلوہ حسن مسلم تھا۔ حسن کی ایک شمع روشن تھی جس کا مرکز نگاہ کے لیے کوئی خاص نقطہ نہ تھا۔

راجہ صاحب نے ایک معذرت آمیز تبسم کے ساتھ پھر ساغر منہ سے لگایا اور بولے:

سردار صاحب! میرا جوش انتقام فرو ہو گیا۔ جس سے محبت ہو گئی۔ اس سے نفرت نہیں ہوسکتی۔ خواہ وہ ہمارے ساتھ کتنی ہی بے وفائیاں کرے۔ جہاں معشوق عاشق کے ہاتھوں قتل ہو۔ وہاں سمجھ لیجیے کہ محبت نہ تھی صرف نفس پروری تھی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ لیکن دل کو کسی طرح سکون نہیں ہوتا۔ تب سے اس وقت تک میں نے غصہ کو ضبط کرنے کی بہ حد امکان کوشش کی۔ مگر ناکام رہا۔ جب تک وہ شیطان زندہ ہے میرے پہلو میں ایک کانٹا سا کھٹکتا رہے گا۔ میری چھاتی پر سانپ لوٹتا رہے گا۔ میرے لیے خواب و خور حرام ہے، وہی مارسیاہ میرے خزانہ تک پہنچنے میں مانع ہو رہا ہے۔ وہی میرے اور سرفراز کے بیچ میں دیوار حائل ہے۔ وہی اس دودھ کی مکھی ہے۔ اس سانپ کا سرکچلنا ہو گا۔ اس دیوار کو منہدم کرنا ہوگا۔ اس مکھی کو نکال کر پھینکنا ہوگا۔ جب تک میں اپنی آنکھوں سے اس کی دھجیاں بکھرتے نہ دیکھوں گا میری روح کو تسکین نہ ہوگی۔ مآل کی مطلق پرواہ نہیں ہے۔ کچھ بھی ہو۔ مگر اس کو واصل جہنم کر کے دم لوں گا۔

یہ کہہ کر راجہ صاحب نے میری طرف سائلانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ بتلایئے آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟

میری زبان سے کلمۂ حیرت نکلا............''میں'' ......!

راجہ صاحب نے میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔'' ہاں! آپ!! آپ جانتے ہیں میں نے اتنے آدمیوں کو چھوڑ کر آپ کو کیوں محرم راز بنایا اور کیوں آپ سے استدعا کی؟ یہاں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں ہے جو میرا اشارہ پاتے ہی اس مردود کے ٹکڑے اڑا دیں گے۔ سربازار اسے خاک و خون میں ملادیں گے۔ جی ہاں! ایک

اشارے سے اس کی ہڈیوں کا برادہ بنوا سکتا ہوں۔ اس کے ناخنوں میں کیلیں ٹھکوا سکتا ہوں۔ مگر میں نے سب کو چھوڑ کر آپ کا انتخاب کیا۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ مجھے تمھارے اوپر اعتبار ہے۔ وہ اعتبار جو مجھے اپنے قریب تر آدمیوں پر بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تمھارے سینہ میں یہ راز اتنا ہی محفوظ رہے گا جتنا میرے۔ مجھے اعتبار ہے کہ تحریص اپنا انتہائی زور صرف کر کے بھی تمھیں نہیں ہلا سکتی۔ حیوانی تشدد اور ظالمانہ ایذا تمھارے لبوں کو نہیں کھول سکتے۔ تم بے وفائی نہ کرو گے۔ دغا نہ کروگے۔ اس موقعہ سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ گے۔ جانتے ہو۔ اس کا صلہ کیا ہوگا؟ اس کے متعلق تم کوئی اندیشہ نہ کرو۔ مجھ میں اور کتنے ہی عیوب ہوں، احسان فراموشی کا عیب نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا صلہ جو میرے امکان میں ہے وہ تمھارے قدموں پر رکھ دیا جائے گا۔ منصب، جاگیر، دولت، اعزاز، تمھارے حسب خواہش عطا ہوں گے۔ تم خود اس کے مختار کامل ہوگے۔ کوئی مداخلت نہ کرے گا۔ حرص اور ارمان کو انتہائی پرواز کی آزادی ہوگی۔ قدردانی کے قدیم افسانے پھر زندہ ہو جائیں گے۔ تم خود فرمان لکھوگے۔ اور میں اس پر آنکھیں بند کر کے دستخط کر دوں گا۔ بولو کب جانا چاہتے ہو؟ اس کا نام اور پتہ اس کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ اسے ذہن میں نقش کر لو اور کاغذ پھاڑ ڈالو۔ میں نے کتنی بڑی ذمہّ داری تمھارے اوپر رکھی ہے۔ میری جان تمھارے مٹھی میں ہے۔ تم اسے بنا اور بگاڑ سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس کام کو بوجوہ احسن انجام دو گے۔ جنھیں اپنا شریک کار بناؤگے وہ بھروسے کے آدمی ہوں گے۔ انتہائی فراست، انتہائی دور اندیشی اور انتہائی احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ ایک غیرمحتاط لفظ، ذرہ برابر لاپرواہی، ایک لمحہ کی تاخیر میرے اور تمھارے دونوں کے حق میں سم قاتل ہوگی۔ دشمن گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔ ناکردہ گناہ گدی سے معزول کرنے کی تجویزیں سوچی جا رہی ہیں۔ گناہ کرنے پر کیا سزا ہوگی اس کا اندازہ تم کرسکتے ہو۔ میں کسی دور دراز کوہستانی علاقہ میں بند کردیا جاؤں گا۔ ریاست غیروں کے تصرف میں چلی جائے گی اور میری زندگی غارت ہو جائے گی۔ تو کب جاؤ گے؟ یہ امپریئل بینک کا چیک بک ہے۔ میں چکوں پر دستخط کردیے ہیں۔ جب اور جتنے روپیوں کی ضرورت ہو لے لینا۔

میرا دماغ عرش معلّٰی پرجا پہنچا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ثروت میں تالیف کی

کتنی قوت ہوتی ہے؟ کیوں لوگ اس کے آستانہ پر سجدے کرتے ہیں؟ مجھ پر جیسے کوئی نشہ ہو گیا۔ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا۔ اپنی تقدیر کی تعمیر کا موقعہ زندگی میں ہر ایک انسان کو ملتا ہے۔ اور ایک ہی بار جو اس موقعہ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا ہے وہ کامیاب ہے۔ اور جو شش و پنج میں پڑ کر اسے چھوڑ دیتا ہے وہ ناکام ہے۔ ایک کو دولت، عزت اور شہرت نصیب ہوتی ہے۔ دوسرا عسرت اور افلاس اور نکبت میں زندگی کے دن کاٹتا ہے۔ فیصلہ کرنے کے لیے صرف ایک منٹ بلکہ صرف ایک لمحہ کا وقت ملتا ہے۔ کتنا بیش قیمت ہے وہ لمحہ۔ میری زندگی میں یہ وہی لمحہ تھا۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ تقدیر اپنی بہترین نعمتوں کا طشت لیے میرے سامنے حاضر ہے۔ وہ ساری برکتیں جن کے لیے انسان مرتا اور جیتا ہے۔ میرا خیر مقدم کرنے کے لیے کھڑی ہیں۔ مانا خطرناک کام ہے۔ لیکن صلہ تو دیکھو۔ دریا میں غوطہ لگانے سے ہی در یتیم ملتاہے۔ کنارے پر بیٹھنے والے سبکساران ساحل کے لیے خر مہروں کے سوائے اور کیا ہے؟ ایک بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگنا پڑے گا۔ کیا مضائقہ! خون ہی عروج کا زینہ ہے۔ یہ دنیا کا رزار حیات ہے۔ یہاں لاشوں کے زینے بنا کر بام رفعت پر چڑھنا پڑتا ہے۔ خون کے نالوں میں تیر کر ہی فتح کا ساحل ملتا ہے۔ گرد و پیش کے واقعات کو دیکھو۔ تاریخ دیکھو! کامیاب زندگیوں کی داستان خونی حرفوں میں لکھی ہوئی ہے۔ دلیروں نے ہمیشہ خون کے دریا کی شناوری کی ہے۔ خون کی ہولیاں کھیلی ہیں۔ خون کا خوف پست ہمتی اورضعف کی دلیل ہے۔ سورما کی نگاہ منزل پر رہتی ہے۔ راستہ پر نہیں۔ چوٹی پر رہتی ہے دامن کوہ پر نہیں۔ اب پس وپیش کا موقعہ نہیں۔ نیک و بد کی فکر اہل عمل کو نہیں ہوتی۔

میں نے کھڑے ہو کر عرض کی۔'' غلام اس خدمت کے لیے حاضر ہے۔''

راجہ صاحب نے نگاہ تحسین سے دیکھ کر کہا۔'' مجھے تم سے یہی امید تھی۔ تمھارا دل کہتا ہے کہ یہ کام پورا کر آؤ گے۔؟

''مجھے یقین ہے''۔

''میرا بھی یہی خیال تھا۔ دیکھو مجھے پل پل کی خبریں بھیجتے رہنا۔ اخفائے راز

کامل شرط ہے''۔

''ایشور نے چاہا تو حضور کو شکایت کا کوئی موقعہ نہ ہوگا''۔

''ایشور کا نام نہ لو۔ ایشور ایسے موقعوں کے لیے نہیں ہے۔ ایشور کی مدد اس وقت مانگو جب اپنا دل کمزور ہو۔ جس کے بازوؤں میں قوت، دل میں ارادہ اور عزم، دماغ میں دانائی اور ہمت ہے وہ ایشور کا دست نگر کیوں بنے؟ اچھا جاؤ اور جلد سرخرو ہو کر آؤ۔ آنکھیں تمھارے انتظار میں دروازہ پر کھڑی رہیں گی۔

(۲)

میں نے ضمیر کی تحریکات کو سر تک نہ اٹھانے دیا۔ میرا نفس اس بدنصیب کو قابل گردن زدنی ثابت کرنے کے لیے دلیلیں پیش کرنے لگا۔ اسے کیا حق تھا کہ وہ سرفراز سے ایسے تعلقات رکھے۔ جب اسے معلوم تھا کہ راجہ صاحب نے اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا ہے تو یہ قریب قریب اتنا ہی سنگین جرم ہے جتنا کسی بیاہتا کا اغوا کرنا۔ سرفراز ہر ایک اعتبار سے منکوحہ ہے۔ بلکہ منکوحہ سے بڑھ کر۔ ایسی حسینہ سے نامہ و پیام جاری رکھنا اور اس پر ڈورے ڈالنا ہرگز قابل معافی نہیں۔ ایسے سنگین جرم کی سزا بھی اتنی ہی سنگین ہو تو کوئی افسوس کی بات نہیں۔ اگر میرے دل میں اس وقت تک کچھ ضعف، کچھ دبدھا تھا تو اس دلیل نے اسے دور کر دیا۔ حق کا انصاف جرأت کا منتر ہے۔ اب وہ خون میری نظروں میں خون ناحق نہیں،خون ناروا نہیں، بلکہ خون جائز تھا اور اس سے منہ موڑنا شرمناک بزدلی۔ٹرین جانے میں ابھی دو گھنٹہ کی دیر تھی۔ رات بھر کا سفر تھا۔ لیکن مجھے کھانے کی اشتہاء مطلق نہ تھی۔ میں نے سفر کی تیاریاں شروع کیں۔ بازار سے ایک نقلی داڑھی لایا۔ شاید اس کی ضرورت پڑے۔ ٹرنک میں دو ریوالور رکھ لیے۔ پھر سوچنے لگا کہ کسے اپنے ساتھ لے چلوں۔ آغاز کیسے ہو؟ یہاں سے کسی کو لے جانا تو مصلحت کے خلاف ہے۔ پھر کیا اپنے بھائی صاحب کو تار دوں؟ ہاں یہی مناسب ہے۔ انھیں لکھ دوں مجھ سے بمبئی میں ملیں۔ وہ چلتے ہوئے آدمی ہیں۔ لیکن نہیں، مفت میں بھائی صاحب کو کیوں پھنساؤں کون جانے کیا ہو۔ بمبئی میں ایسے آدمیوں کی کیا کمی۔ ایک

لاکھ روپے کا لالچ دوں گا۔ چٹکیوں میں کام ہو جائے گا۔ وہاں ایک سے ایک شاطر پڑے ہیں۔ بس ان حضرت کو کسی حکمت سے کسی طوائف کے کمرہ میں بند کر کے وہیں بزن کر دیا جائے یا سمندر کے کنارے جس وقت وہ ہواخوری کے لیے نکلیں۔

ابھی چونکہ دیر تھی اس لیے سوچا لاؤ سندھیا کر لوں۔ جوں ہی سندھیا کے کمرہ میں قدم رکھا۔ وہاں حسب دستورجس چیز پر نگاہ پڑی۔ وہ ماتا جی کی قد آدم تصویر تھی۔ میں یکایک چونک پڑا۔ جیسے کوئی آدمی اس وقت چور کے کندھے پر ہاتھ رکھ دے۔ جب وہ سینندھ مار رہا ہو۔ میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ روز یہی تصویر دیکھا کرتا تھا۔ دن میں صدہا بار اس پر نگاہ پڑتی تھی۔ آج میرے دل کی جو کیفیت ہوئی۔ وہ کبھی نہ ہوئی تھی۔ معلوم ہوا وہ آنکھیں نگاہ سرزنش سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان میں کتنی تنبیہ تھی، کتنی شرم، کتنا افسوس، کتنی مایوسی، اف! میں اس طرف تاک نہ سکا۔ فوراً آنکھیں جھکالیں۔ ان آنکھوں کے سامنے کھڑے ہونے کی مجھے جرات نہ ہوئی۔ وہ تصویر کی آنکھیں نہ تھیں۔ زندہ روشن متحرک آنکھیں تھیں۔ دل میں نفوذ کرنے والی۔ نوکدار سلاخ کی طرح سینہ میں چبھنے والی۔ مجھے ایسا خوف ہوا کہ گر پڑوں گا۔ میں وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ میرا سر آپ ہی آپ جھک گیا۔ بالکل نادانستہ، بالکل غیر محسوس طریقہ پر۔ میرے ارادوں میں، خیالات میں، خواہشات میں ایک انقلاب ہو گیا۔ اس صداقت کے پتلے، اس نور کے مجسمے نے میری ضمیر کو منور کر دیا۔ دل میں کیا کیا جذبات پیدا ہوئے اس کی مجھے خبر نہیں۔ میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ میں ایک غیبی طاقت کے زیر اثر گھر سے نکلا۔ موٹر تیار کروائی اور ۱۰ بجے راجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ میرے لیے انھوں نے خاص طور پر ہدایت کر دی تھی۔ جس وقت چاہوں ان سے ملوں۔ میں جاکر دست بستہ کھڑا ہوگیا۔ اور بولا: حضور کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

راجہ صاحب اس عقدہ کو اپنی دانست میں حل کر چکنے کے بعد اس وقت اطمینان کی سانس لے رہے تھے۔ بوجھ سر سے اتار کر وہ دم لے رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انھیں فراست سے کسی نئی الجھن کا گمان ہوا۔ چیں بجبیں ہو گئے۔ مگر ایک ہی لمحہ میں مصلحت غالب آگئی۔ شگفتہ رو ہو کر بولے:

''ہاں، ہاں کہئے ! کوئی خاص بات۔؟

میں نے بے خوف و ـــ جھجک کہا۔'' مجھے اس کام سے معذور رکھیے۔''

راجہ صاحب کا چہرہ سفید ہو گیا۔ میری طرف وحشت سے دیکھ کر پوچھا؟

''اس کا مطلب''۔

''مجھ سے وہ کام نہ ہو سکے گا''۔

''کیوں''؟

''مجھ میں وہ صلاحیت نہیں ہے''۔

مہاراجہ صاحب نے طعن آمیز نظروں سے دیکھ کر فرمایا:

''شاید ضمیر بے دار ہو گیا...... کیوں؟ وہی بیماری جو پست ہمتوں اور نامردوں کو ہوا کرتی ہے۔ اچھی بات ہے جاؤ''۔

''حضور ! میں اپنے میں وہ قابلیت نہیں پاتا''۔

راجہ صاحب نے شیر کی طرح آتشیں آنکھوں سے دیکھتے ہوئے گرج کر کہا۔'' مت بکو نمک............''

پھر کچھ نرم ہو کر بولے ''تمھاری تقدیر میں عروج اور ثروت نہیں۔ میں نے تمھیں وہ موقع دیا تھا۔ جسے کوئی دوسرا آدمی امداد غیب سمجھتا۔ مگر تم نے اس کی قدر نہ کی۔ تمھاری تقدیر تم ـــ پھری ہوئی ہے۔ ہمیشہ غلامی کروگے اور ٹھوکریں کھاؤگے۔ تم جیسے آدمیوں کے لیے گیروے بانے ہیں۔ اور کاسہ گدائی اور ایک گوشہ غار، نیک و بد کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اسی کی ضرورت ہے۔ دنیا مردوں کے لیے ہے۔''

میں خاموش تھا۔ پچھتا رہا تھا۔ پہلے ہی کیوں نہ یہ عذر کیا تھا۔

راجہ صاحب نے ایک لمحہ کے بعد پھر کہا۔'' اب بھی موقعہ ہے پھر سوچو............''

میں نے اسی بے باکانہ انداز سے کہا۔ ''میں نے خوب سوچ لیا مجھ سے......''

راجہ صاحب ہونٹ دانتوں سے کاٹ کر بولے۔'' بہتر ہے جاؤ اور آج ہی شب کو میرے حدود کے باہر نکل جاؤ۔'' ممکن ہے کل تمھیں پھر یہ موقع نہ ملے۔

اسی رو میں انھوں نے مجھے نمک حرام، کج فہم، کمینہ اور جانے کیا کیا کہا۔

میں نے سلام کیا اور چلا آیا اور اسی رات کو یکہ و تنہا چند کپڑے اور نقد روپیہ کا صندوق لیے ہوئے گھر سے نکل پڑا۔ ہاں وہ تصویر میرے سینے سے لگی ہوئی تھی۔

ادھر آفتاب حدود مشرق میں آیا اور میں ریاست کے حدود سے نکل کر انگریزی علاقہ میں آ پہنچا۔

یہ افسانہ پہلی بار ماہنامہ ''وشال بھارت'' کے دسمبر 1929 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا ''گوچ'' یہ گپت دھن نمبر 2 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ پریم چالیسی میں شامل ہے۔

مزارِ اُلفت

اب نہ وہ جوانی ہے، نہ وہ نشہ ہے، نہ وہ جنون۔ وہ محفل برہم ہوگئی۔ وہ شمع بجھ گئی جس سے اس محفل کی رونق تھی۔ وہ نازنین کنج لحد میں سو رہی ہے۔جس نے وفا پر اپنے تئیں قربان کیا۔ ہاں اس کی محبت کا نقش اب بھی دل پر ہے۔ اور اس کی دل فریب یاد گار آنکھوں کے سامنے۔ ارباب نشاط میں ایسی وفا، ایسا خلوص، ایسی عفت نایاب ہے۔ اور رؤسا میں ایسا نباہ، ایسی فدائیت، ایسی عقیدت نادر کنور رنبیر سنگھ روز بلا ناغہ شام کو زہرہ کے مزار کی زیارت کرنے جاتے۔ اسے پھولوں سے سجاتے اور آنسوؤں سے سینچتے۔ پندرہ سال گزر گئے۔ ایک دن بھی ناغہ نہیں ہوا۔ پریم کی اپاسنا ہی ان کی زندگی کا مقصود تھا۔ اس پریم کا جس میں انھوں نے وہ کچھ پایا، وہ کچھ دیکھا، وہ کچھ محسوس کیا جس کی یاد اب بھی مست کر دیتی ہے۔ اس زیارت میں سلوچنا بھی ان کے ساتھ ہوتی جو زہرہ کی یاد گار اور کنور صاحب کی ساری آرزوؤں کا مرکز تھی۔ کنور صاحب نے دو شادیاں کی تھیں مگر دونوں عورتیں بے اولاد دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ پھر انھوں نے شادی نہ کی۔ ایک دن ایک محفل میں زہرہ کے درشن ہوئے۔ دونوں مائل ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوا گویا ازل کے دو رفیق بچھڑ کر پھر مل گئے ہوں۔ زندگی کی بہار شروع ہوئی۔ کتنی فرحت سے بھری ہوئی۔ کتنی نغمہ ریز۔ مگر افسوس! وہ بہار پانچ مختصر سالوں ہی میں رخصت ہو گئی۔ وہ خواب شیریں پریشان ہوگیا۔ وہ صدق اور وفا کی دیوی تین سال کی سلوچنا کو ان کی گود میں سونپ کر سدھار گئی۔ کنورصاحب نے اس پریم کی امانت کو حرزِجاں بنالیا۔

ان کی مادرانہ الفت دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ کتنے ہی تو انھیں مجنوں سمجھتے۔ سلوچنا ہی کی نیند سوتے، اسی کی نیند جاگتے، ساتھ پڑھتے، ساتھ کھیلتے، ساتھ سیر کرتے۔ اتنی یکسوئی کے ساتھ جیسے کوئی بیوہ اپنے لڑکے کو پالے۔ جب سے سلوچنا یونیورسٹی میں داخل ہوئی تھی۔ خود اسے موٹر پر پہنچا آتے اور شام کو خود جا کر لے آتے۔ ان کی دلی آرزو تھی۔ کہ اس کی شادی کسی ممتاز اور شریف خاندان میں ہو۔ وہ اس کی پیشانی سے وہ داغ دھو دینا چاہتے تھے جو گویا تقدیر نے اپنے بے رحم ہاتھوں سے لگا دیا تھا۔ دولت تو اس داغ کو نہ دھو سکی۔ شاید تعلیم دھو ڈالے۔!

شام کا وقت تھا۔ آفتاب کے مزار پر شفق کے پھول بکھرے ہوئے تھے۔ اورکنور صاحب زہرہ کے مزار کو پھولوں سے سجا رہے تھے۔ سلوچنا کچھ فاصلے پر کھڑی اپنے کتے سے گیند کھیل رہی تھی۔ کہ یکا یک اس نے اپنے پروفیسر ڈاکٹر ''رامیندر'' کو آتے دیکھا۔ شرماکر منہ پھیر لیا۔ گویا انھیں دیکھا ہی نہیں۔ خوف ہوا کہیں ڈاکٹر رامیندر اس سے مزار کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھیں۔

یونیورسٹی میں داخل ہوئے اسے ایک سال سے کچھ کم ہی ہوا تھا۔ مگر اتنے ہی دنوں میں اس نے محبت کی مختلف صورتیں دیکھ لی تھیں۔ کہیں وہ سامان تفریح تھا، کہیں ذریعہ نشاط،کہیں مایۂ ہوس، کہیں تحریک نفس، کہیں وہ ذوق صالح نہ نظر آیا جو محبت کی بنیاد ہے۔ صرف رامیندر ہی ایسے شخص تھے جنھیں اپنی طرف تاکتے دیکھ کر اس کے دل کے تار گونجنے لگتے تھے۔ پر ان آنکھوں میں کتنی بے بسی تھی۔ کتنی معذرت کتنی التجا۔!!

رامیندر نے کنور صاحب کی طرف دیکھ کر کہا: تمھارے بابا اس قبر پر کیا کر رہے ہیں؟

سلوچنا کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ بولی، یہ ان کی پرانی عادت ہے۔

رامیندر : کسی مہاتما کی سمادھی ہے۔؟

سلوچنا نے اس سوال کو اڑا دینا چاہا۔ رامیندر کو یہ تو معلوم ہی تھا کہ سلوچنا کنور صاحب کی ایک داشتہ عورت کی لڑکی ہے۔ پر انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ اسی عورت کی قبر ہے اور کنور صاحب اس یادگار محبت کے پجاری ہیں۔ یہ سوال انھوں

نے ذرا بلند آواز میں کیا تھا۔ کنور صاحب اس وقت جوتے پہن رہے تھے آواز ان کے کانوں میں پڑگئی۔ جلدی سے جوتے پہن لیے اور قریب آ کر بولے۔ دنیا کی آنکھوں میں تو وہ مہاتما نہ تھیں پر میری آنکھوں میں تھیں اور ہیں۔ یہ میری الفت کا مزار ہے۔

سلوچنا کا جی چاہتا تھا وہاں سے بھاگ جائے۔ لیکن کنور صاحب کو زہرہ کی نوحہ خوانی میں مزہ آتا تھا۔ رامیندر کا استعجاب دیکھ کر بولے۔ اس میں وہ دیوی سورہی ہے جس نے دنیا کو میرے لیے جنت بنا دیا تھا۔ سلوچنا اسی کی یادگار ہے۔

رامیندر نے مزار کی طرف دیکھ کر کہا: اچھا۔

کنور صاحب نے دل میں اس یاد سے محظوظ ہو کر کہا۔ وہ زندگی ہی اور تھی پروفیسر صاحب۔ ایسی نفس کشی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ آپ کو فرصت ہو تو میرے ساتھ چلیے۔ آپ کو اپنی داستان محبت......!

سلوچنا نے قطع کلام کر کے کہا: وہ سنا نے کی چیز نہیں ہے دا دا جی۔!

کنور صاحب نے کہا : میں رامیندر بابو کو غیر نہیں سمجھتا۔

رامیندر کو اس داستان محبت میں نفسیات کا ایک عمیق مسئلہ چھپا ہوا نظر آیا۔ وہ کنور صاحب کے ساتھ ان کے گھر تک اور بہت دیر تک ان کی باتیں سنتے رہے۔ آج انھیں اس خواہش کے اظہار کا موقعہ ملا جو مہینوں سے الفاظ کی تلاش میں پریشان تھی۔ کنور صاحب نے انھیں گلے لگاکر ان کی التجا قبول کی۔ رامیندر نے اپنے رفیق حیات کے لیے جو ذہنی معیار قائم کیا تھا۔ سلوچنا اس پر پوری اتری تھی۔

کنور صاحب نے انھیں ٹٹولا۔ آپ نے اس معاملہ کے ہر ایک پہلو پر غور کرلیا ہے؟

رامیندر نے مضبوطی سے کہا۔ میں ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ اگر سماج ہمیں اتنی آزادی بھی نہیں دے سکتا تو ہم ایسے سماج میں رہنا ہی اپنی ذلت سمجھتے ہیں۔

کنور صاحب نے پھر کہا۔ لوگ خوب مضحکہ اڑائیں گے۔ !

رامیندر : مجھے یقین ہے کہ کوئی ذی فہم انسان نہ ہنسے گا۔ اور بے اصول آدمیوں کے ہنسنے کی مجھے پرواہ نہیں۔ !

کنور صاحب : تمھارے خاندان میں تو لوگ مخالفت نہ کریں گے ؟
رامیندر : میں تو آپ سے عرض کرچکا کہ مجھے کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ اگر میں برائی کروں یا کوئی ایسا کام کروں جو اخلاقاً قابل مذمت ہو۔ تو میں سماج کے فتوے کے سامنے شوق سے سر جھکا دوں گا۔ لیکن سماج کے بے جا ظلم کو برداشت کرنا اخلاقی کمزوری ہے۔

رامیندر کی اس دلیرانہ اصول پسندی نے کنور صاحب کو مطمئن کر دیا۔

(۲)

لیکن ڈاکٹر رامیندر کو اس وقت تک سماج کے ظلم کا تجربہ نہ تھا۔ جہاں جاتے ان کی عزت ہوتی تھی۔ تقریبوں اور پارٹیوں میں ان کے نام دعوتی خطوط آتے تھے۔ اپنی شادی کی تقریب میں انھوں نے جو شاندار دعوت دی تھی اس میں وہ سبھی حضرات شریک ہوئے جن سے انھیں ہمدردی کی امید تھی۔ لیکن جب سے سلوچنا گھر میں آئی ان کے یہاں مستورات کا آنا جانا تقریباً بند ہو گیا۔

مرد دوست اب بھی آتے تھے۔ بلکہ پیشتر کے مقابلہ میں ان کی آمدو رفت اور بڑھ گئی۔ صبح شام احباب کا تانتا لگا رہتا۔ سلوچنا ان کی خاطر وتعظیم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرتی۔ لیکن ان احباب کے ساتھ ان کی مستورات نہ آئیں۔ پہلے چند ماہ تو رامیندر نے ادھر توجہ نہ کی۔ لیکن جب کئی ماہ گذر گئے اور مستورات کا احتراز بدستور قائم رہا تو انھوں نے ایک دن سلوچنا سے کہا۔ یہ لوگ اپنی گھروالیوں کو نہیں لاتے۔

سلوچنا نے آہستہ سے کہا : ہاں دیکھتی تو ہوں۔
رامیندر : کیا عورتیں تم سے پرہیز تو نہیں کرتیں؟
سلوچنا : شاید کرتی ہوں۔
رامیندر : مگر یہ لوگ تو بڑے آزاد ہیں۔ ان کی عورتیں بھی کافی تعلیم یافتہ ہیں۔ پھر یہ کیا بات ہے؟

سلوچنا نے آہستہ سے کہا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

رامیندر نے کچھ دیر تامل کر کے کہا: ہم لوگ کسی دوسری جگہ چلے جائیں۔ تو کیا ہرج ہو؟ وہاں تو کوئی ہمیں نہ جانتا ہوگا۔

سلوچنا نے اب کی تیز لہجہ میں کہا۔ دوسری جگہ کیوں جائیں۔ ہم نے کسی کا کچھ بگاڑا نہیں ہے۔ کسی سے کچھ مانگتے نہیں۔ جسے آنا ہو آوے نہ آنا ہو نہ آوے۔ کسی دوسرے مقام پر جاکر منہ چھپانا مجھے تو مناسب نہیں معلوم ہو تا۔

رفتہ رفتہ رامیندر پر اب ایک اور حقیقت کھلنے لگی۔ جو خواتین کے احتراز سے کہیں زیادہ دل شکن۔ کہیں زیادہ ندامت آمیز اور نفرت انگیز تھی۔ رامیندر کو اب معلوم ہونے لگا کہ یہ حضرات جو آتے ہیں اور گھنٹوں بیٹھے قومی اور مجلسی امور پر مباحثے کیا کرتے ہیں۔ فی الواقع تبادلہ خیال کے لیے نہیں بلکہ نظارہ حسن کے لیے آتے ہیں۔ ان کی نگاہیں سلوچنا ہی کی متلاشی رہتی ہیں۔ ان کے کان اسی کی شکرریزیوں کے مشتاق رہتے ہیں۔ اس کے حسن وانداز کا لطف اٹھانا ہی ان کا مقصود ہے۔ یہاں انھیں وہ شرافت اور لحاظ نہیں مانع ہوتی جو کسی معزز آدمی کی بیٹی بہو کی طرف آنکھیں نہیں اٹھنے دیتی۔ وہ سوچتے ہیں یہاں انھیں ہر قسم کی آزادی ہے۔ کبھی کبھی جب رامیندر کی عدم موجودگی میں کوئی حضرت آجاتے اس وقت سلوچنا کے لیے سخت آزمائش کا سامنا ہوتا۔ وہ اپنی نگاہوں سے اپنی راز دارانہ باتوں سے اپنی ٹھنڈی آہوں سے اس پر ظاہر کر دینا چاہتے تھے کہ ہم بھی تمھارے شیدائیوں میں ہیں۔ اگر رامیندر کا تم پر سولہوں آنا حق ہے۔ تو زکوٰۃ کے طور پر ہم بھی ایک نگاہ، ایک تبسم کے مستحق ہیں۔ سلوچنا اس وقت زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

اب تک رامیندر اور سلوچنا دونوں کلب جایا کرتے تھے۔ وہاں آزاد خیالوں کا ایک جمگھٹ رہتا تھا۔ جب تک رامیندر کو کسی کی جانب سے شبہ نہ تھا وہ اسے اصرار کے ساتھ لے جاتا۔ سلوچنا کے پہنچتے ہی وہاں ایک زندہ دلی سی پیدا ہو جاتی۔ مجلس میں جان سی پڑجاتی۔ جس میز پر سلوچنا بیٹھتی اسی پر مجمع ہو جاتا۔ کبھی کبھی سلوچنا گاتی بھی تھی۔ اس وقت تو سارے مجمع پر نشہ طاری ہو جاتا کلب میں مستورات کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ مشکل سے پانچ چھ لیڈیاں آتی تھیں۔ مگر وہ سلوچنا سے زیادہ مخاطب نہ ہوتیں۔ نہیں بلکہ اپنے حرکات وکنایات سے اسے جتا دینا چاہتی

تھیں کہ تم مردوں کا دل خوش کرنے کے لیے ہو۔ مردوں کا دل خوش کرو۔ ہم شریف زادیوں کے پاس تمھاری کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن جب سے رامیندر پر یہ تلخ حقیقت روشن ہوئی انھوں نے کلب جانا چھوڑ دیا۔ دوستوں کے یہاں آمدورفت بھی کم کردی اور اپنے یہاں آنے والوں سے بے اعتنائی کرنے لگے۔ وہ چاہتے تھے میرے گوشہ تنہائی میں کوئی مخل نہ ہو۔ رفتہ رفتہ انھوں نے باہر آنا جانا چھوڑ دیا۔ گھر پر بیٹھے پڑھا لکھا کرتے۔ اپنے چاروں طرف انھیں احتراز اور دغا کی دیوار کھچی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کسی پر اعتماد نہ کر سکتے تھے۔ کہیں سے ہمدردی اور خلوص کی امید نہیں۔ دل سب سے بیزار تھا۔ بدطینت اور تنگ دل آدمیوں سے ملنے سے فائدہ ہی کیا۔ شروع سے محبت پسند آدمی تھے۔ اول درجہ کے یارباش۔ یہ گوشہ نشینی انھیں حد درجہ جانگزا معلوم ہوتی تھی۔ نہ کوئی سیر نہ تفریح۔ یہ تو قید تھی۔ جبری قید۔ اگرچہ وہ قول وفعل سے سلوچنا کی دل جوئی کرتے رہتے تھے لیکن سلوچنا کی باریک نگاہوں سے اب یہ چھپا نہ تھا کہ یہ حالت ان کے لیے روز بروز ناقابل برداشت ہوتی جاتی ہے۔ وہ دل میں سوچتی ان کی یہ حالت میرے ہی باعث تو ہے؟ میں ہی تو ان کی زندگی کا کانٹا ہوگئی۔ اگر میں نہ ہوتی تو کیوں انھیں ان دلآزاریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

آخر ایک دن اس نے رامیندر سے کہا۔ آج کل کلب کیوں نہیں چلتے؟ کئی ہفتے ہوئے گھر سے نکلے تک نہیں؟

رامیندر نے بے دلی سے کہا: میرا تو جی نہیں چاہتا۔ اپنا گھر سب سے اچھا ہے۔

طبیعت تو گھبراتی ہی ہوگی۔ تم تنہائی کے عادی کبھی نہیں رہے۔ یہ تپسیا کیوں کرتے ہو؟ میں تو نہ جاؤں گی۔ ان عورتوں سے مجھے نفرت ہوتی ہے۔ ان میں ایک بھی ایسی نہیں جس کے دامن پر سیاہ داغ نہ ہوں لیکن سیتا بنی پھرتی ہیں۔ مجھے تو ان کی صورت سے چڑھ ہو گئی ہے۔ لیکن تم کیوں نہیں جاتے؟ کچھ تفریح ہی ہو جائے گی۔

رامیندر: تفریح کیا خاک ہوگی۔ جب دل ہی اندر سے جل رہا ہو تو تفریح کہاں؟

سلوچنا چونک پڑی۔ آج پہلی بار اس نے رامیندر کے منہ سے ایسی بات سنی۔ وہ اپنی نگاہ میں خود مظلوم تھی۔ ذلت یا تحقیر جو کچھ تھی اس کی تھی۔ رامیندر کے لیے تو اب بھی سب دروازے کھلے ہوئے تھے۔ وہ جہاں چاہیں جاسکتے ہیں۔ جن سے چاہیں مل سکتے ہیں۔ ان کے لیے کون سا امر مانع ہے۔ مشکل تو میری ہے! مرد شہدے، عورتیں مغرور اور کینہ پرور!!

لیکن نہیں۔! اگر انھوں نے کسی دوسری شریف زادی سے شادی کی ہوتی۔ تو ان کی یہ حالت ہرگز نہ ہوتی۔ معزز گھرانوں کی عورتیں آتیں۔ آپس میں اتحاد اور خلوص پیدا ہوتا۔ ریشم میں ریشم کا پیوند لگ جاتا۔ مگر اب تو ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگا۔ یا ٹاٹ میں ریشم کا۔ بات ایک ہی ہے۔

رامیندر کو بھی فوراً معلوم ہو گیا کہ زبان سے ایک ایسی بات نکل گئی جس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ اسی بات کو زیادہ واضح اور ملائم انداز سے کہا جا سکتا تھا۔ انھوں نے فوراً اس کی تاویل کی۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ ہم اور تم الگ الگ ہیں؟ ہماری اور تمھاری زندگی ایک ہے۔ جہاں تمھاری قدر نہیں وہاں میں کیسے جا سکتا ہوں۔ مجھے بھی سماج کے ان رنگے سیاروں سے کراہیت ہو رہی ہے۔ میں قریب قریب ان سبھوں کے اندرونی حالات سے واقف ہوں۔ اونچے عہدوں یا بڑی بڑی ڈگریوں یا دولت سے کسی کی آتما نہیں پاک ہو جاتی۔ جو یہ لوگ کرتے ہیں وہ اگر کوئی کمتر درجہ کا آدمی کرتا تو اسے کہیں منہ دکھانے کی ہمت نہ ہوتی۔ مگر یہ لوگ اپنی ساری برائیاں آزاد خیالی کے پردہ میں چھپاتے ہیں۔ ان لوگوں سے دور ہی رہنا اچھا۔ !

سلوچنا کو تسکین ہو گئی۔

(۳)

دوسرے سال سلوچنا کی گود میں ایک چاند سی لڑکی کا ظہور ہوا۔ اس کا نام رکھا گیا شوبھا۔ کنور صاحب کی صحت کچھ خراب ہو رہی تھی۔ وہ ان دنوں منصوری میں تھے۔ یہ خبر پاتے ہی رامیندر کو تار دیا کہ زچہ اور بچہ کو لے کر یہاں آجاؤ۔

موسم اچھا ہے۔ لیکن رامیندر اس موقع پر نہ جانا چاہتے تھے۔ اپنے احباب کی شرافت اور آزاد خیالی کا ایک بار وہ آخری امتحان لینا چاہتے تھے۔ اس کے لیے اس سے بہتر موقع کیا ہو سکتا تھا۔ اس تقریب میں انھوں نے اعلیٰ پیانہ پر ایک دعوت کرنے کا فیصلہ کیا۔ گانے بجانے کی بھی تجویز ہوئی۔ کئی باکمال گویئے بلائے گئے۔ احباب کے نام دعوتی کارڈ بھیج دیے گیے۔ مسلم دوستوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ انگریزی، ہندوستانی اور مسلمانی ہرقسم کے کھانے کا انتظام تھا۔ پھلا ہاری مٹھائیاں بھی منگوائی گئی تھیں۔ تاکہ راسخ الاعتقاد واصحاب کو شکایت کا موقع نہ ہو۔ اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے کنور صاحب گرتے پڑتے منصوری سے آئے۔ برہی کے دن دعوت کی تاریخ تھی۔ دوپہر ہی سے نشستیں سجائی جانے لگیں۔ کوئی طشتریاں لگانے لگا کوئی دونے سجانے لگا۔ شام ہوتے ہوتے سارا انتظام مکمل ہو گیا۔ مدعو حضرات ایک ایک کر کے تشریف لانے لگے۔ کنور صاحب خود ان کا استقبال کر رہے تھے۔ نواب صاحب تشریف لائے۔ خان صاحب آئے۔ مرزا صاحب آئے۔ میر صاحب آئے غرض شہر کے مسلم رئیسوں میں بہت کم ایسے ہوں گے جو اس موقع پر جلوہ افروز نہ ہوئے ہوں۔ مگر پنڈت جی اور بابو جی اور لالہ صاحب اور چودھری صاحب اور ککڑ اور مہرا اور چوپڑہ اور کول اور ہکو اور سری واستو اور ماتھر اور دوبے اور چوبے سب عنقا تھے۔ گویا شہر میں ان کا وجود ہی نہ ہو۔ یہ سبھی احباب ہوٹلوں میں کھاتے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ دعوتیں اڑاتے تھے۔ شرابیں لنڈھاتے تھے۔ پھر آج کیوں تشریف نہیں لائے؟ اس لیے نہیں کہ چھوت کا خیال مانع تھا۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی شرکت کو اس شادی کے جواز کی سند سمجھتے تھے اور یہ سند دینی انھیں منظور نہ تھی۔ حیرت تو یہ تھی کہ انگریز احباب نے بھی قدر افزائی نہ کی۔ ہاں دوچار عیسائی جن کے حسب نسب کا کوئی پتہ نہ تھا آگئے۔ دس بجے رات تک کنور صاحب پھاٹک پر کھڑے رہے۔ اسلامی دعوت ختم ہوگئی۔ گانا شروع ہوا۔ مگر ہندو حضرات ابھی تک لاپتہ تھے۔ ہندوؤں کے شامیانے میں ایک متنفس بھی نہ تھا۔ رامیندر پرشاد ایک کرسی پر مغموم اور دل شکستہ سرجھکائے بیٹھے ہوئے تھے کہ کنور صاحب نے آکر کہا۔ اب لوگوں کا انتظار فضول ہے۔ سب سامان غریبوں کو دے دو۔ رامیندر نے افسردہ خاطر

ہو کر کہا۔'' جی ہاں! یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔

کنور : مجھے تو پہلے ہی اندیشہ تھا۔

رامیندر : مجھ سے حماقت ہوئی کہ یہ دعوت کی۔ یہ تو میری علانیہ توہین ہوئی۔

کنور : ہماری توہین نہیں ہوئی۔ خود ان لوگوں کی تنگ دلی کا پردہ فاش ہو گیا۔

رامیندر : خیر امتحان ہو گیا۔ کہیے تو ابھی جا کر ان لوگوں کی خبر لوں؟

کنور صاحب نے حیرت سے کہا: کیا ان کے گھر جا کر؟

رامیندر : جی ہاں! پوچھوں کہ آپ لوگ جو قومی اصلاح کے راگ الاپتے پھرتے ہیں وہ کس بل پر؟ یہی آپ کی اخلاقی ہمت ہے۔ !

کنور : فضول ہے۔ جا کر آرام سے لیٹو۔ نیک وبد کی سب سے بڑی پہچان اپنا ضمیر ہے۔ اگر ہمارا دل گواہی دے کہ یہ کام برا نہیں تو پھر ساری دنیا منہ پھیر لے ہمیں کسی کی پرواہ نہ کرنی چاہیے۔ میرے بھائی بند، عزیز رشتہ دار سب نے مجھے ترک کردیا۔ مگر میں نے کسی کی تنکے برابر بھی پروانہ کی۔ اور میرا خیال ہے کہ مجھے زندگی میں کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔

رامیندر : لیکن میں ان لوگوں کو یوں نہ چھوڑوں گا۔ ایک کا بخیہ ادھیڑ کر نہ رکھ دوں تو نام نہیں۔

یہ کہتے ہوئے وہ محفل میں جا بیٹھے۔ کنور صاحب نے طشتریاں اٹھوا اٹھوا کر غربا کو تقسیم کروانی شروع کیں۔

(۴)

رامیندر ابھی شام کی ہوا خوری کر کے سوئے ہی تھے کہ ارباب نشاط کا ایک مجمع سلوچنا کو مبارک باد دینے کے لیے آ پہنچا۔ ان کے ساتھ باجہ تھا۔ کئی عورتیں سروں پر تھال رکھے ہوئے تھیں۔ ایک لڑکی ناچ رہی تھی۔ اور سب کی سب گاتی بجاتی چلی آتی تھیں۔ یہ بدھاوا تھا۔ زہرہ کی ایک سگی بھتیجی تھی گلنار۔ بلا کی حسین اور خوش گلو۔ سلوچنا کے یہاں پہلے برابر آتی جاتی تھی۔ ادھر دوسال سے نہ آئی تھی۔ لڑکی کی ولادت کی خبر پاکر پھولی نہ سمائی۔ بدھاوا لے کر آ پہنچی۔ حسب دستور

اپنی سکھیوں، سہیلیوں کو بھی ساتھ لائی۔ اچھا خاصہ مجمع ہو گیا۔ اس پر شہر کے تماشائیوں کا اژدھام۔ پھاٹک پر ایک میلہ سا لگ گیا۔ رامیندر پرشاد نے یہ شوروغل سنا تو باہر آئے۔ گلنار نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ اور بولی بابوجی بیٹی مبارک! بدھاوا لائی ہوں۔!

رامیندر پرشاد کا سارا جسم مفلوج سا ہو گیا۔ سر جھک گیا۔ نہ منہ سے بولے نہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نہ وہاں سے ہلے۔ بس نقش دیوار بنے کھڑے رہ گئے۔ ایک بازاری عورت سے رسم پیدا کرنے کا خیال اس درجہ شرمناک اور پر اشکراہ تھا کہ اس کے سامنے ضمیر کی بلند آواز غائب ہو گئی۔ اتنا اخلاق بھی نہ برت سکے، کہ کمرہ میں لے جا کر بٹھا تو دیتے۔ آج پہلی بار انھیں اپنی ذلت کا خود احساس ہوا۔ احباب کی بے وفائی اور لیڈیوں کے احتراز کو وہ ان کی بے انصافی سمجھتے تھے۔ اپنی ذلت نہیں۔ کل کے واقعہ کو بھی انھوں نے سماج کے ظلم ہی سے منسوب کیا۔ لیکن یہ بدھاوا ان کی آزاد روی کے لیے بہت سنگین تھا۔ سلوچنا نے جس آب و ہوا میں پرورش پائی تھی وہ ایک شریف اور ممتاز ہندو خاندان کی آب و ہوا تھی۔ وہاں ان تعلقات کی چرچا تک نہ تھی۔ یہ سچ ہے کہ اب بھی سلوچنا ایک بار روزانہ زہرہ کے مزار کی زیارت کرنے جاتی تھی۔ مگر زہرہ اب ایک آسمانی وجود تھی۔ دنیاوی کثافتوں اور آلائشوں سے پاک۔ گلنار سے قرابت داری اور مراسم کا نباہ دوسری بات تھی۔ جو لوگ تصاویر کے سامنے سر جھکاتے اور نمسکار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ تصاوری پر پھول چڑھاتے ہیں۔ اور تلک لگاتے ہیں وہ بھی تو مورتی پوجا کی مذمت کرتے ہیں۔ ایک صریح ہے۔ دوسرا کنایہ۔ ایک نظروں کے سامنے ہے۔ دوسرا آنکھوں سے پوشیدہ۔

سلوچنا کل زچہ خانہ سے نکل چکی تھی۔ اپنے کمرہ میں پردہ کے سامنے کھڑی وہ رامیندر پرشاد کی پریشانی اور شش و پنج دیکھ رہی تھی۔ جس سماج کو اس نے اپنا معبود بنانا چاہا تھا۔ جس کے دروازہ پر سجدہ کرتے اسے برسوں ہوگئے تھے۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر اس کا دل اس وقت بے اختیار بغاوت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس کے جی میں آتا تھا گلنار کو بلا کر گلے لگالوں۔ جو لوگ میری بات بھی نہیں

پوچھتے ان کی خوشامد کیوں کروں۔ یہ بے چاریاں اتنی دور سے آئی ہیں۔ آخر مجھے اپنا ہی سمجھ کر تو۔ ان کے دل میں محبت تو ہے۔ یہ میرے رنج اور خوشی میں شریک ہو نے کو تیار تو ہیں۔ انھیں لالچ یہاں نہیں لائی۔ اپنی جیب سے خاصی رقم خرچ کرنی پڑی ہوگی؟ کس لیے؟ اسی لیے تو وہ کہ مجھے اپنا سمجھتی ہیں۔ ان کا خون اب بھی جوش کھاتا ہے۔

آخر رامیندر نے سر اٹھایا اور مصنوعی تبسم کے ساتھ گلنار سے بولے۔ ''آیئے۔ آپ لوگ اندر چلی آیئے۔ یہاں دھوپ ہے۔ یہ کہہ کر وہ آگے آگے راستہ دکھاتے ہوئے دیوان خانہ کی جانب چلے۔ کہ یکا یک ایک خادمہ نکلی اور گلنار کے ہاتھ میں ایک پرزہ دے کر چلی گئی۔ گلنا ر نے وہ پرزہ لے کر دیکھا اور اسے رامیندر پرشاد کے ہاتھ میں دے کر وہیں کھڑی ہو گئی۔ رامیندر نے پرزہ دیکھا۔ لکھا تھا بہن گلنار! تم یہاں ناحق آئیں۔ ہم لوگ یونہی ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ اب اور رسوا مت کرو۔ بدھاوا واپس لے جاؤ۔ بچی کے لیے دعا کرنا۔ کبھی ملنے کا جی چاہے تو رات کو آنا اور اکیلے۔ میرا جی تمھارے گلے لپٹ کر رونے کے لیے بے قرار ہو رہا ہے۔ مگر مجبور ہوں۔

رامیندر نے پرزہ پھاڑ کر پھینک دیا۔ اور دلیرانہ انداز سے بولے:

''انھیں بکنے دو۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ اندر آؤ۔''

گلنار نے ایک قدم پیچھے پھرکر کہا۔ نہیں بابو جی۔ اب مجھے اجازت دیجیے جاؤں گی۔

رامیندر : ایک منٹ تو بیٹھو۔

گلنار : جی نہیں۔ ایک سکنڈ بھی نہیں۔ میں نے بڑی حماقت کی۔ کہ بے سوچے سمجھے یہ سب تیاریاں کر بیٹھی۔

یہ کہتی ہوئی وہ الٹے قدم واپس ہو گئی۔ خوان اور طشت سب جوں کے توں لوٹ گئے۔

رامیندر کا چہرہ زرد تھا۔ سر جھکا ہوا۔ آنکھوں میں اعتراف گناہ کی جھلک تھی۔ وہ خود داری، وہ غصہ جائز جو بے انصافی کے احساس سے پیدا ہوتا ہے رخصت ہو

گیا تھا۔ اس کی جگہ ندامت اور پشیمانی تھی۔ اپنی شکست کا ذلت آمیز احساس! اس گلنار کو بدھاوے کی کیوں سوجھ گئی۔ یوں تو کبھی آتی جاتی نہ تھی آج بلائے بے درماں کی طرح کھوپڑی پر سوار ہوگئی۔ اپنے دل میں سمجھتی ہوگی میری بڑی قدر ہوگی۔ لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ کنور صاحب اتنے آزاد خیال ہوں گے۔ انھوں نے زہرہ کے خاندان والوں سے بھائی چارے کا نباہ کیا ہوگا۔ میں اتنا آزاد نہیں ہوں کہیں سلوچنا اس کے پاس آتی جاتی تو نہیں۔ مجھ سے تو اس نے کبھی اس گلنار کا ذکر بھی نہیں کیا۔ مگر پوشیدہ خط و کتابت کرتی ہوگی۔ ورنہ گلنار کو یہاں آنے کی ہمت نہ ہوتی۔ کنور صاحب عیاش تھے ہی۔ ان کے گھر بدھاوے آتے ہوں گے۔ ان کے گھر سے بانٹے جاتے ہوں گے۔ ہولی، دیوالی، عید، بقرعید کی تقریبوں میں دعوتیں اڑتی ہوں گی۔ سلوچنا نے لکھا بھی تو ہے کہ ملنے کی جی چاہے تو رات کو آنا اور اکیلی۔ جی تمھارے گلے لپٹ کر رونے کے لیے بے قرار ہو رہا ہے کیوں نہ لکھے۔ خو بو وہی ہے۔ سرشت وہی، ضمیر وہی، نگاہ وہی، معیار وہی، مانا کنور صاحب کے گھر میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ مگر خون کا اثر اتنی جلد زائل نہیں ہو سکتا۔ اچھا دونوں بہنیں ملتی ہوں گی تو ان میں کیا باتیں ہوتی ہوں گی۔ علمی یا تاریخی چرچا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بازاری گفتگو ہوتی ہوگی۔ گلنار اپنے تجربات بیان کرتی ہوگی۔ بازار حسن کے خریداروں اور دکانداروں کے عیب و ہنر پر بحث ہوتی ہوگی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ گلنار اس کے پاس آتے ہیں اپنے کو بھول جائے۔ اور کوئی بھدی، معیوب اور شرمناک بات نہ کرے۔ ان میں اتنی تہذیب اتنی متانت کہاں! اپنی فتوحات کی داستان کہتے کسے برا معلوم ہوتا ہے۔

مگر انسان بغیر کسی سے ملے جلے رہ بھی تو نہیں سکتا۔ یہ بھی تو ایک طرح کی بھوک ہے، بھوک میں اگر صاف کھانا نہ ملے تو انسان جھوٹا کھانے سے بھی تو گریز نہیں کرتا۔ ہمارے دوست احباب نے ہی تو یہ حالت پیدا کی ہے۔ اگر یہ لوگ سلوچنا کو اپنا بناتے، اس سے یوں احتراز نہ کرتے، اسے ذلیل نہ سمجھتے، تو اسے کیوں ایسے آدمیوں سے ملنے کی خواہش ہو تی۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ ساری خطا ہمارے سماج کی ہے۔ جو ہمیں سنبھلنے نہیں دیتا۔ ہمیں اپنے ماضی کو تازہ رکھنے پر مجبور

کرتا ہے۔ ہمیں گڈھے سے نکلنے نہیں دیتا۔ اگر یہ لوگ سلوچنا سے ہمدردی کرتے، اس کی عزت کرتے تو اس کے دل میں اپنی روایات ماضی سے خود بخود نفرت پیدا ہوتی۔ اس کے دل میں خود بخود روشنی جلوہ نما ہوتی۔ اس کی تحقیر کر کے ان لوگوں نے اسے اس طرف مائل ہو نے پر مجبور کیا ہے۔!

کنور : تو یہ کہو تمھارے ایما سے واپس کیا گیا ہے۔ تم نے اس طبقہ کو اپنی طرف کھینچنے کا کتنا نادر موقعہ کھودیا ہے۔ سلوچنا کی مثال کا جو کچھ تھوڑا بہت اثر پیدا ہوا تھا وہ تم نے مٹا دیا۔ بہت ممکن تھا کہ تمھاری ہمدردی اور اخلاق اور ایک معزز آدمی سے رشتہ رکھنے کا خیال اس کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز کرتا۔ آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہر ایک برائی مجبوری سے پیدا ہوتی ہے۔ چور اس لیے چوری نہیں کرتا کہ چوری کرنے میں اسے کوئی لطف حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ ضرورت اسے مجبور کرتی ہے۔ ہاں وہ ضرورت واقعی ہے یا خیالی اس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ بیوی کے لیے میکہ جا تے وقت کوئی زیور بنوانا ایک آدمی کے لیے ضروری ہو سکتا ہے۔ دوسرے کے لیے بالکل غیرضروری۔ فاقہ کشی کی حالت میں ایک آدمی اپنا ایمان کھو سکتا ہے۔ دوسرا مرجائے گا مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے گا۔ مگر قدرت کا یہ قانون آپ جیسے عالموں کی نہ بھول جانا چاہیے کہ زندہ رہنا فطرت کا پہلا اصول ہے زندہ رہنے کے لیے انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ زندہ رہنا ہر ایک آدمی کے لیے جتنا ہی مشکل ہوگا۔ اتنی ہی برائیوں کی تعداد بھی بڑھے گی۔ جتنا ہی آسان ہوگا اتنی ہی برائیاں کم ہوں گی۔سماج کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ زندہ رہنا ہر ایک آدمی کے لیے آسان ہو۔ رامیندر بابو آپ نے اس وقت ان غریبوں کے ساتھ وہی کیا جو دوسرے آپ کے ساتھ کررہے ہیں اور جس کا آپ کو بے حد صدمہ ہے۔

رامیندر پرشاد نے اس لمبی تقریر کو اس طرح سنا گو یا کوئی دیوانہ بک رہا ہو۔ اس قسم کی دلیلیں وہ بارہا سن چکے تھے۔ اور خود ان کا استعمال کر چکے تھے۔ ان کا جواب دینے کی انھیں ضرورت نہ تھی۔ جب دل پر کوئی چوٹ لگتی ہے تو دلیلوں سے آدمی کی تشفی نہیں ہوتی۔ جس کے روپے لٹ گئے ہوں۔ اس کے لیے تقدیر یا ایشور

کی مرضی کی دلیل کوئی معنی نہیں رکھتے۔ بازاری عورتوں کا دروازے پر رشتہ دار کی حیثیت سے اتنا شرمناک اور ذلت آمیز تھا کہ رامیندر کسی دلیل سے قائل ہو کر اسے قبول نہ کر سکتے تھے۔ نفرت دلیلوں کی محکوم نہیں۔ لاپروائی سے بولے میں ایسے آدمیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ زہر اپنے گھر میں نہیں پھیلانا چاہتا۔

اسی اثنا میں سلوچنا بھی کمرہ میں آ گئی۔ زچگی کا اثر ابھی چہرہ اور جسم پر باقی تھا جسم لاغر تھا اور چہرہ زرد۔ رامیندر اسے دیکھ کر ذرا تیز ہوگئے۔ وہ اس پر ظاہر کر دینا چاہتے تھے کہ میں ایک حد تک جاسکتا ہوں۔ اس کے آگے میں کسی طرح قدم نہ اٹھاؤں گا۔ مجھے اس حد سے آگے لے جانے کی کوشش کامیاب نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا نتیجہ برا ہوگا۔ اسی سلسلہ میں بولے:

''میں یہ کبھی نہ گوارا کروں گا کہ کوئی بازاری عورت کسی وقت اور کسی حالت میں میرے گھر میں آئے۔ رات اس قید سے مستثنیٰ نہیں۔ اور نہ تنہا یا صورت تبدیل کرکے آنے سے ہی اس برائی کا اثر دور ہو سکتا ہے۔ میں سوسائٹی کی حرف گیریوں سے نہیں ڈرتا اس اخلاقی زہر سے ڈرتا ہوں۔ میرے ساتھ رہ کر تمام پرانے ناتے توڑ دینے پڑیں گے۔ کوئی حیلہ، کوئی عذر سننے کی مجھے تاب نہیں ہے۔

سلوچنا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس قید میں اکیلی جان دوں۔ کوئی تو ہو جس سے آدمی ہنسے بولے۔

رامیندر نے گرم ہو کر کہا: ہنسنے بولنے کا شوق تھا تو میرے ساتھ شادی نہ کرنی چاہیے تھی۔ وواہ کا بندھن بڑی حدتک تیاگ کا بندھن ہے۔ جب تک دنیا کا یہ نظام قائم ہے اور عورت خاندان کی عزت وحرمت کی ذمہ دار اور امین سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت تک کوئی مرد یہ نہ قبول کرے گا۔ کہ اس کی بیوی ایسے آدمیوں سے کسی قسم کا تعلق رکھے۔ جن کے اطوار اور کردار برے ہیں۔

کنور صاحب کو معلوم ہو گیا۔ کہ اس طرح ردوکد کرنے سے رامیندر اور سخت ہوتے جائیں گے۔ اور اصلی منشا فوت ہو جائے گا۔ اس لیے انھوں نے زیادہ سنجیدگی سے کہا: لیکن بیٹا! یہ کیوں خیال کرتے ہو کہ ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ عورت دوسروں کا اثر قبول کرے گی۔ اپنا اثر بالکل نہ ڈالے گی۔

رامیندر : ان معاملات میں، میں تعلیم کا قائل نہیں۔ تعلیم ایسی کتنی ہی باتوں کو جائز قرار دیتی ہے جو رسم و رواج اور قدیم روایات کے اعتبار سے مذموم ہیں۔ فلسفہ ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ وہ شادی کو حیوانی ضرورت سمجھتا ہے اور اس معاملہ میں جذبات اور نازک احساسات کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔ اگر پاؤں پھسل جائیں تو ہم انھیں کاٹ کر پھینک نہیں دیتے۔ پھر اگر جسم کا کوئی حصہ لغزش کرے تو وہ کیوں قابل بریدنی سمجھا جائے۔ یہ منطق کی دلیل ہے۔ اور آپ مجھے معاف رکھیں۔ فی الحال میں اس دلیل کے سامنے سر جھکانے کو تیار نہیں ہوں۔ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ رہ کر پرانے تعلقات مٹادینے پڑیں گے۔ اتنا ہی نہیں، دل کو ایسا بنا لینا پڑے گا کہ ایسی صحبتوں سے اسے خود کراہیت ہو۔ ہمیں اس طرح زندگی بسر کرنی پڑے گی۔ کہ سماج اپنی غلطی پر نادم ہو اور خندہ پیشانی سے ہمارا خیر مقدم کرے۔ نہ یہ کہ ہم ایسا طرز معاشرت اختیار کریں۔ جس سے دوسروں کو اپنے احتراز کو جائز سمجھنے کا موقع ملے۔

سلوچنا نے بے نیازی کی شان سے کہا: کوئی عورت اتنی بدگمانی کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اور نہ وہ اس قید کو برداشت کر سکتی ہے۔ آپ کو کیا حق ہے کہ آپ اس کے رہنما بنیں؟ وہ آپ کی آنکھوں سے کیوں دیکھے؟ اسے یہ فیصلہ کرنے کا حق ہے کہ کیا چیز اس کے لیے مضر ہے اور کیا چیز مفید ہے؟

کنورصاحب خائف ہو کر بولے: سلوچنا! تم بھولی جاتی ہو کہ مباحثہ میں ہمیشہ ملائم الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے۔ ہم جھگڑا نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک مسئلہ پر دوستانہ مباحثہ کر رہے ہیں۔

سلوچنا نے بے باکانہ انداز سے کہا: یہ دوستانہ مباحثہ نہیں ہے۔ میرے لیے بیڑیاں تیار کی جارہی ہیں۔ میں ان بیڑیوں کو نہیں پہن سکتی میں اپنے ضمیر کی آزادی کو اتنا ہی عزیز سمجھتی ہوں جتنا کوئی مرد سمجھتا ہے اور کسی حالت میں اسے قربان نہیں کر سکتی۔

رامیندر نے اپنی زیادتی کو محسوس کرکے کہا: میں نے تمھارے ضمیر کی آزادی کو چھیننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اور نہ میں اتنا سنگدل ہوں۔ لیکن تمھارے کسی فعل کو

میں معیوب سمجھوں تو کیا تمھیں سمجھانے کا مجھے حق نہیں ہے؟
سلوچنا : اتنا ہی ہے جتنا تمھیں سمجھانے کا مجھے ہے۔ تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔
رامیندر : میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔
سلوچنا : اگر میں اپنے کسی عزیز سے ربط ضبط رکھوں تو آپ کی عزت میں خلل پڑتا ہے۔ کیا اسی طرح آپ یہ تسلیم کریں گے کہ آپ کسی بازاری عورت سے آمدورفت رکھیں تو میری عزت میں خلل پڑتا ہے۔
رامیندر : ہاں! میں یہ مانتا ہوں۔
سلوچنا : آپ کا کوئی بھائی آجائے تو محض اس بنا پر کہ اس کا تعلق کسی بازاری عورت سے ہے آپ اسے دروازے سے دھتکار دیں گے؟
رامیندر : تم مجھے اس کے لیے مجبور نہیں کر سکتیں۔
سلوچنا : اور آپ مجھے مجبور کر سکتے ہیں۔
رامیندر : بے شک۔
سلوچنا : کیوں۔؟
رامیندر : اس لیے کہ میں اس چھوٹے سے خاندان کا جزو اعظم ہوں۔اس لیے تمھارے باعث ہی مجھے.......... رامیندر کہتے کہتے رک گئے۔ مگر سلوچنا ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ تاڑ گئی۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ گویا سینہ میں برچھی لگ گئی۔ جی میں بے اختیار ایک طوفان اٹھا کہ اسی وقت یہ گھر چھوڑ کر ساری دنیا سے ناتا توڑ کر چلی جاؤں اور پھر انھیں منہ نہ دکھاؤں۔ اگر اسی کا نام شادی ہے کہ کسی ایک آدمی کی مرضی کی غلام ہو کر رہوں۔ وہ رات کو دن کہے تو اس کی ہاں میں ہاں ملاؤں تو اس شادی کو دور ہی سے سلام ہے۔

وہ طیش میں آکر کمرہ سے نکلی اور باہر کی طرف قدم اٹھایا۔ مگر کنور صاحب نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور بولے کیا کرتی ہو بیٹا! گھر میں جاؤ۔ کیوں روتی ہو؟ ابھی تو میں زندہ ہوں۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ یہ تو نہیں جانتا۔ لیکن جب تک زندہ ہوں تمھیں کس بات کا غم ہے؟ رامیندر بابو نے کوئی ایسی بات نہیں کہی اور نہ کہنی چاہتے تھے۔ پھر آپس کی باتوں کا کیا برا ماننا۔ کسی موقع پر تم بھی جو جی میں

آ وے کہہ لینا۔

یوں سمجھاتے ہوئے کنور صاحب اسے گھر میں لے گئے۔ حقیقتاً سلوچنا کے دل میں کبھی گلنار سے ملنے کی خواہش نہ ہوئی تھی۔ وہ اس سے خود احتراز کرتی تھی۔ ایک عارضی غصہ کی حالت اس نے گلنار کو وہ پرزہ لکھ دیا تھا۔ مگر وہ خود سمجھتی تھی کہ ان لوگوں سے ربط ضبط رکھنا مناسب نہیں۔ لیکن رامیندر کی طرف سے یہ ممانعت ہوئی۔ یہی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ یہ کیوں مجھے منع کریں۔ کیا میں اتنا بھی نہیں سمجھتی؟ کیا انھیں میری طرف سے اتنی بدگمانی تھی۔ یہ بدگمانی اسی لیے تو ہے کہ میں .... انھیں میرے ساتھ مطلق ہمدردی نہیں! صریح دیکھتے ہیں کہ وہ دن بھر گھر میں پڑی رہتی ہوں۔ نہ کوئی آدمی نہ آدم زاد؟ تمھیں تو میری دلدہی کے لیے خود گلنار کو کبھی کبھی بلا لینا چاہیے تھا۔ مجھے خود اس سے مل آنے کے لیے تقاضا کرنا تھا۔ میں ایسی نادان نہ تھی۔ کہ گلنار سے ملنے جاتی۔ یہ سب تو کچھ نہ ہوا۔ الٹے اور گلا دبانے کو تیار ! جسے محبت ہو وہ کبھی اتنا بے درد نہیں ہو سکتا۔ محبت نہیں۔ بس بات یہی ہے۔ میں ابھی ابھی جاؤں گی۔ گلنار سے ملنے جاؤں گی۔ دیکھوں کوئی میرا کیا کرتا ہے۔

پیار میں پلی ہوئی سلوچنا کو کبھی کسی نے تیکھی نظروں سے دیکھا تک نہ تھا۔ کنور صاحب اس کی مرضی کے غلام تھے۔ رامیندر بھی اتنے دنوں اس پر نثار ہوتے رہے۔ آج یکایک یہ جھڑکی اور پھٹکار پاکر اس کا خودسر ول الفت دل الفت ومحبت کے سارے رشتوں کو پیروں سے کچل ڈالنے کے لیے بے قرار ہو اٹھا۔ وہ سب کچھ سہہ لے گی۔ مگر یہ ذلت، یہ جبری قید، یہ دھونس اس سے نہ سہی جائے گی۔ اس نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر سائیس سے کہا۔ گاڑی تیار کرو مجھے چوک جانا ہے ابھی لاؤ۔

کنور صاحب نے چمکار کر کہا : بٹی سلّو ! کیا کرتی ہو۔ میرے اوپر ترس کھاؤ اس وقت کہیں مت جاؤ۔ ورنہ ہمیشہ کے لیے پچھتانا پڑے گا۔ رامیندر بابو بھی بڑے غصہ ور آدمی ہیں۔ انھیں کا کہا مان لو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں تمھاری ماں جب زندہ تھی بارہا ایسی نوبت آئی کہ میں نے اس سے کہا گھر سے نکل جاؤ۔ مگر اس

محبت کی دیوی نے کبھی ڈیوڑھی کے باہر پاؤں نہیں نکالا۔ اس وقت تحمل سے کام لو۔ مجھے یقین ہے کہ ذرا دیر میں رامیندر خود نادم ہو کر تمھارے پاس اپنی خطا معاف کرانے آئیں گے۔

یکایک رامیندر نے آ کر پوچھا : گاڑی کیوں منگوائی ؟ کہاں جارہی ہو؟

رامیندر کا چہرہ اتنا غضب ناک ہو رہا تھا کہ سلوچنا سہم اٹھی۔ دونوں آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اسے یہ کہنے کی ہمت نہ پڑی کہ کہہ دے گلنار کے گھر جاتی ہوں۔ شاید اسے خوف ہوا گلنار کا نام لیتے ہی یہ میری گردن پر سوار ہو جائیں گے۔ حفظ جان کا خیال غالب آیا۔ گردن جھکا کر بولی۔ ذرا اماں کے مزار تک جاؤں گی۔

رامیندر نے تحکمانہ انداز سے کہا : کوئی ضرورت نہیں وہاں جانے کی۔

سلوچنا نے ناگ کی طرح پھنکار کر کہا: کیا اماں کے مزار کی زیارت کی بھی مخالفت ہے؟

رامیندر نے اسی انداز سے کہا: ہاں۔!

سلوچنا : تو پھر اپنا گھر سنبھالو۔ میں جاتی ہوں۔

رامیندر : جاؤ، تمھارے لیے کیا، یہ گھر نہ سہی، دوسرا گھر سہی۔

ابھی تک تسمہ باقی تھا وہ بھی کٹ گیا۔ یوں شاید سلوچنا یہاں سے کنور صاحب کے بنگلہ پر جاتی۔ دو چار دن روٹھی رہتی۔ پھر رامیندر پرشاد اسے منالاتے اورمعاملہ طے ہو جاتا۔ لیکن اس چوٹ نے مصالحت اور تفہیم کی جڑ کاٹ دی۔ سلوچنا دروازہ تک پہونچی تھی۔ وہیں کھڑی رہ گئی۔ گویا سارے اعضا مفلوج ہو گیے ہوں۔ گویا کسی رشی کے شراپ نے اس کے پران کھینچ لیے ہوں۔ وہیں بیٹھ گئی کچھ جواب نہ دے سکی۔ کچھ سوچ نہ سکی۔ جس کے سر پر بجلی گر پڑی ہو۔ اس میں راکھ کے سوا اور کیا باقی رہ جاتا ہے۔ سوچنے والا دماغ کہاں؟ رونے والا دل کہاں؟ بولنے والی زبان کہاں؟ یہ سب تو جل کر راکھ ہو گئے۔ وہاں اب کیا ہے۔ رامیندر کے یہ الفاظ بجلی سے کہیں زیادہ قاتل تھے۔

سلوچنا کب تک وہاں بیٹھی رہی اسے کچھ خبر نہ تھی۔ جب اسے کچھ ہوش آیا

تو گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گھڑی کی طرف نگاہ گئی۔ ایک بج رہا تھا۔ سامنے آرام کرسی پر کنور صاحب نوزائیدہ بچی کو گود میں لیے سو گئے تھے۔ برآمدہ میں دائی بیٹھی جمہائیاں لے رہی تھی۔ سلوچنا نے اٹھ کر برآمدہ میں جھانکا رامیندر اپنے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ اس کے جی میں آیا اسی وقت ان کے سامنے جاکر کلیجہ میں چھرا مار لوں۔ اور انھیں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرجاؤں۔ وہ مہلک الفاظ یاد آ گئے۔

ہائے! ان کے منہ سے وہ الفاظ نکلے کیوں کر۔! اتنے مہذب اور بے دار مغز اور روشن خیال ہو کر بھی وہ زبان پر ایسے الفاظ کیوں کر لا سکے؟ اس کی ساری نسائیت، ہندوستانی عصمت کی ازلی روایات میں پلی ہوئی، زمین پر مجروح پڑی اپنی بے کسی پر رو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی اگر میرے نام پر یہ داغ نہ ہوتا۔ میں بھی شریف زادی ہوتی تو کیا یہ الفاظ ان کے منہ سے نکل سکتے۔ ہرگز نہیں۔ لیکن میں بدنام ہوں۔ کمزور ہوں بے کس ہوں۔ ذلیل ہوں مجھے سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔

برآمدہ میں بجلی کی روشنی تھی۔ رامیندر کے چہرہ پر ندامت یا خجالت کا نام بھی نہ تھا۔ غصہ کی کرختگی اب بھی ان کے چہرہ پر مسلط تھی۔ شاید ان آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اب بھی سلوچنا کے مجروح دل کو تشفی ہوتی۔ لیکن وہاں تو ابھی تک تلوار کھچی ہوئی تھی۔

سلوچنا پھر الٹے قدم آئی۔ کنور صاحب کی آنکھیں اب بھی بند تھیں چہرہ پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔شاید روتے رو تے سو گئے تھے۔ سلوچنا نے ان کے پیروں کے پاس بیٹھ کر سچی عقیدت کے آنسو بہائے۔ ہاں مجھ بدنصیب کے لیے انھوں نے کتنی ذلتیں اٹھائیں۔ کتنی تکلیفیں سہیں۔ اپنی ساری زندگی مجھ پر نثار کر دی۔ اور اس کا یہ حسرت ناک انجام۔

سلوچنا نے پھر بچی کو دیکھا۔ مگر اس کا گلاب کا سا شگفتہ چہرہ دیکھ کر بھی اس کے دل میں ماتا نے جوش نہ مارا۔ اس نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ یہ اس ذلت کی یادگار ہے۔ جو اتنے دنوں مجھے بھوگنی پڑی۔ میں اس کے لیے کیوں اپنی جان آفت میں ڈالوں۔ اگر اس کے باپ کو اس کی محبت ہے تو پالے۔ اور ایک دن وہ بھی اس طرح ذلیل ہو۔ جس طرح آج میرے دادا کو ذلیل ہونا پڑ رہاہے۔

اس کے دل میں خیال آیا صبح رامیندر سو کر اٹھیں گے تو مجھے روتے دیکھ کر ان کا دل کتنا خوش ہوگا۔ نہیں میں انھیں خوش نہ ہونے دوں گی۔ جان دینا ایسا کیا مشکل ہے۔ اور پھر زندہ رہوں تو کس امید پر؟ اس طرح رو رو کر دن کاٹنے کے لیے نہیں۔ یوں جینا نہیں چاہتی۔ بہت جی چکی۔ اب دن بدن اور زیادہ درگت ہوگی۔ ایشور! اب کی اگر جنم دیتا تو کسی بھلے آدمی کے گھر جنم دیتا۔ اس دنیا سے اور اس زندگی سے جی بھر گیا.........................

جہاں زہرہ کا مزار تھا۔ اس کے بغل میں ایک دوسرا مزار ہے۔ زہرہ کے مزار پر گھاس جم گئی ہے۔ جا بجا سے چونہ گر گیا ہے لیکن دوسرا مزار بہت صاف ستھرا اور آراستہ ہے۔ اس کے چاروں طرف گملے رکھے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف سرو کے درخت ہیں اور مزار تک جانے کے لیے ان درختوں کے بیچ روشیں بنی ہوئی ہیں۔ شام ہو گئی ہے۔

ایک آدمی ایک تین سال کی بچی کو گود میں لیے ہوئے آیا۔ اور اس مزار کی خاکروبی کرنے لگا۔ لڑکی دوڑ کر تتلیاں پکڑنے لگی۔ اس آدمی نے جھاڑو لگائی۔ پھر کنوئیں سے پانی کھینچ کر سینچنے لگا۔ روشوں میں جو پتیاں پڑی تھیں۔ وہ چن کر صاف کیں۔ ...... یہ سلوچنا کا مزار ہے۔

اس کی آخری وصیت تھی۔ کہ میری لاش جلائی نہ جاوے مجھے میری ماں کے پہلو میں سلا دیا جائے۔

کنور صاحب تو سلوچنا کے بعد چھ مہینے سے زیادہ نہ چل سکے۔ رامیندر رسم قدیم نبھاتے جاتے ہیں۔

شوبھا اب تین سال کی ہوگئی ہے۔ اور اسے یقین ہے کہ اس کی ماں ایک دن اسی مزار سے نکلے گی۔

پہلی بار الہ آباد کے ہندی ماہنامہ ''مایا'' کے جنوری 1930 کے شمارے میں شائع ہوا۔ ہندی میں عنوان تھا ''دو قبریں'' اردو میں یہ پریم چالیسی میں شامل ہے۔ مان سروور چار میں شامل ہے۔

آشیاں برباد

(۱)

مردلا مجسٹریٹ کے اجلاس سے زنانہ جیل میں واپس آئی تو اس کا چہرہ شگفتہ تھا۔ بری ہو جانے کی گلابی امید اس کے رخساروں پر چمک رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی سیاسی قیدیوں کے گروہ نے اسے گھیر لیا۔ اور پوچھنے لگیں۔ ''کتنے دن کی ہوئی بہن۔''

مردلا نے فاتحانہ انداز سے کہا۔'' میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ میں نے دھرنا نہیں دیا۔ یوں آپ زبردست ہیں جو فیصلہ چاہیں کریں۔ نہ میں نے کسی کو روکا نہ پکڑا، نہ دھمکایا۔ کسی سے آرزو منت نہیں کی۔ کوئی خریدار میرے سامنے نہیں آیا۔ ہاں میں دوکان پر کھڑی ضرور تھی۔ وہاں کئی والنٹیر گرفتار کر لیے گئے تھے۔ خلقت جمع ہو گئی تھی۔ پس میں بھی کھڑی ہو گئی تھی۔ تھانیدار نے آ کر مجھے گرفتار کر لیا۔ چھمادیوی کچھ قانون جانتی تھی۔ بولی ایک طرح سے اپنی صفائی دینے کے برابر ہے۔

مردلا نے فوراً تردید کی۔ میں مقدمہ کی کارروائی میں شریک نہ ہونا چاہتی تھی لیکن جب میں نے ان لوگوں کو صریح جھوٹ بولتے دیکھا تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے ان سے جرح کرنا شروع کی۔ میں نے بھی اتنے دنوں گھاس نہیں کھودی ہے۔ تھوڑا سا قانون جانتی ہوں۔ پولیس والوں نے سمجھا ہوگا یہ کچھ بولے گی تو ہے نہیں۔ ہم جو بیان چاہیں گے دے دیں گے۔ جب میں نے جرح شروع

کی تب سب بغلیں جھانکنے لگے۔ میں نے تینوں گواہوں کے بیان کو فرضی ثابت کر دیا۔ اس وقت جانے مجھے کیوں نکتے سوجھتے گئے۔ مجسٹریٹ نے تھانہ دار صاحب کو دو تین بار پھٹکار بھی بتائی۔ وہ میرے سوالوں کا اول جلول جواب دیتا تھا تو مجسٹریٹ بول اٹھتا تھا۔ وہ جو کچھ پوچھتی ہیں اس کا جواب دیجیے۔ فضول کی باتیں کیوں کرتے ہو۔ تب حضرت کا چہرہ ذرا سا نکل آتا۔ میں نے سبھوں کو لاجواب کر دیا۔ ابھی مجسٹریٹ نے فیصلہ نہیں سنایا۔ لیکن مجھے یقین ہے بری ہو جاؤں گی۔ میں جیل سے نہیں ڈرتی لیکن بے وقوف بھی نہیں بننا چاہتی۔ وہاں سکریٹری صاحب بھی تھے۔ اور بہت سے بہنیں تھیں سب یہی کہتے تھے چھوٹ جاؤں گی۔

عورتیں اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی ایک ایک کر کے چلی گئیں۔ ان میں سے کسی کی میعاد سال بھر کی تھی۔ کسی کی چھ مہینے کی۔ کسی نے بھی عدالت کی کارروائی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ان کے مشرب میں یہ کفر سے کم نہ تھا۔ مردلا پولیس سے جرح کر کے ان کی نظروں میں گر گئی تھی۔

دور جاکر ایک دیوی نے کہا۔" اس طرح تو ہم لوگ بھی چھوٹ جاتے۔ ہمیں تو یہ دکھانا ہے کہ سرکاری عدالتوں سے ہمیں انصاف کی کوئی امید نہیں۔

دوسری خاتون بولیں۔ "یہ تو معافی مانگنے کے برابر ہے۔ گئی تھیں دھرنا دینے ورنہ دوکان پر جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ والنٹیر گرفتار ہوئے تھے آپ کی بلا سے، آپ وہاں گئی کیوں۔ مگر اب کہتی ہیں میں دھرنا دینے گئی ہی نہیں۔ یہ تو معافی مانگنا ہوا۔"

تیسری دیوی نے فرمایا جیل میں رہنے کے یے بڑا کلیجہ چاہیے۔ اس وقت تو واہ واہ کہلانے کے لیے آ گئیں۔ ایسی عورتوں کو تو قومی کام کے نزدیک ہی نہ آنا چاہیے۔ تحریک کو بدنام کرنے سے فائدہ؟

(۲)

صرف چھما دیوی مردلا کے پاس اب تک متفکر کھڑی تھی۔ اس نے ایک تقریر کرنے کے الزام میں سال بھر کی سزا پائی تھی۔ دوسرے ضلع سے تبدیل ہو کر ایک

مہینہ ہوا یہاں آئی تھی۔ ابھی میعاد پوری ہونے میں آٹھ ماہ باقی تھے۔ یہاں کے پندرہ قیدیوں میں سے کسی سے اس کا دل نہ ملتا تھا۔ ذرا ذرا سی باتوں کے لیے ان کا آپس میں جھگڑنا، آرائش وشوق کی چیزوں کے لیے لیڈی وارڈروں کی خوشامدیں کرنا، گھروالوں سے ملنے کے لیے ان کا اضطراب اسے پسند نہ تھا۔ وہی بدگوئیاں اور سرگوشیاں جیل کے اندر بھی تھیں۔ وہ خودداری جو اس کے خیال میں ایک سیاسی قیدی میں ہونی چاہیے کسی میں بھی نہ تھی۔ ان کا زیادہ تر وقت اپنے خانگی معاملات کے چرچا میں صرف ہوتا تھا۔ چھما ان سے اعتراض کرتی تھی۔ اس میں قوم کا فدائیانہ جوش تھا اور سچا درد۔ مگر دوسری دیویاں اسے معذور سمجھتی تھیں اور اعتراض کا جواب اعتراض سے دیتی تھیں۔ مردلا کو حراست میں آئے آٹھ دن ہوئے تھے۔ اُتنے ہی دنوں میں چھما کو اس سے خاص انس ہو گیا تھا۔ مردلا میں تنگ دلی اور رقابت نہ تھی۔ نہ بدگوئی کی عادت،نہ آرائش کا خبط۔ نہ بیہودہ مذاق۔اس نے مہر پذیر دل پایا تھا۔ جوش خدمت سے پر ہمدردی سے لبریز۔ چھما نے سوچا تھا اس کے ساتھ چھ مہینے لطف سے گذر جائیں گے۔ لیکن قسمت اسے یہاں بھی پامال کرنے پر آمادہ تھیں۔ کل مردلا یہاں سے چلی جائے گی۔ پھر وہ اکیلی رہ جائے گی۔ یہاں ایسا کون ہے جس کے ساتھ وہ گھڑی بھر بیٹھ کر دل کی باتیں کہے گی۔ ملک اور قوم کا چرچا کرے گی۔ جس کی صحبت میں مغائرت یا ہمدردی کی بو نہ آئے۔ مردلا نے پوچھا تمھیں تو ابھی آٹھ مہینے باقی ہیں۔ بڑی مشکل سے گذریں گے۔ چھما نے حسرت ناک لہجہ میں کہا۔'' کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائیں گے بہن، مگر تمھاری یاد ہمیشہ ستایا کرے گی۔ ایک ہفتہ کے اندر تم نے مجھ پر نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے۔ جب سے تم آئی ہو مجھے یہ جیل خانہ نہ معلوم ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ملتی رہنا۔ مردلا نے دیکھا کہ چھما کے آنکھوں میں آنسوں بھر آئے تھے۔تشفی کے انداز سے بولی۔ ضرور ملوں گی بہن۔ مجھے خود تم سے ملے بغیر چین نہ آئے گا۔ بھان کو بھی ساتھ لاؤں گی۔ کہوں گی تیری موسی آئی ہے۔ تجھے بلا رہی ہے۔دوڑتا ہوا آئے گا۔ اب تم سے آج کہتی ہوں بہن، مجھے یہاں کسی کی یاد آتی تھی تو بھان کی۔ بے چارا اماں کہہ کر مجھے تلاش کرتا ہوگا اور روتا ہوگا۔ مجھے دیکھ کر روٹھ جائے گا۔ تم کہاں چلی گئی

تھیں، جاؤ میں تم سے نہیں بولتا۔ تم میرے گھر سے نکل جاؤ۔ بڑا شیطان ہے بہن۔ دم بھر بھی آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ صبح اٹھتے ہی گاتا ہے ''جھنا اونیا لہے املا'' چھولاج کا مندیل دیل میں ہے۔ (جھنڈا اونچا رہے ہمارا، سورج کا مندر جیل میں ہے) جب ایک بھنڈی کندھے پر رکھ کر کہتا ہے۔ ''نالی چھلاب پینا حلام ہے۔'' تو دیکھتے ہی بنتا ہے۔ باپ کو تو کہتا ہے تم گلام ہو۔ ایک انگریزی کمپنی میں نوکر ہیں۔ باربار سوچتے ہیں استعفی دے دوں لیکن گذر بسر کی بھی تو کوئی صورت ہو کیسے چھوڑ دیں۔ تو اب تک چھوڑ بیٹھے ہوتے بہن! تم سے سچ کہتی ہوں بہن! نوکری سے انھیں نفرت ہے میں ہی انھیں منع کرتی رہتی ہوں۔ بچارے کیسے بھان کو سنبھالتے ہوں گے۔ ساس جی کے پاس تو رہتا ہی نہیں۔ وہ بے چاری بوڑھی، اس کے ساتھ کہاں دوڑیں۔ چاہتی ہیں کہ میرے پاس بیٹھا رہے۔ وہ پل بھر نچلا نہیں بیٹھتا تھا۔ اماں بہت بگڑیں گی۔ بس یہی ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے دیکھنے ایک دن بھی نہیں آئیں۔ کل بابو جی کہتے تھے۔ تم سے بہت ناراض ہیں۔ ''تین دن تو دانا پانی چھوڑ دیا تھا۔ اس چھوکری نے کل کی مرجادا ڈوبا دی۔ خاندان میں داغ لگا دیا۔ کل مونہی۔ کچھتی۔ نہ جانے کیا کیا بکتی رہیں۔ میں تو ان کی باتوں کا برا نہیں مانتی۔ پرانے زمانے کی ہیں ان سے کوئی چاہے کہ ہم لوگوں میں آکر مل جائیں تو یہ اس کی زیادتی ہے۔ کل چل کر منانا پڑے گا۔ بڑی منتوں سے مانیں گی۔ کل ہی کتھا ہوگی۔ دیکھ لینا براہمن کھائیں گے۔ جیل خانہ کا پرائشچیت تو کرنا ہی پڑے گا۔ تم تو ہمارے گھر دو ایک روز رہ کر جانا بہن! میں تمھیں آکر لے جاؤں گی۔

چھما کو ان خوشیوں میں سے ایک بھی نصیب نہیں تھی۔ وہ اکیلی بیوہ تھی۔ جلیان والے باغ میں اس کا آشیانہ برباد ہو گیا تھا۔ شوہر مارا گیا، لڑکے مارے گئے۔ اب کوئی ایسا نہ تھا جسے وہ اپنا کہہ سکتی۔ اور ان دس برسوں سے اس کا حرماں نصیب دل قوم کی خدمت میں تشفی اور سکون کی تلاش کر رہا تھا۔ جن اسباب نے اس کے بسے ہوئے گھر کو ویران کر دیا، اس کے سہاگ کو لوٹا، اس کی گود کو سونا کر دیا، ان اسباب کو مٹانے میں مجنونانہ جوش کے ساتھ مصروف تھی۔ بڑی سے بڑی قربانیاں تو وہ پہلے ہی کر چکی تھی۔ اب اس کے پاس اپنے دل و دماغ کو قربان

کرنے کے سوا اور رہ ہی کیا گیا تھا۔ اوروں کے لیے خدمت قوم، تہذیب کا ایک تقاضا ہو یا نمود کا ایک ذریعہ اس کے لیے تو یہ ایک عبادت تھی اور وہ اپنی ساری نسوانی عقیدت اور انہماک کے ساتھ اسے بجا لائی تھی۔ لیکن طائر کو آسمان میں پرواز کرنے کے بعد اپنے آشیانے کی یاد تو آتی ہی ہے۔ چھما کو یہ آشیانہ کہاں نصیب تھا۔ یہی تو وہ موقع تھا جب اس کا دل ہمدردی کے لیے بے قرار ہو جاتا تھا۔ یہاں درد شناس مردلا کو پاکر وہ اپنی قسمت کی تعریف کر رہی تھی۔ لیکن یہ صحبت بھی اتنی جلد برہم ہو گئی۔

چھما حسرت ناک انداز سے بولی۔ ''یہاں سے جا کر بھول جاؤ گی۔ مردلا تمھارے لیے یہ ریل گاڑی کی ملاقات ہے اور میرے لیے تمھارے وعدے اس ملاقات کے وعدے ہیں کبھی کہیں ملاقات ہو جائے گی تو یا تو پہچانو گی ہی نہیں یا ذرا مسکرا کے نمستے کہتی ہوئی اپنی راہ چلی جاؤ گی۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ اپنی رونے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ دوسرے کے لیے کیوں کر روئے۔ تمھارے لیے تو میں کچھ نہیں تھی میرے لیے تم سب کچھ تھیں۔ اپنے پیاروں میں بیٹھ کر کبھی کبھی مجھے ضرور یاد کر لیا کرنا۔ بھکاری کے لیے چٹکی بھر آٹا ہی بہت ہے۔

دوسرے دن مجسٹریٹ نے فیصلہ سنا دیا۔ مردلا رہا ہو گئی۔ شام کو وہ سب بہنوں سے گلے مل کر رو کر رخصت ہو گئی گو یا میکے سے بدا ہوئی ہو۔

(۳)

تین مہینے گذر گئے مردلا ایک بار بھی نہ آئی اور قیدیوں سے ملنے والے آتے رہتے تھے۔ بعضوں کے گھر سے کھانے پینے کی چیزیں بھی آجاتی تھیں۔ لیکن چھما کو کون پوچھنے والا تھا۔ ہر مہینے کی آخری اتوار کو وہ صبح سے مردلا کا انتظار کرنے لگتی تھی۔ جب ملاقات کا وقت گذر جاتا تو ذرا دیر رو کر دل کو سمجھا لیتی۔ زمانہ کا یہی دستور ہے۔

ایک دن شام کو چھما سندھیا کرکے اٹھی تھی۔ کہ دیکھا مردلا سامنے چلی آرہی ہے۔ نہ وہ چہرہ ہے نہ وہ رونق۔ دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی اور روتی ہوئی

بولی۔ یہ تیری کیا حالت ہے مردلا۔ صورت ہی بدل گئی۔ تم بیمار ہو گیا؟

مردلا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بولی۔" بیمار تو نہیں ہوں بہن۔ مصیبت زدہ ہو ں۔ تم مجھے بے وفا اور وعدہ فراموش سمجھتی ہوگی۔ ان ساری شکایتوں کی تلافی کرنے آئی ہوں اور سارے فکر سے آزاد ہو کر آئی ہوں۔"

چھما کا دل کانپ اٹھا۔ سینہ کی گہرائیوں سے ایک لہر سی اٹھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ بولی۔ خیریت تو ہے۔ اتنی جلدی تم پھر کیوں آ گئیں۔ ابھی تو تین مہینے بھی نہیں ہوئے۔

مردلا ذرا تبسم کے ساتھ بولی۔ "اب سب خیریت ہے بہن۔ ہمیشہ کے لیے خیریت ہو گئی۔ کوئی فکر نہیں رہی۔ اب یہاں ہمیشہ رہنے کے لیے تیار ہوں۔ تمھاری محبت کی کشش اب معلوم ہوئی۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنکھوں میں آنسوں بھر کر بولی۔ "تمھیں باہر کی خبریں کیا ملی ہوں گی؟ پرسوں شہر میں گولیاں چلیں۔ دیہاتوں میں آج کل لگان وصول کیا جا رہا ہے۔ کسانوں کے پاس روپیہ ہے نہیں۔ غلہ ارزاں ہو گیا ہے اور دن بہ دن بھاؤ گرتا جا رہا ہے۔ پونے دو روپیہ من بھر گیہوں آتا ہے۔ میری عمر ہی کیا ہے۔ اماں بھی کہتی ہیں اتنا ستا غلہ کبھی نہیں تھا۔ کھیت کی پیداوار سے بیجوں تک کے دام نہیں آتے۔ سینچائی اور محنت سب اوپر غریب کہاں سے دیں؟ سرکاری حکم ہے کہ جیسے بھی ہو لگان وصول کیا جائے۔ کسان اس پر بھی راضی ہیں کہ ہمارے مال و اسباب نیلام کر لو، قرق کر لو، اپنی زمین لے لو۔ مگر یہاں تو حاکموں کی اپنی کارگذاری دکھانے کی فکر لگی ہوئی ہے۔ بھیروی گنج کا علاقہ پیا جا رہا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ ایک کسان کے گھر میں آ کر کئی کانسٹبلوں نے اسے پیٹنا شروع کیا۔ بے چارہ بیٹھا مار کھاتا رہا۔ اس کی بیوی سے نہ رہا گیا۔ شامت کی ماری کانسٹبلوں کو گالیاں دینے لگی۔ بس ایک کانسٹبل نے اسے برہنہ کر دیا اور اب بہن کیا کہوں ہمارے بھائی اتنی بے رحمی کریں۔ اس سے زیادہ شرمناک اور کیا ہوگا؟ اب کسان سے ضبط نہ ہو سکا۔ کبھی پیٹ بھر غریبوں کو کھانے کو تو ملتا نہیں اس پر اتنی بڑی مشقت۔ جسم میں نہ طاقت باقی رہتی ہے نہ ہمت۔ مگر انسان کا دل ہی تو

ٹھہرا۔ بیچارہ بے دم پڑا ہوا تھا۔ بیوی کا چلانا سن کر اٹھ بیٹھا اور اس بدمعاش کانسٹبل کو زور سے دھکا دے کر اس سے لپٹ گیا۔ ایک کسان کسی پولیس کے آدمی کے ساتھ بے ادبی کرے اسے بھلا کہیں وہ برداشت کرسکتا ہے۔ سب کانسٹبلوں نے غریب کو اتنا مارا کہ وہ مر گیا۔

چھما : گاؤں کے اور لوگ تماشا دیکھ رہے ہوں گے۔

مردلا : اس میں بھی آفت ہے۔ اگر دس بیس آدمی جمع ہو جاتے تو پولیس سمجھتی کہ مزاحمت کرنے آئے ہیں۔ شاید ڈنڈے چلانا شروع کردیتی۔ اور اگر کوئی آدمی غصہ میں ایک آدھ پتھر پھینک دیتا تو گولیاں چلا دیتی۔ دو چار آدمی بھن جاتے۔ اسی لیے لوگ جمع نہیں ہوتے۔ لیکن وہ کسان مرگیا تو گاؤں والے طیش میں آئے۔ لاٹھیاں لے لے کر دوڑے اور کانسٹبلوں کو گھیر لیا۔ ممکن ہے دو چار آدمیوں نے لاٹھیاں چلائی ہوں۔ کانسٹبلوں نے گولیاں چلانی شروع کیں۔ دو کانسٹبلوں کے چوٹیں آئیں۔ اس کے بدلے دس بارہ آدمیوں کی جانیں لی گئیں۔ چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو اختیارات مل جاتے ہیں تو یہ لوگ اس کا بے جا استعمال کرنے لگتے ہیں۔ گاؤں کے غریب لوگوں پر اپنا رعب جما کر کانسٹبل فتح کے نقارے بجاتے ہوئے لوٹ گئے۔ گاؤں والوں کی فریاد کون سنتا؟ غریب ہیں، بے کس ہیں، بے زبان ہیں۔ جتنے آدمیوں کو چاہو مار ڈالو۔ حکام اور عدالت سے انھوں نے انصاف کی امید چھوڑ دی۔ سوچتے ہیں آخر اسی سرکار نے تو کانسٹبلوں کو تعینات کیا تھا۔ وہ سرکار کسانوں کی فریاد کیوں سننے لگی؟ مگر آدمی کا دل بغیر فریاد کیے نہیں مانتا۔ گاؤں والوں نے اپنے شہر کے بھائیوں سے فریاد کرنے کا فیصلہ کیا۔ پبلک اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ہمدردی تو کرتی ہے۔ غم کی داستان سن کر آنسو تو بہاتی ہے۔ مظلوم کے لیے ہمدردی کے آنسو بھی کم پیارے نہیں ہوتے۔ اگر آس پاس کے گاؤں کے لوگ جمع ہو کر کچھ ہمدردی کرتے تو ان غریبوں کی تشفی ہو جاتی۔ مگر پولیس نے اس گاؤں میں لوگوں کا آنا جانا بند کر دیا تھا۔ چاروں سرحدوں پر کانسٹبل کھڑے کر دیے گئے تھے۔ یہ زخم پر نمک تھا۔ مارتے بھی اور رونے بھی نہیں دیتے۔ آخر لوگوں نے لاشیں اٹھائیں اور شہر والوں کو اپنی کہانی سنانے آئے۔ ہنگامہ کی خبر پہلے ہی شہر میں پہنچ چکی تھی۔ ان

مظلوموں کو دیکھ کر پبلک میں اشتعال ہو گیا۔ اور جب سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ان لاشوں کا جلوس نکالنے کی اجازت نہیں دی تو لوگ اور جھلائے۔ بڑا مجمع ہو گیا۔ میرے بابو جی بھی اس مجمع میں تھے۔ سمجھاتی رہی آج مت جاؤ آج کا رنگ اچھا نہیں ہے کہنے لگے میں کسی سے لڑنے تھوڑے ہی جا رہا ہوں۔ پچاس ہزار آدمی مجمع کے ساتھ ساتھ تھے اور پانچ سو مسلح پولیس روکے ہوئے تھی۔ سوار اور پیادے پوری فوج تھی۔ جب بار بار پولیس کی دھمکیاں پر بھی مجمع منتشر نہ ہوا تو گولیاں چلانے کا حکم ہو گیا۔ فائر ہونے لگے، کتنے گھائل ہوئے کون جانتا ہے۔ میرا مکان لب سڑک ہے۔ میں چھجے پر کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ ہزاروں آدمی بھاگے چلے آرہے تھے۔ یہیں وہ نظارہ یاد کر کے روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسی وحشت ایسی سراسیمگی تم سے کیا کہوں۔ مگر ان بھاگنے والوں کے پیچھے سرفروش جانبازوں کی ایک جماعت تھی جو دیوار کی طرح مستقل کھڑے گولیاں کھا رہے تھے۔ اور پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیتے تھے۔ بندوقوں کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔ اور ہر ایک دھائیں دھائیں کے بعد ہزاروں گلوں سے جے کی صدا نکلتی تھی۔اس صدا میں کتنی کشش تھی، کتنا جوش۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ جا کر گولیوں کے سامنے کھڑی ہو جاؤں۔ اور ہنستے ہنستے مرجاؤں۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مرجانا کوئی کھیل ہے۔ اماں جی کمرے میں بھان کو لیے مجھے بار بار بلا رہی تھیں۔ جب میں اندر نہ گئی تو بھان کو لیے چھجے پر آگئیں۔ اسی وقت دس بارہ آدمی ایک سٹریچر پر میرے سوامی کی لاش لیے ہوئے دروازے پر آئے۔ اماں کی ان پر نظر پڑی سمجھ گئیں۔ مجھے تو سکتہ سا ہو گیا۔ اماں نے جا کر ایک بار لاش کو دیکھا اسے چھاتی سے لگایا۔ اس کا بوسہ لیا اور سیدھا چوراہے کی طرف چلیں جہاں سے دھائیں دھائیں اور جے کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ میں نقش دیوار بنی لاش کو دیکھتی تھی۔ کبھی اماں جی کو کچھ نہ بولی، نہ جگہ سے ہلی، روئی، نہ بے قرار ہوئی۔ احساس کی مجھ میں قوت ہی نہ رہی تھی۔ اماں جی جاں بازں کی صف میں جا کر سامنے کھڑی ہوگئیں اور ایک منٹ میں ان کی لاش بھی زمین پر گر پڑی۔ ان کے گرتے ہی جانبازوں کا ضبط بھی رخصت ہو گیا۔ ان کے سر پر خون سوار ہو گیا۔ نہتے تھے مگر ہر ایک فرد اپنے دل میں شیر

کی قوت محسوس کررہا تھا۔ سپاہیوں نے اس سیلاب کو آتے دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ جانیں لے کے بھاگے۔ کوئی ادھر کوئی ادھر بھاگتے ہوئے بھی گولیاں چلاتے جاتے تھے۔ بھان چھجے پر جھکا کھڑا تھا۔ نہ جانے کدھر سے ایک گولی اس کے سینہ میں آ لگی۔ میرا لال وہیں گر پڑا۔ سانس تک نہ لی۔ مگر میری آنکھوں میں اب بھی آنسو نہ تھے۔ میں نے بھان کو گود میں اٹھا لیا۔ اس کے سینہ سے خون جاری تھا۔ میں نے اسے جو دودھ پلایا تھا اسے وہ خون سے ادا کر رہا تھا۔ اس کے خون سے تر کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ایسا فتح مندانہ غرور ہو رہا تھا جو شاید اس کے بیاہ میں ریشمی کپڑے پہن کر بھی نہ ہوتا۔ لڑکپن، جوانی اور موت ساری منزلیں ایک ہچکی میں تمام ہوگئیں۔ میں نے بیٹے کی لاش کو باپ کی گود میں دے دیا۔ اتنے میں اماں جی کا جنازہ بھی آ گیا۔ معلوم ہوتا تھا لیٹی ہوئی مسکرا رہی ہوں۔ مجھے تو روکتی رہتی تھیں اور خود اس طرح بھاگ کر آگ میں کود پڑیں۔ گویا وہی سورگ کا راستہ ہو۔ جب ندی کے کنارے ایک ہی چتا میں لاشیں رکھی گئیں تب میرا سکتہ ٹوٹا اور ہوش آیا۔ ماں اپنے جنم بھر کی کمائی لیے جاتی ہے۔ جنھیں نازوں سے پالا۔ انھیں چھوڑ کر کیسے جاتی۔ وہ تو وہاں بیٹے اور پوتے کے ساتھ گئیں۔ میرے لیے کیا چھوڑا۔ ایک بار جی میں آیا میں بھی انھیں کے ساتھ جا بیٹھوں۔ سارا کنبہ ایک ساتھ ایشور کے دربار میں جا پہونچے، لیکن پھر میں نے سوچا تو نے ابھی ایسا کام ہی کون سا کیا ہے جس کا معاوضہ یہ ملے۔؟ بہن اس چتا کی لپٹوں میں مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اماں جی سچ مچ بھان کو گود میں لیے بیٹھی مسکرا رہی ہیں اور سوامی جی مجھ سے کہہ رہے ہیں تم جاؤ اور بے فکر ہو کر اپنا کام کرو۔ ان کے چہروں پر کتنا جلال تھا خون اور آگ میں ہی تو دیوتا بنتے ہیں۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا، ندی کے کنارے نہ جانے کتنی چتائیں جل رہی تھیں۔ دور سے یہ جلتی ہوئی چتائیں شعلوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے دریا کے پل پر برقی لالٹینوں کی ایک قطار ہو۔ اسی پل پر ہو کر شہادت کی منزل ملتی ہے۔ اور یہی مشعلیں بقائے دوام کی طرف لے جاتی ہیں۔ یا یہ بھٹیاں تھیں جن میں بھارت کی تقدیر گھڑی جا رہی تھی۔

جب چتائیں راکھ ہو گئیں تو ہم لوگ گھر لوٹے لیکن اس گھر میں جانے کی ہمت نہ پڑی۔ میرے لیے اب وہ گھر نہ تھا۔میرا گھر اب یہ ہے جہاں میں بیٹھی ہوں۔ یا پھر وہی چتا۔ میں نے گھر کا دروازہ بھی نہیں کھولا۔ مہلا آشرم چلی گئی کل کی گولیوں میں کانگریس کمیٹی کا صفایا ہو گیا تھا۔ کانگریس باغی انجمن قرار دے دی گئی تھی۔ اس کے دفتر پر پولیس نے چھاپا مارا اور اس پر اپنا قفل ڈال دیا۔ مہیلا آشرم پربھی حملہ ہوا۔ اس پر بھی قفل ڈال دیا گیا۔ ہم نے ایک درخت کے سائے میں اپنا دفتر قائم کیا اور کام کر تے رہے۔ شام کو ہم نے ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ کل کے خونی واقعہ کی یاد اور خوشی اور مبارک بادمیں جلوس نکالنا ضروری تھا۔ لوگ کہتے ہیں جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے؟ اس سے معلوم ہوتا ہے ہم زندہ ہیں۔ مستعد ہیں میدان سے ہٹے نہیں ہیں۔ ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خودداری کا ثبوت دینا تھا۔ یہ دکھانا تھا کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبہ آزادی سے دست بردار ہونے والے نہیں۔ہم اس نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ جس کی بنیاد خود غرضی اور خون چوسنے پر رکھی گئی ہے۔اور پولس نے جلوس کو روک کر اپنی زندگی اور قوت کا ثبوت دینا بھی ضرروی سمجھا۔ شاید پبلک کو دھوکا ہو گیا ہو کہ کل کے واقعہ سے سرکار میں اخلاق کا احساس پیدا ہوگیا ہے۔ وہ اپنی حرکت پر نادم ہے۔ پبلک کے اس وہم کو دور کرنا اس نے اپنا فرض سمجھا۔ وہ یہ دکھانا چاہتی تھی کہ ہم تمھارے اوپر حکومت کرنے آئے ہیں۔ اور حکومت کریں گے۔ تمھاری خوشی یا ناخوشی کی ہم کو پرواہ نہیں۔ جلوس نکالنے کی ممانعت کر دی گئی۔ پبلک کو ہدایت وتنبیہ کی گئی کہ خبر دار جلوس میں نہ آنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ مگر شام کے وقت پچاس ہزار کا مجمع ہو گیا۔ آج کانگریس کی صدارت کا فخر مجھے عطا کیا گیا تھا۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طاقت کا احساس کر رہی تھی۔ ایک کمزور عورت جسے بولنے کا بھی شعور نہیں جس نے کبھی گھر سے قدم نہیں نکالا۔ آج اپنے پیاروں کی قربانی کی بدولت اس مرتبہ پر پہونچ گئی جو بڑے بڑے سرکاری افسر کو بھی بڑے سے بڑے مہاراجہ کو بھی حاصل نہیں۔ یہ دلوں کی حکومت تھی۔ یہ مجمع کیا میرا تنخواہ دار تھا یا اسے مجھ سے کسی نفع کی امید تھی یا نقصان کا خوف تھا ہرگز نہیں۔ پھر بھی وہ میرے کڑے سے کڑے حکم کو

مانے کو تیار تھے اسی لیے کہ ان کے دلوں میں آزادی کی جو تڑپ غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینے کی جو بے چینی ہے میں اس تڑپ اور بے چینی کی زندہ مثال تھی۔ جلوس روانہ ہوا۔ اسی وقت پولیس نے میری گرفتاری کا وارنٹ دکھایا مجھے وارنٹ دیکھتے ہی تمھاری یاد آئی۔ پہلے تمھیں میری ضرورت تھی۔ اب مجھے تمھاری ضرورت ہے۔ پہلے تم مجھ سے ہمدردی کی خواستگار تھیں۔ اب میں تمھاری ہمدردی کے لیے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں۔ اور مجسٹریٹ جو بڑی سے بڑی سزا دے اس کے لیے تیار ہوں۔ اب میں پولیس کی غلط بیانیوں یا بے جا الزام کے خلاف زبان تک نہ کھولوں گی۔ کیوں کہ میں جانتی ہوں آزاد رہ کر جو کچھ کرسکتی ہوں جیل میں اس سے کہیں زیادہ کرسکتی ہوں۔ آزادی میں غلطی کا امکان ہے، بھٹکنے کا خوف ہے، مصالحت کا اندیشہ ہے، رقابت کی فکر ہے۔ جیل احترام اور عقیدت کا ایک دائرہ ہے جس کے اندر شیطان قدم نہیں رکھ سکتا۔ میدان میں جلتا ہوا الاؤ ہوا میں اپنی حرارت کھو دیتا ہے۔ لیکن انجمن میں بند ہوکر وہی آگ تحریک کا لازوال خزانہ بن جاتی ہے۔"

اور دیویوں کو بھی خبر ملی۔ سب کی سب مردلا سے ملنے آ پہنچیں۔ پھر بھارت ماتا کی جے کی صدا دیواروں کو توڑتی ہوئی آسمان پر جا پہونچی۔

یہ قصہ پہلی بار لاہور کے اردو ماہنامہ چندن کے جنوری 1930 کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ زاد راہ میں شامل ہے۔ ہندی میں یہ بنارس کے ہندی ماہنامہ ہنس کے فروری 1931 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مانسرور نمبر 7 میں شامل ہے۔ عنوان تھا جیل۔

قوم کا خادم

خادم قوم نے کہا ''ملک کی نجات کا ایک ہی نسخہ ہے اور وہ ہے نیچوں کے ساتھ برادرانہ سلوک۔ رذیلوں کے ساتھ مساوات کا برتاؤ۔ دنیا میں سبھی بھائی ہیں۔ کوئی نیچا نہیں، کوئی اونچا نہیں۔''

دنیا نے نعرہ تحسین بلند کیا۔ کتنی وسعت نظر ہے۔ کتنا درد رس دل! اس کی حسین لڑکی اندرا نے سنا اور دریائے فکر میں ڈوب گئی۔

خادم قوم نے رذیل نوجوان کو گلے لگا یا۔

دنیا نے کہا یہ فرشتہ ہے۔ دلی ہے۔ قوم کا ناخدا ہے۔

اندرا نے دیکھا اور اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔

خادم قوم رذیل نوجوان کو مندر میں لے گیا۔ دیوتا کے درشن کرائے اور کہا ہمارا معبود غربت میں ہے، نکبت میں ہے، افلاس میں ہے، ذلت میں ہے، پستی میں ہے۔

دنیا نے کہا کتنا روشن ضمیر آدمی ہے! کیسا عارف کامل!

اندرا نے دیکھا اور مسکرائی۔

اندرا خادم قوم کے پاس جا کر بولی۔'' میرے قابل تعظیم باپ! میں موہن سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔''

خادم قوم نے پیار کی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔ موہن کون ہے؟

اندرا نے پرجوش انداز سے کہا۔ ''موہن وہی نوجوان ہے جسے آپ نے گلے

لگایا، جسے آپ مندر میں لے گئے،جو سچا، بہادر اور نیک ہے۔
خادم قوم نے نگاہ قہر سے اس کی طرف دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

یہ افسانہ پہلی بار مجموعہ پریم چالیسی 1930 میں شائع ہوا۔ ہندی میں یہ گپت دھن 2 میں راشٹر کا سیوک کے عنوان سے شائع ہوا۔

دِھکّار

ایران اور یونان میں گھور سنگرام ہو رہا تھا، ایرانی دن دن بڑھتے جاتے تھے اور یونان کے لیے سنکٹ کا سامنا تھا، دیش کے سارے ویوسائے بند ہوگئے تھے، ہل کی مٹھیا پر ہاتھ رکھنے والے کسان تلوار کی مٹیا پکڑنے لیے مجبور ہوگئے، ڈنڈی تولنے والے بھلے تولتے تھے۔ سارا دیش آتم رکشا (حفاظت) کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ پھر بھی شترو کے قدم دن دن آگے بڑھتے آتے تھے جس ایران کو یونان کئی بار کچل چکا تھا، وہی ایران آج کرودھ (غصہ) کے آدیگ کی بھانتی سر پر چڑھا آتا تھا۔ مرد تو رن چھیتر میں سر کٹا رہا تھے اور استریاں دن دن کی نراشاجنک خبریں سن کر سوکھی جاتی تھی۔ کیوں کہ لاج کی رکشا ہوگی۔ پران کا بھے نہ تھا، سمپتی کا بھے نہ تھا، بھے تھا مریادا کا۔ وجیتا غرو سے متوالے ہو کر یونانی للناؤں کو گھوریں گے، ان کے کومل انگوں کو اسپرش کریں گے، ان کو قید کر لے جائیں گے۔ اس وپتی کی کلپنا ہی سے ان لوگو ں کے روئیں کھڑے ہوجاتے تھے۔

آخرجب حالت بہت نازک ہوگئی تو کتنے ہی استری، پرش مل کر ڈلفی کے مندر میں گئے اور پرشن کیا۔ دیوی ہمارے اوپر دیوتاؤں کی یہ وَکر (ٹیڑھا فربی) درشٹ کیوں ہیں؟

ہم سے ایسا کون سا اپرادھ ہوا ہے؟ کیا ہم نے نیموں کا پالن نہیں کیا، قربانیاں نہیں کی، ورت نہیں رکھے؟ پھر دیوتاؤں نے کیا ہمارے سروں سے اپنی رکشا کا ہاتھ اٹھا لیا؟

پجارن نے کہا: دیوتاؤں کی اسیم کرپا بھی دیش کو دروہی کے ہاتھ سے نہیں بچا سکتی۔ اس دیش میں اوشیہ کوئی نہ کوئی دروہی ہے۔ جب تک اس کا ودھ نہ کیا جائے گا دیش کے سر سے یہ سنکٹ نہ ٹلے گا۔

دیوی وہ دروہی کون ہے؟

جس گھر سے رات کو گانے کی دھونی آتی ہو،جس گھر سے دن کو سوگندھ کی لپٹیں آتی ہوں، جس پُرش کی آنکھوں میں مد کی لالی جھلکتی ہو، وہی دیش کا دروہی ہے۔

لوگوں نے دروہی کا پریچیہ پانے کے لیے اور بھی کتنے ہی پرشن کیے پر دیوی نے کوئی اتر نہ دیا۔

(۲)

یونانیوں نے دروہی کی تلاش کرنی شروع کی۔ کس کے گھر میں سے رات کو گانے کی آوازیں آتی ہیں۔ سارے شہر میں سندھیا ہوتے سیاپا ساچلا جاتا تھا۔ اگر کہیں آوازیں سنائی دیتی تھیں تو رونے کی،ہنسی اور گانے کی آواز کہیں نہ سنائی دیتی تھیں۔

دن کو سوگندھ کی لپٹیں کس گھر سے آتی ہیں؟ لوگ جدھر جاتے تھے، ادھر سے درگند آتی تھی۔ گلیوں میں کوڑے کے ڈھیر کے ڈھیر پڑے تھے، کسے اتنی فرصت تھی کہ گھر کی صفائی کرتا، گھر میں سوگندھ جلاتا، دھوبیوں کا آبھاوَ تھا۔ ادھیکانش لڑنے کے لیے چلے گئے تھے، کپڑے تک نہ دھوتے تھے، عطر پھولیل کون ملتا۔

کس کی آنکھوں میں مد کی لالی چھلکتی ہے لال آنکھیں دکھائی دیتی تھیں لیکن یہ مد کی لالی نہ تھی یہ آنسوؤں کی لالی تھی، مدرا کی دوکانوں پر خاک اڑ رہی تھی۔ اس جیون مرتیو کے سنگرام میں ولاس کی کسے سوجھتی۔ لوگوں نے سارا شہر چھان مارا لیکن ایک بھی آنکھ ایسی نظر نہ آئی کہ مد سے لال ہو۔

کئی دن گذر گئے۔ شہر میں پل پل بھر پر رن چھیتر سے بھیانک خبریں آتی تھیں اور لوگوں کے پران سوکھے جاتے تھے۔

آدھی رات کا سمے تھا۔ شہر میں اندھکار چھایا ہوا تھا، مانو شمشان ہو، کسی کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی۔ جن نائیہ شالاؤں (تھیٹر) میں تل رکھنے کی جگہ نہ ملتی تھی، وہاں سیار بول رہے تھے، جن بازاروں میں منچلے جوان استر شستر سجائے اینٹھتے پھرتے تھے وہاں الو بول رہے تھے۔ مندروں میں گانا ہوتا تھا نہ بجانا، پرسادوں میں اندھکار چھایا ہوا تھا۔ ایک بوڑھا یونانی جس کا اکلوتا لڑکا لڑائی کے دوران میں تھا، گھر سے نکلا اور نہ جانے کن وچاروں کی ترنگ میں دیوی کے مندر کی اور چلا۔ راستے میں کہیں پرکاش نہ تھا، قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا تھا، پر آگے بڑھتا چلا جاتا۔ اس نے نشچیہ کر لیا تھا کہ یا تو آج دیوی سے وجے کا وردان لوں گا یا ان کے چرنوں پر اپنے کو بھینٹ کر دوں گا۔

(۳)

سہسا وہ چونک پڑا دیوی کا مندر آگیا تھا، اور اس کے پیچھے کی اور کسی گھر سے مادھر سنگیت کی دھونی آرہی تھی۔ اس کو اشچریہ ہوا۔ اس نرجن استھان میں کون اس وقت رنگیاں منا رہا ہے۔ اس کے پیروں میں پر سے لگ گئے، مندر کے پچھواڑے یہ اندھیر۔بوڑھے نے دووار سے جھانکا۔ ایک سجے ہوئے کمرے میں موم بتیاں جھاڑوں میں جل رہی تھی، صاف ستھرا فرش بچھا ہوا تھا اورایک آدمی میز پر بیٹھا ہوا گا رہا تھا۔ میز پر شراب کی بوتل اور پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دو غلام میز کے سامنے ہاتھ میں بھوجن کے تھال لیے کھڑے تھے، جن میں منوہر سوگند کی لپٹیں آرہی تھیں۔

بوڑھے یونانی نے چلا کر کہا۔ یہ دیش دروہی ہے ، یہی دیش دروہی ہے۔

مندر کی دیواروں نے دہرایا۔ دروہی ہے۔ مندر کی پجارن نے گھر میں سے سر نکال کر کہا۔ ہاں دروہی ہے۔ یہ دیش دروہی اسی پجارن کا بیٹا پاسوں نیاس تھا۔ دیش میں رکشا کے جو اپائے سوچے جاتے، شتروں کا دمن کرنے کے لیے جو نشچیہ کیے جاتے ،ان کی سوچنا وہ ایرانیوں کودے دیا کرتا تھا، سیناؤں کی پرتک گیتی کی خبر ایرانیوں کو مل جاتی تھی۔ اور ان پریتنوں کو وِپھل بنانے کے لیے وہ پہلے سے تیار

ہو جاتے تھے۔ یہی کارن تھا کہ یونانیوں کو جان لڑا دینے پر بھی وجہ نہ ہوتی تھی۔ اسی کپٹ سے کمائے ہوئے دھن سے وہ بھوگ ولاس کرتا تھا۔ اس سمے جب کہ دیش میں گھور سنکٹ پڑا ہوا تھا، اس نے اپنے سوادیش کو اپنی واسناؤں کے لیے بیچ دیا تھا۔ اپنے ولاس کے سوا اسے اور کسی بات کی چنتا نہ تھی۔ کوئی مرے یا جیے۔ دیش رہے یا جائے، ان کی بلا سے، کیول اپنے کوتیل سوارتھ کے لیے دیش کی گردن میں غلامی کی بیڑیاں ڈلوانے پر تیار تھا۔ پجارن اپنے بیٹے کے دراچرن سے انبھگیہ تھی۔ وہ اپنی اندھیری کوٹھری سے بہت کم نکلتی، وہیں بیٹھی جب تپ کیا کرتی تھی، پر لوک چینتن میں اسے اہیلوک کی خبر نہ تھی، میندرھیوں نے باہر کی چنتا کو سونیہ سا کر دیا تھا۔ وہ اس سمے بھی کوٹھری کے دوار بند کئے۔ دیوی سے اپنے دیش کے کلیان (بھلائی) کے لیے وندنا کر رہی تھی کہ سہسا اس کے کانوں میں آواز آئی۔ یہی دروہی ہے، یہی دروہی ہے۔ اس نے ترنت دوار کھول کر باہر کی اور جھانکا۔ پاسوں سیاس کے کمرے سے پرکاش کی ریکھائیں نکل رہی تھیں۔ اور انھیں ریکھاؤں پر سنگیت کی لہریں ناچ رہی تھیں اس کے پیر تلے سے زمین سی نکل گئی۔ کلیجا دھک سے ہو گیا۔ ایشور کیا میرا بیٹا دیش دروہی ہے؟ آپ ہی آپ کسی انت پرن سے پرابھوت ہو کر وہ چلا اٹھی ہاں، یہی دیش دروہی ہے۔

(۴)

یونانی استری پرش جھنڈ کے جھنڈ امڑ پڑے اور پاسونس کے دوار پر کھڑے ہوکر چلانے لگے۔ یہی دیش دروہی ہے۔ پاسونیس کے کمرے کی روشنی ٹھنڈی ہوگی۔ سنگیت بھی بند تھا۔ لیکن دوار پر پرتی چھن نگر واسیوں کا سموہ بڑھتا جاتا تھا۔ اور رہ رہ کر سہتروں کانٹھوں سے دھونی نکلتی تھی۔ یہی دیش دروہی ہے۔

لوگوں نے مشعل جلائی اور اپنے لاٹھی ڈنڈے سنبھال کر مکان میں گھس پڑے کوئی کہتا تھا سر اتارلو، کوئی کہتا تھا دیوی دیوی کے چرنوں پر بلیدان کردو۔ کچھ لوگ اسے کوٹھے سے نیچے گرا دینے پر آگرہ کر رہے تھے۔

پاسونیس سمجھ گیا کہ اب مصیبت کی گھڑی سر پر آگئی۔ ترنت زینے سے اتر کر

نیچے کی اور بھاگا اور کہیں شرن کی آشا نہ دیکھ کر دیوی کے مندر میں جا گھسا۔
اب کیا کیا جائے؟ دیوی کی شرن جانے والے کو ابھے دان مل جاتا تھا۔ پر میرا سے یہی پر-تھا تھی؟ مندر میں کسی کی ہتیا کرنا مہاپاپ تھا۔
لیکن دیش دروہی کو اتنے سستے کون چھوڑتا بھانتی بھانتی کی پرستاو ہونے لگے سور کا ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچ لو۔
ایسے دیش دروہی کا ودھ کرنے کے لیے دیوی ہمیں چھما کردے گی۔ دیوی آپ اسے کیوں نہیں نگل جاتی؟
پتھروں سے مارو، پتھروں سے، آپ نکل کر بھاگے گا۔
نکلتا کیوں نہیں رے کائر۔ وہاں کیا منہ میں کالک لگا کر بیٹھا ہوا ہے؟
رات بھر یہی شور مچا رہا اور پاسونیس نہ نکلا۔ آخر یہ نشچیہ ہوا کہ مندر کی چھت کھود کر پھینک دی جائے اورپاسونیس دوپہر کی تیز دھوپ اور رات کی کڑاکے کی سردی میں آپ ہی آپ اکڑ جائے۔ بس پھر کیا تھا، آن کی آن میں لوگوں نے مندر کی چھت اورکلس ڈھا دیے۔
ابھاگا پاسونیس دن بھر تیز دھوپ میں کھڑا رہا۔ اسے زور کی پیاس لگی، لیکن پانی کہاں؟ بھوک لگی پر کھانا کہاں؟ ساری زمین توے کی بھانتی جلنے لگی، لیکن چھاؤں کہاں؟ اتنا کشٹ اسے جیون بھر میں نہ ہوا تھا، مچھلی کی بھانتی تڑپتا تھا اور چلا چلا کر لوگوں کو پکارتا تھا، مگر وہاں کوئی اس کی پکار سننے والا نہ تھا۔ بار بار قسمیں کھاتا تھا کہ پھر مجھ سے ایسا اپرادھ نہ ہوگا، لیکن کوئی اس کے نکٹ نہ آتا تھا۔ بار بار چاہتا تھا کہ دیوار سے ٹکرا کر پران دے دے۔ لیکن یہ آشا روک دیتی تھی کہ شاید لوگوں کو مجھ پر دیا آجائے۔ وہ پاگلوں کی طرح زور زور سے کہنے لگا۔ مجھے مار ڈالو، مار ڈالو۔ ایک چھڑ (لمحہ) میں پران لے لو، اس بھانتی جلا جلا کر نہ مارو۔ اور ہتھیاروں تم کو ذرا بھی دیا نہیں۔
دن بیتا اور رات۔ بھینکر رات آئی اوپر تاراگن چمک رہے تھے۔ مانو اس کی وپتی پر ہنس رہے ہوں جیوں جیوں رات بیتی تھی دیوی وکرال روپ دھارن کرتی جاتی تھی۔ کبھی وہ اس کی اور منہ کھول کر لپکتی۔ کبھی اسے جلتی ہوئی آنکھوں سے

دیکھتی ادھر چھٹر چھٹر سردی بڑھتی جاتی تھی پاسونیس کے ہاتھ پاؤں اکڑنے لگے، کلیجا کانپنے لگا، گھٹنوں میں سر رکھ کر بیٹھ گیا اور اپنی قسمت کو رونے لگا۔ کرتے کو کھینچ کر کبھی پروں کو چھپاتا، کبھی ہاتھوں کو، یہاں تک کہ اس کھینچا تانی میں کرتا بھی پھٹ گیا۔ آدھی رات جاتے جاتے برف گرنے لگی۔ دوپہر کو اس نے سوچا گرمی ہی سب سے کشٹ دایک ہے اس ٹھنڈ کے سامنے اسے گرمی کی تکلیف بھول گئی۔

آخر شریر میں گرمی لانے کے لیے ایک ہمت سوجھی۔ وہ مندر میں ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ لیکن ولاسی جیو تھا، ذرا دیر میں ہانپ کر گر پڑا۔

(۵)

پراتا کال لوگوں نے کیواڑ کھولے تو پاسونیس کو بھومی پر پڑے دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا۔ اس کا شریر اکڑ گیا ہے۔ بہت چیکھنے چلانے پر اس نے آنکھیں کھولی۔ پر جگہ سے ہل نہ سکا۔ کتنی دینیہ دشا تھی، کنتو کسی کو اس پر دیا نہ آئی۔ یونان میں دیش دروہی سب سے بڑا اپرادھ تھا اور دروہی کے لیے کہیں چھما نہ تھی، کہیں دیا نہ تھی۔

ایک: ابھی مرا نہیں ہے۔

دوسرا : درودہیوں کو موت نہیں آتی۔

تیسرا : پڑا رہنے دو، مر جائے گا۔

چوتھا : مکر کیے ہوئے ہے؟

پانچواں : اپنی کیے کی سزا پاچکا اب چھوڑ دینا چاہیے۔

سہسا پاسونیس اٹھ بیٹھا۔ اور اددنڈ بھاؤ سے بولا۔ کون کہتا ہے کہ اسے چھوڑ دینا چاہیے۔ نہیں، مجھے مت چھوڑنا، ورنہ پچھتاؤگے، میں سوارتھی ہوں، وشے بھوگی ہوں، مجھ پر بھول کر بھی وشواش نہ کرنا، آہ، میرے کارن تم لوگوں کو کیا کیا جھیلنا پڑا، اسے سوچ کر میرا جی چاہتا ہے کہ اپنی اندریوں کو جلا کر بھسم کر دوں۔ میں اگر سو جنم لے کر اس پاپ کا پرایسچت کروں۔ تو بھی میرا اڈھدار نہ ہوگا۔

تم بھول کر بھی میرا وشواش نہ کرو۔ مجھے سویم اپنے اوپر وشواش نہیں۔ ولاس کے پریمی ستیہ کا پالن نہیں کرسکتے۔ میں اب بھی آپ کی کچھ سیوا کرسکتی ہوں، مجھے

ایسے ایسے گپت رہسیہ معلوم ہیں جنھیں جان کر آپ ایرانیوں کا سنہار کر سکتے ہیں۔ لیکن مجھے اپنے اوپر وشواش نہیں ہے۔ اور آپ سے بھی یہ کہتا ہوں کہ مجھ پر وشواش نہ کیجیے۔ آج رات کو دیوی کی میں نے سچے دل سے وندنا کی ہے۔ اور انھوں نے مجھے ایسے یتر بتائے ہیں جن سے ہم شترووں کو پراست کر سکتے ہیں۔ ایرانیوں کے بڑھتے ہوئے دل کو آن کی آن میں اڑا سکتے ہیں۔ لیکن مجھے اپنے اوُپر وشواش نہیں ہے۔ میں یہاں سے باہر نکل کر ان باتوں کو بھول جاؤں گا۔ بہت سنشے ہے کہ پھر ایرانیوں کی گپت سہایتا کرنے لگوں، اس لیے مجھ پر وشواش نہ کیجیے۔

ایک یونانی : دیکھو، دیکھو کیا کہتا ہے؟

دوسرا : سچا آدمی معلوم ہوتا ہے۔

تیسرا : اپنے اپرادھوں کو آپ سویکار کر رہا ہے۔

چوتھا : اسے چھما کردینا چاہیے اوریہ سب باتیں پوچھ لینی چاہیے۔

پانچواں : دیکھو، یہ نہیں کہتا کہ مجھے چھوڑ دو۔ ہم کو بار بار یاد دلاتا جاتا ہے کہ مجھ پر وشواش نہ کرو۔

چھٹا :رات بھر کے کشٹ نے ہوش ٹھنڈے کردیے۔ اب آنکھیں کھلی ہیں۔

پاسونیس : کیا تم لوگ مجھے چھوڑنے کی بات چیت کر رہے ہو؟ میں پھر معلوم کرتا ہوں میں وشواس کے یوگیہ نہیں ہوں۔ میں دروہی ہوں۔ مجھے ایرانیوں سے بہت سے بھید معلوم ہیں، ایک بار ان کی سینا میں پہنچ جاؤں تو ان کا متر بن کر سروناش کردوں، پر مجھے اپنے اوپر وشواش نہیں ہے۔

ایک یونانی : دھوکے باز اتنی سچی بات نہیں کہہ سکتا۔

دوسرا : پہلے سوارتھا ردھ ہو گیا تھا۔ پر اب آنکھیں کھلی ہیں۔

تیسرا : دیش دروہی سے بھی اپنے مطلب کی باتیں معلوم کرلینے میں کوئی ہانی نہیں ہے۔ اگر وہ اپنے وچن پورے کرے تو ہمیں اسے چھوڑ دینا چاہیے۔

چوتھا : دیوی کی پریرنا سے اس کی کایا پلٹ ہوئی ہے۔

پانچواں : پاپیوں میں بھی آتما کا پرکاش رہتاہے اورکشٹ پاکر جاگرت ہوجاتاہے۔ یہ سمجھنا کہ جس نے ایک بار پاپ کیا وہ پھر کبھی پنیہ کر ہی نہیں سکتا، مانوچرتر کے

ایک پردھان تتّو کا اپواد کرنا ہے۔
چھٹا : ہم اس کو یہاں سے گاتے بجاتے لے چلیں گے، جن سموہ کو چکمادینا کتنا آسان ہے۔ جن ستا واد کا سب سے نربل انگ یہی ہے۔ جنتا تو نیک اور بد کی تمیز نہیں رکھتی، اس پر دھورتوں، رنگے سیاروں کا جادو آسانی سے چل جاتاہے۔ ابھی ایک دن پہلے جس پاسونیس کی گردن پر تلوار چلائی جارہی تھی، اسی کو جلوس کے ساتھ مندر سے نکالنے کی تیاریاں ہونے لگی۔کیونکہ وہ دھورت (مکار) تھا اور جانتا تھا کہ جنتا کی کیل کیوں کر گھمائی جاسکتی ہے۔
ایک استری : گانے بجانے والوں کو بلاؤ، پاسونیس شریف ہے۔
دوسرا : ہاں ہاں، پہلے چل کر اس سے چھما مانگو، ہم نے اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ سختی کی۔
پاسونیس : آپ لوگوں نے پوچھا ہوتا تو میں کل ہی ساری باتیں آپ کو بتا دیتا۔ آپ کو معلوم ہوتا مجھے مار ڈالنا اچت ہے یا جیتا رکھنا۔
کئی استری پُرش : ہائے ہائے ہم سے بڑی بھول ہوئی۔ ہمارے سچے پاسونیس۔
سہسا ایک وردھا استری کسی طرف سے دوڑتی ہوئی آئی اور مندر کے سب سے اونچے زینے پر کھڑی ہو کر بولی۔ تم لوگوں کو کیا ہو گیاہے؟ یونان کے بیٹے آج اتنے گیان شونیہ ہوگئے ہیں کہ جھوٹے اور سچے میں وویک نہیں کرسکتے؟ تم پاسونیس پر وشواش کرتے ہو؟ جس پاسونیس نے سیکڑوں استریوں اوربالکوں کو اناتھ کردیا۔ سیکڑوں گھروں میں کوئی دیا جلانے والا نہ چھوڑا۔ ہمارے دیوتاؤں کا۔ ہمارے پروش کا، گھور اپمان کیا، اس کی دو چار چکنی چپڑی باتوں پر تم اتنے پھول اٹھے۔ یاد رکھو اب کی پاسونیں باہر نکلا تو پھر تمھاری کوشل نہیں۔ یونان پر ایران کا راجیہ ہوگا اور یونانی للنائیں ایرانیوں کی کوُدرشٹ کا شکار بنے گی۔ دیوی کی اگیاں ہے کہ پاسونیس پھر باہر نہ نکلنے پائے اگر تمھیں اپنا دیش پیارا ہے، اپنے پُرش کا نام پیارا ہے۔ اپنی ماتاؤں اور بہنوں کی آبرو پیاری ہے۔ تو مندر کی دوار کو چن دو۔ جس سے دیش دروہی کو پھر باہر نکلنے اور تم لوگوں کو بہکانے کا موقع نہ ملے۔ یہ دیکھو پہلا پتھر میں اپنے ہاتھوں سے رکھتی ہوں۔

لوگوں نے وسمت ہو کر دیکھا۔ یہ مندر کی پجارن اور پاسونیس کی ماتا تھیں۔
دم کے دم میں پتھروں کے ڈھیر لگ گئے۔ اور مندر کے دوار چن دیا گیا۔
پاسونیس بھیتر دانت پیتا رہ گیا۔

ویر ماتا، تمھیں دھنیہ ہے ایسی ہی ماتاؤں سے دیش کا مکھ اُجول ہوتا ہے، جو دیش ہت کے سامنے ماترِاسنیہہ کی دھول برابر پرواہ نہیں کرتی۔ ان کے پتر دیش کے لیے ہوتے ہیں۔ دیش پتر کے لیے نہیں ہوتا۔

نوٹ: یہ افسانہ پہلی بار ماہنامہ ہندی مادھوری فروری 1930 میں شائع ہوا۔ مان سروور 3 میں شامل ہے، اردو میں ابھی تک شائع نہیں ہوا۔

جلوس

(۱)

کانگریس کا جلوس نکل رہا تھا۔ کچھ نوجوان، کچھ بوڑھے، کچھ بچے جھنڈیاں اور جھنڈے لیے ''بندے ماترم'' گاتے ہوئے مال کے سامنے سے نکلے۔ دونوں طرف تماشائیوں کی دیواریں کھڑی تھیں۔ گویا ان کو اس جتھے سے کوئی غرض نہیں ہے۔ یہ کوئی تماشا ہے اور ان کا کام صرف کھڑے کھڑے تماشا دیکھنا ہے۔

شمبھو ناتھ نے دکان کی پڑی پر کھڑے ہو کر اپنے ہمسایہ دین دیال سے کہا۔'' سب کے سب موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ آگے سواروں کا دستہ مار مار کر بھگا دے گا۔''

دین دیال نے کہا۔'' مہاتما جی بھی سٹھیا گئے ہیں۔ جلوس سے سوراجیہ مل جاتا۔ تو اب تک کب کا مل گیا ہوتا۔ اور جلوس میں ہیں کون لوگ دیکھا! لونڈے!! لفنگے!!! دیوانے!!!! شہر کا کوئی بڑا آدمی نہیں۔''

میکو جو چیٹوں اور سلیپروں کی مالا گردن میں لٹکائے کھڑا تھا ان دونوں سیٹھوں کی باتیں سنکر ہنس پڑا۔ شمبھو نے پوچھا۔''کیوں ہنسے میکو؟

آج رنگ گہرا معلوم ہوتا ہے۔

میکو : ہنسا اس بات پر جو تم نے کہی کہ بڑا آدمی جلوس میں نہیں ہے۔ بڑے آدمی

جلوس میں کیوں آنے لگے۔ انھیں اس راج میں کون آرام نہیں ہے بنگلوں اور محلوں میں رہتے ہیں۔ موٹروں پر گھومتے ہیں۔ صاحبوں کے ساتھ دعوتیں کھاتے ہیں۔ انھیں کون تکلیف ہے۔ مرتو ہم لوگ رہے ہیں۔ جنھیں روٹیوں کا ٹھکانہ نہیں۔ اس وقت کوئی ٹینس کھیلتا ہو گا۔ کوئی چائے پیتا ہو گا۔ کوئی گراموفون لیے گانا سنتا ہوگا۔ کوئی پارک کی سیر کرتا ہوگا۔ یہاں آویں پولیس کے کوڑے کھانے کے لیے تم نے بھی اچھی کہی۔''

شمبھو : تم یہ باتیں کیا سمجھو گے میکو! جس کام میں چار بڑے آدمی شامل ہوتے ہیں اس کی سرکار پر بھی دھاک بیٹھ جاتی ہے۔ لونڈے لفنگوں کو حاکم لوگ بھلا کیا سمجھتے ہیں۔

میکو نے ایسی نگاہ سے دیکھا جو کہہ رہی تھی۔''ان باتوں کو ہم بھی سمجھتے ہیں۔'' اور بولا بڑے آدمیوں کو ہمیں لوگ بناتے بگاڑتے ہیں۔ یا کوئی اور؟ کتنے ہی لوگ جنھیں کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ ہمارے بنائے بڑے آدمی بن گئے اور اب موٹروں پر نکلتے ہیں اور ہمیں نیچا سمجھتے ہیں۔ یہ ہم لوگوں کی تکدیر کی کھوبی ہے کہ جس کی جرا بھی ترکی ہوئی بس اس نے ہم لوگوں کی طرف سے نگاہ بدلی۔ ہمارا بڑا آدمی تو وہی ہے جو لنگوٹی باندھے ننگے پاؤں گھومتا ہے۔ جو ہمارے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے۔ ہمیں اور کسی بڑے آدمی کی پرواہ نہیں ہے۔ سچ پوچھیے تو ان بڑے آدمیوں نے ہی ہماری مٹی خراب کر رکھی ہے۔ انھیں سرکار نے کوئی اچھی سی جگہ دیدی۔ بس اس کا دم بھرنے لگے۔

دین دیال : نیا داروغہ بڑا جلاد ہے۔ چوراہے پر پہنچتے ہی ہنٹر لے کر پل پڑے گا۔ پھر دیکھنا سب کیسا دم بدا کر بھاگتے ہیں۔ مزا آوے گا۔

جلوس آزادی کے نشے میں چور چوراہہ پر پہنچا تو دیکھا کہ سواروں اور سپاہیوں کا ایک دستہ راستہ رو کے کھڑا ہے۔

یکایک داروغہ بیربل سنگھ گھوڑا بڑھا کر جلوس کے سامنے آگئے اور بولے۔ تم لوگوں کو آگے جانے کا حکم نہیں۔ جلوس کے بڈھے لیڈر ابراہیم علی نے آگے بڑھ کر کہا:۔ ''میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ کسی قسم کا دنگا فساد نہ ہوگا۔ ہم دکانیں

لوٹنے یا موٹریں توڑنے نہیں نکلے ہیں۔ ہمارا مقصد اس سے کہیں اونچا ہے۔
بیربل سنگھ : مجھے یہ حکم ہے کہ جلوس یہاں سے آگے نہ جانے پاوے۔
ابراہیم : آپ اپنے افسروں سے ذرا پوچھ لیں۔
بیربل سنگھ : میں اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔
ابراہیم : تو ہم لوگ یہیں بیٹھے ہیں۔ جب آپ لوگ چلے جائیں تو ہم نکل جائیں گے۔
بیربل سنگھ : یہاں کھڑے ہونے کا بھی حکم نہیں ہے۔ تم کو واپس جانا پڑے گا۔

ابراہیم نے متانت کے ساتھ جواب دیا۔ ''واپس تو ہم نہ جائیں گے۔ آپ کو یا کسی کو بھی ہمیں روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ اپنے سواروں، سنگینوں اور بندوقوں کے زور سے ہمیں روکنا چاہتے ہیں۔ روک لیجیے۔ مگر آپ ہمیں واپس نہیں کر سکتے۔

بیر بل سٹرک تھا۔ اس کا باپ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ اس کی رگ رگ میں رعب بھراہوا تھا۔ افسروں کی نگاہ میں اس کی بڑی عزت تھی۔ خاصہ گورا چٹا، نیلی آنکھوں اوربھورے بالوں والا صاحب اقبال شخص تھا۔ شاید جس وقت وہ کوٹ پہن کر اوپر سے ہیٹ لگا لیتا تو وہ بھول جاتا تھاکہ میں بھی یہیں کا رہنے والا ہوں۔ غالبًا وہ اپنے کو سلطنت کرنے والی قوم کا جز سمجھنے لگا تھا۔ مگر ابراہیم علی کے مردانہ استقلال نے ذرا دیر کے لیے اس شش و پنج میں ڈال دیا۔ جلوس کو راستہ دے دیتا ہے تو جواب طلب ہوجائے گا۔ وہیں کھڑا رہنے دیتا ہے تو یہ سب نہ جانے کب تک کھڑے رہیں۔ اسی حیص بیص میں پڑا ہوا تھا کہ اس نے ڈی۔ ایس۔ پی کو موٹر پر آتے دیکھا۔ اب پس و پیش کا وقت نہ تھا۔ یہی موقع تھا کارگذاری دکھانے کا اس نے کمر سے بیٹن نکال لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر جلوس پڑ چڑھانے لگا۔ اسے دیکھتے ہی اور سواروں نے بھی گھوڑوں کو جلوس پر چڑھانا شروع کردیا۔ ابراہیم داروغہ کے گھوڑے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے سر پر ایک بیٹن ایسے زور سے پڑا کہ اس کی آنکھیں تملا گئیں۔ کھڑا نہ رہ سکا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت داروغہ کے گھوڑے نے دونوں پاؤں اٹھائے اور زمین پر بیٹھا ہوا ابراہیم اس کے ٹاپوں کے

نیچے آ گیا۔ جلوس ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ ابراہیم کو گرتے دیکھ کر کئی آدمی اسے اٹھانے کے لیے لپکے مگر کوئی آگے نہ بڑھ سکا۔ ادھر سواروں کے ڈنڈے بڑی بے رحمی سے پڑ رہے تھے۔ لوگ ہاتھوں پر ڈنڈوں کو روکتے تھے اور ثابت قدمی کے ساتھ کھڑے تھے۔ دل سے اشتعال کو دور رکھنا ان کے لیے دم بہ دم مشکل ہوتا جاتا تھا۔ مگر مسلک اور اصول نے ان کے جذبات اور حرکات کو بندشوں سے جکڑ رکھا تھا۔

دس بارہ منٹ تک یونہی ڈنڈوں کی بوچھاڑ ہوتی رہی اور لوگ خاموش کھڑے رہے۔

(۲)

اس مار پیٹ کی خبر ایک ہی آن میں بازار میں جا پہنچی۔ ابراہیم گھوڑے سے کچل گئے۔ کئی آدمی زخمی ہو گئے۔ کتنوں ہی کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ مگر نہ وہ لوگ واپس ہوتے ہیں نہ پولیس انھیں آگے جانے دیتی ہے۔

میکو نے جوش میں آ کر کہا۔'' اب تو بھائی یہاں نہیں رہا جاتا۔ میں بھی چلتا ہوں۔''

دین دیال نے کہا۔'' ہم بھی چلتے ہیں بھائی! دیکھی جائے گی۔''

شمبھو ایک منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ یکایک اس نے بھی دکان بڑھائی۔ اور بولا۔ ''ایک دن تو مرنا ہی ہے جی، جو کچھ ہونا ہے ہو۔ آخر یہ لوگ سبھی کے لیے تو جان دے رہے ہیں۔'' دیکھتے دیکھتے زیادہ تر دکانیں بند ہو گئیں۔ وہ لوگ جو دس منٹ پیشتر تماشا دیکھ رہے تھے۔ ادھر ادھر سے دوڑ پڑے اور ہزاروں آدمیوں کا ایک جم غفیر جائے وقوع کی طرف چلا یہ متوالا گروہ خونریزی کا نشہ میں بھرے ہوئے آدمیوں کا گروہ تھا۔ جسے اصول اور مسلک کی پرواہ نہ تھی۔ جو مرنے کے لیے ہی نہیں مارنے کے لے بھی تیار تھے۔ کتنوں ہی کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں کتنے ہی جیبوں میں پتھر بھرے ہوئے تھے۔ نہ کوئی کسی سے کچھ بولتا تھا نہ پوچھتا تھا۔ بس سب کے سب دل میں ایک مستقل ارادہ کیے لپکے چلے جا رہے تھے۔ گویا کوئی گھٹا

اڈی چلی آتی ہو۔

اس گروہ کو دور سے دیکھتے ہی سواروں میں کچھ ہلچل پڑی۔ بیربل سنگھ کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگی۔ ڈی۔ ایس۔پی نے اپنی موٹر آگے بڑھائی۔

امن اور عدم تشدد کے حامیوں پر ڈنڈے برسانا اور بات تھی۔ لیکن ایک پرجوش گروہ سے مقابلہ کرنا دوسری بات۔ سوار اور سپاہی پیچھے ہٹ گئے۔

ابراہیم کی پیٹھ پر گھوڑے نے ٹاپ رکھ دیا تھا۔ وہ بے ہوش زمین پر پڑے تھے۔ ان آدمیوں کو اشارہ سے بلا کر کہا۔ کیوں کیلاش ! کیا کچھ لوگ شہر سے آرہے ہیں۔

کیلاش نے اس بڑھتی ہوئی گھٹا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جی ہاں ہزاروں آدمی ہیں۔''

ابراہیم : تو اب خیریت نہیں ہے۔ جھنڈا لوٹا دو۔ ہمیں فوراً واپس چلنا چاہیے۔ نہیں تو طوفان برپا ہوجائے گا۔ ہمیں اپنے بھائیوں سے لڑائی نہیں کرنا ہے۔ فوراً واپس چلو۔

یہ کہتے ہوئے انھوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر اٹھ نہ سکے۔

اشارہ کی دیر تھی۔ منظم فوج کی طرح لوگ حکم پاتے ہیں پیچھے پھر گئے!

جھنڈیوں کے بانسوں، صافوں اور رومالوں سے فوراً ایک اسٹریچر تیار ہو گیا۔ ابراہیم کو لوگوں نے اس پر لٹا دیا۔ اور واپس ہوئے۔ مگر کیا وہ مغلوب ہو گئے تھے؟ اگر کچھ لوگوں کو انھیں مغلوب سمجھنے میں ہی تسلی ہوتی ہو، تو ہو۔ لیکن حقیقت میں انھوں نے ایک معرکتہ الآرا فتح حاصل کی تھی۔ وہ جانتے تھے ہماری کشمکش اپنے ہی بھائیوں سے ہے۔ جن کے مفاد حالت موجودہ میں ہمارے مفاد سے علیحدہ ہیں۔ ہمیں ان سے دشمنی نہیں کرنی ہے۔ پھر وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ شہر میں لوٹ مار اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو جائے۔ اور ہماری قومی جدوجہد کا نتیجہ لٹی ہوئی دکانیں اور ٹوٹے ہوئے سر ہوں۔ ان کی فتح کا سب سے روشن پہلو یہ تھا کہ انھوں نے پبلک کی ہمدردی حاصل کر لی تھی۔ وہی لوگ جو پہلے ان پر تمسخر کرتے تھے۔ ان کا استقلال اور ان کی جرأت دیکھ کر ان کی امداد کے لیے نکل پڑے تھے۔ ذہنیت کی یہ تبدیلی یہ بے داری ہی ان کی اصلی فتح تھی۔

(۴)

تین دن گزر گئے تھے۔ بیر بل سنگھ اپنے کمرہ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اور ان کی بیوی مٹھن بائی بچے کو گود میں لیے سامنے کھڑی تھیں۔

بیربل سنگھ نے کہا۔ میں اس وقت کیا کرتا؟ پیچھے ڈی۔ ایس۔ پی کھڑا تھا۔ اگر جلوس کو راستہ دے دیتا تو اپنی جان مصیبت میں پھنستی۔

مٹھن بائی نے سر ہلا کر کہا۔ تم کم سے کم اتنا تو کر ہی سکتے تھے کہ ان پر ڈنڈے نہ چلاتے۔ کیا تمھارا کام آدمیوں پر ڈنڈے چلاناہے۔؟ تم زیادہ سے زیادہ جلوس کو روک سکتے تھے۔ کل کو تمھیں مجرموں کو بید لگانے کا کام دیا جائے تو شاید تمھیں بڑی خوشی ہو گی۔ کیوں؟

بیر بل سنگھ نے شرمندہ ہو کر کہا۔ تم تو بات نہیں سمجھتی ہو۔!

مٹھن بائی : میں خوب سمجھتی ہوں۔ ڈی۔ایس۔پی پیچھے کھڑا تھا۔ تم نے خیال کیا ہوگا کہ کارگزاری دکھانے کا ایسا موقع پھر کبھی ملے یا نہ ملے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس گروہ میں کوئی بھلا آدمی نہ تھا؟ اس میں کتنے ہی آدمی ایسے تھے جو تمھارے جیسوں کو نوکر رکھ سکتے ہیں۔ علم میں تو شاید زیادہ تر تم سے بڑھے ہوئے ہوں گے۔ مگر تم ان پر ڈنڈے چلا رہے تھے۔ اور انھیں گھوڑے سے کچل رہے تھے۔ واہ ری جواں مردی۔!

بیربل سنگھ نے بے حیائی کی ہنسی کے ساتھ کہا۔ صاحب نے میرا نام نوٹ کر لیا ہے۔ سچ!

داروغہ نے سمجھا تھا۔ یہ مژدہ جاں فزا سنا کر وہ مٹھن بائی کو خوش کرلیں گے۔ شرافت اور اخلاق کی چشم نمائیاں اس نفع صریح کی تاب نہ لاسکیں گی۔ مگر مٹھن بائی کے چہرہ پر خوشی کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ بولی۔ ضرور کر لیا ہوگا۔ اور شاید تمھیں جلد ترقی بھی مل جائے۔ مگر بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگ کر ترقی پائی تو کیا پائی ! یہ تمھاری کارگزاری کا انعام نہیں۔ تمھاری غداری کی قیمت ہے۔ تمھاری کارگذاری کا انعام تو اس وقت ملے گا جب تم کسی خونی کو کھوج نکالوگے۔ کسی

ڈوبتے ہوئے آدمی کو بچالوگے۔

یکا یک ایک سپاہی نے برآمدہ میں کھڑے ہو کر کہا۔''حضور! یہ لفافہ لایا ہوں۔'' بیربل سنگھ نے باہر نکل کر لفافہ لے لیا اور اندر کی سرکاری چٹھی نکال کر پڑھنے لگے پڑھ کر اسے میز پر رکھ دیا۔

مٹھن نے پوچھا۔ کیا ترقی کا پروانہ آگیا؟

بیربل سنگھ نے جھینپ کر کہا۔ تم تو بناتی ہو۔ آج پھر کوئی جلوس نکلنے والا ہے۔ مجھے اس کے ساتھ رہنے کا حکم ہوا ہے۔

مٹھن: پھر تو تمھاری چاندی ہے۔ تیارہوجاؤ۔ آج پھر ویسے ہی شکار ملیں گے۔ خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ دکھانا،ڈی۔ایس۔پی ضرور آئیں گے اس مرتبہ تم انسپکٹرہوجاؤگے سچ۔!

بیربل سنگھ نے چیں بہ جبیں ہو کرکہا۔ کبھی کبھی تم بے سر پیر کی باتیں کرنے لگتی ہو۔ فرض کرو میں جاکر خاموش کھڑا رہوں تو کیا نتیجہ ہو گا؟ میں نالائق سمجھا جاؤں گا اور میری جگہ کوئی دوسرا آدمی بھیج دیا جائے گا۔ کہیں شبہ ہو گیا کہ مجھے سوراجیوں سے ہمدردی ہے تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ اگر برخاست نہ بھی ہوا تو لین کی حاضری تو ہو ہی جائے گی۔ آدمی جس دنیا میں رہتاہے اسی کا چلن دیکھ کر کام کرتا ہے۔ میں عقلمند نہ سہی پر اتنا جانتا ہوں کہ یہ لوگ ملک اور قوم کو آزاد کرانے کے لیے ہی کوشش کر رہے ہیں۔یہ بھی جانتا ہوں کہ سرکار اس خیال کو پامال کر دینا چاہتی ہے۔ایسا گدھا نہیں ہوں۔ کہ غلامی کی زندگی پر فخر کروں۔ لیکن حالت موجودہ سے مجبور ہوں۔

باجے کی آواز کانوں میں آئی۔ بیر بل سنگھ نے باہر جا کر دریافت کیا۔ معلوم ہوا سوراجیوں کا جلوس آرہا ہے۔ فوراً وردی پہنی۔ صافہ باندھا اور جیب میں پستول رکھ کر باہر آئے۔ دم بھر میں گھوڑا تیار ہو گیا۔ کانسٹبل پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے۔ سب لوگ ڈبل مارچ کر تے ہوئے جلوس کی طرف روانہ ہوئے۔

(۴)

یہ لوگ کوئی پندرہ منٹ میں جلوس کے سامنے پہنچ گئے۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی

بے شمار گلوں سے ''بندے ماترم'' کی ایک آواز نکلی گویا بادلوں میں گرج ہوئی ہو۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ اس جلوس میں کسی قدر فرق تھا۔ وہ سوراجیہ کے جشن کا جلوس تھا۔ یہ ایک شہید کے ماتم کا۔ تین دن کے مسلسل بخار اور تکلیف کے بعد آج اس زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ جس نے کبھی عہدے کی خواہش نہیں کی۔ کبھی منصب کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ انھوں نے مرتے وقت وصیت کی تھی۔ میری لاش کو گنگا میں غسل دے کر دفن کیا جائے اور میرے مزار پر سوراجیہ کا جھنڈا نصب کیاجائے۔ ان کے انتقال کی خبر پھیلتے ہی سارے شہر پر ماتم کا پردہ سا پڑگیا۔ جو سنتا تھا ایک مرتبہ اس طرح چونک پڑتا تھا۔ گویا کہ اسے گولی سی لگ گئی ہو۔اور فوراً ان کی زیارت کے لیے بھاگتا تھا۔ سارے بازار بند ہو گئے یکہ اور تانگوں کا بھی کہیں پتہ نہ تھا جیسے شہر لٹ گیا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر امنڈ پڑا۔جس وقت جنازہ اٹھا۔ لاکھ سوا لاکھ آدمی ساتھ تھے۔کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو آنسوؤں سے سرخ نہ ہو۔

بیربل سنگھ اپنے کانسٹبلوں اور سواروں کو پانچ پانچ گز کے فاصلہ پر جلوس کے ساتھ چلنے کا حکم دے کر خود پیچھے چلے گئے۔ پچھلی صفوں میں کوئی پچاس گز مستوراتیں تھیں۔ داروغہ نے ان کی طرف دیکھا۔ پہلی ہی قطار میں مٹھن بائی نظر آئی۔ بیر بل کو اعتبار نہ آیا۔ پھر غور کر کے دیکھا وہی تھی۔ مٹھن نے ان کی طرف ایک بار دیکھ کر آنکھیں پھیر لیں۔ لیکن اس کی ایک چتون میں کچھ ایسی لعنت، کچھ ایسی شرم، کچھ ایسا درد اور کچھ ایسی نفرت بھری ہوئی تھی کہ بیربل سنگھ کے جسم میں سر سے پاؤں تک سنسنی دوڑ گئی۔ وہ اپنی نگاہ میں کبھی ایسے ہلکے، اتنے کمزور اور اتنے ذلیل نہ ہوئے تھے۔

یکایک ایک عورت نے داروغہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ کوتوال صاحب! کہیں ہم لوگوں پر ڈنڈے نہ چلادیجیے گا۔ آپ کو دیکھ کر ڈر ہو رہا ہے۔

دوسری بولی۔ آپ ہی کے تو کوئی بھائی تھے۔ جنھوں نے اس دن نال کے چوراہہ پر ڈنڈوں کی بارش کی تھی۔

مٹھن نے کہا۔''آپ کے کوئی بھی نہ تھے۔آپ خود تھے۔''

بیسوں منہ سے آوازیں نکلیں۔ اچھا! یہ وہی صاحب ہیں۔!! صاحب۔ آپ کو

آداب ہے! یہ آپ ہی کی نوازش کا نتیجہ ہے۔ کہ آج ہم بھی آپ کے ڈنڈے کی زیارت کے لیے آ کھڑی ہوئی ہیں۔''

بیربل نے مٹھن بائی کی طرف آنکھوں کا بھالا چلایا۔ پر منہ سے کچھ نہ بولے۔

ایک تیسری خاتون نے پھر کہا۔ ہم ایک جلسہ کرکے آپ کو ہار پہنائیں گے۔

ایک بڑھیا نے آنکھیں چڑھا کر کہا۔'' میری کوکھ سے ایسا بچہ پیدا ہوتا تو اس کی گردن مروڑ دیتی۔''

ایک نوجوان خاتون نے اس کی سرزنش کر کے کہا۔'' آپ بھی خوب کہتی ہیں۔ ماتا جی! کتے تک تو نمک کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہ تو آدمی ہیں۔''

بڑھیا نے جھلا کر کہا۔ ''آدمی نہیں! پیٹ کے غلام۔ ہائے پیٹ! ہائے پیٹ!!

اس پر کئی عورتوں نے بڑھیا کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور وہ بے چاری شرمندہ ہو کر بولی۔ ارے تو میں کچھ کہتی تھوڑے ہی ہوں۔ مگر ایسا آدمی بھی کیا جو خود غرضی کے پیچھے اندھا ہو جائے۔''

بیربل سنگھ اب اور نہ سن سکے۔ گھوڑا بڑھا کر جلوس سے کئی گز پیچھے چلے گئے۔ مرد طعنے دے تو ہمیں غصہ آتا ہے۔ عورت طعنے دیتی ہے تو ہم خفیف ہوجاتے ہیں۔ بیربل سنگھ کی اس وقت اتنی ہمت نہ تھی کہ پھر ان خاتونوں کے سامنے جاتے۔ اپنے افسروں پر غصہ آیا۔ مجھ کو ہی باربار کیوں ان کاموں پر تعینات کیا جاتا ہے اور لوگ بھی تو ہیں۔ انھیں کیوں نہیں بلایا جاتا۔ کیا میں ہی سب سے گیا گذرا ہوں؟ کیا میں ہی سب سے بے حس ہوں؟ مٹھی اس وقت مجھے دل میں کس قدر بزدل اور ذلیل سمجھ رہی ہو گی۔ شاید اس وقت مجھے کوئی مار بھی ڈالے تو وہ زبان نہ کھولے گی۔ غالبًا دل ہی دل میں خوش بھی ہوگی۔ کہ اچھا ہوا۔ ابھی کوئی جاکر صاحب سے کہہ دے کہ بیربل سنگھ کی بیوی جلوس میں نکلی تھی۔ تو کہیں کا نہ رہوں۔ مٹھی جانتی ہے۔ سمجھتی ہے۔ پھر بھی نکل کھڑی ہوئی۔ مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ کوئی فکر نہیں ہے نہ۔ جبھی تو یہ باتیں سوجھتی ہیں۔ یہاں سبھی بے فکرے ہیں۔ کالجوں اور اسکولوں کے لڑکے، مزدور، پیشہ ور، انھیں کیا فکر۔ موت تو ہم لوگوں کی ہے جن کے بال بچے ہیں اور کچھ عزت کا خیال ہے۔ سب کی سب میری

طرف کیسا گھور رہی ہیں گویا کھاجائیں گی۔

جلوس شہر کی خاص سڑکوں سے گزرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ دونوں طرف چھتوں، چھجوں، جنگلوں اور درختوں پر تماشائیوں کی دیواریں سی کھڑی تھیں۔ بیربل سنگھ کو آج ان کے چہروں پر ایک نئی امنگ، ایک نیا عزم اور ایک نئی شان جھلکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ امنگ بڈھوں کے چہروں پر، عزم نوجوانوں کے، اور شان خاتونوں کے۔ اب ان کے سفر کی منزل مقصود مفقود نہ تھی۔ گم گشتوں کی طرح ادھر ادھر بھٹکنا نہ تھا۔ پامالوں کی طرح سر جھکا کر رونا نہ تھا آزادی کی سنہری چوٹی دور دراز آسمان پر چمک رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کو درمیان کے نالوں اور جنگلوں کی پرواہ نہیں ہے۔ سب اس سنہری منزل پر پہنچنے کے شوق میں بے چین ہو رہے ہیں۔

گیارہ بجتے بجتے جلوس دریا کے کنارے جا پہنچا۔ جنازہ اتارا گیا اور لوگ لاش کو گنگا اشنان کرانے کے لیے چلے۔ اس کی سرد، خاموش اور زرد پیشانی پر لاٹھی کی چوٹ صاف نظر آرہی تھی۔ خون جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔ سر کے بڑے بڑے بال خون جم جانے سے کسی مصور کے برش کی طرح چمٹ گئے تھے۔ کئی ہزار آدمی اس شہید کی آخری زیارت کے لیے حلقہ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ بیربل سنگھ پیچھے گھوڑے پر سوار کھڑے تھے۔ لاٹھی کی چوٹ انھیں بھی نظر آئی۔ ان کی روح نے انھیں پرزور ملامت کی۔ وہ لاش کی طرف نہ دیکھ سکے۔ منہ پھیر لیا۔جس شخص کی زیارت کے لیے جس کی خاک پا کو پیشانی پر لگانے کے لیے لاکھوں آدمی بے تاب ہو رہے ہیں۔ اس کی میں نے اتنی بے عزتی کی۔ ان کی روح اس وقت اعتراف کر رہی تھی کہ اس بے رحمانہ تشدد میں فرض کی ادائیگی کا شمہ بھی نہ تھا۔ صرف خود غرضی تھی۔ کار گذاری دکھانے کا جوش اور افسروں کو خوش کرنے کی تمنا۔ ہزاروں آنکھیں غصہ سے بھری ہوئی ان کی طرف دیکھ رہے تھیں۔ لیکن وہ آنکھیں اٹھانے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

ایک کانسٹبل نے آکر تعریف کی۔ حضور کا ہاتھ گہرا پڑا تھا۔ ابھی تک کھوپڑی کھلی ہوئی ہے۔

بیربل نے آزردہ خاطر ہو کر کہا۔ میں اسے اپنی جوانمردی نہیں، اپنا کمینہ پن

سمجھتا ہوں۔

کانسٹبل نے پھر خوشامد کی۔ بڑا سرکش آدمی تھا، حضور!

بیربل نے غصہ کے ساتھ کہا۔ چپ رہو۔ جانتے بھی ہو سرکش کسے کہتے ہیں۔ سرکش وہ کہلاتے ہیں جو ڈاکے مارتے ہیں۔ چوری کرتے ہیں۔ خون کرتے ہیں۔ انھیں سرکش نہیں کہتے جو ملک کی بہبودی کے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لیے گھومتے ہیں۔ ہماری بدنصیبی ہے کہ جن کی مدد کرنی چاہیے۔ ان کی مخالفت کر رہے ہیں۔ یہ گھمنڈ کرنے اور خوش ہونے کی بات نہیں ہے۔ شرم کرنے اور رونے کی بات ہے۔

غسل ختم ہوا۔ جلوس یہاں سے پھر روانہ ہوا۔

(۵)

لاش کو جب خاک کے نیچے سلا کر لوگ واپس ہوئے تو دو بج رہے تھے۔ مٹھن بائی عورتوں کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک آئی۔ پر کوئنس پارک میں آ کر ٹھٹھک گئی۔ گھر جانے کی خواہش نہ ہوئی۔ وہ بڈھا، زخمی، خون آلودہ چہرہ گویا اس کے دل میں بیٹھا محبت کی بندشوں کو کاٹ رہا تھا۔ شوہر سے اس کا دل اس قدر پھر گیا تھا کہ اب اسے ملامت کرنے کی بھی اس کی خواہش نہ تھی ایسی خود غرض آدمی پر خوف کے علاوہ اور کسی چیز کا اثر ہو سکتا ہے۔ اس کا اسے یقین ہی نہ تھا۔

وہ بڑی دیر تک پارک میں گھاس پر بیٹھی سوچتی رہی۔ لیکن اپنے طرز عمل کا بھی فیصلہ قطعی نہ کر سکی۔ میکے جا سکتی تھی لیکن وہاں سے مہینہ دو مہینہ میں پھر اسی گھر میں آنا پڑے گا۔ نہیں، میں کسی کی محتاج نہ بنوں گی۔ کیا میں اپنے گزر بسر کو بھی نہیں کما سکتی؟ اس نے خود طرح طرح کی مشکلات کا خیال کیا۔ لیکن آج اس کے دل میں نہیں معلوم اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ان فرضی باتوں کا خیال کرنا ہی اسے اپنی کمزوری معلوم ہوئی۔

یکایک اسے ابراہیم علی کی بوڑھی بیوہ کا خیال آیا۔ اس نے سنا تھا کہ اس کے لڑکے بالے نہیں ہیں۔ بیچاری اکیلی بیٹھی رو رہی ہوگی۔ کوئی تسلی دینے والا بھی پاس نہ ہوگا۔ وہ ان کے مکان کی طرف روانہ ہوئی۔ پتہ اس نے پہلے ہی اپنے

ساتھ کی عورتوں سے دریافت کر لیا تھا۔۔ وہ دل میں سوچتی جا تی تھی۔میں ان سے کیسے ملوں گی؟ ان سے کیا کہوں گی۔ انھیں کن لفظوں میں سمجھاؤں گی۔ انھیں خیالات میں ڈوبی ہوئی وہ ابراہیم علی کے گھر پر پہنچ گئی۔ مکان ایک گلی میں تھا۔ صاف ستھرا لیکن دروازہ پرحسرت برس رہی تھی۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے اندر قد م رکھا۔ سامنے برآمدہ میں ایک چارپائی پر وہ بوڑھی بیوہ بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کے شوہر نے آج آزادی کی لڑائی میں اپنی قربانی دی تھی۔ اس کے سامنے سادے کپڑے پہنے ایک نوجوان کھڑا آنکھوں میں آنسوں بھرے بوڑھی سے کچھ باتیں کررہا تھا۔ مٹھن اس نوجوان کو دیکھ کر چونک پڑی۔ وہ بیربل سنگھ تھے۔

اس نے غصہ میں بھرے ہوئے تعجب سے پوچھا۔ تم یہاں کیسے آئے؟ بیربل سنگھ نے کہا۔ اسی طر ح جیسے تم آئیں۔ اپنی خطا معاف کرانے آیا ہوں۔

مٹھن بائی کے گورے چہرہ پر آج فخر، مسرت اور محبت کی پاکیزہ شگفتگی نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوا گویا اس کی ساری مرادیں پوری ہوگئی ہیں اور اس سے زیادہ نصیبہ ور عورت دنیا میں نہیں۔

مگر اس نے اپنی خوشی کو سر د مہر ی کے پردہ میں چھپا کر سخت لہجہ میں کہا۔ دنیا میں بعض ایسی خطائیں ہیں جن کی معافی ممکن نہیں۔ زبان خلق کی عدالت تمھیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

بیربل نے ایک بار اس کی طرف پُرسوال نظروں سے دیکھ کر کہا : تم ٹھیک کہتی ہو مٹھی۔''

اس نے فوراً جیب سے پستول نکالا اور اپنے سینہ میں گولی مارلی۔ بوڑھی بیوہ چیخ کر اسے سنبھالنے دوڑی مگر مٹھن بائی اسی شگفتہ انداز سے کھڑی تھی۔

یہ قصہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ ہنس کے مارچ 1930 کے شمارے میں شائع ہوا۔ یہ مانسرور نمبر 7 میں شامل ہے۔ اردو میں پریم چالیسی میں شامل ہے۔

سُبھاگی

(۱)

اور لوگوں کے یہاں چاہے جو ہوتا ہو، تلسی مہتو اپنی لڑکی سوبھاگی کو لڑکے راموں سے جوں بھر بھی کم پیار نہ کرتے تھے۔ راموں جوان ہو کر بھی کاٹھ کا اُلو تھا۔ سوبھاگی گیارہ سال کی بالکا ہو کر بھی گھر کے کام میں اتنی چتر اور کھیتی باری کے کام میں اتنی نِپُن تھی کہ اس کی ماں لکشمی دل میں ڈرتی رہتی کہ کہیں لڑکی پر دیوتاؤں کی آنکھ نہ پڑجائے۔ اچھے بالکوں سے بھگوان کو بھی تو پریم ہے۔ کوئی سوبھاگی کا بکھان نہ کرے، اس لیے وہ انایاس ہی اسے ڈانٹتی رہتی تھی۔ بکھان سے لڑکے بگڑ جاتے ہیں یہ بھئے تو نہ تھا، بھئے تھا۔ نظر کا۔ وہی سوبھاگی آج گیارہ سال کی عمر میں ودھوا ہوگئی۔

گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لکشمی پچھاڑیں کھاتی تھی۔ تلسی سر پیٹتے تھے، انھیں روتے دیکھ کر سوبھاگی بھی روتی تھی۔ بار بار ماں سے پوچھتی۔ کیوں روتی ہو؟ اماں میں تمھیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی تم کیوں روتی ہو ماں میں اس کی بھولی باتیں سن کر ماتا کا دل اور بھی پھٹا جاتا تھا۔ وہ سوچتی تھی ایشور تمھاری یہی لیلا ہے۔ جو کھیل کھیلتے ہو وہ دوسروں کو دکھ دے کر۔ ایسا تو پاگل کرتے ہیں۔ آدمی پاگل پن کرے تو اسے پاگل خانے بھیجتے ہیں مگرتم جو پاگل پن کرتے ہو، اس کا کوئی دنڈ نہیں۔ ایسا کھیل کس کام کا کہ دوسرے روئے اور تم ہنسو، تمھیں تو لوگ دیالو کہتے ہیں۔ یہی تمھاری دیا ہے۔

اور سُبھاگی کیا سوچ رہی تھی؟ اس کے پاس کوٹھری بھر روپے ہوتے تو وہ

انھیں چھپا کر رکھ دیتی۔ پھر ایک دن چپکے سے بازار چلی جاتی اور اماں کے لیے اچھے اچھے کپڑے لاتی، دادا جب باقی مانگنے آتے، توچٹ روپے نکال کر.دے دیتی، اماں دادا کتنے خوش ہوتے۔

(۲)

جب سوبھاگی جوان ہوئی تو لوگ تلسی مہتو پر دباؤ ڈالنے لگے کہ لڑکی کا گھر کہیں کر دو۔ جوان لڑکی کا یوں پھرنا ٹھیک نہیں۔ جب ہماری برادری میں اس کی کوئی نندا نہیں ہے۔ تو کیوں سوچ وچار کرتے ہو؟

تلسی نے کہا: بھائی میں تو تیار ہوں، لیکن جب سوبھاگی بھی مانے، وہ کسی طرح راضی نہیں ہوتی۔

ہریجن نے سوبھاگی کو سمجھا کر کہا۔ بیٹی، ہم تیرے ہی بھلے کو کہتے ہیں۔ ماں باپ اب بوڑھے ہوئے۔ ان کا کیا بھروسہ، تم اس طرح کب تک بیٹھی رہوگی؟

سوبھاگی نے سر جھکا کر کہا۔ چاچا، میں تمھاری بات سمجھ رہی ہوں، لیکن میرا من گھر کرنے کو نہیں کہتا۔ مجھے آرام کی چنتا نہیں ہے۔ میں سب کچھ جھیلنے کو تیار ہوں اور جو کام تم کہو، وہ سر آنکھوں کے بل کروں گی، مگر گھر بسانے کو مجھ سے نہ کہو۔ جب میرا چال کو چال دیکھنا تو میرا سر کاٹ لینا۔ اگر میں سچے باپ کی بیٹی ہوں گی تو بات کی بھی پکی ہوں گی۔ پھر لجا رکھنے والے بھگوان ہیں، میری کیا ہستی ہے کہ ابھی کچھ کہوں۔

اجڈو راموں بولا۔ تم اگر سوچتی ہو کہ بھیا کما دیں گے اور میں بیٹھی موج کروں گی تو اس بھروسے نہ رہا۔ یہاں کسی نے جنم بھر کا ٹھیکا نہیں لیا ہے۔

راموں کی دلہن راموں سے بھی دو انگل اونچی تھی۔ مٹک کر بولی۔ کسی کا قرض تھوڑے کھایا کہ جنم بھر بیٹھے بھرا کریں۔ یہاں تو کھانے کو بھی مہین چاہیے، پہنے کو بھی مہین چاہیے، یہ ہمارے بوتے کی بات نہیں، سوبھاگی نے غرو سے بھرے ہوئے سور میں کہا، بھابھی، میں نے تمھارا آسرا کبھی نہیں کیا۔اور بھگوان نے چاہا تو کبھی کروں گی بھی نہیں۔ تم اپنی دیکھوں میری چنتا نہ کرو۔

راموں کی دلہن کو جب معلوم ہوگیا کہ سوبھاگی گھر نہ کرے گی۔ تو اور بھی اس کے سر ہوگئی۔ ہمیشہ ایک نہ ایک کھچڑ لگائے رہتی۔ اسے رولانے میں جیسے اس کو مزا آتا تھا۔ وہ بے چاری پہر رات سے اٹھ کر کوٹنے پیسنے میں لگ جاتی، چوکا برتن کرتی، گوبر پاتھتی۔ پھر کھیت میں کام کرنے چلی جاتی۔ دوپہر کو آکرجلدی جلدی کھانا پکا کر سب کو کھلاتی۔ رات کو کبھی ماں کے سر میں تیل ڈالتی، کبھی اس کی دیہہ دباتی۔ تلسی چلم کے بھکت تھے۔ انھیں بار بار چلم پلاتی۔ جہاں تک اپنا بس چلتا، ماں باپ کو کوئی کام نہ کرنے دیتی۔ ہاں، بھائی کو نہ روکتی۔ سوچتی یہ تو جوان آدمی ہیں۔ یہ کام نہ کریں گے تو گرہستی کیسے چلے گی۔

مگر راموں کو یہ برا لگتا۔ اماں اور دادا کو تنکا تک نہیں اٹھانے دیتی اورمجھے پیسنا چاہتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ جامے سے باہر ہوگیا۔ سوبھاگی سے بولا۔ اگر ان لوگوں کا بڑا موہ ہے توکیوں نہیں الگ لے کر رہتی ہو تب سیوا کرو تو معلوم ہو کہ سیوا کڑوی لگتی ہے کہ میٹھی۔ دوسروں کے بل پر واہ واہی لینا آسان ہے۔ بہادر وہ ہے جو اپنے بل پر کام کرے۔

سوبھاگی نے تو کچھ جواب نہ دیا۔ بات بڑھ جانے کا بھئے تھا۔ مگر اس کے ماں باپ بیٹھے سن رہے تھے۔ مہتو سے نہ رہا گیا۔ بولے کیا ہے راموں، اس غریبن سے کیوں لڑتے ہو؟ راموں پاس آکر بولا تم کیوں بیچ میں کود پڑے، میں تو اس کو کہتا تھا۔

تلسی : جب تک میں جیتا ہوں تم اسے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ میرے پیچھے جو چاہے کرنا۔ بے چاری کا گھر میں رہنا مشکل کر دیا۔

رامو : آپ کو بیٹی بہت پیاری ہے۔ تو اسے گلے باندھ کر رکھیئے۔ مجھ سے تو نہیں سہا جاتا۔

تلسی : اچھی بات ہے، اگر تمھاری یہ مرضی ہے تو یہی ہوگا میں کل گاؤں کے آدمیوں کو بُلا کر بٹوارا کردوں گا ۔ تم چاہے چھوٹ جاؤ سوبھاگی نہیں چھوٹ سکتی۔ رات کو تلسی لیٹے تو وہ پرانی بات یاد آئی جب رامو کے جنم اتسو میں انھوں نے روپے قرض لے کر جلسہ کیا تھا، اور سوبھاگی پیدا ہوئی تو گھر میں روپے رہتے ہوئے

بھی انھوں نے ایک کوڑی نہ خرچ کی۔ پتر کو رتن سمجھا تھا، پوتری کو پوروجنم کے پاپوں کا دنڈ۔ وہ رتن کتنا کٹھور نکلا اور یہ دنڈ کتنا منگل ہے۔

(۳)

دوسرے دن مہتو نے گاؤں کے آدمیوں کو جمع کر کے کہا۔ پنچوں اب راموں کا اور میرا ایک میں نباہ نہیں ہوتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ انصاف سے جو مجھے دے دو، وہ لے کر الگ ہو جاؤں، رات دن کی کچ کچ اچھی نہیں۔

گاؤں کے مختار بابو سجن سنگھ بڑے سجن پروش تھے۔ انھوں نے راموں کو بلا کر پوچھا۔ کیوں جی، تم اپنے باپ سے الگ رہنا چاہتے ہو؟ تمھیں شرم نہیں آتی کہ عورت کے کہنے سے ماں باپ کو الگ کئے دیتے ہو؟

رام ۔ رام

راموں نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا۔ جب ایک میں گذر نہ ہو تو الگ ہوجانا ہی اچھا ہے۔

سجن سنگھ : تم کو ایک میں کیا کشٹ ہوتا ہے؟

رامو : ایک بات ہو تو بتاؤں۔

سجن : کچھ تو بتلاؤ

رامو : صاحب ایک میں میرا ان کے ساتھ نباہ نہ ہوگا بس میں اور کچھ نہیں جانتا۔

یہ کہتا ہوا رامو وہاں سے چلتا بنا۔

تلسی : دیکھ لیا آپ لوگوں نے اس کا مزاج۔ آپ چاہے چار حصوں میں تین حصے اسے دے دیں پر اب میں اس دُشٹ کے ساتھ نہ رہوں گا۔ بھگوان نے بیٹی کو دکھ دے دیا۔ نہیں مجھے کھیتی باری لے کر کیا کرنا تھا۔ جہاں رہتا وہیں کماتا کھاتا۔ بھگوان ایسا بیٹا ساتویں بیری کو بھی نہ دے۔ لڑکے سے لڑکی بھلی، جو کلونتی ہوے۔

سہسا سوبھاگی آکر بولی: دادا، یہ سب بانٹ بکھرا میرے ہی کارن تو ہو رہا ہے مجھے کیوں نہیں الگ کر دیتے۔ میں محنت مزدوری کرکے اپنا پیٹ پال لوں گی۔ اپنے سے جو کچھ بن پڑے گا تمھاری سیوا کرتی رہوں گی پر رہوں گی الگ۔ یوں گھر

کا بارا بانٹ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ میں اپنے ماتھے پر یہ کلنک نہیں لینا چاہتی۔
تلسی نے کہا۔ بیٹی، تجھے نہ چھوڑیں گے چاہے سنسار چھوٹ جائے۔ رامو کا میں منہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس کے ساتھ رہنا تو دور رہا۔
رامو کی دلہن بولی۔ تم کسی کا منہ نہیں دیکھنا چاہتے تو ہم بھی تمھاری پوجا کرنے کو بیاکل نہیں ہیں۔ مہتو دانت پیستے ہوئے اٹھے کہ بہو کو ماریں، مگر لوگوں نے پکڑ لیا۔

(۴)

بٹوارا ہوتے ہی مہتو اور لکشمی کو مانوں پنشن مل گئی۔ پہلے تو دونوں سارے دن سوبھاگی کے منع کرنے پر بھی کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے تھے، پر اب انھیں پورا وشرام تھا۔ پہلے دونوں دودھ گھی کو ترستے تھے۔ سوبھاگی نے کچھ روپے بچا کر ایک بھینس لے لی۔ بوڑھے آدمیوں کی جان تو بس بھوجن ہے۔ اچھا بھوجن نہ ملے تو وے کس آدھار پر رہیں۔ چودھری نے بہت ورودھ کیا۔ کہنے لگے گھر کا کام یوں ہی کیا کم ہے کہ تو یہ نیا جھنجھٹ پال رہی ہے۔ سوبھاگی انھیں بہلانے کے لیے کہتی۔ دادا دودھ کے بنا مجھے کھانا نہیں اچھا لگتا۔
لکشمی نے ہنس کر کہا۔ بیٹی تو جھوٹ کب سے بولنے لگی۔ کبھی دودھ ہاتھ سے تو چھوتی نہیں، کھانے کی کون کہے۔ سارا دودھ ہم لوگوں کے پیٹ میں ٹھونس دیتی ہے۔ گاؤں میں جہاں دیکھوں سب کے منہ سے سوبھاگی کی تعریف۔ لڑکی نہیں دیوی ہے۔ دو مردوں کا کام بھی کرتی ہے، اس پر ماں باپ کی سیوا بھی کیے جاتی ہے۔ سجن سنگھ تو کہتے یہ اس جنم کی دیوی ہے۔
مگر شاید مہتو کو یہ سکھ بہت دن تک بھوگنا نہ لکھا تھا۔ سات آٹھ سے مہتو کو زور کا جور چڑھا ہوا تھا۔ دیہہ پر کپڑے کا تار بھی نہیں رہنے دیتے۔ لکشمی پاس بیٹھی رو رہی تھی پر جب تک وہ پانی لاوے ان کا جی ڈوب گیا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوگئے۔ سوبھاگی کی یہ دشا دیکھتے ہی راموں کے گھر گئی اور بولی۔ بھیا، چلو دیکھو آج دادا نہ جانے کیسے ہوئے جاتے ہیں۔ سات دن سے جور نہیں اترا۔

راموں نے چارپائی پر لیٹے لیٹے کہا۔ تو کیا میں ڈاکٹر حکیم ہوں کہ دیکھنے چلوں؟ جب تک اچھے تھے تب تک تو تم ان کے گلے کا ہار بنی ہوئی تھی۔ اب جب مرنے لگے تو مجھے بلانے آئی ہو۔ اسی وقت اس کی دلہن اندر سے نکل آئی اور سوبھاگی سے پوچھا۔ داداد کو کیا ہوا ہے دی دی؟

سوبھاگی سے پہلے رامو بول اٹھا ہوا کیاہے ، ابھی کوئی مرے تھوڑے ہی جاتے ہیں۔

سوبھاگی نے پھر اس سے کچھ نہ کہا۔ سیدھے سجن سنگھ کے پاس گئی۔ اس کے جانے کے بعد رامو ہنس کر استری سے بولا۔ تریا چرتر اسی کو کہتے ہیں۔

استری : اس میں تریا چرتر کی کون بات ہے؟ چلے کیوں نہیں جاتے؟

رامو : میں نہیں جانے کا۔ جیسے اسے لے کر الگ ہوئے تھے ویسے اسے لے کر رہیں۔ مر بھی جائیں تو نہ جاؤں۔

استری : (ہنس کر) مرجائیں گے تو آگ دینے تو جاؤگے۔ تب کہاں بھاگوگے؟

رامو : کبھی نہیں؟ سب کچھ ان کی پیاری سوبھاگی کرے گی۔

استری : تمھارے رہتے وہ کیوں کرنے لگی۔

رامو : جیسے میرے رہتے اسے لے کر الگ ہوئے اور کیسے۔

استری : نہیں جی، یہ اچھی بات نہیں ہے۔ چلو دیکھ آویں۔کچھ بھی ہو، باپ ہی تو ہیں۔ پھر گاؤں میں کون منھ دکھاؤگے؟

رامو : چپ رہو، مجھے اپدیش مت دو ادھر بابو صاحب نے جیوں ہی مہتو کی حالت سنی۔ ترنت سوبھاگی کے ساتھ بھاگے چلے آئے۔ یہاں پہنچے تو مہتوں کی دشا اور خراب ہو چکی تھی۔ ناری دیکھی تو بہت دھیمی تھی۔ سمجھ گئے کہ زندگی کے دن پورے ہو گئے۔ موت کا آتنک چھایا ہوا تھا۔ سجل نیتر ہو کر بولے۔ مہتو بھائی کیسا جی ہے؟ مہتو جیسے نیند سے جاگ کر بولے۔ بہت اچھا ہے بھیا۔ اب تو چلنے کی بیلا ہے۔ سوبھاگی کے پتا اب تمھیں ہو۔ اسے تمھیں سونپے جاتا ہوں۔

سجن سنگھ نے روتے ہوئے کہا۔ بھیا مہتو گھبراؤ مت، بھگوان نے چاہا تو تم اچھے ہوجاؤگے۔ سوبھاگی کو تو میں نے ہمیشہ اپنی بیٹی سمجھا ہے اور جب تک جیووں گا

ایسا ہی سمجھتا رہوں گا۔ تم نشچت رہو۔ میرے رہتے سوبھاگی یا لکشمی کو کوئی ترچھی آنکھ سے نہ دیکھ سکے گا۔ اور کچھ اچھا ہو تو وہ بھی کہہ دو۔

مہتو نے ونت نیتروں سے دیکھ کر کہا۔ اور کچھ نہیں کہوں گا بھیا بھگوان تمھیں سدا سکھی رکھے۔

سجن : رامو کو بلا کر لاتا ہوں۔ اس سے جو بھول چوک ہو چھما کردو۔

مہتو : نہیں بھیا۔ اس پاپی ہتیار کا منھ میں نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس کے بعد گودان کی تیاری ہونے لگی۔

(۵)

رامو کو گاؤں بھر نے سمجھایا پر وہ انتیسٹھ کرنے پر راضی نہ ہوا۔ کہا جس پتا نے مرتے سمے میرا منھ دیکھنا سویکار نہ کیا وہ میرا نہ پتا ہے نہ میں اس کا پتر ہوں۔ لکشمی نے داہ کریا کی۔ ان تھوڑے سے دنوں میں سوبھاگی نے نہ جانے کیسے روپے جمع کر لیے تھے کہ جب ترہی کا سامان آنے لگا تو گاؤں والوں کی آنکھ کھل گئی۔ برتن کپڑے، گھی، شکر سبھی سامان افراط سے جمع ہوگئے۔ رامو دیکھ دیکھ جلتا تھا۔ اور سوبھاگی اسے جلانے ہی کے لیے سب کو یہ سامان دکھاتی تھی۔

لکشمی نے کہا۔ بیٹی گھر دیکھ کر خرچ کرو۔ اب کوئی کمانے والا نہیں بیٹھا ہے، آپ ہی کنواں کھودنا اور پانی پینا ہے۔

سوبھاگی بولی بابو جی کا کام تو دھوم دھام سے ہی ہوگا۔ اماں چاہے گھر رہے یا جائے۔ بابو جی پھر تھوڑے ہی آویں گے۔ میں بھیا کو دکھا دینا چاہتی ہوں کہ ابلا کیا کرسکتی ہے۔ وہ سمجھتے ہوں گے ان دونوں کے کیے کچھ نہ ہوگا۔ ان کا یہ گھمنڈ تور دوں گی۔

لکشمی چپ ہو رہی۔ ترہی کے دن آٹھ گاؤں کے برہمنوں کا بھوجن ہوا۔ چاروں طرف واہ واہی مچ گئی۔ پچھلے پہر کا سمے تھا لوگ بھوجن کر کے چلے گئے تھے۔ لکشمی تھک کر سو گئی تھی۔ کیول سوبھاگی بچی ہوئی چیزیں اٹھا اٹھا کر رکھ رہی تھی کہ ٹھاکر سجن سنگھ آکر کہا اب تم بھی آرام کرو بیٹی۔سویرے یہ سب کام کر لینا۔

سوبھاگی نے کہا۔ ابھی تھکی نہیں ہوں دادا۔ آپ نے جوڑ لیا کل کتنے روپے اٹھے؟

سجن : وہ پوچھ کر کیا کروگی بیٹی؟

کچھ نہیں یوں ہی پوچھتی ہوں

کوئی تین سو روپے اٹھے ہوں گے۔

سوبھاگی نے سکوچاتے ہوئے کہا۔ میں ان رپیوں کی دین دار ہوں۔ تم سے تو میں مانگتا نہیں۔ مہتو میرے متر اور بھائی تھے۔ ان کے ساتھ کچھ میرا بھی تو دھرم ہے۔

آپ کی یہی دیا کیا کم ہے کہ میرے اوپر اتنا وشواس کیا۔ مجھے کون تین سو روپے دیتا۔

سجن سنگھ سوچنے لگے۔ اس ابلا کی دھرم بدھی کا کہیں وار پار بھی ہے یا نہیں۔

(۶)

لکشمی ان استریوں میں تھی جن کے لیے پرتی ویوگ جیون سروت کا بند جانا ہے۔ پچاس ورش کے چرسہواس کے بعد اب یہ سکانت جیون اس کے لیے پہاڑ ہوگیا اسے اب گیات ہوا کہ میری بدھی میرا بل میری سمتی مانوں سب سے میں ونچت ہوگئی۔

اس نے کتنی بار ایشور سے ونتی کی تھی۔ مجھے سوامی کے سامنے اٹھا لینا، مگر اس نے یہ ونتی سویکار نہ کی۔ مِرتیو پر اپنا قابو نہیں تو کیا جیون پر بھی قابو نہیں ہے۔ وہ لکشمی جو گاؤں میں اپنی بدھی کے لیے مشہور تھی جو دوسرے کو شکھ دیا کرتی تھی اب بوڑھی ہو گئی ہے۔ سیدھی سے بات کرتے نہیں بنتی۔

لکشمی کا دانہ پانی اسی دن سے چھوٹ گیا۔ سوبھاگی کے آگرہ پر چوکے میں جاتی مگر کور کنٹھ کے نیچے نہ اترتا۔ پچاس ورش ہوئے ایک دن بھی ایسا نہ ہوا کہ پتی کے بنا کھائے خود کھایا ہو۔ اب اس نیم کو کیسے توڑے؟

آخر اسے کھانسی آنے لگی۔ در بلتا نے جلدی ہی کھاٹ پر ڈال دیا۔ سوبھاگی

اب کیا کرے۔ ٹھاکر صاحب کے روپے چکانے کے لیے دل و جان سے کام کرنے کی ضرورت تھی۔ یہاں ماں بیمار پڑ گئی۔ اگر باہر جائے تو ماں اکیلی رہتی ہے۔ ان کے پاس بیٹھے تو باہر کا کام کون کرے۔ ماں کی دشا دیکھ کر سوبھاگی سمجھ گئی کہ ان کا پروانہ بھی آپہنچا۔ مہتو کو بھی تو یہی جور تھا۔

گاؤں میں اور کسے فرصت تھی کہ دوڑ دھوپ کرتا، سجن سنگھ دونوں وقت آتے، لکشمی کو دیکھتے دوا پلاتے سوبھاگی کو سمجھاتے، اور چلے جاتے۔ مگر لکشمی کی دشا بگڑتی جاتی تھی۔ یہاں تک کی پندرہویں دن وہ بھی سنسار سے سدھار گئی۔ انتم سمے رامو آیا اور اس کے پیر چھونا چاہتا تھا۔ پر لکشمی نے اسے ایسی جھڑکی دی کہ وہ اس کے سمیپ نہ جاسکا۔ سوبھاگی کو اس نے آشیرواد دیا۔ تمھاری جیسی بیٹی پاکر تر گئی۔ میرا کریا کرم تمھیں کرنا۔ میری بھگوان سے یہی عرضی ہے کہ اس جنم میں تم میری کوکھ پوتر کرو۔

(۷)

ماتا کے دیہانت کے بعد سوبھاگی کے جیون کا کیول ایک لکشیہ رہ گیا۔ سجن سنگھ کے روپے چکانا۔ ۳۰۰ روپے پتا کے کریا کرم میں لگے تھے لگ بھگ دو سو ماتا کے کام میں لگے۔ ۵۰۰ کا رِن (قرض) تھا اور اس کی اکیلی جان۔ مگر وہ ہمت نہ ہارتی تھی۔ تین سال تک سوبھاگی نے رات کو رات اور دن کو دن نہ سمجھا۔ اس کی کاریہ شکتی اور پرش دیکھ کر لوگ دانتوں انگلی دباتے تھے۔ دن بھر کھیتی باری کا کام کرنے کے بعد وہ رات کو چار چار پسیری آٹا پیس ڈالتی تیسویں دن ۱۵ روپے لے کر وہ سجن سنگھ کے پاس پہنچ جاتی۔ اس میں کبھی ناغا نہ پڑتا۔ یہ مانو پرکرتی کا اٹل نیم تھا۔

اب چاروں اور سے اس کی سگائی کے پیغام آنے لگے۔ سبھی اس کے لیے منھ پھلائے ہوئے تھے۔ جس کے گھر سوبھاگی جائے گی اس کے بھاگیہ پھر جائیں گے۔ سوبھاگی یہی جواب دیتی۔ ابھی وہ دن نہیں آیا۔

جس دن سوبھاگی آخری کست چکائی، اس دن اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔

آج اس کے جیون کا کٹھور ورت پورا ہوگیا۔ وہ چلنے لگی تو سجن سنگھ نے کہا۔ بیٹی تم سے میری ایک پرارتھنا ہے۔ کہو کہوں۔ کہو نہ کہوں، مگر وچن دو کہ مانوگی۔

سوبھاگی نے کرتگیا بھاؤ سے دیکھ کر کہا۔ دادا آپ کی بات نہ مانوں گی تو کس کی بات مانوں گی۔ میرا تو رویاں رویاں آپ کا غلام ہے۔

سجن سنگھ : اگر تمھارے من میں یہ بھاؤ ہے تو میں نہ کہوں گا۔ میں نے اب تک تم سے اس لیے نہیں کہا کہ تم اپنے کو میرا دیندار سمجھ رہی تھی۔ اب روپے چک گئے۔ میرا تمھارے اوپر کوئی احسان نہیں ہے، رتی بھر بھی نہیں۔ بولو کہوں؟

سوبھاگی : آپ کی جو آگیا ہو۔

سجن سنگھ : دیکھوں انکار نہ کرنا، نہیں میں پھر تمھیں اپنا منھ نہ دکھاؤں گا۔

سوبھاگی : کیا آگیا ہے؟

سجن سنگھ : میری اچھا ہے کہ تم میری بہو بن کر میرے گھر کو پوتر کرو۔ میں جات پات کا کائل ہوں۔ مگر تم نے میرے سارے بندھن تور دیے۔ میرا لڑکا تمھارے نام کا پجاری ہے۔ تم نے اسے بارہا دیکھا ہے۔ بولو، منظور کرتی ہو؟

سوبھاگی : دادا، اتنا سمان پا کر پاگل ہو جاؤں گی۔

سجن سنگھ : تمھارا سمان بھگوان کر رہے ہیں بیٹی۔ تم ساکشات بھگوتی کا اوتار ہو۔

سوبھاگی : میں تو آپ کو اپنا پتا سمجھتی ہوں۔ آپ جو کچھ کریں گے، میرے بھلے ہی کے لیے کریں گے۔ آپ کے حکم کو کیسے انکار کر سکتی ہوں۔

سجن سنگھ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ بیٹی، تمھارا سہاگ امر ہو۔ تم نے میری بات رکھ لی۔ مجھ سا بھاگیہ شالی سنسار میں اور کون ہوگا؟

نوٹ: یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں مادھوری مارچ 1930 میں شائع ہوا۔ مان سروور نمبر 1 میں شامل ہے۔ اردو میں ابھی تک شائع نہیں ہوا۔

بیوی سے شوہر

(۱)

مسٹر سیٹھ کو ہر ایک ہندوستانی چیز سے نفرت تھی۔ اور ان کی قبول صورت بیوی گوداوری کو ہر ایک ولایتی چیز سے گریز۔ مگر ضبط اور حلم ہندوستانی دیویوں کا خاصہ ہے۔ گوداوری دل پر ہزار جبر کرکے ہر ایک بدیسی چیز کا استعمال کرتی۔ حالانکہ اندر ہی اندر اس کا دل اپنی بے کسی پر روتا رہتا۔ وہ جس وقت اپنے چھجے پر کھڑی ہو کر سڑک پر نگاہ دوڑاتی اور کتنی ہی مستورات کو کھدر کی ساڑیاں پہنے دیکھتی تو اس کے دل سے ایک ٹھنڈی آہ نکل آتی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا مجھ سے زیادہ بدنصیب عورت دنیا میں نہیں ہے۔ میں اپنے اہل وطن کی اتنی خدمت بھی نہیں کر سکتی! شام کو مسٹر سیٹھ کے بضد ہونے پر بھی وہ کہیں سیرو تفریح کے لیے نہ جاتی۔ اسے ولایتی کپڑے پہن کر نکلتے ہوئے شرم دامن گیر ہوتی تھی۔

ہولی کا دن تھا۔ آٹھ بجے رات کا وقت۔ فدائیان حریت کا جلوس آ کر مسٹر سیٹھ کے مکان کے سامنے رکا۔ اور اسی چوڑے میدان میں ولائتی کپڑوں کی ہولی لگانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ گوداوری اپنے کمرہ میں کھڑکی پر کھڑی یہ نظارہ دیکھتی تھی اور دل مسوس کر رہ جاتی تھیں۔ ایک وہ ہیں جو یوں خوش نشہ آزادی سے مخمور، غرور سے سر اٹھائے ہولی لگا رہے ہیں اور ایک میں ہوں قفس میں بند طائر کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی ان تیلیوں کو کیسے توڑ دوں؟ اس نے کمرہ میں نگاہ ڈالی۔ ہر

ایک چیز ولایتی تھی۔ یہی چیزیں وہاں جلائی جا رہی تھیں اور وہی چیزیں یہاں ذلت کے احساس کی طرح صندوق میں مقفل رکھی ہوئی تھیں۔ وہ چاہتی تھی ان چیزوں کو اٹھا کر اسی ہولی میں ڈال دے۔ اس کی ذلت اور بیکسی ایک شعلہ میں فنا ہوجائے۔ مسٹر سیٹھ ابھی تک کلب سے نہ لوٹے تھے۔ گوداروی کے جی میں آیا اپنی ساڑیاں اٹھا کر ہولی میں ڈال آؤں۔ مگر پھر شوہر کی ناراضگی کا خیال آ گیا۔ رک گئی۔

یکا یک مسٹر سیٹھ نے اندر آ کر کہا۔ ذرا ان احمقوں کو دیکھو۔ کپڑے جلا رہے ہیں۔ یہ دیوانگی اور جنون اور حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ کسی نے سچ کہا ہے۔ ہندوستانیوں کو کبھی نہ عقل آئی ہے نہ آوے گی۔ کوئی کل بھی تو سیدھی نہیں۔

گوداوری نے کہا۔ تم بھی تو ہندوستانی ہو۔!

سیٹھ نے گرم ہو کر کہا۔ ہاں لیکن مجھے اس کا ہمیشہ افسوس رہتا ہے۔ ایسے ذلیل ملک میں کیوں پیدا ہوا؟ میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے ہندوستانی کہے یا سمجھے۔ کم سے کم میں نے اپنی بود و باش، طور طریق، قول و فعل میں کوئی ایسی بات نہیں رکھی جس سے کوئی مجھے ہندوستانی سمجھے۔ سوچیے! جب ہمیں آٹھ آنے گز میں نہایت خوبصورت کپڑا ملتا ہے تو ہم کیوں موٹا ٹاٹ خریدیں۔ اس معاملہ میں کامل آزادی ہونی چاہیے۔ معلوم نہیں گورنمنٹ نے کیوں ان احمقوں کو یہاں جمع ہونے دیا؟ اگر میں برسر اختیار ہوتا تو سبھوں کو واصل جہنم کر دیتا۔ تب معلوم ہوتا۔

گوداوری : تمھیں ذرا بھی اپنے غریب بھائیوں کا خیال نہیں آتا؟

سیٹھ: میں انھیں اپنا بھائی نہیں سمجھتا۔

گوداوری : آخر تمھیں سرکار جو تنخواہ دیتی ہے وہ انھیں آدمیوں کی جیب سے تو آتی ہے۔

سیٹھ : مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ میری تنخواہ کس کی جیب سے آتی ہے۔ مجھے جس کے ہاتھ سے ملتی ہے وہ میرا آقا اور مالک ہے۔ نہ جانے ان احمقوں کو یہ کیا سنک سوار ہو گئی ہے۔ کہتے ہیں روحانیت ہندوستانیوں کی خاص صفت ہے۔ یہ روحانیت ہے کہ پرماتما کی مرضی کی مخالفت کی جائے؟ جب یہ معلوم ہے کہ پرماتما کی مرضی کے بغیر ایک پتی بھی نہیں ہل سکتی تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اتنا بڑا ملک

بغیر پرماتما کی مرضی کے انگریزوں کے زیر اقتدار ہو ؟ کیوں ان دیوانوں کو اتنی عقل نہیں آتی کہ پر ماتما کی جب تک مرضی نہ ہوگی۔ کوئی انگریزوں کا بال بھی بیکا نہ کر سکے گا؟

گوداوری : لیکن پرماتما ان کی مدد بھی تو کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔

سیٹھ : بے شک کرتا ہے۔ لیکن اس طرح نہیں جیسے یہ لوگ کر رہے ہیں۔ اپنے گھر میں آگ لگا دینا۔ گھر کی چیزوں کو جلا دینا ایسے کام ہیں جس میں پرماتما کبھی مدد نہیں کرسکتا۔

یکایک ہولی جلی۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ گویا قومی آزادی آتشیں لباس میں ملبوس آکاش کے دیوتاؤں سے گلے ملنے جا رہی ہو۔ دینا ناتھ نے کھڑکی بند کر دی۔ وہ یہ نظارہ دیکھنا ہی نہ چاہتے تھے۔

گوداوری صورت تصویر خاموش کھڑی رہی۔

(۲)

دوسرے دن علی الصباح کانگریس کی طرف سے ایک عام جلسہ ہوا۔ مسٹر سیٹھ نے ولایتی ٹوتھ پاؤڈر ولائتی برش سے دانتوں میں ملا۔ ولائتی صابون سے نہایا۔ ولایتی چائے ولایتی چائے کے سیٹ میں پیا۔ولایتی بسکٹ، ولایتی مکھن کے ساتھ کھایا۔ ولایتی دودھ پیا۔ پھر ولایتی سوٹ زیب تن کر کے ولایتی سگار ہونٹوں میں دبا کر گھر سے نکلے۔ سڑک پر ولایتی موٹر کھڑی تھی۔ اس میں بیٹھ کر فلاور شو دیکھنے چلے گئے۔

گوداوری کو رات بھر نیند نہ آئی تھی۔ مسٹر سیٹھ کی تالیف قلب کرنے کے لیے اس نے وہ سب کچھ کیا جو ایک حسینہ کر سکتی ہے۔ پر اس مرد خدا پر اس کی ساری سحرطرازیوں اور عشوہ پردازیوں کا مطلق اثر نہ ہوا۔ خود تو سدیشی کپڑوں کے استعمال پر کیا راضی ہوتے۔ گوداوری کے لیے ایک کھدر کی ساڑی کی تجویز بھی منظور نہ کی۔ یہاں تک کہ گوداوری نے قسم کھا لی کہ اب تم سے کبھی کوئی چیز نہ مانگوں گی۔

اس نے سوچا جب یہ میری اتنی سی تمنا نہیں پوری کر سکتے۔ تو پھر میں کیوں

ان کے اشاروں پر چلوں؟ کیوں ان کی ہاں میں ہاں ملاؤں؟ میں نے ان کے ہاتھ کچھ اپنی آتما نہیں بیچی ہے۔ اگر آج یہ چوری یا غبن کریں تو کیا میں اس میں ان کی شریک ہوں گی۔ اس کی سزا یہ خود جھیلیں گے۔ اس کی ذمہ داری کلیتہً ان کے اوپر ہوگی۔ میری ہستی ان کی ہستی میں کیوں مدغم ہو؟ انھیں اپنے قول وفعل کا اختیار ہے۔ مجھے اپنے قول وفعل کا اختیار۔ یہ اپنے سرکار کی غلامی کریں۔ انگریزوں کے چوکھٹ پر ناک رگڑیں۔ مجھے کیا غرض ہے کہ ان کی شریک بنوں جو خود غلام ہے اس کی غلامی کیوں کروں؟ ملازمت اور غلامی میں فرق ہے۔ ملازم چند قواعد کا پابند ہو کر ملازمت کرتا ہے۔ وہ شرطیں حاکم و محکوم دونوں پر عائد ہوتی ہیں۔ غلام کے لیے کوئی شرط نہیں اس کی جسمانی غلامی پیچھے ہو گی۔ روحانی غلامی پہلے ہے۔ سرکار نے کبھی شاید یہ نہ کہا ہوگا کہ دیسی چیزیں نہ خریدو۔ سرکاری ٹکٹوں تک پر یہ عبارت لکھی ہو تی ہے۔''سدیشی چیزیں خریدو'' اس سے ظاہر ہے کہ سرکار سدیشی چیزوں کی ممانعت نہیں کرتی۔ پھر بھی یہ حضرت سرخرو بننے کی فکر میں سرکار سے بھی دو انگلی آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ انگریزوں سے بھی زیادہ انگریز بنے ہوئے ہیں۔ وفا کی قبر پر لات مار رہے ہیں۔ میں کیوں ان کے پیچھے اپنی عاقبت بگاڑوں؟

ذرا دیر بعد سیٹھ نے کہا۔'' کل فلاور شو دیکھنے چلوگی؟

گوداوری نے کہا : نہیں ! میں کانگریس کے جلسہ میں جاؤں گی۔

سیٹھ کے سر پر اگر چھت گر پڑی ہوتی یا انھوں نے بجلی کا تار ہاتھ سے پکڑ لیا ہوتا تو بھی وہ اس قدر بدحواس اور مضطرب نہ ہوتے آنکھیں پھاڑ کر بولے ''تم کانگریس کے جلسہ میں جاؤ گی۔''

ہاں! ضرور جاؤں گی۔

میں نہیں چاہتا کہ تم وہاں جاؤ۔

اگر تم میری پرواہ نہیں کر تے تو میرا فرض نہیں کہ تمھارے ہر ایک حکم کی تعمیل کروں۔''

نتیجہ برا ہو گا۔

جو کچھ ہو۔ اس کا غم نہیں ہے۔ تم میرے خدا نہیں ہو۔

سیٹھ جی خوب گرم ہوئے۔ دھمکیاں دیں۔ آنکھیں دکھائیں۔ آخر منہ پھیر کر لیٹ رہے۔ جاتے وقت بھی انھوں نے گوداوری سے کچھ نہ کہا۔

(۳)

گوداوری جس وقت کانگریس کے جلسہ میں پہونچی۔ کئی ہزار مردوں اور عورتوں کا مجمع تھا۔ سکریٹری نے چندہ کی پر زور اپیل کی تھی۔ اور کچھ لوگ چندے دے رہے تھے۔ گوداوری اس مقام پر کھڑی ہوگئی۔ جہاں عورتیں جمع تھیں۔ اس نے جیب ٹٹولی تو ایک روپیہ موجود تھا۔ سمجھا کافی ہے اور لوگ دو دو، چار چار آنے ہی دے رہے ہیں۔

یکا یک ایک اندھا لڑکا ہاتھ میں خنجری لیے کھڑا ہو گیا۔ اسے گوداوری روز اپنے گھر کے سامنے زمین پر بیٹھ کر خنجری بجا بجا کر گاتے سنا کرتی تھی۔ کبھی کبھی ایک آدھ پیسہ کبھی روٹیاں دے دیتی تھی۔ لوگ اس کی طرف تاکنے لگے۔ کیا وہ بھی کچھ چندہ دینا چاہتا ہے۔ خوب! دن بھر گلا پھاڑتا ہے تب تو پیٹ کی روٹی ملتی ہے۔ وہ چندہ دینے آئے گا۔ اور پھر ایسے سڑک پر گانے والوں کو دیتا بھی کون ہے؟ اگر وہی گانا پشواز اور ساز کے ساتھ کسی محفل میں ہو تو روپیوں کی بارش ہو جائے۔ لیکن سڑک والے اندھے کی خنجری کی کون پرواہ کرتا ہے؟

لڑکے نے کمر سے کچھ نکالا۔ اور جوں ہی چندہ کی جھولی اس کے قریب پہنچی اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ جھولی والی نے جھولی بڑھا دی۔ اندھے نے اس میں کچھ ڈال دیا۔ لوگوں نے دیکھا ایک پیسہ تھا۔ جھولی میں پیسہ ڈالتے ہی اندھا لڑکا وہاں سے چل دیا۔ اور دور جا کر پھر گانے لگا۔

''وطن کی دیکھئے تقدیر کب بدلتی ہے''؟

جلسہ کے پریزیڈنٹ نے کہا: دوستو! دیکھئے یہ وہ پیسہ ہے جو غریب اندھا لڑکا اس جھولی میں ڈال گیا ہے۔ میری نگاہوں میں اس ایک پیسہ کی قیمت کسی امیر کے ایک ہزار روپیہ سے کم نہیں ہے۔ شاید یہی اس غریب کی ساری بساط ہو گی۔ جب ایسے غریبوں کی ہمدردی اور قربانی ہمارے ساتھ ہے تو مجھے حق کی فتح یقینی نظر آتی

ہے۔ ہمارے یہاں کیوں اتنے فقیر نظر آتے ہیں۔ اس لیے کہ یا تو سوسائٹی میں انھیں کوئی مقام نہیں ملتا۔ یا افلاس سے پیدا ہوئی بیماریوں کے باعث یہ اب اس قابل ہی نہیں رہے کہ کوئی کام کرسکیں۔ یا اس گداگری نے ان میں کوئی محنت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں باقی رکھی۔ سوراجیہ کے سوا ان حالات کی اور کوئی دوا نہیں ہے۔ یہ غریب اندھا جس کی تان اب بھی آپ کے کان میں آرہی ہے اس حقیقت کو خوب سمجھتا ہے۔ دیکھئے وہ گاتا ہے۔

''وطن کی دیکھیے تقدیر کب بدلتی ہے''؟

آہا! اس غریب دکھ سے بھرے دل میں کتنا ایثار ہے؟ اب بھی کیا کوئی شک کر سکتاہے کہ ہم کس کی آواز ہیں؟ یہ تامب پتراس کی تصدیق کر رہا ہے۔ آپ میں کون اس تبرک کو، اس رتن کو خریدنا چاہتا ہے؟ کون اس دُرّ بے بہا کی قیمت ادا کر سکتا ہے؟

گوداوری کے دل میں ایک اضطراب خیز خواہش ہوئی۔ کیا وہ یہی پیسہ تو نہیں ہے جو رات میں نے اسے دیا تھا؟ کیا اس نے سچ مچ رات کو کچھ نہیں کھایا؟

اس نے جا کر قریب سے پیسے کو دیکھا جو میز پر رکھا ہوا تھا۔ اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ یہ وہی گھسا ہوا پیسہ تھا۔

گوداوری نے کانپتے ہوئے گلے سے کہا مجھے آپ یہ پیسہ دے دیجیے۔ میں پانچ روپیہ دوں گی۔

پریسیڈنٹ نے کہا۔ ایک بہن اس پیسہ کی قیمت پانچ روپیہ دے رہی ہیں۔

دوسری آواز آئی: دس روپئے۔

تیسری آواز آئی: بیس روپئے۔

گوداوری نے آخری شخص کی طرف دیکھا۔ کوئی خوش حال مغرور آدمی تھا۔ سب کی نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ گوداوری کے دل میں ایک ہیجان سا اٹھا کچھ بھی ہو اس شخص کے ہاتھ میں یہ پیسہ نہ جانے دوں گی۔ سمجھتا ہے۔ اس نے بیس روپیہ کیا کہہ دیا یا کوئی قلعہ جیت لیا۔

گوداوری نے کہا: چالیس روپئے۔

امیر آدمی نے فوراً کہا: پچاس روپئے۔

گوداوری کی طرف ہزاروں نگاہیں اٹھ گئیں۔ گویا کہہ رہی ہوں۔ بس یہ امیر اس پیسہ کو لیے جاتا ہے۔

گوداوری نے اس آدمی کی طرف مغرور نظروں سے دیکھ کر کہا: سو روپئے۔

امیر آدمی نے بھی فوراً کہا: ایک سو بیس روپئے۔

چاروں طرف سے تالیاں پڑیں۔ لوگ سمجھ گئے امیر آدمی پیسہ لے گیا۔ گوداوری اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ لوگوں نے مایوس نظروں سے گوداوری کو دیکھا۔ مگر جوں ہی گوداوری کے منہ سے نکلا۔ ڈیڑھ سو! تو لوگوں نے امیر آدمی کو پھر فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ گویا کہہ رہے تھے۔ تم اس پیسہ کو نہیں لے جاسکتے۔ امیر آدمی نے پھر کہا پونے دو سو!

گوداوری بولی دو سو!

چاروں طرف سے تالیاں پڑیں۔ امیر آدمی شرمندہ ہو کر چلا گیا۔

گوداوری فتح کی مسرت کو انکسار سے دباتی ہوئی کھڑی تھی۔ اور ہزاروں دعائیں پھولوں کی طرح اس پر برس رہی تھیں

(۴)

جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ گوداوری مسٹر سیٹھ کی بیوی ہے تو انھیں ایک حاسدانہ مسرت کے ساتھ اس پر رحم بھی آیا۔ سیٹھ ایک ہی خوشامدی ہے۔ گوداوری کو زندہ نہ چھوڑے گا۔

~~مسٹر سیٹھ~~ بھی فلاور شو ہی میں تھے۔ کہ ایک پولیس کے افسر نے یہ وحشتناک خبر سنائی۔ مسٹر سیٹھ سکتے میں آکر کھڑے ہوگئے۔ گویا مفلوج ہو گئے ہوں۔ پھر دونوں مٹھیاں باندھ لیں۔ دانت پیسا۔ ہونٹ چبایا اور اسی وقت گھر چلے۔ موٹر سائیکل اتنی تیز کبھی نہ چلی تھی۔

گھر میں گھستے ہوئے کڑک کر بولے۔ میرے منہ میں کالکھ لگوانا چاہتی ہو تم؟ میری قبر کھودنا چاہتی ہو تم؟

گوداوری تحمل کے ساتھ بولی۔ کچھ منہ سے بھی تو کہو یا گالیاں ہی دیے جاؤگے۔ تمھارے منہ میں کالکھ لگے گی۔ تو کیا میرے منہ میں نہ لگے گی۔ تمھاری قبر کھدے گی تو میرے لیے دوسرا کون سا سہارا ہے؟

سیٹھ : سارے شہر میں طوفان مچا ہوا ہے۔ تم نے میرے روپے کیوں دیے؟

گوداوری نے اسی صابرانہ انداز سے کہا: اس لیے کہ میں اسے اپنا ہی روپیہ سمجھتی ہوں۔

سیٹھ جی دانت کٹ کٹا کر بولے: ہر گز نہیں۔ کسی طرح نہیں،تمھیں میرے روپیہ کو خرچ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کوئی اختیار نہیں ہے۔

گوداوری : بالکل غلط۔ تمھار ے روپیہ کو خرچ کرنے کا مجھے اتنا ہی اختیار ہے جتنا تم کو ہے۔ ہاں جب طلاق کا قانون پاس کرا لوگے اور طلاق دے دوگے تب نہ رہے گا۔

سیٹھ جی نے اپنا ہیٹ اتنے زور سے میز پر پھینکا کہ وہ لڑھکتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ اور بولے مجھے تمھاری عقل پر افسوس آتا ہے۔ جانتی ہو تمھاری اس حماقت کا کیا نتیجہ ہوگا؟ مجھ سے جواب طلب ہوگا۔ بتلاؤ کیا جواب دوں گا؟ ہے کوئی جواب؟ جب ظاہر ہے کہ کانگریس سرکار سے دشمنی کر رہی ہے۔ تو کانگریس کی مدد کرنا سرکار کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔

''تم نے تو نہیں کی کانگرس کی مدد''؟

''تم نے تو کی''

''اگر میں کوئی جرم کروں تو اس کی سزا مجھے ملے گی یا تمھیں''؟

جرم کی بات اور ہے۔ یہ بات اور ہے۔

تو کیا کانگریس کی کچھ مدد کر نا، چوری یا ڈاکے سے بھی بُرا ہے؟

''ہاں گورنمنٹ ملازم کے لیے چوری یا ڈاکے سے بھی کہیں زیادہ برا ہے۔''

میں نے یہ نہیں سمجھا تھا۔

اگر تم نے نہیں سمجھا تھا تو تمھاری غلطی تھی۔ حماقت تھی۔ جہالت تھی۔ روز اخباروں میں دیکھتی ہو پھر بھی پوچھتی ہو۔ ایک کانگریس کا آدمی پلیٹ فارم پر بولنے

کھڑا ہوتا ہے۔ تو غیر وردی والے بیسیوں خفیہ پولیس کے افسر اس کی رپورٹ کی نقل کرنے بیٹھتے ہیں۔ کانگریس کے سرغناؤں کے پیچھے کئی کئی مخبر لگائے جاتے ہیں۔ جن کا کام یہی ہے کہ ان کے اوپر کڑی نگاہ رکھیں۔ چوروں کے ساتھ تو اتنی سختی کبھی نہیں کی جاتی۔ ہزاروں چوریاں اور ڈاکے اور خون روز ہوتے ہیں۔ کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ نہ پولیس اس کی پرواہ کرتی ہے۔ مگر پولیس کو جس معاملہ میں پالیٹکس کی بو آتی ہے اس میں دیکھو اس کی مستعدی انسپکٹر جنرل سے لے کر کانسٹبل تک ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ چوروں سے سرکار کو خوف نہیں۔ چور سرکار پر حملہ نہیں کرتا۔ کانگریس سرکار کے اختیار پر حملہ کرتی ہے۔ اس لیے سرکار بھی اپنی حفاظت کے لیے انتہائی تدابیر اختیار کرتی ہے۔ یہ تو قدرت کا قانون ہے۔

مسٹر سیٹھ آج دفتر چلے تو ان کے قدم پیچھے رہ جاتے تھے۔ وہاں آج نہ جانے کیا حشر ہو۔ روز کی طرح وہ دفتر میں پہنچتے ہی چپراسیوں پر بگڑے نہیں۔ کلرکوں پر رعب نہیں جمایا۔ چپکے سے وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ان کے سر پر تلوار لٹک رہی ہے۔ جوں ہی صاحب کی موٹر آکر رکی۔ روح فنا ہوگئی۔ روز وہ اپنے کمرہ میں بیٹھے رہتے تھے۔ جب صاحب آکر بیٹھ جاتے تھے تب آدھ گھنٹہ کے بعد وہ مسلیں لے کر پہنچتے تھے۔ وہ برآمدہ میں سلام کرنے کو کھڑے تھے۔ صاحب اترے تو انھوں نے جھک کر سلام کیا مگر صاحب نے منہ پھیر لیا۔ مسٹر سیٹھ کی جان نکل گئی۔

لیکن پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارے۔ آگے بڑھ کر پردہ ہٹا دیا۔ جوں ہی صاحب نے کمرہ میں قدم رکھا آپ نے پنکھا کھول دیا۔ مگر جان سوکھی جاتی تھی کہ دیکھیں کب سر پر تلوار گرتی ہے؟ صاحب کو خبر تو مل ہی گئی ہو گی۔ یہ تو غیر ممکن ہے کہ اب تک انھیں خبر ہی نہ ہو۔ صاحب جوں ہی کرسی پر بیٹھے سیٹھ جی نے لپک کر سگار بکس اور دیا سلائی اور خاکدان لاکر میز پر رکھ دیا۔ یکایک انھیں ایسا معلوم ہوا گویا آسمان پھٹ گیا ہے۔ صاحب گرج رہے تھے۔ تم دغا باز آدمی ہے۔

مسٹر سیٹھ نے اس طرح صاحب کی طرف دیکھا گویا ان کا مطلب نہیں سمجھے۔

صاحب نے گھور کر کہا۔ تم دغاباز آدمی ہے۔

مسٹر سیٹھ کے خون میں حرارت آئی۔ میرا تو خیال ہے کہ مجھ سے زیادہ وفادار ہندوستان میں نہ ہو گا۔

صاحب : تم نمک حرام آدمی ہے۔

مسٹر سیٹھ کے چہرہ پر سرخی آئی۔آپ زبان مبارک کو ناحق خراب کررہے ہیں۔

صاحب : تم شیطان آدمی ہے۔

مسٹر سیٹھ کی آنکھوں میں سرخی آئی۔ آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ میں نے اپنی پندرہ سال کی ملازمت میں کبھی ایسی باتیں نہیں سنیں۔

صاحب۔ چپ رہو۔ یو بلاڈی۔ تم کو سرکار پانچ سو روپیہ تنخواہ اسی لیے دیتا ہے کہ تم اپنی بلاڈی وائف کے ہاتھ سے کانگریس کا چندہ دلوائے تم کو اس لیے سرکار روپیہ نہیں دیتا۔ تم کو اس لیے نوکر نہیں رکھا ہے کہ تم سرکار کے دشمنوں سے مل کر سرکار کا گلا کاٹے۔

مسٹر سیٹھ کو اپنی صفائی دینے کا موقعہ ملا جس کے وہ تلاش میں تھے۔ بولے۔ میں حلف سے کہتا ہوں کہ میری وائف نے میرے حکم کے خلاف سراسر میری مرضی کے خلاف روپے دیے ہیں۔ میں تو اس وقت فلاور شو دیکھنے گیا تھا۔ جہاں میں نے مس کاک کا گلدستہ پانچ روپیہ میں لیا۔ وہاں سے لوٹا تو مجھے یہ خبر ملی۔

صاحب : تم ہم کو بیوقوف بناتا ہے۔ ہم کو بیوقوف بناتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے صاحب جامہ سے باہر ہوگیے۔ کسی ہندوستانی کی اتنی مجال کہ انھیں بے وقوف بنائے۔ وہ جو ہندوستان کا بادشاہ ہے۔ جس کے سامنے بڑے بڑے تعلقہ دار آکر سلام کرتے ہیں۔ بڑے بڑے رئیس ڈالیاں لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ جس کے نوکروں کو بڑے بڑے ہندوستانی افسر نذرانے دیتے ہیں۔ اس کو کوئی بیوقوف بنائے۔ یہ وہ کیوں کر برداشت کر سکتا تھا۔ اس کا غصہ جو ابال کے درجہ تک پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اس مکارانہ گستاخی پر مشتعل ہو پڑا۔ رول اٹھا کر دوڑا۔

لیکن سیٹھ جی مضبوط آدمی تھے۔ ٹینس برابر کھیلتے تھے۔ یوں وہ ہر طرح کی خوشامد کرنے پر تیار تھے۔ لیکن یہ ذلت ان کی قوت برداشت سے باہر تھی۔ انھوں نے رول کو تو ہاتھ پر لیا اور آگے بڑھ کر ایک گھونسا صاحب کے منہ پر رسید کیا۔

صاحب اس گھونسے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہندوستانی تو متحمل مزاج ہوتا ہے۔ خاص کر صاحب بہادروں کے سامنے تو اس کی زبان بھی نہیں کھلتی۔ گھونسا کھاتے ہی وہ گر پڑا۔ ناک سے خون گرنے لگا۔ پھر مسٹر سیٹھ سے الجھنے کی اس کی ہمت نہ پڑی۔ شاید دل میں افسوس کر رہا تھا۔ کہ کیوں رول چلایا؟ یا سوچ رہا ہو۔ کہ اسے کیوں کر نیچا دکھاؤں؟ مسٹر سیٹھ وہاں سے اپنے کمرہ میں آئے اور سوچنے لگے۔ انھیں مطلق ندامت نہ تھی۔ بلکہ وہ اپنی جسارت پر خوش تھے۔ اس کی بدمعاشی تو دیکھو کہ مجھ پر رول چلادیا۔ جتنا دیتا تھا اتنا ہی دبائے جاتا تھا۔ اس کی بیوی یاروں کو لیے گھوما کرتی ہے تو اس کا کیا بنا لیتا ہے۔ اس کی بات بھی نہیں پوچھتی۔ منہ چھپاتا پھرتا ہے۔ اور مجھ سے شیر بن گئے۔ اب دوڑے گا۔ کمشنر صاحب کے پاس۔ مجھے برخاست کرائے بغیر نہ چھوڑے گا۔ ساری شرارت گوداوری کی ہے۔ اس کی بدولت یہ ساری بربادی ہورہی ہے۔ بے عزتی تو ہو ہی گئی۔ اب روٹیوں کو بھی محتاج ہونا پڑے گا۔ ان صاحبوں سے انصاف کی امید رکھنا فضول ہے۔ مجھ سے پوچھتا ہی کون ہے ؟ ایک پروانہ آ گیا تم برخاست کردیے گئے۔ اپیل کہاں ہوگی؟سکریٹری ہیں تو ہندوستانی مگر انگریزوں کے غلام۔ زر خرید۔ گوداوری کے چندہ کا نام سنتے ہی انھیں لرزہ آجائے گا۔ انصاف کی کسی سے توقع نہیں۔ اب یہاں سے نکل جانے ہی میں خیریت ہے۔

یہ سوچ کر انھوں نے ایک استعفے لکھا اور اردلی کو دیا کہ صاحب کو دے آئے۔ صاحب نے استعفے دیکھا تو جل گئے۔ اسی پر لکھ دیا برخاست!

(۵)

مسٹر سیٹھ خونبار آنکھوں سے دیکھ کر بولے۔ اب روؤ سر پر ہاتھ دھر کے۔

گوداوری نے بیباکی سے کہا۔'' میں کیوں روؤں۔ تم روؤ۔ یہاں تو سوت کاتوں گی۔ اسی سے کپڑے بھی ملیں گے۔ کھانا بھی۔ تم روؤ کہ تمھارا کام نہ چلے گا۔ یہی اس غلامی کی سزا ہے جو تم نے پال رکھی تھی۔

سیٹھ نے ہونٹ چبا کر کہا۔''شرمندہ تو نہ ہوگی۔ اور اوپر سے دھاندلی کرتی ہو۔

گوداوری اسی شان استغنا سے بولی۔ شرمندہ کیوں ہوں؟ یہاں اپنا ضمیر اپنی ضرورتوں کے ہاتھ نہیں بیچا ہے۔ تمھاری آمدنی ولایتی تکلفات کے پیچھے ہی تو غارت ہوتی تھی۔ گویا ہم انھیں چیزوں کے غلام تھے۔ پرماتما کا شکر کیوں نہیں کرتے کہ تم اس غلامی سے آزاد ہو گئے۔؟

سیٹھ : آخر کچھ سوچاہے کام کیسے چلے گا۔ ولائتی چیزیں چھوڑ بھی دوں تب بھی تو بلا روپئے کے کام نہ چلے گا۔

گوداوری : چلے گا۔ میں چلا کر دکھادوں گی۔ میں جو کچھ کہوں وہ تم کیے جانا۔ اب تک میں تمھاری ہدایتوں پر چلتی تھی اب تم میری ہدایتوں پر چلنا۔ میں تمھاری ساری باتیں بے عذر قبول کرتی تھی۔ تم ولائتی پہنا تے تھے۔ پہنتی تھی۔ ننگی رکھتے ننگی رہتی۔ موٹا کھلاتے موٹا کھاتی۔ مہین کھلاتے مہین کھاتی۔ محل میں رکھتے محل میں رہتی۔ جھونپڑے میں رکھتے جھونپڑے میں رہتی مگر حرف شکایت زبان پر نہ لاتی۔اسی طرح آپ بے چوں وچرا میری ہدایتوں پر عمل کرنا۔ جس حالت میں رکھوں اس حالت میں رہنا۔ جو کام کرنے کو کہوں وہ کام کرنا۔ پھر دیکھوں کیسے کام نہیں چلتا۔ ہاں میں تمھاری روحانی آزادی نہ چھینوں گی۔ کوئی ایسا کام کرنے کو نہ کہوں گی جس میں تمھارے ضمیر کا خون ہو۔

آج تک تم میرے شوہر تھے۔ آج سے میں تمھاری شوہر ہوں۔

گوداوری ہاں ہاں کرتی رہی کہ سیٹھ نے ولائتی سٹ کو اٹھا کر زمین پر پٹک دیا۔ او ذرا دیر میں اس گھر میں ولایتی کپڑوں کی ہولی جلی۔ جس کی پیدائش سے جلنے تک کے سارے مرحلے خو د سیٹھ جی کے ہاتھوں طے ہوئے تھے۔

یہ افسانہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری کے اپریل 1930 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا پتنی سے پتی۔ مانسروور نمبر 7 میں شامل ہے۔ اردو میں پریم چالیسی میں شامل ہے۔

بند دروازہ

آفتاب افق کی گود سے نکلا۔ بچہ پالنے سے وہی ملاحت،وہی سرخی،وہی خمار، وہی ضیا۔

میں برآمدہ میں بیٹھا تھا۔ بچے نے دروازہ سے جھانکا۔ میں نے مسکرا کر پکارا وہ میری گود میں آکر بیٹھ گیا۔

اس کی شرارتیں شروع ہو گئیں۔ کبھی قلم پر ہاتھ بڑھایا۔ کبھی کاغذ پر دست درازی کی۔ میں نے گود سے اتار دیا۔ وہ میز کا پایہ پکڑے کھڑا رہا۔ گھرمیں نہ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک چڑیا پھدکتی ہوئی آئی اور سامنے کے صحن میں بیٹھ گئی۔بچہ کے لیے تفریح کا یہ نیا سامان تھا۔ وہ اس کی طرف لپکا۔ چڑیا ذرا بھی نہ ڈری۔ بچہ نے سمجھا اب یہ پرواز کھلونا ہاتھ آگیا۔ بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے چڑے کو بلانے لگا۔ چڑیا اڑ گئی۔ مایوس بچہ رونے لگا۔ مگر اندر کے دروازہ کی طرف تاکا بھی نہیں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

گرم حلوے، کی خوش آیند صدا آئی۔ بچہ کا چہرہ اشتیاق سے کھل اٹھا۔ خوانچے والا سامنے سے گزرا۔ بچے نے میری طرف التجا کی نظروں سے دیکھا۔ جوں جوں خوانچے والا دور ہوتا گیا نگاہ التجا احتجاج میں تبدیل ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ جب موڑ آگیا اور خوانچے والا نظروں سے غائب ہو گیا۔ تو احتجاج نے فریاد پرشور کی صورت اختیار کی۔ مگر میں بازار کی چیزیں بچوں کو نہیں کھانے دیتا۔ بچہ کی فریاد نے مجھ پر کوئی اثر نہ کیا۔ میں نے آئندہ را احتیاط کے خیال سے اور بھی اکڑ کر

لی۔ کہہ نہیں سکتا۔ بچے نے اپنی ماں کی عدالت میں اپیل کرنے کی ضرورت سمجھی یا نہیں۔ عام بچے ایسی افتادوں کے موقعہ پر ماں سے اپیل کرتے ہیں۔ شاید اس نے کچھ دیر کے لیے اپیل ملتوی کردی ہو۔ اس نے دروازہ کی طرف رخ نہ کیا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

میں نے اشک شوئی کے خیال سے اپنا فاؤنٹین پن اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ بچہ کو کائنات کی دولت مل گئی۔ اس کے سارے قواء ذہنی اس نئے عقدے کو حل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ دفعتہً دروازہ ہوا سے خود بخود بند ہو گیا۔ پٹ کی آواز بچہ کے کانوں میں آئی۔ اس نے دروازہ کی طرف دیکھا ا س کا انہاک فی الفور غائب ہو گیا۔ اس نے فاؤنٹین پن کو پھینک دیا اور روتا ہوا دروازہ کی طرف چلا۔ کیوں کہ دروازہ بند ہو گیا تھا۔

یہ افسانہ پریم چالیسی 1930 میں شائع ہوا۔ یہ گپت دھن نمبر 2 میں شامل ہے۔

سمر یاترا

(۱)

آج سویرے ہی سے گاؤں میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کچی جھونپڑیاں ہنستی ہوئی جان پڑتی تھیں۔ آج ستیہ گرہیوں کا جتھا گاؤں میں آئے گا۔ کودئی چودھری کے دوار پر چندووا تنا ہوا ہے۔ آٹا، گھی، ترکاری، دودھ اور دہی جمع کیا جا رہا ہے۔ سب کے چہروں پر امنگ ہے، حوصلہ ہے، آنند ہے۔ وہیں بندا اہیر، جو دورے کے حکیموں کے پڑاو پر پاؤ پاؤ بھر دودھ کے لیے منھ چھپاتا پھرتا تھا، آج دودھ اور دہی کے مٹکے چھیرانے سے بٹور کر رکھ گیا ہے۔ کمہار، جو گھر چھوڑ کر بھاگ جایا کرتا تھا، مٹی کے برتنوں کا اٹم لگا گیا ہے۔ گاؤں کے نائی- کہار سب آپ ہی آپ دوڑے چلے آرہے ہیں۔ اگر کوئی پرانی دکھی ہے، تو وہ نوہری بڑھیا ہے۔ وہ اپنی جھونپڑی کے دوار پر بیٹھی ہوئی ہے اپنی پچھتر سال کی بوڑھی سکڑی ہوئی آنکھوں سے یہ سماروہ دیکھ رہی ہے اور پچھتا رہی ہے۔ اس کے پاس کیا ہے، جسے لے کر کودئی کے دُوار پر جائے اور کہے- میں یہ لائی ہوں۔ وہ تو دانوں کو محتاج ہے۔

مگر نوہری نے اچھے دن بھی دیکھے ہیں۔ ایک دن اس کے پاس دھن، جن سب کچھ تھا۔ گاؤں پر اسی کا راجیہ تھا۔ کودئی کو اس نے ہمیشہ نیچے دبائے رکھا۔ وہ استری ہوکر بھی پُرش تھی۔ اس کا پتی گھر میں سوتا تھا، وہ کھیت میں سونے جاتی تھی۔ معاملے- مقدمے کی پیروی خود ہی کرتی تھی۔ لینا دینا سب اسی کے ہاتھوں میں تھا لیکن وہ سب کچھ وِدھاتا نے ہَر لیا؛ نہ دھن رہا نہ جَن رہے - اب ان

کے ناموں کو رونے کے لیے وہی باتی تھی۔ آنکھوں سے سوجھتا نہ تھا، کانوں سے سنائی نہ دیتا تھا، جگہ سے ہلنا مشکل تھا۔ کسی طرح زندگی کے دن پورے کر رہی تھی اور ادھر کودئی کے بھاگ اُدے ہوگئے تھے۔ اب چاروں اُور سے کودئی کی پونچھ تھی۔ پانچ تھی۔ آج جلسہ بھی کودئی کے دُوار پر ہورہا ہے۔ نوہری کو اب کون پوچھے گا۔ یہ سوچ کر اس کا منسوی ہردے مانو کسی پتھر سے کچل اٹھا۔ ہائے! اگر بھگوان اسے اتنا اَپنگ نہ کر دیا ہوتا، تو آج جھونپڑی کو لیپتی، دُوار پر باجے بجواتی، کڑھاؤ چڑھا دیتی، پوڑیاں بنواتی اور جب وہ لوگ کھا چکتے؛ تو اَنجلی بھر روپے ان کی بھینٹ کر دیتی۔

اسے وہ دن یاد آیا، جب وہ اپنے بوڑھے پتی کو لے کر یہاں سے بیس کوس مہاتما جی کے درشن کرنے گئی تھی۔ وہ اُتساہ، وہ ساتوِک پریم، وہ شرڈھا، آج اس کے ہردے میں آکاش کے مٹیالے میکھوں کی بھانتی اُمڑنے لگی۔

کودئی نے آکر پوپلے منھ سے کہا- بھابی، آج مہاتما جی کا جتھا آرہا ہے، تمھیں بھی کچھ دینا ہے۔

نوہری نے چودھری کو کٹار بھری ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ بزدئی مجھے جلانے آیا ہے۔ مجھے نیچا دِکھانا چاہتا ہے۔ جیسے آکاش پر چڑھ کر بولی- مجھے جو کچھ دینا ہوگا، وہ انھیں لوگوں کو دوں گی۔ تمھیں کیوں دکھاؤں۔

کودئی نے مسکراکر کہا- ہم کسی سے کہیں گے نہیں، سچ کہتے ہیں بھابی، نکالو وہ پرانی ہانڈی! اب کس دن کے لیے رکھے ہوئے ہو۔ کسی نے کچھ نہیں دیا۔ گاؤں کی لاج کیسے رہے گی؟

نوہری نے کٹھور دینتا کے بھاؤ سے کہا- جلے پر نمک نہ چھڑکو، دیورجی! بھگوان نے دیا ہوتا، تو تمھیں کہنا نہ پڑتا۔ اسی دُوار پر ایک دن سادھو- سنت، جوگی- جتی، حکیم- سوبا سبھی آتے تھے؛ مگر سب دن برابر نہیں جاتے!

کودئی لجّت ہو گیا۔ اس کے مکھ کی جھرّیاں مانوں رینگنے لگیں۔ بولا- تم تو ہنسی ہنسی میں بگڑ جاتی ہو بھابی! میں نے تو اس لیے کہا تھا کہ پیچھے سے تم یہ نہ کہنے لگو- مجھے تو کسی نے کچھ کہا ہی نہیں۔

یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ نوہری وہیں بیٹھی اس کی اُور تاکتی رہی۔ اس کا وہ وینگ سَرپ کی بھانتی اس کے سامنے بیٹھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

(۲)

نوہری ابھی بیٹھی ہوئی تھی کہ شور مچا- جتّھا آگیا۔ پچھّم میں گرد اُڑتی ہوئی نظر آرہی تھی، مانو پرتھوی ان یاتریوں کے سواگت میں اپنے راج رتنوں کی وَرشا کر رہی ہو۔ گاؤں کے سب اَستری پُرش سب کام چھوڑ چھاڑ کر ان کا اَبھیوادن کرنے چلے۔ ایک شَن میں ترنگی پتاکا ہوا میں پھراتی دکھائی دی، مانو سوراجیہ اونچے آسن پر بیٹھا ہوا سب کو آشِر واد دے رہا ہے۔

اِستریاں منگل- گان کرنے لگیں۔ ذرا دیر میں یاتریوں کا دَل صاف نظر آنے لگا۔ دو-دو آدمیوں کی قطاریں تھیں۔ ہر ایک کی دِہ پر کھدّر کا کُرتا تھا، سر پر گاندگی ٹوپی، بغل میں تھیلا لٹکتا ہوا، دونوں ہاتھ خالی، مونو سوراجیہ کا آلِنگن کرنے کو تیار ہوں۔ پھر ان کا کنٹھ سوَر سنائی دینے لگا۔ ان کے مردانے گلوں سے ایک قومی ترانہ نکل رہا تھا، کرم، گہرا، دلوں میں سپھرتی ڈالنے والا-

اک دن وہ تھا کہ ہم سارے جہاں میں فرد تھے
ایک دن یہ ہے کہ ہم سا بہیا کوئی نہیں
ایک دن وہ تھا کہ اپنی شان پر دیتے تھے جان
ایک دن یہ ہے کہ ہم سا بہیا کوئی نہیں

گاؤں والوں نے قدم آگے بڑھایا یاتریوں کا سواگت کیا۔ بیچاروں کے سروں پر دھول جمی ہوئی تھی، ہونٹ سوکھے ہوئے، چہرے سنولائے؛ پر آنکھوں میں جیسے آزادی کی جیوتی چمک رہی تھی۔

اِستریاں گا رہی تھیں، بالک اچھل رہے تھے اور پُرش اپنے انگوچھوں سے یاتریوں کو ہوا کر رہے تھے۔ اس سماروہ میں نوہری کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا۔ وہ اپنی لٹھیا پکڑے سب کے پیچھے سجیو آشِر واد بنی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں، مُکھ سے گورو کی ایسی جھلک آرہی تھی مانو وہ کوئی رانی ہے، مانو یہ سارا

گاؤں اس کا ہے، وہ سبھی یووک اس کے بالک ہیں۔ اپنے من میں اس نے ایسی شکتی، ایسے وِکاس، ایسے اتھان کا انوبھو کبھی نہ کیا تھا۔

سہسا اس نے لاٹھی پھینک دی اور بھیڑ کو چیرتی ہوئی یاتریوں کے سامنے آ کھڑی ہوئی، جیسے لاٹھی کے ساتھ ہی اس نے بڑھاپے اور دکھ کے بوجھ کو پھینک دیا ہو۔ وہ ایک پل انورکت آنکھوں سے آزادی کے سینکوں کی طرف تاکتی رہی، مونو ان کی شکتی کو اپنے اندر بھر رہی ہو، تب وہ ناچنے لگی، اس طرح ناچنے لگی، جیسی کوئی سُندری نو یوونا پریم اور اُلاس کے مد سے وِہل ہوکر ناچے۔ لوگ دو-دو، چار-چار قدم پیچھے ہٹ گئے، چھوٹا سا آنگن بن گیا اور اس آنگن میں وہ بڑھیا اپنا اتیت ترتے کوشل دکھانے لگی۔ اس آلوکک آنند کے ریلے مین وہ اپنا سارا دکھ اور سنتاپ بھول گئی۔ اس کے جیرن انگوں میں جہاں سدا وایو کا پرکوپ رہتا تھا، وہاں نہ جانے اتنی چپلتا، اتنی لچک، اتنی پھرتی کہاں سے آگئی تھی۔ پہلے کچھ دیر تو لوگ مذاق سے اس کی طرف تاکتے رہے؛ جیسے بالک بندر کا ناچ دیکھتے ہیں پھر انوراگ کے اس پاون پرواہ نے سبھی کو متوالا کر دیا۔ انھیں ایسا جان پڑا کہ ساری پراکرتی ایک وِراٹ وِیاپک نِرتّے کی گود میں کھیل رہی ہے۔

کودئی نے کہا - بس کرو، بھابی، بس کرو۔

نوہری نے تھرکتے ہوئے کہا- کھڑے کیوں ہو، آؤ نہ ذرا دیکھوں کیسے ناچتے ہو!

کودئی بولے - اب بڑھاپے میں کیا ناچوں؟

نوہری نے رک کر کہا- کیا تم آج بھی بوڑھے ہو؟ میرا بڑھاپا تو جیسے بھاگ گیا۔ ان ویروں کو دیکھ کر بھی تمھاری چھاتی نہیں پھولتی؟ ہماری ہی دکھ درد ہَرنے کے لیے تو انھوں نے یہ پرَن ٹھانا ہے۔ انھیں ہاتھوں سے حکیموں کی بیگار بجائی ہے، انھیں کانوں سے ان کی گالیاں اور گھڑیاں سنئی ہیں۔ اب تو اس زور ظلم کا ناش ہوگا- ہم اور تم کیا ابھی بوڑھے ہونے لگیہ تھے؟ ہمیں پیٹ کی آگ نے جلایا ہے۔ بولو، ایمان سے، یہاں اننتے آدمی ہیں، کسی نے ادھر چھ: مہینے سے پیٹ بھر روٹی کھائی ہے؟ گھی کسی کو سونگھنے کو ملا ہے۔ کبھی نیند بھر سوئے ہوئے ہو۔ جس کھیت کی

لگان تین روپے دیتے تھے، اب اسی کے نو دس دیتے ہو۔ کیا دھرتی سونا اگلے گی؟ کام کرتے کرتے چھاتی پھٹ گئی۔ ہم ہیں کہ اتنا سہہ کر بھی جیتے ہیں۔ دوسرا ہوتا، تو یا تو مار ڈالتا، یا مر جاتا۔ دھنے ہیں مہاتما اور ان کے چیلے کی دینوں کا دکھ سمجھتے ہیں ان کے اڈّھار کا جتن کرتے ہیں۔ اور تو سبھی ہمیں پیس کر ہمارا رَکت نکالنا جانتے ہیں۔

یاتریوں کے چہرے چمک اٹھے، ہردے کھل اٹھے۔ پریم کی ڈوبی ہوئی دھوَنی نکلی۔

ایک دن تھا کہ پارس تھی یہاں کی سر زمین
ایک دن یہ ہے کہ یوں بے دست و پا کوئی نہیں

(۳)

کودئی کے دوار پر مشالیں جل رہی تھیں۔ کئی گاؤں کے آدمی جما ہوگئے تھے۔ یاتریوں کے بھوجن کر لینے کے بعد سبھا شروع ہوئی۔ دَل کے نایک نے کھڑے ہوکر کہا۔

بھائیوں، آپ نے آج ہم لوگوں کا جو آدر ستکار کیا، اس سے ہمیں یہ آشا ہو رہی ہے کہ ہماری بیڑیاں جلد ہی کٹ جائیں گی۔ میں نے پورب اور پچھّم کے بہت سے دیشوں کو دیکھا ہے، اور میں تجربے سے کہتا ہوں کہ آپ میں جو سرلتا، جو ایمانداری، جو شرَم اور دھرم بدّھی ہے، وہ سنسار کے اور کسی دیش میں نہیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ آپ منوشئے نہیں، دیوتا ہیں۔ آپ کو بھوگ دِلاس سے مطلب نہیں، نشہ پانی سے مطلب نہیں، اپنا کام کرنا اور اپنی دَشا پر سنتوش رکھنا۔ یہ آپ کا آدرش ہے، لیکن آپ کا یہی دیوتو، آپ کا یہی سیدھا پَن آپ کے حق مین کھاتک ہو رہا ہے۔ برا نہ مانیے گا، آپ لوگ اس سنسار میں رہنے کے یوگیہ نہیں۔ آپ کو تو سورگ میں کوئی اِستھان پانا چاہیے تھا۔ کھیتوں کا لگان برساتی نالے کی طرح بڑھتا جاتا ہے، آپ چوں نہیں کرتے۔ اَملے اور اہلکار آپ کو ناچتے رہتے ہیں، آپ زبان نہیں ہلاتے۔ اس کا یہ نتیجہ ہورہا ہے کہ آپ کو لوگ دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے

ہیں؛ پر آپ کو خبر نہیں۔ آپ کے ہاتھوں سے سبھی روزگار چھنتے جاتے ہیں، آپ کا سَروناش ہورہا ہے، پر آپ آنکھ کھول کر نہیں دیکھتے۔ پہلے لاکھوں بھائی سوت کات کر، کپڑے بُن کر گزر کرتے تھے۔ اب سب کپڑا وِدیش سے آتا ہے۔ پہلے لاکھوں آدمی یہیں نمک بناتے تھے۔ اب نمک باہر سے آتا ہے۔ یہاں نمک بنانا جرم ہے۔ آپ کے دیش میں اتنا نمک ہے کہ سارے سنسار کا دو سو سال تک اس سے کام چل سکتا ہے، پر آپ سات کروڑ روپے صرف نمک کے لیے دیتے ہیں۔ آپ کے اُوسروں میں، جھیلوں میں نمک بھرا پڑا ہے، آپ اسے چھو نہیں سکتے۔ شاید کچھ دنوں میں آپ کے کنوؤں پر بھی محصول لگ جائے۔ کیا آپ اب بھی انیائے سہتے رہیں گے؟

ایک آواز آئی- ہم کس لائق ہیں؟

نایک- یہی تو آپ کا بھرم ہے۔ آپ ہی کی گردن پر اتنا بڑا راجیہ تھما ہوا ہے۔ آپ ہی ان بڑی بڑی فوجوں، ان بڑے بڑے افسروں کے مالک ہیں؛ مگر پھر بھی آپ بھوکوں مرتے ہیں، انیائے سہتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ کو اپنی شکتی کا بیان نہیں۔ یہ سمجھ لیجیے کہ سنسار میں جو آدمی اپنی رَکشا نہیں کرسکتا، وہ سدیو سوارتھی اور اَنیائے آدمیوں کا شکار بنا رہے گا۔ آج سنسار کا سب سے بڑا آدمی اپنے پرانوں کی بازی کھیل رہا ہے۔ ہزاروں جوان اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے آپ کے دکھوں کا انت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ جو لوگ آپ کو اَسہائے سمجھ کر دونوں ہاتھوں سے آپ کو لوٹ رہے ہیں، وہ کب چاہیں گے کہ ان کا شکار ان کے منھ سے چھِن جائے۔ وہ آپ کے ان سپاہیوں کے ساتھ جتنی سختیاں کر سکتے ہیں، کر رہے ہیں؛ مگر ہم لوگ سب کچھ سہنے کو تیار ہیں۔ اب سوچیے کہ آپ ہماری کچھ مدد کریں گے؟ مردوں کی طرح نکل کر اپنے کو اَنیائے سے بچائیں گے یا کائروں کی طرح بیٹھے ہوئے تقدیر کو کوستے رہیں گے؟ ایسا اَوسر پھر شاید کبھی نہ آئے۔ اگر اس وقت چُوکے، تو پھر ہمیشہ ہاتھ مَلتے رہیے گا۔ ہم نیائے اور ستّے کے لیے لڑ رہے ہیں؛ اس لیے نیائے اور ستّے ہی کے ہتھیاروں سے ہمیں لڑنا ہے۔ ہمیں ایسے ویروں کی ضرورت ہے، جو ہنسا اور کرودھ کو دِل سے نکال ڈالیں اور ایشور پر اٹل

رکھ کر دھرم کے لیے سب کچھ جھیل سکیں۔ بولیے آپ کیا مدد کر سکتے ہیں؟

(۴)

ایکا ایک شور مچا- پولیس! پولیس آ گئی!!

پولیس کا داروغہ کانسٹیبلوں کے ایک دَل کے ساتھ آکر سامنے کھڑا ہوگیا۔ لوگوں نے سہمی ہوئی آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے دِلوں سے ان کی طرف دیکھا اور چھپنے کے لیے بِل کھوجنے لگے۔

داروغہ جی نے حکم دیا- مار کر بھگا دو ان بدمعاشوں کو؟

کانسٹیبلوں نے اپنے ڈنڈے سنبھالے؛ مگر اس کے پہلے کہ وہ کسی پر ہاتھ چلائے سبھی لوگ ہُر ہوگئے! کوئی ادھر سے بھاگا، کوئی ادھر سے بھگدڑ مچ گئی۔ دس منٹ میں وہاں گاؤں کا ایک آدمی بھی نہ رہا۔ ہاں، نایک اپنے اِستھان پر اب بھی کھڑا تھا اور جتھا اس کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا؛ کیول کودئی چودھری نایک کے پاس بیٹھے ہوئے تھر آنکھوں سے بھومی کی طرف تاک رہے تھے۔

داروغہ نے کودئی کی طرف کٹھور آنکھوں سے دیکھ کر کہا- کیوں رے کودئیا، تو نے ان بدمعاشوں کو کیوں ٹھہرایا یہاں؟

کودئی نے لال-لال آنکھوں سے داروغہ کی طرف دیکھا اور زہر کی طرح غصّے کو پی گئے۔ آج اگر ان کے سر پر گرہستی کا بکھیڑا نہ ہوتا، لینا دینا نہ ہوتا تو وہ بھی اس کا منھ توڑ جواب دیتے۔ جس گرہستی پر انھوں نے اپنے جیون کے پچاس سال ہوم کر دیے تھے؛ وہ اس سمے ایک وشیلے سرپ کی بھانتی ان کی آتما میں لپٹی ہوئی تھی۔

کودئی نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا کہ نوہری پیچھے سے آکر بولی- کیا لال پگڑی باندھ کر ہماری جیبھ اینٹھ گئی ہے؟ کودئی کیا تمھارے غلام ہیں کہ کودئیا- کودئیا کررہے ہو؟ ہمارا ہی پیسہ کھاتے ہو اور ہمیں کو آنکھیں دکھاتے ہو؟ تمھیں لاج نہیں آتی؟

نوہری اس وقت دوپہری کی دھوپ کی طرح کانپ رہی تھی۔ داروغہ

ایک شن کے لیے سناٹے میں آ گیا۔ پھر کچھ سوچ کر اور عورت کے منھ لگنا اپنی شان کے خلاف سمجھ کر کودئی سے بولا- یہ کون شیطان کی خالہ ہے، کودئی! خدا کا خوف نہ ہوتا تو زبان تالو سے کھینچ لیتا۔

بوڑھیا لاٹھی ٹیک کر داروغہ کی طرف گھومتی ہوئی بولی- کیوں خدا کی دہائی دے کر بدنام کرتے ہو۔ تمھارے خدا تو تمھارے افسر ہیں، جن کی تم جوتیاں چاٹتے ہو۔ تمھیں تو چاہیے تھا کہ ڈوب مرتے چلو بھر پانی میں! جانتے ہو، یہ لوگ جو یہاں آئے ہیں، کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں، جو ہم غریب کے لیے اپنی جان تک ہومنے کو تیار ہیں۔ تم انھیں بدمعاش کہتے ہو! تم جو گھوس سے روپے کھاتے ہو، جُوا کھلاتے ہو، چوریاں کرواتے ہو، ڈاکے ڈلواتے ہو، بھلے آدمیوں کو پھنسا کر مٹھیاں گرم کرتے ہو اور اپنے دیوتاؤں کی جوتیوں پر ناک رگڑتے ہو، تم انھیں بدمعاش کہتے ہو!

نوہری کی تیکشن باتیں سن کر بہت سے لوگ جو اِدھر اُدھر دبک گئے تھے، پھر جمع ہوگئے۔ داروغہ نے دیکھا، بھیڑ بڑھتی جاتی ہے تو اپنا ہنٹر لے کر ان پر پلے پڑے۔ لوگ پھر تتر بتر ہوگئے۔ ایک ہنٹر نوہری پر بھی پڑا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ کوئی چنگاری ساری پیٹھ پر دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھاگیا، پر اپنی بچی ہوئی شکتی کو اکتر ت کرکے اونچے سور سے بولی- لڑکوں کیوں بھاگتے ہو؟ کیا نیوتا کھانے آئے تھے۔ یا کوئی ناچ تماشا ہورہا تھا؟ تمھارے اسی لیڑی پن نے ان سبھوں کو شیر بنا رکھا ہے۔ کب تک یہ مار دھاڑ، گالی گپّہ سہتے رہوگے۔

ایک سپاہی نے بوڑھیا کی گردن پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ بوڑھیا دو تین قدم پر اوندھے منھ گرا چاہتی تھی کہ کودئی نے لپک کر اسے سنبھال لیا اور بولا- کیا ایک دکھی پر غصہ دکھاتے ہو یارو؟ کیا غلامی نے تمھیں نامرد بھی بنا دیا ہے؟ عورتوں پر بوڑھوں، نہتھوں پر، وار کرتے ہو، وہ مردوں کا کام نہیں ہے۔

نوہری نے زمین پر پڑے پڑے کہا- مرد ہوتے، تو غلام ہی کیوں ہوتے! بھگوان! آدمی اتنا نردئی بھی ہوسکتا ہے؟ بھلا انگریز اس طرح بے دردی کرے تو ایک بات ہے۔ اس کا راج ہے۔ تم تو اس کے چاکر ہو، تمھیں راج تو نہ ملے گا،

مگر رانڈ مانڈ میں ہی خوش! انھیں کوئی طاب دیتا جائے، دوسروں کی گردن بھی کاٹنے میں انھیں سنکوچ نہیں!

اب داروغہ نے نایک کو ڈانٹنا شروع کیا- تم کس کے حکم سے اس گاؤں میں آئے؟

نایک نے شانت بھاؤ سے کہا- خدا کے حکم سے۔

داروغہ- تم رعایا کے امن میں خلل ڈالتے ہو؟

نایک- اگر تمھیں ان کی حالت بتانا ان کے امن میں خلل ڈالنا ہے تو بے شک ہم ان کے امن میں خلل ڈال رہے ہیں۔

بھاگنے والوں کے قدم ایک بار پھر رک گئے۔ کودئی نے ان کی طرف نراش آنکھوں سے دیکھ کر کانپتے ہوئے سور میں کہا- بھائیوں اس بَخت کئی گاؤوں کے یہاں آدمی جمع ہیں؟ داروغہ نے ہماری جیسی بے آبروئی کی ہے، کیا اسے سہہ کر تم آرام کی نیند سوسکتے ہو؟ اس کی فریاد کون سنے گا؟ حاکم لوگ کیا ہماری فریاد سنیں گے۔ کبھی نہیں۔ آج اگر ہم لوگ مار ڈالے جائیں، تو بھی کچھ نہ ہوگا۔ یہ ہے ہماری عزّت اور آبرو؟ تھڑی ہے اس زندگی پر!

سموح ستَر بھاؤ سے کھڑا ہوگیا، جیسے بہتا ہوا پانی مینڈ سے رک جائے۔ بھئے کا دھواں جو لوگوں کے ہردے پر چھاگیا تھا، ایکا ایک ہٹ گیا۔ ان کے چہرے کٹھور ہوگئے۔ داروغہ نے ان کے تیور دیکھے، تو تُرنت گھوڑے پر سوار ہوگیا اور کودئی کو گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ دو سپاہیوں نے بڑھ کر کودئی کی باہ پکڑ لی۔ کودئی نے کہا- گھبراتے کیوں ہو، میں کہیں بھاگوں گا نہیں۔ چلو، کہاں چلتے ہو؟

جیوں ہی کودئی دونوں سپاہیوں کے ساتھ چلا، اس کے دونوں جوان بیٹے کئی آدمیوں کے ساتھ سپاہیوں کی طرف لپکے کہ کودئی کو ان کے ہاتھوں میں چھین لیں۔ سبھی آدمی وِکٹ آویش میں آکر پولیس والوں کے چاروں طرف جمع ہوگئے۔

داروغہ نے کہا- تم لوگ ہٹ جاؤ ورنہ میں فائر کردوں گا۔ سموح نے اس دھمکی کا جواب 'بھارت ماتا کی جے! سے دیا اور ایکا ایک دو دو قدم آگے کھسک گئے۔

داروغہ نے دیکھا، اب جان بچتی نہیں نظر آتی ہے۔ نمرتا سے بولا- نایک

صاحب، یہ لوگ فساد پر آمادہ ہیں۔ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔

نایک نے کہا- نہیں، جب تک ہم میں ایک آدمی بھی یہاں رہے گا، آپ کے اوپر کوئی ہاتھ نہ اٹھا سکے گا۔ آپ سے ہماری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ ہم اور آپ دونوں ایک ہی پیروں کے تلے دبے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم آپ دونوں وِرودھی دَلوں میں کھڑے ہیں۔

یہ کہتے ہوئے نایک نے گاؤں والوں کو سمجھایا- بھائیوں، میں آپ سے کہہ چکا ہوں، یہ نیائے اور دھرم کی لڑائی ہے اور ہمیں نیائے اور دھرم کے ہتھیار سے ہی لڑنا ہے۔ ہمیں اپنے بھائیوں سے نہیں لڑنا ہے۔ ہمیں تو کسی سے بھی لڑنا نہیں ہے۔ داروغہ کی جگہ کوئی انگریز ہوتا، تو بھی ہم اس کی اتنی ہی رَکشا کرتے۔ داروغہ نے کودئی چودھری کو گرفتار کیا ہے۔ میں اسے چودھری کا سوبھاگیہ سمجھتا ہوں۔ دھنے ہیں وہ لوگ جو آزادی کی لڑائی میں سزا پائیں۔ یہ بگڑنے یا گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ آپ لوگ ہٹ جائیں اور پولیس کو جانے دیں۔

داروغہ اور سپاہی کودئی کو لے کر چلے۔ لوگوں نے جے دھوَنی کی- 'بھارت ماتا کی جے۔

کودئی نے جواب دیا۔ رام رام بھائیوں، رام رام۔ ڈٹے رہنا میدان میں! گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ بھگوان سب کا مالک ہے۔

دونوں لڑکوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کاتر سُور میں بولے- ہمیں کیا کہے جاتے ہو دادا!

کودئی نے انھیں بڑھاوا دیتے ہوئے کہا- بھگوان کا بھروسہ مت چھوڑنا اور وہ کرنا جو مردوں کو کرنا چاہیے۔ بَھے ساری برائیوں کی جڑ ہے۔ اسے مَن سے نکال ڈالو، پھر تمھارا کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ سَتے کا پرَتیکش روپ آج اس نے پہلی بار دیکھا مانو وہ کوَچ کی بھانتی اس کی رَکشا کررہا ہو۔

(۵)

گاؤں والوں کے لیے کودئی کا پکڑ لیا جانا لجّا جنک معلوم ہورہا تھا۔ ان کی

آنکھوں کے سامنے ان کے چودھری اس طرح پکڑ لیے گئے اور وہ کچھ نہ کر سکے۔ اب وہ منہ کیسے دکھائیں! ہر ایک مُکھ پر گہری ویدنا جھلک رہی تھی جیسے گاؤں لُٹ گیا!

سہسا نوہری نے چلّا کر کہا- اب سب جنے کھڑے کیا پچھتا رہے ہو؟ دیکھ لی اپنی دُردَشا، یا ابھی کچھ باقی ہے! آج تم نے دیکھ لیا نہ کہ ہمارے اوپر قانون سے نہیں لاٹھی سے راج ہورہا ہے۔ آج ہم اتنے بے شرم ہیں کہ اتنی دُردشا ہونے پر بھی کچھ نہیں بولتے! ہم اتنے سوارتھی، اتنے کائر نہ ہوتے، تو ان کی مجال تھی کہ ہمیں کوڑوں سے پیٹتے۔ جب تک تم غلام بنے رہوگے، ان کی سیوا ٹہل کرتے رہوگے، تمھیں بھوسا چوکر ملتا رہے گا، لیکن جس دن تم نے کندھا ٹیڑھا کیا، اسی دن مار پڑنے لگے گی۔ کب تک اس طرح مار کھاتے رہوگے؟ کب تک مُردوں کی طرح پڑے گِدھوں سے اپنے آپ کو نوچواتے رہوگے؟ اب دِکھا دو کہ تم بھی جیتے جاگتے ہو اور تمھیں بھی اپنی عزت آبرو کا کچھ خیال ہے۔ جب عزت ہی نہ رہی تو کیا کروگے؟ کیا اسی لیے جی رہے ہو کہ تمھارے بال بچے اسی طرح لاتیں کھاتے جائیں، اسی طرح کچلے جائیں؟ چھوڑو یہ کایرتا! آخر ایک دِن کھاٹ پر پڑے پڑے مرجاؤگے۔ کیوں نہیں اس دھرم کی لڑائی میں آکر ویروں کی طرح مرتے! میں تو بوڑھی ہوں، لیکن اور کچھ نہ کر سکوں گی، تو جہاں یہ لوگ سوئیں گے وہاں جھاڑو تو لگا دوں گی، انھیں پنکھا تو جھلوں گی۔

کودئی کا بڑا لڑکا میکو بولا- ہمارے جیتے جی تم جاؤگی کاکی، ہمارے جیون کو دِھتکار ہے! ابھی تو ہم تمھارے بالک جیتے ہی ہیں۔ میں چلتا ہوں ادھر! کھیتی باڑی گنگا دیکھے گا۔

گنگا اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ بولا- بھیا تم یہ اَنیائے کرتے ہو۔ میرے رہتے تم نہیں جاسکتے۔ تم رہوگے، تو گرہستی سنبھالوگے۔ مجھ سے تو کچھ نہ ہوگا۔ مجھے جانے دو۔

میکو - اسے کاکا پر چھوڑ دو۔ اس طرح ہماری تمھاری لڑائی ہوگی۔ جسے کاکی کا حکم ہو وہ جائے۔

نوہری نے گرو سے مسکرا کر کہا- جو مجھے گھوس دے گا، اسی کو جتاؤں گی۔

میکو- کیا تمھاری کچہری میں بھی وہی گھوس چلے گا کاکی؟ ہم نے تو سمجھا تھا، یہاں ایمان کا فیصلہ ہوگا۔

نوہری- چلو رہنے دو۔ مرتی دائی راج ملا ہے تو کچھ تو کما لوں۔

گنگا ہنستا ہوا بولا- میں تمھیں گھوس دوں گا کاکی۔ اب کی بازار جاؤں گا، تو تمھارے لیے پوروی تماکھو کا پتہ لاؤں گا۔

نوہری- تو بس تیری ہی جیت ہے، تو ہی جانا۔

میکو- کاکی، تم نیائے نہیں کر رہی ہو۔

نوہری- عدالت کا فیصلہ کبھی دونوں فریق نے پسند کیا ہے کہ تمھیں کروگے؟

گنگا نے نوہری کے چرن چھوئے، پھر بھائی سے گلے ملا اور بولا- کل دادا کو کہلا بھیجنا کہ میں جاتا ہوں۔

ایک آدمی نے کہا- میرا نام بھی لکھ لو بھائی- سیوارام۔

سب نے جے گھوش کیا۔ سیوا رام آکر نایک کے پاس کھڑا ہوگیا۔

بھجن سنگھ دس پانچ گاؤں میں پہلوانی کے لیے مشہور تھا۔ یہ اپنی چوڑی چھاتی تانے، سر اٹھائے نایک کے پاس کھڑا ہوا، تو جیسے منڈپ کے نیچے ایک نئے جیون کا اُدے ہوگیا۔

تُرنت ہی تیسری آواز آئی- میرا نام لکھ لو- گھورے۔

یہ گاؤں کا چوکیدار تھا۔ لوگوں نے سر اٹھا اٹھا کر اسے دیکھا۔ سہسا کسی کو وِشواس نہ آتا تھا کہ گھورے اپنا نام لکھائے گا۔

بھجن سنگھ نے ہنستے ہوئے پوچھا- تمھیں کیا ہوا ہے گھورے۔

گھورے نے کہا- مجھے وہی ہوا ہے، جو تمھیں ہوا ہے۔ بیس سال تک غلامی کرتے کرتے تھک گیا۔

پھر آواز آئی- میرا نام لکھو- کالے خاں۔

وہ زمیندار کا سہنا تھا، بڑا ہی جابر اور دبنگ۔ پھر لوگوں کو آشچر یہ ہوا۔

میکو بولا- معلوم ہوتا ہے، ہم کو لوٹ لوٹ کر گھر بھر لیا ہے، کیوں۔

کالے خاں گمبھیر سور میں بولا - کیا جو آدمی بھٹکتا رہے، اسے کبھی سیدھے راستے پر نہ آنے دوگے بھائی۔ اب تک جس کا نمک کھاتا تھا، اس کا حکم بجاتا تھا۔ تم کو لوٹ لوٹ کر اس کا گھر بھرتا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ میں بڑے بھارے مغالتے میں پڑا ہوا تھا۔ تم سب بھائیوں کو میں نے بہت ستایا ہے۔ اب مجھے معافی دو۔

پانچوں رنگ رُوٹ ایک دوسرے سے لپٹتے تھے، اچھلتے تھے، چیختے تھے، مانو انھوں نے سچ مچ سوراجیہ پا لیا ہو، اور واستو میں انھیں سوراجیہ مل گیا تھا۔ سوراجیہ چت کی ورِتیماتر ہے۔ جیوں ہی پرادھینتا کا آتنک دل سے نکل گیا، آپ کو سوراجیہ مل گیا۔ بھے ہی پرادھینتا ہے، زربھیتا ہی سوراجیہ ہے۔ وِیوستھا اور سنگٹھن تو گون ہیں:

نایک نے ان سیوکوں کو سمبودھت کرکے کہا- مِتروں! آپ آج آزادی کے سپاہیوں میں آملے، اس پر میں آپ کو بدھائی دیتا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے، ہم کس طرح لڑائی کرنے جارہے ہیں؟ آپ کے اوپر طرح طرح کی سختیاں کی جائیں گی، مگر یاد رکھیئے، جس طرح آج آپ نے موہ اور لوبھ کا تیاگ کر دیا ہے، اسی طرح ہنسا اور کرودھ کا بھی تیاگ کر دیجئے۔ ہم دھرم سنگرام میں جارہے ہیں۔ ہمیں دھرم کے راستے پر جمع رہنا ہوگا۔ آپ اس کے لیے تیار ہیں؟

پانچوں نے ایک سور میں کہا- تیار ہیں!

نایک نے آشیرواد دیا- ایشور آپ کی مدد کرے۔

(۶)

اس سہاونے سنہلے پربھات میں جیسے امنگ ڈھلی ہوئی تھی۔ سمیر کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں، پرکاش کی ہلکی ہلکی کرنوں میں امنگ سنی ہوئی تھی۔ لوگ جیسے دیوانے ہوگئے تھے۔ مانو آزادی کی دیوی انھیں اپنی طرف بلا رہی ہو۔ وہی کھیت کھلیان ہیں، وہی باغ باغیچے ہیں، وہی اِستری پُرش ہین پر آج کے پربھات میں جو آشیرواد ہے، جو وردان ہے جو وِبھوتی ہے، وہ اور کبھی نہ تھی۔ وہی کھیت کھلیان، باغ باغیچے، اِستری پُرش آج ایک نئی وِبھوتی میں رنگ گئے ہیں۔

سوریہ نکلنے کے پہلے ہی کئی ہزار آدمیوں کا جماؤ ہوگیا تھا۔ جب ستیہ گرہیوں کا

دَل نکلا تو لوگوں کی مستانی آوازوں سے آکاش گونج اٹھا۔ نئے سینکوں کی وِدائی، ان کی رَمنیوں کا کاتر دَھیرَ یہ، ماتا پِتا کا آدر گرو، سینکوں کے پری تیاگ کا درِشیہ لوگوں کو مست کیے دیتا تھا۔

سہما نوہری لاٹھی ٹیکتی ہوئی آکر کھڑی ہوگئی۔

میکو نے کہا- کاکی، ہمیں آشِر واد دو۔

نوہری- میں تمھارے ساتھ چلتی ہوں بیٹا! کتنا آشِر واد لوگے؟

کئی آدمیوں نے ایک سُور سے کہا-کاکی،تم چلی جاؤگی، تو یہاں کون رہے گا؟

نوہری نے شُبھ کامنا سے بھرے سُور میں کہا- بھیا، جانے کے تو اب دِن ہی ہیں، آج نہ جاؤں گی، دو چار مہینے بعد جاؤں گی۔ ابھی جاؤگی، تو جیون سپھل ہوجائے گا۔ دو چار مہینے میں کھاٹ پر پڑے پڑے جاؤں گی، تو مَن کی آس مَن میں ہی رہ جائے گی۔ اتنے بالک ہیں، ان کی سیوا کے میری مُکتی (نجات) بن جائے گی۔ بھگوان کرے، تم لوگوں کے وہ دِن آئیں اور میں اپنی زندگی میں تمھارا سکھ دیکھ لوں۔

یہ کہتے ہوئے نوہری نے سب کو آشِر واد دیا اور نایک کے پاس جاکر کھڑی ہو گئی۔

لوگ کھڑے دیکھ رہے تھے اور جتھا گاتا ہوا جاتا تھا۔

ایک دن وہ تھا کہ ہم سارے جہاں میں فرد تھے۔

ایک دن یہ ہے کہ ہم سا بے حیا کوئی نہیں۔

نوہری کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے، مانو وِمان پر بیٹھی ہوئی سوَرگ جا رہی ہو۔

یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں ہنس اپریل 1930 میں شائع ہوا۔ مان سرود 7 میں شامل ہے اردو میں شائع نہیں ہوا۔

شراب کی دوکان

(۱)

کانگریس کمیٹی میں یہ سوال پیش تھا۔ شراب اور تاڑی کی دوکانوں پر کون دھرنا دینے جائے؟ کمیٹی کے پچیس ممبر سر جھکائے بیٹھے تھے، پر کسی کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ معاملہ بڑا نازک تھا۔ پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوجانا تو زیادہ مشکل بات نہ تھی۔ پولیس کے کرم چاری اپنی ذمے داریوں کو سمجھتے ہیں۔ چونکہ اچھے اور برے تو سبھی جگہ ہوتے ہیں، لیکن پولیس کے افسر، کچھ لوگوں کو چھوڑ کر، سبھیتا سے اتنے خالی نہیں ہوتے کہ جاتی اور دیش پر جان دینے والوں کے ساتھ دُرویوہار کریں، لیکن نشے بازوں میں یہ ذمے داری کہاں؟ ان میں تو ادھیکانس ایسے لوگ ہوتے ہیں، جنھیں گھرکی، دھمکی کے سوا اور کسی شکتی کے سامنے جھکنے کی عادت نہیں۔ مارپیٹ سے نشا ہرن ہو سکتا ہے، پر شانت وادیوں کے لیے تو وہ دروازہ بند ہے۔ تب کون اس اوکھلی میں سر دے، کون پیکڑوں کی گالیاں کھائے؟ بہت سمجھو ہے کہ وے ہاتھا پائی کر بیٹھے۔ ان کے ہاتھوں پٹنا کیسے منظور ہوسکتا تھا؟ پھر پولیس والے بھی بیٹھے تماشا نہ دیکھیں گے، انھیں اور بھی بھڑکاتے رہیں گے۔ پولیس کی شہہ پاکر یہ نشے کے بندے جو کچھ نہ کر ڈالے وہ تھوڑا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دے نہیں سکتے اور اس سمودائے پر وِنتی کا کوئی اثر نہیں۔

ایک ممبر نے کہا: میرے وچار میں تو ان جاتوں میں پنچایتوں کو پھر سنبھلنا چاہیے ادھر ہماری لاپرواہی سے ان کی پنچایتیں نرجیو ہوگئی ہے۔ اس کے سوا مجھے تو اور کوئی اُپائے نہیں سوجھتا۔

سبھاپتی نے کہا: ہاں یہ ایک اُپائے ہے۔ میں اسے نوٹ کیے لیتا ہوں، پر دھرنا دینا ضروری ہے۔

دوسرے مہاشے بولے: ان کے گھروں پر جاکر سمجھایا جائے تو اچھا اثر ہوگا۔

سبھاپتی نے اپنی چکنی کھوپڑی سہلاتے ہوئے کہا: یہ بھی اچھا اُپائے ہے، مگر دھرنے کو ہم لوگ تیاگ نہیں سکتے۔

پھر سناٹا ہوگیا۔

پچھلی قطار میں ایک دیوی بھی مون بیٹھی ہوئی تھی۔ جب کوئی ممبر بولتا وہ ایک نظر اس کی طرف ڈال کر پھر سر جھکالیتی تھی۔ یہی کانگریس کی لیڈی ممبر تھی۔ ان کے پتی مہاشے جی۔ پی۔ سکسینا کانگریس کے اچھے کام کرنے والوں میں تھے۔ ان کا دیہانت ہوئے تین سال ہوگئے تھے۔ مسز سکسینا ادھر ایک سال سے کانگریس کے کاموں میں بھاگ لینا شروع کر دیا تھا۔ اور کانگریس کمیٹی نے انھیں اپنا ممبر چن لیا تھا وہ شریف گھرانوں میں جاکر سودیشی اور کھدر کا پرچار کرتی تھی۔ جب کبھی کانگریس کے پلیٹ فارم پر بولنے کھڑی ہوتی تو ان کا جوش دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا، اوکاش میں اڑجانا چاہتی ہیں۔ کندن کا سا رنگ لال ہوجاتا تھا۔ بڑی بری کرون انکھیں جس میں جل بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا، چمکنے لگتی تھی۔ بڑی خوش مزاج اور اس کے ساتھ بلا کی نربھک استری تھی۔ دبی ہوئی چنگاری تھی، جو ہوا پاکر دہک اٹھتی تھی۔ اس کے معمولی شبدوں میں اتنا آکرشن کہاں سے آجاتا تھا کہہ نہیں سکتے۔ کمیٹی کے کئی جوان ممبر، جو پہلے کانگریس میں بہت کم آتے تھے اب بنا ناغہ آنے لگے تھے۔ مسز سکسینا کوئی بھی پرستاؤ کریں، ان کا انمودن کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ ان کی سادگی، ان کا اتشاہ، ان کی وِنے ، ان کی مردووانی، کانگریس پر ان کا سکہ جمائے دیتی تھی۔ ہر آدمی ان کی خاطر سمان کی سیما تک کرتا تھا، پر ان کی سوبھاویک نرمتا انھیں اپنے دیوی سادھنوں سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھانے دیتی تھی۔ جب کمرے میں آتی، لوگ کھڑے ہوجاتے تھے۔ پر وہ پچھلے صف میں سے آگے نہ بڑھتی تھی۔

مسزسکسینا نے پردھان سے پوچھا۔شراب کی دوکانوں پرعورتیں دھرنادے سکتی ہیں؟

سب کی آنکھیں ان کی اور اٹھ گئیں، اس پرشن کا آشے سب سمجھ گئے۔

پردھان نے کاتر سور میں کہا: مہاتما جی نے تو یہ کام عورتوں ہی کو سپرد کرنے پر زور دیا ہے پر.........

مسز سکسینا نے انھیں اپنا واقعہ پورا نہ کرنے دیا۔ بولی: تو پھر مجھے اس کام پر بھیج دیجیے۔

لوگوں نے کوتوہل کی آنکھوں سے مسز سکسینا کو دیکھا۔ یہ سوکماری جس کے کومل انگوں میں شاید ہوا بھی چبھتی ہو، گندی گلیوں میں تاڑی اور شراب کی درگند بھری دوکانوں کے سامنے جانے اور نشے سے پاگل آدمیوں کی کولشت آنکھیں اور باہوں کا سامنا کرنے کو کیسے تیار ہوگئی۔

ایک مہاشے نے اپنے سمیپ کے آدمی کے کان میں کہا: بلا کی نڈر عورت ہے۔

ان مہاشے نے جلے ہوئے شبدوں میں اتر دیا۔ ہم لوگوں کو کانٹوں میں گھسیٹنا چاہتی ہے، اور کچھ نہیں۔ وہ بے چاری کیا پیکٹنگ کریں گی۔ دوکان کے سامنے کھڑا تک تو ہوا نہ جائے گا۔

پردھان نے سر جھکا کر کہا: میں آپ کے ساہس اور اتہ سرگ کی پرشنسا کرتا ہوں، لیکن میرے وِچار میں ابھی اس شہر کی دشا ایسی نہیں ہے کہ دیویاں پیکٹنگ کر سکیں۔ آپ کو خبر نہیں نشے باز کتنے منہ پھٹ ہوتے ہیں۔ وِنے تو وہ جانتے ہی نہیں۔ مسز سکسینا نے وینگ بھاؤ سے کہا٭ تو کیا آپ کا وچار ہے کہ کوئی ایسا زمانہ بھی آئے گا جب شرابی لوگ ونے اور شیل کے پتلے بن جائیں گے؟ یہ دشا تو ہمیشہ ہی رہے گی۔ آخر مہاتما جی نے کچھ سمجھ کر ہی تو عورتوں کو یہ کام سونپا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ مجھے کہاں تک سپھلتا ہوگی۔ پر اس کرتویہ کو ٹالنے سے کام نہ چلے گا۔

پردھان نے پس و پیش میں پڑ کر کہا۔ میں تو آپ کو اس کام کے لیے گھسیٹنا اُچت نہیں سمجھتا، آگے آپ کو اختیار ہے

مسز سکسینا نے جیسے ونے کا آلنگن کرتے ہوئے کہا، میں آپ کے پاس فریاد

لے کر نہ آؤں گی کہ مجھے فلاں آدمی نے مارا یا گالی دی۔ اتنا جانتی ہوں کہ اگر میں سپھل ہوگئی، تو ایسی استریوں کی کمی نہ رہے گی جو اس کام کو سولہوں آنے اپنے ہاتھ میں نہ لے لیں۔

اس پر ایک نوجوان ممبر نے کہا: میں سبھاپتی جی سے نویدن کروں گا کہ مسز سکسینا کو یہ کام دے کر آپ ہنسا ہونے کا ڈر اور بھی زیادہ ہے۔ اس نوجوان ممبر کا نام تھا جے رام۔ ایک بار ایک کڑا بکھان دینے کے لیے جیل ہو آئے تھے، پر اس وقت ان کے سر گرہستھی کا بھار نہ تھا۔ کانوں پڑھتے تھے۔ اب ان کا وواہ ہو گیا تھا، دو تین بچے بھی ہوگئے تھے، دشا بدل گئی تھی، دل میں وہی جوش، وہی تڑپ، وہی درد تھا، پر اپنی حالت سے مجبور تھے۔

مسز سکسینا کی اور نرم آگرہ سے دیکھ کر بولے۔ آپ میری خاطر اس گندے کام میں ہاتھ نہ ڈالیں۔ مجھے ایک سپتاہ کا اوسر دیجیے۔ اگر اس بیچ میں کہیں دنگا ہوجائے، تو آپ کو مجھے نکال دینے کا ادھیکار ہوگا۔

مسز سکسینا جے رام کو خوب جانتی تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ یہ تیاگ اور اساحس کا پتلہ ہے اور اب تک پرتھیتون کے کارن پیچھے دبکا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس میں یہ دھیریہ اور برداشت نہیں ہے، جو پیکٹنگ کے لیے لازمی ہے۔ جیل میں اس نے داروغہ کو اپشبد کہنے پر چانٹا لگایا تھا اور اس کی سزا تین مہینے اور بڑھ گئی تھی بولی: آپ کے سر گرہستھی کا بھار ہے۔ میں گھمنڈ نہیں کرتی پر جس نے دھیریہ سے میں یہ کام کرسکتی ہوں، آپ نہیں کرسکتے۔

جے رام نے اسی نرم آگرہ کے ساتھ کہا۔ آپ میرے پچھلے ریکارڈ پر فیصلہ کر رہی ہیں۔ آپ بھول جاتی ہیں کہ آدمی کی اوستھا کے ساتھ اس کی اڈنتیا گھٹتی جاتی ہے۔

پردھان نے کہا میں چاہتا ہوں، مہاشے جے رام اس کام کو اپنے ہاتھوں میں لیں۔

جے رام نے پرسن ہو کر کہا، میں سچے ہردے سے آپ کو دھنے واد دیتا ہوں۔

مسز سکسینا نے نراش ہو کر کہا۔ مہاشے، جے رام، آپ نے میرے ساتھ بڑا انیائے کیا ہے اور میں اسے کبھی چھما نہ کروں گی۔ آپ لوگوں نے اس بات کا آج نیا پرچے دے دیا ہے کہ پورشوں کے ادھین استریاں اپنے دیش کی سیوا بھی نہیں کر سکتی۔

(۲)

دوسرے دن تیسرے پہر جے رام پانچ سوئم سیوکوں کو لے کر بیگم گنج کے شراب خانے کی پیکٹنگ کرنے جا پہنچا۔ تاڑی اور شراب۔ دونوں کی دکانیں ملی ہوئی تھیں۔ ٹھیکے دار بھی ایک ہی تھا۔ دوکان کے سامنے سڑک کی پٹری پر، اندر کے آنگن میں نشے بازوں کی ٹولیاں وِش میں امرت کا آنند لوٹ رہی تھی۔ کوئی وہاں افلاطون سیم نہ تھا۔ کہیں ویرتا کی ڈینگ تھی، کہیں اپنے دان دَکشنا کے پچڑے، کہیں اپنے بدھیہ کوشل کا آلاپھ اہنکار نشے کا موکھ روپ ہے۔

ایک بوڑھا شرابی کہہ رہا تھا، بھیہ زندگانی کا بھروسہ نہیں۔ ہاں، کوئی بھروسہ نہیں۔ میری بات مان لو، زندگانی کا کوئی بھروسہ نہیں، بس یہی کھانا کھلانا یاد رہ جائے گا۔ دھن دولت، جگہ زمین سب دھری رہ جائے گی۔

دو تاڑی والوں میں ایک دوسری بحث چھڑی ہوئی تھی۔

ہم تم رعایا ہیں بھائی۔ ہماری مجال ہے کہ سرکار کے سامنے سر اٹھاسکیں؟ اپنے گھر میں بیٹھ کر بادشاہ کو گالیاں دے لو، لیکن میدان میں آنا کٹھن ، کہاں کی بات بھیا، سرکار تو بڑی چیز ہے، لال پگڑی دیکھ کر تو گھر بھاگ جاتے ہو۔

چھوٹا آدمی بھر پیٹ کھاکے بیٹھتا ہے، تو سمجھتا ہے۔ اب بادشاہ ہمیں ہے، لیکن اپنی حیثیت کو بھولنا نہ چاہیے۔

بہت پکّی بات کہتے ہو خاں صاحب، اپنی اصلیت پر ڈٹے رہو۔ جو راجا ہے، وہ راجا ہے جو پرجا ہے ، وہ پرجا ہے۔ بھلا پرجا کہیں راجا ہو سکتا ہے؟

اتنے میں جے رام نے آکر کہا، رام رام بھائیو رام رام

پانچ چھ کھدر داری منسیوں کو دیکھ کر سبھی لوگ ان کی اور شنکا اور کوتوہل سے

تاکنے لگے۔ دوکان دار نے چپکے سے اپنے ایک نوکر کے کان میں کچھ کہا اور نوکر دوکان سے اتر کر چلا گیا۔

جے رام نے جھنڈے کو زمین پر کھڑا کر کے کہا، بھائیوں، مہاتما گاندھی کا حکم ہے کہ آپ لوگ تاڑی شراب نہ پییں۔ جو روپے آپ یہاں اڑا دیتے ہیں، وہ اگر اپنے بال بچوں کو کھلانے پلانے میں خرچ کریں تو کتنی اچھی بات ہو، ذرا دیر کے نشے کے لیے آپ اپنے بال بچوں کو بھوکوں مارتے ہیں، گندے گھروں میں رہتے ہیں، مہاجن کی گالیاں کھاتے ہیں، سوچیے، اس روپے سے آپ اپنے پیارے بچوں کو کتنے آرام سے رکھ سکتے ہیں۔

ایک بوڑھے شرابی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ بھیا، ہے تو بری چیز، گھر تباہ کرکے چھوڑ دیتی ہے۔ مودا اتنی عمر پیتے کٹ گئی، تو اب مرتے دم کیا چھوڑیں؟ اس کے ساتھی نے سرتھن کیا۔ پکی بات کہتے ہو چودھری۔ جب اتنی عمر پیتے کٹ گئی تو اب مرتے دم کیا چھوڑیں؟

جے رام نے کہا، واہ چودھری یہی تو عمر ہے چھوڑنے کی۔ جوانی تو دیوانی ہوتی ہے۔ اس وقت سب کچھ معاف ہے۔

چودھری نے تو کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن اس کے ساتھی نے جوکالا، موٹا، بڑی بڑی موچھوں والا آدمی تھا، سرل آپتی کے بھاؤ سے کہا، اگر پینا براہے، تو انگریز کیوں پیتے ہیں؟

جے رام وکیل تھا، اس سے بحث کرنا بھیڑ کے چھتے کو چھیڑنا تھا۔

بولا : یہ تم نے بہت اچھا سوال پوچھا بھائی۔ انگریزوں کے باپ۔ دادا بھی ڈیڑھ سو سال پہلے لٹیرے تھے۔ ہمارے تمھارے رشی منی تھے۔ لٹیروں کی سنتان پیئے، تو پینے دو۔ ان کے پاس نہ کوئی دھرم ہے نہ نیتی، لیکن رشیوں کی سنتان ان کا نقل کیوں کرے؟ ہم اور تم ان مہاتماؤں کی سنتان ہیں، جنھوں نے دنیا کو سکھایا، جنھوں نے دنیا کو آدمی بنایا۔ ہم اپنا دھرم چھوڑ بیٹھے، اسی کا پھل ہے کہ آج ہم غلام ہیں، لیکن ہم نے غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ایکا ایک تھانے دار اور چار پانچ کانسٹبل آ کھڑے ہوئے۔

تھانے دار نے چودھری سے پوچھا، یہ لوگ تم کو دھمکا رہے ہیں؟

چودھری نے کھڑے ہو کر کہا، نہیں حضور یہ تو ہمیں سمجھا رہی ہیں، کیسے پریم سے سمجھا رہے ہیں کہ واہ

تھانے دار نے جے رام سے کہا: اگر یہاں فساد ہوجائے تو آپ ذمے دار ہوں گے؟

جے رام : میں اس وقت تک ذمے دار ہوں، جب تک آپ نہ رہیں، آپ کا مطلب ہے کہ میں فساد کرنے آیا ہوں؟

میں یہ نہیں کہتا لیکن آپ آئے ہیں تو انگریزی سامراجیہ کی اٹل شکتی کا پریچیہ ضرور ہی دیجیے۔ جتنا میں اتچنا پھیلے گی۔ تب آپ پل پڑیں گے اور دس، بیس آدمیوں کو مار گرائیں گے۔وہی سب جگہ ہوتا ہے اور یہاں بھی ہوگا۔

سب انسپکٹر نے ہونٹ چبا کر کہا، میں آپ سے کہتا ہوں، یہاں سے چلے جائیے، ورنہ مجھے ضبط کی کاروئی کرنی پڑے گی۔

جے رام نے آوچل بھاؤ سے کہا، اورمیں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ مجھے اپنا کام کرنے دیجیے، میرے بہت سے بھائی یہاں جمع ہیں اور مجھے ان سے بات چیت کرنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا آپ کو۔

اس وقت تک سیکڑوں درشک جمع ہوگئے تھے۔ داروغہ نے افسروں سے پوچھے بغیر اور کوئی کاروائی کرنا اچت نہ سمجھا۔ اکڑتے ہوئے دکان پر گئے اور کرسی پر پاؤں رکھ کر بولے۔ یہ لوگ تو ماننے والے نہیں ہیں۔ دوکان دار نے گڑگڑا کر کہا۔ حضور میری تو بدھیا بیٹھ جائیں گی۔

داروغہ : دو چار غنڈے بلا کر بھگا کیوں نہیں دیتے؟ میں کچھ نہ بولوں گا۔ ہاں ذرا ایک بوتل اچھی سی بھیج دینا۔ کل نہ جانے کیا بھیج دیا، کچھ مزا ہی نہیں آیا۔

تھانے دار چلا گیا۔ تو چودھری نے اپنے ساتھی سے کہا۔ دیکھا کلّو تھانے دار کتنا بگڑ رہا تھا؟ سرکار چاہتی ہے کہ ہم لوگ خوب شراب پئیں۔ اور کوئی سمجھانے نہ پائے۔ شراب کا پیسہ بھی تو سرکار ہی میں جاتا ہے؟

کلّو نے درشنک بھاؤ سے کہا، ہر ایک بہانے سے پیسہ کھینچتے ہیں سب۔

چودھری : تو پھر کیا صلاح ہے؟ ہے تو بری چیز؟
کلو : بہت بری چیز ہے، بھیا، مہاتما جی کا حکم ہے، تو چھوڑ ہی دینا چاہیے۔
چودھری : اچھا تو یہ لو، آج سے اگر پیئے تو دوغلا۔

یہ کہتے ہوئے چودھری نے بوتل زمین پر پٹک دی۔ آدھی بوتل شراب زمین پر بہہ کر سوکھ گئی۔

جے رام کو شاید زندگی میں کبھی اتنی خوشی نہ ہوئی تھی، زور زور سے تالیاں بجا کر اچھل پڑے۔

اسی وقت دونوں تاڑی پینے والوں نے بھی، مہاتما جی کی جے، پکاری اور اپنی ہانڈی زمین پر پٹک دی، ایک سوئم سیوک نے لپک کر پھولوں کی مالا لی اور چاروں آدمیوں کے گلے میں ڈال دی۔

(۳)

سڑک کی پٹری پر کئی نشے باز بیٹھے ان چاروں آدمیوں کی طرف اس دربل بھکتی سے تاک رہے تھے، جو پُرسارتھ ہین منشیوں کا لکشن ہے۔

وہاں ایک بھی ایسا ویکتی نہ تھا جو انگریزوں کی مانس، مدرا یا تاڑی کو زندگی کے لیے انوار یہ سمجھتا ہو اور اس کے بغیر زندگی کی کلپنا بھی نہ کر سکے۔ سبھی نشے کو دوشیت سمجھتے تھے کیول ہونے کے کارن نت آکر پی جاتے تھے۔ چودھری جیسے گھاگھ پیکڑ کو بوتل پٹکتے دیکھ کر ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایک مریل داڑی والے آدمی نے آکر چودھری کی پیٹھ پر ٹھونکی۔ چودھری نے اسے پیچھے ڈھکیل کر کہا۔ پیٹھ کیا ٹھوکتے ہو جی، جاکر اپنی بوتل پٹک دو۔

داڑی والے نے کہا: آج اور پی لینے دو چودھری۔ اللہ جانتا ہے، کل سے ادھر بھول کر بھی نہ آؤں گا۔

چودھری جتنی بچی ہو، اس کے پیسے ہم سے لے لو، گھر جاکر بچوں کو مٹھائی کھلا دینا۔

داڑھی والے نے جاکر بوتل پٹک دی اور بولا۔ تو تم بھی کیا کہوگے؟ اب تو

ہوئے خوش۔

چودھری : اب تو نہ پئیں گے کبھی۔

داڑھی والے نے کہا: اگر تم نہ پیئو گے، تو میں بھی نہ پیوں گا، جس دن تم نے پی اسی دن پھر شروع کر دی۔

چودھری کی تتپرتا (مستعدی) نے دوراگرہ کی جڑیں ہلا دی۔ باہر ابھی پانچ چھ آدمی اور تھے۔ وہ نے سنچیت نرلجتا سے بیٹھے ہوئے ابھی تک پیتے جاتے تھے جے رام نے ان کے سامنے جاکر کہا۔ بھائیو، آپ کے پانچ بھائیوں نے ابھی آپ کے سامنے اپنی اپنی بوتل پٹک دی۔ کیا! ان لوگوں کو بازی جیت لے جانے دیں گے؟ ایک ٹھگنے کالے آدمی نے جو کسی انگریز کا خان ساما معلوم ہوتا تھا۔ لال لال آنکھیں نکال کر کہا۔ ہم پیتے ہیں تم سے مطلب؟ تم سے بھیک مانگنے تو نہیں جاتے؟

جے رام نے سمجھ لیا، اب بازی مار لی، گمراہ آدمی جب وواد کرنے پر اتر آئے تو سمجھ لو وہ راستے پر آجائے گا۔ چپا عیب وہ چکنا گھڑا ہے جس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔

جے رام نے کہا اگر میں اپنے گھر میں آگ لگاؤں تو اسے دیکھ کر کیا آپ میرا ہاتھ نہ پکڑ لیں گے؟ مجھے تو اس میں رتّی بھر سندیہ نہیں ہے کہ آپ میرا ہاتھ ہی نہ پکڑ لیں گے، بلکہ مجھے وہاں سے زبردستی کھینچ لے جائیں گے۔

چودھری نے خان ساماں کی طرف مگدھ آنکھوں سے دیکھا مانو کہہ رہا ہے اس کا تمھارے پاس کیا جواب ہے؟اوربولا جمع دار، اب اسی بات پر بوتل پٹک دو۔

خان ساماں نے جیسے کاٹ کھانے کے لیے دانت تیز کر لیے اور بولا: بوتل کیوں پٹک دوں، پیسے نہیں دیے ہیں۔

چودھری پراست ہوگیا۔ جے رام سے بولا: انھیں چھوڑیے بابوجی یہ لوگ اس طرح ماننے والے اسامی نہیں ہیں۔ آپ ان کے سامنے جان بھی دے دیں تو بھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ ہاں پولس کی ایک گھڑکی پا جائیں تو پھر کبھی ادھر بھول کر بھی نہ آئیں۔

خان ساماں نے چودھری کی اور ترسکار کے بھاؤ سے دیکھا، جیسے کہہ رہا ہو، کیا

تم سمجھتے ہو کہ میں ہی منشیہ ہوں، یہ سب پشو ہیں؟ پھر بولا، تم سے کیا مطلب ہے جی، کیوں بیچ میں کود پڑتے ہو، میں تو بابو.جی سے بات کر رہاہوں، تم کون ہوتے ہو بیچ میں بولنے والے؟ میں تمھاری طرح نہیں ہوں کہ بوتل پٹک کر واہ۔ واہ کرآؤں۔ کل پھر منہ میں کالکھ لگاؤں، گھر پر منگوا کر پیوں؟

جب یہاں چھوڑیں گے تو سچے دل سے چھوڑیں گے، پھر کوئی لاکھ روپے بھی دے تو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں۔

جے رام : مجھے آپ لوگوں سے ایسی ہی آشاہے۔

چودھری نے خان ساماں کی اور کٹاکش کر کے کہا، کیا سمجھتے ہو؟ میں کل پھر پینے آؤں گا؟

خان ساماں نے اونڈتا سے کہا۔ ہاں ہاں کہتا ہوں، تم آؤگے تو بدکر آؤگے کہو پکے کاغذ پر لکھ دوں۔

چودھری: اچھا بھائی، تم بڑے دھرماتما ہو، میں پاپی سہی۔ تم چھوڑوں گے تو زندگی بھر کے لیے چھوڑوگے، میں آج چھوڑ کر کل پھر پینے لگوں گا یہی سہی۔

میری ایک بات گانٹھ باندھ لو۔ تم اس وقت چھوڑوگے جب زندگی تمھارا ساتھ چھوڑ دے گی۔ اس کے پہلے تم نہیں چھوڑ سکتے۔

خان ساماں : تم میرے دل کا حال کیا جانتے ہو؟

چودھری : جانتا ہوں تمھارے جیسے سیکڑوں آدمی کو بھگت چکا ہوں۔

خان ساماں : تو تم نے ایسے ویسے بے شرموں کو دیکھا ہوگا۔ حیادار آدمیوں کو نہ دیکھا ہوگا۔

یہ کہتے ہوئے اس نے جاکر بوتل پٹک دی اور بولا۔ اب اگر تم اس دوکان پر دیکھنا تو منہ میں کالکھ لگا دینا۔

چاروں طرف تالیاں بجنے لگیں۔ مرد ایسے ہوتے ہیں۔

ٹھیکہ دار نے دوکان کے نیچے اتر کر کہا، تم لوگ اپنی اپنی دوکان پر کیوں نہیں جاتے جی؟ میں تو کسی کے دوکان پر نہیں جاتا؟

ایک درشک نے کہا: کھڑے ہیں توتم سے مطلب؟سڑک تمھاری نہیں ہے؟

تم غریبوں کو لوٹے جاؤ کسی کے بال بچے بھوکوں مرے تمھارا کیا بگڑتا ہے۔

(دوسرے شرابیوں) سے کیا یارو، اب بھی پیتے جاؤگے۔ جانتے ہو، یہ کس کا حکم ہے؟ ارے کچھ بھی تو شرم ہو؟

جے رام نے درشکوں سے کہا: اب لوگ یہاں بھیڑ نہ لگائیں اور نہ کسی کو بھلا برا کہیں؟

مگر درشکوں کا سموہ بڑھتا جاتا تھا۔ ابھی تک چار پانچ آدمی بے غم بیٹھے ہوئے کلہڑ پر کلہڑ چڑھا رہے تھے۔ ایک منچلے آدمی نے جاکر اس بوتل کو اٹھالیا، جو ان کے بیچ میں رکھی ہوئی تھی اور اسے پٹکنا چاہتا تھا کہ چاروں شرابی اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے پیٹنے لگے۔ جے رام اور اس کے سوئم سیوک ترنت وہاں پہنچ گئے اور اسے بچانے کی چیشٹا کرنے لگے کہ چاروں اسے چھوڑ کر جے رام کی طرف لپکے۔ درشکوں نے دیکھا کہ جے رام پر مار پڑا چاہتی ہے، تو کئی آدمی جھلا کر ان چاروں شرابیوں پر ٹوٹ پڑے لاتیں، گھونسے اور ڈنڈے چلانے لگے۔ جے رام کو اس کا کچھ اوسر نہ ملتا تھا کہ کسی کو سمجھائے۔ دونوں ہاتھ پھیلائے ان چاروں کے واروں سے بچ رہا تھا۔ وہ چاروں بھی آپ سے باہر ہو کر درشکوں پر ڈنڈے چلا رہے تھے۔ جے رام دونوں طرف سے مار کھاتا تھا شرابیوں کے وار بھی اس پر پڑتے تھے، تماشائیوں کے وار بھی اسی پر پڑتے تھے، پر وہ ان کے بیچ سے ہٹتا نہ تھا۔ اگر وہ اس وقت اپنی جان بچا کر ہٹ جاتا، تو شرابیوں کی خیریت نہ تھی۔ اس کا دوش کانگریس پر پڑتا۔ وہ کانگریس کو اس آکشیب سے بچانے کے لیے اپنے پران دینے پر تیار تھا۔ مسز سکسینا کو اپنے اوپر ہنسنے کا وہ موقع نہ دینا چاہتا تھا۔

آخر اس کے سر پر ڈنڈا اور زور سے پڑا کہ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں کے سامنے تتلیاں اڑنے لگی۔ پھر اسے ہوش نہ رہا۔

(۴)

جے رام ساری رات بے ہوش پڑا رہا۔ دوسرے دن صبح کو جب اسے ہوش آیا تو ساری دیہہ میں پیڑا ہو رہی تھی۔ اور کمزوری اتنی تھی کہ رہ رہ کر جی ڈوبتا جاتا

تھا۔ ایکا ایک سرہانے کی طرف آنکھ اٹھ گئی۔ تو مسز سکسینا بیٹھی نظر آئی۔ انھیں دیکھتے ہی سویم سیوکوں کے منع کرنے پر بھی اٹھ بیٹھا۔ درد اور کمزوری دونوں جیسے غائب ہوگئی۔ ایک ایک انگ میں سپورتی دوڑ آئی۔

مسز سکسینا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ آپ کو بڑی چوٹ آئی۔ اس کا سارا دوش مجھ پر ہے۔

جے رام نے بھکتی مے کرتگیتا کے بھاؤ سے دیکھ کر کہا، چوٹ تو ایسی زیادہ نہ تھی، ان لوگوں نے بربس پٹی پٹی باندھ کر زخمی بنا دیا۔ مسز سکسینا نے گلانت ہو کر کہا۔ مجھے آپ کو نہ جانے دینا چاہیے تھا۔

جے رام : آپ کا وہاں جانا اچت نہ تھا۔ میں آپ سے اب بھی یہی انورودھ کروں گا کہ اس طرف نہ جائیے گا۔

مسز سکسینا نے جیسے ان بادھاؤں پر ہنس کر کہا۔ واہ۔ مجھے آج سے وہاں فیکٹ کرنے کی آگیا مل گئی۔

آپ میری اتنی ونئے مان جائے گا۔ شہدوں کے لیے آواز کسنا بالکل معمولی بات ہے۔

میں آوازوں کی پرواہ نہیں کرتی

تو پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔

آپ اس حالت میں؟ مسز سکسینا نے آشچریہ سے کہا۔

میں بالکل اچھا ہوں سچ۔

یہ نہیں ہوسکتا، جب تک ڈاکٹر یہ نہ کہہ دے گا کہ اب آپ وہاں جانے کے یوگیہ ہیں، آپ کو نہ جانے دوں گی۔ کسی طرح نہیں۔

تو میں بھی آپ کو نہ جانے دوں گا۔

مسز سکسینا نے مردُ وینگ (طعنہ طنز) کے ساتھ کہا۔ آپ بھی انیہ پروشوں ہی کی بھانتی سوارتھ کے پتلے ہیں۔ سدایش خود لوٹنا چاہتے ہیں۔ عورتوں کو کوئی موقع نہیں دینا چاہتے۔ کم سے کم یہ تو دیکھ لیجیے کہ میں بھی کچھ کرسکتی ہوں یا نہیں۔

جے رام نے ویتھت کنٹھ سے کہا : جیسی آپ کی اچھا۔

(۵)

تیسرے پہر مسز سکسینا چار سویم سیوکوں کے ساتھ بیگم گنج چلی۔ جے رام آنکھیں بند کئے چارپائی پر پڑا تھا۔ شور سن کر چونکا اور اپنی استری سے پوچھا۔ یہ کیسا شور ہے؟

استر نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور بولی۔ وہ عورت جو کل آئی تھی جھنڈا لیے کئی آدمیوں کے ساتھ جارہی ہے۔ اسے شرم بھی نہیں آتی۔

جے رام نے اس کے چہرے پر چھما کی درشٹ ڈالی اور وچار میں ڈوب گیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا، میں بھی وہیں جاتا ہوں۔

استری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ابھی کل مار کھاکر آئے ہو آج پھر جانے کی سوجھی۔

جے رام نے ہاتھ چھڑا کر کہا۔ تم اسے مار کہتی ہو، میں اسے اپہار سمجھتی ہوں۔

استری نے اس کا راستہ روک لیا۔ کہتی ہوں، تمھارا جی اچھا نہیں ہے، مت جاؤ، کیوں میری جان کے گاہک ہوئے ہو؟ اس کے دیہہ میں ہیرے نہیں جڑے ہیں جو وہاں کوئی نوچ لے گا۔

جے رام نے منت کر کے کہا: میری طبیعت بالکل اچھی ہے چمو۔ اگر کچھ کسر ہے تو وہ بھی مٹ جائے گی۔ بھلا سوچو یہ کیسے ممکن ہے کہ دیوی ان شہدوں کے بیچ میں پیکٹنگ کرنے جائے اورمیں بیٹھا رہوں۔ میرا وہاں رہنا ضروری ہے۔ اگر کوئی بات آ پڑی تو کم سے کم میں لوگوں کوسمجھا تو سکوں گا۔

چمو نے جل کر کہا: یہ کیوں نہیں کہتے کہ کوئی اور ہی چیز کھینچے لیے جاتی ہے۔

جے رام نے مسکرا کر اس کی اور دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ یہ بات تمھارے دل سے نہیں کنٹھ سے نکل رہی ہے اورکترا کر نکل گیا۔ پھر دوار پر کھڑا ہوکر بولا شہر میں تین لاکھ سے کچھ ہی کم آدمی ہیں کمیٹی میں بھی تیس ممبر ہیں مگر سب کے سب جی چرا رہے ہیں۔ لوگوں کو اچھا بہانا مل گیا کہ شراب خانوں پر دھرنا دینے کے

لیے استریوں ہی کی ضرورت ہے۔ آخر کیوں استری ہی کو اس کام کے لیے اُپیکت سمجھا جاتا ہے؟ اسی لیے کہ مردوں کے سر بھوت سوار ہوجاتا ہے اور جہاں نرمتا سے کام لینا چاہیے۔ وہاں لوگ اگرتا سے کام لینے لگتے ہیں۔ وے دیویاں کیا اسی یوگیہ ہیں کہ شہدوں کے فقرے سنے اور ان کی کدرشٹ کا نسانہ بنے؟ کم سے کم میں یہ نہیں دیکھ سکتا وہ لنگڑاتا ہوا گھر سے نکل پڑا۔ چمو نے پھر اسے روکنے کا پریاس نہیں کیا۔ راستے میں ایک سویم سیوک مل گیا ۔ جے رام نے اسے ساتھ لیا اور ایک تانگے پر بیٹھ کر چلا۔ شراب خانے سے کچھ دور ادھر ایک لیمنڈ برف کی دوکان تھی۔ اس نے تانگے کو چھوڑ دیا والنٹیر کو شراب خانے بھیج کر خود اسی دوکان میں جا بیٹھا۔

دوکان دار نے لیمنڈ کا ایک گلاس اسے دیتے ہوئے کہا: بابو جی کل والے چاروں بدمعاش آج پھر آئے ہوئے ہیں۔ آپ نے نہ بچایا ہوتا تو آج شراب یا تاڑی کی جگہ ہلدی گڑ پیتے ہوتے جے رام نے گلاس لے کر کہا۔ بیچ میں نہ کود پڑتے تو میں نے ان سبھوں کو ٹھیک کر لیا ہوتا۔ دوکان نے پرتی واد کیا۔ نہیں بابو جی وہ سب چھٹے ہوئے غنڈے ہیں۔ میں تو انھیں اپنی دوکان کے سامنے کھڑا بھی نہیں ہونے دیتا، چاروں تین تین سال کاٹ آئے ہیں۔

ابھی بیس منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ ایک سویم سیوک آکر کھڑا ہوگیا۔

جے رام نے سچنت ہو کر پوچھا۔ کہو وہاں کیا ہورہا ہے؟

سویم سیوک نے کچھ ایسا منہ بنا لیا، جیسے وہاں کی دشا کہنا وہ اچت نہیں سمجھتا اور بولا کچھ نہیں، دیوی جی آدمیوں کو سمجھا رہی ہیں۔

جے رام نے اس کی اور اترپت نیتروں سے تاکا، مانو کہہ رہا ہو، بس اتنا ہی، تو میں جانتا ہی تھا۔

سیوم سیوک نے ایک چھڑ بعد پھر کہا۔ دیویوں کا ایسے شہدوں کے سامنے جانا اچھا نہیں۔

جے رام نے آدھیر ہو کر پوچھا۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کیا بات ہے۔

سویم سیوک ڈرتے ڈرتے بولا۔ سب کے سب ان سے دل لگی کر رہے ہیں۔ دیویوں کا یہاں آنا اچھا نہیں۔

جے رام نے اور کچھ نہ پوچھا۔ ڈنڈا اٹھایا اور لال لال آنکھیں نکلائے بجلی کی طرح کوندھ کر شراب خانے کے سامنے جا پہنچا اور مسز سکسینا کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے ہٹاتا ہوا شرابیوں سے بولا۔ اگر تم لوگوں نے دیویوں کے ساتھ ذرا بھی گستاخی کی، تو تمھارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ کل میں نے تم لوگوں کی جان بچائی تھی آج اسی ڈنڈے سے تمھاری کھوپڑی توڑ کر رکھ دوں گا۔

اس کے بدلے ہوئے تیور کو دیکھ کر سب کے سب نشے باز گھبرا گئے۔ وے کچھ کہنا چاہتے تھے کہ مسز سکسینا گمبھیر بھاؤ سے پوچھا۔ آپ یہاں کیوں آئے؟ میں نے تو آپ سے کہا تھا، اپنی جگہ سے نہ ہلیے گا۔ میں نے تو آپ سے مدد نہ مانگی تھی؟

جے رام لجت ہو کر کہا: میں اسی نیت سے یہاں نہیں آیا تھا۔ ایک ضرورت سے ادھر آنکلا تھا۔ یہاں جماؤ دیکھ کر آگیا۔ میرے خیال میں آپ اب یہاں سے چلیں۔ میں آج کانگریس کمیٹی میں یہ سوال پیش کروں گا کہ اس کام کے لیے پُرشوں کو بھیجیں۔

مسز سکسینا نے تیکھے سور میں کہا: آپ کے وچار میں دنیا کے سارے کام مردوں کے لیے ہے۔

جے رام : میرا یہ مطلب نہ تھا۔

مسزسکسینا : تو آپ جاکر آرام سے لیٹیں۔ اور مجھے اپنا کام کرنے دیں۔ جے رام وہیں سر جھکائے کھڑا رہا۔

مسز سکسینا نے پوچھا۔ میں بھی یہی ایک کنارے کھڑا رہوں گا۔

مسز سکسینا نے کٹھور سور میں کہا: جی نہیں ، آپ جایئے۔ جے رام دھیرے دھیرے لدی ہوئی گاڑی کی بھانتی چلا اور آکر پھر اسی لیمنڈ کی دوکان پر بیٹھ گیا۔ اسے جور کی پیاس لگی تھی۔ اس نے ایک گلاس شربت بنوایا اور سامنے میز پر رکھ کر وچار میں ڈوب گیا مگر آنکھیں اور کان اسی طرف لگے ہوئے تھے۔

جب کوئی آدمی دوکان پر آتا، وہ چونک کر اسی طرف تاکنے لگتا وہاں کوئی نئی بات تو نہیں ہوگئی؟

کوئی آدھ گھنٹے بعد وہی سویم سیوک پھر ڈرا ہوا سا آکر کھڑا ہو گیا۔ جے رام نے اداسین بننے کی چیشٹا کرکے پوچھا۔ وہاں کیا ہو رہا ہے جی؟

سویم سیوک نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا: میں کچھ نہیں جانتا بابو جی مجھ سے کچھ نہ پوچھیے۔

جے رام نے ایک ساتھ ہی نرم اور کٹھور ہو کر پوچھا۔ پھر کوئی چھیڑ چھاڑ ہوئی؟

سویم سیوک: جی نہیں کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں ہوئی۔ ایک آدمی نے دیوی جی کو دھکا دے دیا۔ وے گر پڑیں۔

جے رام نسپند بیٹھا رہا۔ پر اس انترال میں بھوکمپ سا مچا ہوا تھا۔

بولا : ان کے ساتھ کے سویم سیوک کیا کر رہے ہیں؟

کھڑے ہیں، دیوی جی انھیں بولنے ہی نہیں دیتیں۔

تو کیا بڑے زور سے دھکا دیا؟

جو ہاں گر پڑی۔ گھٹنوں میں چوٹ آگئی۔ وے آدمی ساتھ پی رہے تھے۔ جب ایک بوتل اڑگئی تو ان میں سے ایک آدمی دوسری بوتل لینے چلا۔ دیوی جی نے راستہ روک لیا بس اس نے دھکا دے دیا وہی جو کالا کالا موٹا سا آدمی ہے۔ کل والے چاروں آدمیوں کی شرارت ہے۔

جے رام انماد کی دِشا میں وہاں سے اٹھا اور دوڑتا ہوا شراب خانے کے سامنے آیا۔ مسز سکسینا سر پکڑے زمین پر بیٹھی ہوئی تھی اور وہ کالا موٹا آدمی دوکان کے کٹھ گھرے کے سامنے کھرا تھا۔ پچاسوں آدمی جمع تھے۔ جے رام نے اسے دیکھتے ہی لپک کر اس کی گردن پکڑ لی اور اتنے زور سے دبائی کہ اس کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔ معلوم ہوتا تھا اس کے ہاتھ فولاد کے ہوگئے ہیں۔

سہسا مسز سکسینا نے آکر اس کا فولاد ہاتھ پکڑ لیا اور بھنویں سکوڑ کر بولی: چھوڑ دو اس کی گردن کیا اس کی جان لے لوگے؟

جے رام نے اور زور سے اس کی گردن دبائی اور بولا: ہاں، لے لوں گا؟ اسے دُشٹ کی یہی سزا ہے۔

مسز سکسینا نے ادھکار غرو سے گردن اٹھا کر کہا آپ کو یہاں آنے کا کوئی ادھکار نہیں ہے۔

ایک درشک نے کہا: ایسا دباؤ بابو جی کہ سالا ٹھنڈا ہو جائے۔ اس نے دیوی جی کو ایسا ڈھکیلا کہ بے چاری گر پڑیں۔ ہمیں تو بولنے کا حکم نہیں ہے، نہیں تو ہڈی توڑ کر رکھ دیتے، جے رام نے شرابی کی گردن چھوڑ دی۔ وہ کسی باز کی چنگل سے چھٹی ہوئی چڑیا کی طرح سہما ہوا کھڑا ہوگیا۔ اسے ایک دھکا دیتے ہوئے اس نے مسز سکسینا سے کہا: آپ یہاں سے چلتی کیوں نہیں، آپ جائیں میں بیٹھتا ہوں، اگر ایک چھٹانک شراب بک جائے تو میرا کان پکڑ لیجیے گا۔ اس کا دم پھولنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھارہا تھا وہ کھڑا نہ رہ سکا۔ زمین پر بیٹھ کر رومال سے ماتھے کا پسینہ پوچھنے لگا۔

مسز سکسینا نے پریہاس کر کے کہا: آپ کانگریسی نہیں ہیں کہ میں آپ کا حکم مانوں۔ اگر آپ یہاں سے نہ جائیں تو میں ستیاگرہ کروں گی۔

پھر ایکا یک کٹھور ہو کر بولی: جب تک کانگریس نے اس کام کا بھار مجھ پر رکھا ہے، آپ کو میرے بیچ میں بولنے کا کوئی حق نہیں ہے آپ میرا اپمان کر رہے ہیں۔ کانگریس کمیٹی کے سامنے آپ کو اس کا جواب دینا ہوگا۔

جے رام تلملا اٹھا: بنا کوئی جواب دیئے لوٹ پڑا اور ویگ سے گھر کی طرف چلا، پر جیوں جیوں آگے بڑھتا تھا اس کی گتی مند ہوتی جاتی تھی، یہاں تک کی بازار کے دوسرے سرے پر آکر وہ رک گیا۔ رسی یہاں ختم ہوگئی۔ اس کے آگے جانا اس کے لیے اسادیہ ہوگیا۔ جس جھٹکے نے اسے یہاں تک بھیجا تھا اس کی شکتی اب شیش ہوگئی تھی۔ ان شبدوں میں جو کٹتا اورچوٹ تھی اس میں اب اسے سہانوبھوتی اور سنیہہ کی سوگند آرہی تھی

اسے پھر چنتا ہوئی نہ جانے وہاں کیا ہورہا ہے۔ کہیں ان بدمعاشوں نے اور کوئی دشٹتا نہ کی ہو، یا پولس نہ آجائے۔

وہ بازار کی طرف مڑا لیکن ایک قدم ہی چل کر پھر رک گیا ایسے پس و پیش میں وہ کبھی نہ پڑا تھا۔

سہسا سے وہیں سویم سیوک دوڑتا آتا دکھائی دیا۔ وہ بدحواس ہو کر اس سے ملنے کے لیے خود بھی اس کی طرف دوڑا، بیچ میں دونوں مل گئے۔

جے رام نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔ کیا ہوا؟ کیوں بھاگے جا رہے ہو؟

سویم سیوک نے دم لے کر کہا: بڑا غضب ہوگیا بابو جی۔ آپ کے آنے کے بعد وہ کالا شرابی بوتل لے کر دوکان سے چلا تو دیوی جی دروازے پر بیٹھ گئی۔ بار بار دیوی جی کو ہٹا کر نکلنا چاہتا ہے، پر وہ پھر آکر بیٹھ جاتی ہے۔ دھکم دھکے میں ان کے کچھ کپڑے پھٹ گئے ہیں اور کچھ چوٹ بھی............

ابھی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ جے رام شراب خانے کی طرف دوڑا۔

(۶)

جے رام شراب خانے کے سامنے پہنچا تو دیکھا، مسز سکسینا کے چاروں سویم سیوک دوکان کے سامنے لیٹے ہوئے ہیں اور مسز سکسینا ایک کنارے سر جھکائے کھڑی ہیں۔ جے رام نے ڈرتے ڈرتے ان کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ آنچل پر رکت کی بوندیں دکھائی دی اسے پھر کچھ سدھ نہ رہی خون کی وہ چنگاریاں جیسے اس کے روم روم میں سما گئی۔ اس کا خون کھولنے لگا مانو اس کے سر خون ہوگیا ہو، وہ ان چاروں شرابیوں پر ٹوٹ پڑا اور پورے زور کے ساتھ لکڑی چلانے لگا۔ ایک ایک بوند کی جگہ وہ ایک ایک کھڑا خون بہا دینا چاہتا تھا۔ خون اسے کبھی اتنا پیارا نہ تھا خون میں اتنی آنچینا ہے اس کی اسے خبر نہ تھی۔

وہ پورے زور سے لکڑی چلا رہا تھا۔ مسز سکسینا کب آکر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی اسے کچھ پتا نہ چلا۔ جب وہ زمین پر گر پڑی، تب اسے جیسے ہوش آگیا ہو۔ اس نے لکڑی پھینک دی اور وہیں نشچل، نسپند کھڑا ہوگیا، مانو اس کا رکت پرواہ رک گیا ہو۔

چاروں سویم سیوک نے دوڑ کر مسز سکسینا کو پنکھا جھلنا شروع کیا۔ دوکان دار ٹھنڈا پانی لے کر دوڑا۔ ایک درشک ڈاکٹر کو بلانے بھاگا، پر جے رام وہیں بے جان کھڑا تھا۔ جیسے سویم اپنے ترسکار بھاؤ کا پتلا بن گیا ہو۔ اگر اس وقت کوئی اس

کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالتا ، کوئی اس کی آنکھیں لال لوہے سے پھوڑ دیتا، تب بھی وہ چوں نہ کرتا۔

پھر وہیں سڑک پر بیٹھ کر اس نے اپنے لجّت ، ترسکار پراجت مستک کو بھومی پر پٹک دیا اور بے ہوش ہو گیا۔

اسی وقت اس کالے موٹے شرابی نے بوتل زمین پر پٹک دی اور اس کے سر پر ٹھنڈا پانی ڈالنے لگا۔

ایک شرابی نے لیسنس دار سے کہا: تمھارا روزگار اتنے لوگوں کی جان لے کر رہے گا۔ یہ تو ابھی دوسرا ہی دن ہے۔

لیسنس دار نے کہا: کل سے میرا استعفیٰ ہے۔ اب سودیشی کپڑے کا روزگار کروں گا، جس میں جَس بھی ہے اور اُپہار بھی۔

شرابی نے کہا: گھاٹا تو بہت رہے گا۔

دوکان دار نے قسمت ٹھونک کر کہا: گھاٹا نفع تو زندگانی کے ساتھ ہے۔

یہ افسانہ اردو رسالہ نیرنگ خیال کے 1931 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس سے قبل مئی 1930 میں ہندی کے ماہنامہ ہنس میں شائع ہوا۔ مانسروور نمبر 7 میں شامل ہے۔

پُوس کی رَات!

(۱)

ہلکو نے آ کر اپنی بیوی سے کہا۔'' شہنا آیا ہے لاؤ جو روپے رکھے ہیں اسے دے دو۔ کسی طرح گردن تو چھوٹے۔''

منی بہو جھاڑو لگا رہی تھی۔ پیچھے پھر کر بولی: تین ہی تو روپے ہیں دے دو تو کمبل کہاں سے آئے گا۔ ماگھ پوس کی رات کھیت میں کیسے کٹے گی۔اس سے کہہ دو فصل پر روپے دے دیں گے۔ ابھی نہیں ہے۔''

ہلکو تھوڑی دیر تک چپ کھڑا رہا اور اپنے دل میں سوچتا رہا پوس سر پر آ گیا بغیر کمبل کے کھیت میں رات کو وہ کسی طرح سو نہیں سکتا۔ مگر شہنا مانے گا نہیں، گھڑکیاں دے گا۔ گالیاں سنائے گا۔ بلا سے جاڑوں میں مریں گے۔ یہ بلا تو سر سے ٹل جائے گی۔یہ سوچتا ہوا وہ اپنا بھاری جسم لیے ہوئے جو اس کے نام کو غلط ثابت کر رہا تھا اپنی بیوی کے پاس گیا۔ اور خوشامد کر کے بولا۔ ''لا دے دے گردن تو کسی طرح سے بچے کمبل کے لیے کوئی دوسری تدبیر سوچوں گا۔

منی اس کے پا س سے دور ہٹ گئی اور آنکھیں ٹیڑھی کر تی بولی۔''کر چکے دوسری تدبیر۔ ذرا سنوں کون تدبیر کروگے؟ کون کمبل خیرات میں دیدے گا۔ نہ جانے کتنا روپیہ باقی ہے جو کسی طرح ادا ہی نہیں ہوتا۔ میں کہتی ہوں تم کھیتی کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔مر مر کر کام کرو۔ پیداوار ہو تو اس سے قرضہ ادا کرو۔ چلو چھٹی

ہوئی قرضہ ادا کرنے کے لیے تو ہم پیدا ہی ہوئے ہیں۔ ایسی کھیتی سے باز آئے۔ میں روپے نہ دوں گی نہ دوں گی۔''

ہلکو رنجیدہ ہو کر بولا۔'' تو کیا گالیاں کھاؤں۔''

منی نے کہا۔'' گالیاں کیوں دے گا؟ کیا اس کا راج ہے؟ مگر یہ کہنے کے ساتھ ہی اس کی تنی ہوئی بھویں ڈھیلی پڑگئیں۔ ہلکو کی بات میں جو دل ہلا دینے والی صداقت تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی جانب ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس نے طاق پر سے روپے اٹھائے اور لاکر ہلکو کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ پھر بولی تم اب کی کھیتی چھوڑ دو۔ مزدوری میں سکھ سے ایک روٹی تو کھانے کو ملے گی۔ کسی کی دھونس تو نہ رہے گی۔ اچھی کھیتی ہے۔ مزدوری کر کے لاؤ وہ بھی اس میں جھونک دو۔ اس پر سے دھونس۔''

ہلکو نے روپے لیے اور اس طرح باہر چلا کہ معلوم ہو تا تھا۔ وہ اپنا کلیجہ نکال کر دینے جا رہا ہے۔ اس نے ایک ایک پیسہ کاٹ کر تین روپے کمبل کے لیے جمع کیے تھے۔ وہ آج نکلے جا رہے ہیں۔ ایک ایک قدم کے ساتھ اس کا دماغ اپنی ناداری کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔

(۲)

پوس کی اندھیری رات۔ آسمان پر تارے بھی ٹھٹھرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہلکو اپنے کھیت کے کنارے اوکھ کے پتوں کی ایک چھتری کے نیچے بانس کے کھٹولے پر اپنی پرانی گاڑھے کی چادر اوڑھے ہوئے کانپ رہا تھا۔ کھٹولے کے نیچے اس کا ساتھی کتا ''جبرا'' پیٹ میں منہ ڈالے سردی سے کوں، کوں، کر رہا تھا۔ دو میں سے ایک کو بھی نیند نہ آتی تھی۔

ہلکو نے گھٹنوں کو گردن میں چمٹاتے ہوئے کہا۔'' کیوں جبرا جاڑا لگتا ہے کہا تو تھا۔ گھر میں پیال پر لیٹ رہ۔ تو یہاں کیا لینے آیا تھا۔ اب کھا سردی میں کیا کروں۔ جانتا تھا میں حلوہ پوری کھانے آرہا ہوں۔ دوڑتے ہوئے آگے چلے آئے۔ اب روؤ اپنے نانی کے نام کو'' جبرا نے لیٹے ہوئے دم ہلائی اور ایک انگڑائی لے کر

چپ ہو گیا۔ شاید وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی کون، کون، کی آواز سے اس کے مالک کو نیند نہیں آ رہی ہے۔

ہلکو نے ہاتھ نکال کر جبرا کی ٹھنڈی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔'' کل سے میرے ساتھ نہ آنا نہیں تو ٹھنڈے ہو جاؤگے۔ یہ رانڈ پچھوا ہوا نہ جانے کہاں سے برف لیے آ رہی ہے۔۔ اٹھوں پھر ایک چلم بھروں۔ کسی طرح رات تو کٹے۔ آٹھ چلم تو پی چکا۔ یہ کھیتی کا مزہ ہے اور ایک بھاگوان ایسے ہیں جن کے پاس اگر جاڑا جائے تو گرمی سے گھبرا کر بھاگے۔ موٹے گدّے، لحاف، کمبل، مجال ہے کہ جاڑے کا گزر ہو جائے۔ تقدیر کی خوبی ہے۔ مزدوری ہم کریں۔ مزہ دوسرے لوٹیں۔''

ہلکو اٹھا اور گڈھے میں سے ذرا سی آگ نکال کر چلم بھری جبرا بھی اٹھ بیٹھا۔ ہلکو نے چلم پیتے ہوئے کہا۔پیئے گا چلم؟ جاڑا تو کیا جاتا ہے۔ ہاں ذرا من بہل جاتا ہے۔

جبرا نے اس کی جانب محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ہلکوں نے کہا۔ ''آج اور جاڑا کھالے۔ کل سے میں یہاں پیال بچھا دوں گا۔ اس میں گھس کر بیٹھنا جاڑا نہ لگے گا۔

جبرا نے اگلے پنجے اس کی گھٹنیوں پر رکھ دیے۔ اور اس کے منہ کے پاس اپنا منہ لے گیا۔ ہلکو کو اس کی گرم سانس لگی۔ چلم پی کر ہلکو پھر لیٹا اور یہ طے کر لیا۔ کہ چاہے جو کچھ ہو اب کی سوجاؤں گا لیکن ایک لمحہ میں اس کا کلیجہ کانپنے لگا۔ کبھی اس کروٹ لیٹا کبھی اس کروٹ۔ جاڑا کسی بھوت کی مانند اس کی چھاتی کو دبائے ہوئے تھا۔ جب کسی طرح نہ رہا گیا۔ تو اس نے جبرا کو دھیرے سے اٹھایا۔ اور اس کے سر کو تھپ تھپا کر اسے اپنی گود میں سلا لیا۔ کتے کے جسم سے معلوم نہیں کیسی بدبو آ رہی تھی۔ پر اسے اپنی گود سے چمٹا تے ہوئے ایسا سکھ معلوم ہوتا تھا جو ادھر مہینوں سے اسے نہ ملا تھا۔ جبرا شاید یہ خیال کر رہا تھا کہ بہشت یہی ہے۔ اور ہلکوں کی روح اتنی پاک تھی کہ اس کو کتے سے بالکل نفرت نہ تھی وہ اپنی غریبی سے پریشان تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اس حالت کو پہنچ گیا تھا۔ ایسی انوکھی دوستی نے اس کی روح کے سب دروازے کھول دیے تھے۔ اور اس کا ایک ایک ذرّہ حقیقی روشنی

سے منور ہو گیا تھا۔ اسی اثنا میں جبرا نے کسی جانور کی آہٹ پائی۔ اس کے مالک کی اس خاص روحانیت نے اس کے دل میں ایک جدید طاقت پیدا کر دی تھی۔ جو ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کو بھی نا چیز سمجھ رہی تھی۔ وہ چھپٹ کر اٹھا اور چھپری سے باہر آکر بھونکنے لگا۔ہلکو نے اسے کئی مرتبہ پچکاکر بلایا پر وہ اس کے پاس نہ آیا۔ کھیت میں چاروں طرف دوڑ دوڑ کر بھونکتا رہا۔ ایک لمحہ کے لیے آ بھی جاتا تو فوراً ہی پھر دوڑتا۔ فرض کی ادائیگی نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔

(۳)

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ سردی بڑھنے لگی۔ ہلکو اٹھ بیٹھا اور دونوں گھٹنوں کو چھاتی سے ملا کر سر کو چھپالیا۔ پھر بھی سردی کم نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ سارا خون منجمد ہو گیا ہے۔ اس نے اٹھ کر آسمان کی جانب دیکھا ابھی کتنی رات باقی ہے۔ وہ سات ستارے جو قطب کے گرد گھومتے ہیں ابھی اپنا نصف دورہ بھی ختم نہیں کر چکے۔ جب وہ اوپر آجائیں گے تو کہیں سویرا ہو گا۔ ابھی ایک گھڑی سے زیادہ رات باقی ہے۔

ہلکو کے کھیت سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر ایک باغ تھا۔ پت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔ باغ میں پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہلکو نے سوچا چل کر پیتاں بٹوروں اور ان کو جلا کر خوب تاپوں۔ رات کو کوئی مجھے پیتاں بٹورتے دیکھے تو سمجھے کہ کوئی بھوت ہے۔کون جا نے کوئی جانور ہی چھپا بیٹھا ہو۔ مگر اب تو بیٹھے نہیں رہا جاتا۔

اس نے پاس کے ارہر کے کھیت میں جاکر کئی پودے اکھاڑے اور اس کا ایک جھاڑو بنا کر ہاتھ میں سلگتا ہوا اپلہ لیے باغ کی طرف چلا۔ جبرا نے اسے جاتے دیکھا تو پاس آیا اور دم ہلا نے لگا۔

ہلکو نے کہا۔ اب تو نہیں رہا جاتا۔ جبرو، چلو باغ میں پیتاں بٹور کر تاپیں ٹاٹھے ہو جائیں گے تو پھر آکر سوئیں گے۔ ابھی تو رات بہت ہے۔

جبرا نے کون ۔ کون کرتے ہوئے اپنے مالک کی رائے سے موافقت ظاہر کی۔ اور آگے آگے باغ کی جانب چلا۔ باغ میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ درختوں

سے شبنم کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹپک رہی تھیں۔ یکا یک ایک جھونکا کا مہندی کے پھولوں کی خوشبو لیے ہوئے آیا۔

ہلکو نے کہا کیسی اچھی مہک آئی جبرا۔! تمھاری ناک میں بھی کچھ خوشبو آ رہی ہے؟

جبرا کو کہیں زمین پر ایک ہڈی پڑی مل گئی تھی۔ وہ اسے چوس رہا تھا۔ ہلکو نے آگ زمین پر رکھ دی اور پتیاں بٹورنے لگا۔ تھوڑی دیر میں پتوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ ہاتھ ٹھٹھرتے جاتے تھے۔ ننگے پاؤں گلے جاتے تھے۔ اور وہ پتیوں کا پہاڑ کھڑا کر رہا تھا۔ اسی الاؤ میں وہ سردی کو جلا کر خاک کر دے گا۔

تھوڑی دیر میں الاؤ جل اٹھا۔ اس کی لو اوپر والے درخت کی پتیوں کو چھو چھو کر بھاگنے لگی۔ اس متزلزل روشنی میں باغ کے عالی شان درخت ایسے معلوم ہوتے تھے کہ وہ اس لاانتہا اندھیرے کو اپنی گردن پر سنبھالے ہوں۔ تاریکی کے اس اتھاہ سمندر میں یہ روشنی ایک ناؤ کے مانند معلوم ہوتی تھی۔

ہلکو الاؤ کے سامنے بیٹھا ہوا آگ تاپ رہا تھا۔ ایک منٹ میں اس نے اپنی چادر بغل میں دبالی اور دونوں پاؤں پھیلا دیے۔ گویا وہ سردی کو للکار کر کہہ رہا تھا۔ ’’تیرے جی میں جو آئے وہ کر۔‘‘ سردی کی اس بے پایاں طاقت پر فتح پا کر وہ خوشی کو چھپا نہ سکتا تھا۔

اس نے جبرا سے کہا۔ کیوں جبّر! اب تو ٹھنڈ نہیں لگ رہی ہے؟

جبرا نے کوں، کوں، کر کے گویا کہا۔ اب کیا ٹھنڈ لگتی ہی رہے گی؟

’’پہلے یہ تدبیر نہیں سوجھی، نہیں اتنی ٹھنڈ کیوں کھاتے؟

جبرا نے دم ہلائی۔

اچھا آؤ، اس الاؤ کو کود کر پار کریں۔ دیکھیں کون نکل جاتا ہے۔ اگر جل گئے بچہ تو میں دوا نہ کروں گا۔‘‘

جبرا نے خوف زدہ نگاہوں سے الاؤ کی جانب دیکھا۔

’’منی سے کل یہ نہ جڑدینا کہ رات خوب ٹھنڈ لگی۔ اور تاپ تاپ کر رات کاٹی۔ ورنہ لڑائی کرے گی۔‘‘

یہ کہتا ہوا وہ اچھلا اور اس الاؤ کے اوپر سے صاف نکل گیا۔ پیروں میں ذرا سی لپٹ لگ گئی۔ پروہ کوئی بات نہ تھی۔ جبرا الاؤ کے گرد گھوم کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

ہلکو نے کہا۔ چلو چلو۔ اس کی سہی نہیں۔ اوپر سے کود کر آؤ۔

وہ پھر کودا اور الاؤ کے اس پار آ گیا۔

(۴)

پتیاں جل چکی تھیں۔ باغیچے میں پھر اندھیر اچھا گیا تھا۔ راکھ کے نیچے کچھ کچھ آگ باقی تھی۔ جو ہوا کا جھونکا آنے پر ذرا جاگ اٹھتی تھی۔ پر ایک لمحہ میں پھر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔

ہلکو نے پھر چادر اوڑھ لی۔ اور گرم راکھ کے پاس بیٹھا ہوا ایک گیت گنگنانے لگا۔ اس کے جسم میں گرمی آ گئی تھی۔ پر جوں جوں سردی بڑھتی جاتی تھی۔ اس سستی دبائے لیتی تھی۔

دفعتاً جبرا زور سے بھونک کر کھیت کی طرف بھاگا۔ ہلکو کو ایسا معلوم ہوا کہ جانوروں کا ایک غول اس کے کھیت میں آیا۔ شاید نیل گاؤں کا جھنڈ تھا۔ ان کے کودنے اور دوڑنے کی آوازیں صاف کان میں آ رہی تھیں۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ وہ کھیت میں چر رہی ہیں۔............اس نے دل میں کہا۔ نہیں جبرا کے ہو تے کوئی جانور کھیت میں نہیں آ سکتا۔ نوچ ہی ڈالے۔ مجھے وہم ہو رہا ہے۔ کہاں! اب تو کچھ سنائی نہیں دیتا۔ مجھے بھی کیسا دھوکا ہوا۔!

اس نے زور سے آواز لگائی۔ جبرا۔! جبرا۔!

جبرا بھونکتا رہا۔ اسکے پاس نہ آیا۔

جانورں کے چرنے کی آواز چر، چر، سنائی دینے لگی۔ ہلکو اب اپنے کو فریب نہ دے سکا۔ مگر اسے اس وقت اپنی جگہ سے ہلنا زہر معلوم ہوتا تھا۔ کیسا گرمایاہوا مزے سے بیٹھا تھا۔ اس جاڑے پالے میں کھیت میں جانا جانورں کو بھگانا، ان کا تعاقب کرنا اسے پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ بیٹھے بیٹھے جانورں کو

بھگانے کے یے چلّانے لگا لہو لہو، ہو۔ ہو۔ ہا ہا!

مگر جبرا پھر بھونک اٹھا۔ اگر جانور بھاگ جاتے تو وہ اب تک لوٹ آیا ہوتا۔ نہیں بھاگے۔ ابھی تک چر رہے ہیں۔ شاید وہ سب بھی سمجھ رہے ہیں کہ اس سردی میں کون بیدھا ہے جو ان کے پیچھے دوڑے گا۔ فصل تیار ہے۔ کیسی اچھی کھیتی تھی۔ سارا گاؤں دیکھ دیکھ کر جلتا تھا۔ اسے یہ ابھا گے تباہ کئے ڈالتے ہیں۔!

اب ہلکو سے نہ رہا گیا۔ وہ پکا ارادہ کرکے اٹھا اور دو تین قدم چلا۔ پھر یکا یک ہوا کا ایسا ٹھنڈا، چبھنے والا، بچھو کے ڈنک کا سا جھونکا لگا۔ کہ وہ پھر بجھتے ہوئے الاؤ کے پاس آ بیٹھا اور راکھ کو کرید کرید کر اپنے ٹھنڈے جسم کو گرمانے لگا۔

جبرا اپنا گلا پھاڑے ڈالتا تھا۔ نیل گائیں کھیت کا صفایا کئے ڈالتی تھیں اور ہلکو گرم راکھ کے پاس بے حس بیٹھا ہوا تھا۔ افسر دگی نے اسے چاروں طرف سے رسی کی طرح جکڑ رکھا تھا۔ آخر وہی چادر اوڑھ کر سو گیا۔ سویرے جب اس کی نیند کھلی۔ تو دیکھا چاروں طرف دھوپ پھیل گئی ہے اور منی کھڑی کہہ رہی ہے۔ کیا آج سوتے ہی رہوگے۔ تم یہاں میٹھی نیند سو رہے ہو اور ادھر سارا کھیت چوپٹ ہو گیا۔ سارا کھیت ستیاناس ہو گیا۔ بھلا کوئی ایسا بھی سوتا ہے تمھارے یہاں منڈیا ڈالنے سے کیا ہوا۔

ہلکو نے بات بنائی میں مرتے مرتے بچا، تجھے اپنے کھیت کی پڑی ہے۔ پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ میں ہی جانتا ہوں۔

دونوں پھر کھیت کے ڈانڈ پر آئے۔ دیکھا کھیت میں ایک پودے کا نام نہیں اور جبرا منڈیا کے نیچے چت پڑا ہے۔ گویا بدن میں جان ہی نہیں ہے۔

دونوں کھیت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ منی کے چہرہ پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ پر ہلکو خاموش تھا۔

منی نے فکر مند ہو کر کہا۔ اب مجوری کرکے مال گجاری دینی پڑے گی۔

ہلکو نے مستانہ انداز سے کہا۔ رات کو ٹھنڈ میں یہاں سونا تو نہ پڑے گا۔

میں اس کھیت کا لگان نہ دوں گی۔ کہے دیتی ہوں۔ جینے کے لیے کھیتی کرتے ہیں۔ مرنے کے لیے نہیں کرتے۔"

جبرا ابھی تک سو یا ہوا ہے۔اتنا تو کبھی نہ سوتا تھا۔''
آج جاکر سحنا سے کہہ دے، کھیت جانور چرگئے۔ ہم ایک پیسہ نہ دیں گے۔''
''رات بڑے غضب کی سردی تھی۔''
''میں کیا کہتی ہوں۔ تم کیا سنتے ہو۔''
''تو گالی کھلانے کی بات کہہ رہی ہے۔ سحنہ کو ان باتوں سے کیا سرو کار۔ تمھارا کھیت چاہے جانور کھائیں،چاہے آگ لگ جائے،چاہے اولے پڑجائیں۔ اسے تو اپنی مالگجاری چاہیے۔
''تو چھوڑ دو کھیتی۔ میں ایسی کھیتی سے باز آئی۔''
ہلکونے مایوسانہ انداز سے کہا۔ جی میں تو میرے بھی یہی آتا ہے کہ کھیتی باڑی چھوڑ دوں منی ! تجھ سے سچ کہتا ہوں۔ مگر مجوری کا خیال کرتا ہوں تو جی گھبرا اٹھتا ہے۔ کسان کا بیٹا ہو کر اب مجوری نہ کروں گا۔ چاہے کتنی ہی درگت ہوجائے کھیتی کا مرجاو نہ بگاڑوں گا۔ جبرا۔! جبرا۔! کیا سوتا ہی رہے گا۔ چل گھر چلیں۔

یہ افسانہ لکھنؤ کے ہند ی ماہنامہ مادھوری کے مئی 1930 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مانسرو ور نمبر۱ میں شامل ہے اردو میں پریم چالیسی میں شامل ہے۔

میکو

قادر اور میکو تاڑی خانے کے سامنے پہنچے تو وہاں کانگریس کے والنٹیر جھنڈا لیے کھڑے نظر آئے، دروازے کے ادھر ادھر ہزاروں درشک کھڑے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ اس وقت گلی میں پیکڑوں کے سیوا اور کوئی نہ آتا تھا۔ بھلے آدمی ادھر سے نکلتے جھجھکتے پیکڑوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں آتی جاتی رہتی تھیں۔ دو چار ویشیائیں دکان کے سامنے کھڑی نظر آتی تھی۔ آج یہ بھیڑ بھاڑ دیکھ کر میکو نے کہا۔ بڑی بھیڑ ہے بے، کوئی دو تین سو آدمی ہوں گے۔

قادر نے مسکرا کر کہا۔ بھیڑ دیکھ کر ڈر گئے کیا؟ یہ سب ہرر ہو جائیں گے۔ ایک بھی نہ ٹکے گا۔ یہ لوگ تماشا دیکھنے آئے ہیں۔ لاٹھیاں کھانے نہیں آئے ہیں۔

میکو نے سندھ کے سور میں کہا۔ پولیس کے سپاہی بھی بیٹھے ہیں۔ ٹھیکے دار نے تو کہا تھا پولیس نہ بولے گی۔

قادر ہاں بے، پولیس نہ بولے گی۔ تیری نانی کیوں مری جا رہی ہے۔ پولیس وہاں بولتی ہے جہاں چار پیسے ملتے ہیں۔ یا جہاں کوئی عورت کا معاملہ ہوتا ہے۔ ایسی بے فضول باتوں میں پولیس نہیں پڑتی۔ پولیس تو اور شہہ دے رہی ہے۔ ٹھیکے دار سے سال میں سیکڑوں روپے ملتے ہیں۔ پولیس اس وقت اس کی مدد نہ کرے گی تو کب کرے گی؟

میکو : چلو، آج دس ہمارے بھی سیدھے ہوئے۔ مفت میں پیئیں گے وہ الگ۔ مگر سنتے ہیں کانگریس والوں میں بڑے بڑے مال دار لوگ شریک ہیں۔ وہ کوئی ہم

لوگوں سے کسر نکالے تو برا ہوگا۔
قادر : ابے، کوئی کسر وسر نہیں نکالے گا۔ تیری جان کیوں نکل رہی ہے کانگریس والے کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاتے، چاہے کوئی مار ہی ڈالے، نہیں تو اس دن جلوس میں دس بارہ چوکیداروں کی مجال تھی کہ دس ہزار آدمیوں کو پیٹ کر رکھ دیتے۔ چار تو وہی ٹھنڈے ہوگئے تھے۔ مگر ایک نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ ان کے جو مہاتما ہیں، وہ بڑے بھاری فقیر ہیں۔ ان کا حکم ہے کہ چپکے سے مار کھالو، لڑائی مت کرو۔

یوں باتیں کرتے کرتے دونوں تاڑی خانے کے دوار پر پہنچ گئے۔ ایک سویم سیوک ہاتھ جوڑ کر سامنے آگیا اور بولا۔ بھائی صاحب آپ کے مذہب میں تاڑی حرام ہے۔

میکو نے بات کا جواب چانٹے سے دیا۔ ایسا طمانچہ مارا کہ سویم سیوک کی آنکھوں میں خون آگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گرا چاہتا ہے۔ دوسرے سویم سیوک نے دوڑ کر اسے سنبھالا۔ پانچوں انگلیوں کو رکشمے پرتی بمسب جھلک رہا تھا۔ مگر والنٹیر طمانچہ کھا کر بھی اپنے ستھان پر کھڑا رہا

میکو نے کہا: اب ہٹتا ہے کہ اور لے گا؟

سویم سیوک نے نرمتا سے کہا اگر آپ کی یہی اچھا ہے تو سر سامنے کیے ہوئے ہوں۔ جتنا چاہیے مار لیجیے۔ مگر اندر نہ جائیے۔

یہ کہتا ہوا وہ میکو کے سامنے بیٹھ گیا۔

میکو نے سویم سیوک کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اس کی پانچوں انگلیوں کے نشان جھلک رہے تھے۔ میکو نے اس سے پہلے اپنی لاٹھی سے ٹوٹے ہوئے کتنے ہی سر دیکھے تھے پر آج کی سی گلانی اسے کبھی نہ ہوئی تھی۔ وہ پانچوں انگلیوں کے نشان کسی پنچ شول کی بھانتی اس کے ہردے میں چبھ رہے تھے۔

قادر چوکی دار کے پاس کھڑا سگریٹ پینے لگا۔ وہیں کھڑے کھڑے بولا۔ اب کھڑا دیکھتا کیا ہے، لگا کس کے ایک ہاتھ۔

میکو نے سویم سیوک سے کہا۔ تم اٹھ جاؤ مجھے اندر جانے دو۔

آپ میری چھاتی پر پاؤں رکھ کر چلے جا سکتے ہو۔

میں کہتا ہوں ہٹ جاؤ۔ میں اندر تاڑی نہ پیوں گا۔ ایک دوسرا کام ہے۔

اس نے یہ بات کچھ اس دڑھتا سے کہی کہ سیوم سیوک اٹھ کر راستے سے ہٹ گیا۔ میکو نے مسکرا کر اس کی اور تاکا۔ سیوم سیوک نے پھر ہاتھ جوڑ کر کہا۔ اپنا وعدہ بھول نہ جانا۔

ایک چوکی دار بولا۔ لات کے آگے بھوت بھاگتا ہے، ایک ہی طمانچہ میں ٹھیک ہوگیا۔

قادر نے کہا۔ یہ طمانچہ بچہ کو جنم بھر یاد رہے گا۔ میکو کے طمانچہ سہہ لینا معمولی کام نہیں ہے۔

چوکیدار : آج ایسا ٹھوکوں ان سبھوں کو کہ پھر ادھر آنے کا نام نہ لے۔

قادر: خدا نے چاہا تو پھر ادھر آئیں گے بھی نہیں۔ مگر ہیں سب بڑے ہمتی۔ جان کو ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔

(۲)

میکو بھیتر پہنچا تو ٹھیکے دار نے سواگت کیا آؤ میکو میاں۔ ایک ہی طمانچہ لگا کر کیوں رہ گئے؟ ایک طمانچہ کا بھلا ان پر کیا اثر ہوگا؟ بڑے لت خور ہیں سب کتنا ہی پیٹو، اثر ہی نہیں ہوتا۔ بس آج سبھوں کے ہاتھ پاؤں توڑ دو۔ پھر ادھر نہ آئیں۔

میکو : تو کیا اور نہ آئیں گے؟

ٹھیکے دار : پھر آتے سبھوں کی نانی مرے گی۔

میکو : اور جو کہیں ان تماشا دیکھنے والوں نے میرے اوپر ڈنڈے چلائے تو۔

ٹھیکے دار : تو پولیس ان کو مار بھگائے گی۔ ایک جھاپڑ میں میدان صاف ہو جائے گا۔ لو جب تک ایک آدھ بوتل پی لو۔ میں تو آج مفت کی پلا رہا ہوں۔

میکو : کیا ان گراہکوں کو بھی مفت؟

ٹھیکے دار : کیا کرتا، کوئی آتا ہی نہ تھا۔ سنا کہ مفت ملے گی تو سب دھنس پڑے۔

میکو : میں تو آج نہ پیوں گا۔

ٹھیکے دار : کیوں؟ تمھارے لیے تو آج تازی تاڑی منگوائی ہے۔
میکو : یوں ہی، آج پینے کی اچھا نہیں ہے۔ لاؤ کوئی لکڑی نکالو۔ ہاتھ سے مارتے نہیں بنتا۔

ٹھیکے دار نے لپک کر ایک موٹا سوٹا میکو کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور ڈنڈے بازی کا تماشا دیکھنے کے لیے دوار پر کھڑا ہوگیا۔

میکو نے ایک چھن ڈنڈے کو تولا، تب اچھل کر ٹھیکے دار کو ایسا ڈنڈا رسید کیا کہ وہیں دوہرا ہو کر دوار میں گر پڑا۔ اس کے بعد میکو نے پیکراں کی اور رخ کیا اور لگا ڈنڈوں کی ورشا کرنے۔ نہ آگے دیکھا تھا نہ پیچھے، بس ڈنڈے چلائے جاتا تھا۔

تاڑی بازوں کے نشے ہرن ہوئے۔ گھبرا گھبرا بھاگنے لگے۔ پر پیکڑوں کے بیچ میں ٹھیکے دار کی دیہہ بندھی پڑی تھی۔ ادھر سے پھر بھیڑ کی اور لپکے۔ میکو نے پھر ڈنڈوں سے آواہان آخر تب ٹھیکے دار کی دیہہ کو روند روند کر بھاگو کسی کا ہاتھ ٹوٹا، کسی کا سر پھوٹا، کسی کی کمر ٹوٹی۔ ایسی بھگڈر مچی کہ ایک منٹ کے اندر تاڑی خانے میں ایک چیڑلیس کا پت بھی نہ رہ گیا۔ ایکایک مٹکوں کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ سویم سیوک نے بھیتر جھانک کر دیکھا۔ تو میکو مٹکوں کو ودھونس کرنے میں جٹا ہوا تھا۔ بولا۔ بھائی صاحب، آجی بھائی صاحب، یہ آپ غضب کر رہے ہیں۔ اس سے تو کہیں اچھا کہ آپ نے ہمارے ہی اوپر اپنا غصہ اتارا ہوتا۔

میکو نے دو تین ہاتھ چلا کر باقی بچی ہوئی بوتلوں اور مٹکوں کا صفایا کر دیا۔ اور تب چلتے چلتے ٹھیکے دار کو ایک لات جما کر باہر نکل آیا۔

قادر نے اس کو روک کر پوچھا تو پاگل تو نہیں ہو گیا ہے بے؟ کیا کرنے آیا تھا اور کیا کر رہا ہے۔

میکو نے لال لال آنکھوں سے اس کی اور دیکھ کر کہا۔ ہاں اللہ کا شکر ہے کہ میں جو کرنے آیا تھا وہ نہ کر کے کچھ اور ہی کر بیٹھا۔ تم میں قوت ہو تو والنٹیروں کو مارو۔ مجھ میں قوت نہیں ہے۔ میں تو جو ایک تھپڑ لگایا اس کا رنج ابھی تک ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ طمانچہ کے نشان میرے کلیجے پر بن گئے ہیں۔ جو لوگ دوسروں کو گناہ

سے بچانے کے لیے اپنی جان دینے کو کھڑے ہیں۔ ان پر وہی ہاتھ اٹھائے گا جو پاجی ہے۔ کمینہ ہے۔ نامرد ہے۔ میکو فسادی ہے، لٹھت گنڈا ہے، پر کمینہ اور نامرد نہیں ہے۔ کہہ دو پولیس والوں سے چاہیں تو مجھے گرفتار کر لیں۔

کئی تاڑی باز کھڑے سر سہلاتے ہوئے، اس کی اور سہمی ہوئی آنکھوں سے تاک رہے تھے۔ کچھ بولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ میکو نے ان کی اور دیکھ کر کہا۔ میں کل پھر آؤں گا۔ اگر تم میں کسی کو یہاں دیکھا تو خون ہی پی جاؤں گا۔

جیل اور پھانسی سے نہیں ڈرتا۔ تمھاری بھل منسی اسی میں ہے کہ اب بھول کر بھی ادھر نہ آنا۔ یہ کانگریس والے تمھارے دشمن ہیں تمھارے اور تمھارے بال بچوں کی بھلائی کے لیے ہی تمھیں پینے سے روکتے ہیں۔ ان پیسوں سے اپنے بال بچوں کی پرورش کرو، گھی دودھ کھاؤ، گھر میں تو فاقے ہورہے ہیں۔ گھر والی تمھارے نام کو رو رہی ہے اور تم یہاں بیٹھے پی رہے ہو؟

لعنت ہے اس نشے بازی پر

میکو نے وہی ڈنڈا پھینک دیا اور قدم بڑھاتا ہوا گھر چلا۔ اس وقت تک ہزاروں آدمیوں کا ہجوم ہو گیا تھا۔ سبھی شردھا پریم اور غرو کی آنکھوں سے میکو کو دیکھ رہے تھے۔

نوٹ: یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں ہنس جون 1930 میں شائع ہوا۔ مان سرور نمبر 7 میں شامل ہے اردو میں ابھی تک شائع نہیں ہوا۔

سَوپَن

اوروں کی تو میں نہیں جانتا، پر مجھے تو جو آنند اور سکھ ملتا ہے وہ سوپن میں وہیں پہنچ کر میں دل کھول کر ہنستا ہوں۔ دل کھول کر روتا ہوں اور دل کھول کر کھیلتا ہوں۔ وہیں میرا سنہرا رتن جٹل محل ہے، وہیں میری کامناؤں کے پھول کھلتے ہیں، وہیں میری زبان اپنی ہوتی ہے۔ میرا قلم اپنا ہوتا ہے۔ میرے وچار اپنے ہوتے ہیں۔ میرا وہ سنسار اس بندھن میں اور قانون کے سنسار سے کہیں زیادہ پرتیکش، کہیں زیادہ شانتی مے اور کہیں زیادہ سپھورتی پرد ہے۔ وہ تمیتا وہ انوراگ، وہ اُت کرش، وہ جاگرتی جس کا میں وہاں انوبھو کرتا ہوں، یہاں کہاں رونا یہی ہے کہ ویسے سوپن بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ کسی اچھے آدمی کا منہ دیکھ کر اٹھنا چاہتے ہیں۔ میں کسی اچھے آدمی کا منہ دیکھ کر سونا چاہتا ہوں۔

معلوم نہیں کل کس بھاگیہ وان کا منہ دیکھ کر سویا تھا اور لیٹتے ہی لیٹتے اپنے سوپن سامراجیہ میں جا پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ میرا بچپن لوٹ آیا ہے۔ ایک بار پھر میں آزادی کے ہوا میں دوڑتا پھرتا ہوں۔ میری اسنیہ مائی ماتا، وہ پیاری بہن، وہ بال سکھا، وہ چھوٹا سا گھر، وہ دوار پرنیم کا ورکش، سب کچھ آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اس امنگ اس اتساہ کو کیا لکھوں، وہ تو ورن نانیت ہے، مجھے خوب یاد تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں بوڑھا تھا۔ مجھے سویم اپنی کایا پلٹنے پر آشچریہ ہو رہا تھا۔ مجھے اپنی پروڑ اوستھا کی ساری باتیں یاد تھی۔ جیون بھر کی بھولوں، انوپایوں، نراشاؤں اور وپھلتاؤں کی یاد نے میرے بالپن کو درلبھ بنا دیا تھا۔ پروڑتا بھی تھی، اوڈتیہ بھی،

امنگ بھی تھی، سویم بھی، گمبھیرتا بھی تھی، چنچلتا بھی۔ پیڑوں پر چڑھتا ہوں، پر اس طرح کی گرنہ پڑوں، چیزوں کے لیے ضد بھی کرتا ہوں۔ پر اس طرح نہیں کہ رو رو کر دنیا سر پر اٹھالوں۔ کھیلتا ہوں تو اس طرح کہ چوٹ نہ لگے۔ اسکول میں جھوٹے بہانے نہیں کرتا۔ چغلی نہیں کھاتا۔ کام سے جی نہیں چراتا۔ جن غلطیوں سے میرا جیون اسپھل ہو گیا تھا، انھیں دہرا کر اس دوسرے جیون کو بھی اسپھل نہیں کرنا چاہتا۔

سوپن ہی یہ شکتی ہے کہ وہ مہینوں، ورشوں اور یگوں کو کشنوں میں گھٹت کردے اور کال کا بھرم جیون کا تیوں بنا رہے۔ میں نے دیکھا کہ میں اسکول سے کالج میں جا پہنچا ہوں۔ کالج نہیں ہے، لڑکے بھی نہیں، لیکن اب میرا کسی سے دوش نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جن لوگوں کو تچھ سمجھا تھا۔ وے مجھ سے کہیں آگے نکل گئے۔

اب میں کسی کی نندا نہیں کرتا تھا۔ یاد تھا کہ ادھیاپکوں سے لکچر دیتے سمے میں اپنیاس پڑھا کرتا تھا۔ کھیل کے سمے بازار کی سیر کیا کرتا تھا۔ وہی غلطیاں کیا پھر کر سکتا تھا؟ وہ اپنیاس پریم، ہردے کا شول بن گیا وہ بازار کی سیر پاؤں کی بیڑی بن گئی۔ اب میں سبھی کام اپنے وقت پر کرتا تھا۔ وہ فیشن کی غلامی، وہ ٹائی اور کالر کا شوق، وہ نئے نئے سوٹوں کا انماد، وے ہزاروں باتیں جن کا ویسن ہمارے چھاتر جیون کو دوشت کر دیتا ہے، ان میں سے اب مجھے کسی چیز کا بھی شوق نہ تھا۔ ایک پورے جیون کے انوبھو اب میری رکشا کر رہے تھے۔ وہیں میں جن کے لیے ہانگی سٹک ننگی تلوار تھی اور فٹ بال بم کا گولا، اب بڑے اتساہ سے ان کھیلوں میں شریف ہونے لگا۔ ویایام سے اداسینتا رہ کر مجھے جو پاپڑ بیلنے پڑے وہ خوب یاد تھے۔

پھر کیا دیکھتا ہوں کہ میرے وواہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اب تک تو میں نے جو باتیں دیکھی تھیں ان سے جیون کاسدھار ہونے کی ہی آشا تھی۔ کسی چھتا یا بھئے کی بات نہ تھی۔ بالپن تھا۔ یون اگر لٹ آیا ہو تو بھی کچھ گانٹھ سے تو نہیں جاتا۔ لیکن کہیں وواہ ہو گیا تو ایک ہی جگہ دو پتنیاں ہو جائیں گی۔ سوچیے کتنی بھیشن سمّسیا تھی۔ میں بڑا دھرم سنکٹ میں پڑا ہوا ہوں کہ وواہ کروں یا نہ کروں۔ اس وواہ

سواد نے میری پوروسمرتیوں کو کچھ اور جاگرت کر دیا تھا۔ سوچتا تھا کہ بھلا یہاں کسی
کو یہ وشواس آئے گا میں تو پہلے ہی سے اس ویترنی میں پڑا ہوا ہوں اور وہ بھی
سر پر آدھی درجن چھوٹی بڑی گٹھریاں لیے ہوئے۔ مجھے خود بھی تو پورا پورا نشچیہ نہیں
ہے کہ میں واستو میں کیا ہوں، بوڑھا یا جوان میں تو اس دودھے میں پڑا ہوا ہوں
اور ادھر گھر والے وواہ کے سب سامان جٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اماں ہیں کہ ان
کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے، مانو سنسار کی سب سے بڑی درشٹ ہوئی ہے، ان
کے بیٹے کے سوا اور کسی کو یہ سوبھاگیہ پراپت ہی نہیں ہوا۔ دادا بھی جنھیں بازار سے
نفرت ہے، جو بازار کو پیسے کا پرنالا کہتے ہیں اور جنھیں آبھوشنوں کے نام سے چڑھ
ہے۔ اس وشے میں اماں جی سے ہزاروں ہی بار ان کی ٹھن چکی ہے اماں جی کے
اکبری حملوں کے سامنے بھی وہ راناپرتاپ کی بھانتی برابر ڈٹے رہے۔ آج خوش خوش
سرافوں کی دوکانوں کی ہوا کھا رہے ہیں۔ بار بار بازار آتے جاتے تھے۔ پر ماتھے
پر بل کا نام بھی نہ تھا۔ اورمیں اس سوچ میں ہوں کہ وہ جوانی کہیں دھوکا نہ ہو۔

سمرتی کے کسی گپت بھاگ میں یہ بات چھپتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ میرے
بال بچے ہیں، استری ہے، سسر ہیں، مجھے چنتا ہو رہی تھی کہ جب میں یاہ نئی بہو
لیے گھر پر جاؤں گا تو لوگ مجھے کیا کہیں گے۔ جوان بیٹے ہیں، جو وردھ وواہ کو
جیون کا سب سے بڑا پاپ سمجھتے ہیں جس کے ساتھ جیون کے تیس سال بیتے ہیں،
وہ استری ہے۔ ان سبھوں کے سامنے میں کون منھ لے کر جاؤں گا۔ یہ نہ پوچھیے کہ
نو ودھو کے ساتھ میں اپنے ماں باپ کے گھر کے بدلے اپنے گھر کیوں لوٹتا؟ میرا
تو گھر بار نہیں لیکن یہاں تو پورو اسمرتیاں بنی ہوئی تھی، ان کے کچھ مٹے مٹے نشان
صاف نظر آرہے تھے۔ پھر سوپن نیائے اور شرنکھلا اور گھٹنا کرم کا انوسرن بھی تو نہیں
کرتا۔ سوچتا تھا متر ورگ کتنا مذاق اڑائیں گے۔ وہاں مہاشے آپ تو ان میل
وواہوں کے بڑے ورودھی تھے۔ یہ آپ کو کیا سنک سوار ہوگئی؟

پران سنکٹ میں پڑے ہوئے تھے۔ سوچتا تھا۔ اماں کو کیسے سمجھاؤں گا؟ کہیں
لوگ ہنسنے نہ لگیں کہ یہ دیوانہ ہو گیا ہے۔

اتنے میں باجے بجنے لگے۔ اماں نے آکر مجھ سے کہا۔ تمھاری بھی وچتر بات

ہے۔ ایسا منھ لٹکائے بیٹھے ہو یعنی کوئی چنتا فکر سوار ہو۔ سارے گھر میں منگل گان ہو رہاہے اور تم رونی صورت بنائے بیٹھے ہو۔ ابھی تو ہم جیتے ہیں، تمھیں کیا چنتا؟ جب ہم مرجائیں تب چنتا کرنا، اٹھو بارات جا رہی ہے، جلدی سے کپڑے پہن لو۔

میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ ماں سے کیسے کہوں کہ میرا تو وواہ ایک بار تمھیں کر چکی ہو۔ چپ چاپ جا کر کپڑے پہنے استریوں نے گیت گائے۔ نائی دھوبی آدی نے نوچھاور پائے اور میں دولہا بنا ہوا گھر سے نکل کر پالکی پر بیٹھا۔ کہاروں نے پالکی اٹھائی۔ پھر میں نے دیکھا کہ میں ودھو کے دوار پر پہنچ گیا۔ جنوا سے میں وہی شور غل چل پوں مچا ہوا تھا، جیسے دستور ہے ذرا دیر میں مجھ سے کہا گیا کہ پانی گرہن کا مہورت آگیا چلو اب میرے لیے کٹھن پریکشا کا سمے تھا۔ جس طرح اب تک بنا کان پونچھ ہلائے سب کچھ کرتا آیا ہوں اگر اسی طرح اس وقت بھی چپکے سے چلا گیا تو انرتھ ہو جائے گا۔ پاؤں میں بیڑی پڑ جائے گی اور میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ اگر یہ جوانی مریچکا ہی نکلی تو شیش جیون کلنکت ہی نہیں۔ دکھ مے ہوجائے گا۔ کہیں کا نہ رہوں گا۔ کیا کہہ کر جان بچاؤں؟ کون سا بہانہ کروں؟ لوگ میری باتوں پر ہنسیں گے اور مجھے پاگل سمجھیں گے۔ لیکن یہ جوانی برف کی طرح پگھل گئی تو اس یوتی کے ساتھ کتنی چھیچھا لے در ہوگی۔

میں اٹھ کر بھاگا، جاما، جورا، مور پہنے لڑ سپڑ کرتا بھاگا۔ میرے پیچھے لوگ دورے۔ میں اس طرح جان چھوڑ کر بھاگا جا رہا تھا، مانو کوئی بھینکر جنتو میرے پیچھے پڑا ہوا ہو۔ یہاں تک کہ سامنے ایک ندی آگئی اور میں اس میں کود پڑا۔ بس، نیند کھل گئی۔ دیکھتا ہوں چار پائی پر پڑا ہوا ہوں، مگر سانس پھول رہی ہے۔

نوٹ: یہ افسانہ پہلی بار ہندی ماہنامہ وینا کے جولائی 1930 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اپراپیہ ساہتیہ میں ہے۔ کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ اردو میں یہ کہیں شائع نہیں ہوا۔

جیل

آنند نے گدّے دار کرسی پر بیٹھ کر سگار جلاتے ہوئے کہا۔" آج وشومبھر نے کیسی حماقت کی۔ امتحان قریب ہے اور آپ آج والنٹیر بن بیٹھے۔ کہیں پکڑے گئے تو امتحان سے ہاتھ دھو لیں گے۔ میرا تو خیال ہے وظیفہ بھی بند ہوجائے گا۔"

سامنے دوسرے کوچ پر روپ متی بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔اس کی آنکھیں اخبار کی طرف تھیں مگر کان آنند کی طرف لگے ہوئے تھے۔ بولی۔"یہ تو بہت برا ہوا۔ تم نے سمجھا یا نہیں"؟

آنند نے منہ بنا کر کہا۔" جب کوئی اپنے کو دوسرا گاندھی سمجھ لے تو اسے سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ الٹا مجھے سمجھانے لگتا ہے۔

روپ متی نے اخبار لپیٹ کر زلفوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔ "تم نے مجھے بھی تو نہیں بتایا۔ شاید میں اسے روک سکتی۔

آنند نے کچھ چڑھ کر کہا: "تو ابھی کیا بگڑا ہے۔ ابھی تو شاید کانگرس آفس ہی میں ہوگا۔ جا کر روک لو۔"

آنند اور وشومبھر دونوں ہی یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ آنند کے حصہ میں لکشمی بھی پڑی تھی۔ سرسوتی بھی۔ وشومبھر چھوٹی تقدیر لے کر آیا تھا۔ پروفیسروں نے مہربانی کر کے ایک چھوٹا سا وظیفہ دے دیا تھا۔ بس یہی اس کے گذارے کی سبیل تھی۔ روپ متی بھی ایک سال قبل انھیں کی جماعت میں پڑھتی تھی۔ مگر اس سال اس کی صحت کچھ خراب ہوگئی تھی۔ اس لیے اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ دونوں

نوجوان کبھی بھی اس سے ملنے آتے رہتے تھے۔ آنند آتا تھا اس کا دل لینے کے لیے، وشومبھر آتا تھا، یوں ہی دل بہلانے کے لیے، طبیعت پڑھنے میں نہ لگتی۔ یا جی گھبراتا، تو یہاں آبیٹھتا تھا، شاید اس سے اپنی مصیبت کی داستان کہہ کر اس کا دل سکون پا جاتا تھا۔ آنند کے سامنے کچھ اظہار درد کی اس میں ہمت نہ تھی۔ آنند کے پاس اس کے لیے ہمدردی کا ایک کلمہ شیریں بھی نہ تھا۔ وہ اسے پھٹکارتا، ذلیل کرتا اور بناتا تھا۔ وشومبھر میں اس سے بحث کرنے کی قابلیت نہ تھی۔ آفتاب کے روبرو چراغ کی ہستی ہی کیا؟ آنند اس کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے اس دماغی غلبہ کو پرے پھینکا اور اسی کی شکایت لے کر روپ متی کے پاس آیا تھا۔ مہینوں وشومبھر نے اپنے اندرونی خیالات کو آنند کے خیالات میں جذب کرنے کی سعی کی۔ لیکن دلائل کی دنیا میں شکست کھا کر بھی اس کا دل بغاوت کرتا رہا۔ بلاشبہ اس کا ایک سال ضائع ہوجائے گا۔ ممکن ہے اس کی کالج کی زندگی کا سدا کے لیے خاتمہ ہوجائے۔ پھر ان چودہ پندرہ سالوں کی محنت پر پانی پھر جائے گا۔ نہ خدا ہی ملے گا، نہ وصال صنم نصیب ہوگا۔ آگ میں کودنے سے کیا حاصل ؟ یونیورسٹی میں رہ کر بھی تو بہت کچھ ملک کا کام کیا جاسکتا ہے۔ آنند مہینے میں کچھ نہ کچھ چندہ جمع کر دیتا تھا۔کچھ طلبا سے سودیشی کا عہد کرا لیتا تھا۔ وشومبھر کو بھی آنند نے یہی مشورہ دیا۔ اس کی دلیلوں نے وشومبھر کی عقل کو جیت لیا۔ لیکن اس کے دل کو جیت نہ سکا۔ آج جب آنند کالج گیا تو وشومبھر کا خط ملا۔

''پیارے آنند

مجھے بخوبی علم ہے کہ میں جو کچھ کرنے والا ہوں۔ وہ میرے لیے فائدہ بخش نہیں لیکن نہ جانے کون سی قوت مجھے کھینچے لیے جا رہی ہے۔ میں جانا نہیں چاہتا۔ لیکن جاتا ہوں۔جب وہ سبھی لوگ جن کی ہمارے دلوں میں عزت ہے۔ اوکھلی میں سر ڈال چکے تو میرے لیے بھی اب کوئی دوسرا رستہ نہیں۔ میں اب اور اپنے دل کو دھوکا نہیں دے سکتا۔یونیورسٹی کی ڈگری اچھی شے ہے لیکن یہ میری عزت کا سوال ہے اور عزت کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرسکتی۔

تمھارا وشومبھر۔''

خط پڑھ کر آنند کے جی میں آیا کہ وشومبھر کو سمجھا بجھا کر لوٹا لائے۔ مگر پھر اس کی حماقت پر غصہّ آیا۔ اور اسی طیش میں روپ متی کے پاس جا پہنچا۔ اگر روپ متی اس کی خوشامد کر کے کہتی۔'' جاکر اسے لوٹا لاؤ۔ تو شاید وہ چلا جاتا۔ پر اس کا یہ کہنا کہ میں اسے روک لیتی۔ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس کے جواب میں ناراضی تھی۔ سرد مہری تھی۔ اور شاید کسی قدر حسد بھی تھا۔

روپ متی نے ادائے غرور سے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''اچھی بات ہے۔ میں چلی جاتی ہوں۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔'' تم کیوں نہیں چلتے''؟

پھر وہ غلطی۔ اگر روپ متی اس کی خوشامد کر کے کہتی۔ تو آنند ضرور اس کے ساتھ چلا جاتا۔ لیکن اس کے سوال میں پہلے ہی یہ اندیشہ چھپا ہوا تھا کہ آنند جانا نہیں چاہتا۔ مغرور آنند اس طرح نہیں جا سکتا۔ اس نے اداس ہو کر جواب دیا۔'' میرا جانا لاحاصل ہے۔ تمھاری باتوں کا زیادہ اثر ہوگا۔ وہ میری میز پر یہ خط چھوڑ گیا تھا۔ جب وہ روح اور فرض اور معراج کی بڑی بڑی باتیں سوچ رہا ہے اور اپنے آپ کو آسمان کا باشندہ تصور کرتا ہے تو میرا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔''

اس نے جیب سے خط نکال کر روپ متی کے سامنے رکھ دیا۔ ان الفاظ میں جو اشارہ اور طعن تھا۔ اس نے ایک لمحہ تک روپ متی کو اس کی طرف دیکھنے نہ دیا۔ آنند کے اس ظالمانہ حملہ نے اسے جیسے ہلاک کر دیا۔ پھر ایک ہی لمحہ میں سرکشی کی ایک چنگاری سی اس کے اندر جا گھسی۔ اس نے نہایت سکون سے خط کھول کر پڑھا۔ پڑھا صرف آنند کے حملہ کا جواب دینے کے لیے۔ لیکن پڑھتے پڑھتے اس کا چہرہ جیسے چمکنے لگ گیا۔گردن تن گئی۔ آنکھوں میں ایثار کی سرخی آ گئی۔

اس نے خط کو میز پر رکھ دیا اور بولی۔'' نہیں اب میرا جانا بھی بے کار ہے۔'' آنند نے اپنی جیت پرخوش ہو کر کہا۔'' میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا ہے۔ کہ اس وقت اس کے سر پر بھوت سوار ہے۔ اس پر کسی کے سمجھانے کا اثر نہ ہوگا جب سال بھر جیل میں چکی پیس لے گا اور وہاں سے تپ دق لے کر نکلے گا۔ یا پولیس کے ڈنڈے سے سر اور ہاتھ پاؤں تڑوالے گا تو عقل ٹھکانے آئے گی۔ ابھی تو ہے اور تالیوں کے خواب دیکھ رہا ہے۔''

روپ متی سامنے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے نیلے آسمان میں بادل کی ایک تصویر سی نظر آئی۔ کمزور، دبلی، پتلی، برہنہ جسم، گھٹنوں تک دھوتی چکنا سر، پوپلا منہ، عبادت، ایثار اور صداقت کی زندہ مورت۔

آنند نے پھر کہا۔ ''اگر مجھے یقین ہو کہ میرے خون سے ملک بے دار ہو جائے گا۔ تو میں اپنا خون دینے کو آج تیار ہوں۔ لیکن میرے جیسے سو پچاس آدمی نکل آئے تو کیا ہوگا۔ جان دے دینے کے علاوہ اور تو کچھ نتیجہ نظر نہیں آتا۔''

روپ متی اب بھی وہی بادل کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ اس کا وہ تبسم، وہ سادہ دل فریب مسکراہٹ جس نے کائنات کو جیت لیا ہے۔ آنند پھر بولا۔''جن حضرات کو امتحان کا بھوت ستایا کرتا ہے انھیں خدمت وطن کی سوجھتی ہے۔ کوئی پوچھے، آپ اپنی خدمت تو کر نہیں سکتے وطن کی کیا خدمت کریں گے۔ ادھر کے ڈنڈے بھی ہیں۔''

روپ متی کی آنکھیں اب بھی آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ آنند نے جیسے چونک کرکہا۔'' ہاں بڑا پر لطف فلم ہے۔چلتی ہو، پہلے شو میں دیکھ آئیں۔''

روپ متی نے گویا آسمان سے اتر کرجواب دیا۔'' نہیں میرا جی نہیں چاہتا۔''

آنند نے آہستہ سے اسکا ہاتھ پکڑ کر کہا۔'' کیوں طبیعت تو اچھی ہے''؟

روپ متی نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔بولی۔''ہاں طبیعت کو کیا ہوا ہے۔''

آنند: تو چلتی کیوں نہیں؟

روپ متی : آج جی نہیں چاہتا۔

آنند : تو پھر میں بھی نہ جاؤں گا۔

روپ متی : نہایت نیک خیال ہے۔ٹکٹ کے دام کسی کار خیر میں دے دو۔

آنند : یہ تو ٹیڑھی شرط ہے۔ مگر منظور!

روپ متی : کل رسید مجھے دکھا دینا۔

آنند : تمھیں مجھ پر اتنا بھی اعتبار نہیں۔

وہ کچھ بے دل ہو کر ہوسٹل چلا گیا۔ ذرا دیر بعد روپ متی سوراج بھون کی طرف چلی۔

(۲)

روپ متی سوراج بھون پہنچی۔ تو والنٹیروں کی ایک جماعت بدیشی کپڑوں کے گوداموں پر دھرنا دینے جا رہی تھی۔ وشومبھر اس جماعت میں نہ تھا۔ دوسری جماعت شراب کی دوکانوں پر جانے کو تیار تھی۔ وشومبھر اس میں بھی نہ تھا۔ روپ متی نے سکریٹری کے پاس جا کر پوچھا۔" آپ بتا سکتے ہیں وشومبھر کہاں ہیں"؟

سکریٹری : کون وشومبھر؟ وہی جو آج ہی بھرتی ہوئے ہیں؟

روپ متی : جی ہاں، وہی۔

سکریٹری : بڑا دلیر آدمی ہے۔ اس نے دیہات میں کام کرنے کا ذمہ لیا ہے۔ اسٹیشن پر پہنچ چکا ہوگا۔ سات بجے کی گاڑی سے جا رہا ہے۔

روپ متی : تو ابھی اسٹیشن پر ہوں گے ؟

سکریٹری نے گھڑی پر نظرڈال کر جواب دیا۔ "ہاں شاید ابھی اسٹیشن پر مل جائیں۔"

روپ متی نے باہر نکل کر سائکل تیز کی اسٹیشن پر پہنچی تو دیکھا وشومبھر پلیٹ فارم پر کھڑا ہے۔ روپ متی کو دیکھتے ہی اس کے پاس چلا آیا۔ اور بولا۔

"تم یہاں کیسے آ گئیں؟ آج آنند سے ملاقات ہوئی یا نہیں"؟

روپ متی نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا۔" یہ تم نے کیا صورت بنا لی ہے۔ کیا پاؤں میں جوتا پہننا بھی حب وطن کے خلاف ہے"؟

وشومبھر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا آنند بابو نے تم سے کچھ کہا تو نہیں"؟

روپ متی نے جواب دیا۔"جی ہاں کہا ہے۔ لیکن تمھیں یہ کیا سوجھی؟ دو سال سے کم کے لیے نہ جاؤ گے۔ اتنا سوچ لو۔"

وشومبھر کا منہ اتر گیا۔ بولا۔ "جب یہ جانتی ہو، تو کیا تمھارے پاس میری ہمت بڑھانے کے دولفظ بھی نہیں ہے"؟

روپ متی کا دل مسوس اٹھا۔ مگر اس نے ظاہر نہ کیا۔ بولی۔ "تم مجھے دشمن

سمجھتے ہو یا دوست''؟

وشومبھر نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔'' تم ایسا سوال کیوں پوچھتی ہو روپ متی؟ اس جواب میرے منہ سے سنے بغیر بھی تم کہہ سکتی ہو کہ میرا جواب کیا ہوگا''؟

روپ متی : تو میرا مشورہ یہ ہے مت جاؤ۔ اب بھی لوٹ چلو۔''

وشومبھر : یہ دوست کا مشورہ نہیں ہے روپ متی۔ مجھے یقین ہے یہ بات تم دل سے نہیں کہہ رہی ہو۔ ذرا سوچو۔ میری جان کی قیمت کیا ہے؟ ایم، اے پاس کرنے کے بعد بھی سو روپے کی ملازمت !بہت پڑھا تو تین چار سو تک پہنچ جاؤں گا۔ اس کے بدلے یہاں کیا ملے گا؟ جانتی ہو سارے ملک کے لیے سوراج! اتنے عظیم الشان مقصد کے لیے مرجانا بھی اس زندگی سے کہیں اچھا ہے۔ اب جاؤ۔ گاڑی آرہی ہے۔ آنند بابو سے کہنا مجھ سے ناراض نہ ہوں۔''

روپ متی نے آج تک اس کند ذہن نوجوان پر رحم کیا تھا۔ اس وقت اسے اس سے عقیدت ہو چکی تھی۔ ایثا میں دل کو کھینچنے کی جو طاقت ہے روپ متی کو اس نے زور سے کھینچا۔ پھر ناموافق حالات کا تفاوت مٹ سا گیا۔ وشومبھر میں جس قدر خامیاں تھیں وہ سب خوبیاں بن کر چمک اٹھیں۔ اس کے دل کی وسعتوں میں وہ کسی پنچھی کی مانند اڑ اڑ کر گوشئہ عافیت تلاش کرنے لگیں۔''

روپ متی نے اس کی طرف عقیدت مندانہ انداز سے دیکھ کر کہا۔ ''مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔''

وشومبھر کو جیسے گھڑوں نشہ چڑھ گیا۔ بو لا۔ ''تم کو !؟ آنند با بو مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔''

روپ متی : میں آنند بابو کے ہاتھوں بکی نہیں ہوں۔

وشومبھر : آنند تو تمھارے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔

روپ متی نے سرکش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ پر کچھ بولی نہیں۔ ماحول اسے اس وقت پاؤں کی بیڑیاں معلوم ہو رہا تھا۔ کاش، وہ بھی وشومبھر کی مانند آزاد ہوتی۔ امیر والدین کی اکلوتی لڑکی ناز و نعمت میں پلی ہوئی اس وقت اپنے

آپ کو مقید سمجھ رہی تھی۔ اس کی روح ان بندشوں کو توڑنے کے لیے پھڑپھڑانے لگی۔

گاڑی آ گئی۔ مسافر اترنے لگے۔ روپ متی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ''تم مجھے نہیں لے چلو گے؟

وشومبھر نے مستقل مزاجی سے جواب دیا۔ '' نہیں۔''

روپ متی : کیوں؟

وشومبھر : میں اس کا جواب دینا نہیں چاہتا۔

روپ متی : کیا تم سمجھتے ہو کہ میں دیہات میں نہ رہ سکوں گی؟

وشومبھر نادم ہو گیا۔ یہ بھی ایک بڑا سبب تھا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔ ''نہیں یہ بات تو نہیں ہے روپ متی۔''

روپ متی : تو پھر کیا بات ہے؟ کیا اندیشہ ہے کہ والد صاحب مجھے گھر سے نکال دیں گے۔

وشومبھر : اگر یہ اندیشہ ہو تو کیا یہ کم ہے؟

روپ متی : میں اس کی ذرا پروا نہیں کرتی۔ ایک تنکے برابر بھی نہیں۔

وشومبھر نے دیکھا روپ متی کے چاند سے چہرے پر آہنی ارادہ کی روشنی چمک رہی ہے۔ وہ اس کے اس ارادے کے سامنے کانپ اٹھا۔ بولا۔ ''میری درخواست قبول کر لو۔ روپ متی۔ میں تم سے یہ منت کرتا ہوں۔''

روپ متی سوچنے لگی۔

وشومبھر نے کہا۔'' میر خاطر تمھیں یہ ارادہ ترک کر دینا ہوگا۔

روپ متی سر جھکا کر بولی۔'' اگر یہ تمھارا حکم ہے تو میں اس کی تعمیل کروں گی۔ وشومبھر تم شاید دل میں سمجھتے ہوگے یہ عارضی جوش میں آ کر اس وقت مستقبل کو غارت کرنے جارہی ہے۔ میں ثابت کردوں گی یہ میرا عارضی جوش نہیں۔بلکہ مصیبتوں میں بھی قائم رہنے والا عزم ہے۔ جاؤ، مگر میری ایک بات یاد رکھنا۔ قانون کے پنجہ میں اسی وقت آنا جب تمھاری اصول پرستی پر حرف آتا ہو۔ میں تمھاری کامیابی کے لیے پرارتھنا کرتی رہوں گی۔

گاڑی نے سیٹی دی۔ وشو مبھر اندر جا بیٹھا۔گاڑی چلی گئی۔ روپ متی گویا کائنات کی دولت آنچل میں لیے کھڑی رہی۔

(۳)

روپ متی کے پاس وشو مبھر کا ایک پرانا بوسیدہ سا فوٹو الماری کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ آج اسٹیشن سے لوٹ کر اس نے اسے نکالا۔ اور اسے خوب صورت فریم میں لگا کر میز پر رکھ دیا۔ آنند کا فوٹو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔

وشومبھر نے تعطیلوں میں اسے دو چار خط لکھے تھے۔ روپ متی نے انھیں پڑھ کر ایک طرف پھینک دیا تھا۔ آج اس نے ان خطوں کو نکالا اور انھیں دوبارہ پڑھا۔ ان خطوں میں آج حلاوت تھی۔ روپ متی نے انھیں نہایت حفاظت سے رائیٹنگ بکس میں بند کر دیا۔

دوسرے دن اخبار آیا تو روپ متی اس پر ٹوٹ پڑی۔ وشو مبھر کا نام دیکھ کر وہ مسرت سے پھول اٹھی۔ دن میں ایک مرتبہ سوراج بھون میں جانا اس کا معمول ہو گیا۔ جلسوں میں برابر شریک ہوتی۔ عیش وآرام کی تمام اشیاء ایک ایک کرکے پھینک دیں۔ ریشمی ساڑیوں کی جگہ گاڑھے کی ساڑیاں آئیں۔ چرخہ بھی آیا وہ گھنٹوں بیٹھی سوت کاتا کرتی۔'' اس کا سوت روز بروز باریک ہوتا جاتا تھا۔ اسی سوت سے وہ وشومبھر کے کرتے بنائے گی۔

اسی زمانہ میں امتحان کی تیاریاں تھیں۔ آنند کو پھر اس سے ملنے کی فرصت نہ ملی۔ دو ایک مرتبہ وہ آیا۔ لیکن زیادہ دیر بیٹھا نہیں۔ شاید روپ متی کی سرد مہری نے اسے نہ بیٹھنے دیا ہو۔

ایک مہینہ بیت گیا۔

ایک دن شام کو آنند آیا۔ روپ متی سوراج بھون جانے کو تیار تھی۔ آنند نے بھویں سکوڑ کر کہا۔ ''تم سے تو اب بات کرنا بھی مشکل ہے۔''

روپ متی نے کرسی پر بیٹھ کر جواب دیا۔ ''تمھیں بھی تو کتابوں سے چھٹی نہیں ملتی۔ آج کی تازہ خبر نہیں ملی۔ سوراج بھون میں روز بروز کی خبریں مل جاتی ہیں۔''

کی زبان نہ کھلتی تھی۔ وہاں دیہات میں خوب گرجتا ہوگا۔ آدمی منچلا ہے۔''

روپ متی نے اس کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جو کہہ رہی تھیں تم کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ اور بولی۔ ''آدمی میں اگر یہ خوبی ہے تو دوسرے سارے عیب مٹ جاتے ہیں۔ قومی خبریں پڑھنے کو کب فرصت ملتی ہو گی۔ وشومبھر نے گاؤں میں ایسی بے داری پیدا کردی ہے کہ بدیشی کپڑے کا ایک تار بھی نہیں بکنے پاتا۔ نہ کوئی نشہ کی دکانوں پر جاتا ہے۔ اور مزہ یہ ہے کہ کپٹنگ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اب قومی پنچایتیں کھول رہے ہیں۔''

آنند نے بے پروائی سے کہا۔'' تو سمجھ لو اب اس کے چلنے کے دن بھی آگئے۔

روپ متی نے جوش سے جواب دیا۔ ''اتنا کام کرکے جانا بہت سستا نہیں۔ کل تو وہاں ایک بڑا جلسہ ہونے والا تھا۔ پرگنہ بھر کے لوگ جمع ہوئے ہوں گے۔ سنا ہے آج کل دیہات سے کوئی مقدمہ نہیں آتا۔ وکیلوں کی نانی مری جارہی ہے۔''

آنند نے قدرے جوش سے کہا۔'' یہی توسوراج کا مزہ ہے کہ زمیندار، وکیل اور بیوپاری سب مریں۔ صرف مزدور اور کسان رہ جائیں۔''

روپ متی نے سمجھ لیا۔ آج آنند تل کر آیا ہے۔ اس نے بھی جیسے آستین چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تو کیا چاہتے ہو کہ زمیندار اور وکیل اور بیوپاری غریبوں کا خون چوس چوس کر موٹے ہوتے چلے جائیں اور کوئی زبان نہ کھولے؟

آنند گرم ہو کر بولا۔''علم اور دولت کی حکمرانی ہمیشہ رہی ہے۔ اور ہمیشہ رہے گی۔ ہاں اس کی صورت بدل سکتی ہے۔''

روپ متی نے جوش سے کہا۔ ''اگر سوراج ملنے پر بھی دولت کو ہی جگہ ملے اور تعلیم یافتہ لوگ سو سائیٹی میں اسی طرح غرض کے اندھے بنے رہیں۔ تو سوراج نہ ملنا اچھا۔ امراء کے تمول اور تعلیم یافتہ طبقہ کی خود غرضیوں نے ہمیں پیس ڈالا۔جن برائیوں کو رفع کرنے کے لیے آج ہم جان کو ہتھیلی پر لیے ہیں انھیں برائیوں کو کیا ہم اس لیے سر پر چڑھالیں گے کہ وہ بدیشی نہیں۔ سودیشی ہیں۔ کم از کم میرے لیے تو سوراج کا یہ مطلب نہیں کہ جان کی جگہ گوبند آبیٹھے۔ میں سوسائیٹی کی ایسی

ہم اس لیے سر پر چڑھالیں گے کہ وہ بدیشی نہیں۔ سودیشی ہیں۔ کم از کم میرے لیے تو سوراج کا یہ مطلب نہیں کہ جان کی جگہ گوبند آبیٹھے۔ میں سوسائیٹی کی ایسی حالت دیکھنا چاہتی ہوں جہاں غریب سے غریب آدمی کو بھی پیٹ بھرکر کھانا میسر آسکے۔"

آنند : یہ تمھاری ذاتی رائے ہوگی۔

روپ متی : تم نے ابھی اس تحریک کا لٹریچر پڑھا ہی نہیں ہے۔

آنند : نہ پڑھا ہے، نہ پڑھنا چاہتا ہوں۔

روپ متی : نہ پڑھو۔ اس سے ملک کو کوئی نقصان پہنچنے کا احتمال نہیں ہے۔

آنند : تم تو جیسے وہ رہی ہی نہیں۔ بالکل کایا پلٹ ہو گئی۔

اتنے میں چٹھی رساں نے اخبار لاکر میز پر رکھ دیا روپ متی نے بے صبری سے اسے کھولا۔ پہلے عنوان پرنظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں جیسے سرور چھا گیا۔ گردن خود بخود تن گئی۔ اور چہرے پرایک عجیب قسم کا نور برسنے لگا۔

اس نے جوش سے کھڑے ہو کر کہا۔ "وشومبھر گرفتار ہوکر دوسال کے لیے جیل چلے گئے۔

آنند نے افسردگی سے پوچھا۔" کس معاملہ میں؟

روپ متی نے وشومبھر کے فوٹو کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔" رانی گنج میں جلسہ تھا وہیں پکڑے گئے ہیں۔"

آنند : میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ دوسال کے لیے جائیں گے۔ زندگی خراب کرلی۔

روپ متی نے سرد مہر سے کہا۔ "کیا ڈگری لے لینے سے ہی آدمی کی زندگی شاندار بنتی ہے؟ کیا سارا علم، سارا تجربہ کتابوں ہی میں بھرا ہے؟ میرا خیال ہے انسانی فطرت کا جس قدر عملی تجربہ وشومبھر کو دوسال میں ہو جائے گا۔ اتنا تجربہ فلسفہ اور منطق کی کتابوں سے تمھیں دس سال میں بھی نہ ہوگا۔ اگر تعلیم کا مقصد کیرکٹر ہے۔ تو ملکی تحریک میں اس کے جس قدر ذرائع ہیں۔ وہ پیٹ کی لڑائی میں کبھی نہیں ہوسکتے۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ہمارے لیے پیٹ کی فکر ہی بہت ہے۔ تو میں

مان لوں گی۔ لیکن ملک اور قوم کی خدمت کرنے والوں کو بے وقوف بنانا میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔''

آنند : آج وشومبھر کو مبارک باد دینے کے لیے جلسہ ہوگا جاؤ گی؟

روپ متی نے خود سرانہ انداز میں کہا۔''ضرور جاؤں گی۔ میں تو لیکچر بھی دوں گی۔ کل رانی گنج چلی جاؤ گی۔ اور وشومبھر نے جو چراغ روشن کیا ہے میری زندگی میں بجھنے نہ پائے گا۔

آنند نے ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح تنکے کا سہارا لے کر کہا ''تم نے اپنے والدین سے بھی پوچھا؟

روپ متی : پوچھ لوں گی۔

آنند : اور وہ تمھیں اجازت دے دیں گے۔

روپ متی : اصول کے سامنے کسی کی اجازت کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

آنند : اچھا یہ نئی بات معلوم ہوئی۔

یہ کہتا ہوا آنند اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کچھ کہے کمرہ سے باہر نکل گیا۔ اس وقت اس کے پیر اس طرح لڑکھڑا رہے تھے جیسے اب گرا۔ اب گرا......

یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ ہنس کے نومبر 1930 کے شمارے میں شائع ہوا۔ پھر 1 جنوری 1931 کو اردو کے چندن میں شائع ہوا۔ عنوان تھا آہوتی۔ یہ مجموعہ کفن میں شامل ہے۔ اردو میں یہ آخری تحفہ میں شائع ہوا ہے۔

ڈھپورسنکھ

مرادآباد میں میرے ایک پرانے مِتر ہیں، جنھیں دل میں تو میں ایک رتن سمجھتا ہوں پر پکارتا ہوں ڈھپورسنکھ کہہ کر اور وہ برا بھی نہیں مانتے ہیں۔ ایشور نے انھیں جتنا ہردے دیا ہے، اس کی آبدھی بدھی دی ہوتی تو آج وہ کچھ اور ہوتے۔ انھیں ہمیشہ تنگ ہست (تنگ دست) ہی دیکھا، مگر کسی کے سامنے کبھی ہاتھ پھیلاتے نہیں دیکھا۔ ہم اور وہ بہت دنوں تک ساتھ پڑھے ہیں۔ خاصی بے تکلفی ہے، پر یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے لیے سو پچاس روپے سے ان کی مدد کرنا کوئی بڑی بات نہیں اور میں بڑی خوشی سے کروں گا، کبھی مجھ سے ایک پائی کے روادار نہ ہوئے اگر پہلے سے بچوں کو دو چار روپے دے دیتا ہوں تو وداع ہوتے سمے اس کی دوگنی رقم کے مرادآبادی برتن لادنے پڑتے ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ نیم (اصول) بنا لیا ہے کہ ان کے پاس جاتا ہوں تو ایک دو دن میں جتنی بڑی سے بڑی چپت دے سکتا ہوں دیتا ہوں، موسم میں جو مہنگی سے مہنگی چیز ہوتی ہے وہی کھاتا ہوں اور مانگ مانگ کر کھاتا ہوں۔ مگر دل کے ایسے بے حیا ہیں کہ ایک بار بھی ادھر سے نکل جاؤں اور ان سے نہ ملوں تو بری طرح ڈانٹ بتاتے ہیں۔ ادھر دو تین سال سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جی دیکھنے کو چاہتا تھا۔ مئی میں نینی تال جاتے ہوئے ان سے ملنے کے لیے اتر پڑا۔ چھوٹا سا گھر ہے، چھوٹا سا پریوار، چھوٹا سا ڈیل۔ دوار پر آواز دی ڈھپورسنگھ ترنت باہر نکل آئے اور گلے سے لپٹ گئے۔ تانگے پر سے میرے ٹرنک (بکس) تو اتار کر کندھے پر رکھا۔ بستر بغل میں دبایا اور گھر میں داخل

ہوئے۔ کہتا ہوں بستر مجھے دے دو مگر کون سنتا ہے۔ بھیتر قدم رکھا، تو دیوی جی کے درشن ہوگئے۔ چھوٹے بچے نے آکر پرنام کیا بس یہی پریوار ہے۔

کمرے میں گیا تو دیکھا خطوں کا دفتر پھیلا ہواہے۔ خطوں کو سرکشت (حفاظت سے) رکھنے کی تو ان کی عادت نہیں؟ اتنے خط کس کے ہیں؟ کوتوہل (حسرت) سے پوچھا یہ کیا کوڑا پھیلا رکھا ہے جی، سمیٹو۔

دیوی جی مسکرا کر بولیں۔ کوڑا نہیں کہیے، ایک ایک پتر، ساہتیہ کا رتن ہے، آپ تو ادھر آئے نہیں، ان کے ایک نئے مِتر پیدا ہوگئے ہیں۔ یہ انھی کے کملوں کے پرساد ہیں۔ ....

ڈھپور سنکھ نے اپنی ننھی ننھی آنکھیں سکوڑ کر کہا۔ تم اس کے نام سے کیوں اتنا جلتی ہو، میری سمجھ میں نہیں آتا؟ اگر تمھارے دو چار سو روپے اس پر آتے ہیں تو ان کا دیندار میں ہوں۔ وہ بھی ابھی جیتا جاگتاہے، کسی کو بے ایمان کیوں سمجھتی ہو؟ یہ کیوں نہیں سمجھتی کہ اسے ابھی سودھا نہیں ہے اورپھر دو چار سو روپے ایک مِتر کے ہاتھوں ڈوب ہی جائیں تو کیوں روؤں مانا ہم غریب ہیں، دو چار سو روپے ہمارے لیے دوچار لاکھ سے کم نہیں لیکن کھایا تو ایک مِتر نے۔

دیوی جی جتنی روپ وتی تھی اتنی ہی زبان کی تیز تھی بولی اگر ایسو ہی کا نام متر ہے تو میں نہیں سمجھتی شَترو (دشمن) کسے کہتے ہیں۔

ڈھپورسنکھ نے میری طرف دیکھ کر، مانو مجھ سے حامی بھرنے کے لیے کہا۔ عورتوں کا ہردے بہت ہی سَنکیرڑ (تنگ) ہوتاہے۔

دیوی جی ناری جاتی پر یہ آکشیپ (الزام) کیسے سہہ سکتی تھی آنکھیں تریر کر بولی یہ کیوں نہیں کہتے کہ اُلّو بنا کر لے گیا اوپر سے ہیکڑی جتاتے ہو دال گر جانے پر تمھیں بھی سوکھا اچھا لگے تو کوئی آشچریہ (حیرت) نہیں۔ میں جانتی ہوں روپیہ ہاتھ کا میل ہے۔ یہ بھی سمجھتی ہوں کہ جس کے بھاگیہ کا جتنا ہوتا ہے اتنا وہ کھاتا ہے مگر یہ میں کبھی نہ مانوں گی کہ وہ سجّن تھا اور آدرش وادی تھا اور یہ تھا وہ تھا صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔ لَمپٹ تھا دغا باز تھا۔ بس میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں۔

ڈھپورسنکھ نے گرم ہو کر کہا۔ میں یہ نہیں مان سکتا۔ دیوی جی بھی گرم ہو کر

بولیں تمھیں ماننا پڑے گا مہاشے جی آ گئے ہیں میں انھیں پنچ بناتی ہوں۔ اگر یہ کہہ دیں گے کہ سجنتا کا پتلا تھا، آدرش وادی (اصولپسند) تھا ویراتما تھا تو میں مان لوں گی اور پھر اس کا نام نہ لوں گی اور یدی ان کا فیصلہ میرے انوکول ہوا تو لالہ تمھیں ان کو اپنا بہو نئی کہنا پڑے گا۔

میں نے پوچھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے آپ کس کا ذکر کر رہی ہیں؟ وہ کون تھا؟دیوی جی نے آنکھیں نچاکرکہا۔ انھیں سے پوچھو کون تھا؟ان کا بہنوئی تھا۔

ڈھپورسنگھ نے جھینپ کر کہا۔ اجی، ایک ساہتیہ سیوی تھا۔ کروناکر جوشی۔ بے چارا وپتی کا مارا یہاں آپڑا تھا۔ اس وقت تو یہ بھی بھیا بھیا کرتی تھی حلوا بنا بنا کر کھلاتی تھی اس وپتّی کتھا (مصیبت کی کہانی) سن کر ٹسوے بہاتی تھی اور آج وہ دغاباز ہے۔ لمپٹ (بدمعاش) ہے لبار ہے؟

دیوی جی نے کہا وہ تمھارے خاطر تھی۔ میں سمجھتی تھی لیکھ لکھتے ہو واکھیان دیتے ہو، ساہتیہ کے مرمگہ (رازدان) بنتے ہو کچھ تو آدمی پہچانتے ہوگے پر اب معلوم ہوگیا قلم گھسنا اور بات ہے منشیہ کی ناڑی (نس) پہچاننا اوربات۔

میں اس جوشی کا ورتانت (کہانی) سننے کے لیے اتسک ہو اٹھا ڈھپورسنگھ تو اپنا پچڑا سنانے کے لیے تیار تھے مگر دیوی جی نے کہا۔ کھانے پینے سے نورت (نپٹ کر) ہو کر پنچایت بیٹھے۔ میں نے بھی اسے سویکار کر لیا۔

دیوی جی گھر میں جاتی ہوئی بولیں۔ تمھیں قسم ہے جو ابھی جوشی کے بارے میں ایک شبد بھی ان سے کہو۔ میں بھوجن بنا کر جب تک کھلا نہ لوں تب تک دونوں آدمیوں پر دفعہ ۱۴۴ ہے۔

ڈھپورسنگھ کے آنکھیں مار کر کہا۔ تمھارا نمک کھا کر یہ تمھاری طرف داری کریں گے ہی۔ اس بار دیوی جی کے کانوں میں یہ جملہ نہ پڑا۔ دھیمے سور (ہلکی آواز) میں کہا بھی گیا تھا، انھیں تو دیوی جی نے کچھ نہ کچھ جواب ضرور دیا ہوتا۔ دیوی جی چولھا جلا چکی اور ڈھپور سنگھ ان کی طرف سے نشچنت (مطمئن) ہوگئے۔ تو مجھ سے بولے جب تک وہ رسوئی میں ہے میں سنکشیپ (مختصراً) میں تمھیں یہ ورتانت (کہانی) سنادوں۔

میں نے دھرم کی آڑ لے کر کہا: نہیں بھائی میں پنچ بنایا گیا ہوں اور اس وشے میں کچھ نہ سنوں گا انھیں آجانے دو۔

مجھے بھے ہے کہ تم انھیں کا سا فیصلہ کردوگے اور پھر وہ میرا گھر میں رہنا اپاڑھ۔ کردے گی۔ میں نے دھارس دیا یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں میں کیا فیصلہ کروں گا؟

میں تمھیں جانتا جو ہوں۔ تمھاری عدالت میں عورتوں کے سامنے مرد کبھی جیت ہی نہیں سکتا۔

تو کیا چاہتے ہو۔ تمھاری ڈگری کردوں۔

کیا دوستی کا اتنا بھی حق نہیں ادا کر سکتے؟

اچھا لو تمھاری جیت ہوگی چاہے گالیاں ہی کیوں نہ ملیں۔

کھاتے پیتے دوپہر ہو گئی۔ رات کا جاگا تھا۔ سونے کی اِچھا ہو رہی تھی پر دیوی جی کب ماننے والی تھیں بھوجن کر کے آپہنچیں۔ ڈھپور سنگھ کے پتروں کا پلندہ سمیٹا اور درتانت سنانے لگے۔

دیوی جی نے ساودھان کیا۔ ایک شبدھ بھی جھوٹ بولے تو جرمانہ ہوگا۔

ڈھپور سنگھ نے گمبھیر ہو کر کہا۔ جھوٹ وہ بولتا ہے جس کا پکش نربل ہوتا ہے۔ مجھے تو اپنی وجے کا وشواس ہے۔

اس کے بعد کتھا شروع ہو گئی۔

دو سال سے زیادہ ہوئے ایک دن میرے پاس ایک پتر آیا جس میں ساہتیہ سیوا کے ناتے ایک ڈرامے کی بھومکا لکھنے کی پریرنا (ترغیب) کی گئی تھی۔ کرونا کرن کا پتر تھا۔ اس ساہتیک ریتی (ادبی طریقے) سے میرا ان سے پرتھم (پہلا) پریچے ہوا۔ ساہتیہ کاروں کی اس زمانے میں جو دردشا (بری حالت) ہے اس کا انوبھو کر چکا ہوں اور کرتا رہتا ہوں اور یدی بھومکا تک بات رہے تو ان کی سیوا کرنے میں پس و پیش نہیں ہوتا۔ میں نے ترنت جواب دیا آپ ڈراما بھیج دیجئے ایک سپتاہ میں ڈراما آ گیا پر اب کے پتر میں بھومکا لکھنے ہی کی نہیں کوئی پرکاشک (شائع کنندہ) ٹھیک کر دینے کی بھی پرارتھنا کی گئی تھی۔ میں پرکاشوں کا جھنجٹ میں نہیں پڑتا۔ دو

پڑتا۔ دو ایک بار پکڑ کر کئی متروں کو جانی دشمن بنا چکا ہوں۔ میں نے ڈرامے کو پڑھا، اس پر بھومکا لکھی اور ہست لپی لوٹا دی۔ ڈراما مجھے سندر معلوم ہوا اس لئے بھومکا بھی پرشنساتمک (قابل تعریف) تھی کتنی ہی پستکوں کی بھومکا لکھ بھی چکا ہوں۔ کوئی نئی بات نہ تھی۔ پر اب کی بھومکا لکھ کر پنڈ نہ چھوٹا۔ ایک سپتاہ کے بعد ایک لیکھ آیا کہ اسے اپنی پتریکا (میگزین) میں پرکاشت (شائع) کر دیجیے۔ (ڈھپور سنگھ ایک پتریکا میں سمپادک ہے) اسے گن کہیے یا دوش مجھے دوسروں پر وشواس بہت جلدی آجاتا ہے اور جب کسی لیکھ کا معاملہ ہو تو میری وشواس کریا اور بھی تیز ہوجاتی ہے میں اپنے ایک متر کو جانتا ہوں جو ساہتیہ کاروں کے سائے سے بھاگتے ہیں۔ وہ خود نرپن (ماہر) لیکھک ہے۔ بڑے ہی سجن ہیں بڑے ہی زندہ دل۔ اپنی شادی کر کے لوٹنے پر جب جب راستے میں مجھ سے بھینٹ ہوئی کہا آپ کی مٹھائی رکھی ہوئی ہے بھجوا دوں گا۔ پر وہ مٹھائی آج تک نہ آئی، حالانکہ اب ایشور کی دیا سے دواہ ترو میں پھل بھی لگ آئے، لیکن خیر میں ساہتیہ سیویوں سے اتنا چوکنا نہیں رہتا۔ ان پتروں میں اتنی ونے (استدعا) اتنا آگرہ (حوصلہ) اتنی بھکتی ہوتی تھی کہ مجھے جوشی سے بنا ساکشاتکا (ملاقات) کے ہی اسنہ (محبت) ہوگیا معلوم ہوا ایک بڑے باپ کا بیٹا ہے گھر سے اس لئے نرواست (نکلا) ہے کہ اس کے چاچا جہیز کی ایک لمبی رقم لے کر اس کا دواہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ اسے منظور نہ ہوا۔ اس پر چاچا نے گھر سے نکال دیا۔ باپ کے پاس گیا۔ باپ آدرش بھاتر بھکت تھا۔ اس نے چاچا کے فیصلے کی اپیل نہ سنی۔ ایسی دشا میں سدھانت کا مارا یوک سوائے گھر سے باہر نکل بھاگنے کے اور کیا کرتا؟ یوں وَن وَن (جنگل جنگل) کے پتے توڑتا دوار دوار ٹھوکریں کھاتا وہ گوالیر آگیا تھا اس پر منداگنی کا روگی، جیرن (رانا) جور (بخار) سے گرست (بتلا)۔ آپ ہی بتلائیے ایسے آدمی سے کیا سہانبھوتی (ہمدردی) نہ ہوتی؟ پھر جب ایک آدمی آپ کو پریہ بھائی صاحب لکھتا ہے اپنا منو رہسیہ آپ کے سامنے کھول کر رکھتا ہے وپتی میں بھی دھیرے اور پروشارتھ (مردانگی) کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا کڑے سے کڑا پری شرم کرنے کو تیار ہے تو یدی آپ میں سوجنیہ کا انوماتر بھی ہے تو آپ اس کی مدد ضرور کریں گے۔

اچھا پھر اب ڈرامے کی طرف آیئے۔ کئی دنوں بعد جوشی کا پتر پریاگ سے آیا۔ وہ وہاں کے ایک ماسک پتریکا (ماہانہ میگزین) کے سمپادکیہ وبھاگ میں نوکر ہو گیا تھا۔ یہ پتر پا کر مجھے اتنا سنتوش (اطمینان) اورآنند (خوشی) ہوا کہہ نہیں سکتا۔ کتنا اُدھم شیل آدمی ہے اس کے پرتی میرا سینہ اور بھی پرگاڑھ (زیادہ) ہوگیا۔ پتریکا کا سوامی سمپادک سختی سے پیش آتا تھا۔ ذرا سی دیر ہو جانے پر دن بھر کی مزدوری کاٹ لیتا تھا۔ بات بات پر گھڑکیاں جماتا تھا پر وہ ساہتیہ گراس ویر سب کچھ سہہ کر بھی اپنے کام میں لگا رہتا تھا۔ اپنا بھوشیہ (مستقبل) بنانے کا ایسا اوسر (موقع) پا کر وہ اسے کیسے چھوڑ دیتا۔ یہ ساری باتیں اِسنیہہ اور وشواس کو بڑھانے والی تھیں۔ ایک آدمی کو کٹھنائیوں کا سامنا کرتے دیکھ کر کسے اس سے پریم نہ ہوگا۔ گرو نہ ہوگا۔

پریاگ میں وہ زیادہ نہ ٹھہر سکا۔ اس نے مجھے لکھا میں سب کچھ جھیلنے کو تیار ہوں بھوکو مرنے کو تیار ہوں پر آتم سمّان میں داغ نہیں لگا سکتا، کوچن (میرے الفاظ) نہیں کہہ سکتا۔

ایسا چرتر یدی آپ پر پربھاؤ نہ ڈال سکے تو میں کہوں گا آپ چالاک چاہے جتنے ہوں پر ہردیہ سونہ (صفر) ہیں۔

ایک سپتاہ کے بعد پریاگ سے پھر پتر آیا۔ یہ وَیوہار (سلوک) میرے لیے اسہن (ناقابل برداشت) ہو گیا آج میں نے استعفا دے دیا۔ یہ نہ سمجھیے کہ میں نے ہلکے دل سے لگی لگائی روزی چھوڑ دی۔ میں نے وہ سب کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا یہاں تک کہ کچھ کچھ وہ بھی کیا، جو مجھے نہ کرنا چاہیے تھا پر آتم سمّان کا خون نہیں کر سکتا۔ اگر یہ کر سکتا تو مجھے گھر چھوڑ کر نکلنے کی کیا آوشیکتا (ضرورت) تھی۔ میں بمبئی جا کر قسمت آزمانے کا نشچے کیا ہے میرا دَرڑھ سنکلپ (پختہ ارادہ) ہے کہ اپنے گھر والوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤں گا۔ ان سے دیا کی بھکشہ نہ مانوں گا۔ مجھے قلی گیری کرنی منظور ہے۔ ٹوکری ڈھونا منظور ہے پر اپنی آتما کو کلنکِت نہیں کرسکتا۔

میری شردھا (عقیدہ) اور بڑھ گئی۔ یہ ویکتی (شخص) میرے لیے کیول ایک

ڈرامے کا چرتر (کردار) نہ تھا جس کے سکھ سے سکھی اور دکھ سے دکھی ہونے پر بھی ہم درشک ہی رہتے ہیں وہ اب میرے اتنے نِکٹ پہنچ گیا تھا کہ اس پر آگھات ہوتے دیکھ کر میں اس کی رکشا کرنے کو تیار تھا۔ اسے ڈوبتے دیکھ کر پانی میں کودنے سے بھی نہ ہچکتا۔

میں بڑی اُتکنٹھا سے اس کے بمبئی سے آنے والے پتر کا انتظار کرنے لگا۔ چھٹے دن پتر آیا۔ وہ بمبئی میں کام کھوج رہا تھا۔ لکھا تھا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے میں سب کچھ جھیلنے کو تیار ہوں۔ پھر دو دو چار چار دن کے انتر (فرق) سے کئی پتر آئے وہ ویروں کی بھانتی کٹھنائیوں کے سامنے کمر کسے کھڑا تھا۔ حالانکہ تین دن سے اسے بھوجن نہ ملا تھا۔

او۔ کتنا اونچا آدرش ہے۔ کتنا اجول چرتر (کردار)۔ میں سمجھتا ہوں میں نے اس سے بڑی کریتا کی۔ میری آتمانے مجھے دھکارا یہ بے چارہ اتنے کشٹ (دکھ) اٹھا رہا ہے اور تم بیٹھے دیکھ رہے ہو۔ کیوں اس کے پاس کچھ روپے نہیں بھیجتے؟ میں نے آتما کے کہنے پر عمل نہ کیا۔ پر اپنی بے دردی پر کھِن (رنجیدہ) اُوشے تھا۔

جب کئی دن کی بے چینی بھرے ہوئے انتظار کے بعد یہ سماچار آیا کہ وہ ایک ساپتاہک پتر کے سمپادکیہ وبھاگ میں جگہ پا گیا ہے تو میں نے آرام کی سانس لی اور ایشور کو سچے دل سے دھنے واد دیا۔

ساپتاہک میں جوشی کے لیکھ نکلنے لگے۔ انھیں پڑھ کر مجھے گرو ہوتا تھا کتنے سجیو، کتنے وچار سے بھرے لیکھ تھے۔ اس نے مجھ سے بھی لیکھ مانگے پر مجھے اوکاش نہ تھا۔ چھما مانگی حالانکہ اس اوسر پر اس کو پروتساہن (حوصلہ افزائی) نہ دینے پر مجھے بڑا کھید ہوتا تھا۔

لیکن شاید با دھائیں ہاتھ دھوکر اس کے پیچھے پڑیں تھیں۔ پتر کے گراہک کم تھے چندے اور ڈونیشن سے کام چلتا تھا روپے ہاتھ آجاتے تو کرمچاریوں کو تھوڑا تھوڑا مل جاتا، نہیں آسرہ لگائے کام کرتے رہتے۔ اس دشا میں غریب نے تین مہینے کانٹے ہوں گے آشا تھی کہ تین مہینے کا حساب ہوگا تو اچھی رقم ہاتھ لگے گی مگر وہاں سوکھا جواب ملا۔ سوامی نے ٹاٹ الٹ دیا پتر بند ہو گیا اورکرمچاریوں کو اپنا سا منھ لیے

وداع ہونا پڑا۔ سوامی کی سجنتا میں سندیہ نہیں لیکن روپے کہاں سے لاتا۔ سجنتا کے ناطے لوگ آدھے ویتن پر کام کر سکتے تھے لیکن پیٹ باندھ کر کام کرنا کب ممکن تھا۔ اور پھر بمبئی کا خرچ بے چارے جوشی کو پھرٹھوکریں کھانی پڑیں میں نے خط پڑھا تو بہت دُکھ ہوا۔ ایشور نے مجھے اس یوگیہ نہ بنایا، نہیں بے چارہ کیوں پیٹ کے لیے یوں مارا مارا پھرتا۔

اب کے بار بہت حیران نہ ہونا پڑا۔ کسی مل میں گانٹھوں پر نمبر لکھنے کا کام مل گیا ایک روپیہ روز مزدوری تھی بمبئی میں ایک روپیہ، ادھر کے چار آنے کے برابر سمجھو، کیسے اس کا کام چلتا تھا ایشور ہی جانے۔

کئی دن کے بعد ایک لمبا پتر آیا۔ ایک جرمن ایجنسی اسے رکھنے پر تیار تھی، اگر ترنت سو روپے کی ضمانت دے سکے ۔ ایجنسی یہاں کی فوجوں میں جوتے ، سگار، صابن آدمی سپلائی کرنے کا کام کرتی تھی۔ اگر یہ جگہ مل جاتی۔ تو اس کے دن آرام سے کٹنے لگتے۔لکھا تھا، زندگی سے تنگ آگیا ہوں، ہمت نے جواب دے دیا۔ آتم ہتّیا (خودکشی) کرنے کے سوا اورکوئی اپائے نہیں سوجھتا۔ کیول ماتا جی کی چنتا ہے۔ رو رو کر پران دے دیں گی۔ پتاجی کے ساتھ انھیں شاریرک (جسمانی) سکھوں کی کمی نہیں۔ پر میرے لیے ان کی آتما تڑپتی رہتی ہے۔ میری یہی ابھیلاشا ہے کہ کہیں بیٹھنے کا ٹھکانا مل جاتا، تو ایک بار انھیں اپنے ساتھ رکھ کر ان کی جتنی سیوا ہو سکتی، کرتا۔ اس کے سوا مجھے کوئی اچھا نہیں، لیکن ضمانت کہاں سے لاؤں؟ بس، کل کا دن اور ہے۔ پرسوں کوئی دوسرا امیدوار ضمانت دے کر یہ لے لے گا اور میں تاکتا رہ جاؤں گا۔ ایجنٹ مجھے رکھنا چاہتاہے، لیکن اپنے کاریالیہ (دفتر) کے نیموں کو کیا کرے۔

اس پتر نے میری کرپن (بخیل) پرکرتی (فطرت) کو بھی وشی بھوت (تابع) کر لیا۔ اچھا ہو جانے پر کوئی نہ کوئی راہ نکل آتی ہے۔ میں نے روپے بھیجنے کا نشچے (فیصلہ) کر لیا۔ اگر اتنی مدد سے ایک یوک کا جیون سدھر رہاہوں، تو کون ایسا ہے، جو منھ چھپا لے۔ اس سے بڑا رپیوں کا اور کیا سد اُپیوگ (اچھا استعمال) ہو سکتا ہے۔ ہندی میں قلم گھسنے والوں کے پاس اتنی بڑی رقم ذرا مشکل ہی سے نکلتی۔ پر

سنیوگ (اتفاق) سے اس وقت میرے کوش (خزانہ) میں روپے موجود تھے۔ میں اس کے لیے اپنی گرپتا کارنی (قرضدار) ہوں۔ دیوی جی کی صلاح لی۔ وہ بڑی خوشی سے راضی ہوگئیں۔ حالانکہ اب سارا دوش میرے ہی سر منڈا جاتا ہے۔ کل روپیوں کا پہچانا آویشک تھا نہیں تو اوسر (موقع) ہاتھ سے نکل جائے گا۔ منی آرڈر تین دن میں پہنچے گا۔ ترنت تار گھر گیا اور تار سے روپے بھیج دئے۔ جس نے برسوں کتر بیونت کے بعد اتنے روپے جوڑے ہوں اور جسے بھوشیہ بھی ابھاؤ میں (فقدان سے پُر) ہی دیکھتا ہو، وہی اس آنند کا انوبھو (احساس) کر سکتا ہے، جو اس سمے مجھے ہوا۔ سیٹھ امیرچند کو دس لاکھ کا دان کر کے بھی اتنا آنند نہیں ہوا ہوگا۔ دیا تو میں نے رن (قرض) سمجھ کر ہی پر وہ دوستی کا رن تھا۔ جس کا ادا ہونا سوپن (خواب) کا یتھارتھ ہونا ہے۔ اس پتر کو میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ جو دھنے واد کے روپ (شکل) میں چوتھے دن مجھے ملا۔ کیسے سچے ادگار تھے۔ ایک ایک شبد (لفظ) انوگرہ (احسان) میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں اسے ساہتیہ کی ایک چیز سمجھتا ہوں۔

دیوی جی نے چٹکی لی۔ سو روپے میں اس سے بہت اچھا پتر مل سکتا ہے۔

ڈھپور سنکھ نے کچھ جواب نہ دیا کتھا کہنے میں تنمے (محو) تھے۔

بمبئی میں وہ کیسی پرسدھ استھان پر ٹھہرہ تھا کیول نام اور پوسٹ بکس لکھنے ہی سے اسے پتر مل جاتا تھا۔ وہاں سے کئی پتر آئے۔ وہ پرسن تھا۔

دیوی جی بولیں۔ پرسن کیوں نہ ہوتا، کپے میں ایک چڑیا جو پھنس گئی تھی۔

ڈھپور سنکھ نے چڑ کر کہا۔ یا تو مجھے کہنے دو، یا تم کہو، بیچ میں مت بولو۔

بمبئی سے کئی دن کے بعد ایک پتر آیا کہ ایجنسی نے اس کے ویوہار سے پرسن ہو کر اسے کاشی میں نیکت (تعینات) کر دیاہے اور وہ کاشی آرہا ہے اسے ویتن کے اپرانت (بعد) بھتے بھی ملے گا۔ کاشی میں اس کے ایک موسا تھے جو وہاں کے پرشدھ ڈاکٹر تھے۔ پر وہ ان کے گھر نہ اتر کر الگ ٹھہرا۔ اس سے اس کے آتم سمان کا پتا چلتا ہے۔ مگر ایک مہینے میں کاشی سے اس کا جی بھر گیا۔ شکایت سے بھرے پتر آنے لگے۔ صبح سے شام تک فوجی آدمیوں کی خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ صبح کا گیا گیا دس بجے رات کو گھر آتا ہوں، اس وقت اکیلا اندھیرا گھر دیکھ کر چت

(دل) دکھ سے بھر جاتا ہے۔ کس سے بولوں، کس سے ہنسوں، بازار کی پوریاں کھاتے کھاتے تنگ آگیا ہوں۔ میں نے سمجھا تھا، اب کچھ دن چین سے کٹیں گے، لیکن معلوم ہوتا ہے ابھی قسمت میں ٹھوکر کھانا لکھا ہے۔ میں اس طرح جیوت نہیں رہ سکتا۔ رات رات بھر پڑا روتا رہتا ہوں۔ آدمی (وغیرہ) مجھے ان پتروں میں وہ اپنے آدرش سے گرتا ہوا معلوم ہوا۔ میں نے اسے سمجھایا، لگی روزی نہ چھوڑو، کام کئے جاؤ، جواب آیا۔ مجھ سے اب یہاں نہیں رہا جاتا۔ فوجیوں کا ویوہار آسہیہ (ناقابل برداشت) ہے۔ پھر منیجر صاحب مجھے رنگون بھیج رہے ہیں۔ اور رنگون جا کر میں بچ نہیں سکتا۔ میں کوئی ساہتک کام کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ دن آپ کی سیوا میں رہنا چاہتاہوں۔

میں اس پتر کا جواب دینے جا ہی رہا تھا کہ پھر پتر آیا۔ میں کل دہرہ دون ایکسپریس سے آرہا ہوں۔ دوسرے دن وہ آ پہنچا۔ دبلا سا آدمی، سانولا رنگ لمبا منھ، بڑی بڑی آنکھیں انگریزی ویش،ساتھ میں کئی چمڑے کے ٹرنک ایک سوٹ کیس، ایک ہول ڈال، میں تو اس کے ٹھاٹ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

دیوی جی نے ٹپنی کی۔ پھر بھی تو نہ چیتے۔ میں نے سمجھا تھا گاڑے کا کرتہ، چپل، زیادہ سے زیادہ فاؤنٹین پین والا آدمی ہوگا۔ مگر یہ مہاشے تو پورے صاحب بہادر نکلے۔ مجھے اس چھوٹے سے گھر میں انھیں ٹھہراتے ہوئے سنکوچ ہوا۔

دیوی جی سے بنا بولے نہ رہا گیا۔ آتے ہی شری چرنوں پر سر تو رکھ دیا۔ اب اورکیا چاہتے تھے۔

ڈھپور سنگھ اب کی مسکائے۔دیکھو شیاما، بیچ بیچ میں ٹوکومت۔ عدالت کی پرتشٹھا (عزت) یہ کہتی ہے کہ ابھی چپ چاپ سنتی جاؤ جب تمھاری باری آئے تو جو چاہے کہنا۔

پھر سلسلہ شروع ہوا۔ تھا تو دبلا پتلا مگر بڑا پھرتیلا، بات چیت میں بڑا چتر، ایک جملہ اگریزی بولتا، ایک جملہ ہندی، اور ہندی انگریزی کی کھچڑی جیسے آپ جیسے سبھیہ (مہذب) لوگ بولتے ہیں۔ بات چیت شروع ہوئی۔ آپ کے درشنوں کی بڑی اچھا تھی۔ میں نے جیسا انومان کیا تھا ویسا ہی آپ کو دیکھا۔ بس اب معلوم ہو رہا

میں نے کہا: تو کیا استعفا دے دیا؟

نہیں ابھی تو چٹھی لے کر آیا ہوں۔ ابھی اس مہینے کا ویتن بھی نہیں ملا۔ میں نے لکھ دیاہے یہاں کے پتے سے بھیج دیں۔ نوکری تو اچھی ہے، مگر کام بہت کرنا پڑتا ہے اور مجھے کچھ لکھنے کا اوسر نہیں ملتا۔

خیر، رات کو میں نے اسی کمرے میں انھیں سلایا، دوسرے دن یہاں کے ایک ہوٹل میں پربندھ (انتظام) کر دیا۔ ہوٹل والے پیشگی روپیہ لیتے ہیں۔ جوشی کے پاس روپیے نہ تھے مجھے تیس روپے دینے پڑے۔ میں نے سمجھا اس کا ویتن تو آتا ہی ہوگا، لے لوں گا۔ یہاں میرے ایک ماتھر متر ہیں۔ ان سے بھی میں نے جوشی کا ذکر کیا تھا۔ اس کے آنے کی خبر پاتے ہی ہوٹل دوڑے دونوں میں دوستی ہوگئی۔ جوشی نے دو تین بار دن میں ایک بار رات کو ضرور آتے۔ اور خوب باتیں کرتے، دیوی جی ان کو ہاتھوں پر لئے رہتی۔ کبھی ان کے لیے پکوڑیاں بن رہی ہیں کبھی حلوہ۔ جوشی ہرفن مولا تھا۔ گانے میں کشل ہارمونیم میں نپن (ماہر) اندرجال (جادو) کے کرتب دکھلانے میں کشل، سالن اچھا پکاتا تھا دیوی جی کو گانا سیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا اسے میوزک ماسٹر بنا لیا۔

دیوی جی لال منھ بنا کر کے بولیں۔ تو کیا مفت میں حلوہ پکوڑیاں اور پان بنا بنا کر کھلاتی تھی؟

ایک مہینہ گذر گیا پر جوشی کا ویتن نہ آیا۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ سوچا اپنے دل میں سمجھے گا، اپنے ہوٹل والے روپیوں کا تقاضا کر رہے ہیں۔ ماتھر کے گھر بھی اس نے آنا جانا شروع کردیا۔ دونوں ساتھ گھومنے جاتے، ساتھ رہتے، جوشی جب آتے، ماتھر کا بکھان کرتے، ماتھر جب آتے جوشی کی تعریف کرتے، جوشی کے پاس اپنے انوبھوں کا وشیش بھنڈار تھا۔ وہ فوج میں رہ چکا تھا جب اس کی منگیتر کا وواہ دوسرے آدمی سے ہو گیا تو شوک میں اس نے فوج کی نوکری چھوڑ دی۔ ساماجک جیون کی نہ جانے کتنی ہی گھٹنائیں اسے یاد تھیں۔ اور جب اپنے ماں باپ چاچا چاچی کا ذکر کرنے لگتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ دیوی جی بھی اس کے ساتھ روتیں۔

ساتھ روتیں۔
دیوی جی ترچھی آنکھوں سے دیکھ کر رہ گئیں۔ بات سچی تھی۔
ایک دن مجھ سے اپنے ایک ڈرامے کی بری تعریف کی وہ ڈراما کلکتہ میں کھیلا گیا۔ اور مدن کمپنی کے منیجر نے اسے بدھائیاں دیں۔ ڈرامے کے دو چار ٹکڑے اس کے پاس پڑے تھے۔ مجھے سنائے، مجھے ڈراما بہت پسند آیا، اس نے کاشی کے ایک پرکاشک کے ہاتھ وہ ڈراما بیچ دیا تھا اور کل پچیس روپے پر۔ میں نے کہا، اسے واپس مانگ لو روپے میں دے دوں گا۔ ایسی سندر رچنا کسی اچھے پرکاشک کو دیں گے یا کسی تھیٹر کمپنی سے کھلوائیں گے۔ تین چار دن کے بعد معلوم ہوا کہ پرکاشک اب پچاس روپے لے کر لوٹائے گا۔ کہتا ہے میں اس کا کچھ انش چھپوا چکا ہوں۔ میں نے کہا، منگوا لو پچاس روپے ہی سہی۔ ڈراما وی پی سے واپس آ گیا۔ میں نے پچاس روپیہ دے دیے۔
مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ ہوٹل والے دوسرا مہینہ شروع ہوتے ہیں پیشگی مانگیں گے۔ میں اسی چنتا میں تھا کہ جوشی نے آ کر کہا، میں ماتھر کے ساتھ رہوں گا۔ بے چارہ غریب آدمی تھا اگر میں بیس روپیے بھی دے دوں گا۔ تو اس کا کام چل جائے گا۔ میں بہت خوش ہوا دوسرے دن وہ ماتھر کے گھر ڈٹ گیا۔
جب آتا، تو ماتھر کے گھر کا کوئی نہ کوئی رہسّے (راز) لے کر آتا یہ تو میں جانتا تھا کہ ماتھر کی آرتھک (مالی) دَشا اچھی نہیں تھی۔ بے چارہ ریلوے کے دفتر میں نوکر تھا۔ وہ نوکری بھی چھوٹ گئی تھی۔ مگر یہ نہ معلوم تھا کہ اس کے یہاں فاقے ہو رہے ہیں۔ کبھی مالک مکان آ کر گالیاں سنا جاتا ہے۔ کبھی دودھ والا کبھی بنیا کبھی کپڑے والا، بے چارہ ان سے منھ چھپاتا پھرتا ہے، جوشی آنکھوں میں آنسو بھر بھر کر اس کے سنکٹوں تکلیفوں کی کرن (دکھ بھری) کہانی کہتا اور روتا۔ میں تو جانتا تھا میں ہی ایک آفت کا مارا ہوں، ماتھر کی دشا دیکھ کر مجھے اپنی وپتی بھول گئی تجھے اپنی ہی چنتا ہے، کوئی دوسری فکر نہیں، جس کے دوار پر جا پڑوں دو روٹیاں مل جائیں گی مگر ماتھر کے پیچھے تو پورا کھٹلا ہے۔ ماں، دودھوا (بیوہ) بہنیں، ایک بھانجی، دو بھانجے ایک چھوٹا بھائی، اتنے بڑے پریوار کے لیے پچاس روپیہ تو کیول روٹی

دال کے لیے چاہیے۔ ماتھر سچا ویر ہے۔ دیوتا ہے جو اتنے بڑے پریوار کا پالن کر رہاہے وہ اب اپنے لیے نہیں ماتھر کے لیے دکھی تھا۔

دیوی جی نے ٹیکا کی۔ جبھی ماتھر کی بھانجی پر ڈورے ڈال رہا تھا دکھ کا بھار کیسے ہلکا کرتا۔

ڈھپور سنگھ نے بگڑ کر کہا: اچھا تو اب تمھیں کہو۔

میں نے سمجھایا۔ تم تو یار، ذرا ذرا سی بات پر تنک اٹھتے ہو کیا تم سمجھتے ہو یہ پھلجڑیاں مجھے نیائے پتھ سے وچلت (مضطرب) کر دیں گی؟

پھر کہانی شروع ہوئی۔ ایک دن آکر بولا آج میں نے ماتھر کے ادھار کا اپائے سوچ نکالا۔ میرے ایک ماتھر متر بیرسٹر ہیں۔ ان سے جگو (ماتھر کی بھانجی) کے وواہ کے وشئے میں پتر ویوہار کر رہا ہوں اس کی ایک دھوا بہن کو دونوں بچوں کے ساتھ سسرال بھیج دوں گا۔ دوسری ودھوا بہن اپنے دیور کے پاس جانے پر راضی ہے بس تین چار آدمی رہ جائیں گے۔ کچھ میں دوں گا کچھ ماتھر پیدا کرے گا گذر ہو جائے گا۔ مگر آج اس کے گھر کا دو مہینوں کا کرایہ دینا پڑے گا۔ مالک مکان نے صبح سے ہی دھرنا دے رکھا ہے۔ کہتاہے، اپنا کرایہ لے کر ہی ہٹوں گا۔ آپ کے پاس تیس روپے ہوں تو دے دیجیے۔ ماتھر کے چھوٹے بھائی کا ویتن کل پرسوں تک مل جائے گا۔ روپیے مل جائیں گے۔ ایک متر سنکٹ میں پڑا ہوا ہے، دوسرا متر اس کی سفارش کر رہا ہے، مجھ سے انکار نہ ہوا، دیوی جی نے اس وقت ناک بھوں ضرور سکوڑا تھا پر میں نے نہ مانا روپیے دے دیے۔

دیوی جی نے ڈنک مارا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہ روپے میری بہن نے برتن خریدنے کے لیے بھیجے تھے۔

ڈھپورسنگھ نے غصہ پی کر کہا: خیر یہی سہی، میں‌نے روپے دے دیے، مگر مجھے یہ الجھن ہونے لگی کہ اس طرح تو میرا کچومر ہی نکل جائے گا۔ ماتھر پر ایک نا ایک سنکٹ (مصیبت) روز ہی سوار رہے گا۔ میں کہاں تک انھیں اباروں گا۔ جوشی بھی جان کھا رہا تھا کہ کہیں کوئی جگہ دلا دیجیے۔ سنیوگ سے انھیں دنوں میرے ایک آگرہ کے متر آنکلے ، کونسل میں ممبر تھے۔ اب جیل میں ہیں گانے بجانے کا شوق

خود بڑے رسک ہیں اب کہ وہ آئے تو میں نے جوشی کا ان سے ذکر کیا۔ ان کا ڈرامہ بھی سنایا۔ بولے تو اسے میرے ساتھ کر دیجیے۔ اپنا پرائیویٹ سکریٹری بنا لوں گا۔ میرے گھر میں رہے میرے ساتھ گھر کے آدمی کی طرح رہے۔ جیب خرچ کے لیے مجھ سے تیس روپے مہینہ لیتا جائے۔ میرے ساتھ ڈرامے لکھے میں پھولا نہ سمایا جوشی سے کہا جوشی بھی تیار ہو گیا لیکن جانے کے پہلے اسے کچھ روپیوں کی ضرورت ہوئی۔ ایک بھلے آدمی کے ساتھ پھٹے حالوں تو جاتے نہیں بنتا اور نہ یہی اُچت (مناسب) تھا کہ پہلے دن سے روپے کا تقاضہ ہونے لگے۔ بہت کانٹ چھانٹ کرنے پر بھی چالیس روپے کا خرچ نکل آیا۔ جوتے ٹوٹ گئے تھے، دھوتیاں پھٹ گئی تھیں اور بھی کئی خرچ تھے جو اس وقت یاد نہیں آتے۔ میرے پاس روپے نہ تھے شیاما سے مانگنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

دیوی جی بولیں: میرے پاس تو قارون کا خزانہ رکھا تھا نہ، کئی ہزار مہینے لاتے ہو، سو دو سو روپے بچت میں آہی جاتے ہوں گے۔

ڈھپور سنگھ اس وینگ (طنز) پر دھیان نہ دے کر اپنی کتھا (کہنا) کہتے رہے۔ روپے پاکر جوشی نے ٹھاٹ بنایا اور کونسلر صاحب کے ساتھ چلے۔ میں اسٹیشن تک پہچانے گیا ماتھر بھی تھا۔ لوٹا تو میرے دل پر سے ایک بوجھ اتر گیا تھا۔

ماتھر نے کہا: بڑا محبتی آدمی ہے۔

میں نے سمرتھن کیا: بڑا مجھے تو بھائی سا معلوم ہوتا ہے۔

مجھے تو اب گھر اچھا نہ لگے گا۔ گھر کے سب آدمی روتے رہے۔ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کوئی غیر آدمی ہے۔ اماں سے لڑکے کی طرح باتیں کرتا تھا، بہنوں سے بھائی کی طرح۔

بدنصیب آدمی ہے، نہیں جس کا باپ دو ہزار روپے ماہواری کماتا ہو، وہ یوں مارا مارا پھرے۔

دارجلنگ میں ان کے باپ کی دو کوٹھیاں ہیں؟

'آئی ایم ایس ہے'

جوشی مجھے بھی وہی لے جانا چاہتا ہے۔ سال دو سال میں تو وہاں جائے گا ہی

جوشی مجھے بھی وہی لے جانا چاہتا ہے۔ سال دو سال میں تو وہاں جائے گا ہی کہتا ہے تمھیں موٹر کی ایجنسی کھلوا دوں گا اس طرح خیالی پلاؤ پکاتے ہوئے ہم لوگ گھر آئے۔

میں دل میں خوش تھا کہ چلو اچھا ہوا جوشی کے لیے اچھا سلسلہ نکل آیا۔ مجھے یہ آشا بھی بندھ چلی کہ اب کہ اسے ویتن (تنخواہ) ملے گا۔ تو میرے روپے دے گا۔ چار پانچ مہینے میں چکتا کر دے گا۔ حساب لگا کر دیکھا تو اچھی خاصی رقم ہوگئی تھی۔ میں نے دل میں سمجھا، یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ یوں جمع کرتا تو کبھی نہ جمع ہوتے۔ اس بہانے سے کسی طرح جمع تو ہو گئے۔ میں نے یہ سوچا کہ اپنے متر سے جوشی کے ویتن کے روپے پیشگی کیوں نہ لے لوں۔ کہہ دوں، اس کے ویتن سے مہینے مہینے کاٹتے رہیے گا۔

لیکن ابھی مشکل سے ایک سپتاہ ہوا ہوگا کہ ایک دن دیکھتا ہوں تو جوشی اور ماتھر دونوں چلے آرہے ہیں مجھے بھے (ڈر) ہوا کہیں جوشی جی پھر تو نہیں چھوڑ آئے، لیکن شنکا (شک) کو دباتا ہوا بولا کہو بھائی کب آئے؟ مزے میں تو ہو؟

جوشی نے بیٹھ کر ایک سگار جلاتے ہوئے کہا:۔ بہت اچھی طرح ہوں۔ میرے بابو صاحب بڑے ہی سجّن آدمی ہیں۔ میرے لیے الگ ایک کمرہ خالی کرا دیا ہے۔ ساتھ ہی کھلاتے ہیں بالکل بھائی کی طرح رکھتے ہیں آج کل کسی کام سے دلّی گئے ہیں۔ میں نے سوچا۔ یہاں پڑے پڑے کیا کروں تب تک آپ ہی لوگوں سے ملتا جاؤں۔ چلتے وقت بابو صاحب نے مجھ سے کہا تھا، مرادآباد سے تھوڑے سے برتن لیتے آنا مگر شاید انھیں روپے دینے کی یاد نہیں رہی۔ میں نے اس وقت مانگنا بھی اچت نہ سمجھا۔ آپ ایک پچاس روپے دے دیجیے گا۔ میں پرسوں تک جاؤں گا اور وہاں سے جاتے ہی جاتے بھجوا دوں گا۔ آپ تو جانتے ہیں روپے کے معاملے میں وہ کتنے کھرے ہیں۔

میں نے ذرا روکھائی (روکھے پن) کے ساتھ کہا: روپے تو اس وقت میرے پاس نہیں ہیں۔

دیوی جی نے تڑی کی۔ کیوں جھوٹ بولتے ہو؟ تم نے روکھائی کے ساتھ کہا

تھا کہ روپے نہیں ہیں۔

ڈھپور سنگھ نے پوچھا: اور کیا چکنائی کے ساتھ کہا تھا؟

دیوی جی : تو پھر کاغذ کے روپے کیوں دے دیے تھے؟ بڑی روکھائی کرنے والے۔

ڈھپورسنگھ : اچھا صاحب میں نے ہنس کر روپے دے دیے۔ بس اب خوش ہوئی۔ تو بھئی مجھے برا تو لگا۔ لیکن اپنے سجّن متر کا واسطہ تھا۔ میرے اوپر بے چارے بڑی کرپا رکھتے ہیں۔ میرے پتریکا کا کاغذ خریدنے کے لیے پچاس روپے رکھے ہوئے تھے۔ وہ میں نے جوشی کو دے دیے۔

شام کو ماتھر نے آکر کہا: جوشی تو چلے گئے ۔ کہتے تھے بابو صاحب کا تار آگیا ہے۔ بڑا ادار آدمی ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا ، کوئی باہری آدمی ہے۔ سوبھاؤ (مزاج) بھی بالکوں کا سا ہے۔ بھانجی کی شادی طے کرنے کو کہتے تھے۔ یعنی لین دین کا تو کوئی ذکرہے ہی نہیں پر کچھ نذر تو دینی ہی پڑے گی۔ بیرسٹر صاحب، جن سے وِواہ ہو رہا ہے دلّی کے رہنے والے ہیں۔ ان کے پاس جا کر نذر دینی ہوگی۔ جوشی جی چلے جائیں گے۔آج میں نے روپے بھی دے دیے۔ چلیے ایک بڑی چنتا سر سے ٹلی۔

میں نے پوچھا: روپے تو تمھارے پاس نہ ہوں گے۔

ماتھر نے کہا: روپے کہاں تھے صاحب ۔ ایک مہاجن سے اسٹامپ لکھ کر لیے۔ دو روپے سینکڑے سود پر۔

دیوی جی نے کرودھ (غصہ) بھرے سور (آواز) میں کہا: میں اس دُشٹ کو پاجاؤں تو منھ نوچ لوں۔ وپشاچ (بدچلن) نے اس غریب کو بھی نہ چھوڑا۔

ڈھپور سنگھ بولا: یہ کرودھ تو آپ کو اب آرہا ہے نا۔ تب تو آپ بھی سمجھتی تھیں کہ جوشی دَیا اور دھرم کا پتلا ہے۔

دیوی جی نے وِرودھ (مخالفت) کیا۔ میں نے اسے پتلا پتلی کبھی نہیں سمجھا۔ ہاں تمھاری تکلیفوں کے بھلاوے میں پڑ جاتی تھی۔

ڈھپورسنگھ : توصاحب اس طرح کوئی دو مہینے گذرے اس بیچ میں بھی جوشی دو تین بار آئے مگر مجھ سے کچھ مانگا نہیں۔ ہاں اپنے بابو صاحب کے بندھن میں طرح طرح کی باتیں کیں جن سے مجھے دوچار گلپ (فسانہ) لکھنے کی سامگری (مواد) مل گئی۔

مئی کا مہینہ تھا۔ ایک دن پراتا کال جوشی آ پہنچے۔ میں نے پوچھا تو معلوم ہوا۔ ان کے بابو صاحب نینی تال چلے گئے۔ انھیں بھی لیے جاتے تھے۔ پر انھوں نے ہم لوگوں کے ساتھ یہاں رہنا اچھا سمجھا اور چلے آئے۔

دیوی جی نے پھلجڑی چھوڑی۔ کتنا تیاگی تھا بے چارہ۔ نینی تال کی بہار چھوڑ کر یہاں گرمی میں پران دینے چلا آیا۔

ڈپھورسنگھ نے اس کی اور کچھ دھیان نہ دے کر کہا: میں نے پوچھا کوئی نئی بات تو نہیں ہوئی وہاں؟

جوشی نے ہنس کر کہا: بھاگیہ میں تو نئی نئی وپتیاں لکھی ہیں۔ ان سے کیسے جان بچ سکتی ہے۔ اب کہ بھی ایک نئی وپتی سر پڑی۔ یہ کہیے آپ کا آشیرواد تھا، جان بچ گئی، نہیں تو اب تک جمنا جی میں بہا چلا جاتا ہوتا۔ ایک دن جمنا کنارے سیر کرنے چلا گیا، وہاں تیراکی کا میچ تھا۔ بہت سے آدمی تماشا دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ میں بھی ایک جگہ کھڑا ہو کر دیکھنے لگا۔ مجھ سے تھوری دور پر ایک اور مہاشیہ ایک یوتی (لڑکی) کے ساتھ کھڑے تھے۔ میں نے بات چیت کی تو معلوم ہوا میری ہی برادری کے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا میرے پتا اور چاچا دونوں ہی سے ان کا پریچے ہے۔ مجھ سے اسنیہ کی باتیں کرنے لگے۔ تمھیں اس طرح ٹھوکریں کھاتے تو بہت دن ہوگئے کیوں نہیں چلے جاتے اپنے ماں باپ کے پاس۔ مانا کہ ان کا لوک ویوہار تمھیں پسند نہیں لیکن ماتا پتا کا پتر پر کچھ نہ کچھ ادھیکار تو ہوتا ہے۔ تمھاری ماتا جی کو کتنا دکھ ہو رہا ہوگا۔ سہسا (اچانک) ایک یوک کسی طرف سے آنکلا اور وردھ مہاشیہ تتھا یوتی کو دیکھ کر بولا: آپ کو شرم نہیں آتی کہ آپ اپنی یوتی کنیا کو اس طرح میلے میں لیے کھڑے ہیں۔

وردھ مہاشیہ کا منھ ذرا سا نکل آیا اور یوتی ترنت گھونگھٹ نکال کر پیچھے ہٹ گئی۔ معلوم ہوا کہ اس کا وواہ اسی لوک سے ٹھہرا ہوا ہے۔ وردھ ادار، ساماجک وچاروں کے آدمی تھے پردے کے قائل نہ تھے یوک ویس میں یوک ہو کر بھی کھوسٹ ویچاروں کا آدمی تھا۔ پردے کا کٹر پکشپاتی، وردھ تھوڑی دیر تک تو اپرادھی بھاؤ سے باتیں کرتے رہے، پر یوک پرتی شن گرم ہوجاتا تھا۔ آخر بوڑھے بابا بھی تیز ہوئے۔

یوک نے آنکھیں نکال کر کہا: میں ایسی نرلجّا سے وواہ کرنا اپنے لیے اپمان کی بات سمجھتا ہوں۔

وردھ نے کرودھ سے کانپتے ہوئے سور میں کہا: اور میں تم جیسے لمپٹ سے اپنی کنیا کا وواہ کرنا لجّا کی بات سمجھتا ہوں۔

یوک نے کرودھ کے آویش (جوش) میں وردھ کا ہاتھ پکڑ کر دھکا دیا۔ باتوں سے نہ جیت کر اب وہ ہاتھوں سے کام لینا چاہتا تھا۔ وردھ دھکا کھاکر گر پڑے۔ میں نے لپک کر انھیں اٹھایا اوریوک کو ڈانٹا۔

وہ وردھ کو چھوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں کوئی کشتی باز تو ہوں نہیں۔ وہ لڑنا جانتا تھا۔ مجھے اس نے بات کی بات میں گرا دیا اور میرا گلا دبانے لگا۔ کئی آدمی جمع ہوگئے تھے۔ اب تک کشتی ہوتی رہی۔ لوگ کشتی کا آنند اٹھاتے رہے لیکن جب دیکھا معاملہ سنگین ہوا چاہتا ہے تو ترنت بیچ بچاؤ کر دیا۔ یوک بوڑھے بابا سے جاتے جاتے کہہ گیا۔ تم اپنی لڑکی کو ویشیا بنا کر بازار میں گھمانا چاہتے ہو تو اچھی طرح گھماؤ مجھے اب اس سے وواہ نہیں کرنا ہے۔ وردھ چپ چاپ کھڑے تھے۔ اور یوتی رو رہی تھی۔ بھائی صاحب تب مجھ سے نہ رہا گیا ۔ میں نے کہا: مہاشیہ آپ میرے پتا کے تلے ہیں اور مجھے جانتے ہیں یدی آپ مجھے اس یوگیہ سمجھیں تو میں ان دیوی جی کو اپنی ہردیشوری...... بنا کر اپنے کو دھنیّ (دولت مند) سمجھوں گا۔ میں جس دشا میں ہوں آپ دیکھ رہے ہیں ۔ سمبھو ہے میرا جیون اسی طرح کٹ جائے لیکن شردھا سیوا اور پریم یدی جیون کو سکھی بنا سکتاہے تو مجھے وشواس ہے کہ دیوی جی کے پرتی مجھ میں ان بھاؤں کی کمی نہ رہے گی۔ بوڑھے بابا نے گدگد ہو کر مجھے کنٹھ سے لگا لیا۔ اسی شن مجھے اپنے گھر لے گئے۔ بھوجن کرایا اور وواہ کا سنکن کر دیا۔ میں ایک بار یوتی سے مل کر اس کی سمّتی (اجازت) لینا چاہتا تھا۔ بوڑھے بابا نے مجھے اس کی سہرش ، انومتی (اجازت) دے دی۔ یوتی سے مل کر مجھے گیات ہوا کہ وہ رمنیوں میں رتن ہے۔ میں اس کی بدھّی متا دیکھ کر چکت (حیران) ہو گیا۔ میں نے اپنے من میں جس سندری کی کلپنا کی تھی وہ اس سے ہو بہو ملتی ہے۔ مجھے اتنی ہی دیر میں وشواس ہو گیا کہ میرا جیون اس کے ساتھ سکھی ہوگا۔ مجھے اب

آشیرواد دیجیے۔ یوتی آپ کی پتریکا برابر پڑھتی ہے اور آپ سے اسے بڑی شردھا (عقیدہ) ہے، جون میں وواہ ہونا نشچت ہوا ہے۔ میں نے اسپشٹ کہہ دیا ہے۔ میں زیور کپڑے نام ماتر کو لاؤں گا نہ کوئی دھوم دھام کروں گا۔ وردھا نے کہا: میں تو سَنم سوئم (خود) یہی کہنے والا تھا۔ میں کوئی تیاری نہیں چاہتا۔ نہ دھوم دھام کی مجھے اچھا ہے۔ جب میں نے آپ کا نام لیا کہ وہ میرے بڑے کے تلے (طرح) ہیں تو وہ بہت پرسن ہوئے۔ آپ کے لیکھوں کو وہ بڑے آدر سے دیکھتے ہیں۔

میں نے کچھ کھن (غم زدہ) ہو کر کہا یہ تو سب کچھ ہے لیکن اس سے تمھیں وواہ کرنے کی سامرتھ (قوت) بھی نہیں ہے۔ اور کچھ نہ تو پچاس روپے کی بندھی ہوئی آمدنی تو ہونی چاہیے۔

جوشی نے کہا: بھائی صاحب میرا ادھار وواہ ہی سے ہوگا۔ میرے گھر سے نکلنے کا کارن بھی وواہ ہی تھا۔ اور گھر واپس جانے کا کارن بھی وواہ ہی ہوگا۔ جس سے پرملا ہاتھ باندھے ہوئے جاکر پتا جی کے چرنوں پر گر پڑے گی ان کی پاشان ہردے (سنگ دل) بھی پگھل جائے گا۔ سمجھیں گے وواہ تو ہو ہی چکا۔ اب ودھو پر کیوں ظلم کیا جائے۔ جب اسے آشرے مل جائے گا تو مجھے جھک مار کر بلائیں گے۔ میں اسی جد پر گھر سے نکلا تھا کہ اپنا وواہ اپنی اچھا انوسار بنا کچھ لیے دیے کروں گا اور وہ میری پرتگیہ پوری ہوئی جارہی ہے۔ پرملا اتنی چتر ہے کہ وہ میرے گھر والوں کو چٹکیوں میں منالے گی۔ میں نے تخمینہ لگا لیا ہے، کل تین سو روپے خرچ ہوگئے اوریہی تین چار سو روپے مجھے سسرال سے ملیں گے۔ میں نے سوچا ہے پرملا کو پہلے یہیں لاؤں گا۔ یہیں سے وہ میرے گھر پتر لکھے گی اور آپ دیکھیے گا تیسرے دن چاچا صاحب گہنوں کی پٹاری لیے آ پہنچیں گے۔ وواہ ہوجانے پر وہ کچھ نہیں کرسکتے۔ اس لیے میں نے وواہ کی خبر نہیں دی۔

میں نے کہا: لیکن میرے پاس تو ابھی کچھ بھی نہیں ہے بھائی۔ میں تین سو روپے کہاں سے لاؤں گا ؟

جوشی نے کہا: تین سو نقد تھوڑے ہی لگیں گے۔ کوئی سو روپے کے کپڑے لگیں گے۔ سو روپے کی دو ایک سہاگ کی چیزیں بنوا لوں گا اور سو روپے راہ خرچ

سمجھ لیجیے۔ ان کا مکان کاشی پور میں ہے وہیں سے وواہ کریں گے۔ یہ بنگالی سنار جو سامنے ہے آپ کے کہنے سے ایک سپتاہ کے وعدہ پر جو جو چیزیں مانگوں گا دے دے گا۔ بجاج بھی آپ کے کہنے سے دے دے گا۔ نقد مجھے کل سو روپے کی ضرورت پڑے گی۔ اور جیوں ہی ادھر سے لوٹا تیوں ہی دے دوں گا۔ بارات میں آپ اور ماتھر کے سوا کوئی تیسرا آدمی نہ ہوگا۔ آپ کو میں کشٹھ نہیں دینا چاہتا۔ لیکن جس طرح اب تک آپ نے مجھے بھائی سمجھ کر سہایتا دی ہے اسی طرح ایک بار اور دیجیے۔ مجھے وشواس تھا کہ آپ اس شبھ (مبارک) کاریہ (کام) میں آپتی (اڑچن) نہ کریں گے۔ اس لیے میں نے وچن دے دیا۔ اب تو آپ کو یہ ڈولی پار لگانی ہی پڑے گی۔

دیوی جی بولیں: میں کہتی تھی، اسے ایک پیسا مت دو، کہہ دو ہم تمھاری شادی وواہ کے جھنجٹ میں نہیں پڑتے۔

ڈھپورسنگھ نے کہا: ہاں تم نے اب کہ بار ضرور سمجھایا۔ لیکن میں کیا کرتا۔ شادی کا معاملہ اس پر اس نے مجھے بھی گھسیٹ لیا تھا۔ اپنی عزت کا کچھ خیال تو کرنا ہی پڑتا ہے۔

دیوی جی نے میرا لحاظ کیا اور چپ ہوگئیں۔

اب میں اس درتانت کو نہ بڑھاؤں گا۔ سارانش (خلاصہ) یہ ہے کہ جوشی نے ڈھپورسنگھ کے متھے سو روپے کے کپڑے اور سو روپے سے کچھ اوپر گہنوں کا بوجھ لادا۔ بے چارے نے ایک متر سے سو روپے ادھار لے کر اس کے سفر خرچ کو دیا۔ خود بیاہ میں شریک ہوئے۔ بیاہ میں خاص دھوم دھام رہی۔ کنیا کے پتا نے مہمانوں کا آدرستکار خوب کیا۔ انھیں جلدی تھی۔ اس لیے وہ خود تو دوسرے ہی دن چلے آئے۔ پر ماتھر جوشی کے ساتھ وواہ کا انت تک رہا۔ ڈھپورسنگھ کو آشا تھی کہ جوشی سسرال کے روپے پاتے ہی ماتھر کے ہاتھوں بھیج دے گا۔ یا خود لیتا آئے گا۔ مگر ماتھر بھی دوسرے دن آگئے خالی ہاتھ اور یہ خبر لائے کہ جوشی کو سسرال میں کچھ بھی ہاتھ نہیں لگا۔ ماتھر سے انھیں اب معلوم ہوا کہ لڑکی سے جمنا تٹ پر ملنے کی بات سروتھا نرمول تھی۔ اس لڑکی سے جوشی بہت دنوں تک پتر ویوہار کر رہا تھا۔ پھر تو

ڈھپورسنکھ کے کان کھڑے ہوگئے۔ ماتھر سے پوچھا۔ اچھا۔ یہ بالکل کلپنا تھی اس کی؟

ماتھر : جی ہاں

ڈھپور سنکھ : اچھا تمھاری بھانجی کے وواہ کا کیا ہوا؟

ماتھر : ابھی تو کچھ نہیں ہوا۔

ڈھپورسنکھ : مگر جوشی نے کئی مہینے تک تمھاری سہایتا تو خوب کی ؟

ماتھر : میری سہایتا وہ کیا کرتا۔ ہاں دو جون بھوجن بھلے ضرور کر لیتا تھا۔

ڈھپورسنکھ : تمھارے نام پر اس نے مجھ سے جو روپے لیے تھے وہ تو تمھیں دیے ہوں گے؟

ماتھر : کیا میرے نام پر بھی کچھ روپے لیے تھے؟

ڈھپورسنکھ : ہاں بھائی تمھارے گھر کا کرایہ دینے کے لیے تو لے گیا تھا۔

ماتھر : سراسر بے ایمانی۔ مجھے اس نے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔ الٹے اور ایک مہاجن سے میرے نام پر سو روپیوں کا اسٹامپ لکھ کر روپے لیے۔ میں کیا جانتا تھا کہ دھوکا دے رہا ہے۔

سنیوگ سے اسی وقت آگرہ سے وہ سجن آئے جن کے پاس جوشی کچھ دنوں رہا تھا۔ انھوں نے ماتھر کو دیکھ کر پوچھا۔ اچھا آپ ابھی زندہ ہیں۔ جوشی نے تو کہا تھا ماتھر مر گیا ہے۔ ماتھر نے ہنس کر کہا: میرے تو سر میں درد بھی نہیں ہوا۔

ڈھپورسنکھ نے پوچھا۔ اچھا آپ کے مرادآبادی برتن تو پہنچ گئے؟

آگرہ نواسی متر نے کوتوہل سے پوچھا۔ کیسے مرادآبادی برتن؟

وہی جو آپ نے جوشی کی معرفت منگوائے تھے؟

میں نے کوئی چیز اس کی معرفت نہیں منگوائی۔ مجھے ضرورت ہوتی تو آپ کو سیدھا نہ لکھتا۔

ماتھر نے ہنس کر کہا: تو یہ روپے بھی اس نے ہضم کر لیے۔

آگرہ نواسی متر بولے: مجھ سے بھی تو تمھاری مرتیو کے بہانے سو روپے لایا تھا۔ یہ تو ایک ہی جالیا۔ نکلا۔ اُف کتنا بڑا چکمادیاہے اس نے۔ زندگی میں یہ پہلا موقع ہے۔ کہ میں یوں بے وقوف بنا۔ بچہ کو پا جاؤں تو تین سال کو بھجواؤں کہاں

ہے آج کل؟

ماتھر نے کہا: ابھی تو سسرال میں ہے۔

ڈھپوسنکھ کا ورتانت سماپت ہوگیا۔ جوشی نے انھیں کونہیں ماتھر جیسے اور غریب آگرہ نواسی سجن جیسے گھاگ کو بھی الٹے چھرے سے موڑھتا اور اگر یہ بھانڈا نہ پھوٹ گیا ہوتا تو ابھی نہ جانے کتنے دنوں تک مونڈتا۔ اس کی ان مولک چالوں پر میں بھی مگدھ ہوگیا۔ بے شک اپنے فن کا استاد ہے۔ چھٹا ہوا گرغا۔

دیوی جی بولیں۔ ہاں سن تو لی۔

اچھا تو اب آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ (پتی کی اور اشارہ کرکے) انھوں نے گھونگھا پن کیا یا نہیں؟ جس آدمی کو ایک ایک پیسے کے لیے دوسروں کا منھ تاکنا پڑے وہ گھر کے پانچ چھ سو روپے اس طرح اڑا دے۔ اسے آپ اس کی سجنتا کہیں گے یا بے وقوفی؟ اگر انھوں نے یہ سمجھ کر روپے دئے ہوتے کہ پانی میں پھینک رہا ہوں تو مجھے کوئی آپتّی نہ تھی۔ مگر یہ برابر اس دھوکے میں رہے اور مجھے بھی اس دوھکے میں ڈالتے رہے کہ وہ گھر کا مالدار ہے۔ اور میرے سب روپے ہی نہ لوٹا دے گا بلکہ اور بھی کتنے سلوک کرے گا جس کا باپ دو ہزار روپے مہینے پاتا ہو۔ جس کے چاچا کی آمدنی ایک ہزار ماسک ہو اور ایک لاکھ کی جائداد گھر میں ہو وہ اور کچھ نہیں تو یوروپ کی سیر تو ایک بار کرا ہی سکتا تھا۔ میں اگر کبھی منع بھی کرتی تو آپ بگڑ جاتے اور ادارتا کا اپدیش دینے لگتے تھے۔ یہ میں سویکار کرتی ہوں۔ کہ شروع میں میں بھی دھوکے میں آگئی تھی۔ مگر پیچھے سے مجھے اس کا سندیہ ہونے لگا تھا اور وواہ کے سمے تو میں نے زور دے کر کہا دیا تھا کہ اب ایک پائی بھی نہ دوں گی۔ پوچھیے جھوٹ کہتی ہوں یا سچ؟ پھر اگر مجھے دھوکا ہوا تو میں گھر میں رہنے والی استری ہوں۔ میرا دھوکے میں آجاتا ہے مگر یہ جو لیکھک اور وچارک اور اپدیشک بنتے ہیں یہ کیوں دھوکے میں آئے اور جب میں انھیں سمجھاتی تھی تو یہ کیوں اپنے کو بدھی متا کا اوتار (پیغمبر) سمجھ کر میری باتوں کی اپیکشا کرتے تھے؟ دیکھیے رو رعایت نہ کیجیے گا۔ نہیں میں بری طرح خبر لوں گی۔ میں نے نسپکش نیائے چاہتی ہوں۔

ڈھپور سنکھ نے دردناک آنکھوں سے میری طرف دیکھا جو مانوبھکشا (بھیک) مانگ رہی تھیں۔ اسی کے ساتھ دیوی جی کی آگرہ، آویش اور گرد سے بھری آنکھیں

تاک رہی تھیں ایک کو اپنی یار کا وواس تھا دوسری کو اپنی جیت کا۔ ایک رعایت چاہتی تھی دوسری سچانیائے۔

میں نے کرتم (مصنوعی) گنبھیرتا (سنجیدگی) سے اپنا نرنے سنایا۔ میرے متر نے کچھ بھاؤ کتا سے اوشے کام لیا ہے پر ان کی سجنتا نرو واد ہے۔

ڈھپور سنکھ اچھل پڑے اور میرے گلے لپٹ گئے۔ دیوی جی نے سگرو (فخر سے) نیتروں سے دیکھ کر کہا۔ یہ تو میں جانتی ہی تھی کہ چور چور موسیرے بھائی ہوں گے۔ تم دونوں ایک ہی تھیلی چٹے بٹے ہو۔ اب تک روپے میں ایک پائی مردوں کا وشواس (یقین) تھا آج تم نے وہ بھی اٹھا دیا۔ آج نشچے ہوا کہ پروش (مرد) چھلی کپٹی، وشواس گھاتی اور سوارتھی ہوتے ہیں۔ میں اس نرنے کو نہیں مانتی۔ مفت میں ایمان بگاڑنا اسی کو کہتے ہیں۔ بھلا میرا پکشی لیتے تو اچھا بھوجن ملتا۔ ان کا پکش لے کر آپ کو سڑے سگرٹوں کے سوا اور کیا ہاتھ لگے گا۔ خیر ہانڈی گئی کتے کی ذات تو پہچانی گئی۔

اس دن سے دو تین بار دیوی جی سے بھینٹ ہو چکی ہے اور وہی پھٹکار سننی پڑی ہے۔ وہ نہ چھما چاہتی ہے نہ چھما کر سکتی ہے۔

یہ افسانہ ہنس جنوری 1930 میں شائع ہوا۔ مان سرور 4 میں شامل ہے۔ اردو کے چندن میں مارچ 31 میں شائع ہوا۔ اردو کے کسی مجموعے میں نہیں ہے۔

اُنماد

منہر نے انُرکت ہو کر کہا- وہ سب تمھاری قربانیوں کا پھل ہے واگی۔ نہیں تو آج میں کسی اندھیری گلی میں، کسی اندھیرے مکان کے اندر اندھیری زندگی کے دن کاٹتا ہوتا۔ تمھاری سیوا اور اُپکار ہمیشہ یاد رہیں گے، تم نے میرا جیون سدھار دیا- مجھے آدمی بنا دیا۔

واگیشوری نے سر جھکائے ہوئے نمرتا سے اُتّر دیا۔ یہ تمھاری سجنتا ہی مانوں، میں بے چاری بھلا زندگی کیا سدھاروں گی؟ تمھارے ساتھ میں بھی ایک دن آدمی بن جاؤں گی۔ تم نے پرِشرم کیا، اس کا پُرسکار پایا۔ جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں، ان کی مدد پرماتما بھی کرتے ہیں، اگر مجھ جیسی گنوارِن کسی اور کے پالے پڑتی، تو اب تک نہ جانے کیا گت بنی ہوتی۔

منہر مانو اس بحث میں اپنا پکش سمرتھن کرنے کے لیے کمر باندھتا ہوا بولا- تم جیسی گنوارِن پر میں ایک لاکھ سجی ہوئی گڑیوں اور رنگین تتلیوں کو نچھاور کرسکتا ہوں۔ تم نے محنت کرنے کا وہ اَوسر اور اَوکاش دیا، جن کے بنا کوئی سپھل ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر تم نے اپنی انیہ ولاس پریہ، رنگین مزاج بہنوں کی طرح مجھے اپنے تقاضوں سے دبا رکھا ہوتا، تو مجھے اُنّتی کرنے کا اَوسر کہاں ملتا؟ تم نے مجھے وہ نِشچِنتا پردان کی، جو اسکول کے دنوں میں بھی نہ ملی تھی۔ اپنے اور سہکاریوں کو دیکھتا ہوں، تو مجھے ان پر دیا آتی ہے۔ کسی کا خرچ پورا نہیں پڑتا۔ آدھا مہینہ بھی نہیں جانے پایا اور ہاتھ خالی ہو جاتا ہے۔ کوئی دوستوں سے ادھار مانگتا ہے، کوئی گھر والوں کو خط

لکھتا ہے۔ کوئی گہنوں کی فکر میں مرا جاتا ہے، کوئی کپڑوں کی۔ کبھی نوکر کی ٹوہ میں حیران، کبھی ویدھ کی ٹوہ میں پریشان۔ کسی کو شانتی نہیں۔ آئے دن استری پرُش میں جوتے چلتے ہیں۔ اپنا جیسا بھاگیوان تو مجھ کو کوئی دیکھ نہیں پڑتا۔ مجھے گھر کے سارے آنند پراپت ہیں اور ذمّہ داری ایک بھی نہیں۔ تم نے ہی میرے حوصلوں کو ابھارا، مجھے اُتیجنا دی۔ جب کبھی میرا اُتساہ ٹوٹنے لگتا تھا، تو تم مجھے تسلّی دیتی تھیں۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ تم گھر کا پربندھ کیسے کرتی ہو۔ تم نے موٹے سے موٹا کام اپنے ہاتھوں سے کیا، جس سے مجھے پُستکوں کے لیے روپیے کی کمی نہ ہو۔ تمھیں میری دیوی ہو اور تمھاری بدولت ہی آج مجھے یہ سوبھاگیہ پراپت ہوا ہے۔ میں تمھاری ان سیواؤں کی اسمرتی کو ہردے میں سُرکشچھت رکھوں گا باکی، اور ایک دن وہ آئے گا، جب تم اپنے تپ اور تیاگ کا آنند اٹھاؤ گی۔

واگیشوری نے گد گد ہو کر کہا- تمھارے یہ شبد میرے لیے سب سے بڑے پرُسکار ہیں مانو۔ میں اور کسی پرُسکار کی بھوکی نہیں۔ میں نے جو کچھ تمھاری تھوڑی بہت سیوا کی، اس کا اتنا یَش مجھے ملے گا، مجھے تو آشا بھی نہ تھی۔

منہر ناتھ کا ہردَے اس سَمے اُدار بھاووں سے اُمڑا ہوا تھا وہ یوں الپ بھاشی، کچھ روکھا آدمی تھا اور شاید واگیشوری کے من میں اس کی شُشکتا پر دکھ بھی ہو، اس سَمے سپھلتا کے نشے نے اس کی واڑی میں پرَ سے لگا دیے تھے۔ بولا- جس سَمے میرے وِواہ کی بات چیت ہو رہی تھی، میں بہت شنکت میں تھا۔ سمجھ گیا کہ مجھے جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا۔ اب ساری عمر دیوی جی کی ناز برداری میں گزرے گی۔ بڑے بڑے انگریز وِدّ آنوں کی پُستکیں پڑھنے سے مجھے بھی وِواہ سے گھرنڑا ہو گئی تھی۔ میں اسے عمر قید سمجھنے لگا تھا، جو آتما اور بُدّھِ کی اُنّتی کا دوار بند کر دیتی ہے، جو منُشیہ کو سوارتھ کا بھکت بنا دیتی ہے، جو جیون کے چھیترے کو سنکیرنڑ کر دیتی ہے، مگر دو ہی چار ماس کے بعد مجھے اپنی بھول معلوم ہوئی۔ مجھے معلوم ہوا کہ سُبھاریہ سورگ کی سب سے بڑی وِبھوتِہ ہے، جو منُشیہ کو اپّول اور پورنڑ بنا دیتی ہے، جو آتمونّتی کا مول منتر ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ وِواہ کا اُدیشیہ بھوگ نہیں، آتما کا وکاس ہے۔

واگیشوری کی نمرتا اور سہن نہ کرسکی۔وہ کسی بات کے بہانے سے اٹھ کر چلی گئی۔

منہر اور واگیشوری کا وِواہ ہوئے تین سال گزرے تھے۔ منہر اس سَمے ایک دفتر میں کلرک تھا۔ سامانیہ یوکوں کی بھانتِ اسے بھی جاسوسی اُپنیاسوں سے بہت پریم تھا۔ دھیرے دھیرے اسے جاسوسی کا شوق ہوا۔ اس وشے پر اس نے بہت سا ساہتیہ جمع کیا اور بڑے منویوگ سے ان کا اَدّھین کیا۔ اس کے بعد اس نے اس وشے پر سوئم ایک کتاب لکھی۔ رچنا میں اس نے ایسی وِلکشنڑ، وِوِیچن شکتی کا پریچے دیا، اس کی شیلی بھی اتنی روچک تھی، کہ جنتا نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس وشے پر وہ سرووتم گرنتھ تھا۔

دیش میں دھوم مچ گئی۔ یہاں تک کہ اٹلی اور جرمنی جیسے دیشوں سے اس کے پاس پرشنسا پتر آئے اور اس وشے کی پترکاؤں میں اچھی اچھی آلوچنائیں نکلیں۔ انت میں سرکار نے بھی اپنی گن گراہکتا کا پریچے دیا۔ اسے انگلینڈ جا کر اس کلا کا ابھیاس کرنے کے لیے ورتِ پردان کی۔ اور یہ سب کچھ واگیشوری کی ست پریرنڑا کا شبھ پھل تھا۔

منہر کی اِچھا تھی کہ واگیشوری بھی ساتھ چلے، پر واگیشوری ان کے پاؤں کی بیڑی نہ بننا چاہتی تھی۔اس نے گھر رہ کر ساس سسر کی سیوا کرنا ہی اُچت سمجھا۔

منہر کے لیے انگلینڈ ایک دوسری ہی دنیا تھی، جہاں اُنّتی کے مکھیہ سادھنوں میں ایک روپ وتی پتنی کا ہونا بھی تھا۔ اگر پتنی روپ وتی ہے، چپل ہے، چتر ہے، وانڑی کُشل ہے، پرگلبھ ہے، تو سمجھ لو کہ اس کے پتی کو سونے کی کھان مل گئی، اب وہ اُنّتی کے شکھر پر پہنچ سکتا ہے، منویوگ اور تپسیہ کے بوتے پر نہیں، پتنی کے پربھاو اور آکرشن کے تیج پر۔ اس سنسار میں روپ اور لاونیہ ورت کے بندھنوں سے مُکت، ایک ابادھ سمپتِ تھی۔ جس نے کسی رمنی (خوبصورت عورت) کو پراپت کر لیا، اس کی مانو تقدیر کھل گئی۔ یدِی کوئی سندری تمھاری سہہ دھارمنی نہیں ہے، تو تمھارا سارا اُدّیوگ، ساری کاریہ پٹُتا نشپھل ہے، کوئی تمھارا پرسان حال نہ ہوگا۔ اَت ایو وہاں لوگ روپ کو ویاپارِک درشٹِ سے دیکھتے ہیں۔

سال ہی بھر کے انگریزی سماج کے سنسرگ نے منہر کی منوورِتیوں میں کرانتِ پیدا کردی۔ اس کے مزاج میں سانسارِکتا کا اتنا پرادھانیہ ہو گیا کہ کومل بھاووں کے

لیے وہاں استھان ہی نہ رہا۔ واگیشوری اس کے ودھابھیاس میں سہایک ہوئی تھی، پر اس ادھیکار اور پد کی اونچائیوں پر نہ پہنچ سکتی تھی۔ اس کے تیاگ اور سیوا کا مہتو بھی اب منہر کی نگاہوں میں کم ہوتا جارہا تھا، واگیشوری اب اسے ویرتھ سی وستو معلوم ہوتی تھی۔ کیوں کہ اس کی بھوتک درشٹِ سے ہر ایک وستو کا مولیہ اس سے ہونے والے لابھ پر ہی اولمبت تھا۔ اپنا پورو جیون اب اسے ہاسیہ پرد جان پڑتا تھا۔ چنچل، ہنس مکھ، ونودنی انگریز یووتیوں کے سامنے واگیشوری ایک ہلکی تچھ سی وستو جان پڑتی تھی-اس ودھُت پرکاش میں وہ دیپک اب مَلِن پڑ گیا تھا۔ یہاں تک کہ شنیہ شنیہ اس کا وہ مَلِن پرکاش بھی لُپت ہو گیا۔

منہر نے اپنے بھوشیہ کا نشچے کر لیا۔ یہ بھی ایک رمنی کی روپ نوکادوار ہی اپنے لکشے (نشان کی جگہ) پر پہنچے گا۔ اس کے سوا اور کوئی اُپائے نہ تھا۔

(۲)

رات کے نو بجے تھے۔ منہر لندن کے ایک فیشنیبل ریسٹراں میں بنا ٹھنا بیٹھا تھا، اس کا رنگ روپ اور ٹھاٹ باٹ دیکھ کر سہسا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ انگریز نہیں ہے۔ لندن میں بھی اس کے سوبھاگیہ نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ اس نے چوری کے کئی گہرے معاملے کا پتہ لگا دیا تھا، اس لیے اسے دھن اور لیش دونوں ہی مل رہا تھا۔ وہ اب وہ یہاں کے بھارتیہ سماج کا ایک پرمکھ انگ بن گیا تھا، جس کے آتِتھیہ اور سوجنیہ کی سبھی سراہنا کرتے تھے۔ اس کا لب و لہجہ بھی انگریزوں سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے سامنے میز کے دوسری اور ایک رمنی بیٹھی ہوئی ان کی باتیں بڑے دھیان سے سن رہی تھی۔ اس کے انگ انگ سے یَوون ٹپکا پڑتا تھا۔ بھارت کے ادبھُت ورتانت سن سن کر اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔ منہر چڑیا کے سامنے دانے بکھیر رہا تھا۔

منہر- وچتر دیش ہے جینی، اتینت وچتر۔ پانچ پانچ سال کے دولھے تمھیں بھارت کے سوا اور کہیں دیکھنے کو نہ ملیں گے۔

لال رنگ کے کامدار کپڑے، سر پر چمکتا ہوا لمبا ٹوپ، چہرے پر پھولوں کا

جھالدار برقع، گھوڑے پر سوار چلے جا رہے ہیں۔ دو آدمی دونوں طرف سے چھتریاں لگائے ہوئے ہیں۔ ہاتھوں میں منہدی لگی ہوئی۔

جینی- منہدی کیوں لگاتے ہیں؟

منہر- جس میں ہاتھ لال ہوجائیں۔ پیروں میں بھی رنگ بھرا جاتاہے۔ انگلیوں کے ناخن لال رنگ دیے جاتے ہیں۔ وہ درشیہ دیکھتے ہی بنتا ہے۔

جینی- یہ تو دل میں سنسنی پیدا کرنے والادرشیہ ہوگا۔ دلھن بھی اسی طرح سجائی جاتی ہوگی؟

منہر- اس سے کئی گنا ادِھک۔ سر سے پاؤں تک سونے چاندی کے جیوروں سے لدی ہوئی ایساکوئی انگ نہیں جس میں دو دو، چار چار گہنے نہ ہوں۔

جینی- تمھاری شادی بھی اسی طرح ہوئی ہوگی۔تمھیں تو بڑا آنند آیا ہوگا؟

منہر- ہاں، وہی آنند آیا تھا، جو تمھیں میری گوراونڈر پر چڑھنے میں آتا ہے۔ اچھی اچھی چیزیں کھانے کو ملتی ہیں، اچھے اچھے کپڑے پہننے کو ملتے ہیں۔ خوب ناچ تماشے دیکھتا اور شہنائیوں کا گانا سنتا تھا۔ مزہ تو تب آتا ہے، جب دلھن اپنے گھر سے وداع ہوتی ہے۔ سارے گھر میں کہرام مچ جاتا ہے۔ دلھن ہر ایک سے لپٹ لپٹ کر روتی ہے، جیسے ماتم کر رہی ہو۔

جینی- دلھن روتی کیوں ہے؟

منہر- رونے کا رواج چلا آتا ہے۔ حالاں کہ سبھی جانتے ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے نہیں چلی جا رہی ہے، پھر بھی سارا گھر اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے، مانو وہ کالے پانی بھیجی جارہی ہو۔

جینی- میں تو اس تماشے پر خوب ہنسوں۔

منہر- ہنسنے کی بات ہی ہے۔

جینی- تمھاری بیوی بھی روئی ہوگی؟

منہر- اجی کچھ نہ پوچھو، پچھاڑیں کھارہی تھی، مانو میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا۔ میری پالکی سے نکل کر بھاگی جاتی تھی، پر میں نے زور سے پکڑ کر اپنی بغل میں بٹھالیا۔ تب مجھے دانت کاٹنے دوڑی۔

مِس جینی نے زور سے قہقہہ مارا اور ہنسی کے ساتھ لوٹ گئیں۔ بولیں- باریبل! باریبل! کیا اب بھی دانت کاٹتی ہے؟

منہر- وہ اب اس سنسار میں نہیں ہے، جینی۔ میں اس سے خوب کام لیتا تھا۔ میں سوتا تھا، تو وہ میرے بدن میں چپی لگاتی تھی، میرے سر میں تیل ڈالتی تھی، پنکھا جھلتی تھی۔

جینی- مجھے تو وشواس نہیں آتا بالکل مورکھ تھی۔

منہر- کچھ نہ پوچھو، دن کو کسی کے سامنے مجھ سے بولتی بھی نہ تھی، مگر میں اس کا پیچھا کرتا رہتا تھا۔

جینی- او- ناٹی بوائے۔ تم بڑے شریر ہو۔ تھیں تو روپ وتی؟

منہر- ہاں اس کا منھ تمھارے تلووں جیسا تھا۔

جینی- نانسنس۔ تم ایسی عورت کے پیچھے کبھی نہ دوڑتے۔

منہر- اس وقت میں بھی مورکھ تھا جینی۔

جینی- ایسی مورکھ لڑکی سے تم نے وِواہ کیوں کیا؟

منہر- وِواہ نہ کرتا تو ماں باپ زہر کھا لیتے۔

جینی- وہ تمھیں پیار کیسے کرنے لگی؟

منہر- اور کرتی کیا؟ میرے سوا دوسرا تھا ہی کون؟ گھر سے باہر نہ نکلنے پاتی تھی، مگر پیار ہم میں سے کسی کو نہ تھا۔ وہ میری آتما اور ہردے کو سنتشٹ نہ کر سکتی تھی، جینی مجھے ان دنوں کی یاد آتی ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بھینکر سواپن تھا۔ اف! اگر وہ استری آج جیِوت ہوتی، تو میں کسی اندھیرے دفتر میں بیٹھا قلم گھستا ہوتا، اس دیش میں آکر مجھے یتھارتھ گیان ہوا کہ سنسار میں استری کا کیا استھان ہے، اس کا کیا دایتو ہے۔ اور جیون اس کے کارن کتنا آنند پرد ہو جاتا ہے۔ اور جس دن تمھارے درشن ہوئے، وہ تو میری زندگی کا سب سے مبارک دن تھا۔ یاد ہے تمھیں وہ دن؟ تمھاری وہ صورت میری آنکھوں میں اب بھی پھر رہی ہے۔

جینی-اب میں چلی جاؤں گی ۔ تم میری خوشامد کرنے لگے۔

(۳)

بھارت کے مزدور دَل سچو تھے لارڈ باربر، اور ان کے پرائیویٹ سکریٹری تھے مسٹر کاورڈ۔ لارڈ باربر بھارت کے سچے متر سمجھے جاتے تھے۔ جب کنزرویٹو اور لبرل دَلوں کا ادھکار تھا، تو لارڈ باربر بھارت کی بڑے زوروں سے وکالت کرتے تھے۔ وہ ان منتریوں پر ایسے ایسے کٹاکشچھ کرتے تھے کہ ان بے چاروں کو کوئی جواب نہ سوجھتا۔ ایک بار وہ ہندوستان آئے تھے اور یہاں کانگریس میں شریک بھی ہوئے تھے۔ اس سَمے ان کی اُدارو کرتاؤں نے سمست دیش میں آشا اور اُتساہ کی ایک لہر دوڑا دی تھی۔ کانگریس کے جلسے کے بعد وہ جس شہر میں گئے جنتا نے ان کے راستے میں آنکھیں بچھائیں، ان کی گاڑیاں کھینچیں، ان پر پھول برسائے۔ چاروں طرف سے یہی آواز آتی تھی۔ یہ ہے بھارت کا اُدّھار کرنے والا۔ لوگوں کو وشواس ہوگیا کہ بھارت کے سوبھاگیہ سے اگر کبھی لارڈ باربر کو ادھکار پراپت ہوا، تو وہ دن بھارت کے اتہاس میں مبارک ہوگا۔

لیکن ادھیکار پاتے ہی لارڈباربر میں ایک وچتر پرورتن ہوگیا۔ ان کے سارے سَد بھاو، ان کی اُدارتا، نیائے پرائنتا، سہانبھوتی یہ سبھی ادھیکار کے بھنور میں پڑ گئے۔ اور اب لارڈ باربر اور ان کے پورو ادھیکار کے ویوہار میں لیش ماتر بھی انتر نہ تھا۔ وہ بھی وہی کر رہے تھے، جو ان کے پہلے کے لوگ کر چکے تھے وہی دَمن تھا، وہی جاتِیَت ابھِمان، وہی کٹرتا وہی سنکیرنتا۔ دیوتا ادھیکار کے آسن پر پاؤں رکھتے ہی اپنا دیوتو کھو بیٹھا۔ اپنے دو سال کے ادھیکار کام میں انھوں نے سیکڑوں ہی افسر نیکت کیے تھے، پر ان میں ایک بھی ہندوستانی نہ تھا۔ بھارت واسی نراش ہو ہو کر انھیں ''ڈائے ہارڈ، ، دھن کا اُپاسک، اور سامراجیہ واد کا پجاری کہنے لگے تھے۔ یہ کھلا ہوا رہسیہ تھا کہ جو کچھ کرتے تھے مسٹر کاورڈ کرتے تھے۔ حق یہ تھا کہ لارڈ باربر نیت کے اتنے شیر تھے، جتنے دل کے کمزور حالاں کہ پری ڑام دونوں دَشاؤں میں ایک سا تھا۔

یہ مسٹر کاورڈ ایک ہی مہاپُرش تھے۔ ان کی عمر چالیس سے ادھِک گزر چکی تھی،

پر ابھی تک انھوں نے وِواہ نہ کیا تھا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ راجنیتِ کے شھیڑے میں رہ کر ویواہک جیون کا آنند نہیں اٹھا سکتے۔ واستو میں نویتا کے مدُھپ تھے۔ انھیں نتیہ نئے ونود اور آکرشنڑ، نتیہ نئے ولاس اور اُلّاس کی ٹوہ رہتی تھی۔ دوسروں کے لگائے ہوئے باغ کی سیر کرکے چِت کو پرسنّ کرلینا اس سے کہیں سرل تھا کہ اپنا باغ آپ لگائیں اور اس کی رَکشھا اور سجاوٹ میں اپنا سر کھپائیں، ان کو ویُوہارک اور ویاپارِک درشٹِ میں یہ لٹکا اس سے کہیں آسان تھا۔

دوپہر کا سَمے تھا۔ مسٹرکاورڈ ناشتہ کرکے سگار پی رہے تھے کہ مس جینی روز کے آنے کی خبر ہوئی۔ انھوں نے ترنت آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر اپنی صورت دیکھی، بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارا، بہُمولیہ عطر ملا اور مکُھ سے سواگت کی سہاس چھوی درشاتے ہوئے کمرے سے نکل کرمس روز سے ہاتھ ملایا۔

جینی نے کمرے میں قدم رکھتے ہی کہا- اب میں سمجھ گئی کہ کیوں کوئی سندری تمھاری بات نہیں پوچھتی۔ آپ اپنے وعدوں کو پورا کرنا نہیں جانتے۔

مسٹر کاورڈ نے جینی کے لیے ایک کرسی کھینچتے ہوئے کہا- مجھے بہت کھید ہے مس روز، کہ میں کل اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ پرائیویٹ سکریٹریوں کا جیون کتّوں کے جیون سے بھی بہتر ہے۔ بار بار چاہتا تھا کہ دفتر سے اٹھوں، پر ایک نہ ایک کام ایسا آجاتا تھا کہ پھر رُک جانا پڑتا تھا۔ میں تم سے چھما مانگتا ہوں، بعد میں تمھیں خوب آنند آیا ہوگا۔

جینی- میں تمھیں تلاش کرتی رہی۔ جب تم نہ ملے، تو میرا جی کھٹا ہوگیا۔ میں اور کسی کے ساتھ نہیں ناچی۔ اگر تمھیں نہیں جانا تھا تو مجھے نمنترن پتر کیوں دِلایا تھا۔

کاورڈ نے جینی کو سگار بھینٹ کرتے ہوئے کہا- تم مجھے لجّتِ کررہی ہو، جینی۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی تھی کہ تمھارے ساتھ ناچتا؟ ایک پرانا بیچلر ہونے پر بھی میں اُس آنند کی کلپنا کر سکتا ہوں۔ بس یہی سمجھ لو کہ تڑپ تڑپ کر رہ جاتا تھا۔

جینی نے کٹھور مسکان کے ساتھ کہا- تم اسی یوگیہ ہو کہ بیچلر بنے رہو۔ یہی تمھاری سزا ہے۔

کاورڈ نے اُرکت ہوکر اُتّر دیا-تم بڑی کٹھور ہو جینی، تمھیں کیا رمنڑیاں سبھی کٹھور ہوتی ہیں۔ میں کتنی ہی پروشتا دکھاؤں، تمھیں وشواس نہ آئے گا۔ مجھے ارمان ہی رہ گیا کہ کوئی سندری میرے انوراگ اور لگن کا آدر کرتی۔

جینی- تم میں انوراگ ہو بھی تو؟ رمنڑیاں ایسے بہانے بازوں کو منھ نہیں لگاتیں۔

کاورڈ- پھر بہانے باز کہا- مجبور کیوں نہیں کہتیں؟

جینی- میں کسی کی مجبوری کونہیں مانتی - میرے لیے یہ ہرش اور گورَو کی بات نہیں ہوسکتی، کہ آپ کو جب اپنے سرکاری، اَردھ سرکاری اورغیرسرکاری کاموں سے اَوکاش ملے، تو آپ میرا من رکھنے کو ایک چھَن کے لیے اپنے کومل چرنوں کو کشٹ دیں۔ میں دفتر اور کام کے حیلے نہیں سننا چاہتی۔ اسی کارن تم اب تک جھینکھ رہے ہو۔

کاورڈ نے گمبھیر بھاو سے کہا-تم میرے ساتھ اَنیائے کر رہی ہو، جینی۔ میرے اُوداسِت رہنے کا کیا کارن ہے، یہ کل تک مجھے خود نہ معلوم تھا۔ کل آپ ہی آپ معلوم ہوگیا۔

جینی نے اس کا پرِہاس کرتے ہوئے کہا- اچھا! تو یہ رہسیہ آپ کو معلوم ہوگیا؟ تب تو آپ سچ مچ آتم دَرشی ہیں۔ ذرا میں بھی سنوں، کیا کارن تھا۔

کاورڈ نے اُتساہ کے ساتھ کہا-اب تک کوئی ایسی سندری نہ ملی تھی، جو مجھے اُنمت کر سکتی۔

جینی نے کٹھور پرِہاس کے ساتھ کہا-میرا خیال تھا کہ دنیا میں ایسی عورت پیدا ہی نہیں ہوئی، جو تمھیں اُنمت کر سکتی۔ تم اُنمت بنانا چاہتے ہو، اُنمت بننا نہیں چاہتے۔

کاورڈ- تم بڑا اَتیاچار کرتی ہو، جینی۔

جینی- اپنے اُنماد کا پرمان دینا چاہتے ہو؟

کاورڈ- ہردے سے، جینی۔ میں اس اَوسر کی تاک میں بیٹھا ہوں۔

اسی دن شام کو جینی نے منہر سے کہا-تمھارے سوبھاگیہ پر بدھائی۔ تمھیں وہ جگہ مل گئی۔

منہر اُچھل کر بولا۔سچ!سکریٹری سے کوئی بات چیت ہوئی تھی؟

جینی۔ سکریٹری سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ سب کچھ کاورڈ کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اسی کو چنگ پر چڑھایا۔ لگا مجھے عشق جتانے۔ پچاس سال کی تو عمر ہے، چاند کے بال جھڑ گئے ہیں، گالوں پر جھرّیاں پڑ گئی ہیں، پر ابھی تک آپ کو عشق کا خبط ہے۔ آپ اپنے کو ایک ہی رسیا سمجھتے ہیں۔ اس کے بوڑھے چوچلے بہت برے معلوم ہوتے تھے؛مگر تمھارے لیے سب کچھ سہنا پڑا۔ خیر محنت سپھل ہوگئی۔ کل تمھیں پروانہ مل جائے گا۔ اب سفر کی تیاری کرنی چاہیے۔

منہر نے گد گد ہوکر کہا۔تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے، جینی۔

(۴)

منہر کو گُپت چَر وِبھاگ میں اونچا پَد ملا۔ دیش کے راشٹریہ پتروں نے اس کی تعریفوں کے پُل باندھے، اس کی تصویر چھاپی اور راشٹر کی اور سے اسے بدھائی دی۔ وہ پہلا بھارتیہ تھا، جسے وہ اونچا پَد پردان کیا گیا تھا۔ برٹش سرکار نے سِدّھ کر دیا تھا کہ اس کی نیائے بُدّھِ جاتیہ ابھیمان اور دُویش سے اُچتر ہے۔

منہر اور جینی کا وِواہ انگلینڈ میں ہی ہوگیا۔ ہنی مون کا مہینہ فرانس میں گزرا۔ وہاں سے دونوں ہندوستان آئے۔ منہر کا دفتر بمبئی میں تھا۔ وہیں دونوں ایک ہوٹل میں رہنے لگے۔ منہر کو گُپت ابھیوگ کی کھوج کے لیے اکثر دورے کرنے پڑتے تھے۔ کبھی کشمیر، کبھی مدراس، کبھی رنگون۔ جینی ان یاتراؤں میں برابر اس کے ساتھ رہتی۔ نتیہ نیے درِشیہ تھے، نئے ونود، نئے اُلّاس ۔ اس کی نویتا پریے پرکرتِ کے لیے آنند کا اس سے اچّھا اور کیا سامان ہو سکتا تھا؟

منہر کا رہن سہن تو انگریزی تھا ہی، گھر والوں سے بھی سمبندھ وِچھید ہو گیا تھا۔ واگیشوری کے پتروں کا اُتّر دینا تو دور رہا انھیں کھول کر پڑھتا بھی نہ تھا۔ بھارت میں اسے ہمیشہ یہ شنکا بنی رہتی تھی کہ کہیں گھر والوں کو اس کا پتہ نہ چل جائے۔ جینی سے وہ اپنی یتھارتھ اِستِھتی کو چھپائے رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے گھر والوں کو آنے کی سوچنا تک نہ دی۔ یہاں تک کہ وہ ہندوستانیوں سے بہت کم ملتا

تھا۔ اس کے مِتر ادھیکانش پولیس اور فوج کے افسر تھے۔ وہی اس کے مہمان ہوتے۔ واک چتر جینی سموہن کلا میں سدّھست تھی۔ پُرشوں کے پریم سے کھیلنا اس کی سب سے امودمیہ کریڑا تھی۔ جلاتی تھی، رجھاتی بھی تھی، اور منہر بھی اس کی کپٹ لیلا کا شکار بنتا رہتا تھا۔ اسے وہ ہمیشہ بھول بُھلَیا میں رکھتی، کبھی اتنا نِکٹ کہ چھاتی پر سوار نہ کبھی اتنی دور کہ یوجن کا اَنتر۔کبھی نِسھڑ اور کٹھور اور کبھی پریم وِہُل اور وِیگّر۔ ایک رہسّیہ تھا، جسے وہ کبھی سمجھتا تھا اور کبھی حیران رہ جاتا تھا۔

اس طرح دو ورش بیت گئے اور منہر تتھا جینی کونڑ کی دو بُھجاؤں کی بَھانتی ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ منہر اس بَھاونہ کو ہردے سے نہ نکال سکتا تھا کہ جینی کا میرے پرتی ایک وِشیش کرتوّیہ ہے۔ یہ چاہے اس کی سنکیرنتا ہو یاکُل مریادا کا اثر کہ وہ جینی کو پابند دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی سوچھندورتّ اسے لجّاسپَد معلوم ہوتی تھی۔ وہ بھول جاتا تھا کہ جینی سے اس کے سمپرک کا آرمّبھ ہی سُوارتھ پر اَولمبِت تھا۔ شاید اس نے سمجھا تھا کہ سَمے کے ساتھ جینی کو اپنے کَرتوّیہ کا گیان ہو جائے گا ؛حالاں کہ اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ٹیڑھی بنیاد پر بنا ہوا بَھوَن جلد یا دیر میں اَوشیہ بُھومستھ ہو کر رہے گا ۔ اور اونچائی کے ساتھ اس کی شنکا اور بھی بڑھتی جاتی تھی۔ اس کے وپُریت جینی کا ویوہار بالکل پرِستِھتی کے اَنکول تھا۔ اس نے منہر کو ونودمے تتھا وِلاسمے جیون کا ایک سادھن سمجھا تھا اور اسی وچار پر وہ اب تک اِستھر تھی۔ اس وِیکتِ کو وہ من میں پتی کا اِستھان نہ دے سکتی تھی، پاشانڑ پرتما کو اپنا دیوتا نہ بنا سکتی تھی۔ پتنی بننا اس کے جیون کا سوَپن نہ تھا، اس لیے وہ منہر کے پرِتی اپنے کسی کرتوّیہ کو سویکار نہ کرتی تھی۔ اگر منہر اپنی گاڑھی کمائی اس کے چرنوں پر اَرپِت کرتا تھا تو اس پر کوئی احسان نہ کرتا تھا۔ منہر اس کا بنایا ہوا پُتلا اسی کا لگایا ہوا ورِکش تھا ۔ اس کی چھایا اور پھل کو بھوگ کرنا وہ اپنا ادھیکار سمجھتی تھی۔

(۵)

منومالِنیہ بڑھتا گیا ۔ آخر منہر نے اس کے ساتھ دعوتوں اور جلسوں میں جانا چھوڑدیا، پر جینی پوروَوت سیر کرنے جاتی، متروں سے ملتی، دعوتیں کرتی اور دعوتوں

میں شریک ہوتی۔ منہر کے ساتھ نہ جانے سے لیش ماتر بھی دکھ یا نراشا نہ ہوتی تھی، بلکہ وہ شاید اس کی اداسینتا پر اور بھی پرسن ہوتی۔ منہر اس مانسک ویتھا کو شراب کے نشے میں ڈبونے کا اڈھوگ کرتا۔ پینا تو اس نے انگلینڈ ہی میں شروع کر دیا تھا، پر اب اس کی ماترا بہت بڑھ گئی تھی۔ وہاں اسپھورتی اور آنند کے لیے پیتا تھا، یہاں اسپھورتی اور آنند کو مٹانے کے لیے۔ وہ دن دن دُربَل ہوتا جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا، شراب مجھے پیے جا رہی ہے، پر اس کے جیون کا یہی ایک اَولمب رہ گیا تھا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ منہر ایک معاملے کی جانچ کرنے کے لیے لکھنؤ میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھا۔ معاملہ بہت سنگین تھا۔ اسے سر اٹھانے کی فرصت نہ ملتی تھی۔ سواستھ بھی کچھ خراب ہو چلا تھا، مگر جینی اپنے سیر-سپاٹے میں مگن تھی۔ آخر ایک دن اس نے کہا-میں نینی تال جا رہی ہوں۔ یہاں کی گرمی مجھ سے سہی نہیں جاتی۔

منہر نے لال لال آنکھیں نکال کر کہا- نینی تال میں کیا کام ہے؟ وہ آج اپنا ادھیکار دکھانے پر تُل گیا۔ جینی بھی اس کے ادھیکار کی اپیکشا کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ بولی-یہاں کوئی سوسائٹی نہیں۔ سارا لکھنؤ پہاڑوں پر چلا گیا ہے۔

منہر نے جیسے میان سے تلوار نکال کر کہا-جب تک میں یہاں ہوں تمھیں کہیں جانے کا ادھیکار نہیں ہے۔ تمھاری شادی میرے ساتھ ہوئی ہے، سوسائٹی کے ساتھ نہیں۔ پھر تم صاف دیکھ رہی ہو کہ میں بیمار ہوں، تِس پر بھی تم اپنی وِلاس پرورت کو روک نہیں سکتیں۔ مجھے تم سے ایسی آشا نہ تھی، جینی !میں تم کو شریف سمجھتا تھا۔ مجھے سَوپن میں بھی یہ گمان نہ تھا کہ تم میرے ساتھ ایسی بے وفائی کروگی۔

جینی نے اَوچلت بھاو سے کہا- تو کیا تم سمجھتے تھے، میں بھی تمھاری ہندوستانی استری کی طرح تمھاری لونڈی بن کر رہوں گی اور تمھارے تلوے سہلاؤں گی؟ میں تمھیں اتنا نادان نہیں سمجھتی۔ اگر تمھیں ہماری انگریزی سبھیتا کی اتنی موٹی سی بات معلوم نہیں، تو اب معلوم کر لو کہ انگریز استری اپنی رُچی کے سوا اور کسی کی پابند نہیں۔ تم نے مجھ سے اس لیے وِواہ کیا تھا کہ میری سہایتہ سے تمھیں سمّان اور پد پراپت ہو۔ سبھی پُرش ایسا کرتے ہیں اور تم نے بھی وہی کیا۔ میں اس کے لیے

تمھیں بُرا نہیں کہتی لیکن جب تمھارا وہ اُدّشیہ پورا ہو گیا۔ جس کے لیے تم نے مجھ سے وِواہ کیا تھا، تو تم مجھ سے اَدھِک آشا کیوں رکھتے ہو؟تم ہندوستانی ہو، انگریز نہیں ہو سکتے۔ میں انگریز ہوں اور ہندوستانی نہیں ہو سکتی، اس لیے ہم میں سے کسی کو یہ ادھیکار نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو اپنی مرضی کا غلام بنانے کی چیشٹھا کرے۔

منہر ہَتْ بُدّھ سا بیٹھا سنتا رہا۔ ایک ایک شبد وِش کی گھونٹ کی بھانتی اس کے کنٹھ کے نیچے اتر رہا تھا۔ کتنا کٹھور ستیہ تھا۔ پد لالسا کے اس پرچنڈ آویگ میں، وِلاس تِرشنّاؤں کے اس اُدّمیہ پرواہ میں وہ بھول گیا تھا کہ جیون میں کوئی ایسا تَتو بھی ہے، جس کے سامنے پد اور وِلاس کانچ کے کھلونوں سے اَدھِک مول نہیں رکھتے۔ وہ وِسمرت سَتیہ اس سَمے اپنے دَارُن وِلاپ سے اس کی مد مگن چیتنا کو تڑپانے لگا۔

شام کو جینی نینی تال چلی گئی۔منہر نے اس کی اورآنکھیں اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

(۶)

تین دن تک منہر گھر سے نہ نکلا۔ جیون کے پانچ چھ وَرشوں میں اس نے جتنے رَتن سنچت کیے تھے، جس پر وہ گرو کرتا تھا؛ جنھیں پاکر وہ اپنے کو دھنّیہ مانتا تھا، اب پَریکشا کی کسوٹی پر آکر نقلی پتّھر سِدّھ ہو رہے تھے۔ اس کی اَپمانت، گلانت، پَراجِت آتما اِکانت رودن کے سوا اور کوئی تِرانڑ نہ پاتی تھی۔ اپنی ٹوٹی جھونپڑی کو چھوڑ کر وہ جس جس سُنہلے کلش والے بَھون کی اور لپکا تھا، وہ مرِیچکا ماتر تھی اور اب اسے پھر اسی ٹوٹی جھونپڑی کی یاد آئی، جہاں اس نے شانتی، پریم اور آشیرواد کی سُدھا پی تھی۔ یہ سارا آڈمبر سے کاٹ کھانے لگا۔ اس سرل شیتل اِسنیہ کے سامنے یہ ساری وِبھوتیاں تُچھ سی جچنے لگیں۔ تیسرے دن وہ بھیشنڑ سَنکلپ کرکے اٹھا اور دو پتر لکھے۔ ایک تو اپنے پد سے استعفیٰ تھا، دوسرا جینی سے انتم وِداع کی سُوچنا۔ استعفے میں اس نے لکھا -میرا سواستھ نَشٹ ہو گیا ہے اور میں اس بَھار کو نہیں سنبھال سکتا۔ جینی کے پتر میں اس نے لکھا- ہم اور تم دونوں نے بھول کی اور ہمیں جلد سے جلد اس بھول کو سُدھار لینا چاہیے۔ میں تمھیں سارے بندھنوں سے

مُکت کرتا ہوں۔ تم بھی مجھے مُکت کردو۔ میرا تم سے کوئی سمبندھ نہیں ہے ۔ اَپرادھ نہ تمھارا ہے، نہ میرا۔ سمجھ کا پھیر تمھیں بھی تھا اور مجھے بھی۔ میں نے اپنے پد سے استعفیٰ دے دیا ہے اور اب تمھارا مجھ پر کوئی احسان نہیں رہا۔

میرے پاس جو کچھ ہے، وہ تمھارا ہے، وہ سب میں چھوڑے جاتا ہو۔ میں تو نِمتر ماتر تھا، سُوامنی تم تھیں۔ اس سَبھیتا کو دور سے ہی سلام ہے، جو ونود اور وِلاس کے سامنے کسی بندھن کو سُویکار نہیں کرتی۔ اس نے خود جاکر دونوں پتروں کی رجسٹری کرائی اور اُتّر کا انتظار کیے بنا ہی وہاں سے چلنے کو تیار ہو گیا۔

(۷)

جینی نے جب منہر کا پتر پاکر پڑھا، تو مسکرائی۔ اسے منہر کی اِچھا پر شاسن کا ایسا اَبھیاس پڑ گیا تھا کہ اس پتر سے اسے ذرا بھی گھبراہٹ نہ ہوئی۔ اسے وِشواس تھا کہ دو چار دن چکنی چپڑی باتیں کرکے وہ اسے پھر وَشیبُھوت کرلے گی۔ اگر منہر کی اِچھا کیول دھمکی دینی نہ ہوتی، اس کے دل پر چوٹ لگی ہوتی، تو وہ اب تک یہاں نہ ہوتا۔ کب کا یہ اِستھان چھوڑ چکا ہوتا۔ اس کا یہاں رہنا ہی بتا رہا تھا کہ وہ کیول بندر گھڑکی دے رہا ہے۔

جینی نے اِستھرچِت ہوکر کپڑے بدلے اور تب اس طرح منہر کے کمرے میں آئی، مانو کوئی ابھنے کرنے اسٹیج پر آئی ہو۔ منہر اسے دیکھتے ہی زور سے ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ جینی سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس ہنسی میں کرودھ یا پرتِکار نہ تھا۔ اس میں اُنماد بھرا ہوا تھا ۔ منہر کے سامنے میز پر بوتل اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ ایک دن اس نے نہ جانے کتنی شراب پی لی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے رَکت ابلا پڑا تھا۔ جینی نے سَمیپ جاکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی- کیا رات بھر پیتے ہی رہوگے؟ چلو آرام سے لیٹو، رات زیادہ آ گئی ہے۔ گھنٹوں سے بیٹھی تمھارا انتظار کر رہی ہوں۔ تم اتنے نِشٹھر تو کبھی نہ تھے۔ منہر کھویا ہوا سا بولا- تم کب آگئیں واگی؟ دیکھو، میں کب سے تمھیں پُکار رہا ہوں۔ چلو، آج سیر کر آئیں۔ اسی ندی کے کنارے تم اپنا وہی پیارا گیت سُنانا، جسے سن کر میں پاگل ہو جاتا ہوں۔ کیا کہتی

ہو، میں بے مروّت ہوں؟ یہ تمھارا انیائے ہے، واگی! میں قسم کھا کر کہتا ہوں، ایسا ایک دن بھی نہیں گزرا، جب تمھاری یاد نے مجھے نہ رُلایا ہو۔ جینی نے اس کا کندھا ہلا کر کہا- تم یہ کیا اُول جلول بک رہے ہو؟ واگی یہاں کہاں ہے؟

منہر نے اس کی اور اَپَرچِت بھاو سے دیکھ کر کچھ کہا، پھر زور سے ہنس کر بولا- میں یہ نہ مانوں گا، واگی! تمھیں میرے ساتھ چلنا ہوگا؟ وہاں میں تمھارے لیے پھولوں کی ایک مالا بناؤں گا......۔

جینی نے سمجھا، یہ شراب بہت پی گئے ہیں۔ بک جھک کر رہے ہیں۔ ان سے اس وقت کچھ باتیں کرنا وِیرتھ ہے۔ چپکے سے کمرے سے باہر چلی گئی۔ اسے ذرا سی شَنکا ہوئی تھی۔ یہاں اس کا مؤلوچّھید ہو گیا۔ جس آدمی کا اپنی وانڑی پر ادھیکار نہیں، وہ اِچّھا پر کیا ادھیکار رکھ سکتا ہے؟

اس گھڑی سے منہر کو گھر والوں کی رٹ سی لگ گئی۔ کبھی واگیشوری کو پُکارتا، کبھی اماں کو، کبھی دادا کو۔ اس کی آتما اَتیت میں وِچَرتی رہتی، اس اَتیت میں جب جینی نے کالی چھایا کی بَھانتِ پرویش نہ کیا تھا اور واگیشوری اپنے سرل وَرَت سے اس کے جیون میں پرکاش پھیلاتی رہتی تھی۔

دوسرے دن جینی نے جاکر اس سے کہا-تم اتنی شراب کیوں پیتے ہو؟ دیکھتے نہیں، تمھاری کیا دَشا ہو رہی ہے؟

منہر نے اس کی اور آشچریہ سے دیکھ کر کہا-تم کون ہو؟

جینی- کیا مجھے نہیں پہچانتے ہو؟ اتنی جلد بھول گئے؟

منہر- میں نے تمھیں کبھی نہیں دیکھا۔ میں تمھیں نہیں پہچانتا۔

جینی نے اور اَدھِک بات چیت نہ کی۔ اس نے منہر کے کمرے سے شراب کی بوتلیں اٹھوا لیں اور نوکروں کو تاکید کردی کہ اسے ایک گھونٹ بھی شراب نہ دی جائے۔ اسے اب کچھ کچھ سَندیہہ ہونے لگا تھا، کیوں کہ منہر کی دَشا اس سے کہیں شَنکا جَنَک تھی، جتنی وہ سمجھتی تھی۔ منہر کا جیوِت اور سُوَستھ رہنا اس کے لیے اَوشیک تھا۔ اسی گھوڑے پر بیٹھ کر وہ شکار کھیلتی تھی۔ گھوڑے کے بغیر شکار کا آنند کہاں؟

مگر ایک سپتاہ ہو جانے پر بھی منہر کی مانسِک دَشا میں کوئی انتر نہ ہوا۔ نہ

متروں کو پہچانتا، نہ نوکروں کو۔ پچھلے تین برسوں کا اس کا جیون ایک سُوپن کی بھانتی مِٹ گیا تھا۔

ساتویں دن جینی سِول سرجن کو لے کر آئی، تو منہر کا کہیں پتہ نہ تھا۔

(۸)

پانچ سال کے بعد واگیشوری کا لوٹا ہوا سُہاگ پھر چیتا۔ ماں باپ پُتر کے وِیوگ میں رو رو کر اندھے ہو چکے تھے۔ واگیشوری نِراشا میں بھی آس باندھے بیٹھی تھی۔ اس کا مائیکہ سَمپَنّ تھا۔ بار بار بُلاوے آتے، باپ آیا، بھائی آیا، پر دَھیرّ یہ اور وَرَت کی دیوی گھر سے نہ ٹلی۔

جب منہر بھارت آیا، تو واگیشوری نے سُنا کہ وہ وِلایت سے ایک میم لایا ہے۔ پھر بھی اسے آشا تھی کہ وہ آئے گا؛لیکن اس کی آشا پوری نہ ہوئی۔ پھر اس نے سُنا، وہ عیسائی ہو گیا ہے آچار وِچار تیاگ دیاہے، تب اس نے ماتھا ٹھونک لیا۔

گھر کی اَوَستھا دن دن بگڑنے لگی۔ ورشا بند ہو گئی اور ساگر سوکھنے لگا۔ گھر بکا، کچھ زمین تھی، وہ بِکی، پھر گہنوں کی باری آئی، یہاں تک کہ اب کیول آکاشی ورتِ تھی۔ کبھی چولھا جل گیا، کبھی ٹھنڈا پڑا رہا۔

ایک دن سَندِھیا سَمے وہ کنویں پر پانی بھرنے گئی تھی کہ ایک تھکا ہوا، جیرن، (پھٹا پرانا) وپتّی کا مارا جیسا آدمی آ کر کنویں کی جگت پر بیٹھ گیا۔ واگیشوری نے دیکھا، تو منہر۔ اس نے تُرنت گھونگھٹ بڑھا لیا۔ آنکھوں پر وِشواس نہ ہوا، پھر بھی آنند اور وِسمیہ سے ہردے میں پُھریریاں اُڑنے لگیں۔ رسّی اور کلسا کنویں پر چھوڑ کر لپکی ہوئی گھر آئی اور ساس سے بولی-امّاں جی، ذرا کنویں پر جاکردیکھو، کوئی آیا ہے۔ ساس نے کہا- تو پانی لانے گئی تھی، یا تماشہ دیکھنے؟گھر میں ایک بوند پانی نہیں ہے۔ کون آیا ہے کنویں پر؟

'چل کر، دیکھ لو نا!'

'کوئی سپاہی پیادہ ہوگا۔ اب ان کے سوا اور کون آنے والا ہے۔ کوئی مہاجن تو نہیں ہے؟'

'نہیں امّاں، تم چلی کیوں نہیں چلتیں؟'
بوڑھی ماتا بھانتِ بھانتِ کی شنکائیں کرتی ہوئی کنویں پر پہنچی، تو منہر دوڑ کر ان کے پیروں سے لپٹ گیا۔ ماتا نے اسے چھاتی سے لگاکرکہا-تمھاری یہ دَشا ہے مانو؟کیا بیمار ہو؟اسباب کہاں ہے؟
منہر نے کہا-پہلے کچھ کھانے کو دو، امّاں!بہت بھوکا ہوں۔ میں بڑی دور سے پیدل چلا آرہاہوں۔
گاؤں میں خبر پھیل گئی کہ منہر آیا ہے۔ لوگ اسے دیکھنے دوڑے۔ کس ٹھاٹھ سے آیا ہے؟ بڑے اونچے پد پر ہے، ہزاروں روپیے پاتا ہے۔ اب اس کے ٹھاٹھ کا کیا پوچھنا۔ میم بھی ساتھ آئی ہے یا نہیں؟
مگر جب جاکر دیکھا، تو آفت کا ماراآدمی، پھٹے حال، کپڑے تارتار، بال بڑھے ہوئے، جیسے جیل سے آیا ہو۔
پرشنوں کی بوچھار ہونے لگی-ہم نے تو سنا تھا، تم کسی بڑے اونچے پد پر ہو۔
منہر نے جیسے کسی بھولی بات کو یاد کرنے کا وِپھل پریاس کرکے کہا- میں! میں تو کسی عہدے پر نہیں۔
'واہ! تم ولایت سے میم نہیں لائے تھے؟'
منہر نے چکِت ہوکر کہا- وِلایت۔ وِلایت کون گیا تھا؟
'ارے!بھانگ تو نہیں کھا گئے ہو۔ تم وِلایت نہیں گئے تھے؟'
منہر مونڑھوں کی بھانتِ ہنسا-میں وِلایت کیا کرنے جاتا؟
'اجی، تم کو وظیفہ نہیں ملاتھا؟ یہاں سے تم وِلایت گئے تھے۔ تمھارے پتر برابر آتے تھے۔ اب تم کہتے ہو، میں وِلایت گیا ہی نہیں۔ ہوش میں ہو، یا ہم لوگوں کو الّو بنارہے ہو۔'
منہر نے ان لوگوں کی اور آنکھیں پھاڑ کر دیکھا اور بولا- میں تو کہیں نہیں گیا تھا۔ آپ لوگ جانے کیا کہہ رہے ہیں۔
اب اس میں سَندیہہ کی گنجائش نہ رہی کہ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ اسے وِلایت جانے کے پہلے کی ساری باتیں یادتھیں۔ گاؤں اور گھر کے ہر

ایک آدمی کو پہچانتا تھا، سب سے نَمرتا اور پریم سے باتیں کرتا تھا؛ لیکن جب انگلینڈ، انگریز بیوی اور اونچے پد کا ذکر آتا تو بھونچکا ہو کر تاکنے لگتا۔ واگیشوری کو اب اس کے پریم میں ایک اَسْوا بھاوِک اَنُوراگ دکھتا تھا، جو بناوٹی معلوم ہوتا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے ویوہار اور آچرن میں پہلے کی سی بے تکلفی ہو۔ وہ پریم کا سوانگ نہیں، پریم چاہتی تھی۔ دس ہی پانچ دنوں میں اسے گیان ہوگیا کہ اس وِشیش اَنُوراگ کا کارن بناوٹ یا دکھاوا نہیں، وَرَن کوئی مانسِک وِکار ہے۔ منہر نے ماں باپ کا اتنا ادب پہلے کبھی نہ کیا تھا۔ اسے اب موٹے سے موٹا کام کرنے میں سَنکوچ نہ تھا۔ وہ، جو بازار سے ساگ بھاجی لانے میں اپنا اَنادر سمجھتا تھا، اب کنویں سے پانی کھینچتا، لکڑیاں پھاڑتا اور گھر میں جھاڑو لگاتا تھا اور اپنے گھر میں ہی نہیں، سارے محلّے میں اس کی سیوا اور نَمرتا کی ہوتی چرچا تھی۔

ایک بار محلّے میں چوری ہوئی۔ پولیس نے بہت دوڑدھوپ کی؛ پر چوری کا پتہ نہ چلا۔ منہر نے چور کا پتہ ہی نہیں لگا دیا؛ بلکہ مال بھی برآمد کر ادیا۔ اس سے آس پاس کے گاؤں اور محلّوں میں اس کا لیش پھیل گیا۔ کوئی چوری ہوجاتی تو لوگ اس کے پاس دوڑے آتے اور اَدِھیکانش اُدیوگ اس کے سَپھل بھی ہوتے تھے۔ اس طرح اس کی جیوِکا کی ایک وِوَستھا ہوگئی۔ وہ اب واگیشوری کا غلام تھا۔ اسی کی دلجوئی اور سیوا میں اس کے دن کٹتے تھے گراس میں وِکار یا بیماری کا کوئی لکشن تھا، تو اتنا ہی۔ یہی سنک اسے سوار ہوگئی تھی۔

واگیشوری کو اس کی دَشا پر دکھ ہوتا تھا؛ پر اس کی یہ بیماری اس سُواستھیہ سے اسے کہیں پر یہ تھی، جب وہ اس کی بات بھی نہ پوچھتا تھا۔

(۹)

چھ مہینوں کے بعد ایک دن جینی منہر کا پتہ لگاتی ہوئی آ پہنچی۔ ہاتھ میں جو کچھ تھا، وہ سب اُڑا چکنے کے بعد اب اسے کسی آشریہ کی کھوج تھی۔ اس کے چاہنے والوں میں کوئی ایسا نہ تھا، جو اس کی آرتھک سہایتا کرتا۔ شاید اب جینی کو کچھ گلانِ بھی ہوتی تھی۔ وہ اپنے کیے پر لجّت تھی۔

ڈرائیور ہارن کی آواز سن کر منہر باہر نکلا اور اس پرکار جینی کو دیکھنے لگا، مانو اسے کبھی دیکھا ہی نہیں۔

جینی نے موٹر سے اتر کر اس سے ہاتھ ملایا اور اپنی بیتی سُنانے لگی- تم اس طرح مجھ سے چھپ کر کیوں چلے آئے؟ اور پھر آکر ایک پتر بھی نہیں لکھا۔ آخر، میں نے تمھارے ساتھ کیا بُرائی کی تھی! پھر مجھ میں کوئی بُرائی دیکھی تھی، تو تمھیں چاہیے تھا کہ مجھے ساودھان کر دیتے۔ چھپ کر چلے آنے سے کیافائدہ ہوا؟ ایسی اچھی جگہ مل گئی تھی وہ بھی ہاتھ سے نکل گئی۔

منہر کاٹھ کے اُلّو کی بھانتِ کھڑارہا۔

جینی نے پھر کہا- تمھارے چلے آنے کے بعد میرے اوپر جو سنکٹ آئے، وہ سُناؤں، تو تم گھبرا جاؤگے۔ میں اسی چنتا اور دکھ سے بیمار ہوگئی۔ تمھارے بغیر میرا جیون نِرارتھک ہوگیا ہے۔ تمھارا چتر دیکھ کر من کو ڈھارس دیتی تھی ۔ تمھارے پتروں کو آدِ سے انت تک پڑھنا میرے لیے سب سے منورنجک وِشے تھا۔ تم میرے ساتھ چلو، میں نے ایک ڈاکٹر سے بات چیت کی ہے، وہ مَستِشک کے وِکاروں کا ڈاکٹر ہے۔ مجھے آشا ہے، اس کے اُپچار سے تمھیں لابھ ہوگا۔

منہر چپ چاپ وِرَکت بھاو سے کھڑا رہا، مانووہ نہ کچھ دیکھ رہاہے، نہ سن رہاہے۔

سہسا واگیشوری نکل آئی۔ جینی کو دیکھتے ہی وہ تاڑگئی کہ یہی میری یورپین سوت ہے۔ وہ اسے بڑے آدرستکار کے ساتھ بھیتر لے گئی۔ منہر بھی ان کے پیچھے پیچھے چلاگیا۔

جینی نے ٹوٹی کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا- انھوں نے میرا ذکر تو تم سے کیا ہی ہوگا۔ میری ان سے لندن میں شادی ہوئی تھی۔

واگیشوری بولی- یہ تومیں آپ کو دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی۔

جینی- انھوں نے کبھی میرا ذکر نہیں کیا؟

واگیشوری- کبھی نہیں۔ انھیں تو کچھ یادنہیں۔ آپ کو تو یہاں آنے میں بڑا کشٹ ہوا ہوگا؟

جینی- مہینوں کے بعد تب ان کے گھر کا پتہ چلا۔ وہاں سے بنا کچھ کہے سنے چل دیے۔

'آپ کو کچھ معلوم ہے، انھیں کیا شکایت ہے؟'

'شراب بہت پینے لگے تھے۔ آپ نے کسی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا؟'

'ہم نے تو کسی کو نہیں دکھایا۔'

جینی نے تِرسکار کر کے کہا- کیوں؟ کیا آپ انھیں ہمیشہ بیمار رکھنا چاہتی ہیں؟

واگیشوری نے بے پروائی سے جواب دیا- میرے لیے تو ان کا بیمار رہنا ان کے سُوستھ رہنے سے کہیں اچّھا ہے۔ تب وہ اپنی آتما کو بھول گئے تھے، اب اسے پا گئے۔

پھر اس نے نِردیہ کٹاکشچھ کرکے کہا- میرے وِچار میں تو وہ تب بیمار تھے اب سواَستھ ہیں۔

جینی نے چڑ کر کہا- نانسینس۔ ان کی کسی وِشیشگیہ سے چکِتسا کرانی ہوگی۔ یہ جاسوسی میں بڑے کُشل ہیں۔ ان کے سبھی افسر ان سے پرسن تھے۔ یہ چاہیں تو اب بھی وہ جگہ مل سکتی ہے۔ اپنے وِبھاگ میں اونچے سے اونچے پد تک پہنچ سکتے ہیں۔ مجھے وِشواس ہے کہ ان کا روگ اَسادھیہ نہیں ہے؛ ہاں، وِچتر اَوَشیہ ہے۔ آپ کیا ان کی بہن ہیں؟

واگیشوری نے مسکرا کر کہا- آپ تو گالی دے رہی ہیں۔ یہ میرے سوامی ہیں۔

جینی پر مانو وَجرپات سا ہوا۔ اس کے مکھ پر سے نِمرتا کا آوَرن ہٹ گیا اور من میں چھپا ہوا کرودھ جیسے دانت پیسنے لگا۔ اس کی گردن کی نسیں تن گئیں، دونوں مٹھیاں بندھ گئیں۔ اُنمت ہو کر بولی- بڑا دغاباز آدمی ہے۔ اس نے مجھے بڑا دھوکھا دیا۔ مجھ سے اس نے کہا تھا، میری استری مر گئی ہے۔ کتنا بڑا دھورت ہے۔ یہ پاگل نہیں ہے۔ اس نے پاگل پن کا سوانگ بھرا ہے۔ میں عدالت سے اس کی سزا کراؤں گی۔

کرودھاویش کے کارن وہ کانپ اُٹھی۔ پھر روتی ہوئی بولی- اس دغابازی کا میں اسے مزہ چکھاؤں گی۔ آہ! اس نے میرا کتنا گھور اپمان کیا ہے۔ ایسا وِشواس گھات

کرنے والے کو جو ڈنڈ دیا جائے، وہ تھوڑا ہے۔ اس نے کیسی میٹھی میٹھی باتیں کر کے مجھے پھانسا۔ میں نے ہی اسے جگہ دلائی، میرے ہی پریتوں سے یہ بڑا آدمی بنا۔ اس کے لیے میں نے اپنا گھر چھوڑا، اپنا دیش چھوڑا اور اس نے پرے ساتھ کپٹ کیا۔ جینی سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ پھر تیش میں اٹھی اور منہر کے پاس جاکر اس کو اپنی اور کھینچتی ہوئی بولی۔ میں تمھیں خراب کرکے چھوڑوں گی۔ تو نے مجھے سمجھا کیا ہے......

منہر اس طرح شانت بھاو سے کھڑا رہا، مانو اس سے کوئی پریوجن نہیں ہے۔

پھر وہ سِنہنی کی بھانتِ منہر پر ٹوٹ پڑی اور اسے زمین پر گرا کر اس کی چھاتی پر چڑھ بیٹھی۔ واگیشوری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر الگ کر دیا اور بولی۔ تم ایسی ڈائن نہ ہوتیں، تو ان کی یہ دَشا کیوں ہوتی؟

جینی نے طیش میں آ کر جیب سے پستول نکالی اور اگیشوری کی طرف بڑھی۔ سہسا منہر تڑپ کر اُٹھا، اس کے ہاتھ سے بھرا ہوا پستول چھین کر پھینک دیا اور واگیشوری کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ پھر ایسا منھ بنا لیا، مانو کچھ ہوا ہی نہیں۔

اسی وقت منہر کی ماتا دوپہری کی نیند سو کر اٹھیں اور جینی کو دیکھ کر واگیشوری کی اور پرشن کی آنکھوں سے تاکا۔

واگیشوری نے اُپہاس کے بھاو سے کہا۔ یہ آپ کی بہو ہے۔ بڑھیا تنک کر بولی۔ کیسی میری بہو؟ یہ میری بہو بننے جوگ ہے بندریا؟ لڑکے پر نہ جانے کیا کر کرا دیا ہے، اب چھاتی پر مونگ دلنے آئی ہے؟

جینی ایک چھن تک خون بھری آنکھوں سے منہر کی اور دیکھتی رہی۔ پھر بجلی کی بھانتِ کوندھ کر اس نے آنگن میں پڑا ہوا پستول اُٹھا لیا اور واگیشوری پر چھوڑنا چاہتی تھی کہ منہر سامنے آ گیا۔ وہ بے دھڑک جینی کے سامنے چلا گیا۔ اس نے ہاتھ سے پستول چھین لیا اور اپنی چھاتی میں گولی مار لی۔

یہ افسانہ ہندی میں پہلی بار مادھوری جنوری 1931 میں شائع ہوا۔ مان سروور 2 میں شامل ہے۔ اردو میں شائع نہیں ہوا۔

الزام

منشی شیام کشور کے دروازہ پر منو مہتر نے جھاڑو لگائی غسل خانہ دھوکر صاف کیا اور زاں بعد دروازہ پر جاکر مالکہ سے بولا- ماں جی دیکھ لیجے سب صاف کر دیا۔ آج کچھ کھانے کو مل جائے، سرکار! مالکہ نے دروازہ پر آکر کہا۔ ابھی تو تمھیں تنخواہ دیئے ہوئے دس روز بھی نہیں گزرے، اتنی جلد پھر مانگنے لگے۔

منو : کیا کروں ماں جی،خرچ نہیں چلتا، اکیلا آدمی گھر دیکھوں کہ کام کروں!

مالکہ : تو بیاہ کیوں نہیں کر لیتے؟

منو : روپے مانگتے ہیں، سرکار! یہاں کھانے سے نہیں بچتا۔ تھیلی کہاں سے لاؤں۔

مالکہ : ابھی تم تو جوان ہو، کب تک اکیلے بیٹھے رہو گے؟

منو : حضور کی اتنی نگاہ ہے تو کہیں نہ کہیں ٹھیک ہو ہی جائے گا۔ سرکار کچھ مدد کریں گی نا؟

مالکہ : ہاں! ہاں تم ٹھیک ٹھاک کرو۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا میں بھی دے دوں گی۔

منو : سرکار کا مجاج بڑا اچھا ہے۔ حضور اتنا خیال کرتی ہیں، دوسرے گھروں میں تو مالکن لوگ بات بھی نہیں پوچھتیں، سرکار کو اللہ نے جیسی شکل صورت دی ہے ویسا ہی دل بھی دیا ہے اللہ جانتا ہے۔ حضور کو دیکھ کر بھوک پیاس جاتی رہتی ہے۔ بڑے بڑے گھر کی عورتیں دیکھتی ہیں مگر حضور کے تلوؤں کی برابری بھی نہیں کر سکتیں۔

مالکہ : چل جھوٹے میں ایسی کون سی خوبصورت ہوں

منّو : اب سرکار سے کیا کہوں؟ بڑی بڑی کھترانیوں کو دیکھا ہے مگر گورے پن کی سوا اور کوئی بات نہیں، ان میں یہ نمک کہاں سرکار؟

مالکہ : ایک روپیہ میں تمھارا کام چل جاوے گا؟

منّو : بھلا سرکار دو روپے تو دے دیں۔

مالکہ : اچھا یہ لو اور جاؤ۔

منّو : جاتا ہوں سرکار آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں۔

مالکہ : کیا پوچھتے ہو، پوچھو! مگر جلدی، مجھے چولہا جلانا ہے۔

منّو : تو سرکار جائیں، پھر کبھی کہوں گا۔

مالکہ : نہیں نہیں، کیابات ہے؟ ابھی کچھ ایسی جلدی نہیں ہے۔

منّو : دال منڈی میں سرکار کے کوئی رہتے ہیں کیا؟

مالکہ : نہیں، یہاں تو کوئی رشتہ دار نہیں۔

منّو : تو کوئی دوست ہوں گے، سرکار کو اکثر ایک کوٹھے پر سے اترتے دیکھتا ہوں۔

مالکہ : دال منڈی تو رنڈیوں کا محلہ ہے۔

منّو : ہاں سرکار رنڈیاں بہت ہیں وہاں، لیکن سرکار تو سیدھے سادے آدمی جان پڑتے ہیں۔ یہاں رات میں دیر سے تو نہیں آتے؟

مالکہ : نہیں، شام ہونے سے پہلے آجاتے ہیں، اور پھر کہیں نہیں جاتے ہاں کبھی کبھی لائبریری البتہ جاتے ہیں۔

منّو : بس یہی بات ہے حضور، موکا (موقع) ملے تو اشارہ سے سمجھا دیجیے گا، سرکار، کہ رات کو ادھر نہ جایا کریں۔ آدمی کا دل کتنا ہی صاف ہو، مگر دیکھنے والے شک کرنے لگتے ہیں۔

اتنے ہی میں بابو شیام کشور آگئے۔ منّو نے انھیں سلام کیا۔ بالٹی اٹھالی اور چلتا ہوا۔

شیام : کشور نے پوچھا- منّو کیا کہہ رہا تھا؟

دیوی : کچھ نہیں، اپنے دکھڑے رو رہا تھا۔ کھانے کو مانگتا تھا، دو روپے دے دیئے ہیں۔ بات چیت بڑے بُرے ڈھنگ سے کرتا ہے ۔

شیام : تمھیں تو باتیں کرنے کا روگ ہے، اور کوئی نہیں، مہتر ہی سہی اس بھتنے سے نہ جانے تم کیسے باتیں کرتی ہو؟

دیوی : مجھے اس کی صورت لے کر کیا کرنا ہے؟ غریب آدمی ہے، اپنا دکھڑا سنانے لگتا ہے تو کیسے نہ سنوں؟

بابو صاحب نے بیلے کا گجرا رومال سے نکال کر دیوی کے گلے میں ڈال دیا مگر دیوی کے چہرے پر خوشی کے کوئی آثار نہ دکھائی پڑے۔ ترچھی نگاہوں سے دیکھ کر بولی، آپ آج کل دال منڈی کی سیر بہت کیا کرتے ہیں۔

شیام : کون ،میں؟

دیوی : جی ہاں، تم مجھ سے لائبریری کا بہانہ بنا کرکے جاتے ہو اور وہاں جلسے ہوتے ہیں۔

شیام : بالکل جھوٹا سولہوں آنے جھوٹ: تم سے کون کہتا تھاوہی متو؟

دیوی : متو نے مجھ سے کچھ نہیں کہا مگر مجھے تمھاری ٹوہ ملتی رہتی ہے۔

شیام : تم میری ٹوہ مت لیا کرو، شک کرنے سے آدمی شکی ہوجاتاہے۔اور تب بڑی بڑی برائیاں پیدا ہوجاتی ہیں،بھلا میں دال منڈی کیوں جانے لگا؟ تم سے بڑھ کر دال منڈی میں اور کون ہے؟ میں تو تمھاری ان مدبھری آنکھوں کا عاشق ہوں۔ اگر اپسرا (حور) بھی سامنے آجائے تو آنکھ اٹھاکر نہ دیکھوں آج شاردا کہاں ہے ؟

دیوی : نیچے کھیلنے چلی گئی ہے۔

شیام : نیچے نہ جانے دیا کرو یکے، موٹریں، بگھیاں دوڑتی رہتی ہیں نہ جانے کب کیا ہو جاوے۔ آج ہی اردلی بازار میں ایک واردات ہو گئی۔تین لڑکے ایک ساتھ دب گئے۔

دیوی : تین لڑکے: بڑا غضب ہوگیا۔ کس کی موٹر تھی؟

شیام : اس کا ابھی پتہ نہیں چلا، ایشور(جانتا ہے) تم پر یہ گجرا بہت کھل رہا ہے۔

دیوی : (مسکراکر) چلو، باتیں نہ بناؤ۔

(۲)

تیسرے روز منو نے دیوی سے کہا۔سرکار! ایک جگہ سگائی ٹھیک ہورہی ہے، دیکھئے کول سے پھر نہ جائیے گا۔ مجھے آپ کا بڑا بھروسہ ہے

دیوی : دیکھ لی، عورت کیسی ہے؟

منو : سرکار جیسی تکدیر میں ہے ویسی ہے، گھر کی روٹیاں تو ملیں گی نہیں تو اپنے ہاتھوں ٹھونکنا پڑتا تھا۔ پر ہے کیا کہ مجاج کی سیدھی ہے، ہمارے جات کی عورتیں بڑی چنچل ہوتی ہیں حضور، سیکڑے پیچھے ایک بھی پاک نہ ملے گی۔

دیوی : مہتر لوگ اپنی عورتوں کو کچھ کہتے نہیں؟

منو : کیا کہیں حضور، ڈرتے ہیں کہ کہیں اپنے آشنا سے چگلی کھاکر ہماری نوکری جاکری نہ چھڑا دے۔ مہترانیوں پر بابو صاحبوں کی بہت نگاہ رہتی ہے سرکار!"

دیوی : (ہنس کر) چل جھوٹے، بابو صاحبوں کی عورتیں کیا مہترانیوں سے بھی گئی گذری ہوتی ہیں؟

منو : اب سرکار کچھ نہ کہلاویں، حضور کو چھوڑ کر اور تو کوئی ایسی بیوائن نہیں دیکھتا جس کا کوئی بکھان کرے بہت ہی چھوٹا آدمی ہوں سرکار، پر ان بیوانیوں کی طرح میری عورت ہوتی تو اس سے بولنے کو جی نہ چاہتا حضور کے چہرے مہرے کی کوئی عورت میں نے تو دیکھی نہیں؟

دیوی : چل جھوٹے، اتنی خوشامد کرنا کس سے سیکھا؟

منو : خوشامد نہیں کرتا سرکار، سچی بات کہتا ہوں، حضور ایک دن کھڑکی کے سامنے کھڑی تھیں، راجا میاں کی نگاہ آپ پر پڑگئی، جوتے کی بڑی دکان ہے ان کی۔ اللہ نے جیسا دھن دیا ہے ویسا ہی دل بھی، آپ کو دیکھتے ہی آنکھیں نیچی کر لیں، آج باتوں باتوں میں حضور کی سکل وصورت سراہنے لگے میں نے کہا جیسی صورت ہے ویسا ہی اللہ نے آپ کو دل بھی دیا ہے۔

دیوی : اچھا، وہ لانبا سا سانولے رنگ کا جوان؟

منو : ہاں حضور، وہی مجھ سے کہنے لگے کہ کس طرح پھر انھیں ایک بار دیکھ پاتا مگر

میں نے ڈانٹ کر کہا ، کھبردار میاں، جو مجھ سے پھر ایسی باتیں کیں! وہاں تمھاری دال نہ گلے گی۔

دیوی : تم نے بہت اچھا کیا ۔نگوڑے کی آنکھیں پھوٹ جائیں، جب ادھر سے جاتا ہے ،کھڑکی کی طرف اس کی نگاہ رہتی ہے،کہہ دینا ادھر بھول کر بھی نہ تاکے۔

متو : کہہ دیا ہے حضور۔ حکم ہو تو چلوں اور تو کچھ صاف نہیں کرنا ہے؟ سرکار کے آنے کی بیلا(وقت) ہو گئی ہے مجھے دیکھیں گے تو کہیں گے کہ کیا باتیں کر رہا ہے۔

دیوی : یہ روٹیاں لیتے جاؤ، آج چولھے سے بچ جاؤ گے۔

متو : اللہ حضور کو سلامت رکھے، میرا تو جی یہی چاہتا ہے کہ اسی درواجے پر پڑا رہوں اور ایک ٹکڑا کھالیا کروں، سچ کہتاہوں، حضور کو دیکھ کر بھوک پیاس ہرجاتی ہے۔

متو : جاہی رہا تھا کہ بابو شیام کشور اوپر آپہونچے۔ متو کی آخری بات ان کے کان میں پڑ گئی تھی، منو جیوں ہی نیچے گیا بابو صاحب دیوی سے بولے۔ میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ متو کو منہ نہ لگاؤ، مگر تم نے میری بات نہ مانی،چھوٹے لوگ ایک گھر کی بات دوسرے گھر میں پہونچا دیتے ہیں انھیں کبھی منہ نہ لگانا چاہیے بھوک پیاس ہرجانے کی کیا بات تھی؟

دیوی : کیا جانے، بھوک پیاس کیسی؟ ایسی تو کوئی بات نہ تھی؟

شیام : تھی کیوں نہیں۔ میں نے صاف سنی۔

دیوی : مجھے تو یاد نہیں پڑتی، ہوگی کوئی بات، میں کون سی اس کی سب باتیں سنا کرتی ہوں؟

شیام : تو کیا وہ دیوار سے باتیں کرتاہے؟ دیکھو، نیچے کوئی آدمی اس کھڑکی کی طرف تاکتا چلا جاتاہے، اسی محلہ کا ایک مسلمان لونڈا ہے، جوتیوں کی دکان کرتاہے۔ تم کیا اس کھڑکی پر کھڑی رہا کرتی ہو۔؟

دیوی : چک تو پڑی ہوئی ہے۔

شیام : چق کے پاس کھڑے ہونے سے باہر کا آدمی تمھیں صاف دیکھ سکتا ہے۔

دیوی : یہ مجھے نہ معلوم تھا۔ اب کبھی کھڑکی کھولوں گی ہی نہیں۔

شیام : ہاں کیا فائدہ؟ منو کو اندر نہ آنے دیا کرو۔
دیوی : غسل خانہ کون کرے گا۔؟
شیام : خیر آوے مگر اس سے تمھیں باتیں نہ کرنی چاہئیں۔ آج ایک نیا تھیٹر آیا ہے۔ سنا ہے، اب کے ایکٹر بہت اچھے ہیں۔

اتنے میں شاردا نیچے سے مٹھائی کا ایک دونا لیے دوڑتی ہوئی آئی۔ دیوی نے پوچھا ارے یہ مٹھائی کس نے دی؟

شاردا : راجا بھیا نے تو دی ہے کہتے تھے۔ تم کو اچھے اچھے کھلونے لادوں گا۔
شیام : راجا بھیا۔ کون ہے ؟
شاردا : وہی تو ہیں جو ابھی ادھر سے گئے ہیں۔
شیام : وہی تو نہیں جو لمبا سا سانولے رنگ کا آدمی ہے ۔؟
شاردا : ہاں ہاں، وہی وہی، میں اب ان کے گھر روز جاؤں گی۔
دیوی : کیا تو اس کے گھر گئی تھی۔؟
شاردا : وہی تو گود میں اٹھا کر لے گئے۔
شیام : تو نیچے کھیلنے مت جایا کر۔ کسی دن موٹر کے نیچے دب جاوے گی۔ دیکھتی نہیں۔ کتنی موٹریں آتی رہتی ہیں۔؟
شاردا : راجا بھیا کہتے تھے کہ تمھیں موٹر پر ہوا کھلانے لے چلیں گے۔
شیام : تم بیٹھی بیٹھی کیا کرتی ہو۔ جو تم سے ایک لڑکی کی دیکھ بھال بھی نہیں ہوسکتی؟
دیوی : اتنی بڑی لڑکی کو صندوق میں بند کر کے نہیں رکھا جا سکتا۔
شیام : تم جواب دینے میں تو تیز ہو۔ یہ میں جانتا ہوں، یہ کیوں نہیں کہتیں کہ باتیں کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔؟
دیوی : باتیں میں کس سے کرتی رہتی ہوں، یہاں تو کوئی پڑوسن بھی نہیں۔
شیام : منو ہر مہتر تو ہے۔
دیوی : (ہونٹ چبا کر) منو کیا میرا سگا ہے جس سے بیٹھی باتیں کیا کرتی ہوں؟ غریب آدمی ہے ، اپنا دکھڑا روتا ہے تو کیا کہدوں ؟ مجھ سے تو دتکارتے نہیں بنتا۔
شیام : خیر ، کھانا بنالو، نو بجے تماشہ شروع ہو جائے گا، سات بج گئے ہیں۔

دیوی : تم جاؤ، دیکھ آؤ، میں نہ جاؤں گی۔
شیام : تمھیں تو مہینوں سے تماشے کی رٹ لگائے ہوئے تھیں، اب کیا ہو گیا؟ کیا تم نے قسم کھالی ہے کہ یہ جو بات کہیں اسے کبھی نہ مانوں گی؟
دیوی : نہ جانے کیوں تمھارا ایسا خیال ہے۔ میں تو تمھاری مرضی سے ہی کوئی کام کرتی ہوں، میرے نہ جا نے سے کچھ اور پیسے خرچ ہو جاویں گے تو تم میری جان کھانے لگوگے، یہی سوچ کر میں نے کہا تھا۔ اب تم کہتے ہو تو چلی چلوں گی، تماشہ دیکھنا کسے برا لگتا ہے ؟

(۳)

نو بجے شیام کشور ایک تانگہ پر بیٹھ کر دیوی اور شاردا کے ساتھ تھیٹر دیکھنے چلے، سڑک پر کچھ ہی دور گئے تھے کہ پیچھے سے ایک اور تانگہ والا آ پہونچا اس پر رضا بیٹھا ہوا تھا اور اسکی بغل میں بیٹھا وہی منّو مہتر جو بابو صاحب کے گھر کی صفائی کرتا تھا! دیوی نے ان دونوں کو دیکھتے ہی سر جھکا لیا، اسے تعجب ہوا کہ رضا اور منّو میں اتنی گہری دوستی ہے کہ رضا اسے اپنے ہمراہ تانگے پر بٹھا کر سیر کرانے لے جاتا ہے، شاردا رضا کو دیکھتے ہی بول اٹھی۔ بابوجی، دیکھو! وہ راجا بھیا آرہے ہیں(تالی بجا کر) راجا بھیا، ادھر دیکھو ہم لوگ تماشہ دیکھنے جا رہے ہیں۔

رضا نے مسکرا دیا مگر بابو صاحب غصہ سے تلملا اٹھے انھیں ایسا معلوم ہوا کہ یہ بد معاش صرف میرے تعاقب میں آرہے ہیں، ان دونوں میں ضرور سانٹھ گانٹھ ہے ورنہ رضا منّو کو کیوں ساتھ لاتا؟ ان سے پیچھا چھڑا نے کے لیے انھوں نے تانگہ والے سے کہا ''اور تیز چلو، دیر ہورہی ہے'' تانگہ تیز ہوگیا، رضا نے بھی اپنا تانگہ تیز کیا، بابو صاحب نے جب تانگہ والے کو آہستہ کر نے کے لیے کہا تو رضا کا تانگہ بھی آہستہ ہو گیا۔''آخر بابو صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔'' تم تانگے کو چھاؤنی کی طرف لے چلو ہم تھیٹر دیکھنے نہ جائیں گے۔'' تانگے والے نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا اور تانگہ پھیر دیا، رضا کا تانگہ بھی پھر گیا، بابو صاحب کو اتنا غصہ آرہا تھا کہ رضا کو للکاروں مگر ڈرتے تھے کہ کہیں جھگڑا ہو گیا تو بہت لوگ جمع ہو

جائیں گے اور بے فائدہ خفت اٹھانی پڑے گی۔ لہو کا گھونٹ پی کر رہ گئے ۔ اپنے ہی اوپر جھنجھلا نے لگے کہ ناحق آیا، کیا جانتا تھا کہ یہ دونوں شیطان سر پر سوار ہو جائیں گے منّو کو تو کل ہی نکال دوں گا۔ آخر رضا کا تانگہ کچھ دور چل کر دوسری طرف مڑ گیا اور بابو صاحب غصہ کسی قدر فرو ہوا۔ مگر اب تھیٹر جانے کا وقت نہ تھا، چھاونی سے گھر واپس آئے۔

دیوی نے کوٹھے پر آکر کہا، مفت میں تانگہ والے کو دو روپے دینے پڑے۔

شیام کشور نے اس کی طرف خون خشک کر دینے والی نگاہوں سے دیکھ کر کہا، اور منّو سے باتیں کرو اور کھڑکی پر کھڑے ہو کر رضا کو اپنا جمال دکھاؤ، تم نہ جانے کیا کرنے پر تلی ہو۔

دیوی : ایسی باتیں منہ سے نکالتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی! تم مجھے ناحق ہی ذلیل کرتے ہو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ میں کسی مرد کو تمھارے پیروں کی خاک کے برابر بھی نہیں سمجھتی اس کمبخت مہتر کی کیا حقیقت ہے۔ تم مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہو۔

شیام : نہیں نہیں، میں تمھیں ذلیل نہیں سمجھتا مگر نادان ضرور سمجھتا ہوں تمھیں اس بدمعاش کو کبھی منہ نہ لگانا چاہیے تھا۔ اب تو تمھیں معلوم ہوگیا کہ وہ ایک شیدا ہے یا اب بھی کچھ شک ہے۔

دیوی : میں اس کو کل ہی نکال دونگی۔

منشی جی لیٹے مگر دل بے چین تھا، وہ تمام دن دفتر میں رہتے تھے کیا جان سکتے تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں دیوی کیا کرتی ہے وہ یہ جانتے تھے کہ دیوی عصمت شعار ہے مگر یہ بھی جانتے تھے کہ اپنا حسن وجمال دکھانے کا حسن و جمال والوں کو مرض ہوتا ہے، دیوی ضرور بن ٹھن کر دریچہ پر کھڑی ہوتی ہے اور محلّہ کے شہدے اس کو دیکھ دیکھ کر نہ جانے کیا کیا منصوبہ کرتے ہوں گے، اس کاروبار کو بند کرنا انھیں اپنے قابو سے باہر معلوم ہوتا تھا۔ شہدے فن تسخیر کے ماہر ہوتے ہیں، ایشور نہ کرے، ان بدمعاشوں کی نگاہ کسی بھلے آدمی کی بہو بیٹی پر پڑے۔ ان سے کیسے پیچھا چھڑاؤں؟

بہت سوچنے پر آخر انھوں نے وہ مکان چھوڑ دینے کا قصد کر لیا۔ اس کے سوا

انھیں کوئی اور تدبیر نہ سوجھی، دیوی سے بولے۔ کہو تو یہ مکان چھوڑ دوں۔ ان شہدوں کے درمیان میں رہنے سے آبرو بگڑنے کا اندیشہ ہے۔

دیوی نے معترضانہ لہجہ میں کہا۔ جیسے تمھاری مرضی۔

شیام : آخر تمھیں کوئی تدبیر بتلاؤ۔؟

دیوی : میں کون سی تدبیر بتلاؤں اورکس بات کی تدبیر مجھے تومکان چھوڑنے کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ ایک دو نہیں لاکھ دو لاکھ شہدے ہوں تو کیا؟ کتّوں کے بھونکنے کے خوف سے کوئی اپنا مکان چھوڑ دیتا ہے۔

شیام : کبھی کبھی کتّے کاٹ بھی لیتے ہیں۔

دیوی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا زیادہ قیل وقال سے شوہر کے خیالات میں زیادہ بگاڑ پیدا ہو جانے کا خوف تھا، وہ شکّی تو ہیں ہی، نہ جانے اس کا کیا مطلب سمجھ بیٹھیں۔

تیسرے ہی روز شیام بابو نے وہ مکان ترک کر دیا۔

(۴)

اس نئے مکان میں آنے کے ایک ہفتہ بعد منو پیر میں پٹّی باندھے، لاٹھی کو ٹیکتا ہوا آیا اور آواز دی، دیوی اس کی آواز پہچان گئی مگر اسے دتکارا نہیں، جاکر دروازہ کھول دیا۔ پرانے گھر کے حالات جاننے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔

منّو نے اندر آکر کہا ۔ سرکار، جب سے آپ نے وہ مکان چھوڑ دیا۔ قسم لے لیجیے جو ادھر ایک بار بھی گیاہوں، اس گھر کو دیکھ کر رونا آنے لگتا ہے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ اس محلّہ میں آجاؤں، اچکوں کی طرح ادھر ادھر مارا مارا پھرتا ہوں سرکار۔ کسی کام میں من نہیں لگتا۔ ہر گھڑی آپ کی یاد آتی رہتی ہے حضور کتنی پرورش کرتی تھیں اتنی اب کون کرے گا؟ یہ گھر تو بہت چھوٹا ہے۔

دیوی : تمھارے ہی کارن تو وہ مکان چھوڑنا پڑا۔

منّو : میرے کارن؟ مجھ سے کون سی تکسیر ہوئی سرکار؟

دیوی : تمھیں تو تانگہ پر رضا کے طرح بیٹھے میرے پیچھے چلے آرہے تھے ایسے آدمی پر آدمی کو شک ہو تا ہے۔

منّو : ارے سرکار اس دن کی بات کچھ نہ پوچھئے، رضا میاں کو ایک وکیل سے ملنے کے لیے جانا تھا، وہ چھاؤنی میں رہتے ہیں۔مجھے بھی ساتھ بٹھالیا۔ اس کا سائیں کہیں گیا ہوا تھا، مارے لحاج (لحاظ) کے آپ کے تانگے کے آگے نہ نکالتے تھے، سرکار اسے سہدا کہتیں ہیں اس کا سا بھلا آدمی محلّہ بھر میں نہیں؟ پانچوں بکھت کی نماز پڑھتا ہے حضور ،تیسوں روزے رکھتا ہے۔ گھر میں بی بی بچیں بھی موجود ہیں کیا مجال کہ کسی پر بدنگاہ ہو۔

دیوی : خیر، ہوگا، تمھارے سر میں پٹی کیوں بندھی ہے؟

منّو : اس کا حال نہ پوچھئے۔ آپ کی برائی کر تے کسی کو دیکھتا ہوں تو بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ درواجے پر جو حلوائی رہتا تھا نا،کہنے لگا میرے کچھ پیسے بابوجی پر آتے ہیں۔ بس سرکار، اس بات پر تکرار ہوگی۔ میں تو دکان کے نیچے نالی دھو رہا تھا۔ وہ اوپر سے کود کر آیا اور مجھے ڈھکیل دیا، میں بے خبر کھڑا تھا چاروں خانے چِت سڑک پر گر پڑا۔ چوٹ تو آئی مگر میں نے بھی دکان کے سامنے بچہ کو اتنی گالیاں سنائی کہ یاد ہی کرتے ہوں گے۔ اب گھاؤ اچھا ہو رہا ہے حضور۔

دیوی : رام رام، ناحق لڑائی لینے لگے، سیدھی سی بات تو تھی۔ کہدیتے تمھارے پیسے آتے ہیں تو جاکر مانگ لاؤ ہیں تو شہر ہی میں، کسی دوسرے دیس تو نہیں بھاگ گئے۔

منّو : حضور، آپ کی برائی سن کر نہیں رہا جاتا، پھر چاہے وہ اپنے گھر کا لاٹ ہی کیوں نہ ہو، بھڑ پڑوں گا، وہ مہاجن ہو گا تو اپنے گھر کا ہوگا، یہاں کون اس کا دیا کھاتے ہیں۔

دیوی : اس گھر میں ابھی کوئی آیا کہ نہیں؟

منّو : کئی آدمی دیکھنے آئے حضور، مگر جہاں آپ رہ چکی ہیں وہاں اب دوسرا کون رہ سکتاہے؟ ہم لوگوں نے انھیں بھڑ کا دیا، رضامیاں توحضور، اسی دن سے کھانا پینا چھوڑ بیٹھے ہیں، بیٹا کی یاد کر کر کے رویا کرتے ہیں۔ حضور کو ہم غریبوں کی یاد

کاہے کو آتی ہوگی۔

دیوی : یاد کیوں نہیں آتی، کیا میں آدمی نہیں ہوں؟ جانور تک تھان چھوٹنے پر دو چار دن تک چارہ نہیں کھاتے، یہ پیسے لو، کچھ بازار سے لاکر کھالو بھوکے ہوگے۔

متو : حضور کی دعا سے تنگی نہیں ہے آدمی کا دل دیکھا جاتا ہے، حضور پیسوں کی کون بات ہے آپ کا دیا تو کھاتے ہی ہیں۔ حضور کا مجاج ایسا ہے کہ آدمی بے کوڑی کا غلام ہو جاتا ہے۔ تو اب چلوں گا حضور، بابو جی آتے ہوں گے۔ کہیں گے یہ شیطان یہاں پھر آ پہنچا۔

دیوی : ابھی ان کے آنے میں بڑی دیر ہے۔

متو : اوہو، ایک بات تو بھولا ہی جاتا تھا، رضا میاں نے بیٹا کے لیے یہ کھلونے دیئے تھے، باتوں میں ایسا بھول گیا کہ ان کی سدھ ہی نہ رہی کہاں ہے بیٹا؟

دیوی : ابھی تو مدرسے سے نہیں آئی مگر اتنے کھلونے لانے کی کیا ضرورت تھی۔ ارے، رضا نے تو غضب کر دیا، بھیجنا ہی تھا تو دو چار آنے کے کھلونے بھیج دیتے، اکیلی میم تین چار روپئے سے کم کی نہ ہوگی۔ کل ملا کر تیس پینتیس روپئے سے کم کے کھلونے نہیں ہیں۔

متو : کیا جانیں سرکار، میں نے تو کبھی کھلونے نہیں خریدے تیس پینتیس روپئے ہی کے ہوں گے تو ان کے لیے کون بڑی بات ہے؟ اکیلی دکان سے پچاس روپئے کی روز کی آمدنی ہے، حضور!

دیوی : نہیں، ان کو لوٹا لیجاؤ۔ اتنے کھلونے لے کر کیا کرے گی؟ میں ایک میم رکھے لیتی ہوں۔

متو : حضور، رجا میاں کو بڑا رنج ہوگا، مجھے تو جیتا ہی نہ چھوڑیں گے بڑے ہی مروتی آدمی ہیں حضور، بی بی دو چار دن کے لیے میکے چلی جاتی ہے تو بے چین ہوجاتے ہیں۔

اسی وقت شاردا پاٹھ شالا سے آ گئی اور کھلونے دیکھتے ہی ان پر ٹوٹ پڑی، دیوی نے ڈانٹ کر کہا، کیا کرتی ہے، کیا کرتی ہے؟ میم لے لے اور سب لے کر کیا کرے گی؟

شاردا : میں تو سب لونگی،میم کو موٹر پر بٹھاکر دوڑاؤں گی، کتا پیچھے پیچھے دوڑے گا، ان برتنوں میں گڑیا کے کھانے بناؤں گی کہاں سے آئے ہیں اما، بتادو۔

دیوی : کہیں سے نہیں آئے۔ میں نے دیکھنے کو منگائے ہیں۔ تو ان میں سے کوئی ایک لے لے۔

شاردا : میں سب لوں گی، میری اماں نہ، سب لے لیجیے، کون لایا ہے اماں؟

دیوی : متو تم کھلونے لے کر جاؤ، ایک میم رہنے دو۔

شاردا : کہاں سے لائے ہو متو، بتادو۔

متو : تمھارے راجہ بھیا نے تمھارے لیے بھیجے ہیں۔

شاردا : راجا بھیا نے بھیجے ہیں، اوہو(ناچ کر) راجا بھیا بڑے اچھے ہیں کل اپنی سہیلیوں کو دکھاؤں گی۔ کسی کی پاس ایسے کھلونے نہ نکلیں گے۔

دیوی : اچھا متو، اب تم جاؤ۔ رضاں میاں سے کہدینا، پھر یہاں کھلونے نہ بھیجیں۔

متو چلا گیا تو شاردا سے دیوی نے کہا۔ لا بٹی تیرے کھلونے رکھ دوں بابو.جی دیکھیں گے تو بگڑیں گے، کہیں گے رضا میاں کے کھلونے کیوں لیے توڑ تاڑ کر پھینک دیں گے، بھول کر بھی ان سے کھلونے کا تذکرہ نہ کرنا۔

شاردا : ہاں! اماں، رکھدو، بابو.جی توڑ ڈالیں گے۔

دیوی : ان سے کبھی مت کہنا کہ راجا بھیا نے کھلونے بھیجے ہیں، نہیں تو بابو.جی راجا بھیا کو ماریں گے اور تمھارے کان بھی کاٹ لیں گے، کہیں گے لڑکی بھیک منگی ہے، سب سے کھلونے مانگتی پھرتی ہے۔

اتنے میں بابو شیام کشور بھی دفتر سے آگئے، تیور چڑہے ہوئے تھے، آتے ہی آتے بولے، وہ شیطان متو اس محلے میں بھی آنے لگا میں نے آج اسے دیکھا، کیا یہاں بھی آیا تھا؟

دیوی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ہاں، آیا تو تھا۔

شیام : اورتم نے آنے دیا؟میں نے منع کیاتھا نہ کہ اسے کبھی اندرقدم نہ رکھنے دینا؟

دیوی : آکر دروازہ کھڑ کانے لگا تو کیا کرتی؟

شیام : اس کے ساتھ وہ شہدا بھی رہا ہوگا؟

دیوی : اس کے ساتھ اورکوئی نہ تھا۔
شیام : تم نے آج بھی نہ کہا ہو گا کہ یہاں مت آیا کرو؟
دیوی : مجھے تو اس کا خیال نہ رہا اور اب وہ یہاں کیا کرنے آوے گا؟
شیام : جو کرنے آج آیا تھا وہی کرنے پھر آوے گا۔ تم میرے منہ پر کالکھ لگانے پر تلی ہوئی ہو۔

دیوی نے غصہ سے پیچ و تاب کھا کر کہا۔ مجھ سے تم اوٹ پٹانگ باتیں مت کیاکرو۔ سمجھ گئے نا؟ تمھیں ایسی باتیں منہ سے نکالتے شرم نہیں آتی! ایک بار پہلے بھی تم نے ایسی ہی کچھ باتیں کہی تھیں، آج پھر تم وہی باتیں کر رہے ہو، اگر تیسری بار میں نے یہ لفظ سنا تو نتیجہ برا ہوگا، اتنا کہے دیتی ہوں، تم نے مجھے کوئی رنڈی سمجھ لیاہے۔
شیام : میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے گھرآوے۔
دیوی : تو منع کیوں نہیں کر دیتے؟ میں تمھیں روکتی ہوں؟
شیام : تم کیوں نہیں منع کر دیتیں؟
دیوی : تمھیں کہتے کیا شرم آتی ہے؟
شیام : میرا منع کرنا فضول ہے، میرے منع کرنے پر بھی وہ تمھاری مرضی پاکر اس کی آمدورفت جاری ہی رہے گی۔

دیوی نے ہونٹ چبا کر کہا۔ اچھا اگر وہ آتا ہی رہے تو اس میں کیا ہرج ہے؟ مہتر سب ہی گھروں میں آیا جایا کرتے ہیں۔
شیام : اگر میں نے منو کو کبھی اپنے دروازے پر پھر دیکھا تو تمھاری خیریت نہیں اتنا سمجھائے دیتا ہوں۔

یہ کہتے ہوئے شیام کشور نیچے چلے گئے اور دیوی مبہوت سی کھڑی رہ گئی تب اس کا دل اس توہین الزام اور بے اعتباری کے صدمہ سے تڑپ اٹھا۔ وہ زار و قطار رونے لگی، اس کو سب سے زیادہ صدمہ جس بات سے پہنچا وہ یہ تھی کہ میرا شوہر مجھے اس قدر کمینہ اور بے حیا سمجھتا ہے جو کام رنڈی بھی نہ کرے گی اس کا شبہ مجھ پر کر رہے ہیں۔

(۵)

شیام کشور کے آتے ہی شاردا اپنے کھلونے اٹھا کر بھاگ گئی تھی کہ کہیں بابو جی توڑ نہ ڈالیں، نیچے جا کر وہ سوچنے لگی کہ انھیں کہاں چھپا کر رکھوں وہ اسی سوچ میں کھڑی تھی کہ اس کی ایک سہیلی صحن میں آ گئی، شاردا اسے اپنے کھلونے دکھانے کے لیے بے قرار ہو گئی اس ترغیب کو وہ کسی طرف ضبط نہ کر سکی، ابھی تو بابو جی اوپر ہی ہیں، کون اتنی جلدی نیچے آئے جاتے ہیں تب تک کیوں نہ سہیلی کو کھلونے دکھا دوں؟ اس نے سہیلی کو بلا لیا اور دونوں نئے کھلونے دیکھنے میں اتنی محو ہو گئیں کہ بابو شیام کشور کے نیچے آنے کی بھی انھیں خبر نہ ہوئی، شیام کشور کھلونے دیکھتے ہی جھپٹ کر شاردا کے پاس پہنچا اور پوچھا تو نے یہ کھلونے کہاں پائے؟ شاردا کے ہوش وحواس گم ہو گئے، خوف سے تھر تھر کانپنے لگی اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

شیام کشور نے پھر گرج کر پوچھا۔ بولتی کیوں نہیں تجھے کس نے یہ کھلونے دیئے؟

شاردا رونے لگی، تب شیام کشور نے اسے بلا کر کہا۔ رو مت ہم تجھے ماریں گے نہیں، تجھ سے اتنا ہی پوچھتے ہیں، تو نے ایسے اچھے کھلونے کہاں پائے۔

اس طرح دو چار مرتبہ دلاسا دینے سے شاردا کو کچھ تسکین ہوئی اس نے سارا ماجرا کہہ سنایا، ہائے غضب! اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ شاردا چپ رہتی، اس کا گونگا ہو جانا بھی اس سے کہیں بہتر ہوتا، دیوی کوئی بہانہ کر کے آئی ہوئی بلا کو سر سے ٹال دیتی، مگر شدنی کون ٹال سکتا ہے؟ شیام کشور کے روئیں روئیں سے شعلے نکلنے لگے، کھلونے وہیں چھوڑ کر وہ دھم دھم کرتے اوپر آ گئے اور دیوی کے دونوں کندھے جھنجھوڑ کر بولے۔ ''تمھیں اس گھر میں رہنا ہے کہ نہیں؟ صاف صاف کہدو۔'' دیوی ابھی تک کھڑی سسکیاں لے رہی تھی، اس نفرت بھرے سوال کو سن کر اس کے آنسو غائب ہو گئے۔ کسی بڑی مصیبت کے اندیشہ نے ہلکے صدمے کو بھلا دیا، جیسے قاتل کی تلوار دیکھ کر کوئی مریض بستر سے اٹھ کر بھاگے، شیام کشور کی طرف خوف بھری

آنکھوں سے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ بولی، اس کا ایک ایک رونگٹا خاموش لہجہ میں دریافت کر رہا تھا۔'' اس سوال کا مطلب کیا ہے؟''

شیام کشور نے پھر کہا۔ تمھاری جو مرضی ہو، صاف صاف کہہ ڈالو اگر میرے ساتھ رہتے رہتے تمھارا جی اکتا گیا ہو تو تم کو اختیار ہے میں تمھیں قید کر کے نہیں رکھنا چاہتا، میرے ساتھ تمھیں مکر و فریب کر نے کی ضرورت نہیں میں تمھیں بخوشی رخصت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جب تم نے دل میں ایک بات ٹھان لی تو میں نے تہیہ کر لیا۔ تم اس مکان میں اب نہیں رہ سکتیں، رہنے کے قابل نہیں ہو۔

دیوی نے آواز کو سنبھال کر کہا۔ تمھیں آج کل ہو کیا گیاہے جو ہر وقت زہر اگلتے رہتے ہو؟ اگر مجھ سے جی اکتا گیا ہے تو زہر دے دو، جلاجلا کر کیوں مارتے ہو؟ اگر منّو سے باتیں کر نا تو ایساقصور نہ تھا۔

جب اس نے آکر پکارا تو میں نے دروازہ کھول دیا اگر میں جانتی کہ ذراسی بات کا بتنگڑ ہو جاوے گا تو اسے دور ہی سے دتکار دیتی۔

شیام: جی چاہتا ہے، تالو سے زبان کھینچ لوں، باتیں ہو نے لگیں اشارے ہو نے لگے، تحفے آنے لگے، اب باقی کیا رہا؟

دیوی : کیوں ناحق جلے پر نمک چھڑکتے ہو؟ ایک کمزور عورت کی جان لے کر کچھ پا نہ جاؤ گے۔

شیام : میں جھوٹ کہتا ہوں؟

دیوی : ہاں جھوٹ کہتے ہو۔

شیام : یہ کھلونے کہاں سے آئے؟

دیوی کا کلیجہ دھک سے ہوگیا، کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں۔ سمجھ گئی اس وقت تقدیر بگڑی ہوئی ہے تباہی کے سبھی آثار نمایاں ہیں، یہ نگوڑے کھلونے نہ جانے کس بری ساعت میں آئے میں نے لیے ہی کیوں؟ اس وقت لوٹا کیوں نہ دیے؟ بات بناکر بولی۔ آگ لگے، وہی تحفے کھلونے تحفے ہوگئے، بچے کو کوئی کیسے روکے؟ کس کی مانتے ہیں کہتی رہی کہ مت لے مگر نہ مانی تو میں کیا کرتی؟ ہاں، یہ جانتی ہوتی کہ ان کھلونوں پرمیری گردن ماری جائیگی تو جبراً چھین کر پھینک دیتی۔

شیام : ان کے ساتھ اور کون کون سے چیزیں آئی ہیں؟ بھلا چاہتی ہو تو ابھی لاؤ۔
دیوی : جو کچھ آیا ہو گا اسی گھر میں تو ہوگا، دیکھ کیوں نہیں لیتے؟ اتنا بڑا گھر بھی تو نہیں ہے کہ دو چار دن دیکھنے میں لگ جائیں۔
شیام : مجھے اتنی فرصت نہیں ہے خیریت اسی میں ہے کہ جو چیزیں آئی ہوں انھیں میرے سامنے لاکر رکھ دو، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ لڑکی کے لیے کھلونے آویں اور تمھارے لیے سوغات نہ آوے۔ تم بھری گنگا میں قسم کھاؤ تو مجھے یقین نہ آویگا۔
دیوی : تم گھر میں دیکھ کیوں نہیں لیتے؟
شیام کشور نے گھونسہ تان کر یہ کہہ دیا۔ مجھے فرصت نہیں ہے سیدھے سے ساری چیزوں کو لاکر رکھدو ورنہ اسی دم گلا دبا کر مار ڈالوں گا۔
دیوی : مار ڈالنا ہو تو مار ڈالو، جو چیزیں آئی ہی نہیں انھیں میں دکھا کر کیسے دوں۔
شیام کشور نے غصہ سے پاگل ہو کر دیوی کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ چاروں شانے چت زمین پر گر پڑی، تب اس کے گلے پر ہاتھ رکھ کر بولے دبا دوں گلا، نہ دکھلاوے گی تو ان چیزوں کو؟
دیوی : جو ارمان ہوں، پورے کرلو۔
شیام : خون پی لوں گا، تو نے سمجھا کیا ہے؟
دیوی : اگر دل کی پیاس بجھتی ہے تو پی لو۔
شیام : پھر تو اس مہتر سے باتیں نہ کرے گی؟ اگر اب کبھی متو آیا اس شہدے رضا کو اس دروازے پر دیکھا توسر کاٹ لوں گا۔
یہ کہہ کر بابو جی نے دیوی کو چھوڑ دیا اور باہر چلے گئے مگر دیوی اسی حالت میں بڑی دیر تک پڑی رہی، اس کے دل میں اس وقت شوہر کی محبت اور پاسداری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس کا دل انتقام کے لیے بے قرار ہو رہا تھا اس وقت اگر وہ سنتی کہ شیام کشور کو کسی نے بازار میں جوتوں سے پیٹا ہوتا تو شاید وہ خوش ہو تی، کئی دنوں تک پانی سے بھیگنے کے بعد آج یہ جھونکا پاکر محبت کی دیوار زمین پر گر پڑی اور حفظ ناموس کا کوئی ذریعہ نہ رہا اب صرف دنیاوی لحاظ اور قدرتی حیاء کی ہلکی سی ڈور رہ گئی تھی جو ایک جھٹکے میں ٹوٹ گئی۔

(۶)

شیام کشور باہر نکلے چلے گئے تو شاردا بھی اپنے کھلونے کے لیے گھر سے نکلی، بابو.جی کھلونوں کو دیکھ کر کچھ نہ بولے تو اب اسے کس کی فکر اور کس کا خوف اب وہ کیوں اپنی سہیلیوں کو اپنے کھلونے دکھاوے؟ سڑک کے اسی پار ایک حلوائی کا مکان تھا، حلوائی کی لڑکی اپنے دروازے پر کھڑی تھی، شاردا اسے کھلونے دکھانے چلی، درمیان میں سڑک تھی، سواری گاڑیوں اور موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا شاردا کو اپنی دھن میں کسی بات کا خیال نہ رہا طفلانہ جذبہ سے بھری ہوئی وہ کھلونے لیے دوڑی، وہ کیا جانتی تھی کہ موت بھی اسی طرح اس کی جان کا کھلونہ کھیلنے کے لیے دوڑی آرہی ہے۔ سامنے سے ایک موٹر آتا ہوا نظر پڑا، دوسری طرف سے ایک بگھی آرہی تھی، شاردا نے چاہا کہ دوڑ کر اس پار نکل جائے موٹر نے بگل بجایا، شاردا اس کے سامنے آچکی تھی، ڈرائیور نے موٹر کو روکنا چاہا، شاردا نے بھی بہت زور مارا کہ سامنے سے نکل جائے، مگر شدنی کو کون ٹالتا؟ موٹر بچی کو روندتی ہوئی چلی گئی، سڑک پر صرف ایک گوشت کا لوتھڑا پڑا رہ گیا کھلونے جیوں کے تیوں تھے، ان میں سے ایک بھی نہ ٹوٹا تھا، کھلونے رہ گئے، کھیلنے والا چلا گیا، دونوں میں کون باقی اور کون فانی ہے، اس کا فیصلہ کون کرے؟

چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے۔ ارے یہ تو بابو.جی کی لڑکی ہے جو اوپر والے مکان میں رہتے ہیں، لاش کون اٹھاوے؟ ایک آدمی نے لپک کر دروازہ پر آوازدی۔ بابو.جی، آپ کی لڑکی تو سڑک پر نہیں کھیل رہی تھی؟ ذرا نیچے آجایئے۔

دیوی نے چھجے پر کھڑے ہو کر سڑک کی طرف دیکھا، شاردا کی لاش پڑی ہوئی تھی، چیخ مار کر بے تحاشا نیچے دوڑی اور سڑک پر آکر بچی کو گود میں اٹھا لیا، اس کے پیر تھر تھر کانپنے لگے۔ اس جانکاہ صدمہ نے اس کو مبہوت بنادیا۔ رونا بھی نہ آیا۔

محلہ کے کئی لوگ پوچھنے لگے، بابو.جی کہاں گئے ہیں، ان کو کیسے بلایا جائے دیوی کیا جواب دیتی، وہ تو بے ہوش سی ہو گئی تھی، لڑکی کی لاش کو گودی میں

لیے اس کے خون سے اپنے کپڑوں کو ترکرتی۔ آسمان کی طرف تاک رہی تھی۔ گو دیوتاؤں سے پوچھ رہی ہو، کیا ساری مصیبتیں مجھی پر؟

اندھیرا ہوتا جاتا تھا مگر بابو.جی کا کہیں پتہ نہ تھا، کچھ معلوم بھی نہیں، وہ کہاں گئے ہیں رفتہ رفتہ نو بجے مگر اب تک بابو.جی نہ لوٹے اتنی دیر تک وہ کبھی باہر نہ رہتے تھے کیا آج ہی انھیں بھی غائب ہونا تھا؟ دس بھی بج گئے، اب دیوی رونے لگی، اسے لڑکی کی موت کا اتنا رنج نہ تھا جتنا اپنی بے بسی کا، وہ کیسے لاش کو جلائے گی؟ کون اس کے ساتھ جائے گا؟ کیا اتنی رات گئے کوئی اس کے ساتھ جانے کو تیار ہوگا؟ اگر کوئی نہ گیا تو کیا اسے تنہا جانا پڑے گا؟ کیا رات بھر لاش پڑی رہے گی؟

جیوں جیوں سناٹا ہوتا جاتا تھا دیوی کا خوف بڑھتا جاتا تھا، وہ پچھتا رہی تھی کہ میں شام ہی کو کیوں نہ اسے لے کر چلی گئی؟

گیارہ بجے تھے، دفعتاً کسی نے دروازہ کھولا، دیوی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ سمجھی بابو.جی آ گئے۔ اس کا دل الڈ آیا اور وہ روتی ہوئی باہر آئی مگر آہ یہ بابو جی نہ تھے، یہ پولس کے آدمی تھے جو اس معاملے کی تحقیقات کرنے آئے تھے، پانچ بجے کا واقعہ، تحقیقات ہونے لگی، گیارہ بجے! آخر تھانہ دار بھی تو آدمی ہے، وہ بھی شام کے وقت سیر و تفریح کے لیے جاتاہے۔

گھنٹہ بھر تک تحقیقات ہوتی رہی، دیوی نے دیکھا کہ اب شرم سے کام نہ چلے گا، تھانہ دار نے اس سے جو کچھ پوچھا، اس کا جواب اس نے بلا تامل دیا، ذرا بھی نہ شرمائی ذرا بھی نہ جھجکی، تھانہ دار بھی دنگ رہ گیا۔

جب سب کے بیانات قلمبند کرکے داروغہ جی جانے لگے تو دیوی نے کہا۔

آپ اس موٹر کا پتہ لگادیں گے؟

داروغہ : اب تو شاید ہی اس کا پتہ چلے۔

دیوی : تو اس کو کچھ سزا نہ ہوگی؟

داروغہ : مجبوری ہے کسی کو نمبر بھی تو معلوم نہیں۔

دیوی : سرکار اس کا کچھ انتظام نہیں کرتی؟ غریبوں کے بچے اسی طرح کچلے جاتے

رہیں گے؟

داروغہ : اس کا کیا انتظام ہو سکتا ہے؟ موٹریں تو بند نہیں ہو سکتیں۔

دیوی : کم از کم پولس والوں کو یہ تو دیکھنا چاہیے کہ شہر میں کوئی بہت تیز نہ چلاوے، مگر آپ لوگ ایسا کیوں کرنے لگے؟ آپ کے افسر بھی تو موٹروں پر بیٹھتے ہیں، آپ ان کی موٹریں روکیں گے تو نوکری کیسے رہے گی؟

تھانہ دار نادم ہو کر چلا گیا، جب لوگ سڑک پر پہنچے تو ایک سپاہی نے کہا۔ ہریا بڑی ٹن من دکھاوٹ ہے۔

تھانہ دار : جی اس نے تو میرا ناطقہ بند کر دیا۔ کس غضب کا حسن پایا ہے مگر قسم لے لو۔ جو میں نے ایک بار بھی اس پر نظر ڈالی ہو تاکنے کی ہمت ہی پڑتی۔

بابو شیام کشور بارہ بجے کے بعد نشہ میں چور گھر پر پہنچے، انھیں یہ خبر راستہ ہی میں مل گئی تھی، روتے ہوئے مکان میں داخل ہوئے دیوی بھری بیٹھی تھی سوچ رکھا تھا کہ آج چاہے جو ہو جائے مگر پھٹکاروں گی ضرور، لیکن انھیں روتے دیکھا تو سارا غصہ غائب ہو گیا، خود بھی رونے لگی، دونوں بڑی دیر تک روتے رہے اس ناگہانی مصیبت نے دونوں کی دلوں کو ایک دوسرے کی طرف بڑے زور سے کھینچا انھیں ایسا معلوم ہوا کہ ان میں پھر اگلی محبت عود کر آئی ہے۔

علی الصباح جب لوگ لاش کو جلا کر لوٹے تو شیام کشور نے دیوی کی طرف محبت سے دیکھ کر دکھ بھری آواز میں کہا۔ تمھارا جی اکیلے کیسے لگے گا؟

دیوی : تم دس پانچ روز کی چھٹی نہ لے سکوگے۔؟

شیام : یہی میں سوچتا ہوں، پندرہ روز کی چھٹی لے لوں؟

شیام بابو چھٹی لینے دفتر چلے گئے۔ اس مصیبت میں آج دیوی کا دل جتنا خوش تھا اتنا ادھر مہینوں سے نہ ہوا تھا، بچی کو کھو کر وہ اعتبار اور محبت پا گئی تھی اور یہ بات اس کی اشک شوئی کے لیے کچھ کم نہ تھی۔

آہ بدنصیب، خوش مت ہو، تیری زندگی کا وہ آخری واقعہ ابھی ہونے کو باقی ہے جس کو تو خیال میں بھی نہیں لاسکتی۔

(۷)

دوسرے روز بابو شیام کشور مکان ہی پر تھے کہ متو نے آ کر سلام کیا۔ شیام کشور نے ذرا سخت لہجہ میں پوچھا۔ کیا ہے جی، یہ تم کیوں بار بار یہاں آیا کرتے ہو؟

متو بڑے عاجزانہ لہجہ میں بولا۔ مالک کل کی بات جو سنتا ہے اسی کو رنج ہوتا ہے۔ میں تو حضور کا غلام ٹھہرا، اب نوکر نہیں ہوں تو کیا، سرکار کا نمک کھاچکا ہوں، بھلا وہ کبھی ہڈیوں سے نکل سکتا ہے کبھی کبھی حال احوال پوچھنے آجاتا ہوں۔ جب سے کل والی بات سنی ہے حضور، ایسا رنج ہورہا ہے کہ کیا کہوں، کیسی پیاری پیاری بچی تھی کہ دیکھ کر دکھ در ہو جاتا تھا، مجھے دیکھتے ہی متو متو کہہ کر دوڑتی تھی، جب بے گانوں کا یہ حال ہے تو سرکار کے دل پر جو کچھ بیت رہی ہو گی، سرکار ہی جانتے ہوں گے۔

شیام بابو نرم ہو کر بولے، ایشور کی مرضی میں انسان کا کیا بس؟ میرا تو گھر ہی اندھیرا ہی ہو گیا اب یہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔

متو : مالکن تو اور بھی بے حال ہوں گی۔؟

شیام : ہوا ہی چاہیں، میں تو اسے شام سویرے کھلالیا کرتا تھا۔ ماں تو دن بھر ساتھ ہی رہتی تھی میں تو کام دھندوں میں بھول جاؤں گا وہ کہاں بھول سکتی ہیں؟ ان کو تو ساری زندگی کا رونا ہے؟

شوہر کو متو سے باتیں کر تے سن کر دیوی نے کوٹھے پر صحن کی طرف دیکھا متو کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے بولی۔ متو میں تو لٹ گئی۔

متو : حضور اب صبر کیجیے! رونے دھونے سے کیا فائدہ؟ یہی سب اندھیر دیکھ کر تو کبھی کبھی اللہ کو جالم (ظالم) کہنا پڑتاہے۔ جو بے ایمان ہیں، دوسروں کا گلا کاٹتے پھرتے ہیں، ان سے اللہ میاں بھی ڈرتے ہیں، جو سیدھے اور سچے ہیں ان پر آپھت آتی ہے۔

منو دیر تک دیوی کو دلاسا دیتا رہا۔ شیام بابو بھی اس کی باتوں کی تائید کرتے جاتے تھے۔ جب وہ چلا گیا تو بابو صاحب نے کہا آدمی تو کچھ برا نہیں معلوم ہوتا؟

دیوی نے کہا۔ محبتی آدمی ہے۔ رنج نہ ہوتا تو یہاں کیوں آتا۔

دیوی نے سمجھا، ان کا دل منو کی طرف سے صاف ہو گیا۔

(۸)

پندرہ دن گزر گئے۔ بابو صاحب پھر دفتر جانے لگے۔ منو اس درمیان میں پھر کبھی نہ آیا، اب تک تو دیوی کا دن شوہر سے باتیں کرنے میں کٹ جاتا تھا۔ مگر اب ان کے چلے جانے پر اسے بار بار شاردا کی یاد آتی۔ عموماً سارا دن روتے ہی گزرتا تھا۔ محلہ کی جوچار نیچ ذات کی عورتیں آتی تھیں مگر دیوی کا دل ان سے نہ ملتا تھا، وہ جھوتی ہمدردی دکھاکر دیوی سے کچھ اینٹھنا ہی چاہتی تھی۔

ایک روز کوئی چار بجے منو پھر آیا اور صحن میں کھڑا ہو کر بولا۔ مالکن میں ہوں منو، جرا نیچے آجایئے گا۔

دیوی اوپر ہی سے پوچھا۔ کیا کام ہے؟ کہو تو۔

منو : جرا آیئے تو۔

دیوی نے نیچے آئی تو منو نے کہا۔ رضا میاں باہر کھڑے ہیں اور حضور سے ماتم پرسی کرتے ہیں۔

دیوی نے کہا۔ جاکر کہدو، ایشور کی جو مرضی تھی وہ ہوا۔

رضا دروازہ پر ہی کھڑا تھا۔ یہ باتیں اس نے صاف سنیں۔ باہر ہی سے بولا۔ خدا جانتا ہے، جب سے یہ خبر سنی ہے دل کے ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں، میں ذرا دلی چلا گیا تھا۔ آج ہی واپس آیا ہوں۔ اگر میری موجودگی میں یہ واردات ہوئی ہوتی تو اور کیا کرسکتا مگر موٹر والے کو بلا سزا کروائے نہ چھوڑ تا، خواہ وہ کسی راجہ ہی کا موٹر ہوتا، سارا شہر چھان مارتا، بابو صاحب چپکے ہو کر بیٹھ رہے۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ موٹر چلا کر کیا کوئی کسی کی جان لے لے گا، پھول سی معصوم بچی کو مار ڈالا۔ ہائے، اب کون مجھے راجا بھیا کہہ کر پکارے گا؟ خدا کی قسم اس کے لیے دلی

سے ٹوکری بھر کھلونے لایا ہوں، کیا جانتا تھا کہ یہاں یہ ستم ہوگیا۔ منّو، دیکھ یہ تعویذ لے جاکر بہو جی کو دے دے۔ اسے اپنے جوڑے میں باندھ لیں گی، خدا نے چاہا تو انھیں کسی قسم کا خوف و خدشہ نہ رہے گا انھیں برے برے خواب دکھائی دیتے ہوں گے، رات کو نیند اچٹ جاتی ہوگی، بدن میں کمزوری معلوم ہوتی ہوگی، دل گھبرایا کرتا ہوگا یہ ساری شکایتیں اس تعویذ سے دور ہو جاوینگی، میں نے ایک خدا رسیدہ بزرگ فقیر سے یہ تعویذ لکھایا ہے۔

اسی طرح سے رضا اور منّو اس وقت ایک نہ ایک حیلہ سے دروازے پر سے نہ ٹلے، جب تک بابو صاحب آتے دکھائی نہ دیئے شیام کشور نے ان دونوں کو جاتے دیکھ لیا، اوپر جاکر بڑی متانت سے بولے۔ رضا کیا کرنے آیا تھا؟

دیوی : یوں ہی ماتم پرسی کرنے آیا تھا۔ آج دلی سے آیا ہے یہ خبر سن کی دوڑا آیا تھا۔

شیام : مرد، مردوں سے ماتم پرسی کرتے ہیں یا عورتوں سے؟

دیوی : تم نہ ملے تو مجھی سے رنج کا اظہار کر کے چلا گیا۔

شیام : اس کے یہ معنی ہیں کہ جو آدمی مجھ سے ملنے آوے وہ میرے نہ ہونے پر تم سے مل سکتا ہے اس میں کوئی ہرج نہیں، کیوں؟

دیوی : سب سے ملنے میں تھوڑا ہی جا رہی ہوں۔

شیام : تو رضا کیا میرا سالا ہے یا سسر؟

دیوی : تم تو ذرا سی بات پر جھلانے لگتے ہو۔

شیام : یہ ذرا سی بات ہے؟ ایک شریف گھر کی عورت ایک شہدے سے باتیں کرے یہ ذرا سی بات ہے، تو بڑی سی بات کسے کہتے ہیں؟ یہ ذرا سی بات نہیں ہے۔ یہ اتنی بڑی بات ہے کہ اگر میں تمھارا گلا گھونٹ دوں تو بھی مجھے پاپ نہ لگے، دیکھتا ہوں کہ پھر تم نے وہی رنگ پکڑا ہے اتنی بڑی سزا پاکر بھی تمھاری آنکھیں نہیں کھلیں، اب کے کیا مجھے لے بیتنا چاہتی ہو؟

دیوی سناٹے میں آگئی، ایک تو لڑکی کا غم اس پر یہ بد کلامیوں کی بوچھاڑ اور سنگین الزام، اس کے سر میں چکر سا آگیا، بیٹھ کر رونے لگی اس زندگی سے تو

موت کہیں اچھی! صرف یہی الفاظ اس کی زبان سے نکلے۔

بابو صاحب گرج کر بولے۔ یہی ہوگا۔ مت گھبراؤ یہی ہوگا، تم مرنا چاہتی ہو تو مجھے بھی تمھارے امر ہونے کی خواہش نہیں ہے۔ جتنی جلد تمھاری زندگی کا خاتمہ ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے، خاندان میں کلنک تو نہ لگے گا۔

دیوی نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ کیوں ایک کمزور عورت پر اتنا ظلم کرتے ہو؟ تمھیں ذرا بھی رحم نہیں آتا؟

شیام : میں کہتا ہوں۔ چپ رہ!

دیوی : کیوں چپ رہوں؟ کیا کسی کی زبان بند کردوگے؟

شیام : پھر بولے جاتی ہے، میں اٹھ کر سر توڑ دوں گا۔

دیوی : کیوں سر توڑ دوگے، کوئی زبردستی ہے۔

شیام : اچھا تو بلا، دیکھوں تیرا کون حمایتی ہے؟

یہ کہتے ہوئے بابو صاحب جھلا کر اٹھے اور دیوی کو کئی تھپڑ اور گھونسے لگا دیے۔ مگر وہ نہ روئی، نہ چلائی، نہ زبان سے ایک لفظ نکالا، صرف بے معنی نگاہوں سے شوہر کی طرف تاکتی رہی، گویا یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ آدمی ہے یا کچھ اور۔

جب شیام کشور مار پیٹ کر علیحدہ کھڑے ہوگئے تو دیوی نے کہا دل کے ارمان ابھی نہ نکلے ہوں تو اور نکال لو، پھر شاید یہ موقع نہ ملے۔

شیام کشور نے جواب دیا۔ سرکاٹ لوں گا سر، تو ہے کس پھیر میں، یہ کہتے ہوئے وہ نیچے چلے گئے، جھٹکے کے ساتھ کواڑ کھولے دھاکے کے ساتھ بند کیے اور کہیں چلے گئے۔

اب دیوی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہنے لگی۔

(۹)

رات کے دس بج گئے مگر شیام کشور گھر نہ لوٹے، روتے روتے دیوی کی آنکھیں پھول گئیں، غصہ میں یاد ہائے شیریں کا فقدان ہو جاتا ہے، دیوی کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شیام کشور کو اس کے ساتھ کبھی محبت ہی نہیں تھی، ہاں کچھ دنوں

تک وہ اس کا منہ ضرور چومتے رہتے تھے۔ لیکن وہ مصنوعی محبت تھی اس کے شباب کی بہار لوٹنے کے لیے ہی اس سے میٹھی میٹھی باتیں محبت کی باتیں کی جاتی تھیں، اسے سینہ سے لگایا جا تا تھا۔وہ سب دکھاوا تھا، سوانگ تھا، اسے یاد ہی نہ آتا تھاکہ کبھی اس سے سچی محبت کی گئی ہو، اب وہ شکل نہیں رہی۔ وہ شباب نہیں رہا، وہ جدت نہیں رہی، پھر اس پر کیوں نہ ظلم کیا جاوے؟ میں نے سوچا۔ کچھ نہیں، اب ان کا دل مجھ سے بھر گیا ہے ورنہ کیا اسی ذرا سی بات پر مجھ پریوں ٹوٹ پڑتے، کوئی نہ کوئی الزام لگا کر مجھ سے گلا چھڑانا چاہتے ہیں، یہی بات ہے، تو کیا میں ان کی روٹیاں اور ان کی مار کھانے کے لیے اس گھر میں پڑی رہوں؟ جب محبت ہی نہیں رہی تو میرے یہاں رہنے پرلعنت ہے۔ مائکہ میں کچھ نہ سہی یہ درگت تو نہ ہوتی، ان کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی، میں بھی سمجھ لوں کی کہ بیوہ ہوگئی۔

جیوں جیوں رات گزرتی تھی، دیوی کی جان سوکھی جا تی تھی، اسے یہ کھٹکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ آ کر پھر مارپیٹ شروع کردیں، کتنے غصہ میں بھرے ہوئے یہاں سے گئے، وہ ری قسمت، اب میں اتنی رذیل ہوگئی کہ مہتروں سے، جوتے والوں سے آشنائی کرنے لگی؟ اس بھلے آدمی کو ایسی باتیں منہ سے نکالتے شرم بھی نہیں آتی، نہ جانے ان کے دل میں ایسی باتیں کیوں کر آتی ہیں،کچھ نہیں، یہ مزاج کے کمینہ، دل کے ناپاک اور خود غرض آدمی ہیں، رذیلوں کے ساتھ رذیل ہی بننا چاہیے میری غلطی تھی کہ اتنے دنوں سے ان کی جھڑکیاں سہتی رہی،جہاں عزت نہیں، قدر نہیں، محبت نہیں، اعتبار نہیں، وہاں رہنا بے حیائی ہے، کچھ میں ان کے ہاتھوں بک تو گئی ہی نہیں کہ یہ جو چاہیں کریں، ماریں یا کاٹیں، میں پڑی سہا کروں، سیتا جیسی عورتیں ہوتی تھیں تورام جیسے مرد بھی ہو تے تھے۔

دیوی کو اب یہ خوف ہو نے لگا کہ کہیں شیام کشور آتے ہی آتے سچ مچ اس کا گلا نہ گھونٹ دیں یا اس کے چھری نہ بھونک دیں، وہ اخبارات میں ایسے کئی ہرجائیوں کی خبریں پڑھ چکی تھی، شہر ہی میں ایسی کئی وارداتیں ہو چکی تھیں، وہ خوف سے کانپ گئی، یہاں رہنے میں جان کی خیریت نہیں۔

دیوی نے کپڑوں کا ایک چھوٹا سا بقچہ باندھا اور سوچنے لگی کہ یہاں سے کیسے نکلوں، اور پھر یہاں سے نکل کر جاؤں کہاں؟ کہیں اس وقت منو کا پتہ لگ جاتا تو بڑا کام نکلتا، وہ مجھے مائکہ نہ پہنچا دیتا؟ایک بار مائکہ پہنچ جاتی، تو پھر لالہ سر پٹک کر مر جاتے پر بھول کر بھی آنے کا نام نہ لوں۔ یہ بھی کیا یاد کریں۔ روپئے کیوں چھوڑ دوں، جس میں یہ مزہ سے گلچھرے اڑا دیں، میں نے ہی تو کاٹ کاٹ کر جمع کئے ہیں ان کی کون سی ایسی بڑی کمائی تھی؟ خرچ کرنا چاہتی تو کوڑی نہ بچتی پیسہ پیسہ بچاتی رہتی تھی۔

دیوی نے جاکر نیچے کے کواڑ بند کردیئے، پھر صندوق کھول کر اپنے سارے زیور اور روپے نکال کر بقچے میں باندھ لیے، نقد میں سب نوٹ تھے کوئی خاص بوجھ بھی نہ ہوا۔

یکایک کسی نے صدر دروازے پر زور سے دھکا دیا، دیوی سہم گئی اوپر سے جھانک کر دیکھا، شیام بابو تھے، اس کی ہمت نہ پڑی کہ جا کر دروازہ کھول دے، پھر تو بابو صاحب نے اتنی زور سے دھکے مارنے شروع کئے گویاکہ کواڑ ہی توڑ ڈالیں گے، اس طرح دروازہ کا کھل جانا ہی ان کے دل کی حالت کو صاف ظاہر کر رہا تھا، دیوی شیر کے منہ میں جانے کی جرأت نہ کرسکی۔

آخر شیام کشور نے چلا کر کہا۔ او ڈیم، کواڑ کھول، او بلاڈی کھول! ابھی کھول!

دیوی کی رہی سہی ہمت بھی جاتی رہی، شیام کشور نشہ میں چور تھے۔ ہوش میں شاید رحم آجاتا، اس لیے شراب پی کر آئے تھے، کواڑ تو نہ کھولوں گی چاہے توڑ ہی ڈالو، اب تم مجھے اس گھر میں پاؤ گے ہی نہیں، مارو گے کہاں سے۔تمھیں خوب پہچان گئی۔

شیام کشور پندرہ بیس منٹ شور مچانے اور کواڑ کھٹکانے کے بعد اناپ شاپ بکتے ہوئے چلے گئے، دوچار پڑوسیوں نے لعنت ملامت بھی کی، آپ بھی تو پڑھے لکھے آدمی ہو کر آدھی رات کو گھر چلتے ہیں، نیند ہی تو ہے نہیں کھلتی کیا کیجیے گا جائیے کسی یار دوست کے گھر میں پڑ رہیئے،صبح آئیے گا۔

شیام کشور کے جاتے ہی دیوی نے بقچہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ نیچے اتری، ذرا دیر اس نے کان لگا کر آہٹ لی کہ کہیں شیام کشور کھڑے تو نہیں ہیں، جب یقین ہوگیا کہ وہ چلے گئے تو اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی اسے ذرا بھی دکھ یا پچھتاوا نہ تھا، بس صرف ایک خواہش تھی کہ یہاں سے بچ کر بھاگ جاؤں کوئی ایسا شخص نہ تھا جس پر وہ بھروسہ کرسکے، جو اس مصیبت میں کام آسکے، تھا تو بس وہی متو مہتر۔ اب اسی کے ملنے پر اس کی ساری امیدوں کا دارومدار تھا۔ اسی سے مل کر وہ تصفیہ کرے گی کہ کہاں جائے اور کیسے رہے؟ مائکہ جانے کا اب اس کا ارادہ نہ تھا، اسے خوف ہوتا تھا کہ مائکہ میں شیام کشور سے وہ اپنی جان نہ بچا سکے گی، اسے یہاں نہ پاکر وہ ضرور اس کے مائکے جاویں گے اور اسے جبراً کھینچ لاویں گے، وہ ساری تکلیفیں، ساری ذلتیں برداشت کرنے کو تیار تھی، صرف شیام کشور کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی تھی، محبت! اہانت سے نفرت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

تھوڑی ہی دور پر چوراہا تھا کئی یکہ والے کھڑے تھے۔ دیوی نے ایک یکہ کیا اور اس سے اسٹیشن چلنے کو کہا۔

(۱۰)

دیوی نے رات اسٹیشن پر گذاری علی الصباح اس نے ایک تانگہ کرائے پر کیا اور پردہ میں بیٹھ کر چوک جاپہنچی، ابھی دکانیں نہ کھلی تھیں، مگر پوچھنے پر رضا میاں کا پتہ چل گیا، اس کی دوکان پر ایک لڑکا جھاڑو دے رہا تھا دیوی نے اسے بلا کر کہا۔ جاکر رضا میاں سے کہہ دے کہ شاردا کی ماں تم سے ملنے آئی ہیں، ابھی چلیے۔

دس منٹ میں رضا اور متو دونوں آپہنچے۔

دیوی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ تم لوگوں کے پیچھے مجھے گھر چھوڑنا پڑا۔ کل رات کو تمھارا میرے گھر جانا غضب ہو گیا، جو کچھ ہوا وہ پھر کہوں گی ، مجھے کہیں ایک گھر دلادو۔ گھر ایسا ہو کہ بابو صاحب کو میرا پتہ نہ چلے ورنہ وہ مجھے جیتا نہ

چھوڑینگے، رضا نے متّو کی طرف دیکھا، گویا کہہ رہا ہے دیکھ، چال کیسی ٹھیک چلی (دیوی سے) آپ مطمئن رہیں ایسا گھر دلا دوں گا کہ بابو صاحب کے بابا کو بھی پتہ نہ چلے، آپ کو کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی، ہم آپ کے پسینے کی جگہ خون بہادیں گے؟ سچ پوچھو تو بہو.جی، بابو صاحب آپ کے قابل تھے ہی نہیں؟

متّو۔ کہاں کی بات بھیا، آپ رانی ہونے کے لائک ہیں، میں مالکن سے کہتا تھا کہ بابو.جی کو دالمنڈی کی ہوا لگ گئی ہے، مگر آپ مانتی ہی نہ تھیں، آج ہی رات کو میں نے انھیں گلاب جان کے کوٹھے پر سے اترتے دیکھا۔ نشہ میں چور تھے۔

دیوی : جھوٹی بات، ان کی یہ عادت نہیں، غصہ انھیں ضرور بہت ہے۔ اور غصہ میں آکر انھیں نیک وبد کچھ نہیں سوجھتا، مگر نگاہ کے برے نہیں۔

متّو : حضور، مانتی ہی نہیں تو کیا۔کروں، اچھا کبھی دکھا دوں گا تب تو مانئے گا۔

رضا : ابے دکھانا پیچھے، اس وقت آپ کو میرے گھر پہنچا دے، اوپر لے جانا جب تک میں، ایک مکان دیکھنے جاتا ہوں، آپ کے لائق بہت ہی اچھاہے۔

دیوی : تمھارے گھر میں تو بہت سی عورتیں ہوں گی؟

رضا : کوئی نہیں ہے بہو.جی، صرف ایک بڑھیا ماں ہے وہ آپ کے لیے ایک کہارن بلاوے گی،آپ کو کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی، میں مکان دیکھنے جا رہ ہوں۔

دیوی : ذرا بابوصاحب کی طرف بھی ہوتے آنا، دیکھنا، گھر آئے کہ نہیں،

رضا : بابو صاحب سے تو مجھے چڑھ ہو گئی، شاید نظر آجائیں تو ان سے میری لڑائی ہو جاوے، جو مرد آپ جیسی حسن کی دیوی کی قدر نہیں کر سکتا، وہ آدمی نہیں۔

متّو : بہت ٹھیک کہتے ہو بھیا، ایسی سریپ جادی (شریف زادی) کو نہ جانے کس منہ سے ڈانٹے ہیں، مجھے اتنے دن حضور کی گلامی کر تے ہوگئے۔ کبھی آدھی بات نہ کہی۔

رضا : مکان دیکھنے گیا اور تانگہ رضا کے مکان کی طرف چلا۔

دیوی کے دل میں اس وقت ایک خیال پیدا ہوا۔ کہیں یہ دونوں سچ مچ شہدے تو نہیں ہیں؟ مگر کیسے معلوم ہو؟ یہ سچ ہے کہ دیوی نے زندگی بھر کے لیے شوہر کو ترک کردیا تھا مگر اتنی ہی دیر میں اسے پچھتاوا ہو نے لگا تھا۔ وہ تنہا ایک

مکان میں کیسے رہے گی؟ بیٹھی بیٹھی کیا کرے گی؟ یہ کچھ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا اس نے دل میں کہا۔کیوں نہ گھر لوٹ چلوں؟ ایشور کرے وہ ابھی گھر نہ آئے ہوں منّو سے بولی، تم ذرا دوڑ کر دیکھو تو، بابو.جی گھر آئے کہ نہیں۔

منّو : آپ چل کر آرام سے بیٹھیں، میں دیکھتے آتا ہوں۔

دیوی : میں اندر نہ جاؤں گی۔

منّو : خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں، گھر بالکل خالی ہے، آپ ہم لوگوں پر شک کرتی ہیں، ہم وہ لوگ ہیں کہ آپ کا حکم پاویں تو آگ میں کود پڑیں۔

دیوی تانگہ سے اتر کہ اندر چلی گئی، چڑیا ایک بار پکڑ جانے پر بھی پھڑپھڑائی مگر بازوؤں میں لاسا لگا ہونے کے سبب اڑ نہ سکی اور شکاری نے اسے اپنی جھولی میں رکھ لیا، وہ بدبخت کیا پھر کبھی آسمان میں اڑے گی کیا پھر اسے ڈالیوں پر چہکنا نصیب ہوگا؟

(11)

شیام کشور صبح گھر لوٹے تو ان کا دل سکون پذیر ہوگیا تھا، انھیں اندیشہ ہو رہا تھا کہ شاید دیوی گھر میں نہ ہوگی، دروازہ کے دونوں پاٹ کھلے دیکھے۔ تو کلیجہ دھک سے ہو گیا، اتنے سویرے کواڑوں کا کھلا ہوا فال بد تھی، ایک لمحہ دروازہ پر کھڑے ہو کر اندر کی آہٹ لی، کوئی آواز نہ سنائی دی، صحن میں گئے وہاں بھی سناٹا! اوپر گئے، چاروں طرف سونا! گھر کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ شیام کشور نے اب ذرا توجہ سے دیکھنا شروع کیا۔ صندوق میں روپے ندارد۔ زیورات کا صندوقچہ بھی خالی! اب کیا ہو سکتا تھا؟ کوئی گنگا نہانے جا تا ہے تو گھر کے روپئے نہیں اٹھالے جاتا وہ چلی گئی، اب اس میں ذرا بھی شبہ نہ تھا یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کہاں گئی ہے شاید اسی وقت لپک کر جانے سے وہ واپس لائی جاسکتی ہے، لیکن دینا کیا کہے گی؟

شیام کشور نے اب پلنگ پر بیٹھ کر ٹھنڈے دل ان سارے واقعات جانچ پڑتال شروع کی، اس میں تو انھیں کوئی شبہ نہ تھا کہ رضا شہدا ہے اور منّو اس کا پٹھو۔ تو آخر بابو صاحب کا فرض کیا تھا؟ انھوں نے وہ پہلا مکان چھوڑ دیا، دیوی کو

بار بار سمجھایا، اس کے علاوہ وہ اور کیا کر سکتے تھے؟ کیا مارنا بے جا تھا؟ اگر ایک لمحہ کے لیے بے جا بھی مان لیا جائے تو کیا دیوی کو اس طرح مکان سے نکل جانا چاہیے تھا؟ کوئی دوسری عورت جس کے دل میں پہلے ہی سے زہر نہ بھر دیا گیا ہو، صرف مار کھاکر مکان سے نہ نکل جاتی، ضرور ہی دیوی کا دل کثیف ہو گیا ہے۔

بابو صاحب نے پھر سوچا، ابھی ذرا دیر میں مہری آوے گی، وہ دیوی کو گھر میں نہ دیکھ کر پوچھے گی تو کیا جواب دوں گا، دم کے دم سارے محلّہ میں یہ خبر پھیل جاوے گی، ہائے ایشور کیا کروں؟ شیام کشور کے دل میں اس وقت ذرا بھی پچھتاوا، ذرا بھی رحم نہ تھا اگر دیوی کسی طرح انھیں مل سکتی تو وہ اس کو ہلاک کر ڈالنے میں ذرا بھی پس وپیش نہ کرتے، اس کا گھر سے نکل جانا، فوری جوش کے سوا اس کا اور کوئی سبب نہ ہو، ان کی نگاہ میں ناقابل عفو تھا، یہ بے عزتی کسی طرح نہ گوارا کر سکتے تھے مر جانا اس سے کہیں بہتر تھا۔غصہ اکثر بے لوثی کی ضرورت اختیار کرلیا کرتا ہے۔ شیام کشور کو دنیا سے نفرت ہو ئی، جب اپنی بیوی ہی دغادے جاوے تو اور سے کیا امید کی جاوے؟ جس عورت کے لیے ہم جیتے بھی ہیں اور مرتے بھی، جسے آرام سے رکھنے کے لیے ہم اپنی جان قربان کر دیتے ہیں، جب وہ اپنی نہ ہوئی تو دوسرا کون اپنا ہو سکتا ہے؟ اس عورت کو خوش رکھنے کے لیے انھوں نے کیا کیا نہیں کیا؟ گھر والوں سے لڑائی کی، بھائیوں سے ناتا توڑا، یہاں تک کہ اب وہ ان کی صورت سے بھی بے زار ہیں اس کی کوئی ایسی خواہش نہ تھی جسے انھوں نے پورا نہ کیا اس کا ذرا سا سر بھی دکھتا تھا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے تھے، وہی عورت ان سے دغا کر گئی، صرف ایک شہدے کے بہکانے میں آکر ان کے منہ میں کالکھ لگا گئی، شہدوں پر الزام لگانا تو ایک طرح دل کو سمجھانا ہے جس کے دل میں خامی نہ ہو تو کون بہکا سکتا ہے؟ جب اس عورت نے دھوکا دیا تو پھر یہ سمجھنا ہی چاہیے کہ دنیا میں محبت و وفا کا وجود ہی نہیں ہے وہ صرف اہل تخیل کی ایجاد ہے، ایسی دنیا میں رہ کر تکلیف اور ناامیدی کے سوا اور کیا ملتا ہے؟ پاجن بولے، آج سے تو آزاد ہے، جو چاہے کر، اب کوئی تیرا ہاتھ پکڑنے والا نہیں جسے تو ''پیارا'' کہتے ہوئے نہ تھکتی تھی اس کے ساتھ تو نے ایسا مجرمانہ

سلوک کیا! چاہوں تو تجھے عدالت میں گھسیٹ کر اس جرم کی سزا دلا سکتا ہوں۔ مگر کیا فائدہ؟ اس کا ثمرہ تجھے ایشور دے گا۔

شیام کشور چپ چاپ نیچے اترے، کسی سے کچھ کہا نہ سنا، دروازہ کو کھلا چھوڑ دیا اور ساحل گنگا کی جانب روانہ ہو گئے۔

یہ افسانہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری کے فروری 1931 میں شائع ہوا۔ مانسرور نمبر5 میں شامل ہے۔ عنوان تھا لانچھن۔ اردو میں پریم چالیسی میں شامل ہے۔ اردو ماہنامہ چندن میں بھی جولائی 32 میں شائع ہوا۔

ترسول

(۱)

اندھیری رات ہے۔ موسلادھار پانی برس رہا ہے۔ کھڑکیوں پر پانی کے تھپیڑے لگ رہے ہیں۔ کمرہ کی روشنی کھڑکی سے باہر جاتی ہے تو پانی کی بڑی بڑی بوندیں تیروں کی طرح نوک دار لمبی موٹی گرتی ہوئی نظر آجاتی ہیں۔ اس وقت اگر گھر میں آگ بھی لگ جائے تو شاید میں باہر نکلنے کی جرأت نہ کروں۔ لیکن ایک دن تھا جب ایسی ہی اندھیری بھیانک رات کے وقت میں میدان میں بندوق لیے پہرہ دے رہا تھا۔ اسے آج تیس سال گذر گئے۔

ان دنوں میں فوج میں ملازم تھا۔

آہ! وہ فوجی زندگی کتنے لطف سے گذرتی تھی۔ میری زندگی سب سے شیریں، سب سے دلآویز یادگاریں اسی زمانہ سے وابستہ ہیں۔ آج مجھے اس حجرۂ تاریک میں اخباروں کے لیے مضامین لکھتے دیکھ کر کون قیاس کرے گا۔ کہ اس نیم جاں، خمیدہ کمر،خستہ حال انسان میں بھی کبھی حوصلہ اور ہمت اور جوش کا دریا موجزن تھا۔ کیا کیا دوست تھے جن کے چہروں پر ہمیشہ مسکراہٹ رقص کرتی رہتی تھی۔ شیر دل رام سنگھ اور خوش گلو دیوی داس کی یاد کیا کبھی دل سے مٹ سکتی ہے۔ وہ عدن، وہ بصرہ، وہ مصر سب آج میرے خواب ہیں۔ حقیقت ہے تو یہ تنگ کمرہ اور اخبار کا دفتر۔

ہاں ایسی ہی اندھیری، ڈراؤنی، سنسان رات تھی۔ میں بارک کے سامنے برساتی پہنے ہوئے کھڑا میگزین کا پہرہ دے رہا تھا۔ کندھے پر بھرا ہوا رائفل تھا۔ بارک میں سے دوچار سپاہیوں کے گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ رہ رہ کر جب بجلی چمک جاتی تھی تو سامنے کے اونچے پہاڑ اور درخت اور نیچے کا ہرا بھرا سبزہ زار اس طرح نظر آجاتے تھے جیسے کسی بچے کی بڑی بڑی سیاہ معصوم پتلیوں میں خوشی کی جھلک نظر آجاتی ہے۔

رفتہ رفتہ بارش نے طوفانی صورت اختیار کی، تاریکی اور بھی تاریک بادل کی گرج اور بھی مہیب اور بجلی کی چمک اور بھی تیز ہوگئی۔ معلوم ہوتا تھا فطرت اپنی ساری طاقت سے زمین کو پامال کردے گی۔

یکا یک مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے سامنے سے کسی چیز کی پرچھائیں سی نکل گئی۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ کوئی جنگلی جانور ہوگا۔ لیکن بجلی کی ایک چمک نے یہ خیال دور کر دیا۔ وہ کوئی آدمی تھا جو بدن کو چرائے پانی میں بھیگتا ہوا ایک طرف جا رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس سیلاب میں کون آدمی بارک سے نکل سکتا ہے۔ اور کیوں؟ مجھے اب اس کے آدمی ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ میں نے بندوق سنبھال لی اور فوجی قاعدہ کے مطابق پکارا ''ہالٹ ہو کمس دیر''؟ پھر بھی کوئی جواب نہیں قاعدہ کے مطابق تیسری بار للکارنے پر اگر جواب نہ ملے تو مجھے بندوق داغ دینی چاہیے تھی۔ اس لیے میں نے بندوق ہاتھ میں لے کر خوب زور سے کڑک کر کہا ''ہالٹ، ہوکس دیر''؟ جواب تو اب کے بھی نہ ملا، مگر وہ پرچھائیں میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مرد نہیں عورت ہے۔ قبل اس کے کہ میں کوئی سوال کروں۔ اس نے کہا، سنتری خدا کے لیے چپ رہو۔ میں ہوں لوئسا۔

میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ اب میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ہمارے کمانڈنگ افسر کی دوشیزہ لوئسا ہی تھی۔ مگر اس وقت اس موسلادھار مینہ اور اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وہ کہاں جارہی ہے۔؟ بارک میں ایک ہزار جوان موجود تھے جو اس کے حکم کی تعمیل کر سکتے تھے۔ پھر وہ نازک بدن عورت اس وقت کیوں نکلی اور کہاں کے لیے نکلی؟ میں نے تحکمانہ انداز سے پوچھا۔ تم اس وقت کہاں جارہی ہو۔؟

لوئسا نے نہایت لجاجت آمیز لہجہ میں کہا۔'' معاف کر دو سنتری۔ یہ میں نہیں بتا سکتی اور تم سے التجا کرتی ہوں کہ یہ بات کسی سے نہ کہنا۔ میں ہمیشہ تمھاری احسان مند رہوں گی۔''

یہ کہتے کہتے اس کی آواز اس طرح کانپنے لگی جیسے کسی پانی سے بھرے ہوئے برتن کی آواز۔

میں نے اسی سپاہیانہ انداز سے کہا۔'' یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ میں فوج کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔ مجھے اتنا مجاز نہیں۔ میں قاعدہ کے مطابق آپ کو اپنے سرجنٹ کے روبرو لے جانے کے لیے مجبور ہوں۔''

لیکن تم کیا نہیں جانتے کہ میں تمھارے کمانڈنگ افسر کی لڑکی ہوں؟''

میں نے ذرا ہنس کر جواب دیا۔ ''اگر میں اس وقت کمانڈنگ افسر صاحب کو بھی ایسی حالت میں دیکھوں تو ان کے ساتھ بھی مجھے یہی سختی کرنی پڑے گی۔ قاعدہ سب کے لیے یکساں ہے اور ایک سپاہی کو کسی حالت میں اسے توڑنے کا اختیار نہیں ہے۔''

یہ بے رحمانہ جواب پاکر اس نے دردناک انداز سے پوچھا۔ ''تو پھر کیا تدبیر ہے۔''

مجھے اس پر رحم تو آرہا تھا۔ لیکن قاعدوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ مجھے انجام کا مطلق خوف نہ تھا۔ کورٹ مارشل یا تنزل اور کوئی سزا میرے ذہن میں نہ تھی۔ میرا ضمیر بھی صاف تھا۔ لیکن قاعدے کو کیسے توڑوں جو فرض کی دستاویز ہے۔ اسی حیص بیص میں کھڑا تھا کہ لوئسا نے ایک قدم بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور نہایت پردرد اضطراب کے لہجہ میں بولی۔''تو پھر میں کیا کروں۔؟

ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ گویا اس کا دل پگھلا جا رہا ہو۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ ایک بار جی میں آیا جانے دوں۔ پیام یار یا ایفائے وعدہ کے سوا اور کون سی طاقت اس عالم میں اسے گھر سے نکلنے پر مجبور کرتی۔؟ پھر میں کیوں کسی کی راہ محبت کا کانٹا بنوں۔ لیکن قاعدہ نے پھر زبان پکڑلی۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کر کے منہ پھیر کرکہا۔'' اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔''

میرا جواب سن کر اس کی گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ گویا جسم میں جان نہ ہو۔ پر اس نے اپنا ہاتھ ہٹایا نہیں۔ میرے ہاتھ کو پکڑے ہوئے گڑگڑا کر بولی ''سنتری مجھ پر رحم کرو۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ میری عزت خاک میں مت ملاؤ۔ میں بڑی بدنصیب ہوں۔''

میرے ہاتھ پر آنسوؤں کے کئی گرم قطرے ٹپک پڑے۔ موسلا دھار بارش کا مجھ پر ذرہ بھر بھی اثر نہ ہوا تھا لیکن ان چند بوندوں نے مجھے سر سے پاؤں تک ہلادیا۔

میں بڑے پس وپیش میں پڑ گیا۔ ایک طرف قائد اور فرض کی آہنی دیوار تھی۔ دوسری طرف ایک نازک اندام دوشیزہ کا منت آمیز اصرار میں جانتا تھا۔ اگر اسے سارجنٹ کے سپرد کردوں گا تو سویرا ہوتے ہی سارے بٹالین میں خبر پھیل جائے گی۔ کورٹ مارشل ہوگا۔ کمانڈنگ افسر کی لڑکی پر بھی فوج کا آہنی قانون کوئی رعایت نہ کرسکے گا۔ اس کے بے رحم ہاتھ اس پر بھی بے دردی سے اٹھیں گے۔ خاص کر لڑائی کے زمانہ میں۔

اور اگر اسے چھوڑ دوں تو اتنی ہی بے دردی سے قانون میرے ساتھ پیش آئے۔ زندگی خاک میں مل جائے گی۔ کون جانے کل زندہ بھی رہوں یا نہیں۔ کم سے کم تحقیر تو ہوگی ہی۔ راز مخفی بھی رہے تو کیا میرا ضمیر ہمیشہ لعن طعن نہ کرے گا۔ کیا میں پھر کسی کے سامنے اسی دلیرانہ انداز سے تاک سکوں گا؟ کیا میرے دل میں ہمیشہ ایک چور سا نہ سمایا رہے گا۔

لوئسا بول اٹھی۔ ''سنتری''

منت کا ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکلا۔ وہ اب یاس کے اس درجہ پر پہنچ چکی تھی جب انسان کی قوت اظہار مفردات تک محدود ہوجاتی ہے۔

میں نے درد مندانہ لہجہ میں کہا۔ ''بڑا مشکل معاملہ ہے۔''

''سنتری میری عزت بچالو۔ میرے امکان میں جو کچھ ہے وہ میں تمھارے لیے کرنے کو تیار ہوں۔''

میں نے خود دارانہ انداز میں کہا۔ ''مس لوئسا مجھے ترغیب نہ دیجیے، میں لالچی

نہیں ہوں۔ میں صرف اس لیے معذور ہوں کہ فوجی قانون کو توڑنا ایک سپاہی کے لیے دنیا میں سب سے بڑا جرم ہے۔"

"کیا ایک دوشیزہ کے ننگ وناموس کی حفاظت کرنا اخلاقی قانون نہیں ہے۔؟ کیا فوجی قانون اخلاقی قانون پر بھی غالب آسکتا ہے"؟ لوئسا نے ذرا پرجوش انداز سے کہا۔

اس سوال کا میرے پاس کیا جواب تھا۔ میں لاجواب ہو گیا۔ فوجی قانون عارضی، تغیر پذیر، ماحولیات کا مطیع ہے۔ اخلاقی قانون ازلی، اٹل، ماحولیات سے بالاتر۔ میں نے قائل ہو کر کہا۔

"جاؤ مس لوئسا، تم اب آزاد ہو۔ تم نے مجھے لاجواب کردیا۔ میں فوجی قانون توڑ کر اس اخلاقی فرض کو پورا کروں گا۔ مگر تم سے صرف اتنی التجا ہے کہ آئندہ کسی سپاہی کو اخلاقی فرض کی تلقین نہ کرنا۔ کیوں کہ فوجی قانون میں وہ بھی جرم ہے۔ فوجی آدمی کے لیے دنیا میں سب سے بڑا قانون فوجی قانون ہے۔ فوج کسی اخلاقی، روحانی، خدائی قانون کی پروا نہیں کرتی۔

لوئسا نے پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور احسان میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں بولی۔

"سنتری، خدا تمھیں اس کا اجر دے۔"

مگر فوراً اسے شبہ ہوا کہ شائد یہ سپاہی آئندہ کسی موقعہ پر یہ راز فاش نہ کردے۔ اس لیے مزید اطمینان کے خیال سے اس نے کہا۔" میری آبرو اب تمھارے ہاتھ ہے۔"

میں نے یقین انگیز انداز سے کہا۔" میری طرف سے آپ بالکل مطمئن رہیے۔"

"کبھی کسی سے نہیں کہو گے نہ"؟

"کبھی نہیں "؟

"کبھی نہیں "؟

"ہاں جیتے جی کبھی نہیں۔"

"اب مجھے اطمینان ہوگیا سنتری۔" لوئسا تمھاری اس نیکی اوراحسان کو موت کی

گود میں جاتے وقت بھی نہ بھولے گی۔ تم جہاں رہو گے تمھاری یہ بہن تمھارے لیے خدا سے دعا کرتی رہے گی۔ جس وقت تمھیں کبھی ضرورت ہو میری یاد کرنا۔ لوئسا دنیا کے اس پردے پر ہوگی تب بھی تمھاری خدمت کے لیے حاضر ہوگی۔ وہ آج سے تمھیں اپنا بھائی سمجھتی ہے۔ سپاہی کی زندگی میں ایسے موقعے آتے ہیں جب اسے ایک خدمت گذار بہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ خدا نہ کرے تمھاری زندگی میں ایسے موقعے آئیں۔ لیکن اگر آئیں تو لوئسا اپنا فرض ادا کرنے میں کبھی دریغ نہ کرے گی۔ کیا میں اپنے نیک مزاج بھائی کا نام پوچھ سکتی ہوں''؟

بجلی ایک بار چمک اٹھی تھی۔ میں نے دیکھا لوئسا کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔

بولا لوئسا ان حوصلہ انگیز باتوں کے لیے میں تمھارا تہ دل سے مشکور ہوں۔ لیکن میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ اخلاق اور ہمدردی کے ناتے کر رہا ہوں۔ صلہ یا انعام کی مجھے خواہش نہیں ہے۔ میرا نام پوچھ کر کیا کروگی''؟

لوئسا نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا۔'' کیا بہن کے لیے بھائی کا نام پوچھنا بھی فوجی قانون کے خلاف ہے''؟

ان الفاظ میں کچھ ایسا خلوص، کچھ ایسی محبت، کچھ ایسا اپنا پن بھرا ہوا تھا کہ میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔

بولا۔'' نہیں لوئسا میں صرف یہی چاہتا ہوں کہ اس برادرانہ سلوک میں خود غرضی کا شائبہ بھی نہ رہنے پائے۔ میرا نام سری ناتھ سنگھ۔''

لوئسا نے اظہار تشکر کے طور پر میرا ہاتھ آہستہ سے دبایا۔ اور ''تھینکس'' کہہ کر چلی گئی۔ تاریکی کے باعث بالکل نظر نہ آیا کہ وہ کہاں چلی گئی اور نہ پوچھنا قرین مصلحت تھا۔ وہیں کھڑا کھڑا اس اتفاقی ملاقات کے پہلوؤں کو سوچتا رہا۔ کمانڈنگ افسر کی بیٹی کیا ایک معمولی سپاہی کو، اور وہ بھی جو کالا آدمی ہو، کیا کتے سے بدتر نہیں سمجھتی۔ مگر وہی عورت آج میرے ساتھ بھائی کا رشتہ قائم کرکے پھولی نہیں سماتی تھی۔

(۲)

اس کے بعد کئی سال گزر گئے۔ دنیا میں کتنے ہی انقلابات ہو گئے۔ روس کی مطلق العنان شہنشاہی مٹ گئی۔ جرمنی کا قیصر دنیا کے سٹیج سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ جمہوریت کو ایک صدی میں جتنا فروغ نہ ہوا تھا اتنا ان چند سالوں میں ہو گیا۔ میری زندگی میں بھی کتنے ہی تغیرات ہوئے۔ ایک ٹانگ جنگ کے دیوتا کی بھینٹ ہو گئی۔ معمولی سپاہی سے لفٹیننٹ ہوگیا۔

ایک دن پھر ایسی ہی چمک اور گرج کی رات تھی۔ میں چرچا کر رہا تھا۔ جو دس بارہ سال قبل ہوا تھا۔ صرف لوئسا کا نام چھپا رکھا تھا۔ کپتان ناکس کو اس تذکرہ سے غیرمعمولی دلچسپی ہو رہی تھی۔ وہ بار بار ایک ایک بات پوچھتا اور واقعہ کا سلسلہ ملانے کے لیے دوبارہ پوچھتا تھا۔جب میں نے آخر میں کہا اس دن بھی ایسی ہی اندھیری رات تھی۔ ایسی ہی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اور یہی وقت تھا۔ تو ناکس اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور بڑے اضطراب سے بولا۔'' کیا اس عورت کا نام لوئسا تو نہیں تھا۔''

میں نے تعجب سے کہا۔'' آپ کو اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟ میں نے تو نہیں بتلایا۔''

ناکس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ سسکیاں لے کر بولے۔ یہ سب آپ کو ابھی معلوم ہوجائے گا۔ پہلے یہ بتلایئے کہ آپ کا نام سری ناتھ سنگھ ہے یا چودھری۔''؟

میں نے کہا۔''میرا پورا نام سری ناتھ سنگھ چودھری ہے۔ اب لوگ مجھے صرف چودھری کہتے ہیں۔ لیکن اس وقت چودھری کے نام سے مجھے کوئی نہ جانتا تھا۔ لوگ سری ناتھ کہتے تھے۔

کپتان ناکس اپنی کرسی کھینچ کر میرے قریب آگئے۔ اور بولے تب تو آپ میرے پرانے دوست نکلے۔مجھے اب تک نام کے تبدیل ہو جانے سے دھوکا ہو رہا تھا۔ ورنہ آپ کا نام تو مجھے خوب یاد ہے۔ ہاں ایسا یاد ہے کہ شاید مرتے دم بھی

نہ بھولوں کیوں کہ یہ اس کی آخری وصیت ہے۔"
یہ کہتے کہتے ناکس خاموش ہو گئے اور آنکھیں بند کر کے سر میز پر رکھ لیا۔ میری حیرت ہر لحہ بڑھتی جاتی تھی۔ اور لفٹنٹ ڈاکٹرچندر سنگھ بھی پر سوال نظروں سے ایک بار میری طرف اور دوسری بار کپتان ناکس کے چہرہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دو منٹ تک خاموش رہنے کے بعد کپتان ناکس نے سر اٹھایا اور ایک لمبی سانس لے کر بولے۔" کیوں لفٹنٹ چودھری ؟ تمھیں یاد ہے ایک بار ایک انگریز سپاہی نے تمھیں بری بری گالی دی تھی۔؟

میں نے کہا۔" ہاں خوب یاد ہے۔ وہ کارپول تھا۔ میں نے اس کی شکایت کر دی تھی۔ اور اس کا کورٹ مارشل ہوا تھا۔ وہ کار پول سے تنزل ہو کر معمولی سپاہی بنا دیا گیا تھا۔ ہاں اس کا نام بھی یاد آگیا کرپ یا کُرپ ......؟"

کپتان ناکس نے قطع کلام کر کے۔" کرپن، اس کی اور میری صورت میں آپ کو کچھ مشابہت معلوم ہوتی ہے؟ میں ہی وہ کرپن ہوں۔ میرا نام ہی ناکس ہے کرپن ناکس۔ جس طرح ان دونوں آپ کو لوگ سری ناتھ کہتے تھے اسی طرح مجھے بھی کرپن کہا کر تے تھے۔"

اب جو میں نے غور سے ناکس کی طرف دیکھا تو پہچان گیا۔ بے شک وہ کرپن ہی تھا۔ میں استعجاب سے اس کی طرف تاکنے لگا۔ لوئسا سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ ؟ یہ میری سمجھ میں اس وقت بھی نہ آیا۔

کپتان ناکس بولے۔"آج مجھے ساری داستان کہنی پڑے گی۔ لفٹنٹ چودھری تمھاری وجہ سے جب میرا تنزل ہوا اور ذلت بھی کچھ کم نہ ہوئی تو میرے دل میں حسد اور انتقام کا شعلہ سا اٹھنے لگا۔ میں ہمیشہ اسی فکر میں رہتا تھا کہ کس طرح تمھیں ذلیل کروں۔ کس طرح اپنی ذلت کا بدلہ لوں۔ میں تمھاری ایک ایک حرکت کو، ایک ایک بات کو، عیب جویانہ نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ ان دس بارہ سالوں میں تمھاری صورت بہت کچھ بدل گئی ہے۔ اور میری نگاہوں میں بھی کچھ فرق آ گیا ہے جس کے باعث میں تمھیں پہچان نہ سکا۔ لیکن اس وقت تمھاری صورت ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہی

تھی کہ کسی طرح تمھیں بھی تنزل کراؤں۔ اگر مجھے موقع ملتا تو شاید میں تمھاری جان لینے میں بھی دریغ نہ کرتا......''

کپتان ناکس پھر خاموش ہو گئے۔ میں اور ڈاکٹر چندر ٹکٹکی لگائے کپتان ناکس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ناکس نے پھر اپنی داستان شروع کی۔'' اس دن رات کو جب لوئسا تم سے باتیں کر رہی تھی۔ میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تمھیں دور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس وقت کیامعلوم تھا کہ وہ لوئسا ہے۔ میں صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ تم پہرہ دیتے وقت کسی عورت کا ہاتھ پکڑے اس سے باتیں کررہے ہو۔ اس وقت مجھے جتنی پاجیانہ خوشی ہوئی وہ بیان نہیں کرسکتا۔ میں نے سوچا اب اسے ذلیل کروں گا۔ بہت دنوں کے بعد بچہ پھنسے ہیں۔ اب کسی طرح نہ چھوڑوں گا۔ یہ فیصلہ کرکے میں کمرہ سے نکلا۔ اور پانی میں بھیگتا ہوا تمھاری طرف چلا۔ لیکن جب تک میں تمھارے پاس پہنچوں لوئسا چلی گئی تھی۔ مجبور ہو کر اپنے کمرہ میں لوٹ آیا۔ لیکن پھر بھی میں مایوس نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ تم جھوٹ نہ بولوگے۔ اور جب میں کمانڈنگ افسر سے تمھاری شکایت کروں گا تو تم اپنا قصور تسلیم کر لوگے۔ میرے دل کی آگ بجھانے کے لیے اتنا اطمینان کافی تھا۔ میری آرزو بر آنے میں اب کوئی شک وشبہ نہ تھا۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔'' لیکن آپ نے میری شکایت تو نہیں کی۔ کیا بعد کو رحم آ گیا۔''؟

ناکس نے جواب دیا ''نہیں جی، رحم کس مردود کو آنا تھا۔ شکایت نہ کرنے کا دوسرا ہی سبب تھا۔ سویرا ہوتے ہی میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ سیدھا کمانڈنگ افسر کے پاس پہنچا۔ تمھیں یاد ہو گا میں ان کے بڑے بیٹے راجرس کو گھوڑے کی سواری سکھایا کرتا تھا۔ اس لیے وہاں جانے میں کسی قسم کی جھجھک یا رکاوٹ نہ ہوئی۔ جب میں پہنچا تو راجرس اور لوئسا دونوں چائے پی رہے تھے۔ آج اتنے سویرے مجھے دیکھ کر راجرس نے کہا۔''آج اتنی جلدی کیوں کرپن؟ ابھی تو وقت نہیں ہوا۔ آج بہت خوش نظر آرہے ہو۔''

میں نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔''آج کا دن میری زندگی میں مبارک

ہے۔ آج مجھے اپنے ایک پرانے دشمن کو سزا دینے کا موقع ہاتھ آیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے نہ ایک راجپوت سپاہی نے کمانڈنگ افسر سے شکایت کر کے مجھے تنزل کرا دیا تھا۔''

راجرس نے کہا۔'' ہاں ہاں معلوم کیوں نہیں۔مگر تم نے اسے گالی دی تھی۔''

میں نے کسی قدر جھینپتے ہوئے کہا۔ میں نے گالی نہیں دی تھی، صرف بلڈی کہا تھا، سپاہیوں میں اس طرح کی بدزبانی بالکل عام ہے۔ مگر اس راجپوت نے میری شکایت کردی۔ آج میں نے اسے ایک سنگین جرم میں پکڑ پایاہے۔ خدا نے چاہا کل اس کا بھی کورٹ مارشل ہو گا۔ میں نے آج رات کو اسے ایک عورت سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ بالکل اس وقت جب وہ ڈیوٹی پر تھا۔ وہ اس فعل سے انکار نہیں کرسکتا۔ اس حدتک کمینہ نہیں ہے۔

لوئسا کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ عجیب سراسیمگی سے میری طرف دیکھ کر بولی۔''تم نے اور کیا دیکھا۔''؟

میں نے کہا۔''جتنا میں نے دیکھا ہے اتنا اس راجپوت کو ذلیل اور معتوب کرنے کے لیے کافی ہے۔ ضرور اس سے کسی سے آشنائی ہے۔ اور وہ عورت ہندوستانی نہیں کوئی یورپین لیڈی ہے۔میں قسم کھا سکتا ہوں۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے بالکل اسی طرح باتیں کر رہے تھے جیسے عاشق ومعشوق کیا کرتے ہیں۔''

لوئسا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ چودھری میں کتنا کمینہ ہوں اس کا اندازہ تم خود کرسکتے ہو۔ میں چاہتا ہوں تم مجھے کمینہ کہو مجھے مطعون کرو۔ میں درندہ وحشی سے بھی زیادہ بے رحم ہوں۔ کالے سانپ سے بھی زیادہ زہریلا ہوں وہ کھڑی دیوار کی طرف تاک رہی تھی۔ کہ اسی اثنا ء میں راجرس کا کوئی دوست آ گیا۔ وہ اس کے ساتھ چلا گیا۔ لوئسا میرے ساتھ اکیلی رہ گئی تب اسنے میری طرف نہایت پرالتجا نظروں سے دیکھ کر کہا۔'' کرپن'' تم اس رات کو سپاہی کی شکایت مت کرنا۔''

میں نے تعجب سے پوچھا۔'' کیوں۔''؟

لوئسا نے سر جھکا کر کہا۔'' اس لیے کہ جس عورت کو تم نے اس کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا وہ میں ہی تھی۔

میں نے اور بھی متحیر ہو کر کہا۔" تو کیا تم اسے ......"

لوئسا نے بات کاٹ کر کہا۔"چپ، وہ میرا بھائی ہے۔ بات یہ ہے میں کل رات کو ایک جگہ جارہی تھی۔ تم سے چھپاؤں گی نہیں کرپن۔ جس کو میں دل و جان سے زیادہ چاہتی ہوں۔ اس سے رات کو ملنے کا وعدہ تھا۔ وہ میرے انتظار میں پہاڑ کے دامن میں کھڑا تھا۔ اگر میں نہ جاتی تو اس کی کتنی دل شکنی ہوتی۔ میں جوں ہی میگزین کے پاس پہنچی اس راجپوت سپاہی نے مجھے ٹوک دیا۔ وہ مجھے فوجی قاعدے کے مطابق سرجنٹ کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن میرے بہت منت سماجت کرنے پر وہ میری لاج رکھنے کے لیے فوجی قانون کو توڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ سوچو اس نے اپنے سر کتنی ذمہ داری لی۔ میں نے اسے اپنا بھائی کہہ کر پکارا ہے اور اس نے بھی مجھے بہن کہا ہے۔ سوچو اگر تم اس کی شکایت کروگے تو اس کی کیا حالت ہو گی۔ وہ نام نہ بتلائے گا۔ اس کا مجھے کامل یقین ہے۔ اگر اس کے گلے پر تلوار بھی رکھ دی جائے گی تو بھی وہ میرا نام نہ بتائے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ ایک نیک کام کرنے کا اسے یہ انعام ملے۔ تم اس کی شکایت ہرگز مت کرنا۔ تم سے التجا کرتی ہوں۔"

میں نے بے رحمانہ دریدہ دہنی سے کہا۔" اس نے میری شکایت کرکے مجھے ذلیل کیا ہے۔ ایسا اچھا موقعہ پا کر میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا جب تم کو یقین ہے کہ وہ تمھارا نام نہ بتلائے گا تو پھر اسے جہنم میں جانے دو۔"

لوئسا نے میری طرف حقارت کی نظر سے دیکھ کر کہا۔" چپ رہو کرپن ایسی باتیں مجھ سے نہ کرو۔ میں اسے کبھی گوارانہ کروں گی کہ میری عزت وحرمت کے لیے اسے ذلت اور حقارت کا نشانہ بننا پڑے۔ اگر تم میری نہ مانوگے تو میں سچ کہتی ہوں میں خودکشی کر لوں گی۔"

اس وقت تو میں صرف انتقام کا پیاسا تھا۔ اب میرے اوپر نفس پروری کا بھوت سوار ہوا۔ میں بہت دنوں سے دل میں لوئسا کی پرستش نہ کر سکتا تھا۔ اب اس کو راس کرنے کا مجھے موقعہ ملا۔ میں نے سوچا اگر یہ اس راجپوت سپاہی کے لیے جان دینے پرتیار ہے تو یقیناً میرے اظہار خیال پر بد دماغ نہیں ہوسکتی۔ میں نے اسی بے رحمانہ خود پروری کے ساتھ کہا۔" مجھے سخت افسوس ہے۔ مگر اپنے شکار کو

چھوڑ نہیں سکتا۔"

لوئسا نے میری طرف بے کسانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔" یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے۔"

میں نے ظالمانہ بے حیائی کے ساتھ کہا۔" نہیں لوئسا یہ آخری فیصلہ نہیں ہے۔ تم چاہو تو اسے توڑ سکتی ہو۔ یہ بالکل تمھارے امکان میں ہے۔ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں یہ آج تک شاید تمھیں معلوم نہ ہو مگر ان تین سالوں میں تم ایک لمحہ کے لیے بھی میرے دل سے دور نہیں ہوئیں۔ اگر تم میری طرف سے اپنے دل کو نرم کر لو، میری محبت کی قدر کرو، تو میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ میں آج ایک معمولی سپاہی ہوں اور میرے منہ سے محبت کی دعوت پاکر شائد تم دل میں ہنستی ہوگی۔ لیکن ایک دن میں بھی کپتان ہو جاؤں گا اور تب شاید ہمارے درمیان اتنی بڑی خلیج نہ رہے گی۔"

لوئسا نے رو کر کہا۔" کرپن، تم بڑے بے رحم ہو۔ میں تم کو اتنا ظالم نہ سمجھتی تھی۔ خدا نے کیوں تمھیں اتنا سنگدل بنایا، کیا تمھیں ایک بے کس عورت پر مطلق رحم نہیں آتا۔"؟

میں اس کی بیچارگی پر دل میں خوش ہو کر بولا۔"جو خود سنگدل ہو اسے دوسروں کی سنگدلی کی شکایت کرنے کا حق ہے۔"؟

لوئسا نے متین لہجہ میں کہا۔"میں بے رحم نہیں ہوں کرپن۔ خدا کے لیے انصاف کرو۔ میرا دل دوسرے کا ہو چکا ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اور شاید وہ بھی میرے بغیر زندہ نہ رہے۔ میں اپنی بات رکھنے کے لیے اپنے ایک محسن کی آبرو بچانے کے لیے اپنے اوپر جبر کرکے اگر تم سے شادی کر بھی لوں تو نتیجہ کیا ہوگا۔ جبر سے محبت نہیں پیدا ہوتی۔ میں کبھی تم سے محبت نہ کروں گی۔"

دوستو! اپنی بے شرمی اور بے حیائی کا پردہ فاش کرتے ہوئے روحانی صدمہ ہو رہا ہے۔ مجھے اس وقت نفس نے اتنا اندھا بنا دیا تھا کہ میرے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ بولا۔" ایسا مت خیال کرو لوئسا۔ محبت اپنا اثر ضرور پیدا کرتی ہے۔ تم اس وقت مجھے نہ چاہو لیکن بہت دن نہ گذرنے پائیں گے کہ میری محبت رنگ

لائے گی۔ تم مجھے خود غرض اور کمینہ سمجھ رہی ہو گی۔ سمجھو، عشق خود غرض ہو تا ہی ہے۔ شاید وہ کمینہ بھی ہو تا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ نفرت اور بے رخی بہت دنوں تک نہ رہے گی۔میں اپنے جانی دشمن کو چھوڑنے کے لیے زیادہ سے زیادہ قیمت لوں گا جو مل سکے۔

لوئسا پندرہ منٹ تک روحانی کوفت کی حالت میں کھڑی رہی جب اس کی یاد آتی ہے تو جی چاہتا ہے گلے میں چھری مارلوں۔ آخر اس نے پر اشک نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔''اچھی بات ہے کرپن۔ اگر تمھاری یہی خواہش ہے تو یہی سہی۔تم جو قیمت چاہتے ہو وہ میں دینے کا وعدہ کرتی ہوں، مگر خدا کے لیے اس وقت جاؤ۔ مجھے خوب جی بھر کر رو لینے دو۔''

یہ کہتے کہتے کپتان ناکس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں نے کہا۔'' اگر آپ کو یہ غمناک داستان کہنے میں صدمہ ہو رہا ہے تو جانے دیجیے۔''

کپتان ناکس کے گلا صاف کرکے کہا۔''نہیں بھئی۔ وہ قصہ تو پورا کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے بعد ایک ماہ تک میں روزانہ لوئسا کے پاس جاتا اور اس کے دل سے اپنے رقیب کے خیال کو نکالنے کی کوشش کرتا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کمرہ سے باہر نکل آتی۔ خوش ہو ہو کر باتیں کرتی۔ یہاں تک کہ میں سمجھنے لگا کہ وہ مجھ سے ملتفت ہوگئی ہے۔ اسی اثنا میں یوروپین جنگ چھڑ گئی۔ ہم اور تم دونوں لڑائی پر چلے گئے۔تم فرانس گئے۔ میں کمانڈنگ افسر کے ساتھ مصر گیا۔ لوئسا اپنے چچا کے ساتھ یہیں رہ گئی۔ راجرس بھی اس کے ساتھ رہ گیا۔ تین سال تک میں لام پر رہا۔ لوئسا کے پاس برابر خطوط آتے رہے۔ میں ترقی پاکر لفٹنٹ ہو گیا اور کمانڈنگ افسر کچھ دن اور زندہ رہتے تو ضرور کپتان ہو جاتا۔ مگر میری بدنصیبی سے وہ ایک لڑائی میں مارے گئے۔ آپ لوگوں کو اس لڑائی کا حال معلوم ہی ہے۔ ان کے مرنے کے ایک ماہ بعد میں چھٹی لے کر پھر لوٹا۔ لوئسا اب بھی اپنے چچا کے ساتھ ہی تھی۔ مگر افسوس ! نہ وہ حسن تھا۔ نہ وہ زندہ دلی۔ گھل کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اس وقت مجھے اس کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ مجھے اب معلوم ہو گیا کہ اس کی محبت کتنی صادق اور کتنی جانکاہ تھی۔مجھ سے شادی کا وعدہ کر کے بھی وہ اپنے جذبات پر فتح

نہ پاسکی تھی۔ شاید اسی غم میں کڑھ کڑھ کر اس کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ایک دن میں نے اس سے کہا۔'' لوئسا ! مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ شاید تم اپنے پرانے محبوب کو بھول نہیں سکیں۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہو تو میں اس وعدہ سے تمھیں سبکدوش کرتا ہوں۔ تم شوق سے اس کے ساتھ شادی کرلو۔ میرے لیے یہی اطمینان کافی ہوگا کہ میں دن رہتے گھر آ گیا۔ میری طرف سے اگر کوئی ملال ہو تو اسے نکال ڈالو۔''

لوئسا کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپکنے لگے۔ بولی۔'' وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں کرپن، آج چھ مہینہ ہوئے وہ فرانس میں مارے گئے میں ہی ان کی موت کا باعث ہوئی۔ یہی غم ہے۔ فوج سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اگر وہ میری جانب سے مایوس نہ ہو جاتے تو کبھی فوج میں نہ بھرتی ہوتے۔ مرنے ہی کے لیے وہ فوج میں گیے۔ مگر تم اب آگیے میں بہت جلد اچھی ہو جاؤں گی۔ اب مجھ میں تمھاری بیوی بننے کی قابلیت زیادہ ہوگئی۔ تمھارے پہلو میں اب کوئی کانٹا نہیں رہا اور نہ میرے دل میں کوئی غم۔''

ان الفاظ میں طنز بھرا ہوا تھا جس کے معنٰی یہ تھے کہ میں نے لوئسا کے محبوب کی جان لی۔ اس کی صداقت سے کون انکار کرسکتا تھا۔ اس کی تلافی کی اگر کوئی صورت تھی تو یہی کہ لوئسا کی اتنی خاطر داری، اتنی دلجوئی کروں۔ اس پر اس طرح نثار ہو جاؤں کہ اس کے دل سے یہ ملال نکل جائے۔

اس کے ایک ماہ بعد شادی کا دن مقرر ہو گیا۔ ہماری شادی بھی ہو گئی ہم دونوں گھر آئے۔ احباب کی دعوت ہوئی۔ شراب کے دور چلے۔ میں اپنی خوش نصیبی پر نازاں تھا اور میں ہی کیوں میرے عزیز احباب سب میری خوش قسمتی پر مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔

مگر کیا معلوم تھا تقدیر مجھے یوں سبز باغ دکھا رہی ہے۔ کیا معلوم تھا کہ یہ وہ راستہ ہے جس کے پیچھے ظالم شکاری کا جال بچھا ہوا ہے۔ میں تو اور دوستوں کی خاطر تواضع میں مصروف تھا۔ ادھر لوئسا اندر کمرہ میں لیٹی ہوئی اس دنیا سے رخصت ہونے کا سامان کر رہی تھی۔ میں ایک دوست کی مبارک باد کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ راجرس نے آ کر کہا۔'' کرپن! چلو، لوئسا تمھیں بلا رہی ہے۔ جلد اس کی نہ

جانے کیا حالت ہو رہی ہے۔ ''میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ دوڑا ہوا لوئسا کے کمرہ میں آیا۔

کپتان ناکس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ آواز پھر بھاری ہو گی۔ ذرا دم لے کر انھوں نے کہا۔

''اندر جا کر دیکھا تو لوئسا کوچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے اعضا میں تشنج ہو رہا تھا۔ چہرہ سے کرب کی علامت نمودار تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔''کرپن میرے قریب آجاؤ۔ میں نے شادی کر کے اپنا قول پورا کر دیا۔ اس سے زیادہ میں تمھیں کچھ اور نہ دے سکتی تھی۔ کیوں کہ میں اپنی محبت پہلے ہی دوسرے کی نذر کرچکی ہوں۔ مجھے معاف کرنا۔ میں نے زہر کھالیا ہے۔ اور چند لمحوں کی مہمان ہوں۔''

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ دل پر ایک نشتر سا لگا۔ گھٹنے ٹیک کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ روتا ہوا بولا۔ ''لوئسا یہ تم نے کیا کیا۔ ہائے! کیا تم مجھے داغ دے کر اتنی جلدی چلی جاؤ گی۔کیا اب کوئی تدبیر نہیں ہے۔''

فوراً دوڑ کر ایک ڈاکٹر کے مکان پر گیا۔ مگر آہ! جب تک اسے ساتھ لے کر آؤں میری وفاشعار، سچی لوئسا ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔ صرف اس کے سرہانے ایک چھوٹا سا پرزہ پڑا ہوا تھاجس پر اس نے لکھا تھا۔'' اگر تمھیں میرا بھائی سری ناتھ نظر آئے تو اس سے کہہ دینا لوئسا مرتے وقت بھی اس کا احسان نہیں بھولی۔''

یہ کہہ کر ناکس نے اپنے واسکٹ کے جیب سے ایک مخملی ڈبیا نکالی اور اس میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔'' چودھری! یہی میری اس عارضی خوش نصیبی کی یادگار ہے۔ جسے آج تک میں نے جان سے زیادہ عزیز رکھا ہے۔ آج تم سے تعارف ہو گیا۔ میں نے سمجھا تھا اور احباب کی طرح تم بھی لڑائی میں ختم ہو گئے ہوگے۔ مگر شکر ہے کہ تم جیتے جاگتے موجود ہو۔ یہ امانت تمھارے سپرد کرتا ہوں۔ اب اگر تمھارے جی میں آئے تو مجھے گولی ماردو۔ کیوں کہ اس بہشتی وجود کا قاتل میں ہوں۔''

یہ کہتے کہتے کپتان ناکس پھیل کر کرسی پر لیٹ گئے۔ ہم دونوں کی آنکھوں

سے آنسو جاری تھے۔ مگر جلدی ہی ہمیں اپنے وقتی فرض کی یاد آگئی۔ نائس کو تشفی دینے کے لیے میں کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ مگر اس کا ہاتھ پکڑتے ہی میرے جسم میں رعشہ سا آ گیا۔ ہاتھ ٹھنڈا تھا۔ ایسا ٹھنڈا جیسا دم آخری ہوتا ہے۔ میں نے گھبرا کر ان کے چہرہ کی طرف دیکھا اور ڈاکٹر چندر کو پکارا۔ ڈاکٹر صاحب نے آکر فوراً ان کی چھاتی پر ہاتھ رکھا اور غمناک لہجہ میں بولے۔ دل کی حرکت بن ہو گئی۔

اسی وقت بجلی کڑ کڑا اٹھی۔ کڑ ! کڑ ! کڑ !

یہ افسانہ پہلی بار پریم چالیسی میں شائع ہوا۔ ہندی میں یہ گپت دھن 2 میں شامل ہے۔

تگادا

سیٹھ چیت رام نے اسنان کیا۔ شیوا جی کو جل چڑھایا۔ دو دانے مرچ چبائے، دو لوٹے پانی پیا اور سوٹا لے کر تگادے پر چلے۔

سیٹھ جی کی عمر کوئی پچاس کی تھی۔ سر کے بال جھڑ گئے تھے اور کھوپڑی ایسی صاف ستھری نکل آئی تھی جیسے اوسر کھیت۔ آپ کی آنکھیں تھیں تو چھوٹی لیکن بالکل گول۔ چہرے کے نیچے پیٹ تھا۔ اور پیٹ کے نیچے ٹانگے، مانو کسی پیپے میں دو میکھیں گاڑ دی گئی ہوں، لیکن یہ خالی پیپا نہ تھا۔ اس میں سجیوتا اور کرم شیلتا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کسی باقی دار اسامی کے سامنے اس پیپے کا اچھلنا کودنا اور پترے بدلنا دیکھ کر کسی نٹ کا چیکیا بھی لجیت ہوجاتا۔ ایسی آنکھیں لال پیلی کرتے، ایسے گرجنا کہ درشکوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔ انھیں کنجوس تو نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ جب وہ دوکان پر ہوتے، توہاریک بھیک منگے کے سامنے ایک کوڑی پھینک دیتے، ہاں اس سے ان کے ماتھے پر کچھ ایسا بل پڑجاتا۔ آنکھیں کچھ ایسی پرچنڈ ہو جاتی۔ ناک کچھ ایسی سکوڑ جاتی کہ بھیکاری پھر ان کی دوکان پر نہ آتا۔ لہنے کا باپ تغادا ہے، اس سدھانت کے وہ اتنے بھکت تھے جل پان کرنے کے بعد سندھیا تک برابر تغادا کرتے رہتے تھے۔ اس میں ایک تو گھر کا بھوجن بچتا تھا دوسرے اسامیوں کے ماتھے دودھ پوری، مٹھائی آدی پدارتھ کھانے کو مل جاتے تھے۔ ایک وقت کا بھوجن بچ جانا کوئی سادھارن بات نہیں ہے۔ ایک بھوجن کا ایک آنہ بھی رکھ لیں تو کیول اسی مد میں انھوں نے اپنے تیس ورشوں کے مہاجنی جیون میں کوئی آٹھ سو

روپے بچا لیے تھے۔ پھر لوٹتے سے دوسری بیلا کے لیے بھی دودھ، دہی، تیل، ترکاری اپلے ایدھن مل جاتے تھے۔ بہودھا سندھیا کا بھوجن بھی نہ کرنا پڑتا تھا۔ اس لیے تغادے سے نہ چوکتے تھے آسمان پھٹا پڑتا ہو، آگ برس رہی ہو۔ آندھی آتی ہو، پر سیٹھ جی پراکرتی کے اٹل نیم کی بھانتی تغادے پر ضرور نکل جاتے۔

سیٹھانی نے پوچھاء بھوجن؟

سیٹھ جی نے گرج کر کہا۔ نہیں

سانجھ کا

آنے پر دیکھی جائے گی۔

(۲)

سیٹھ جی کے ایک کسان پر پانچ روپے آتے تھے۔ چھ مہینے سے دشٹ سود بیاج کچھ نہ دیا تھا اور نہ کبھی کوئی سوغات لے کر حاضر ہوا تھا۔ اس کا گھر تین کوس سے کم نہ تھا۔ اس لیے سیٹھ جی ٹالتے آتے تھے۔ آج انھوں نے اسی گاؤں چلنے کا نشچیہ کرلیا۔ آج بنا دُشٹ سے روپے لئے نہ مانوں گا، چاہے کتنا ہی روئے گھگھیائے مگر اتنی لمبی یاترا پیدل کرنا نندا سپد تھا۔ لوگ کہیں گے۔ نام بڑے درشن تھوڑے۔ کہلانے کو سیٹھ، چلتے ہیں پیدل اس لیے متھرگتی سے ادھر ادھر تاکتے راہ گیروں سے باتیں کرتے چلے جاتے تھے کہ لوگ سمجھیں وایو سیون کرنے جا رہے ہیں۔

سہسا ایک خالی ایکہ ان کی طرف جاتا ہوا مل گیا۔ ایکے وان نے پوچھا۔ کہاں لالا، کہاں جانا ہے؟

سیٹھ جی نے کہا: جانا تو کہیں نہیں ہے، دو پرگ تو اور ہیں۔ لیکن لاؤ بیٹھ جائیں۔

ایکّے والے نے چبھتی ہوئی آنکھوں سے سیٹھ جی کو دیکھا، سیٹھ جی نے بھی اپنی لال آنکھوں سے اسے گھورا۔ دونوں سمجھ گئے، آج لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے۔

ایکہ چلا۔ سیٹھ جی نے پہلا وار کیا۔ کہاں گھر ہے میاں صاحب؟ گھر کہاں

ہے حضور۔ جہاں پڑ رہوں وہی گھر ہے۔ جب گھر تھا تب تھا۔ اب تو بے گھر، بے در ہوں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بے پر ہوں۔ تقدیر نے پر کاٹ لیے، لنڈورا بنا کر چھوڑ دیا۔ میرے دادا نوابی میں چکلے دار تھے۔ حضور، سات جلے کے مالک جسے چاہیں توپ، دم کر دیں، پھانسی پر لٹکا دیں۔ نکلنے کے پہلے لاکھوں کی تھیلیاں نظر چڑھ جاتی تھی حضور۔

نواب صاحب بھائی کی طرح مانتے تھے۔ ایک دن وہ تھے، ایک دن یہ ہے کہ ہم آپ لوگوں کی غلامی کر رہے ہیں۔ دنوں کا پھیر ہے۔

سیٹھ جی کو ہاتھ ملاتے ہی معلوم ہوگیا، پکا پھکیت ہے، اکھاڑے باز، اس سے پیش پانا مشکل ہے، پر اب تو کشتی بد گئی تھی۔ اکھاڑے میں اتر پڑے تھے۔ بولے یہ تو کہو کہ بادشاہی گھرانے کے ہو۔ یہ صورت ہی گواہی دے رہی ہے، دنوں کا پھیر ہے بھائی۔ سب دن برابر نہیں جاتے۔ ہمارے یہاں لکشمی کو چنچلا کہتے ہیں۔ برابر چلتی رہتی ہے۔ آج میرے گھر کل تمھارے گھر۔تمھارے دادا نے روپے تو خوب چھوڑے ہوں گے؟

اِیکّے والا : ارے سیٹھ، اس دولت کا کوئی حساب تھا۔ نہ جانے کتنے تہہ خانے بھرے ہوئے تھے بوروں میں سونے چاندی کے ڈلے رکھے ہوئے تھے جواہرات ٹوکریوں میں بھرے پڑے تھے۔ ایک ایک پتھر پچاس لاکھ کا۔ چمک دمک ایسی تھی کہ چراغ مات مگر تقدیر بھی تو کوئی ہے۔ ادھر دادا کا چالیسواں ہوا۔ ادھر نوابی برد ہوئی۔ سارا خزانہ لٹ گیا۔ چھکڑوں پر لاد لاد کر لوگ جواہرات لے گئے پھر گھر میں اتنا بچ رہا تھا کہ ابا جان نے زندگی بھر عیش کیا۔ ایسا عیش کیا کہ کیا کوئی بھگوا کرے گا۔ سولہ کہاروں کے سکھ پال پر نکلتے تھے۔ آگے پیچھے چوب دار دوڑتے چلتے تھے۔ پھر بھی میرے گذر بھر کو انھوں نے بہت چھوڑا۔ اگر حساب کتاب سے رہتا تو آج بھلا آدمی ہوتا۔ لیکن رئیس کا بیٹا رئیس ہی تو ہوگا۔ ایک بوتل چڑھا کر بستر سے اٹھتا تھا۔ رات رات بھر مجرے ہوتے رہتے تھے۔ کیا جانتا تھا، ایک دن یہ ٹھوکریں کھانی پڑیں گی۔

سیٹھ : اللہ میاں کا شکر کرو بھائی کہ ایمان داری سے اپنے بال بچوں کی پرورش تو

کرتے ہو۔ نہیں تو ہمارے تمھارے کتنے ہی بھائی رات دن کو کرم کرتے رہتے ہیں، پھر بھی دانے دانے کو محتاج رہتے ہیں۔ ایمان کی سلامتی چاہیے۔ نہیں تو دن تو سبھی کٹ جاتے ہیں، دودھ روٹی کھا کر کاٹے تو کیا سوکھے چنے چبا کر کاٹے تو کیا۔ بڑی بات تو ایمان ہے مجھے تو تمھاری صورت دیکھتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ نیت کے صاف سچے آدمی ہو بے ایمانی کی تو صورت ہی سے پھٹکار برستی ہے۔

اکے والا : سیٹھ جی، آپ نے ٹھیک ہی کہا کہ ایمان سلامت رہے تو سب کچھ ہے۔ آپ لوگوں سے چار پیسے مل جاتے ہیں وہی بال بچوں کو کھلا پلا کر پڑ رہتا ہوں حضور اور اکے والوں کو دیکھئے تو کوئی کسی مرض میں مبتلا ہے، کوئی کسی مرض میں۔ میں نے توبہ بولا۔ ایسا کام ہی کیوں کرے، کہ مصیبت میں پھنسے بڑا کنبہ ہے حضور ماں ہیں۔ بچے ہیں کئی بیوائیں ہیں۔ اور کمائی یہاں اکہ ہے۔ پھر بھی اللہ میاں کسی طرح نباہے جاتے ہیں۔

سیٹھ : وہ بڑا کارساز ہے۔ کھاں صاحب، تمھاری کمائی میں ہمیشہ برکت ہوگی۔

اکے والا : آپ لوگوں کی مہربانی چاہیے۔

سیٹھ : بھگوان کی مہربانی چاہیے۔ تم سے خوب بھینٹ ہوگئی میں اکے والا سے بہت گھبراتا ہوں، لیکن اب معلوم ہوا، اچھے برے سبھی جگہ ہوتے ہیں، تمھارے جیسے سچا دیندار آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ کیسی صاف طبیعت پائی ہے تم نے کہ واہ۔

سیٹھ جی کو یہ چکنے دار باتیں سن کر اکہ والا سمجھ گیا کہ یہ مہاشے پرلے سرے کے بیٹھک باز ہیں۔ یہ صرف میری تعریف کرکے مجھے چکما دینا چاہتے ہیں اب اور کسی پہلو سے اپنا مطلب نکالنا چاہیے۔ ان کی دیا سے تو کچھ لے مرنا مشکل ہے شاید ان سے بھے سے کچھ لے مروں بولا۔ مگر لالا، یہ نہ سمجھیے کہ میں جتنا سیدھا اور نیک نظر آتا ہوں اتنا سیدھا اور نیک ہوں بھی۔ نیکوں کے ساتھ نیک ہوں۔ لیکن بروں کے ساتھ پکا بدمعاش ہوں۔ یوں کہیے آپ کی جوتیاں سیدھی کردوں۔ لیکن کرایے کے معاملے میں کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتا رعایت کروں تو کھاؤں کیا؟

سیٹھ جی نے سمجھا تھا اکے والے کو ہتھے پر چڑھا لیا۔ اب یاترا اور نہ شلک

حمایت ہوجائے گی۔ لیکن یہ الاپ سنا تو کان کھڑے ہوئے۔ بولے بھائی روپے پیسے کے معاملے میں میں بھی کسی سے رعایت نہیں کرتا، لیکن کبھی کبھی جب یار دوستوں کا معاملہ آپڑتا ہے تو جھک مار کر دینا ہی پڑتا ہے۔ تمھیں بھی کبھی کبھی بل کھانا ہی پڑتا ہوگا۔ دوستوں سے بے مروتی تو نہیں کی جاتی۔ اکّے والے نے روکھے پن سے کہا۔ میں کسی کے ساتھ مروت نہیں کرتا۔ مروتوں کا سبق تو استاد نے پڑھایا ہی نہیں۔ ایک ہی چنڈل ہوں۔ مجال کیا کہ کوئی ایک پیسہ دبا لیں۔ گھر والی تک کو تو میں ایک پیسہ دیتا نہیں۔ دوسروں کی بات ہی کیا ہے، اور اکّے والے اپنے مہاجن کی خوشامد کرتے ہیں۔ اس کے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں۔ یہاں مہاجنوں کو بھی دھتا بتاتا ہوں۔ سب میرے نام کو روتے ہیں۔ روپے لیے اور صاف ڈکار گیا۔ دیکھیں، اب کیسے وصول کرتے ہو بچا، نالش کرو، گھر میں کیا دھرا ہے جو لے لوگے۔

سیٹھ جی کو مانو جوری چڑھ آئی۔ سمجھ گئے، یہ شیطان بنا پیسے لیے نہ مانے گا۔ جانتے کہ یہ وپتی گلے پڑے گی تو بھول کر بھی اکّہ پر پاؤں نہ رکھتے۔ اتنی دور پیدل چلنے میں کون پیر ٹوٹ جاتے تھے۔ اگر اس طرح روز پیسے دینے پڑے، تو پھر لین دین کر چکا۔

سیٹھ جی بھکت جیو تھے۔ شیو جی کو جل چڑھانے میں جب سے ہوش سنبھالا، ایک ناغا بھی نہ کیا۔ کیا بھکت وتسل شنکر بھگوان اس اوسر پر میری سہایتہ نہ کریں گے۔ اسیشٹ دیو کا سمرن کر کے بولے۔ کھاں صاحب اور کسی سے چاہے نہ دبوں۔ پر پولیس سے دبنا ہی پڑتا ہوگا۔ وہ تو کسی کے سگے نہیں ہوتے۔

اکّے والے نے قہقہہ مارا۔ کبھی نہیں، ان سے الٹے اور کچھ نہ کچھ وصول کرتا ہوں۔ جہاں کوئی شکار ملا۔ جھٹ ستے بھاڑے بٹھاتا ہوں۔ اور تھانے پر پہنچا دیتا ہوں۔ کرایہ بھی مل جاتا ہے، اور انعام بھی۔ کیا مجال کہ کوئی بول سکے۔ لائسنس نہیں لیا۔ آج تک لائسنس۔ مزے میں صدر میں اکّہ دوڑاتا پھرتا ہوں۔ کوئی سالہ چھو نہیں کرسکتا۔ میلے ٹھیلوں میں اپنی خوب بن آتی ہے۔ اچھے اچھے مال چن کر کوتوالی پہنچاتا ہوں۔ وہاں کون کسی کی دال گلتی ہے۔ جسے چاہیں روک لیں، ایک دن تو دو

دن، تین دن، بیس بہانے ہیں، کہہ دیا شک تھا کہ یہ عورتوں کو بھگائے لیے جاتا تھا۔ پھر کون بول سکتا ہے۔ صاحب بھی چھوڑنا چاہیں، ایک ہی حرامی ہوں۔ سواریوں سے پہلے کرایہ طے نہیں کرتا، ٹھکانے پر پہنچ کر ایک کے دو لیتا ہوں۔ پھر کون ہے جو سامنے ٹھہر سکے۔

سیٹھ جی کو رومانچہ ہو آیا۔ ہاتھ میں ایک سوٹا تو تھا۔ پر اس ویوہار کرنے کی شکتی کا ان میں ابھاؤ تھا۔ آج برے پھنسے۔ نہ جانے کس منحوس کا منہ دیکھ کر گھر سے چلے تھے۔ کہیں یہ دشٹ الجھ پڑے۔ تو دس پانچ دن ہلدی سوٹھ پینا پڑے۔ اب سے بھی کوشل ہے۔ یہاں اتر جاؤں۔ جو بچ جائے وہی سہی۔ بھیگی بلی بن کر بولے۔ اچھا اب روک لو کھان صاحب میرا گاؤں آگیا۔ بولو تمھیں کیا دے دوں؟

اکے والے نے گھوڑی کو ایک چابک اور لگایا اور نردیتا سے بولا۔ مزوری سوچ لو بھائی۔ تم کو نہ بٹھایا ہوتا۔ تو تین سواریاں بٹھا لیتا۔ تین چار چار آنے بھی دیتے تو بارہ آنے ہو جاتے۔ تم آٹھ ہی آنے دے دو۔

سیٹھ جی کی بندھیاں بیٹھ گئی۔ اتنی بڑی رقم انھوں نے عمر بھر اس مد میں نہیں خرچ کی۔ اتنی سی دور کے لیے اتنا کرایہ، وہ کسی طرح نہ دے سکتے تھے منشیہ کے جیون میں ایک ایسا اوسر بھی آتا ہے جب پری نام کی اسے چنتا نہیں رہتی۔ سیٹھ جی کے جیون میں یہ ایسا ہی اوسر تھا۔ اگر آنے دو آنے کی بات ہوتی تو خون کا گھونٹ پی کر دے دیتے۔ لیکن آٹھ آنے کے لیے کہ جس کا دیگن ایک کل دار ہوتا ہے۔ اگر تو تو میں میں ہی نہیں ہاتھا پائی کی بھی نوبت آئے تو وہ کرنے کو تیار تھے۔ یہ نشچیہ کرکے وہ درڑھتا کے ساتھ بیٹھے رہے۔

سہسا سڑک کے کنارے ایک جھونپڑا نظر آیا۔ اکہ رک گیا۔ سیٹھ جی اتر پڑے اور کمر سے ایک دو انّی نکال کر اکے وان کی اور بڑھائی۔

اکے وان نے سیٹھ جی کے تیور دیکھے۔ تو سمجھ گیا تاؤ بگر گیا۔ چاشنی کڑی ہوکر کٹھور ہوگئی۔ اب یہ دانتوں سے لڑے گی۔ اسے چبل کر ہی میٹھاس کا آنند لیا جاسکتا ہے۔ نرتما سے بولا: میری اور سے اس کی ریوڑیاں لے کر بال بچوں کو کھلا دیجیے گا۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔

سیٹھ جی نے ایک آنہ اور نکالا اور بولے بس، اب زبان نہ ہلانا۔ ایک کوڑی بھی بیسی نہ دوں گا۔

ایکہ والا : نہیں مالک۔ آپ ہی ایسا کہیں گے۔ تو ہم غریبوں کے بال بچے کہاں سے پلیں گے۔ ہم لوگ بھی آدمی پہچانتے ہیں حضور۔

اتنے میں جھونپڑی میں سے ایک استری گلابی ساڑی پہنے، پان چباتی ہوئی نکل آئی اور بولی آج بڑی دیر لگائی (یکایک سیٹھ جی کو دیکھ کر) اچھا اج لالا جی تمھارے ایکے پر تھے۔ پھر آج تمھارا مجاز کاہے کو ملے گا۔

ایک چہرے تو شاہی تو ملی ہوگی۔ ادھر چڑھا دو سیدھے سے۔

یہ کہہ کر وہ سیٹھ جی کے سمیپ آکر بولی۔ آرام سے چرپیاں پر بیٹھو لالا۔ بڑے بھاگیہ تھے کہ آج سویرے سویرے آپ کے درشن ہوئے۔

اس کے وستر مندر، مند مہک رہے تھے۔ سیٹھ جی کا دماغ تازہ ہوگیا۔ اس کی اور کنکھیوں سے دیکھا۔ عورت چنچل، بانکی، کٹیلی، تیز طرار تھی۔ سٹھانی جی کی مورتی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ بھدی، تھل تھل، پیل پیل، پیروں میں بیوائے پھٹی ہوئی، کپڑوں سے درگند اڑتی ہوئی سیٹھ جی نام ماتر کو بھی رشک نہ تھے۔ پر اس سے آنکھوں سے ہار گئے۔ آنکھوں کو ادھر سے ہٹانے کی چیشٹا کر کے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ابھی کوس بھر کی منزل باقی ہے۔ اس کا خیال ہی نہ رہا۔

استری ایک چھوٹی سی پنکھیاں اٹھا لائی۔ اور سیٹھ جی کو جھلنے لگی۔ ہاتھ کی پرتیک گتی کے ساتھ سوگند کا ایک جھونکا آکر سیٹھ جی کو انمت کرنے لگا۔

سیٹھ جی نے جیون میں ایسا الاس کبھی انوبھو نہ کیا تھا۔ انھیں پرایا سبھی گھرنا کی درشٹ سے دیکھتے تھے۔ چولا مست ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں پنکھیاں چھین لینی چاہی۔

تمھیں کشٹ ہورہا ہے، لاؤ میں جھل لوں، یہ کیسی بات ہے لالا جی۔ آپ ہمارے دروازے پر آئے ہیں کیا اتنی خاطر بھی نہ کرنے دیجیے گا۔ اور ہم کس لائق ہیں ادھر کہیں دور جانا ہے؟ اب تو بہت دیر ہوگئی کہاں جایئے گا۔

سیٹھ جی نے پاپی آنکھوں کو پھیر کر کہا اور پاپی من کو دبا کر کہا۔ یہاں سے

تھوڑی دور پر ایک گاؤں ہے سانجھ کو ادھر ہی سے لوٹوں گا۔

سندری نے پرسنے ہوکرکہا۔ تو پھر آج یہیں رہیے گا۔ سانجھ کو پھر کہاں جائیے گا۔ ایک دن گھر کے باہر کی ہوا بھی کھائیے۔ پھر نہ جانے کب ملاقات ہوگی۔

اکیے والے نے آکر سیٹھ جی کے کان میں کہا: پیسے نکالیے تو دانے چارے کا انتظام کردوں۔

سیٹھ جی نے چپکے سے اٹھنی نکال کر دے دی۔

اکیے والے نے پھر پوچھا۔ آپ کے لیے کچھ مٹھائی لیتا آؤں؟

یہاں آپ کے لائق مٹھائی تو کیا ملے گی، ہاں منہ میٹھا ہو جائے گا۔

سیٹھ جی بولے۔ میرے لیے کوئی ضرورت نہیں ہاں بچوں کے لیے یہ چار آنے کی مٹھائی لیواتے آنا۔ چونی نکال کر سیٹھ جی نے اس کے سامنے ایسے غرو سے پھینکی مانو اس کی ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں ہے۔ سندری کے منہ کا بھاؤ تو دیکھنا چاہتے تھے پر ڈرتے تھے کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھیں لالا چونی کیا دے رہے ہیں، مانو کسی کو مول لے رہے ہیں۔

اکیے والا: چونی اٹھا کر جا ہی رہا تھا کہ سندری نے کہا۔ سیٹھ جی کی چونی لوٹا دو۔ لپک کر اٹھالی۔ شرم نہیں آتی یہ مجھ سے روپیہ لے لو۔ آٹھ آنے کی تازی مٹھائی بنوا کر لاؤ۔

اس نے روپیہ نکال کر پھینکا۔ سیٹھ جی مارے لاج کے گڑ گئے۔ اکیے وان کی بھٹیارن جس کی ٹیکے کو بھی اوکات نہیں، اتنی خاطر داری کرے کہ ان کے لیے پورا روپیہ نکال کر دے دے، یہ بھلا وہ کیسے سہہ سکتے تھے۔ بولے نہیں نہیں یہ نہیں ہوسکتا تم اپنا روپیہ رکھ لو۔ (رشک آنکھوں کو ترپت کر کے) میں روپیہ دیے دیتا ہوں یہ لو آٹھ آنے کی لے لینا۔

اکیے وان تو ادھر مٹھائی اور دانا چارا کی فکر میں چلا ادھر سندری نے سیٹھ سے کہا۔ وہ تو ابھی دیر میں آئے گا لالہ تب تک پان تو کھاؤ۔

سیٹھ جی نے ادھر ادھر تاک کر کہا۔ یہاں تو کوئی تمولی نہیں ہے۔

سندری نے ان کی اور نیتروں سے دیکھ کر بولی۔ کیا میرے لگائے پان تمولی

کے پانوں سے بھی خراب ہوں گے؟

سیٹھ جی نے للجیت ہو کر کہا۔ نہیں نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ تم مسلمان ہو نہ؟

سندری نے ونودے آگرہ سے کہا۔ خدا کی قسم، اسی بات پر تمھیں کھلا کر چھوڑوں گی۔ یہ کہہ کر اس نے پان دان سے ایک بیڑا نکالا اور سیٹھ جی کی طرف چلی۔ سیٹھ جی نے ایک منٹ تک تو ہاں ہاں کیا۔ پھر دونوں ہاتھ بڑھا کر اسے ہٹانے کی چیسٹا کی۔ پھر زور سے دونوں ہونٹھ بند کر لیے۔ پر جب سندری کسی طرح نہ مانی تو سیٹھ جی اپنا دھرم لے کر بے تحاشہ بھاگے۔ سوٹا وہیں چارپائی پر رہ گیا۔ بیس قدم پر جاکر اب رک گئے۔ اور ہانپ کر بولے۔ دیکھو اس طرح کسی کا دھرم نہیں لیا جاتا۔ ہم لوگ تمھارا چھوا ہوا پانی پی لیں تو دھرم نشٹ ہوجائے۔

سندری نے پھر دوڑایا۔ سیٹھ جی پھر بھاگے۔ ادھر پچاس ورشوں سے اس طرح بھاگنے کا اوسر نہ پڑا تھا۔ دھوتی کھسک کر گرنے لگی مگر اتنا اوکاش نہ تھا کہ دھوتی باندھ لیں۔ بے چارے دھرم کو کندھے پر رکھے دوڑے چلے جاتے تھے۔ نہ معلوم کب کمر سے روپیوں کا بٹوا کھسک پڑا۔ جب ایک پچاس قدم پر پھر رکے اور دھوتی اوپر اٹھائی، تو بٹوا ندارد۔ پیچھے پھر کر دیکھا۔ سندری ہاتھ میں بٹوا لیے انھیں دکھا رہی تھی اور اشارے سے بلا رہی تھی۔ مگر سیٹھ جی کو دھرم روپے سے کہیں پیارا تھا۔ دو چار قدم چلے پھر رک گئے۔

یکا یک دھرم بدھیہ نے ڈانٹ بتائی۔ تھوڑے روپے کے لئے دھرم چھوڑے دیتے ہو۔ روپے بہت ملیں گے دھرم کہاں ملے گا۔

یہ سوچتے ہوئے وہ اپنی راہ چلے۔ جیسے کوئی کتا جھگڑالو کتوں کے بیچ سے آہاتھ، دُم دبائے بھاگا جاتا ہو اور بار بار پیچھے پھر کر دیکھ لیتا ہو کہ کہیں وے دُشٹ آ تو نہیں رہے ہیں۔

نوٹ: یہ افسانہ پہلی بار ہندی مجموعہ ''پریرنا'' 1931 میں شائع ہوا مان سروور نمبر 4 میں شامل ہے اردو میں شائع نہیں ہوا۔

آخری حیلہ

اگرچہ میرا حافظہ بہت قوی نہیں۔ تاریخ دنیا کی ساری اہم تاریخیں فراموش ہوگئیں۔ وہ ساری تاریخیں جنھیں راتوں کو جاگ کر جبر ڈال کر یاد کیا تھا۔ مگر شادی کی تاریخ اس ہموار میدان میں ایک ستون کی طرح اٹل ہے۔ نہ بھولتا ہوں نہ بھول سکتا ہوں۔ اس سے قبل و مابعد کے سارے واقعات دل سے محو ہو گیے۔ ان کا نشان تک باقی نہیں۔ وہ ساری کثرت ایک وحدت میں مضمر ہو گئی اور وہ میری شادی کی تاریخ ہے۔ چاہتا ہوں اسے بھول جاؤں۔ مگر جس تاریخ کو روزانہ یاد کیا جاتا ہو وہ کیسے بھول جائے۔ اور یاد کیوں کرتا ہوں؟ یہ اس مبتلائے غم سے پوچھیے جسے نام خدا کے سوا زندگی سے نجات کا کوئی وسیلہ باقی نہ رہا ہو۔

لیکن کیا میں تاہل سے اس لیے بھاگتا ہوں۔ کہ میں زاہد خشک ہوں۔ اور صنف لطیف کی دل ربائیوں سے بے اثر۔ کیا میں نہیں چاہتا کہ جب میں سیر کرنے نکلوں تو اہلیہ بھی جلوہ افروز ہوں۔ تکلفات کی دکانوں پر ان کے ساتھ جاکر تھوڑی دیر کے لیے معشوقانہ التجا کا لطف اٹھاؤں؟ میں اس شان ومسرت اور غرور کا اندازہ کرسکتا ہوں جو میرے دوسرے بھائیوں کی طرح میرے دل میں بھی تموج پذیر ہو گا۔ لیکن میری تقدیر میں وہ خوشیاں اور رنگ رلیاں نہیں۔ کیوں کہ تصویر کا دوسرا رخ بھی تو دیکھتا ہوں۔ ایک رخ جتنا ہی دل فریب اور خوشنما ہے، دوسرا اتنا ہی دل شکن اور ہیبت ناک۔ شام ہوئی اور آپ بچے کو گود میں لیے تیل یا ایندھن والے کی دکان پر کھڑے ہیں۔ اندھیرا ہوا۔ اور آپ آٹے کی پوٹلی بغل میں دبائے گلیوں میں

یوں قدم بڑھاتے ہوئے نکل جاتے ہیں گویا چوری کی ہے۔ صبح ہوئی اور بچوں کو گود میں لیے ہومیوپیتھک ڈاکٹر کی دکان میں ٹوٹی کرسی پر رونق افروز ہیں۔کسی خوانچے والے کی صدائے نوش آیند سن کر بچے نے نالۂ فلک بلند کیا۔ اور آپ کی روح قبض ہوئی ایسے باپوں کو بھی دیکھا ہے جو دفتر سے لوٹتے ہوئے پیسے دو پیسے کی مونگ پھلی یا ریوڑیاں لے کر بہ سرعت تمام منہ میں رکھتے چلے جاتے ہیں کہ گھر پہنچتے پہنچتے بچوں کی یورش سے قبل وہ ذخیرہ ختم ہو جائے۔ کتنا مایوس کن ہوتا ہے وہ نظارہ جب دیکھتا ہوں کہ میلے میں بچہ کسی کھلونے کی دکان کے سامنے مچل رہا اور قبلہ گاہی صاحب واعظانہ سرگرمی سے کھلونوں کی بے حقیقی کا راگ الاپ رہے ہیں۔

تصویر کا پہلا رخ تو میرے لیے ایک شیریں خواب ہے۔ دوسرا رخ ایک روح فرسا حقیقت۔ اس حقیقت کے سامنے میرا سارا ذوق تاہل فنا ہو جاتا ہے۔ میری ساری قوت ایجاد، میری ساری فکر رسا اسی تاہل کے پھندوں سے بچنے مین صرف ہوتی ہے۔ دانہ تہ دام ہے۔ یہ جتنا ہوں مگر کتنا گراں، کتنا مہلک، دام خوش رنگ ہے۔ بالکل سنہرے تاروں کا بنا ہوا۔ اس میں طائروں کو تڑپتے اور پھڑپھڑاتے دیکھتا ہوں۔

لیکن ادھر کچھ دنوں سے اہلیہ نے پیہم تقاضے کرنے شروع کیے کہ مجھے بلالو۔ پہلے چھٹیوں میں جاتا تھا تو میرا محض ''کہاں چلو گی'' کہہ دینا اس کے اطمینان قلب کے لیے کافی ہوتا تھا۔ پھر میں نے ''فضول ہے۔'' کہہ کر اسے تسکین دینا شروع کیا۔ اس کے بعد خانہ داری کی پریشانیوں سے تخویف کی۔ مگر اب کچھ دنوں سے اس کی بے اعتباری بڑھتی جاتی ہے۔ اب میں نے چھٹیوں میں بھی اس کے تقاضے کے خوف سے گھر جانا بند کر دیا ہے۔ کہ کہیں وہ میرے ساتھ نہ چل کھڑی ہو۔ اور انواع واقسام کے حیلوں سے اسے ڈراتا رہتا ہوں۔

میرا پہلا حیلہ اخبار نویس کی زندگی کی مشکلات سے متعلق تھا۔ بے انتہا تکلیف دہ، کبھی بارہ بجے رات کو سونا نصیب ہوتا ہے۔ کبھی ساری رات لکھنا پڑتا ہے۔ صبح ہوتے ہی دوا دوش، وہی ہنگامہ آرائی، اس پر طرہ یہ کہ سر پر ایک برہنہ شمشیر لٹکتی رہتی ہے۔نہ جانے کب گرفتار ہو جاؤں۔ کب ضمانت طلب ہو جائے۔ خفیہ پولیس کی

ایک فوج ہمیشہ پیچھے پڑی رہتی ہے۔ کبھی بازار میں نکل جاتا ہوں تو لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہتے ہیں۔ وہ جا رہا ہے اخبار والا۔ دنیا میں جتنی آفات ارضی و سماوی، نسلی و مذہبی، ملکی و قومی ہیں۔ ان کا ذمہ دار میں ہوں۔ گویا میرا دماغ جھوٹی خبریں گھڑنے کا کارخانہ ہے۔ سارا دن افسروں کی سلامی اور پولیس کی خوشامد میں گذر جاتا ہے۔ کنسٹبلوں کو دیکھا اور روح فنا ہوئی کہ خدا جانے کیا آفت برپا کریں۔ میری تو یہ حالت اور حکام ہیں کہ میری صورت سے ہراساں ایک دن شامت اعمال سے کسی انگریز کے بنگلے کی طرف جا نکلا۔ صاحب نے پوچھا کیا کام کرتا ہے؟ میں نے ایک شان کے ساتھ کہا۔ اخبار کا ایڈیٹر ہوں۔ صاحب فوراً اندر گھس گئے اور دروازہ بند کرلیا۔ پھر میں نے میم صاحبہ اور باوا لوگوں کو کھڑکیوں سے جھانکتے دیکھا۔ گویا کوئی خطرناک جانور ہے۔ ایک بار ریل گاڑی میں سفر کا اتفاق ہوا۔ ساتھ اور بھی کئی دوست تھے۔ اس لیے اپنے پیشے کا وقار قائم رکھنے کے لیے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لینا پڑا۔ گاڑی میں بیٹھا تو ایک صاحب نے میرے سوٹ کیس پر میرا نام اور پیشہ دیکھتے ہی فوراً اپنا صندوق کھولا اور ریوالور نکال کر میرے رو برو اس میں گولیاں بھریں تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ مجھ سے بے خبر نہیں۔

میں نے اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر مطلق نہیں کیا۔ کیوں کہ میں جنس لطیف سے ایسا تذکرہ کرنا اپنی شان مردانگی کے خلاف سمجھتا ہوں۔

مجھے یقین تھا کہ اہلیہ اس خط کے بعد پھر یہاں آنے کے لیے اصرار نہ کریں گی مگر یہ خیال غلط نکلا اور ان کے تقاضے بدستور قائم رہے۔

تب میں نے دوسرا حیلہ سوچا۔ شہروں میں بیماریوں کی گرم بازاری ہے۔ ہرایک کھانے پینے کی چیزمیں سمیت کا اندیشہ، دودھ میں سمیت، گھی پھلوں میں سمیت، سبزی میں سمیت، ہوا میں سمیت، پانی میں سمیت، یہاں انسان کی زندگی نقش برآب ہے۔ جسے آج دیکھو وہ کل غائب۔ اچھے خاصے بیٹھے ہیں دل کی حرکت بند، گھر سے سیر کرنے نکلے موٹر سے ٹکرا کر راہی عدم۔ اگر کوئی شام کو زندہ سلامت گھر آجائے تو اسے خوش نصیب سمجھو۔ مچھر کی آواز کان میں آئی اور دل بیٹھا۔ مکھی نظر آئی تو ہاتھ پاؤں پھولے۔ چوہا بل سے نکلا اور جان نکلی گئی۔ جدھر دیکھیے

ملک الموت۔ اگر موٹر اور ٹرام سے بچ کر آگئے تو مچھر اور مکھی کے شکار ہوں۔ کہاں بچ کر جاؤ گے۔ بس سمجھ لو موت ہر دم سر پر کھیلتی رہتی ہے۔ ساری رات مچھروں سے جنگ کرتے گذرتی ہے۔ دن بھر مکھیوں سے لڑتا ہوں۔ ننھی سی جان کو کن کن دشمنوں سے بچاؤں۔ سانس بھی مشکل سے لیتا ہوں۔ کہ کہیں کوئی کیڑا پھیپھڑے میں نہ داخل ہو جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بیوی کو پھر یقین نہ آیا دوسرے خط میں وہی اصرار موجود تھا۔ لکھا تھا ''تمھارے خط نے ایک اور فکر پیدا کردی۔ اب ہر روز خط لکھا کرنا ورنہ میں ایک نہ سنوں گی۔ اور سیدھی چلی آؤں گی۔'' میں نے دل میں کہا چلو ستے چھوٹے۔ مگر یہ فکر لگا ہوا تھا کہ نہ جانے کب انھیں شہر آنے کی سنک سوار ہو جائے۔ اس لیے میں نے ایک تیسرا حیلہ سوچ نکالا۔ یہاں دوستوں کے مارے جان عذاب میں رہتی ہے۔ احباب آکر بیٹھ جاتے ہیں تو اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ گویا اپنا گھر بیچ کر آئے ہیں۔ اگر گھر سے ٹل جاؤ تو آکر بے محابا کمرہ میں بیٹھ جاتے ہیں اور نوکر سے سگریت، ناشتہ ادھار منگواکر کھاتے ہیں۔ دینا مجھے پڑتا ہے۔ بعض تو ہفتوں پڑے رہتے ہیں ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ روزانہ ان کی خاطرومدارات کرو۔شام کو تھیٹر یا فلم دکھاؤ۔ رات کو ایک دو بجے تک تاش یا شطرنج کھیلو۔ اکثر احباب شراب کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ اکثر تو بیمار ہو کر آتے ہیں۔ بلکہ زیادہ تر بیمار ہی آتے ہیں۔ اب روزانہ ڈاکٹر کو بلاؤ۔ تیمار داری کرو۔ رات بھر سرہانے بیٹھے پنکھا جھلتے رہو۔ اکثر آکر دیکھتا ہوں تو خدمت گار غائب ہے۔ گھنٹوں اس کی تلاش میں گھومتا ہوں تب پتہ چلتا ہے کہ ایک دوست نے اسے ذرا ایک کام سے بازار بھیج دیا تھا۔ میری گھڑی مہینوں سے میری کلائی پر نہیں آئی۔ دوستوں کے ساتھ جلسوں میں شریک ہو رہی ہے اچکن ہے تو وہ ایک صاحب کے پاس۔ کوٹ دوسرے صاحب لے گئے۔ جوتے ایک اور بابو لے اڑے۔ ہیں وہی پرانا کوٹ اور وہی خارج شدہ جوتا پہن کر دفتر جاتا ہوں۔ احباب تاڑتے رہتے ہیں کہ کون سے نئی چیز لایا۔

کوئی چیز لاتاہوں تو وہ صندوق میں بند پڑی رہتی ہے۔ استعمال کروں تو کسی

نہ کسی صاحب کی فرمائش ہو۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملتی ہے تو چوروں کی طرح دبے پاؤں گھر آتا ہوں۔ کہ کہیں کوئی صاحب اس لیے میرے منتظر نہ بیٹھے ہوں کہ آج ضرورت ہے۔ کچھ روپے دے دو۔ معلوم نہیں ان کی ضرورتیں پہلی تاریخ کی منتظر کیوں رہتی ہے۔ ایک دن تنخواہ لے کر بارہ بجے رات کو لوٹا۔ مگر دیکھا اس وقت بھی دو اصحاب رونق افروز تھے۔ تقدیر ٹھونک لی۔ کتنے ہی بہانے کروں ان کے سامنے ایک بھی پیش نہیں جاتی۔ میں کہتا ہوں گھر سے خط آیا ہے والدہ صاحبہ بہت بیمار ہیں۔ وہ جواب دیتے ہیں اجی بوڑھے اتنے جلد نہیں مرتے۔ مرنا ہی ہوتا تو اتنے دنوں زندہ کیوں رہتیں؟ دیکھ لینا دوچار روز میں اچھی ہو جائیں گی۔ کہتا ہوں ارے یار گھر سے بہت ضروری خط آیا ہے مال گذاری کا سخت تقاضا ہو رہا ہے۔ جواب ملتا ہے آج کل تو لگان بند ہو رہی ہے۔ اور تمھیں بھی اس کی تقلید کرنی چاہیے۔ اگر کسی تقریب کا حیلہ کرتاہوں تو فرماتے ہیں تم بھی کیا عجیب الخلقت انسان ہو۔ ان بے ہودہ مراسم کی پابندی کر نا تمھاری شان کے خلاف ہے۔ اگر تم ان مراسم کی بیخ کنی نہ کروگے تو وہ لوگ کیا آسمان سے آئیں گے؟ خاموش ہوجاتا ہوں کہ یہ کسی طرح گلا نہ چھوڑیں گے۔ پھرکیوں مفت میں سر پچی کروں؟

مجھے یقین تھا کہ اس خط کے بعد بیوی پھر یہاں آنے کا نام نہ لے گی مگر اب کی پھر وہ خیال غلط نکلا۔ جواب میں وہی تقاضا تھا۔ خیریت اتنی ہوئی کہ انھوں نے خط لکھنے پر ہی اکتفا کی۔

تب میں نے جو تھا سوچا: یہاں کے مکان ہیں کہ خدا کی پناہ۔ نہ ہوا، نہ روشنی، نہ وسعت، اعراض ثلاثہ کا کہیں پتہ نہیں، وہ غضب کا تعفن کہ دماغ پھٹا جاتا ہے۔ کتنوں کو توا اسی تعفن کے باعث مالیخولیا، اختلاج قلب، ضیق النفس، یا ٹائیفائیڈ ہو جاتاہے۔ بارش ہوئی اور مکان ٹپکنا شروع ہوا۔ پانی آدھ گھنٹہ بر سے مکان رات بھر رستا رہتا ہے۔ رات بھر مکانوں کے گرنے کی صدا آتی رہتی ہے۔ صبح کو اٹھو، تو کوئی یہاں ملبہ میں مدفون ہے۔ کوئی وہاں رات کو وحشت ہو تی ہے۔ ایسے بہت کم مکان ہوں گے جن میں پلید ارواح کا گذر نہ ہو۔ ہولناک خواب دکھائی دیتے ہیں۔ لوگ رات کو رو پڑتے ہیں چیخ اٹھتے ہیں۔ کتنے ہی جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

آج گھر میں آئے۔ کل مکان تبدیل کرنے کی فکر پیدا ہو گئی۔ کوئی ٹھیلہ اسباب سے لدا جا رہا ہے۔ کوئی آرہا ہے۔ بس جدھر دیکھئے ٹھیلے ہی ٹھیلے نظر آتے ہیں۔ چوریاں تو اس کثرت سے ہوتی ہیں۔اگر کوئی رات خیریت سے گذر جائے تو دیوتاؤں کی منت مانی جاتی ہے۔ آدھی رات ہوئی اور چور چور، لینا لینا کی صدائیں بلند ہوئیں۔ لوگ دروازوں پر موٹے موٹے لکڑی کے پھٹے یا جوتے یا دست پناہ، یا چہل قدمی کی چھڑی لیے کھڑے رہتے ہیں۔ پھر بھی۔چور اتنے شاطر ہیں کہ نظر بچا کر اندر پہنچ ہی جاتے ہیں۔ ایک میرے بے تکلف دوست ہیں۔ رات اندھیرے میں برتن کھڑکے۔ تو میں نے بجلی کی بتی جلائی۔ دیکھا تو وہی حضرت برتن سمیٹ رہے ہیں۔ مجھے جاگتے دیکھ کر زور سے قہقہہ مارا۔ اور بولے۔'' میں تجھے چکمہ دینا چاہتا تھا۔'' میں نے دل میں سمجھ لیا۔ کہ اگر نکل جاتے تو برتن آپ کے تھے۔ جاگ گئی تو چکمہ ہو گیا۔ گھر میں آئے کیسے تھے؟ یہ معمہ ہے۔ غالبًا رات کو تاش کھیل کر چلے، تو باہر جانے کے بدلے نیچے اندھیری کوٹھری میں چھپ گئے۔

ایک دن ایک صاحب مجھ سے خط لکھوانے آئے۔ شامت اعمال، کمرہ میں قلم دوات نہ تھی۔ اوپر کے کمرہ سے لانے گیا۔ لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ آنحضرت غائب ہیں اور ان کے ساتھ گھڑی بھی غائب ہے۔

مگر میری بیوی پر شہری زندگی کا ایسا جادو چڑھا ہوا ہے کہ میرا کوئی حیلہ اسے خائف نہیں کرتا۔اس خط کے جواب میں اس نے لکھا کہ تم مجھ پر بہانے کرتے ہو۔ اور خود وہاں سیر سپاٹے کا لطف اٹھاتے ہو۔ میں ہرگز نہ مانوں گی۔ آکر مجھے لے جاؤ۔''

آخر مجھے پانچواں حیلہ کرنا پڑا۔ یہ خوانچے والوں کے متعلق تھا۔ ابھی بستر سے اٹھنے کی نوبت نہیں آئی کہ کانوں میں عجیب و غریب صدائیں آنے لگیں۔ شاید بابل کے مینار کی تعمیر کے وقت وہی ایسی ہی گوناگوں نہمل صدائیں آتی ہوں گی۔ یہ خوانچے والوں کی صدائے بے ہنگام ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ یہ سب نغمۂ و چنگ کے ساتھ اپنی چیزوں کی جانب لوگوں کو مائل کرتے۔ یہاں کے موسیقی کالج میں چار پانچ سال اس ہنر کو حاصل کرتے۔ مگر ان اوندھی عقل والوں کو یہ کیا سوجھتی

ہے۔ اس طرح شیطانی صدائیں نکالتے ہیں۔ کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اور بچے ماں کی گود سے چمٹ جائیں۔ میں بھی تو اکثر راتوں کو چونک پڑتا ہوں۔ ایک روز تو میرے پڑوس میں ایک سانحہ ہو گیا۔ گیارہ بجے تھے۔ کوئی خاتون شاید بچے کو دودھ پلانے اٹھی تھیں۔ یکایک جو کسی خوانچے والے کی صدائے مہیب کانوں میں آئی تو چیخ مار کر چلّا اٹھیں۔ اور پھر بے ہوش ہو گئیں۔ مہینوں کی دوا دارو کے بعد صحت ہوئی۔ اب رات کو کانوں میں روئی ڈال کر سوتی ہیں۔ ہر چند کہا گیا کہ خوانچے والے کی صدا تھی پر انھیں یقین نہیں آتا۔ اور ایسے سانحے آئے دن ہوتے رہتے ہیں کئی احباب اپنی بیویوں کو لائے۔ مگر بے چاریاں دوسرے ہی دن ان صداؤں سے خائف ہو کر واپس چلی گئیں۔

مگر اہلیہ نے اسے بھی مرا حیلہ ہی سمجھا۔ ''تم سمجھتے ہو کہ میں خوانچے والوں کی آواز سے ڈر جاؤں گی۔ یہاں گیدڑوں کا ہوّا ہوا اور الوؤں کا شور سن کر تو ڈرتی نہیں۔ خوانچے والوں کی آواز سے ڈر جاؤں گی۔ مجھے ایسی باتوں سے نہ ڈرایئے۔''

آخر میں نے اب کی کوئی ایسا حیلہ سوچ نکالنے کی ٹھانی۔ جو اس خوف کا یکلخت خاتمہ کردے۔ اہلیہ صاحبہ کو شہری زندگی سے مدت العمر کے لیے نفرت ہو جائے۔ کئی دنوں کے بعد مجھے ایک حیلہ سوجھا۔ اگرچہ اس میں کچھ رسوائی کا بھی اندیشہ تھا لیکن رسوائی ہو جانے کا کوئی غم نہیں۔ وہ مصیبت تو سر پر نہ پڑے۔

میں نے لکھا کہ یہ شریف زادیوں کو رہنے کی جگہ نہیں۔ یہاں کی مہریاں اتنی بدزبان ہیں کہ باتوں کا جواب گالیوں سے دیتی ہیں۔ اور ان کی وضع قطع کا کیا پوچھنا۔ شریف زادیاں تو ان کا ٹھاٹھ دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہیں۔ سر سے پاؤں تک سونے سے لدی ہوئی سامنے سے نکل جاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے خوشبو کی لپٹ نکل گئی۔ کوئی شریف عورت یہ ٹھاٹھ کہاں سے لائے گی۔ اسے تو اور بھی سینکڑوں فکر ہیں۔ انھیں تو بناؤ سنوار کے سوا دوسرا کام ہی نہیں۔ روز نئی سج دھج، نت نئی ادا، اور شوخ تو اس غضب کی ہیں کہ گویا سیماب بھر دیا گیا ہو۔ ان کا چمکنا اور مٹکنا، لجانا اور مسکرانا دیکھ کر بچاری بھلے گھروں کی عورتیں شرما جاتی ہیں اور ایسی گستاخ ہیں کہ خواہ مخواہ گھروں میں گھس پڑتی ہیں۔ کہیں کسی دوست کے گھر

آج گھر میں آئے۔ کل مکان تبدیل کرنے کی فکر پیدا ہو گئی۔ کوئی ٹھیلہ اسباب سے لدا جا رہا ہے۔ کوئی آرہا ہے۔ بس جدھر دیکھئے ٹھیلے ہی ٹھیلے نظر آتے ہیں۔ چوریاں تو اس کثرت سے ہوتی ہیں۔اگر کوئی رات خیریت سے گذر جائے تو دیوتاؤں کی منت مانی جاتی ہے۔ آدھی رات ہوئی اور چور چور، لینا لینا کی صدائیں بلند ہوئیں۔ لوگ دروازوں پرموٹے موٹے لکڑی کے پھٹے یا جوتے یا دست پناہ، یا چہل قدمی کی چھڑی لیے کھڑے رہتے ہیں۔ پھر بھی۔چور اتنے شاطر ہیں کہ نظر بچا کر اندر پہنچ ہی جاتے ہیں۔ ایک میرے بے تکلف دوست ہیں۔ رات اندھیرے میں برتن کھڑکے۔ تو میں نے بجلی کی بتی جلائی۔ دیکھا تو وہی حضرت برتن سمیٹ رہے ہیں۔ مجھے جاگتے دیکھ کر زور سے قہقہہ مارا۔ اور بولے۔'' میں تجھے چکمہ دینا چاہتا تھا۔'' میں نے دل میں سمجھ لیا۔ کہ اگر نکل جاتے تو برتن آپ کے تھے۔ جاگ گئی تو چکمہ ہو گیا۔ گھر میں آئے کیسے تھے؟ یہ معمہ ہے۔ غالبًا رات کو تاش کھیل کر چلے، تو باہر جانے کے بدلے نیچے اندھیری کوٹھری میں چھپ گئے۔

ایک دن ایک صاحب مجھ سے خط لکھوانے آئے۔ شامت اعمال، کمرہ میں قلم دوات نہ تھی۔ اوپر کے کمرہ سے لانے گیا۔ لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ آنحضرت غائب ہیں اور ان کے ساتھ گھڑی بھی غائب ہے۔

مگر میری بیوی پر شہری زندگی کا ایسا جادو چڑھا ہوا ہے کہ میرا کوئی حیلہ اسے خائف نہیں کرتا۔اس خط کے جواب میں اس نے لکھاکہ تم مجھ پر بہانے کرتے ہو۔ اور خود وہاں سیر سپاٹے کا لطف اٹھاتے ہو۔ میں ہرگز نہ مانوں گی۔ آکر مجھے لے جاؤ۔''

آخر مجھے پانچواں حیلہ کرنا پڑا۔ یہ خوانچے والوں کے متعلق تھا۔ ابھی بستر سے اٹھنے کی نوبت نہیں آئی کہ کانوں میں عجیب و غریب صدائیں آنے لگیں۔ شاید بابل کے مینار کی تعمیر کے وقت وہی ایسی ہی گوناگوں مہمل صدائیں آتی ہوں گی۔ یہ خوانچے والوں کی صدائے بے ہنگام ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ یہ سب نغمۂ و چنگ کے ساتھ اپنی چیزوں کی جانب لوگوں کو مائل کرتے۔ یہاں کے موسیقی کالج میں چار پانچ سال اس ہنر کو حاصل کرتے۔ مگر ان اوندھی عقل والوں کو یہ کیا سوجھتی

ہے۔ اس طرح شیطانی صدائیں نکالتے ہیں۔ کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اور بچے ماں کی گود سے چمٹ جائیں۔ میں بھی تو اکثر راتوں کو چونک پڑتا ہوں۔ ایک روز تو میرے پڑوس میں ایک سانحہ ہو گیا۔ گیارہ بجے تھے۔ کوئی خاتون شاید بچے کو دودھ پلانے اٹھی تھیں۔ یکایک جو کسی خوانچے والے کی صدائے مہیب کانوں میں آئی تو چیخ مار کر چلا اٹھیں۔ اور پھر بے ہوش ہو گئیں۔ مہینوں کی دوا دارو کے بعد صحت ہوئی۔ اب رات کو کانوں میں روئی ڈال کر سوتی ہیں۔ ہر چند کہا گیا کہ خوانچے والے کی صدا تھی پر انھیں یقین نہیں آتا۔ اور ایسے سانحے آئے دن ہوتے رہتے ہیں کئی احباب اپنی بیویوں کو لائے۔ مگر بے چاریاں دوسرے ہی دن ان صداؤں سے خائف ہو کر واپس چلی گئیں۔

مگر اہلیہ نے اسے بھی مرا حیلہ ہی سمجھا۔ ''تم سمجھتے ہو کہ میں خوانچے والوں کی آواز سے ڈر جاؤں گی۔ یہاں گیدڑوں کا ہوّا ہوا اور الوؤں کا شور سن کر تو ڈرتی نہیں۔ خوانچے والوں کی آواز سے ڈر جاؤں گی۔ مجھے ایسی باتوں سے نہ ڈرایئے۔''

آخر میں نے اب کی کوئی ایسا حیلہ سوچ نکالنے کی ٹھانی۔ جو اس خوف کا یکلخت خاتمہ کر دے۔ اہلیہ صاحبہ کو شہری زندگی سے مدت العمر کے لیے نفرت ہو جائے۔ کئی دنوں کے بعد مجھے ایک حیلہ سوجھا۔ اگرچہ اس میں کچھ رسوائی کا بھی اندیشہ تھا لیکن رسوائی ہو جانے کا کوئی غم نہیں۔ وہ مصیبت تو سر پر نہ پڑے۔

میں نے لکھا کہ یہ شریف زادیوں کو رہنے کی جگہ نہیں۔ یہاں کی مہریاں اتنی بدزبان ہیں کہ باتوں کا جواب گالیوں سے دیتی ہیں۔ اور ان کی وضع قطع کا کیا پوچھنا۔ شریف زادیاں تو ان کا ٹھاٹھ دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہیں۔ سر سے پاؤں تک سونے سے لدی ہوئی سامنے سے نکل جاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے خوشبو کی لپٹ نکل گئی۔ کوئی شریف عورت یہ ٹھاٹھ کہاں سے لائے گی۔ اسے تو اور بھی سینکڑوں فکر ہیں۔ انھیں تو بناؤ سنوار کے سوا دوسرا کام ہی نہیں۔ روز نئی سج دھج، نت نئی ادا، اور شوخ تو اس غضب کی ہیں کہ گویا سیماب بھر دیا گیا ہو۔ ان کا چمکنا اور مٹکنا، لجانا اور مسکرانا دیکھ کر بچاری بھلے گھروں کی عورتیں شرما جاتی ہیں اور ایسی گستاخ ہیں کہ خواہ مخواہ گھروں میں گھس پڑتی ہیں۔ کہیں کسی دوست کے گھر

سے کوئی چیز لے کر، کبھی کسی دوسرے بہانہ سے، کئی کتنا ہی چاہے کہ ان کی آنکھیں چار نہ ہوں۔ مگر غیر ممکن۔ جدھر دیکھو ان کا میلہ سا لگا ہوا ہے۔ اجی اکثر تو خط لکھانے کے بہانے سے گھروں میں آجاتی ہیں۔ اور خواہ مخواہ گھر والیوں کو جلاتی ہیں۔"

معلوم نہیں اس خط میں مجھ سے کون سی غلطی ہو گئی کہ تیسرے ہی دن اہلیہ محترمہ ایک بوڑھے کہار کے ساتھ میرا پتہ پوچھتی ہوئی اپنے تینوں بچوں کو لیے ایک بلائے بے درماں کی طرح وارد ہو گئیں۔

میں نے بد حواس ہو کر پوچھا کیوں خیریت تو ہے"؟

اہلیہ نے چادر اتار تے ہوئے کہا۔" گھر میں کوئی چڑیل بیٹھی تو نہیں ہے؟ یہاں کسی نے قدم رکھا تو ناک ہی کاٹ لوں گی۔ ہاں جو تمھاری شر نہ ہو۔"

اچھا تو اب عقدہ کھلا، میں نے سر پیٹ لیا، کیا جا نتا تھا کہ اپنا طمانچہ اپنے ہی منہ پر پڑے گا۔

یہ افسانہ پہلی بار لاہور کے ماہنامہ چندن کے فروری 1931 کے شمارے میں شائع ہوا۔ آخری تحفہ میں شامل ہے ہندی میں یہ بنارس کے ہندی ماہنامہ ہنس میں ۱/اپریل 1931 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مانسروور نمبر 1 میں شامل ہے۔

ڈیمانسٹریشن

تمہید

مہاشے گوروپرشاد نہایت رنگین مزاج شخص ہیں۔ گانے بجانے کے رسیا ہیں۔ سیروسیاحت سے دلچسپی ہے۔ کھانے کھلانے میں نہایت سیر چشم ہیں یوں تو کسی کے محتاج نہیں۔ شریف آدمیوں کی طرح رہتے ہیں اور ہیں بھی بھلے آدمی۔ لیکن کسی کام میں چمٹ نہیں سکتے۔ گڑ ہو کر بھی ان میں لیس نہیں ہے۔ وہ کوئی ایسا کام کر نا چاہتے ہیں جس میں جھٹ پٹ قارون کا خزانہ مل جائے اور وہ ہمیشہ کے لیے بے فکر ہو جائیں۔ بینک سے ششماہی سود چلا آئے۔ کھائیں اور مزے سے پڑے رہیں۔ ایک دن بات بات میں کسی ستم ظریف نے مشورہ دیا کہ کوئی ناٹک کمپنی کھولو۔ بات معقول تھی۔ سمجھ میں آ گئی دوستوں کو لکھا۔ میں بہت جلد ایک ڈرامیٹک کمپنی کھولنے جارہا ہوں۔ آپ لوگ ڈرامے لکھنا شروع کیجیے۔ کمپنی کے قواعد و ضوابط مرتب ہوئے۔ کئی مہینے خوب گرم بازاری رہی کتنے ہی بڑے بڑے آدمیوں نے حصے خریدنے کے وعدے کیے۔ لیکن نہ حصے بکے، نہ کمپنی کھڑی ہوئی۔ ہاں اسی دُھن میں گورو پرشاد نے ایک ناٹک ضرور تصنیف کر ڈالا۔ اور یہ فکر ہوئی کہ اسے کسی کمپنی کو دیا جائے لیکن یہ تو معلوم ہی نہ تھا کہ کمپنی والے ایک ہی گھاگھ ہوتے ہیں۔ پھر جس کمپنی میں کسی غیر شخص کا داخلہ ہو۔ وہ تو اس تصنیف میں طرح طرح کے عیب نکالے گا اور کمپنی کے مالک کو بھڑکا دے گا۔ بالآخر یہ ترکیب سوچی گئی کہ احباب

کمپنی کے مالکوں پر کچھ ایسا رعب غالب کریں، کہ کمپنی کے ڈراماٹسٹ کی دال ہی نہ گل سکے۔ چنانچہ پانچ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اس میں تمام پروگرام پر تبادلہ خیالات ہوا۔ اور دوسرے دن گوروپرشاد ہی معہ اپنے رفقاء کے ناٹک دکھانے چلے۔ ٹانگے آ گئے۔ ہارمونیم طلبہ وغیرہ سب ان پر لاد دیے گئے۔ کیوں کہ ناٹک کے ڈیمانسٹریشن Demonstration کا فیصلہ ہوا تھا۔

یکا یک ونود بہاری نے کہا: یار ٹانگے پر جانے میں کچھ بے رُعبی سی ہوگی۔ مالک خیال کرے گا۔ یہ مہاشے تو یوں ہی ہیں۔ اس وقت دس پانچ روپیہ کا منہ نہ دیکھنا چاہیے۔ میں تو مغربی اشتہاربازی کا قائل ہوں کہ روپے میں پندرہ آنے اسی میں لگا کر صرف ایک آنہ میں تجارت کرتے ہیں کہیں سے دو موٹریں منگانی چاہییں''

رسک لال نے کہا: ''لیکن کرایہ کی موٹروں سے یہ بات پیدا نہ ہوگی۔ جو آپ چاہتے ہیں۔ کسی رئیس سے دو موٹریں مانگ لینی چاہییں۔ماریسن ہوں یا نئے فیشن کی آسٹین۔''

بات سچی تھی۔ بھیس سے بھیک ملتی ہے۔ قیاس آرائیاں ہو نے لگیں کس رئیس سے درخواست کی جائے۔ اجی وہ مہاکھوسٹ ہے۔ صبح صبح اس کا نام لے لو تو دن بھر پانی نہ ملے۔ اچھا سیٹھ جی کے پاس چلیں۔ تو کیسے؟ منہ دھو رکھئے۔ اس کی موٹر میں افسروں کے لیے ریزرو ہیں۔ اپنے لڑکے تک کو کبھی بیٹھنے نہیں دیتا۔ آپ کو دیے دیتا ہے۔ تو چلو کپور صاحب کے پاس چلیں۔ ابھی انھوں نے نئی موٹر لی ہے۔ اجی اس کا نام مت لو۔ کوئی نہ کوئی بہانہ کرے گا۔ ڈرائیور نہیں ہے۔ زیر مرمت ہے۔ اس قسم کی باتیں بناتے کیا اسے دیر لگتی ہے؟

گورو پرشاد نے مایوس ہو کر کہا۔''تم لوگوں نے خواہ مخواہ بکھیڑا کر دیا۔ ٹانگوں پر چلنے سے کیا ہرج تھا۔''

ونود بہاری نے کہا۔ ''آپ تو گھاس کھا گئے ہیں۔ ناٹک لکھ لینا دوسری بات ہے اور معاملہ کرنا دوسری بات۔ میری بات سنئے۔ فی صفحہ ایک روپیہ سنا دے گا۔ اپنا سا منہ لے کر رہ جایے گا۔''

امرناتھ نے کہا۔''میں سمجھتا ہوں۔ موٹر کے لیے کسی راجہ رئیس کی خوشامد کرنا

بے کار ہے۔ تعریف تو جب ہے کہ پیدل چلیں۔ اور وہاں ایسا رنگ جمائیں کہ موٹر سے زیادہ شان جم جائے۔

ونود بہاری اچھل پڑے۔ سب لوگ پیدل چلے۔ وہاں پہنچ کر کس طرح باتیں شروع ہوں۔ کس طرح تعریفوں کے پل باندھے جائیں کس طرح ڈراماٹسٹ صاحب کو خوش کیا جائے۔ تمام راستہ اسی گفتگو اور بحث کا بازار گرم رہا۔

آخر یہ لوگ کمپنی کے کیمپ میں پہنچے۔ تقریباً دو بجے کا وقت تھا۔ پروپرائٹر صاحب معہ اپنے ایکٹر اور ڈراماٹسٹ کے پہلے ہی انتظار میں تھے۔ پان، الائچی، سگریٹ وغیرہ پہلے ہی منگوالیے گئے تھے۔

اوپر جاتے ہی رسک لال نے مالک سے کہا۔ ''معاف فرمائیے گا ہم لوگوں کو یہاں پہنچنے میں کسی قدر دیر ہوئی۔ موٹر سے نہیں بلکہ پا پیادہ آئے ہیں۔ سب لوگوں کی یہی صلاح ہوئی کہ آج قدرتی مناظر کا لطف اٹھاتے ہوئے چلیں۔ گورو پرشاد تو قدرت کے پرستاروں میں سے ہیں۔ اگر ان کا بس چلتا ہو تو آج چمٹالیے ہوئے یا تو کہیں بھیک مانگتے ہوتے یا کسی پہاڑ کی کھوہ، یا گاؤں میں کسی برگد کے سایہ میں بیٹھے خوش نوا پرندوں کے وجد انگیز نغموں سے محظوظ ہوتے۔

ونود نے کہا۔ ''اور آئے بھی تو سیدھے راستہ سے نہیں۔ نہ معلوم کہاں کہاں کا چکر کاٹتے خاک چھانتے یہاں تک پہنچے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پاؤں میں سنیچر ہے۔

امر نے کچھ اور ہی رنگ جمایا۔ پورے ست جگی آدمی ہیں۔ نوکر چاکر تو موٹروں پر سیر کرتے ہیں۔ اور آپ گلی گلی مارے مارے پھرتے ہیں۔ جب اور رئیس خواب راحت کا لطف اٹھا تے رہتے ہیں۔ تو آپ ندی کے کنارے افق کی جلوہ نمائیوں میں محو رہتے ہیں۔''

مست رام نے فرمایا: شاعر ہو نے کے معنی دین دنیا سے بے گانہ ہوجانا ہے۔ گلاب کی ایک پنکھڑی لے کر اس میں نہ معلوم گھنٹوں کیا دیکھا کرتے ہیں۔ قدرت کے مشاہدے نے ہی یورپ کے بڑے بڑے شعرا کو آسمان پر پہنچا دیا ہے۔ کاش یہ یورپ میں ہو تے تو ان کے دروازے پر ہاتھی جھومتا ہوتا۔ ایک دن

ایک لڑکے کو روتے دیکھ کر آپ بھی رونے لگے۔ ہرچند پوچھتا ہوں۔ بھئی کیوں روتے ہو؟ مگر جواب نہیں دیتے۔ بلکہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ منہ سے آواز نہیں نکلتی تھی۔ بڑی مشکل سے آواز نکلی۔"

ونود : جناب شاعر کا دل نازک اور لطیف جذبات کا سرچشمہ ہے نغمۂ لطیف کی کان ہے۔ وسعت کا آئینہ ہے۔"

"واہ واہ ! آپ نے کیا بات کہی۔ وسعت کا آئینہ۔ واہ! شاعر کی صحبت میں رہ کر آپ پر بھی شاعری کا رنگ غالب آتا جاتا ہے۔"

گورو پرشاد نے عاجزانہ انداز سے کہا۔" میں شاعر نہیں۔ اور نہ مجھے شاعری کا دعوے ہے۔ آپ لوگ مجھے زبردستی شاعر بنائے دیتے ہیں۔ شاعر قدرت کی وہ عجیب وغریب تخلیق ہے۔ جو عناصر خمسہ کی جگہ نوروں سے ترکیب پاتی ہے۔"

مست رام : آپ کی یہی ایک بات ایسی ہے جس پر سیکڑوں نظمیں نثار ہیں۔ رشک لال جی شاعر کی عظمت ذہن نشیں ہوئی۔ یا نہیں ؟ یاد کر لیجیے رٹ لیجیے۔"

رسک لال : کہاں تک یاد کروں؟ یہ تو تشبیہات اور استعارات میں گفتگو کرتے ہیں۔ اور انکسار کا یہ حال ہے کہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ قابلیت وذہانت کی یہی علامت ہے جس نے اپنے آپ کو سمجھا بس وہ رہ گیا۔ (کمپنی کے مالک سے) آپ تو سب کچھ خود ہی سن لیں گے۔ اس ڈرامہ میں اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیا ہے۔ شاعروں میں جو عام طور پر ایک خود نمائی ہوتی ہے اس کی آپ میں کہیں بو بھی نہیں۔ اس ڈرامے کا مواد فراہم کرنے میں آپ نے کچھ نہیں تو کم از کم ہزار بڑے بڑے پوتھوں کا مطالعہ کیا ہو گا۔ واجد علی شاہ کو خود غرض وقائع نگاروں نے کتنا بدنام کیا ہے۔ آپ سے پوشیدہ نہیں اس طومار میں سے حقیقت کا انتخاب کرنا انہی کا کام ہے۔

ونود : اسی لیے ہم اور آپ دونوں کلکتے گئے۔ اور وہاں متواتر چھ ماہ تک مٹیا برج کی خاک چھانتے رہے۔ واجد علی شاہ کا قلمی مسودہ تلاش کیا۔ اس ڈراما کی تکمیل کے لیے اس کتاب کی بہت بڑی ضرورت تھی۔ اس میں انھوں نے خود ہی اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ ایک بڑھیا کو بہت کچھ نذر کرنے پر چھ مہینے میں جا

کر کتاب ملی۔''
امر ناتھ : ''کتاب نہیں۔ جواہرات کی کان ہے۔''
مست رام : اس وقت تو اس کی حالت کوئلے کی سی تھی۔ گورو پرشاد جی نے اس پر مہر لگا کر اشرفی بنا دیا۔ ڈراما ایسا ہونا چاہیے کہ جو سنے دل ہاتھوں سے تھام لے۔ ایک ایک نکتہ دل میں تیرو نشتر کی طرح اتر جائے۔
امر ناتھ : لٹریچر کے تمام ناٹکوں کو آپ نے چاٹ ڈالا اور فن ڈراما پر سیکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔
ونود : جب ہی تو چیز بھی لا ثانی ہوئی ہے۔
امر ناتھ : لاہور ڈرامیٹک کلب کا مالک ہفتہ بھر یہاں پڑا رہا۔ پیروں پڑا کہ یہ ناٹک مجھے دے دیجیے لیکن آپ نے نہ دیا، نہ دیا۔ جب ایکٹر ہی اچھے نہیں تو ان سے اپنا ڈرامہ کھلوانا اس کی مٹی خراب کرنا تھا۔ اس کمپنی کے ایکٹر ماشاء اللہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اور اس کے ڈرامہ نویس کی سارے زمانہ میں دھوم ہے۔ آپ لوگوں کے ہاتھوں میں پڑ کر یہ ڈراما دھوم مچا دے گا۔
ونود : ایک تو مصنف صاحب بذات خود شیطان سے زیادہ مشہور ہیں۔ اس پر ایکٹروں کا اسلوب بیان، سازو سامان، یہ تمام باتیں مل کر قیامت برپا کردیں گی۔
مست رام : روز ہی تو کسی کمپنی کا آدمی سر پر سوار رہتا ہے۔ مگر بابو صاحب کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتے۔
ونود : ''بس ایک یہ کمپنی ہے جس کے تماشا کے لیے دل بے قرار رہتا ہے۔ نہیں تو جتنے اور ڈرامے کھیلے جاتے ہیں دو کوڑی کے ہوتے ہیں۔ میں نے تو تماشا دکھینا ہی چھوڑ دیا۔''
گوروپرشاد : ناٹک لکھنا بچوں کا کھیل نہیں۔ خون جگر پینا پڑتا ہے۔ میرے خیال میں ایک ناٹک لکھنے کے لیے پانچ سال کا وقت بھی کافی نہیں۔ بلکہ اچھا ڈرامہ زندگی میں ایک ہی لکھا جاتا ہے۔ یوں قلم گھسنا دوسری بات ہے۔ بڑے بڑے زبردست مبصروں کا یہی فیصلہ ہے کہ ڈرامہ زندگی میں صرف ایک ہی لکھا جا سکتا ہے۔ روس، فرانس، جرمنی، تمام زبانوں کے ڈرامے پڑھے۔ مگر کوئی نہ کوئی نقص ہر

ایک میں موجود ہے۔ کسی میں جذبات ہیں، تو زبان نہیں۔ زبان ہے، تو جذبات نہیں۔ مذاق ہے تو،گانا نہیں۔ گانا ہے،تو مذاق نہیں۔ جب تک جذبات، زبان، مذاق اور گانا یہ چاروں باتیں پورے طور پرموجود نہ ہوں۔ اسے ڈرامہ کہنا ہی غلطی ہے۔ میں تو نہایت ہی ناقابل شخص ہوں۔ آپ لوگوں کی صحبت میں کچھ شد بد کر لیتا ہوں۔ میری تصنیف کی حقیقت ہی کیا۔ لیکن اگر پرماتما نے چاہا تو اس ڈراما میں ایسے نقائص آپ کو نہ ملیں گے۔

ونود : جب آپ کی قابلیت کا یہ حال ہے تو نقائص رہ کیسے سکتے ہیں۔

رسک لال : ''دس سال تک آپ نے صرف نغمہ کی ہی مشق کی ہے۔ ہزاروں روپے استادوں کی نذر کر دیے۔ اگر اتنے پر بھی نقص رہ جائے تو بد قسمتی!

ریہرسل

ری ہرسل شروع ہوئی۔ اور واہ وا، اور ہائے ہائے کا تار بندھا۔ کورس سنتے ہی ایکٹر، پروپرائٹر اور ناٹک نویس جیسے کسی خواب گراں سے بے دار ہو اٹھے۔ تمہید نے انھیں زیادہ متاثر نہیں کیا۔ لیکن اصلی چیز سامنے آتے ہی آنکھیں کھلیں۔ سماں بندھ گیا۔ پہلا سین آیا۔ آنکھوں کے سامنے واجد علی شاہ کے دربار کی تصویر کھنچ گئی۔ درباریوں کی حاضر جوابی اور پھڑکتے ہوئے لطیفے! واہ وا کیا کہنا۔ کیا طرزادا تھی۔ اور کیا شوکت الفاظ، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے تمام رس ایک ہی جگہ پر مجتمع ہو کر اپنی کیفیت دکھا رہے ہیں۔ تیسرا نظارہ مذاقیہ! ہنستے ہنستے لوگوں کی پسلیاں دکھنے لگیں۔ چوتھا سین نہایت رنجیدہ، اور تڑپا دینے والا تھا۔ مذاق کے بعد افسردگی، آندھی کے بعد آنے والا سکون تھا۔ ونود آنکھوں پر ہاتھ رکھے سر جھکائے رو رہے تھے۔ مست رام بار بار ٹھنڈی آہیں کھینچ رہے تھے۔ اور امرناتھ پیہم سسکیاں بھر رہے تھے۔ اسی طرح سین پر سین اور باب پرباب ختم ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ جب ریہرسل ختم ہوا تو چراغ روشن ہو چکے تھے۔

سیٹھ جی اب تک سونٹھ بنے بیٹھے رہے۔ ڈرامہ ختم ہو گیا لیکن ان کی زبان پر ان کی مبارک رائے کے عکس کا شائبہ تک نہ تھا۔ جڑ بھرت کی طرح بیٹھے تھے۔ نہ

مسکراہٹ تھی نہ داد۔ نہ اشک نہ کچھ۔

آخر ونود بہاری نے معاملے کی بات پوچھی۔ کہ اس ڈراما کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

سیٹھ جی نے اسی بے نیازانہ انداز میں جواب دیا۔ ''اس کے متعلق کل عرض کروں گا۔ کل یہیں کھانا بھی کھایئے گا۔ آپ لوگوں کے لائق کھانا تو کیا ہو سکے گا۔ اسے صرف بدر کا ساگ سمجھ کر قبول فرمایئے۔

جیسے ہی پانچوں باہر نکلے مارے خوشی کے سب کی باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ ونود نے کہا۔'' پانچ ہزار کی تھیلی ہے۔ ناک ناک بد سکتا ہوں۔

امر ناتھ : پانچ ہزار ہے کہ دس۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن رنگ خوب جما۔

رسک لال : میرا اندازہ تو چار ہزار تک ہے۔

مست رام : میرا تو یقین یہ\ہے کہ دس ہزار سے کم کہے گا ہی نہیں میں تو سیٹھ کے چہرے کی طرف یکسوئی سے دیکھ رہا تھا۔ آج ہی کہہ دیتا۔ لیکن مست خوب ہو رہا تھا۔

گورو پرشاد : میں نے پڑھا بھی تو جی توڑ کر۔

ونود : ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ کے گلے میں سرسوتی بیٹھ گئی ہو۔ سب کی آنکھیں کھل گئیں۔

روپیہ کے لالچ سے لکھا۔ ہمارے دوسرے ڈرامہ نویس بھی دولت کے لیے ہی لکھتے ہیں۔ ان میں وہ بات کہاں پیدا ہو سکتی ہے۔ جو بے غرضانہ لکھنے والوں میں پیدا ہو سکتی ہے۔ گوسائیں جی کی رامائن کیوں زندہ ہے؟ اس لیے کہ وہ بھگتی اور پریم سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ سعدی کی گلستا، بوستاں، ہومر کی تصنیفات اس لیے مقبول عام ہیں کہ ان لوگوں نے دل کی امنگ سے لکھا ہے۔ جو امنگ ہے وہ ایک ایک لفظ ایک ایک جملہ اور ایک ایک ترکیب پر مہینوں کاوش کرتا ہے۔ مگر بندۂ دولت کو تو ایک کام ختم کر کے دوسرے کو شروع کرنے کا فکر ہوتا ہے۔

ڈراماٹسٹ : آپ بجا فرماتے ہیں۔ ہمارے ادب کی تنزلی کا باعث بھی یہی ہے کہ ہم دولت کی غرض یا ناموری کے لیے لکھتے ہیں۔

سیٹھ جی : سوچیے۔ آپ نے دس ہزار صرف فن موسیقی کی تحصیل میں خرچ کر دیے۔ لاکھوں روپے گویوں اور اہل ہنر کی نذر کیے۔ کہاں کہاں سے اور کتنی جدوجہد سے اس ناٹک کا مصالحہ جمع کیا۔ نہ جانے کتنے والیان ریاست کو سنایا۔ اس جدو جہد اور جاں فشانی کی قیمت کون ادا کر سکتا ہے ؟

ڈراماٹسٹ : ممکن ہی نہیں۔ ایسی تصنیف کے معاوضہ کا تصور کرنا ہی ان کی توہین ہے۔ ان کا معاوضہ اگر کچھ ہے تو وہ اپنی روح کی تشفی ہے۔ اور وہ قناعت جو آپ کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہو رہی ہے۔

سیٹھ جی : آپ نے سچ کہا۔ ایسی تصنیف کا معاوضہ تسکین روح ہے۔ معاوضہ تو ایسی تصانیف کا بھی مل جاتا ہے۔ جو صحافت پر بدنما داغ ہیں۔ آپ ڈرامہ لے لیجیے۔ اور آج ہی پارٹ بھی تقسیم کردیجیے۔ تین مہینے کے اندر اسے کھیل ڈالنا ہو گا؟

میز پر مسودہ پڑا ہوا تھا۔ ڈرامہ ٹسٹ نے اسے اٹھالیا۔ گورو پرشاد نے نیم باز نگاہوں سے ونود کی طرف دیکھا۔ ونود نے امر کی جانب، امر نے رسک کی طرف۔ لیکن لفظ کسی کے منہ سے نہ نکلا۔ جیسے سیٹھ جی نے سب کے منہ سی دیے ہوں۔ ڈراما ٹسٹ صاحب کتاب لے کرچل دیے۔

سیٹھ جی نے مسکرا کر کہا۔ ''حضور کو تھوڑی سی تکلیف اور کرنی ہوگی۔ ڈراما کا ریہرسل شروع ہو نے پر آپ کو تھوڑے دنوں کمپنی کے ساتھ رہنے کی تکلیف گوارا کرنی پڑے گی۔ ہمارے ایکٹر بیشتر گجراتی ہیں۔ یہ ہندی زبان کے تلفظ کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتے۔ کہیں کہیں الفاظ پر بلا ضرورت زور دے دیتے ہیں۔ آپ کی نگرانی سے یہ تمام خامیاں دور ہو جائیں گی۔ اگر ایکٹروں نے پارٹ اچھا ادا نہ کیا تو آپ کی تمام محنت پر پانی پھر جائے گا۔

یہ کہتے کہتے اس نے لڑکے کو آواز دی۔ ''بولے آپ لوگوں کے لیے سگار لاؤ۔

سگار آ گئے۔ سیٹھ جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ دوستوں کی انجمن رخصت ہوجانے کا اشارہ تھا۔ پانچوں دوست بھی اٹھے۔ سیٹھ جی دروازے تک آئے پھر سب سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا:

''آج اس غریب کمپنی کا تماشا دیکھ لیجیے۔ پھر خدا جانے کب اتفاق ہو۔
گورو پرشاد نے جیسے کسی قبر کے نیچے سے کہا ہو۔'' ہوسکا تو آجاؤں گا۔
سڑک پر آکر پانچوں دوست ایک دوسرے کا منہ تاکنے لگے۔ تب پانچوں زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

ونود نے کہا۔'' یہ ہم سب کا ہی گورو گھنٹا ل نکلا۔''

امر : آنکھوں میں صاف دھول جھونک دی۔''

رسک : میں اس کی خاموشی دیکھ کر پہلے ہی سے ڈر رہا تھا کہ یہ کوئی اول درجہ کا گھاگھ ہے۔

مست : مان گیا اس کی کھوپڑی کو یہ چپت عمر بھر نہ بھولے گی۔

ددو پرشاد ان چہ میگوئیوں میں شامل نہ ہو سکے۔ وہ اس طرح سر جھکائے چلے جا رہے تھے۔ گویا وہ ان کے خیالات کی تہ تک ہی نہیں پہنچ سکے۔

یہ افسانہ پہلی بار ہندی ماہنامہ پربھا کے اپریل 1931 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مانسرور نمبر 4 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ آخری تحفہ میں شامل ہے۔ جنوری 1932 کے ہمایوں کے شمارے میں بھی شائع ہوا۔

کھیل

تیسرا پہر ہوگیا تھا۔ کسان اپنے کھیتوں میں پہنچ چکے تھے۔ درختوں کے سائے جھک چلے تھے۔ اوکھ کے ہرے ہرے کھیتوں میں جا بجا سارس آبیٹھے تھے پھر بھی دھوپ تیز تھی اور ہوا گرم۔ بچے ابھی تک لو کے خوف سے گھروں سے نہ نکلنے پائے تھے کہ یکا یک ایک جھونپڑے کا دروازہ کھلا اور ایک چار پانچ سال کے لڑکے نے دروازہ سے جھانکا۔ جھونپڑے کے سامنے نیم کے سایہ میں ایک بڑھیا بیٹھی اپنی کمزور آنکھوں پر زور ڈال ڈال کر ایک ٹوکری بن رہی تھی۔ بچے کو دیکھتے ہی اس نے پکارا۔ کہاں جاتے ہو پھندن۔ جاکر اندر سوؤ دھوپ بہت کڑی ہے۔ ابھی تو سب لڑکے سو رہے ہیں۔

پھندن نے ٹھنک کر کہا۔ اماں تو کھیت گونڈنے گئیں۔ مجھے اکیلے گھر میں ڈر لگتا ہے۔

بڑھیا گاؤں بھر کے بچوں کی دادی تھی۔ جس کا کام بچوں کی آزادی میں مخل ہوتا تھا۔ گڑھیا کے کنارے امیاں گری ہوئی ہیں۔ لیکن کوئی بچہ ادھر نہیں جاسکتا۔ گڑھیاں میں گر پڑے گا۔ بیر کا درخت سرخ و زرد بیروں سے لدا ہوا ہے۔ کوئی لڑکا اس پر چڑھ نہیں سکتا۔ پھسل پڑے گا۔ تالاب میں کتنا صاف پانی بھرا ہوا ہے۔ مچھلیاں اس میں پھدک رہی ہیں۔ کمل کھلے ہوئے ہیں۔ پر کوئی لڑکا تالاب کے کنارے نہیں جاسکتا۔ ڈوب جائے گا۔ اس لیے بچے اس کی صورت سے بیزار تھے۔ اس کی آنکھیں بچا کر سرک جانے کی حکمتیں سوچا کرتے تھے۔ مگر بڑھیا اپنے ہشت

سالہ تجربے سے ان کی ہر ایک نقل وحرکت کو تاڑ جاتی تھی۔ اور کوئی نہ کوئی پیش بندی کر لیتی تھی۔

بڑھیا نے ڈانٹا ''میں تو بیٹھی ہوں ڈر کس بات کا ہے۔ جا سو رہ نہیں اٹھتی ہوں۔

لڑکے نے دروازہ کے باہر آکر کہا.اب تو نکلنے کی بیلا ہوگئی۔

''ابھی سے نکل کے کہاں جاؤ گے۔''

''کہیں نہیں جاتا ہوں دادی۔''

وہ دس قدم اور آگے بڑھا۔ دادی نے ٹوکری اور سوجا رکھ دیا اور اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ پھندن نے چھلانگ ماری اور سوگز کے فاصلے پر تھا۔ بڑھیا نے اب سختی سے کام نہ چلتے دیکھ کر نرمی سے پکارا۔ ''ابھی کہیں مت جا بیٹے۔''

پھندن نے وہیں کھڑے کھڑے کہا۔ ''......کو دیکھنے جاتے ہیں۔'' اور بھاگتا ہوا گاؤں کے باہر نکل گیا۔

...... ایک ایک کھونچے والے کا نام ہے ادھر کچھ دنوں سے اس نے گاؤں کا چکر لگانا شروع کر دیا تھا۔ ہر روز شام کو ضرور آجاتا۔ گاؤس میں پیسوں کی جگہ اناج مل جاتا تھا۔ اور اناج اصل قیمت سے کچھ زیادہ ہوتا تھا۔ کسانوں کا انداز ہمیشہ فیاضی کی جانب مائل ہوتا ہے۔ اس لیے...... قریب کے قصبے سے تین چار میل کی مسافت طے کرکے آتا تھا۔ اس کے ......میں میٹھے اور نمکین سیو، تل یا رام دانے کے لڈو، کچھ بتاشے اور کھٹیاں، کچھ پٹی ہوتی تھی۔ اس پر ایک میلا سا بوسیدہ کپڑا پڑا ہوتا تھا مگر گاؤں کے بچوں کے لیے وہ خانۂ نعمت تھا۔ جیسے کھڑے ہوکر دیکھنے کے لیے سارے بچے بیتاب رہتے تھے۔ ان کی طفلانہ سرگرمیوں میں یہ ایک دلچسپ اضافہ ہوگیا تھا۔ سب کے سب تیسرے پہر ہی سے...... کا انتظار کرنے لگتے تھے۔ حالانکہ ایسے خوش نصیب لڑکے کم تھے، جنھیں اس خانہ نعمت سے حقائق فیض پہنچتا ہو۔ مگر کھونچے کے گرد جمع ہوکر خوان پوش کو آہستہ سے اٹھتے اور ان نعمتوں کی رانیوں کی طرح اپنی اپنی جگہ تکلف سے بیٹھے دیکھنا بجائے خود بے حد دل آویز تھا۔ حالانکہ...... اس کا آنا ہر ایک گھر میں کہرام مچا دیتا تھا۔ اور آدھا گھنٹہ سارے گاؤں

میں ہنگامہ سا برپا ہو جاتا تھا۔ مگر بچے اس کا خیر مقدم کر نے کے لیے مضطرب رہتے تھے۔ یہ جانتے ہوئے کہ ...... ان کی آمد ان کے لیے ہنسی کا نہیں؟ رونے کا موقع ہے۔ سب کے سب بڑی بے صبری سے اس کے منتظر رہتے تھے۔ کیونکہ مٹھائیوں کے درشن سے چاہے زبان آسودہ نہ ہو۔ روحانی تقویت ضرور ہوتی تھی۔ پھندن بھی انھیں غریب لڑکوں میں تھا۔ اور لڑکے مٹھائیاں کھاتے تھے۔ وہ صرف غرشنا نگاہوں سے دیکھتا تھا رونے اور روٹھنے، طفلانہ منت اور خوشامد ایک سے بھی اس کی مقصد براری نہ ہوتی تھی۔ گویا ناکامی ہی اس کی تقدیر میں لکھی ہو۔مگر ان ناکامیوں کے باوجود اس کا حوصلہ پست نہ ہوتا تھا۔

آج پھندن دوپہر کو نہ سویا .... نے آج کچی گبری اور امرتیاں لانے کا ذکر کیا تھا۔ یہ خبر لڑکوں کی اس دنیا میں کسی اہم تاریخی واقعہ سے کم نہ تھا۔ صبح ہی سے...... کی طرف دل لگا ہوا تھا۔ ایسی آنکھوں میں نیند کہاں سے آتی؟

پھندن نے باغ میں پہنچ کر سوچا۔ کیا ابھی سویرا ہے؟ اس وقت تو...... آجاتا تھا۔ مگر نہیں، ابھی سبیر ہے۔ چنو اور موہن اور کلو ایک بھی تو نہیں اٹھے۔ جیتن سڑک پر پہنچ گیاہوگا۔ امرتیاں ضرور لائے گا، سرخ اور چکنی ہوں گی۔ ایک بار نہ جانے کب...... ہاں دسہرے کے میلے میں ایک امرتی کھائی تھی۔ کتنی مزے دار تھی۔ اس ذائقہ کو یاد کر کے اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اشتیاق اور بھی تیز ہوگیا۔ وہ باغ کے آگے نکل گیا۔ اب سڑک ہموار میدان تھا۔ لیکن جیتن کا کہیں پتہ نہ تھا۔

کچھ دیر تک پھندن گاؤں کے نکاس پر کھڑا جیتن کی راہ دیکھتا رہا۔ اس کے دل میں ایک گدگدی اٹھی۔ آج میں سب سے پہلے جیتن کو پکاروں گا۔ میں جیتن کے ساتھ ساتھ گاؤں میں پہنچوں گا۔ تب لوگ کتنا چکرائیں گے؟ اس خیال نے اس کے اشتیاق میں بے صبری کا اضافہ کردیا۔ وہ تالیاں بجا بجاکر دل ہی دل میں چہکتا ہوا سڑک کی طرف چلا۔ اتفاق سے اسی وقت گیندا آگیا۔ وہ گاؤں کا پنچایتی کتا تھا، چوکیدار کا چوکیدار، کھلونا کا کھلونا، حسب معمول تیسرے پہر کا گشت لگانے نکلا تھا۔ اسی وقت سانڈ اور بیل کھیتوں میں گھستے تھے۔ یہاں پہنچا تو پھندن کو دیکھ کر رک گیا اور دم ہلا کر گویا پوچھا۔ تم آج یہاں کیوں آئے؟ پھندن نے اس کے سر پر تھپکیاں

دیں۔ مگر گیندا کو زیادہ بات چیت کرنے کی مہلت نہ تھی وہ آگے بڑھا تو پھندن بھی اس کے پیچھے دوڑا۔ اب اس کے دل میں ایک تازہ امنگ پیدا ہورہی تھی۔ وہ تنہا نہ تھا۔ اس کا رفیق بھی ساتھ تھا۔ وہ کچی سڑک پر جیتن کا خیر مقدم کرنا چاہتا تھا۔ سڑک پر پہنچ کر اس نے دور تک نگاہ دوڑائی۔ جیتن کا کہیں نشان نہیں تھا۔ کئی بار اسے وہم ہوا، وہ جیتن آرہا ہے۔ مگر ایک لمحے میں اس کا ازالہ ہوگیا۔ سڑک پر ناظری دلچسپیوں کی کمی نہ تھی۔ بیل گاڑیوں کی کتاریں تھیں۔ کبھی کبھی یکے اور پیر گاڑیاں بھی نکل جاتی تھیں۔ ایک بار ایک اونٹ بھی نظر آیا، جس کے پیچھے وہ کئی سو قدم تالیاں بجاتا گیا، مگر ان سریع السیر دلچسپیوں میں وہ اشتیاق کسی مینار کی طرح کھڑا تھا۔

سڑک کے کنارے دو رویہ درخت کھڑے تھے۔ اس میں آم کے درخت بھی تھے۔ اس اشتیاق میں اسے آموں پر نشانہ مارنے کا ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آیا۔ مگر آنکھیں جیتن کے لیے برسرراہ تھیں۔ یہ بات کیا ہے؟ آج وہ آ کیوں نہیں رہا ہے؟

رفتہ رفتہ سایا لمبا ہوگیا۔ دھوپ کسی تھکے ہوئے مسافر کی طرح پاؤں پھیلا کر سوتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اب تک جیتن کے آنے کی امید رہی۔ امید میں وقت اڑتا چلا جارہا تھا۔ مایوسی میں وہ گویا گھٹنے توڑ کر بیٹھ گیا۔ پھندن کی آنکھوں میں بے اختیار امید شکستہ کے آنسو بہنے لگے۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ جیتن کتنا بے رحم ہے۔ روز آپ ہی دوڑ آتا ہے۔ آج جب میں دوڑ آیا تو گھر بیٹھ رہا۔ کل آئے گا تو گاؤں میں گھسنے نہ دوں گا۔ اس کی طفلانہ آرزوئیں اپنی ساری ولولہ انگیزیوں کے ساتھ اس کے دل کو مسوسنے لگیں۔

دفعتاً اسے زمین پر ایک ٹوٹا ہوا چھبہ نظر آیا۔ اس یاس و ناکامی کے عالم میں بچپن کی فطری خوش باشی نے اندوہ روبائی کا سامان پیدا کر دیا۔ کچھ پتیاں چن کر چھبے میں بچھائیں۔ اس میں کچھ بجریاں اور کنکر چن کر رکھے۔ اپنا کرتا اتار کر اس کو ڈھانکا اور اسے سر پر رکھ کر گاؤں کی طرف چلا۔ اب وہ جیتن کا متلاشی لڑکا نہ تھا، خود جیتن تھا۔ وہی خانۂ نعمت سر پر رکھے اسی مہمل صدا لگاتا ہوا۔ رفتار بھی وہی،طرز کلام بھی وہی، جیتن کے آگے آگے چل کر کیا اسے یہ مسرت ہوسکتی تھی۔ جو

اس وقت جیتن بن کر ہو رہی تھی؟ وہ ہوا میں اڑا جا رہا تھا۔ سراب میں حقیقت کا مزہ لیتا ہوا۔ خوشی اسباب سے کس قدر بے نیاز ہے۔ اس کی چال کتنی مستانہ تھی؟ غرور سے اس کا سر کتنا اٹھا ہوا تھا۔

واقعیت کا اس کا طفلانہ چہرے پر ایسا ملمع تھا کہ کیا مجال ذرا بھی ہنسی آجائے۔ اس شان سے وہ گاؤں میں داخل ہوا۔ لڑکوں نے اس کی آواز سنی، ریوڑی لڑاکے دار، اور سب کے سب دوڑے آن کی آن میں پھندن مشتاق صورتوں سے محسور ہوگیا، اسی طرح جیسے جیتن ہوجاتا تھا۔ کسی نے نہ پوچھا، یہ کیا سوانگ ہے؟ دل نے دل کی بات سمجھی۔ مٹھائیوں کی خرید ہونے لگی۔ ٹھیکروں کے پیسے تھے۔ کنکر اور بجریوں کی مٹھائیاں۔ اس کھیل میں لطف کہیں زیادہ تھا۔ مادیت میں روحانیت کا انداز کہاں، مسرت کہاں، احساس پرواز کہاں؟ منا نے ایک ٹھیکرا دے کر کہا۔ ''جیتن ایک پیسہ کی کٹھیاں دے دو''

جیتن نے ایک پتہ میں تین چار رکھ کر دے دیے۔

کٹھیوں میں اتنی شرینی، اتنی لذت، کب حاصل ہوئی تھی؟

یہ افسانہ چندن، اپریل 1931 میں شائع ہوا۔ ہندی کے مجموعے اپراپیہ ساہتیہ میں شامل ہے۔

ہولی کا اُپہار

میکولال امرکانت کے گھر شطرنج کھیلنے آئے۔ تو دیکھا وہ کہیں باہر جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ پوچھا۔ کہیں باہر کی تیاری کر رہے ہو کیا بھائی؟ فرصت ہو، تو آؤ، آج دو چار بازیاں ہو جائے، امرکانت نے صندوق میں آئینہ۔ کنگھی رکھتے ہوئے کہا۔ نہیں بھائی، آج تو بالکل فرصت نہیں ہے۔ کل ذرا سسرال جا رہا ہوں۔ سامان۔اَمان ٹھیک کر رہاہوں۔

میکو تو آج ہی سے کیا تیار کرنے لگے؟ چار قدم توہے۔ شاید پہلی بار جا رہے ہو؟

امر۔ ہاں یار، ابھی ایک بار بھی نہیں گیا۔ میری اچھا تو ابھی جانے کو نہ تھی، پر سسر جی آگرہ کر رہے ہیں۔

میکو : تو کل شام کو اٹھنا اور چل دینا۔ آدھ گھنٹے میں تو پہنچ جاؤگے۔

امر : میرے ہردے میں تو ابھی سے جانے کیسی دھڑکن ہو رہی ہے۔ ابھی تک تو کلپنا میں پتنی۔ ملن کا آنند لیتا تھا۔ اب وہ کلپنا پرتیکش (ظاہر) ہوئی جاتی ہے۔ کلپنا سندر ہوتی ہے، پرتیکش (ظاہر) کیا ہوگا، کون جانے۔

میکو : تو کوئی سوغات لے لی ہے؟

خالی ہاتھ نہ جانا، نہیں منھ ہی سیدھا نہ ہوگا۔

امرکانت نے کوئی سوغات نہ لیا تھا۔ اس کلا میں ابھی ابھیست (رواجی) نہ ہوئے تھے۔

میکو بولا۔ تو اب لے لو بھلے آدمی۔پہلی بار جارہے ہو، بھلا وہ دل میں کیا کہے گی؟

امر : تو کیا چیز لے جاؤں؟ مجھے تو اس کا خیال ہی نہیں آیا۔ کوئی ایسی چیز بتاؤ، جو کم خرچ اور بالا نشین ہو، کیوں کہ گھر بھی روپے بھیجنے ہیں۔ دادا نے روپے مانگے ہیں۔

میکو ماں۔باپ سے الگ رہتا تھا۔ وینگیہ (مذاق) کر کے بولا۔ جب دادا نے روپے مانگے ہیں، تو بھلا کیسے ٹال سکتے ہو۔ دادا کا روپے مانگنا کوئی معمولی بات تو ہے نہیں؟

امرکانت نے وینگیہ (مذاق) نہ سمجھ کر کہا۔ ہاں، اسی وجہ سے تو میں نے ہولی کے لیے کپڑے بھی نہیں بنوائے۔ مگر جب کوئی سوغات لے جانا بھی ضروری ہے، تو کچھ نہ کچھ لینا ہی پڑے گا۔ ہلکے داموں کے کوئی چیز بتلاؤ۔

دونوں متروں میں وچار ویمے (تبدیلی سوچ) ہونے لگا۔ وشے بڑے ہی مہتو کا تھا۔ اسی ادھار پر بھاوی دامپتیہ جیون سکھ مے یا اس کے پرتکول (برخلاف) ہو سکتا تھا۔ پہلے دن بلی کو مارنا اگر جیون پر ستھائی پر بھاؤ ڈال سکتا ہے، تو پہلا اپہار کیا کم مہتو کا وشے ہے؟ دیر تک بحث ہوتی رہی، پر کوئی نشچیہ نہ ہوسکا۔

اسی وقت ایک پارسی مہیلا ایک نئے فیشن کی ساڑی پہنے ہوئے موٹر پر نکل گئی۔ میکو لال نے کہا۔ اگر ایسی ایک ساڑی لے لو وہ ضرور خوش ہوجائے۔ کتنا صوفیانہ رنگ ہے۔ اور وجہ کتنی نرالی۔ میری آنکھوں میں تو جیسے بس گئی۔ ہاشم کی دوکان سے لے لو۔ ۲۵/۔ میں آجائے گی۔

امرکانت بھی اس ساڑی پر مگدھ ہو رہا تھا۔ ودھو یہ ساڑی دیکھ کر کتنی پرسنے ہوگی اور اس کے گورے رنگ پر یہ کتنی کھلے گی، وہ اسی کلپنا میں مگن تھا۔ بولا۔ ہاں یار، پسند تو مجھے ہے، لیکن ہاشم کی دوکان پر تو ہو رہی ہے۔ تو ہونے دو۔ خریدنے والے خریدتے ہی ہیں اپنی اچھا ہے، جو چیز چاہتے ہیں، خریدتے ہیں، کسی کے بابا کا ساجھا ہے۔ امرکانت نے چھما (معافی) پرارتھنا (استدعا درخواست) کے بھاؤ سے کہا۔ یہ تو ستیہ ہے، لیکن میرے لیے سویم سیکوں کے بیچ دوکان میں جانا سمجھو نہیں

ہے۔ پھر تماشائیوں کی ہردم بھیڑ بھی تو لگی رہتی ہے۔ میکو نے مانوں اس کی کائرتا پر دیا کر کے کہا۔ تو پیچھے کے دوار سے چلے جانا وہاں پیکٹنگ نہیں ہوتی۔

''کسی دیشی دوکان پر نہ مل جائے گی؟''

''ہاشم کے دوکان کے سوا اور کہیں نہ ملے گی۔''

(۲)

سندھیا ہوگئی تھی۔ امین آباد میں آکرشن کا اودے ہو گیا تھا۔ سوریہ کی پرتیبھا ودھت پر کاش کے بن بلوں میں اپنی سمرتی (یادگار) چھوڑ گئی تھی۔ امرکانت دبے پاؤں ہاشم کی دوکان کے سامنے پہنچا۔ سویم سیکوں کا دھرنا بھی تھا اور تماشائیوں کی بھیڑ بھی۔ اس نے دو تین بار اندر جانے کے لیے کلیجہ مضبوط کیا، پر پھٹ پاتھ تک جاتے۔جاتے ہمت نے جواب دے دیا۔

مگر ساڑی لینا ضروری تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں خب گئی تھی۔ وہ اس کے لیے پاگل ہو رہا تھا۔

آخر اس نے پچھواڑے دوار سے جانے کا نشچیہ کیا۔ جاکر دیکھا، ابھی تک وہاں کوئی والنٹیر نہ تھا۔ جلدی سے ایک سپاٹے میں بھیترچلا گیا اور بیس پچیس منٹ میں اسی نمونے کی ایک ساڑی لے کر پھر اسی دوار پر آیا، پر اتنی ہی دیر میں پرستھتی (حالت) بدل چکی تھی۔ تین سویم سیوک آپہنچے تھے۔ امرکانت ایک منٹ تک دوار پر دودھے میں کھڑا رہا۔ پھر تیر کی طرح نکل بھاگا اور اندھا دھندھ بھاگتا چلا گیا۔ دربھاگیہ کی بات ہے۔ ایک بڑھیا لاٹھی ٹیکتی ہوئی چلی آرہی تھی۔ امرکانت اس سے ٹکرا گیا۔ بڑھیا گر پڑی اور لگی گالیاں دینے۔ آنکھوں میں چربی چھا گئی ہے کیا؟ دیکھ کرنہیں چلتے؟ یہ جوانی ڈھہ جائے گی ایک دن۔

امرکانت کے پاؤں آگے نہ جاسکے۔ بڑھیا کو اٹھایا اور اس سے چھما مانگ رہے تھے کہ تینوں سویم سیوکوں نے پیچھے سے آکر گھیر لیا۔ ایک ایک سویم سیوک نے ساڑی کے پیکٹ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ بلاتی کپڑا لے جائے کا حکم نہیں نا۔ بلائت ہے ۔تو سنت ناہی ہو۔

دوسرا بولا۔ آپ تو ایسے بھاگے، جیسے کوئی چور بھاگے؟
تیسرا : ہزارن منئی (انسان) پکر پکری کے جیہل میں بھرا جات ہیں، دیش میں آگ لگی ہے، اور ان کا من بلاتی مال سے نہیں بھرا۔
امرکانت نے پیکٹ کو دونوں ہاتھو ں سے مضبوط کر کے کہا۔ تم لوگ مجھے جانے دوگے یا نہیں۔
پہلے سویم سیوک نے پیکٹ پر ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ جائے کسن دیئی۔ بلاتی کپڑا لے کے تم یہاں سے کیوں نہیں جاسکتے ہو۔
امرکانت نے پیکٹ کو ایک جھٹکے میں چھڑا کر کہا۔ تم مجھے ہرگز نہیں روک سکتے۔

انھوں نے آگے قدم بڑھایا، مگر دو سویم سیوک ترنت اس کے سامنے لیٹ گئے۔ اب بے چارے بڑی مشکل میں پھنسے۔ جس وپتی سے بچانا چاہتے تھے، وہ زبردستی گلے پڑ گئی۔ ایک منٹ میں بیسوں آدمی جمع ہوگئے چاروں طرف سے ان پر ٹپیاں ہونے لگیں، کوئی جنٹل مین معلوم ہوتے ہیں۔
''یہ لوگ اپنے کو شکشت کہتے ہیں۔ چھیہ۔ اس دوکان پر سے روز دس۔پانچ آدمی گرفتار ہوتے ہیں، پر آپ کو اس کی کیا پرواہ۔
'کپڑا چھین لو اور کہہ دو' جاکر پولیس میں رپٹ کریں۔ بے چارے بیڑیاں سی پہنے کھڑے تھے۔ کیسے گلا چھوٹے۔ اس کا کوئی اپائے نہ سوجھتا تھا۔ میکو لال پر کرودھ آرہا تھا کہ اسی نے یہ روگ ان کے سر مڈھا انھیں تو کسی سوغات کی فکر نہ تھی۔ آئے وہاں سے کہ کوئی سوغات لے لو۔ کچھ دیر تک لوگ ٹپیاں ہی کرتے رہے، پھر چھین جھپٹ شروع ہوئی۔ کسی نے سر سے ٹوپی اڑا دی۔ اس کی طرف لپکے، تو ایک نے ساڑی کا پیکٹ ہاتھ سے چھین لیا۔ پھر وہ ہاتھوں ہات غائب ہوگئی۔
امرکانت نے بگڑ کر کہا۔ میں جا کر پولیس سے رپورٹ کرتا ہوں۔ ایک آدمی نے کہا۔ ہاں۔ہاں ضرور جاؤ اور ہم سبھی کو پھانسی چڑھوا دو۔
سہسا ایک یوتی کھدر کی ساڑھی پہنے ایک تھیلا لیے آنکلی۔ یہاں یہ ہڑدنگ دیکھ

کر بولی۔ کیا معاملہ ہے؟ تم لوگ کیوں اس بھلے آدمی کو دق کر رہے ہو؟ امرکانت کی جان میں جان آئی۔ اس کے پاس جا کر فریاد کرنے لگے۔ یہ لوگ میرے کپڑے چھین کر بھاگ گئے ہیں اور انھیں غائب کر دیا۔ میں اسے ڈاکہ کہتا ہوں، یہ چوری ہے ۔ اسے میں نہ ستیاگرہ کہتا ہوں، نہ دیش پریم۔

یوتی نے دلاسا دیا۔ گھبرایئے نہیں۔ آپ کے کپڑے مل جائیں گے، ہوں گے تو انھیں لوگوں کے پاس۔ کیسے کپڑے تھے۔

ایک سویم سیوک بولا۔ بہن جی، انھوں نے ہاشم کی دوکان سے کپڑے لیے ہیں۔

یوتی : کسی کی دوکان سے لیے ہوں، تمھیں ان کے ہاتھ سے کپڑا چھیننے کا کوئی ادھیکار نہیں ہے۔ آپ کے کپڑے واپس لادو۔ کس کے پاس ہے؟

ایک چھِن (لمحہ) میں امرکانت کے ساڑی جیسے ہاتھوں ہاتھ گئی تھی، ویسے ہی ہاتھوں ہاتھ واپس آگئی۔ ذرا دیر میں بھیڑ بھی غائب ہوگئی۔ سویم سیوک بھی چلے گئے۔ امرکانت نے یوتی کو دھنیہ واد دیتے ہوئے کہا۔ آپ اس سمے نہ آئی ہوتی تو ان لوگوں نے دھوتی تو غائب کر ہی دی تھی، شاید میری خبر بھی لیتے۔ یوتی نے سرل بھرتستنا کے بھاؤ سے کہا۔ جن سمپتی کا لحاظ سبھی کو کرنا پڑتا ہے، مگر آپ نے اس دوکان سے کپڑے لیے ہی کیوں؟ جب آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہاں ہمارے اوپر کتنا آتیاچار ہو رہا ہے، پھر بھی آپ نہ مانے۔ جو لوگ سمجھ کر بھی نہیں سمجھتے، انھیں کیسے کوئی سمجھائے۔

امرکانت اس سمے لجت ہو گئے اپنے متروں میں بیٹھ کر وے جو سوا کے راگ الاپا کرتے تھے، وہ بھول گئے۔ بولے۔ میں نے اپنے لیے نہیں خریدے ہیں، ایک مہیلا کی فرمائش تھی، اس لیے مجبور تھا۔

'ان مہیلا کو آپ نے سمجھایا نہیں؟'

'آپ سمجھاتیں، تو شاید پاتیں۔ میرے سمجھانے سے تو نہ سمجھیں۔'

'کبھی اوسر ملا، تو ضرور سمجھانے کی چیشٹا کروں گی۔ پرشوں کی نکیل مہیلاؤں کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کس محلے میں رہتے ہیں؟

'سعادت گنج میں۔'

'شبھ نام؟'

'امرکانت۔'

یوتی نے ترنت ذرا گھونگھٹ کھینچ لیا اور سر جھکا کر سنکوچ اور اسمیہ سے سنے سور میں بولی۔ آپ کی پتنی تو آپ کے گھر میں نہیں ہے، اس نے فرمائش کیسے کی؟

امرکانت نے چکت ہو کر پوچھا۔ آپ کس محلے میں رہتی ہیں؟ 'گھسیاری منڈی'

'آپ کا نام سکھدا دیوی تو نہیں ہے؟'

'ہو سکتا ہے، اس نام کی کئی استریاں ہیں' آپ کے پتا کا نام جوالا دت جی ہے؟'

'اس نام کے بھی کئی آدمی ہوسکتے ہیں۔'

امرکانت نے جیب سے دیا سلائی نکالی اور وہیں سکھدا کے سامنے اس ساڑی کو جلا دیا۔

سکھدا نے کہا۔ آپ کل آئیں گے؟

امرکانت نے اور ودھ کنٹھ سے کہا۔ نہیں سکھدا، جب تک اس کا پراشچیت نہ کر لوں گا، نہ آؤں گا۔

سکھدا کچھ اور کہنے جارہی تھی کہ امرکانت تیزی سے قدم بڑھا کر دوسری طرف چلے گئے۔

(۳)

آج ہولی ہے، مگر آزادی کے مت والوں کے لیے نہ ہولی ہے، نہ بسنت۔ ہاشم کے دوکان پر آج بھی پیکٹنگ ہورہی ہے، اور تماشائی آج بھی جمع ہیں۔ آج سے سیوم سیکوں میں امرکانت بھی کھڑے پیکٹنگ کر رہے ہیں۔ ان کی دیہہ پر کھدر کا کرتا ہے اور کھدر کی دھوتی۔ ہاتھ میں ترنگا جھنڈا لیے ہیں۔

ایک سویم سیوک نے کہا۔ پانی داروں کو یو بات لگتی ہے۔ کل تم کیا تھے۔ آج کیا ہو۔ سکھدا دیوی نہ آجاتیں، تو بڑی مشکل ہوتی۔

امر نے کہا۔ میں اس کے لیے تم لوگوں کو دھنیہ واد دیتا ہوں۔ نہیں میں آج یہاں نہ ہوتا۔

'آج تمھیں نہ آنا چاہیے تھا۔ سکھدا بہن تو کہتی تھیں' میں آج انھیں نہ جانے دوں گی۔'

'کل کے اپمان کے بعد اب میں انھیں منھ دکھانے یوگیہ نہیں ہوں۔ جب وہ رمنی ہو کر اتنا کر سکتی ہیں، تو ہم تو ہر طرح کے کشٹ اٹھانے کے لیے بنے ہی ہیں۔ خاص کر جب بال بچوں کا بھار سر پر نہیں ہے۔'

اسی وقت پولیس کی لاری آئی، ایک سب انسپکٹر اترا اور سیوم سیوکوں کے پاس آکر بولا۔ میں تم لوگوں کو گرفتار کرتا ہوں۔

'وندے ماترم' کی دھونی ہوئی۔ تماشائیوں میں کچھ ہلچل ہوئی۔ لوگ دو۔دو قدم ور آگے بڑھ آئے۔ سویم سیوکوں نے درشکوں کو پرنام کیا اور مسکراتے ہوئے لاری میں جابیٹھے۔ امرکانت سب سے آگے تھے۔ لاری چلنا ہی چاہتی تھی، کہ سکھدا کسی طرف سے دوڑی ہوئی آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پشپ مالا تھی، لاری کا دوار کھلا تھا۔ اس نے اوپر چڑھ کر وہ امرکانت کے گلے میں ڈال دی۔ آنکھوں سے اسنیہ اور غرو کی دو بوندیں ٹپک پڑیں۔ لاری چلی گئی۔ یہی ہولی تھی، یہی ہولی کا آنند ملن تھا۔ اسی وقت سکھدا دوکان پر کھڑی ہو کر بولی۔ والایتی کپڑے خریدنا اور پہننا دیش دروہ ہے۔

نوٹ: یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں مادھوری اپریل 1931 میں شائع ہوا۔ کفن میں شامل ہے۔ اردو میں شائع نہیں ہوا۔

تحریک

(۱)

میری کلاس میں سورج پرکاش سے زیادہ شریر لڑکا نہ تھا۔ بلکہ یوں کہو اپنی ملازمت کے دس سالوں میں مجھے ایسے ناہموار طالب علم سے سابقہ نہ پڑا تھا۔ فتنہ انگیزی میں اس کی جان بستی تھی۔ مدرّسوں کو بنانے اور چڑھانے، سرگرم طلبا کو ذلیل کرنے اور رلانے میں اسے مزا آتا تھا۔ ایسی ایسی سازشیں کرتا، ایسے ایسے پھندے ڈلاتا، ایسی ایسی بندشیں کرتا کہ عقل دنگ ہو جاتی تھی۔ گروہ بندی میں اسے خدا داد ملکہ تھا۔ خدائی فوجداروں کی ایک فوج بنالی تھی اور اس کے زور سے اسکول پر حکومت کرتا تھا۔ پرنسپل کا حکم ٹل جائے مگر کیا مجال کہ کوئی اس کے حکم سے سرموانحراف کر سکتے۔ جینامحال کر دیتا تھا۔ اسکول کے چپراسی اور اردلی اس سے تھر تھر کانپتے تھے۔ انسپکٹر کا معائینہ ہونے والا تھا۔ پرنسپل صاحب نے حکم دیا کہ لڑکے معین وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے آجائیں۔ منشا یہ تھا کہ لڑکوں کو معائینہ کے متعلق کچھ ضروری ہدایتیں کر دیں۔ مگر دس بج گئے انسپکٹر صاحب آکر بیٹھ گئے اور مدرسہ میں ایک لڑکا بھی نہیں! گیارہ بجے خود بخود سب لڑکے اس طرح نکل پڑے جیسے کوئی پنجرہ کھول دیا گیا ہو۔ انسپکٹر صاحب نے کیفیت میں لکھا۔ ڈسپلن بہت خراب ہے۔ پرنسپل صاحب کی کرکری ہوئی، مدرسین بدنام ہوئے اور یہ ساری شرارت سورج پر کاش کی تھی۔ مگر ہر چند تحقیقات کی گئی سورج پرکاش کا کسی نے نام تک نہ لیا۔ مجھے اپنی

تنظیم پر غرّہ تھا۔ ٹریننگ کالج میں اس صیغہ میں میں نے امتیاز حاصل کیا تھا مگر یہاں میری ساری تنظیمی قابلیت میں زنگ سا لگ گیا تھا۔ کچھ عقل ہی کام نہ کرتی کہ اس شیطان کو کیسے راہ راست پر لاؤں۔ کئی بار مدرسوں کی میٹنگ ہوئی پر یہ عقدہ نہ حل ہوا۔ نئے اصولِ تعلیم کے مطابق میں جور استاد کا قائل نہ تھا پر یہاں ہم اس طرزِ عمل سے محض اس لیے محترز تھے کہ کہیں علاج مرض سے بدتر نہ ہو جائے۔ سورج پرکاش کو اسکول سے نکال دینے کی تجویز بھی گئی پر اسے شکست کا اعتراف سمجھ کر ہم اس پر عمل کرنے کی جراُت نہ کر سکے۔ بیس بائیس سند یافتہ آزمودہ کار آمد مدرّس ایک بدمعاش بارہ تیرہ سال کے لڑکے کی اصلاح نہ کر سکیں۔ یہ خیال حد درجہ شرمناک تھا۔ یوں تو سارا اسکول اس سے بیزار تھا مگر سب سے زیادہ پریشان میں تھا۔ کیوں کہ وہ میرے درجہ کا طالب علم تھا اور اس کی شرارتوں کا خمیازہ زیادہ تر مجھے اٹھانا پڑتا تھا۔ اسکول آتا تو یہ ہی اندیشہ لگا رہتا کہ دیکھیں آج کیا شگوفہ کھلتا ہے۔ ایک دن اپنی میز کی دراز کھولی تو اس میں سے ایک بڑا سا مینڈک نکل پڑا۔ میں چونک کر پیچھے ہٹا تو گرتے گرتے بچا۔ کلاس میں ایک شور برپا ہو گیا مگر ''قہر درویش بر جان درویش''سورج پرکاش کی طرف غضب ناک معذوری کی نگاہ ڈال کر رہ گیا۔ سارا گھنٹہ پندو نصیحت میں گزر گیا اور بد معاش سر جھکائے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ وہ نیچے کی جماعتوں سے پاس ہو کر کیوں میرے درجہ تک آیا تھا؟ اس میں ابتدائی درجوں تک کی لیاقت بھی نہ تھی۔ آٹھویں درجہ تک آپہنچا اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہر سال پاس ہوتا چلا آتا ہے پاس کیوں کر ہوتا تھا؟ خدا ہی جانے۔

ایک دن میں نے غصہ سے کہا ''تم اس درجہ سے عمر بھر پاس نہیں ہوسکتے''۔

سورج پرکاش نے پر اطمینان اور لاپرواہی سے کہا ''آپ میرے پاس ہونے کی فکر نہ کریں، میں ہمیشہ پاس ہوتا رہا ہوں اور اب کے بھی پاس ہوں گا''۔

غیر ممکن۔

غیر ممکن ممکن ہو جائے گا۔

میں استعجاب سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ ذہین سے ذہین لڑکا بھی اپنی کامیابی کا

دعویٰ اتنے استحکام کے ساتھ نہ کر سکتا تھا۔ معاً خیال آیا یہ امتحانی پرچے اڑا لیتا ہوگا ممتحنوں کے نوکروں یا لڑکوں سے مل کر کچھ لالچ دے کر پرچے نقل کر لیتا ہوگا۔ میں نے عہد کیا اب کے میں اس کی ایک بھی چال نہ چلنے دوں گا۔ دیکھوں کتنے دن اس درجہ میں پڑا رہتا ہے آپ گھبرا کر نکل بھا گے گا۔

سالانہ امتحان کے موقعہ پر میں نے غیرمعمولی احتیاط سے کام لیا مگر سورج پرکاش کی کاپی دیکھی تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میرے دو پرچے تھے دونوں ہی میں اس کے نمبر درجہ میں سب سے زیادہ تھے اور ممتحنوں کے پرچے شاید اتنے اچھے نہ کئے تھے مگر پاس سب پرچوں میں تھا۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ وہ میرے کسی پرچے کا کوئی سوال بھی حل نہیں کر سکتا۔ میں اسے ثابت کر سکتا تھا مگر اس کے جوابی پرچوں کو کیا کرتا۔ تحریر میں اتنا فرق نہ تھا جو کوئی شبہ پیدا کر سکتا امتحان میں اکثر لڑکوں کی تحریر عجلت کے باعث کچھ نہ کچھ مختلف ہو ہی جاتی ہے۔ میں نے پرنسپل صاحب سے کہا وہ بھی چکرا گئے مگر انھیں بھی دیدہ دانستہ مکھی نگلنی پڑی۔ میں شاید معمول سے زیادہ مایوس طبیعت ہوں اور مدرّسوں کو میں سورج پرکاش کے بارے میں ذرا بھی متردد نہ پاتا تھا۔ گو یا ایسے لڑکوں کا اسکول میں آنا کوئی غیرمعمولی بات نہیں مگر میرے لیے وہ ایک ہیجان انگیز معمّہ تھا۔ اگر اس کے اطوار یہی رہے تو ایک دن یا تو جیل میں ہو گا یا جیل کے راستہ میں۔

(۲)

اسی سال میرا تبادلہ ہو گیا یہاں کی آب و ہوا مجھے موافق تھی پرنسپل اور دوسرے ماسٹروں سے یارانہ ہو گیا تھا اور ہر ایک قسم کی چیز ارزاں تھی مگر میں اپنے تبادلہ سے خوش ہوا کیوں کہ سورج پرکاش سے میری گلوخلاصی ہوجائے گی، لڑکے مجھ سے مایوس ہو گئے تھے، ان کی طرف سے مجھے رخصتی دعوت دی گئی اور سب کے سب مجھے اسٹیشن تک پہنچانے آئے۔ اس وقت سبھی لڑکوں کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، میں بھی اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکا۔ اتفاق سے اسی وقت میری نگاہ سورج پرکاش پر پڑی جو سب سے پیچھے کچھ نادم کھڑا تھا۔ مجھے ایسا معلوم

ہوا کہ اس کی آنکھ میں بھی آنسو بھرا ہوا تھا۔ میرا جی بار بار چاہتا تھا کہ اس سے چلتے چلتے دو چار باتیں کر لوں شاید وہ بھی مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر نہ میں نے پیش قدمی کی اور نہ اس نے۔ حالانکہ مجھے بہت دنوں تک اس کا افسوس رہا۔ اس کا حجاب قابل معافی ہے۔ اس نے مجھے ناراضگی کے بے شمار موقعہ دیے تھے میرا احتراز ناقابل عفو تھا۔ ممکن تھا کہ اس وقت اور ندامت کے عالم میں دو چار خلوص کی باتیں اس کی دل پر اثر کرجاتیں مگر انھیں کھوئے موقعوں کا نام تو زندگی ہے۔ گاڑی آہستہ آہستہ چلی۔ لڑکے کئی قدم اس کے ساتھ دوڑے۔ میں کھڑکی کے باہر سے سر نکالے کھڑا تھا۔ کچھ دیر تک مجھے ان کے ہلتے ہوئے رومال نظر آئے پھر وہ صورتیں حباب کی طرح مٹ گئیں مگر ایک ننھی سی مورت اب بھی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ میں نے قیاس کیاوہ سورج پرکاش ہے اس وقت میرا دل کسی بے تاب قیدی کی طرح نفرت کدورت اور مغائرت کی بندشوں کو توڑ توڑ کر اس سے گلے ملنے کے لیے تڑپ اٹھا۔

نئے مقام کی نئی دلچسپیوں اور مصروفیتوں نے مجھے بہت جلد اپنی جانب مائل کرلیا۔ تصنیف وتالیف کا شوق پیداہوا۔ پچھلے دنوں کی یاد ایک حسرت بن کر رہ گئی،جس میں درد اور لذّت تو تھی مگر تحریک عمل نہیں۔ نہ کسی کا کوئی خط آیا نہ میں نے کوئی خط لکھا شاید دنیا کا یہی دستور ہے۔ برسات کے بعد برسات کی ہریالی کتنے دنوں قائم رہتی ہے، عارضی صحبتوں کا یہی انجام ہے۔خیر اتفاق سے مجھے انگلینڈ میں تکمیل تعلیم کا ایک موقعہ ہاتھ آ گیا۔ وظیفہ ملا۔ انگلینڈ پہونچ گیا۔ وہاں تین سال لگ گئے۔وہاں سے لوٹا تو اپنے وطن سے بہت دور ایک کالج کا پرنسپل مقرر ہوا۔ یہ فروغ میرے لیے بالکل غیر متوقع تھا خواب میں بھی میرے تخیل نے اتنی بلند پروازی نہ کی تھی مگر حرص رفعت اب کسی بلند ترشاخ پر اپنا آشیانہ بنانا چاہتا تھا۔ وزیر تعلیم سے ربط ضبط پیدا کی، یارانہ بڑھا، میں نے بھی ان کے بنگلہ سے متصل بنگلہ لیا۔ منسٹر صاحب میرے کرم فرما ہیں، ان کی شان میں کوئی بے ادبی نہیں کرنا چاہتا مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ وزیر تعلیم ہوکر تعلیم کے اصولی امورسے واقف نہ تھے۔ گھوڑے پر سوار وہ تھے پر عنان میرے ہاتھ میں تھی اور یہ کھلا ہوا راز تھا۔ نتیجہ یہ

ہوا کہ ان کی سیاسی مخالفین سے میری مخالفت ہوگئی۔ مجھ پر جا بے جا حملے کیے جانے لگے۔ میں خلوص کے ساتھ اصلاح وفلاح کی تجویز پیش کرتا اس کی مخالفت کی جاتی۔ میں اصولاً جبری اصلاح کا مخالف ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ہر ایک انسان کو ان معاملات میں زیادہ سے زیادہ آزادی ہونی چاہیے جن کا تعلق ان کی ذات سے ہے بہت ممکن ہے میں غلطی پر ہوں لیکن میں جبری تعلیم کا قائل نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یورپ میں اس کی ضروت ہے ہندوستان میں نہیں۔ ماڈیت مغربی تہذیب کی روح ہے وہاں کسی کام کی تحریک مالی فائدے کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ ضروریات زندگی زیادہ ہیں۔ اس لیے کشمکش حیات بھی زیادہ دلکش۔ والدین ضرورتوں کے غلام ہو کر بچوں کو جلد سے جلد کسب معاش پرمجبور کرتے ہیں بجائے اس کے کہ وہ شراب ترک کر کے ایک شلنگ روز کی بچت کرلیں۔ وہ اپنے کمسن بچے کو ایک شلنگ کی مزدوری کرنے کے لیے مجبور کریں گے۔ ہندوستان میں زندگی فقیرانہ سادگی کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔ ہم اس وقت تک اپنے بچوں سے مزدوری نہیں کراتے جب تک کہ حالات ہمیں مجبور نہ کریں۔ ہم بھوکے رہیں گے، ننگے رہیں مگر لڑکوں سے مزدوری نہ کرائیں گے تا وقتیکہ فاقہ کشی کی نوبت نہ پہنچے۔ غریب سے غریب اور بے نوا سے بے نوا ہندوستانی مزدور بھی تعلیم کی برکات کا قائل ہے اس کے دل میں یہی تمنا ہے کہ میرا بچہ چار حرف پڑھ جائے اس لیے نہیں کہ اسے کوئی رتبہ حاصل ہوگا۔ بلکہ محض اس لیے کہ علم انسانی خصلت کا ایک زیور ہے۔ تعلیم کے فوائد اسے سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ یہ علم ہونے پر بھی اپنے بچے کو مدرسے نہیں بھیجتا تو سمجھ لینا چاہیے کہ کوئی مجبوری حاصل ہے۔ ایسی حالت میں قانوناً اسے مجبور کرنا میری نگاہ میں قرین انصاف نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے کہ آپ اس کے فرائض پدری کو تشویش سے بے دار کردیں اس کے علاوہ میرے خیال میں ابھی تعلیم کے وہ عناصر ملک میں ناکافی ہیں جن سے تعلیم کی فضیلت ہے۔ نیم تعلیم یافتہ فاقہ کش مدرسوں سے آپ یہ امید نہیں کر سکتے کہ وہ کوئی اونچا معیار پیش نظر رکھ سکیں۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہو گا کہ چار پانچ سال میں لڑکا حرف شناس ہو جائے گا۔ میں اسے ''کوہ کندن و کاہ برآوردن'' کے مصداق سمجھتا ہوں۔ سن شعور میں یہ مرحلہ

ایک مہینہ میں آسانی سے طے کیا جاسکتا ہے۔ میں تجربہ سے کہہ سکتا ہوں کہ اٹھارہ بیس سال کی عمر میں ہم جتنا ایک مہینہ میں پڑھ سکتے ہیں اتنا چھ سات سال کی عمر میں تین سال میں بھی نہیں پڑھ سکتے۔ پھر خواہ مخواہ بچوں کو مدرسے میں قید کرانے سے فائدہ؟ یوں چاہیے کہ اسے روٹیاں نہ ملتیں مگر تازہ ہوا تو ملتی۔ فطرت سے تجربات تو حاصل کرتا۔ مدرسہ میں بند کرکے تو آپ اسے ذہنی اور جسمانی دونوں ترقیوں سے ہی محروم کر دیتے ہیں۔ اس لیے جب صوبہ کی کونسل میں جبری تعلیم کی تجویز پیش ہوئی تو میری تحریک منسٹر صاحب نے اس کی مخالفت کی۔ گورنمنٹ تو مخالفت پر پہلے ہی آمادہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بل مسترد ہو گیا پھر کیا تھا منسٹر صاحب کی اور میری وہ لے دے شرع ہوئی کہ الاماں! ایک طوفان برپا ہو گیا۔ ذاتیات پر حملے کئے جانے لگے۔ میں ''عضو ضعیف'' تھا اس لیے نزلہ مجھی پر گرا۔ مجھے ملک کا بد خواہ،ترقی کا دشمن، قومی غدّار اور گورنمنٹ کا گداگر بنا یا گیا۔ کئی اخباروں میں آبروریز کارٹون بھی نکلے۔ میرے کالج میں ذراسی بھی کوئی بات ہوتی تو کونسل میں اس پر سوالوں کی بارش شروع ہو جاتی۔ میں نے ایک چپراسی کو برخاست کیا۔ ممبر اصحاب پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑگئے۔ اعتراضات کا تانتا بندھ گیا۔ یہاں تک کہ منسٹر کو مجبور ہو کر اس چپراسی کو بحال کرنا پڑا۔ میں یہ توہین برداشت نہ کرسکا۔ شاید کوئی بھی نہ کرسکتا۔ منسٹر صاحب سے مجھے شکایت نہیں وہ مجبور تھے۔ ان حالات میں کام کرنا میرے لیے مشکل ہو گیا۔ تحمل اور ضبط کی بھی کوئی انتہا ہے۔ مجھے اپنے کالج کی اندورنی تنظیم کا بھی اختیار نہیں۔ فلاں کیوں امتحان میں بھیجا گیا؟ فلاں کے عوض فلاں کو کیوں وظیفہ نہیں دیا گیا؟ فلاں پروفیسر کو فلاں کلاس کیوں نہیں دی جاتی؟ اس طرح کے بے معنی، مہمل اور لچراعتراضات نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اس نئی چوٹ نے تسمہ بھی الگ کر دیا۔ میں نے استعفیٰ دے دیا۔ مخالفین کو یہ صبر کہاں کہ وہ مجھے عزت کے ساتھ چلا جانے دیتے۔ میری برطرفی کا فیصلہ کیا گیا۔ مجھے منسٹر صاحب سے اتنی امید ضرور تھی کہ وہ کم سے کم اس معاملہ میں انصاف اور حق سے کام لیں گے مگر انھوں نے حق کی بجائے مصلحت کو مقدم سمجھا اور مجھے کئی سال مخلصانہ رفاقت کا صلہ یہ ملا کہ میری برطرفی کا نوٹس آپہنچا۔ دنیا کا ایسا تلخ

تجربہ اب تک مجھے نہ ہوا تھا تقدیر بھی کچھ برگشتہ تھی اسی دوران میں بیوی کا انتقال ہو گیا۔ آخری دیدار بھی نہ کرسکا۔ شام کو دریا کنارے سیر کرنے گیا ہوا تھا ان کی طبیعت کچھ کسل مند تھی۔ لوٹا تو ان کی لاش ملی۔ شاید قلب کی حرکت بند ہو گئی تھی۔ اس سانحہ نے کمر توڑدی۔ ماں کے فیض اور اثر سے بڑے بڑے انسان سرفراز ہوئے۔ میں جو کچھ ہوا بیوی کے فیض اور اثر سے ہوا۔ وہ میری تقدیر کا معمار تھی۔ کتنی بلند حوصلہ تھی ! کتنی آہنی ہمت! کتنا ملکوتی ایثار! اس شرینی میں تلخی کا نام بھی نہ تھا۔مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے اسے کبھی چیں بجبیں دیکھا ہو۔ ہمیشہ ہر حالت میں صابر اور خوش تھی مگر اس کے ساتھ ہی ترقی کی ایک تحریک باطن اس کے ایک ایک قطرۂ خون میں بھری ہوئی تھی۔ مایوس ہونا تو جانتی ہی نہ تھی۔ میں کئی بار سخت بیمار پڑا ہوں معالجوں پر بھی مایوسی کا غلبہ ہو گیا پر اس کے سکون واطمینان میں شمہ بھر پھر بھی تزلزل نہ ہو۔ اسے اعتقاد تھا میں اپنے شوہر کی حیات میں مروں گی۔ اور وہی ہوا۔ میں زندگی میں اسی کے سہارے اب تک کھڑا تھا۔جب وہ سہارا ہی نہ رہا تو زندگی کہاں رہتی۔کھانے اور سونے کا نام زندگی نہیں ہے۔ زندگی نام ہے ہمیشہ آگے بڑھتے رہنے کی، لگن کا۔ وہ لگن غائب ہو گئی۔ میں نے دنیا سے منھ موڑ لیا اور گوشۂ گمنامی میں زندگی کے دن پورے کرنے کا ارادہ کر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں مقیم ہو گیا۔ چاروں طرف اونچے ٹیلے تھے ایک طرف گنگا بہتی تھی۔ میں نے دریا کے کنارے ایک چھوٹا سا مکان بنالیا اور اس میں رہنے لگا۔

(۳)

مگر اہل دنیا یہاں بھی مجھے دق کرنے کے لیے کبھی کبھی پہنچ جاتے تھے۔ کسی کو کوئی میموریل لکھنا ہوتا تو میرے پاس آتا۔ کبھی کبھی اخباروں کے نامہ نگاروں اور پبلشروں کے ایجنٹ بھی سر پر سوار ہو جاتے تھے ان کے پاس خاطر سے کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑتا تھا۔ دل بستگی کے لیے میں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ کھول لیا تھا۔ ایک درخت کے نیچے گاؤں کے لڑکوں کو جمع کرکے کچھ پڑھایا کرتا تھا۔ اس کا یہاں اتنا شہرہ ہوا کہ آس پاس کے مواضعات کے نوجوان بھی آنے لگے۔

ایک روز میں اپنی کلاس پڑھا رہا تھا کہ موٹر آ کر رکی۔ حلقہ کا سب انسپکٹر تحصیلدار گھوڑوں پر سوار پیچھے دوڑے چلے آتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ اس ضلع کے ڈپٹی کمشنر ہیں۔ میں اس وقت محض ایک کرتہ اور دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ اس ہیٔت مین ایک حاکم سے ملتے ہوئے شرم آ رہی تھی۔مگر کپڑے منگانے کا موقعہ نہ تھا۔ ڈپٹی کمشنر صاحب اپنی موٹر سے اتر پڑے اور میری طرف بڑھے۔ میں نے جھینپتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ مگر مجھ سے ہاتھ ملانے کے بدلے میرے پیروں کی طرف جھکے۔ اور ان پر سر رکھ دیا۔ میں کچھ ایسا سٹپٹا گیا کہ میرے منھ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ میں انگریزی اچھی لکھتا ہوں، ولایت ہو آیا ہوں، فلسفہ میں مجھے اچھا دخل ہے۔ تقریر بھی خوب کر لیتا ہوں۔ مگر ان میں سے کوئی بات بھی تقدس کے قابل نہیں۔ وہ درجۂ تو عارف اور کامل کو ہی ہے۔ اگر میں برہمن ہوتا تو بھی ایک بات تھی حالانکہ ایک سویلین کا کسی برہمن کے پیروں پر سر رکھنا خیال میں بھی نہیں آتا۔ میں ابھی اسی حیرت میں پڑا ہوا تھا کہ اس نے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر بولا'' آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں''؟

اب میں نے اس کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا توصورت مانوس معلوم ہوئی اسے ضرور کہیں دیکھا ہے۔

دفعتاً حافظہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ بولا آپ کا نام پرکاش تو نہیں ہے ؟

''جی ہاں! میں آپ کا وہی نالائق شاگرد ہوں مگر آپ نے خوب پہچانا۔ مجھے امید نہ تھی۔ میں ۱۶ء میں اس اسکول میں تھا۔ بارہ تیرہ سال ہو گئے

سورج پرکاش نے مسکرا کر کہا'' ماسٹر لڑکوں کو بھول جاتے ہیں مگر لڑکے انھیں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں''۔

میں نے اسی مذاق کے انداز سے جواب دیا۔ ''تم ایسے لڑکوں کو بھولنا مشکل ہے''۔

سورج پرکاش انھیں خطاؤں کی معافی مانگنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میں ہمیشہ آپ کا سراغ لگاتا رہتا تھا۔ جب آپ انگلینڈ گئے تب میں نے آپ کے لیے مبارک باد لکھی مگر اسے بھیجنے کی ہمت نہ پڑی۔ جب آپ پرنسپل ہوئے اس وقت

میں انگلینڈ جانے کو تیار تھا ورنہ ضرور حاضر ہوتا۔ وہاں میں آپ کے مضامین اخباروں میں پڑھتا تھا۔ جب لوٹا تو معلوم ہوا کہ آپ نے استعفیٰ دے دیا اور کہیں دیہات میں چلے گئے ہیں۔ اس ضلع میں آئے مجھے ایک سال سے زیادہ ہوا مگر اس کا مطلق گمان نہ تھا کہ آپ اس ویرانے میں پڑے ہوئے ہیں آج باتوں ہی باتوں میں کسی زمیندار نے آپ کا ذکر کیا۔ آپ کا نام تو اسے معلوم نہ تھا مگر اس نے جو حلیہ بیان کیا اس سے مجھے معاً آپ کا خیال آیا۔ ڈاک خانہ میں دریافت کیا تو آپ کے نام کی بھی تحقیق ہو گئی دوڑا چلا آرہا ہوں۔ آپ تو بالکل تارک الدنیا ہو گئے اس کو ردیہہ میں آپ کی طبیعت کیسے لگتی ہے؟ ابھی تو آپ کی عمر ۴۲/ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ بان پرست کا زمانہ تو ۶۰/ کے بعد آتا ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ سورج پرکاش کا عروج دیکھ کر مجھے کتنی استعجاب آمیز مسرت حاصل ہوئی۔ اگر وہ میرا بیٹا ہوتا تو بھی مجھے اس سے زیادہ خوشی نہ ہوتی میں اسے اپنے جھونپڑے میں لایا اور اس سے چند لفظوں میں اپنی رام کہانی سنائی۔

سورج پرکاش نے کہا'' تو یہ کہیے کہ آپ اپنے ہی ایک بھائی کی بے وفائی کا شکار ہوئے۔ میرا تجربہ تو ابھی بہت ہی مختصر ہے مگر اتنے ہی دنوں میں مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ہم لوگ ابھی اپنی ذمّہ داریوں کو پورا کرنا اور اپنے قول کو نبھانا نہیں جانتے۔ جہاں دیکھیے وہاں خود غرضی منسٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو پوچھوں گا یہی انسانیت اور ہمدردی کا تقاضا تھا۔

میں نے جواب دیا'' بھئی ان کی کوئی خطا نہیں ممکن ہے اس حالت میں میں بھی وہی کرتا جو انھوں نے کیا۔ مجھے اپنی ہوس پروری کی سزا مل گئی ہے اور اس کے لیے میں ان کا مشکور ہوں۔ تصنع نہیں۔ میں دل سے کہتا ہوں کہ یہاں مجھے جتنا سکون اور اطمینان ہے اتنا کبھی نہ تھا۔ اس گوشۂ قناعت میں مجھے حقائق زندگی کا وہ علم ہوا جو ثروت اور جاہ کی دوڑ میں کسی طرح ممکن نہ تھا۔ فلسفہ اور تاریخ کے دفتر چاٹ کر اور یورپ کی یونیورسٹیوں کی خوشہ چینی کرکے بھی میں اپنی خود پروری کا ازالہ نہ کرسکا۔ بلکہ یہ مرض روز بروز زیادہ سنگین ہوتا جاتا تھا۔ آپ زینوں پر پاؤں رکھے بغیر سقف کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتے۔ ثروت کی دوڑ میں دوسرے

انسانوں کی زندگیاں ہی زینوں کا کام دیتی ہیں آپ انھیں کچلے بغیر منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں انسانیت، شرافت اور ہمدردی کا ذکر ہی کیا؟ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت میں درندوں کے بیچ میں تھا اور میری ساری قوتیں اپنی حفاظت کرنے میں صرف ہوجاتی تھیں۔ یہاں میں اپنے چاروں طرف خلوص اور سادگی دیکھتا ہوں۔ میرے پاس جو لوگ آتے ہیں کوئی کمینہ غرض لے کر نہیں آتے اور نہ میری خدمات میں صلہ یاستائش کی تمنا ہے۔ میں بھی کسی کے پاس جاتا ہوں تو کوئی غرض لے کر نہیں جاتا۔ مجھے یہاں کے درودیوار اور برگ و بار میں بھی خلوص کی جھلک نظرآتی ہے۔

یہ کہہ کر میں نے سورج پرکاش کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا مگر شرارت آمیز تبسم کی جگہ پشیمانی کا رنگ تھا۔ مجھ سے قناعت کا سبق لینے وہ میرے پاس نہ آیا تھا شاید یہ دکھانے آیا تھا کہ آپ نے جسے اتنا حقیر سمجھا تھا وہ اب اس درجہ پر ہے۔ وہ مجھ سے اپنے سعیٔ جمیل کی داد چاہتا تھا۔ مجھے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا ایک صاحب ثروت کے روبرو ثروت وجاہ کی مذمت زیبا نہیں۔ میں نے فوراً سلسلۂ تقریر بدل کر کہا ''مگر تم اپنا حال تو کہو تمھاری یہ کایا پلٹ کیوں کر ہوئی؟ تمھاری شرارتوں کو یاد کرتا ہوں تو اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یکایک یہ انقلاب کیسے ہوا؟ کسی فقیر کے سوا اور توکوئی طاقت یہ معجزہ نہ دکھا سکتی تھی۔

سورج پرکاش نے مسکرا کر کہا'' آپ کی دعا تھی''۔

''دعا نہیں بددعا ہو سکتی تھی''۔

''ابھی اس حد تک دنیا سے بیزار نہیں ہوا ہوں''۔

آخر میرے بار بار اصرار کرنے پر سورج پرکاش نے اپنا قصہ کہنا شروع کیا۔

''آپ کے چلے آنے کے کئی روز بعد میرا ماموں زاد بھائی اسکول میں داخل ہوا اس کی عمر آٹھ نوسال سے زائدنہ تھی۔ پرنسپل صاحب اسے ہوسٹل میں نہ لیتے تھے اور نہ ماموں صاحب اس کے رہنے کا کوئی دوسرا انتظام کر سکتے تھے۔ انھیں اس پریشانی میں دیکھ کر میں نے پرنسپل صاحب سے کہا اسے میرے کمرے میں ٹھہرا دیجیے۔ پرنسپل صاحب اس پر راضی نہ ہوئے کہنے لگے یہ قاعدہ کے خلاف ہے۔ میں

بھلا ان کی حکومت کب برداشت کر سکتا تھا میں نے اسی دن ہوسٹل چھوڑ دیا اور اپنے ماموں زاد بھائی کو لے کر ایک دوسرے مکان میں رہنے لگا۔ زائد خرچ کا بار ماموں صاحب نے لیا۔ لڑکے کا نام موہن تھا۔ اس کی ماں کئی سال پہلے ہی مر چکی تھی اتنا دبلا پتلا کمزور اور غریب لڑکا تھا کہ پہلے ہی دن سے مجھے اس پر رحم آنے لگا۔ کبھی اس کے سر میں درد ہوتا، کبھی بخار آتا، آئے دن کوئی نہ کوئی شکایت ہوتی رہتی تھی۔ سر شام سوجاتا اور اسے کھانا کھانے کے لیے مجھے اس کی منتیں کرنی پڑتیں۔دن چڑھے تک سوتا رہتا اور جب تک میں گود میں اٹھا کر بٹھا نہ دیتا اٹھنے کا نام نہ لیتا۔رات کو چونک پڑتا، اپنی چارپائی سے اٹھ کرمیری چار پائی پر آ جاتا اور میرے گلے سے لپٹ کر سوتا۔ مجھے اس پر کبھی غصہ نہ آتا۔کہہ نہیں سکتا کیوں مجھے اس سے اتنا انس ہو گیا؟ میں جو نو بجے سو کر اٹھا کرتا تھا تڑکے اٹھ بیٹھتا اور اس کے لیے دودھ گرم کرتا۔ پھر اسے اٹھا کر ہاتھ منھ دھلاتا اور اس کی صحت کا خیال کر کے ساتھ سیر کر انے لے جاتا۔ میں جو کبھی کتاب لے کر نہ بیٹھتا تھا اسے گھنٹوں پڑھایا کرتا۔مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس کیوں کر ہو گیا؟ اس کا اب تک مجھے تعجب ہے۔اسے کوئی شکایت پیدا ہوجاتی تو میری جان ناخن میں سما جاتی تھی۔ ڈاکٹر کے پاس دوڑتا، دوائیں لاتا اور موہن کی خوشامد کر کے اسے دوا پلاتا۔ ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی کہ کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے۔ اس غریب کا یہاں میرے سوا دوسرا کون ہے؟ ماموں صاحب اسے میرے بھروسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ بیچارا بے ماں کا لڑکا ہے۔ میرے بدمعاش دوستوں میں کوئی اسے چڑاتا یا چھیڑتا تو میری تیوریاں بدل جاتی تھیں۔ کئی لڑکے تو مجھے بوڑھی دایہ کہہ کر چڑاتے تھے۔ پر میں ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ میں اس کے سامنے کوئی بے ہودہ حرکت نہ کرتا تھا، ایک بھی ناشائستہ لفظ منہ سے نہ نکالتا، یہ خیال ہوتا تھا کہ میری دیکھا دیکھی یہ بھی خراب ہو جائے۔میں اس کے سامنے اس طرح رہنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے اپنا نمونہ سمجھے اور اس کے لیے لازمی تھا کہ پہلے میں اپنی اصلاح کروں۔ وہ نو بجے سوکر اٹھتا۔ وہ بارہ بارہ بجے تک مٹرگشت کرتا۔ وہ نئی نئی شرارتوں کے منصوبے باندھتا۔وہ ماسٹروں کی آنکھ بچا کر اسکول سے اڑ جاتا آپ ہی آپ جاتا رہا۔ صحت

اور اخلاق کے آئین کا میں دشمن تھا پر اب مجھ سے بڑھ کر ان کا پابند دوسرا نہ تھا۔ میں ایشور کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ مگر اب پکا خدا دوست ہو گیا تھا۔ وہ بڑی سادگی سے پوچھتا تھا۔ ''پرماتما سب جگہ رہتے ہیں تو میرے پاس بھی رہتے ہوں گے'' اس سوال کا مذاق اڑانا میرے لیے غیر ممکن تھا۔ میں کہتا۔ ''ہاں پرماتما تمھارے ہمارے سب کے پاس رہتے ہیں اور ہماری حفاظت کرتے ہیں'' اس کا چہرہ نورانی مسرت سے چمک اٹھتا تھا۔ شاید وہ پرماتما کے وجود کو محسوس کرنے لگتا تھا۔ ماسٹر صاحب یقین مانیئے سال بھر میں ہی موہن کچھ سے کچھ ہوگیا۔ وہ منحنی غریب صورت کاہل بے خبر لڑکا اب توانا شگفتہ رو، چاق و چست اور بشاش ہو گیا۔ ماموں صاحب دوبارہ آئے تو اسے دیکھ کر حیرت میں آگئے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے۔

''بیٹا تم نے اسے جلا لیا ورنہ میں تو مایوس ہو چکا تھا۔ اس کا صلہ تمھیں ایشور دیں گے اس کی ماں جنت میں بیٹھی ہوئی تمھیں دعائیں دے رہی ہیں''۔

سورج پرکاش کی آنکھیں اس وقت بھی آبگوں ہو گئی تھیں۔

میں نے پوچھا''موہن بھی تمھیں بہت پیار کرتا ہوگا؟

سورج پرکاش کی آبگوں آنکھوں میں ایک حسرتناک مسرّت جلوہ افروز ہوئی۔ بولا ''جناب وہ مجھے ایک منٹ کے لیے بھی نہ چھوڑتا تھا میرے ساتھ کھاتا، میرے ساتھ بیٹھتا، میرے ساتھ سوتا، میں ہی اس کا سب کچھ تھا۔ افسوس وہ آج اس دنیا میں نہیں ہے مگر میں اسے ہمیشہ زندہ محسوس کرتا ہوں میں جو کچھ ہوں اسی کا بنایا ہوا ہوں۔ اگروہ فرشتہ غیب کی طرح میرا رہنما نہ ہو جاتا تو شاید آج میں کسی جیل میں پڑا ہوتا۔ ایک دن میں نے کہہ دیا تھا'' اگر تم روز نہا نہ لیا کروگے تو میں تم سے نہ بولوں گا۔ نہانے سے وہ نہ جانے کیوں جی چراتا تھا۔ میری اس دھمکی کا یہ اثر ہوا کہ وہ روز انہ علی الصباح نہانے لگا۔ کتنی ہی سردی کیوں نہ ہو؟ کتنی ہی ٹھنڈی ہوا چلے؟ لیکن وہ نہانے میں غفلت نہ کرتا۔ دیکھتا رہتا تھا کہ میں کس بات سے خوش ہوتا ہوں۔ ایک روز میں چند احباب کے ساتھ تھیٹر دیکھنے چلا گیا۔ تاکید کر گیا تھا کہ تم کھانا کھا کر سو رہنا۔ تین بجے رات کو لوٹا تو دیکھا وہ بیٹھا ہوا

ہے۔ میں نے پوچھا ''تم سوئے نہیں''؟ بولا ''نیند نہیں آئی'' اس دن سے میں نے تھیٹر جانے کا نام نہ لیا۔ بچوں میں پیار کی جو ایک بھوک ہوتی ہے دودھ اور مٹھائی اور کھلونوں سے بھی زیادہ مرغوب جو ماں کی گود کے سامنے دنیا کی کسی چیز کی ہستی کو خیال میں نہیں لاتی۔ موہن میں اس بھوک نے کبھی سیری کا منھ نہیں دیکھا تھا۔ پہاڑوں سے ٹکرانے والی سارس کی صدا کی طرح وہ ہمیشہ اس کی ایک ایک رگ میں گونجا کرتی تھی۔ جیسے زمین پر پھیلی ہوئی لتا کوئی سہارا پاتے ہی اس سے چمٹ جاتی ہے۔ وہی حال موہن کا تھا وہ مجھ سے ایسا چمٹ گیا کہ اس کی نازک بیلوں نے مجھ پر بندشوں کا کام کیا اور مجھے استوارا کر دیا۔ اس کی وفات کا قصہّ نہایت درد ناک ہے میرے دل پر اس کا غم اس وقت بھی تازہ ہے اور مجھ میں اتنا ضبط نہیں کہ میں اس کا ذکر کروں۔ وہ میرے ساتھ تین سال رہا۔ شایدغیب سے میری ہدایت کے لیے جو مشعل عطا ہوا تھا وہ مقصد پورا ہو جانے کے بعد مجھ سے چھین لیا گیا۔ اس ننھے سے دل میں کیا کیا ارمان بھرے ہوئے تھے۔ بی اے پاس کرنا۔ ایم اے پاس کرنا۔ وظیفہ پانا۔ ولایت جانا۔ وہاں سے سول سروس کا امتحان پاس کر کے لوٹنا۔ یہی اس کے زندگی کے خواب تھے جو مرگ بے ہنگام نے پریشان کر دیے۔

گرمیوں کی تعطیلات تھیں۔ دو تعطیلوں میں موہن میرے ساتھ رہا تھا۔ ماموں صاحب کے اصرار کر نے پر بھی گھر نہ گیا۔ تیسری تعطیل میں میری کالج پارٹی نے کشمیر کی سیاحت کا فیصلہ کیا اور مجھے اس کا کپتان بنایا۔ کشمیر کی سیر کی تمنا مدت سے تھی اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ موہن کو ماموں صاحب کے پاس بھیج کر میں کشمیر چلا گیا۔ دو مہینے بعد لوٹا تو معلوم ہوا موہن بیمار ہے۔ کشمیر میں مجھے بار بار موہن کی یاد آتی تھی اور جی چاہتا تھا لوٹ جاؤں۔ مجھے اس سے اتنی محبت ہے اس کا اندازہ مجھے کشمیر جا کر ہوا۔ مگر احباب سے پیچھا چھڑا نا مشکل تھا۔اس کی بیماری کی خبر پاتے ہی میں اس کے پاس گیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کے زرد چہرے پر مسرت کی تازگی کی جھلک پڑی میں دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ وہ دور نظری اور چہرے پروہ روحانیت تھی جو منڈ لاتی ہوئی موت کی خبر

دیتی تھی۔ میں نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز سے پوچھا" تمھاری کیا حالت ہے موہن...... ! دو ہی مہینہ میں یہ نوبت پہنچ گئی۔

موہن نے معصوم تبسم کے ساتھ کہا" آپ کشمیر کی سیر کرنے گئے تھے میں آسمان کی سیر کرنے جا رہا ہوں۔

مگر اس قصۂ غم کو بیان کر کے میں رونا اور رلانا نہیں چاہتا۔ میرے چلے جانے کے بعد موہن اس طرح پڑھنے لگا جیسے تپسیا کر رہا ہو اسے یہ خبط پیدا ہو گیا کہ سال بھر کا کورس دو مہینہ میں ختم کرے اور جب مجھ سے ملاقات ہو تو اپنی کار گذاری کی داد وصول کر لے۔ اس اشتیاق نے محویت کی صورت اختیار کر لی۔ میں کس طرح اس کی پیٹھ ٹھونکوں گا، شاباشی دوں گا،اپنے دوستوں سے اس کی تعریف کروں گا، یہ خیالات اپنی ساری طفلانہ سرگرمی اور انہماک کے ساتھ اس پر غالب آگئے۔ ماموں صاحب کو دفتر کے کام سے اتنی فرصت کہاں کہ وہ اس کی تفریح کی فکر کریں۔ شاید اسے ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے دیکھ کر دل میں وہ خوش ہوتے تھے۔ ایسا کون باپ ہے جو لڑکے کے شوق طلب میں مخل ہو؟ موہن کو کھیلتے دیکھ وہ ضرور ڈانٹتے۔ ''کتاب لے کر کیوں نہیں بیٹھتے'' ؟پڑھتے دیکھ کر بھلا کیا کہتے؟ کسی باپ نے بھلا لڑکے کو پڑھنے کے لیے نہیں ڈانٹا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موہن کی نازک صحت یہ ریاضت شاقہ برداشت نہ کرسکی۔ اسے ہلکا بخار آنے لگا مگر اس حالت میں بھی اس نے پڑھنا نہ چھوڑا۔ یہاں تک کہ کئی اور پیچدگیاں پیدا ہو گئیں۔ مگر اس وقت بھی جب بخار کچھ ہلکا ہو جاتا تو وہ کتابیں دیکھنے لگتا تھا۔ اکثر بخار کے عالم میں بھی نوکروں سے پوچھتا ''بھیا کا خط آیا؟ وہ کب آئیں گے''؟ اس وقت اس کے سوا اسے کوئی دوسری تمنا نہ تھی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری سیر کشمیر اتنی مہنگی پڑے گی تو میں اس کا نام بھی نہ لیتا۔ میں نے اسے سنبھالنے کی حتی الامکان بڑی کوشش کی مگر بخار ٹائیفائڈ تھا اس کی جان لے کر ہی اترا۔ پہلی بار میں نے موت کی صورت دیکھی اور ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس کی زندگی کے خواب ایک جان سے پیارے عزیز کی وصیت بن کر مجھے تحریک عمل کرنے لگے اور یہ اسی کا اثر ہے کہ آج آپ مجھے اس حالت میں دیکھ رہے ہیں۔ موہن نے زندگی کا جو خیالی معیار

قائم کیا تھا اس پر عمل کر کے مجھے یہ مسرت ہوئی ہے کہ شاید اس کی معصوم روح مجھے دیکھ کر خوش ہوتی ہو۔ یہی تحریک تھی جس نے ایم اے سول سروس کی آزمائشوں میں مجھے کامیاب بنایا۔ ورنہ میں آج بھی وہی نالائق، گستاخ اور غبی سورج پرکاش ہوں جس کی صورت سے بھی آپ بے زار تھے۔

اس دن سے میں کئی بار سورج پرکاش سے مل چکا ہوں۔ وہ جب اس گرد و نواح میں آ جاتا ہے تو مجھ سے ملے بغیر نہیں جاتا۔ موہن اب بھی اس کے دل و دماغ میں بسا ہوا ہے۔ انسانی فطرت کا یہ ایک ایسا معمہ ہے جسے میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔

یہ افسانہ پہلی بار خاک پروانہ کے دوسرے ایڈیشن میں شائع ہوا۔ ہندی میں یہ وشال بھارت (کلکتہ) کے مئی 1931 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مانسرور 4 میں شامل ہے۔

طلوع محبت

بھوندو پسینہ میں شرا بور لکڑیوں کا گٹھا سر پر لیے آیا اور اسے زمین پر پٹک کر بنٹی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ گویا زبان حال سے پوچھ رہا تھا کیا ابھی تک تیرا مزاج درست نہیں ہوا۔

شام ہو گی تھی پھر بھی لو چلتی تھی اور آسمان پر گرد و غبار چھایا ہوا تھا۔ ساری قدرت دق کے مریض کی طرح نیم جان ہو رہی تھی۔ بھوندو صبح گھر سے نکلا تھا۔ دوپہر درخت کے سایہ تلے بسر کی تھی اور سمجھا تھا اس تپسیا سے دیوی جی کا منہ ٹھیک ہو گیا ہوگا۔ لیکن آ کر دیکھا تو وہ ابھی تک تنی بیٹھی تھی۔

بھوندو نے سلسلہ کلام شروع کرنے کی غرض سے کہا ''لا ایک پانی کا لوٹا دے دے۔ بڑی پیاس لگی ہے۔ مر گیا سارے دن، میں بجار جاؤں گا تو تین آنے سے بیشی نہ ملیں گے''۔

بنٹی نے سرکی کے اندر بیٹھے بیٹھے کہا۔''دھرم بھی لوٹو گے اور پیسے بھی، منہ دھو کر رکھو''۔

بھوندو نے بھنویں سکوڑ کر جواب دیا'' کیا دھرم دھرم بکتی ہے۔ دھرم کرنا ہنسی کھیل نہیں۔ دھرم وہ کرتا ہے جس پر بھگوان کی مہربانی ہو۔ ہم دھرم کھاک کریں گے۔ پیٹ بھرنے کو چنا چبینا تو ملتا نہیں دھرم کیا کریں گے۔

بنٹی نے اپنا وار اوچھا پڑتے دیکھ کر چوٹ پر چوٹ کی۔

دنیا میں کچھ ایسے دھرماتما بھی ہیں، جو اپنا پیٹ چاہے نہ بھر سکیں مگر پڑوسیوں

کی دعوت کرتے پھرتے ہیں ورنہ سارے دن بن بن کی لکڑیاں نہ کاٹتے پھرتے۔ ایسے دھرماتما لوگوں کو جورو رکھنے کی کیوں سوجھتی ہے ؟ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ دھرم چھکڑا کیا اکیلے نہیں چلتا۔

بھوندو اس چوٹ سے تلملا اٹھا۔ اس کی رگیں تن گئیں، پیشانی پر بل پڑ گئے۔ بنٹی کا منھ وہ ایک ڈپٹ میں بند کرسکتا تھا۔ مگر اس نے یہ نہ سیکھا تھا۔ جس کی طاقت کی سارے کنجڑوں پر دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جو تن تنہا سو پچاس جوانوں کا نشہ اتار سکتا تھا وہ ایک کمزور عورت کے سامنے منھ نہ کھول سکا۔ دبی زبان سے بولا:

''جورو دھرم گنوانے کے لیے نہیں لائی جاتی، دھرم کمانے کے لیے لائی جاتی ہے''۔

یہ دونوں کنجڑ خاوند بیوی تین دن سے اور کئی کنجڑوں کے ساتھ اس باغ میں اترے ہوئے تھے۔ سارے باغ میں سرکیاں ہی سرکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ ان تین ہاتھ چوڑی اور چار ہاتھ لمبی سرکیوں کے اندر ایک گھرانہ زندگی کی تمام مصروفیتوں، تمام بے نوائیوں کے ساتھ گذر اوقات کررہا تھا۔ ایک طرف چکی تھی، ایک طرف باورچی خانہ کی اشیاء، ایک طرف اناج کے مٹکے، دروازہ پر ایک کھٹولی بچوں کے لیے پڑی تھی۔ ہر ایک گھر کے ساتھ دو دو بھینسے یا گدھے تھے۔ جب ڈیرا کوچ ہوتا تھا تو سارا سازو سامان ان گدھوں یا بھینسوں پر لاد دیا جاتا تھا۔ یہی ان کنجڑوں کی زندگی تھی۔ ساری بستی ایک ساتھ چلتی تھی، ایک ساتھ ٹھہرتی تھی۔ ان کی دنیا اسی بستی کے اندر تھی۔ آپس ہی میں شادی بیاہ، لین دین، جھگڑے قضئے ہوتے رہتے تھے۔ اس دنیا کے باہر سارا جہان ان کے لیے شکارگاہ تھا۔ ان کے کسی علاقہ میں پہنچتے ہی وہاں کی پولیس آکر انھیں نگرانی میں لے لیتی تھی۔ پڑاؤ کے ارد گرد چوکیداروں کا پہرہ لگ جاتا تھا۔ عورت یا مرد کسی گاؤں میں جاتے تو پولیس کے آدمی ان کے ساتھ ہو لیتے۔ رات کو ان کی حاضری لی جاتی۔ پھر بھی گرد و نواح کے لوگ سہمے ہوئے تھے۔ کیوں کہ کنجڑ لوگ اکثر گھروں میں گھس کر جو چیز چاہتے اٹھالیتے اور ان کے ہاتھ میں جاکر کوئی شے لوٹ نہ سکتی تھی۔ رات میں یہ لوگ اکثر چوری کرنے نکل جاتے۔ چوکیدار ان سے ڈرتے تھے۔ کیوں کہ یہ لوگ خونخوار

تھے۔ ذراسی بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے۔ سختی کرنے میں جان کا خطرہ تھا۔ کیوں کہ کنجڑ لوگ بھی ایک حدتک ہی پولیس کا دباؤ مانتے ہیں۔ ساری بستی میں بھوندو ہی ایک ایسا شخص تھا جو اپنی محنت کی کمائی کھا تا تھا، مگر اس لیے نہیں کہ وہ پولیس والوں سے خائف تھا۔ بلکہ اس لیے کہ اس کی بہادری یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ وہ ناجائز طریقہ سے اپنی کسی ضرورت کو پورا کرے۔

بنٹی کو اپنے شوہر کی یہ پاک دامنی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس کی بہنیں نئی نئی چوڑیاں اور نئے نئے زیور پہنتیں تو بنٹی اپنے شوہر کی بزدلی پر کڑھتی تھی۔ اس بات پر دونوں میں کئی مرتبہ جھگڑے ہوچکے تھے۔ لیکن بھوندو اپنی عاقبت بگاڑنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ آج بھی صبح یہی سوال درپیش تھا اور بھوندو لکڑی کاٹنے جنگل نکل گیا تھا۔ کچھ مل جاتا تو بنٹی کی اشک شوئی ہو جاتی۔ مگر آج سوائے لکڑی کے اور کوئی شئے نہ ملی۔ نہ کوئی جانور، نہ خس نہ جڑی بوٹی۔

بنٹی نے کہا ''جن سے کچھ نہیں ہوسکتا وہی دھرماتما بن جاتے ہیں۔ رانڈ اپنے مانڈ ہی میں خوش ہے''۔

بھوندو نے کہا ''تو میں نکھٹو ہوں''؟

بنٹی نے اس سوال کا سیدھا جواب نہ دیا۔ میں کیا جانوں۔ تم کیا ہو۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ یہاں دھیلے دھیلے کی چیز کے لیے ترسنا پڑتاہے۔ یہاں جتنی عورتیں ہیں سب کھاتی ہیں، ہنستی کھیلتی ہیں، پہنتی اوڑھتی ہیں۔ کیا میرے ہی دل نہیں ہے؟ تمھارے ساتھ بیاہ کر کے زندگی کھراب ہو گئی؟

بھوندو نے ایک لمحہ سوچا کر کہا'' بانتی ہے پکڑا لیا تو تین سال سے کم کی سجا نہ ہو گی۔

بنٹی پر اثر نہ ہوا۔ بولی''جب اور لوگ نہیں پکڑے جاتے تو تم ہی کیوں پکڑے جاؤگے''؟

بھوندو : اور لوگ پولیس کی کھوسامدیں کرتے ہیں۔ چوکیداروں کے پاؤں سہلاتے ہیں۔ تو چاہتی ہے میں بھی یہ کرم کروں۔

بنٹی نے اپنی ضد نہ چھوڑی۔ بولی'' میں تمھارے ساتھ ستی ہونے نہیں آئی۔ پھر

تمھارے چھرے گنڈا سے کوئی کہاں تک ڈرے۔ جانور کو بھی جب گھاس چارہ نہیں ملتا تو رسہ تڑا کر کسی کھیت میں گھستا ہے۔ میں تو آدمی ہوں''۔

بھوندو نے اس کا جواب نہ دیا۔ اس کی بیوی کوئی دوسرا گھر کر لے گی یہ خیال بھی اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ آج بنٹی نے پہلی مرتبہ یہ دھمکی دی۔ اب تک بھوندو اس کی طرف سے بے فکر تھا اب یہ نیا خطرہ اس کے سامنے آ کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی زندگی میں ایسا روز سیاہ کبھی نہ آنے دے گا۔ اس کے لیے وہ سب کچھ کر گذرے گا۔ بھوندو کی نگاہوں میں بنٹی کی وہ عزت نہیں رہی، وہ اعتماد نہیں رہا۔ مضبوط دیوار کو ٹکاونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب دیوار ہلنے لگتی ہے تو ہمیں اس کے سنبھالنے کی فکر ہوتی ہے۔ آج بھوندو کو اپنے گھر کی دیوار ہلتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ آج تک بنٹی اس کی اپنی تھی۔ وہ جس طرح اپنی طرف سے بے پروا تھا اس کی طرف سے بھی بے فکر تھا۔وہ جس طرح خود رہتا تھا اسی طرح اس کو رکھتا تھا۔ جو خود کھاتا تھا وہی اسے کھلاتا تھا۔ اس کی کوئی خاص فکر نہ تھی۔ پر آج اسے معلوم ہوا کہ وہ اس کی اپنی نہیں۔ اب اسے اس کی خاص طور پر دلجوئی کرنا ہو گی۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا گدھا چر کر چپ چاپ سر جھکائے چلا آرہا تھا۔ بھوندو نے کبھی اس کے کھانے پینے کی طرف دھیان نہ دیا۔ آج اس نے باہر آ کر اسے پچکارا، اس کی پیٹھ سہلائی اور اسے پانی پلانے کے لیے ڈول اور رسی لے کر کنوئیں پر چلا گیا۔

(۲)

اس کے دوسرے ہی دن گاؤں کے ایک امیر ٹھاکر کے گھر چوری ہو گئی۔ اس رات بھوندو اپنے ڈیرے پر نہ تھا۔ بنٹی نے چوکیدار سے کہا:

''کل جنگل سے نہیں لوٹا''

صبح کے وقت بھوندو آپہونچا۔ اس کی کمر میں روپیوں کی تھیلی تھی۔ کچھ سونے کے گہنے تھے۔ بنٹی نے گہنے ایک درخت کے نیچے گاڑ دیے۔ روپیوں کی کیا پہچان ہو سکتی تھی۔

بھوندو نے پوچھا'' اگرکوئی پوچھے اتنے سارے روپے کہاں سے ملے تو کیا کہوگی''؟

بنٹی نے آنکھ نچا کر کہا ''کہہ دوں گی۔ کیوں بتاؤں؟ دنیا کماتی ہے تو کسی کو حساب دینے جاتی ہے۔ ہم اپنا حساب کیوں دیں؟

بھوندو نے گردن ہلا کر کہا:

''یہ کہنے سے گلا نہ چھوٹے گا بنٹی'' تو کہہ دینا میں کئی مہینے سے تین تین چار چار روپے مہینہ بچاتی رہی ہوں۔ ہمارا خرچ ہی کون بڑا لمبا ہے''؟

دونوں نے مل کر کئی جواب سوچ لیے۔ جڑی بوٹیاں بیچتے ہیں ایک ایک جڑی کے لیے کئی کئی روپے مل جاتے ہیں۔ کھس، گھاس جانوروں کی کھالیں سب بیچتے ہیں۔

اس طرف سے بے فکر ہو کر دونوں بازار چلے۔ بنٹی نے اپنے لیے کئی قسم کے کپڑے، چوڑیاں، بندے، سیندور، پان، تمباکو، تیل اور مٹھائیاں لی۔ پھر دونوں شراب کی دوکان پر گئے۔ خوب شراب پی اور دو بوتلیں رات کے لیے لے کر گھومتے پھرتے، گاتے بجاتے، گھڑی رات گئے ڈیرہ پر آئے۔ بنٹی کے پاؤں آج زمین پر نہ پڑتے تھے۔ آنے کے ساتھ ہی بن ٹھن کر پڑوسنوں کو اپنی چھب دکھانے چلی گئی۔

جب وہ لوٹ کر اپنے گھر گئی اور کھانا پکا نے لگی تو پڑوسیوں نے تنقید کرنی شروع کردی۔

''کہیں گہرا ہاتھ مارا ہے''

''بڑا دھرماتما بنا پھر تا تھا''

''بگلا بھگت ہے۔''

''بنٹی تو جیسے آج ہوا میں اڑرہی ہے''

''آج بھوندو کی خاطر ہو رہی ہے۔ ورنہ کبھی ایک لوٹیا پانی دینے بھی نہ اٹھتی تھی''۔

اس رات بھوندو کو دیوی کی یاد آئی۔ آج تک اس نے کبھی دیوی کو بلیدان

نہ دیا تھا۔ پولیس کو گانٹھنا کس قدر مشکل تھا۔ کچھ خودداری بھی کھونی پڑتی تھی۔ دیوی صرف ایک بکرا لے کر خوش ہوجائے گی۔ ہاں اس سے ایک غلطی ضرور ہوئی تھی اس کی برادری کے اور لوگ عام طور پر کوئی کام کر نے سے پہلے قربانی کرتے تھے۔ بھوندو نے یہ خطرہ نہ لیا۔ جب تک مال ہاتھ نہ لگ جائے اس میں سے دیوتاؤں کو کھلا دینا حماقت نہیں۔ تو اور کیا ہے؟ لوگوں سے اپنی چوری پوشیدہ رکھنا چا ہتا تھا۔ اس لیے اس نے کسی کو خبر نہ دی۔ یہاں تک کہ بنٹی سے بھی نہ کہا اور بکرے کی تلاش میں گھر سے نکلا۔

بنٹی نے پوچھا۔

''اب کھا نے کے بکھت کہاں چلے''؟

''ابھی آتا ہوں''

''مت جاؤ مجھے ڈر لگتا ہے''

بھوندو نے محبت کے اس نئے اظہار پر خوش ہوکر کہا '' مجھے دیر نہ لگے گی۔ تو یہ گنڈاسا اپنے پاس رکھ لے''۔

اس نے گنڈا سا نکال کر بنٹی کے پاس رکھ دیا اور باہر نکلا۔ مگر بکرا کہاں ملے۔ آخر اس مشکل کو بھی اس نے ایک خاص طریقہ سے حل کیا۔ قریب کی بستی میں ایک گڈڑئے کے پاس کئی بکرے تھے۔ اس نے سو چا وہیں سے ایک بکرا اٹھا لاؤں۔ دیوی کو اپنی قربانی سے غرض ہے یا اس سے کہ بکرا کہا ں سے آیا۔ اور کیوں آیا۔

لیکن بستی کے قریب پہونچا ہی تھا کہ پولیس کے چار آدمیوں نے اسے گرفتار کرلیا۔ اورمشکیں باندھ کر تھا نے لے چلے۔

(۳)

بنٹی کھانا پکا کر بناؤ سنگار کرنے لگی۔ آج اسے اپنی زندگی گلزار معلوم ہوتی تھی۔ مسرت سے کھلی جاتی تھی۔ آج اپنی عمر میں پہلی مرتبہ اس کے سر میں خوشبودار تیل پڑا۔ اس کا آئینہ خراب ہو گیا تھا۔ اس میں اب منھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔

آج وہ نیا آئینہ لائی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھ کر اس نے بال سنوارے، ابٹن ملا، صابن لانا وہ بھول گئی تھی۔ صاحب لوگ صابن لگا نے ہی سے تو اتنے گورے ہو جاتے ہیں۔ صابن ہوتا تو اس کا رنگ بھی نکھر آتا۔ ایک ہی دن میں بالکل گوری تو نہ ہوجاتی۔ لیکن رنگ ایسا سیاہ بھی نہ رہتا۔ کل وہ صابن کی ٹکیاں ضرور خرید لائے گی۔ اور روز اس سے منہ دھوئے گی۔بال سنوار کر اس نے ماتھے پر السی کا لعاب لگایا کہ بال ادھر ادھر منتشر نہ ہو جائیں۔ پھر پان لگائے، چونا زیادہ ہو گیا تھا اس لیے منہ میں چھالے پڑ گئے لیکن اس نے سمجھا شاید پان کھانے کا یہی مزہ ہے۔ آخر کڑوی مرچ بھی تولوگ مزے لے لے کر کھاتے ہی ہیں۔ گلابی رنگ کی ساڑھی پہن کر اور پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر اس نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو اس کے آبنوسی رنگ پر سرخی دوڑگئی۔ اپنے آپ کو دیکھ کر شرماگئی۔ افلاس کی آگ میں نسائیت بھی جل کر خاک سیاہ ہوجاتی ہے۔ نسائیت کی حیا کا ذکر ہی کیا ہے؟ میلے کچیلے کپڑے پہن کر شرمانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی چنوں میں خوشبو لگا کر کھائے۔

اسی طرح بناؤ سنگار کرکے بنٹی بھوندو کی راہ دیکھنے لگی۔ جب دیر ہو گئی اور وہ نہ آیا تو اس پر جھنجھلا اٹھی۔ روج تو سانجھ سے درواجے پر پڑے رہتے تھے آج نہ جانے کہاں جا کر بیٹھ رہے؟

بنٹی کے سوکھے دل میں آج پانی پڑتے ہی اس کی نسائیت اُگ آئی تھی۔ خشکی کے ساتھ اسے فکر بھی ہو رہی تھی اس نے باہر نکل کر کئی مرتبہ پکارا۔ اس کی آواز میں ایسی شیرینی کبھی نہ تھی۔ اسے کئی مرتبہ شبہ ہوا کہ بھوندو آر ہا ہے وہ دوسری مرتبہ سرکی کے اندر دوڑ آئی اور آئینہ میں اپنا منھ دیکھا کہ کچھ بگڑ نہ گیا ہو۔ ایسی دھڑکن، ایسی الجھن اسے آج تک کبھی نہ ہوئی تھی۔

بنٹی شوہر کے انتظار میں ساری رات بے قرار رہی۔ جوں جوں رات گذرتی جاتی تھی۔ اس کے اندیشے بڑھتے جاتے تھے۔ آج ہی اس کی پر لطف زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ آج ہی یہ حال۔

صبح جب وہ اٹھی تو ابھی کچھ اندھیرا ہی تھا اس کا جسم شب بے داری سے ٹوٹ رہاتھا، آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی،حلق خشک ہو رہاتھا معاً کسی نے آکرکہا:

''اری بنٹی رات بھوندو پکڑا گیا''

(۴)

بنٹی تھا نے پہونچی تو پسینہ میں بھیگی ہوئی تھی۔ اور دم پھول رہا تھا۔ اسے بھوندو پر رحم نہ آتا تھا۔ غصہ آتا تھا۔ سارا زمانہ کام کرتا ہے اور چین کی بنسی بجاتا ہے۔ انھوں نے کہنے سننے پر ہاتھ بھی لگایا، تو چوک گئے شعور نہ تھا تو صاف کہہ دیتے کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔ میں یہ تھوڑے ہی کہتی تھی کہ آگ میں کود پڑو۔

اسے دیکھتے ہی تھا نے دار نے دھونس جمائی'' یہی تو ہے بھوندو کی عورت، اسے بھی پکڑ لو''

بنٹی نے اکڑ کر کہا'' ہاں ہاں پکڑ لو۔ یہاں کسی سے نہیں ڈرتے۔ جب ڈرنے کا کام نہیں کرتے تو ڈریں کیوں؟

افسر اور ماتحت سب بنٹی کی طرف دیکھنے لگے۔ ان کا دل بھوندو کی طرف سے کچھ نرم ہو گیا۔ اب تک وہ دھوپ میں کھڑا تھا اب اسے سائے میں لے آئے۔ اس نے ایک مرتبہ بنٹی کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا تھا ''دیکھنا کہیں ان لوگوں کے دھوکے میں نہ آ جانا''۔

تھانے دار نے ڈانٹ کر کہا:

''ذرا اس کی دیدہ دلیری تو دیکھو جیسے پاکیزگی کی دیوی ہی تو ہے۔ مگر اس پھیر میں نہ رہنا میں تم لوگوں کی نس نس سے واقف ہوں۔ تین سال کے لیے بھجوادوں گا۔ تین سال کے لیے۔ صاف صاف کہہ دو اور سارا مال لوٹا دو۔ اسی میں خیریت ہے۔

بھوندو نے بیٹھتے بیٹھتے کہا'' کیا کہہ دوں؟ جو لوگوں کو لوٹتے ہیں ان سے تو کوئی کچھ نہیں کہتا اور جو غریب محنت کی کمائی کھاتے ہیں ان کا گلا کاٹنے کو سبھی تیار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس کسی کو دینے دلانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔

تھانے دار نے سخت لہجہ میں کہا ''ہاں ہاں۔ سکھا پڑھا دے بیوی کو کہ کہیں

کچھ بھید نہ کھول دے۔ لیکن ان گیدڑ بھبکیوں سے بچ نہیں سکتا۔ تو نے اقبال نہ کر لیا تو تین سال کے لیے جائے گا میرا کیا بگڑتا ہے۔ ارے چھوٹے سنگھ اسے پکڑ کر کوٹھری میں بند کر دے۔

بھوندو نے بے پروائی سے کہا ''داروغہ صاحب! بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو مگر کچھ ہاتھ نہ لگے گا۔ آپ کی دھمکیوں کے سامنے بڑے بڑے سیدھے ہو جاتے ہیں مگر میں دوسری قسم کا آدمی ہوں۔

داروغہ صاحب کو یقین ہو گیا کہ اس فولاد کا جھکانا دشوار ہے۔ بھوندو کے بشرہ سے شہیدوں کا سا استقلال نظر آتا تھا۔ تھانے دار کا حکم پاتے ہی دو آدمیوں نے بھوندو کو پکڑ کر کمرے میں بند کر دیا۔ شوہر کی بے بسی دیکھ کر بنٹی کا سینہ پھٹا جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کنجڑوں میں چوری کرکے اقبال کر لینا انتہا درجہ کی ذلت ہے۔ خدا جانے اس کا نتیجہ کیا ہو؟ خدا جانے کتنی سزا ہو جائے؟ ممکن ہے تین ہی سال کے لیے چلا جائے۔ جان پر کھیل کر بولی''داروغہ جی! تم سمجھتے ہوگے ان گریبوں کی پیٹھ پر کوئی نہیں؟ لیکن بھگوان تو سب کچھ دیکھتے ہیں۔ بھلا چاہو تو ان کو چھوڑ دو۔ کید ہو گئے تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔

تھانے دار نے مسکرا کر کہا ''تجھے کیا یہ مر جائے گا کسی اور سے بیاہ کر لینا۔ جو کچھ چوری کر کے لایا ہوگا وہ تو تیرے ہی پاس ہوگا۔ کیوں نہیں اقبال کرکے چھڑا لیتی۔ میں وعدہ کرتا ہوں مقدمہ نہ چلاؤں گا۔ سب مال لو ٹا دے۔ تو نے ہی منتر دیا ہوگا۔ گلابی ساڑھی اور پا ن اور خوشبودار تیل کے لیے تو ہی بے قرار ہو رہی ہوگی۔ اس پر مقدمہ چل رہا ہے اور سامنے کھڑی دیکھ رہی ہے عجیب عورت ہے۔

بنٹی نے چند لمحے غور کیا اور پھر سر جھکا کر آہستہ سے بولی:

''اچھا داروغہ صاحب میں سب کچھ دے دوں گی ان پر حرف نہ آنے پائے۔

(۵)

بھوندو کو باہر نکالا گیا۔ تو اس نے خائف ہوکر پوچھا''کیوں کیا بات ہے''؟

ایک چوکیدار نے کہا ''تیری عورت نے اقبال کرلیا''

بھوندو پہلی مرتبہ پھنسا تھا اس کا سر چکر کھا رہا تھا، آواز بند سی ہو گئی تھی لیکن یہ بات سنتے ہی جیسے وہ بے دار ہو گیا۔ اس نے دونوں مٹھیاں کس لیں اور بولا

''کیا کہا''؟

کیا کہا ''چوری کھل گئی، داروغہ صاحب مال برآمد کرنے گئے ہیں۔ رات ہی اقبال کر لیتے تو یہ نوبت کا ہے کو آتی؟

بھوندو نے گرج کر کہا ''وہ جھوٹ بولتی ہے''

''وہاں مال بھی برآمد ہو گیا تم ابھی تک اپنی ہی گا رہے ہو''۔

اپنے آبا واجداد کی وضعداری اپنے ہاتھوں خاک میں ملتے دیکھ کر بھوندو کا سر جھک گیا۔ اس جگر سوز ذلّت کے بعد اب اسے اپنی زندگی میں رسوائی اور نفرت اور بے عزتی کے سوائے اور کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ اب اس نے سوچا وہ اپنی برادری میں کسی کو منھ نہ دکھا سکے گا۔

یکا یک بنٹی آ کر سامنے کھڑی ہوگئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ بھوندو کی خونخوار شکل دیکھ کر اسے بولنے کی جرات نہ ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی بھوندو کا مجروح خاندانی وقار کچلے ہوئے سانپ کی طرح تڑپ اٹھا۔ اس نے بنٹی کو آتشیں آنکھوں سے دیکھا اس کی آنکھوں میں خون کی آگ جل رہی تھی۔ بنٹی سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی اور الٹے پاؤں وہاں سے بھاگی۔

کسی دیوتا کے آہنی ہتھیاروں کی مانند وہ دونوں انگاروں کی سی آنکھیں اس کے دل میں چبھنے لگیں۔

تھانے سے نکل کر بنٹی نے سوچا۔ اب کہاں جاؤں؟ بھوندو اس کے ساتھ ہوتا تو وہ پڑوسنوں کے طعنے برداشت کرسکتی تھی۔ لیکن اب وہ اکیلی تھی۔ اس کے لیے گھر جانا ناممکن تھا اور بھوندو کی وہ دو انگارے کی سی آنکھیں اس کے دل میں چبھی جاتی تھیں۔ لیکن کل کی عیش و آرام کی چیزوں کا پیار اسے ڈیرے کی طرف کھینچنے لگا۔ شراب کی بوتل اب بھی بھری رکھی تھی۔ پھلواڑیاں چھینکے پر ہانڈی میں پڑی تھیں۔ وہ تشنہ آرزوئیں جو موت کو سامنے دیکھ کربھی دنیا کی نعمتوں کی طرف دل کو مائل کرتی ہیں اسے کھینچ کر ڈیرہ کی طرف لے چلیں۔

دوپہر کا وقت تھا وہ پڑاؤ پر پہنچی تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل جو جگہ رنگینیٔ حیات سے گلزار بنی ہوئی تھی۔ اب وہاں سوائے ویرانے کے اور کچھ بھی نہ

تھا۔ یہ برادری کا انتقام تھا۔ سب نے سمجھ لیا کہ بھوندو اب ہمارا آدمی نہیں ہے۔ صرف اس کی سر کی اس ویرانے میں گویا روتی ہوئی کھڑی تھی۔ بنٹی نے اس کے اندر پاؤں رکھا تو اس کی وہی حالت ہوئی جو خالی گھر دیکھ کر کسی چور کی ہوتی ہے۔ کون کون سی چیز اٹھائے۔ اس جھونپڑی میں اس نے رو رو کر پانچ برس کاٹے تھے۔ لیکن آج اسے اس سے وہ محبت پیدا ہو گئی تھی۔ جو کسی ماں کے دل میں اپنے کسی نالائق بیٹے کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ جو برسوں کے بعد پردیس سے لوٹا ہو۔ ہوا سے کچھ اشیا ادھر ادھر ہو گئی تھیں۔ اس نے انھیں اٹھا کر ان کی جگہ پر رکھ دیا۔ پھلواڑیوں کی ہانڈی کچھ ہل گئی تھی۔ بنٹی کو شبہہ ہوا کہ شاید اس پر کوئی بلی جھپٹی ہو۔ اس نے جلدی سے ہانڈی اتار کر دیکھا۔ پھلواڑیاں کسی نے چھیڑیں تھیں۔ پانوں پر جو گیلا کپڑا لپٹا ہوا تھا وہ خشک ہو گیا تھا۔ اس نے اس پر پانی چھڑک دیا۔

کسی کے پاؤں کی آہٹ پا کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ بھوندو آرہا ہے۔ اس کی وہ انگارے کی سی آنکھیں! بنٹی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بھوندو کے غصہ کا اسے ایک دو مرتبہ تجربہ ہو چکا تھا۔ لیکن اس نے دل کو مضبوط کیا۔ کیوں مارے گا؟ کچھ سنے گا۔ سوال جواب کرے گا یا یوں ہی گنڈاسا چلا دے گا۔؟ اس نے اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ اسے آفت سے بچایاہے۔ مرجادا جان سے پیاری نہیں ہوتی۔ بھوندو کو ہوگی۔ اسے نہیں ہے۔ کیا اتنی سی بات پر وہ اس کی جان لے لے گا؟

اس نے سر کی کے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ بھوندو نہ تھا اس کا گدھا آرہا تھا۔ بنٹی آج اس بدبخت گدھے کو دیکھ کر ایسی خوش ہوئی جیسے اپنا بھائی میکے سے بتاشوں کی پوٹلی لیے تھکا ماندہ چلا آرہا ہو۔ اس نے جا کر اس کی گردن سہلائی اور اس کے تھوتھنے کو منہ سے لگا لیا۔ وہ اسے پھوٹی آنکھوں سے نہ بھاتا تھا۔ پر آج اسے اپنا عزیز معلوم ہوتا تھا۔ وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ وہ پھر کانپ اٹھی۔

اس نے پھر سوچا کیا کسی طرح نہ چھوڑے گا؟ وہ روتی ہوئی اس کے پیروں پر گر پڑے گی۔ کیا تب بھی نہ چھوڑے گا؟ ان کی آنکھوں کی وہ کتنی تعریف کیا

کرتا تھا۔ کیا آج ان میں آنسو دیکھ کر بھی اسے رحم نہ آئے گا؟ بنٹی نے مٹی کے پیالے میں شراب انڈیل کر پی۔ اور پھلوڑیاں کھائیں جب اسے مرنا ہی ہے تو دل میں حسرت کیوں رہ جائے؟ وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اب بھی اس کے سامنے تھیں۔ اس نے دوسرا پیالہ بھرا اور وہ بھی پی گئی۔ زہریلا ٹھرّا۔ جسے دوپہر کی گرمی نے اور بھی قاتل بنا دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے دماغ کو کھولا نے لگا۔ بوتل آدھی رہ گئی۔

اس نے سوچا بھوندو پوچھے گا تونے اتنی دارو کیوں پی؟ تو وہ کیا کہے گی؟ کہہ دے گی ہاں پی۔ کیوں نہ پیئے؟ اسی کے لیے تو یہ سب کچھ ہوا۔ وہ ایک بوند بھی نہ چھوڑ ے گی۔ جو ہونا ہے ہو جائے۔ بھوندو اسے مار نہ سکے گا۔ وہ اتنا ظالم، اتنا کمینہ نہیں ہے۔ اس نے پھر پیالہ بھرا اور پی گئی۔ پانچ برس کی گذری ہوئی باتیں اسے یاد آنے لگیں۔ سیکڑوں مرتبہ دونوں میں لڑائیاں ہوئی تھیں۔ آج جب بنٹی کو ہر مرتبہ اپنی ہی زیادتی معلوم ہور ہی تھی۔ بے چارا جو کچھ کماتا ہے اسی کے ہاتھ پر رکھ دیتاہے اپنے لیے ایک پیسہ کا تمباکو بھی لیتا ہے تو پیسہ اسی سے مانگتا ہے۔ صبح سے شام تک بن بن پھرتا ہے جو کام اس سے نہیں ہوتا اسے کیوں کر کرے۔

معاً ایک کانسٹبل نے آکر کہا ''ارے بنٹی کہاں ہے ؟چل دیکھ بھوندو کا حال۔ بے حال ہو رہا ہے۔ ابھی تک چپ چاپ بیٹھا تھا پھر نہ جانے کیا جی میں آیا کہ ایک پتھر پر سر پٹک دیا۔ سرسے لہو بہہ رہا ہے۔ ہم لوگ دوڑ کر پکڑ نہ لیتے تو جان ہی دے دی تھی۔

(٦)

ایک ہفتہ گذر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، موسلادھار برکھا ہو رہی تھی۔ بھوندو کی سرکی اب بھی اس ویرانے میں کھڑی تھی۔ بھوندو کھٹولی پر پڑا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور جسم مرجھا گیا تھا۔ وہ فکرمندانہ انداز سے بارش کی طرف دیکھتا ہے۔ چاہتا ہے اٹھ کر باہر دیکھوں مگر اٹھا نہیں جاتا۔

بنٹی سر پر گھاس کی یک گٹھری لیے پانی میں شرابور آتی دکھائی دی۔ وہی گلابی ساڑھی ہے مگر تار تار۔ لیکن اس کا چہرہ کھلا ہوا ہے، رنجِ افسوس کی جگہ اس کی آنکھوں سے محبت ٹپک رہی ہے۔ چال ایسی مستانہ ہے اور آنکھیں ایسی چمکتی ہیں کہ دیکھ کر جی خوش ہو جائے۔

بھوندو نے آہستہ آہستہ کہا'' تو اتنی بھیگ رہی ہے کہیں بیمار پڑ گئی تو کوئی ایک گھونٹ پانی دینے والا بھی نہ رہے گا۔ میں کہتا ہوں تو اتنا کیوں مرتی ہے؟ دو گٹھے تو بیچ چکی تھی اب یہ تیسرا گٹھا لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ہانڈی میں کیا لائی ہے؟

بنٹی نے ہانڈی کو چھپاتے ہوئے کہا'' کچھ بھی تو نہیں ہے۔ کیسی ہانڈی''؟

بھوندو زور لگا کر کھٹولی سے اٹھا۔ آنچل کے نیچے چھپی ہوئی ہانڈی کھول اور اس کے اندر نظر ڈال کر بولا'' ابھی لوٹا۔ نہیں تو ہانڈی پھوڑ دوں گا''۔

بنٹی نے دھوتی نچوڑتے ہوئے کہا ''ذرا آئینہ میں صورت دیکھو گھی دودھ کچھ نہ ملے گا تو کیسے اٹھو گے؟ ہمیشہ چار پائی پر ہی پڑے رہنے کا ارادہ ہے۔

بھوندو نے کھٹولی پر لیٹے ہوئے کہا ''اپنے لیے تو ایک ساڑھی بھی نہیں لائی میرے لیے گھی اور دودھ سب چاہیے۔ میں گھی نہ کھاؤں گا۔

بنٹی نے مسکرا کرکہا ''اسی لیے تو گھی کھلاتی ہوں کہ تم جلدی سے کام دھندا کرنے لگواور میرے لیے ساڑھی لاؤ۔

بھوندو بولا ''تو آج کہیں چوری کرنے جاؤں۔ کیوں''؟

بنٹی نے بھوندو کے گال پر آہستہ سے چپت لگا کر کہا'' پہلے میرا گلا کاٹ دینا پھر جانا''۔

یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ ہنس کے جون 1931 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا پریم کا اودیہ۔ مانسرور 4 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ آخری تحفہ میں شامل ہے۔ اردو میں چندن کے جولائی 1931 میں شائع ہوا۔

آخری تحفہ

سارے شہر میں صرف ایک ایسی دکان تھی جہاں ولایتی ریشمی ساڑھی مل سکتی تھی اور سبھی دکانداروں نے ولایتی کپڑے پر کانگریس کی مہر لگوائی تھی۔ مگر امرناتھ کی محبوبہ کی فرمائش تھی اس کی تعمیل ضروری تھی۔ وہ کئی دن تک شہر کی دکانوں کا چکر لگاتے رہے۔ دوگنا دام دینے پرتیار تھے لیکن کہیں مقصد پورا نہ ہوا اور اس کے تقاضے شدید سے شدیدتر ہوتے جاتے تھے۔ ہولی آرہی تھی آخر وہ ہولی کے دن کون سی ساڑھی زیب تن کرے گی؟ اس کے روبرو اپنی معذوری کا اظہار امرناتھ کی مردانہ خودداری کے لیے محال تھا۔ اس کے اشارہ سے وہ آسمان کے تارے توڑ لانے کے لیے بھی آمادہ ہو جاتے۔ آخر جب کہیں مقصد برآری نہ ہوئی تو انھوں نے اسی خاص دکان پر جانے کا ارادہ کیا۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ اس دکان پر دھرنا دیا جا رہا ہے۔ صبح سے شام تک رضا کار تعینات رہتے ہیں اور تماشائیوں کا بھی ہر دم خاصا مجمع رہتا ہے۔ اس لیے اس دکان میں جانے کے لیے ایک خاص صنف کی اخلاقی ہمت درکار تھی اور یہ ہمت امرناتھ میں ضرورت سے کم تھی۔ تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ قومی جذبات سے بھی عاری نہ تھے۔ حتی الامکان سودیشی چیزیں ہی استعمال کرتے تھے مگر اس معاملہ میں بہت راسخ نہ تھے۔ سودیشی مل جائے تو بہتر ورنہ بدیشی ہی سہی۔ اس اصول کے پیرو تھے اور خاص کر جب اس کی فرمائش تھی تب تو کوئی مفر ہی نہ تھا۔ اپنی ضروریات کو تو وہ شاید کچھ دنوں کے لیے ملتوی بھی کر دیتے مگر اس کی فرمائش تو مرگ بے ہنگام ہے۔ اس سے نجات کہاں ممکن؟ طے کر لیا کہ آج

ساڑھی ضرور لائیں گے۔ کوئی کیوں روکے؟ کسی کو روکنے کا کیا مجاز ہے؟ مانا سودیشی کا استعمال احسن ہے لیکن کسی کو جبر کرنے کا کیا حق؟ اچھی جنگِ آزادی ہے جس میں شخصی آزادی کا اتنی بے دردی سے خون ہو۔

یوں دل کو مضبوط کر کے وہ شام کو دکان پر پہنچے۔ دیکھا تو پانچ رضاکار پکٹنگ کر رہے ہیں اور دکان کے سامنے سڑک پر ہزارہا تماشائی کھڑے ہیں۔ سوچنے لگے۔ دکان میں کیسے جائیں؟ کئی بار کلیجہ مضبوط کیا اور چلے مگر برآمدہ تک جاتے ہمت نے جواب دے دیا۔

اتفاق سے ایک جان پہچان کے پنڈت جی مل گئے ان سے پوچھا۔ ''کیوں جناب !یہ دھرنا کب تک رہے گا؟ شام تو ہو گئی''۔

پنڈت جی نے فرمایا ''ان سر پھروں کو صبح اور شام سے کیا مطلب؟ جب تک دکان بند نہ ہوجائے گی یہاں سے نہ ٹلیں گے۔ کہیے کچھ خریدنے کا ارادہ ہے؟ آپ تو ریشمی کپڑا نہیں خریدتے۔

امرناتھ نے معذوری کے انداز سے کہا ''میں تو نہیں خریدتا مگر مستورات کی فرمائش کو کیسے ٹالوں؟

پنڈت جی نے مسکراکر کہا ''واہ۔ اس سے زیادہ آسان تو کوئی بات نہیں۔ عورتوں کو بھی چکمہ نہیں دے سکتے۔ سو حیلے اور ہزار بہانے ہیں''

امر ناتھ : آپ ہی کوئی حیلہ سوچیے۔

پنڈت جی : ''سوچنا کیا ہے؟ یہاں رات دن یہی کیا کرتے ہیں۔ سو پچاس حیلے ہمیشہ جیبوں میں پڑے رہتے ہیں۔ عورت نے کہا ہار بنوادو۔ کہا۔ آج ہی لو۔ دو چار روز کے بعد کہا۔ سنار مال لے کر چمپت ہو گیا۔ یہ توروز کا دھندا ہے بھائی جان۔ مستورات کا کام فرمائش کرنا ہے اور مردوں کا کام اسے خوبصورتی سے ٹالنا۔''

امر ناتھ : ''آپ تو اس فن کے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔''

پنڈت جی : کیا کریں بھائی صاحب؟ آبرو تو بچانی ہی پڑتی ہے۔ سوکھا جواب دیں تو شرمندگی الگ ہو، خفگی الگ۔ وہ سمجھیں ہماری پرواہی نہیں کرتے آبرو کا معاملہ ہے۔ آپ ایک کام کیجیے یہ تو آپ نے کہا ہی ہوگا کہ آج کل پکٹنگ ہے''

امرناتھ : ہاں یہ تو عذر کر چکا برادر۔ مگر وہ سنتی ہی نہیں۔ کہتی ہیں کیا ولایتی کپڑے دنیا سے اٹھ گئے،مجھ سے چلے ہو اڑنے۔

پنڈت جی : تو معلوم ہوتا ہے کوئی دھن کی پکی عورت ہے۔ تو میں ایک ترکیب بتاؤں۔ ایک خالی کارڈ کا بکس لے لو اس میں پرانے کپڑے جلاکر بھر لو۔ جاکر کہہ دینا میں کپڑے لیے آتا تھا والنٹیر وں نے چھین کر جلا دیے۔ کیوں؟ کیسی رہے گی؟

امر ناتھ : ''کچھ جچتی نہیں۔ اجی بیس اعتراض کریں گی۔ کہیں پردہ فاش ہو جائے تو مفت کی خفت ہو۔''

پنڈت جی : تو معلوم ہو گیا، آپ بو دے آدمی ہیں۔ اور ہیں بھی آپ کچھ ایسے ہی۔ یہاں تو کچھ اس شان سے حیلے کرتے ہیں کہ حقیقت بھی اس کے سامنے گرد ہو جائے۔ زندگی بھر یہی بہانے کرتے گذری اور کبھی گرفتار نہ ہوئے۔ ایک ترکیب اور ہے اسی نمونہ کا۔ دیسی مال لے جایئے اور کہہ دیجیے کہ ولایتی ہے۔

امر ناتھ : ''دیسی اور ولایتی کی تمیز انھیں مجھ سے اور آپ سے کہیں زیادہ ہے۔ ولایتی پر تو جلد ولایتی کا یقین نہ آئے گا۔ دیسی کی تو بات ہی کیا ہے ؟''

ایک کھدرپوش صاحب قریب ہی کھڑے یہ گفتگو سن رہے تھے بول اٹھے'' اے صاحب! سیدھی سی تو بات ہے جا کر صاف کہہ دیجیے کہ میں بدیشی کپڑے نہ لاؤں گا۔ اگر ضد کرے تو دن بھر کھانا نہ کھایئے۔ آپ راہ راست پر آجائیں گی۔

امرناتھ نے ان کی طرف کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا جو کہہ رہی تھیں آپ اس کوچہ سے نا آشنا ہیں۔ اور بولے ''یہ آپ ہی کر سکتے ہیں۔ میں نہیں کر سکتا''۔

کھدر پوش : کر تو آپ بھی سکتے ہیں لیکن کرنا نہیں چاہتے۔ یہاں تو ان لوگوں میں سے ہیں کہ اگر بدیشی دعا سے نجات ملتی ہو تو اسے بھی ٹھکرا دیں۔

امرناتھ : تو شاید آپ گھر میں پکٹنگ کرتے ہوں گے۔

کھدر پوش : ''پہلے گھر میں کر کے تب باہر کرتے ہیں بھائی صاحب۔''

کھدرپوش صاحب چلے گئے تو پنڈت جی بولے''یہ صاحب توتیس مارخاں سے بھی تیز نکلے۔ اچھا تو آپ ایک کام کیجیے۔ اس دکان کی پشت پر ایک دوسرا دروازہ ہے۔ ذرا اندھیرا ہو جائے تو ادھر سے چلے جایئے گا۔ دائیں بائیں کسی

طرف نہ دیکھیے گا۔

امرناتھ نے پنڈت جی کا شکریہ ادا کیا اور جب اندھیرا ہو گیا تو دکان کی پشت کی جانب جاپہونچے۔ ڈر رہے تھے کہیں یہاں بھی محاصرہ نہ ہو۔ لیکن میدان خالی تھا۔ لپک کر اندر گئے ایک بیش قیمت ساڑھی خریدی اور باہر نکلے تو ایک دیوی جی زعفرانی ساڑھی پہنے کھڑی تھی۔ ان کی روح فنا ہو گئی۔ دروازہ سے باہر پاؤں رکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ایک منٹ تک تو کواڑ کی آڑ میں چھپے کھڑے رہے۔ پھر دیوی جی کا رخ دوسری طرف دیکھ کر تیزی سے نکل پڑے۔ اور کوئی سو قدم بھاگتے ہوئے چلے گئے۔ شامت اعمال سامنے سے ایک بڑھیا لٹھیا ٹیکتی چلی آرہی تھی۔ آپ اس سے لڑ گئے۔ بڑھیا گر پڑی۔ اور لگی بددعائیں دینے۔ ارے مردودے! یہ جوانی بہت دن نہ رہے گی۔ آنکھوں میں چربی چھاگئی ہے۔ دھکے دیتا چلتا ہے۔

امرناتھ اس کی خوشامدیں کرنے لگے۔ ماتا، معاف کرو۔ مجھے رات کو کچھ کم نظر آتا ہے۔ عینک گھر بھول آیا''۔

بڑھیا کا مزاج ٹھنڈا ہوا۔ آگے بڑھی اور آپ بھی چلے۔ دفعتاً کانوں میں آواز آئی ''بابوصاحب، ذرا ٹھہریئے گا'' اور وہی زعفرانی کپڑوں والی دیوی جی آتی ہوئی دکھائی دیں۔

امرناتھ کے پاؤں بندھ گئے۔ اس طرح کلیجہ مضبوط کر کے کھڑے ہو گئے جیسے کوئی طالب علم ماسٹر کی بید کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔

دیوی جی نے قریب آکر کہا '' آپ تو ایسے بھاگے کہ میں گویا آپ کو کاٹ کھاؤں گی۔ آپ جب پڑھے لکھے آدمی ہو کر اپنا فرض نہیں پہچانتے تو افسوس ہوتا ہے۔ ملک کی کیا حالت ہے؟ لوگوں کو کھدر نہیں ملتا آپ ریشمی ساڑھیاں خرید رہے ہیں۔''

امرناتھ نے شرمندہ ہو کر کہا'' میں سچ کہتا ہوں دیوی جی۔ میں نے اپنے لیے نہیں خریدی۔ ایک صاحب کی فرمائش تھی۔

دیوی جی نے جھولی سے ایک چوڑی نکال کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''ایسے حیلے روز ہی سنا کرتی ہوں۔ یا تو آپ اسے واپس کر دیجیے یا لائیے ہاتھ

میں آپ کو چوڑی پہنا دوں۔

امر ناتھ : شوق سے پہنا دیجیے۔ میں اسے بڑے فخر سے پہنوں گا۔ چوڑی اس قربانی کی ایک علامت ہے جو دیویوں کی زندگی کے لیے مخصوص ہے۔ چوڑیاں ان دیویوں کے ہاتھ میں بھی تھیں جن کے نام سن کر آج بھی ہم تعظیم سے سر جھکاتے ہیں۔ میں تو اسے شرم کی بات نہیں سمجھتا۔ آپ اگر اور کوئی چیز پہنانا چاہیں تو وہ بھی شوق سے پہنا دیجیے۔ عورت پرستش کی چیز ہے۔ حقارت کی چیز نہیں۔ اگر عورت جو قوم کو پیدا کرتی ہے چوڑی پہننا باعث فخر سمجھتی ہے تو مردوں کے لیے چوڑی پہننا باعث شرم کیوں ہو؟

دیوی جی کو ان کی اس بے غیرتی پر حیرت تو ہوئی مگر وہ اتنی آسانی سے امرناتھ کو چھوڑنے والی نہ تھی۔ بولی آپ باتوں کے شیر معلوم ہوتے ہیں۔ اگر آپ دل سے عورت کو پرستش کی چیز مانتے ہیں تو میری یہ استدعا کیوں نہیں مان جاتے؟

امر ناتھ : اس لیے کہ یہ ساڑھی بھی ایک عورت کی فرمائش ہے۔

دیوی : اچھا چلیئے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ ذرا دیکھوں آپ کی دیوی جی کس مزاج کی عورت ہے''؟

امر ناتھ کا دل بیٹھ گیا۔ غریب ابھی تک بن بیاہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ ان کی شادی نہ ہوئی تھی بلکہ اس لیے کہ شادی کو وہ ایک قید زیست سمجھتے تھے۔ مگر آدمی رنگین مزاج تھے۔ تاہل سے محترز رہ کربھی تاہل کی دل فریبیوں سے بے نیاز نہ تھے۔کسی ایسے وجود کی ضرورت ان کے لیے لازمی تھی جس پر وہ محبتوں کو نثار کر سکیں۔جس کی تراوٹ سے وہ اپنی خشک زندگی کو تروتازہ کر سکیں۔ جس کے سایہ الفت میں وہ ذرا دیر کے لیے ٹھنڈک پا سکیں جس کے دل میں وہ اپنی انڈی ہوئی جوانی کے جذبات بکھیر کر ان کا اگنا دیکھ سکیں۔ ان کی نظر انتخاب مالتی پر پڑی تھی۔ جس کی شہر میں دھوم تھی۔ ادھر ڈیڑھ دو سال سے وہ اسی خرمن کے خوشہ چیں بنے ہوئے تھے۔ دیوی جی کے اصرار نے انھیں ذرا دیر کے لیے چپقلش میں ڈال دیا۔ ایسی ندامت انھیں زندگی میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ بولے ''آج تو وہ ایک تقریب میں گئی ہیں۔ گھر میں نہ ہوں گی۔

دیوی جی نے بے اعتباری سے ہنس کر کہا ''تو میں سمجھ گئی یہ آپ کی دیوی جی کا قصور نہیں، آپ کا قصور ہے''

امرناتھ نے خفیف ہوکر کہا''میں آپ سے سچ کہتا ہوں آج وہ گھر پر نہیں ہیں۔''

دیوی جی نے پوچھا ''کل آجائیں گی''۔

امرناتھ بولے'' ہا ں کل آجائیں گی''۔

دیو ی: تو آپ یہ ساڑھی مجھے دے دیجیے اور کل یہیں آجایئے گا میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔ میرے ساتھ دو چار بہنیں بھی ہوں گی۔

امرناتھ نے بے عذر وہ ساڑھی دیوی جی کو دے دی۔ اور بولے ''بہت خوب۔ میں کل آجاؤں گا مگر کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے جو ساڑھی کی ضمانت درکار ہے ؟

دیوی جی نے مسکرا کر کہا ''سچی بات تو یہی ہے کہ مجھے آپ پر اعتبار نہیں''۔

امرناتھ نے خودداری کے ساتھ کہا ''اچھی بات ہے آپ اسے لیے جائیں''۔

دیوی جی نے ایک لمحہ کے بعد کہا ''شاید آپ کو ناگوار گذر رہا ہو کہ کہیں ساڑھی گم نہ ہو جائے۔ اسے آپ لیتے جایئے مگر کل آیئے ضرور''

امر ناتھ کو ایسی غیرت آئی کہ بغیر کچھ کہے گھر کی طرف چل دیے۔ دیوی جی لیتے جایئے، لیتے جایئے، کرتی رہ گئیں۔

(۲)

امر ناتھ گھر جاکر ایک کھدر کی دکان پر گئے اور دو سو ٹوں کا کھدر خریدا۔ پھر اپنے درزی کے پاس لے جا کر بولے'' خلیفہ اسے راتوں رات تیار کر دو، منھ مانگی سلائی دوں گا''۔

درزی نے کہا ''بابو صاحب، آج کل تو ہولی کی بھیڑ ہے، ہولی سے پہلے تیار نہ ہوسکیں گے۔''

امرناتھ نے اصرار کے ساتھ کہا'' میں منھ مانگی سلائی دوں گا مگر کل دوپہر تک مل جائیں۔ مجھے کل ایک جگہ جانا ہے۔ اگر دوپہر تک نہ ملے تو پھر میرے کسی

مصرف کے نہ ہوں گے۔

درزی نے آدھی سلائی پیشگی لے لی اور کل تیار کر دینے کا وعدہ کیا۔

امرناتھ یہاں سے مطمئن ہو کر مالتی کی طرف چلے۔ قدم آگے بڑھتے تھے لیکن دل پیچھے رہا جاتا تھا۔ کاش وہ ان کی اتنی التجا قبول کر لے کہ کل دو گھنٹہ کے لے ان کے خانۂ ویران کو روشن کرے۔ لیکن یقیناً وہ انھیں خالی ہاتھ دیکھ کر منھ پھیر لے گی۔ سیدھے منھ بات نہیں کرے گی۔ آنے کا ذکر ہی کیا۔ ایک ہی بے مروت ہے۔ تو کل آکر دیوی جی سے اپنی ساری شرمناک داستان بیان کر دوں؟ اس معصوم چہرہ کی بے لوث سرگرمی ان کے دل میں ایک ہیجان پیدا کر رہی تھی۔ ان آنکھوں میں متانت تھی۔ کتنا سچا جذبۂ درد، کتنا خلوص، اس کے سیدھے سادے الفاظ میں کل ایسی تحریک عمل تھی کہ امرناتھ کو اپنی نفس پر ورانہ زندگی پر شرم آرہی تھی۔ اب تک کانچ کے ایک ٹکڑے کو ہیرا سمجھ کر سینہ سے لگائے ہوئے تھے آج انھیں معلوم ہوا ہیرا کسے کہتے ہیں۔ اس کے سامنے وہ ٹکڑا حقیر معلوم ہو رہا تھا۔ مالتی کی وہ جادو بھری چتون، اس کی وہ شیریں ادائیں، اس کی شوخیاں اور سحر طرازیاں سب گو یا ملمع اڑ جانے کے بعد اپنی اصلی صورت میں نظر آرہی تھیں۔ اور امرناتھ کے دل میں نفرت پیدا کر رہی تھیں۔ وہ مالتی کی طرف جا رہے تھے اس کے دیدار کے لیے نہیں بلکہ اس کے ہاتھوں سے اپنا دل چھین لینے کے لیے، محبت کا گداگر آج اپنے اندر ایک عجیب استغنا کا احساس کر رہا تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ اب تک وہ کیوں اتنا بے خبر تھا۔ وہ طلسم جو مالتی نے برسوں کے عشوہ وفریب سے باندھا تھا آج کسی چھومنتر سے تار تار ہو گیا تھا۔

مالتی نے انھیں خالی ہاتھ دیکھ کر چیں بہ جبیں ہو کر کہا ''ساڑھی لائے یا نہیں؟

امرناتھ نے بے نیازی کی شان سے جواب دیا ''نہ''۔

مالتی نے استعجاب سے ان کی طرف دیکھا '' نہ'' وہ ان کے منھ سے یہ لفظ سننے کی عادی نہ تھی۔ یہاں اس نے کامل تسلیم پائی تھی۔ اس کا اشارہ امرناتھ کے لیے نوشتہ تقدیر تھا۔ بولی ''کیوں''؟

امرناتھ : کیوں کیا؟ نہیں لائے۔

مالتی : بازار میں ملی نہ ہوگی۔ تمھیں کیوں ملنے لگی اور میرے لیے؟
امر ناتھ :   نہیں صاحب ملی،مگر لا یا نہیں۔
مالتی : آخر کوئی وجہ ؟ روپئے مجھ سے لے جاتے۔
امر ناتھ :   تم خواہ مخواہ جلاتی ہو۔ تمھارے لیے میں جان دینے کو حاضر رہا۔
مالتی :   تو شاید تمھیں روپئے جان سے بھی پیارے ہوں گے۔
امر ناتھ :   تم مجھے بیٹھنے دو گی یا نہیں۔ اگر میری صورت سے نفرت ہو تو چلا جاؤں۔
مالتی : تمھیں آج ہو کیا گیا ہے، تم تو اتنے تیز مزاج نہ تھے؟
امر ناتھ :   تم باتیں ہی ایسی کر رہی ہو۔
مالتی : تو آخر میری چیز کیوں نہیں لائے؟

امرناتھ نے اس کی طرف دلیرانہ انداز سے دیکھ کر کہا ''دکان پر گیا، ذلّت اٹھائی اور ساڑھی لے کر چلا تو ایک عورت نے چھین لی۔ میں نے کہا ''میری بیوی کی فرمائش ہے۔ تو بولی۔ میں انھیں کو دوں گی۔ کل تمھارے گھر آؤں گی۔

مالتی نے شرارت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا ''تو یہ کہئے آپ دل ہتھیلی پر لیے پھر رہے تھے۔ ایک نازنین کو دیکھا اور اس کے قدموں پر نثار کردیا۔

امر ناتھ :   وہ ان عورتوں میں نہیں جو دلوں کی گھات میں رہتی ہیں۔
مالتی : تو کوئی دیوی ہو گی؟
امرناتھ :   میں اسے دیوی ہی سمجھتا ہوں۔
مالتی : تو آپ اس دیوی کی پوجا کیجیے گا۔
امرناتھ : مجھ جیسے آوارہ نوجوان کے لیے اس مندر کے دروازے بند ہیں۔
مالتی : بہت حسین ہوگی۔
امرناتھ :   نہ حسین ہے نہ جمیل، نہ خوش ادا ہے نہ شیریں گفتار، اور نہ نازک بدن بالکل ایک معمولی معصوم لڑکی ہے۔ لیکن جب میرے ہاتھ سے اس نے ساڑھی چھین لی تو میں کیا کرسکتا تھا؟ میری غیرت نے تو تقاضا نہ کیا کہ اس کے ہاتھ سے ساڑھی چھین لوں۔ تمھیں انصاف کرو وہ دل میں کیا کہتی؟

مالتی : تو تمھیں اس کی زیادہ پروا ہے کہ وہ اپنے دل میں کیا کہے گی؟ میں کیا کہوں گی تمھیں کی مطلق پروا نہ تھی۔ میرے ہاتھ سے کوئی مرد میری کوئی چیز چھین لے تو دیکھوں ۔ چاہے وہ یوسف ثانی ہی کیوں نہ ہو۔

امر ناتھ : ''اب اسے چاہے میری بزدلی سمجھو، چاہے کم ہمتی، چاہے شرافت، میں اس کے ہاتھ سے نہ چھین سکا۔''

مالتی : تو کل وہ ساڑھی لے کر آئے گی۔کیوں؟

امرناتھ : ضرور آئے گی۔

مالتی : تو جا کر منہ دھو آؤ۔ تم اتنے سادہ لوح ہو مجھے معلوم نہ تھا۔ ساڑھی دے کر چلے آئے اب کل وہ آپ کو دینے آئے گی۔ کچھ بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو ؟

امرناتھ : خیر، اس کا امتحان کل ہو ہی جائے گا۔ ابھی سے کیوں بد گمانی کرتی ہو؟ تم شام کو ذرا دیر کے لیے میرے گھر تک چلی چلنا۔

مالتی : جس سے آپ کہیے کہ یہ میری بیوی ہے۔

امرناتھ : مجھے کیا خبر تھی کہ وہ میرے گھر آنے کے لیے تیار ہو جائے گی؟ نہیں تو کوئی اور بہانہ کر دیتا۔

مالتی : تو آپ کی ساڑھی آپ کو مبارک ہو، میں نہیں جاتی۔

امرناتھ : میں تو روز تمھارے گھر آتا ہوں تم ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتی۔

مالتی نے سنگدلی سے کہا ''اگر موقعہ آجائے تو تم اپنے کو میرا شوہر کہلانا پسند کروگے؟ دل پر ہاتھ رکھ کر کہنا''۔

امر ناتھ دل میں کٹ گئے بات بناتے ہوئے بولے ''مالتی، تم میرے ساتھ بے انصافی کررہی ہو۔ برا نہ ماننا۔ میرے اور تمھارے درمیان باوجود پیار اور محبت کے اظہار کے ایک مغائرت کا پردہ حائل تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی حالت کو سمجھتے تھے اور اس پردہ کو ہٹانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔ یہ پردہ ہمارے تعلقات کی لازمی شرط تھا۔ ہمارے درمیان ایک تاجرانہ سمجھوتہ سا ہو گیا۔ ہم دونوں اس کی گہرائی میں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ نہیں! بلکہ میں ڈرتا تھا۔ اور تم ارادۃً نہ جانا چاہتی

تھی۔ اگر مجھے یقین ہو جاتا کہ تمھیں رفیق حیات بنا کر میں وہ سب کچھ پا جاؤں گا جس کا میں اپنے کو مستحق سمجھتا ہوں تو میں اب تک کبھی کا تم سے اس کی التجا کر چکا ہوتا۔ لیکن تم نے کبھی میرے دل میں یہ اعتبار پیدا کرنے کی پروا نہ کی۔ میری نسبت بھی تمھیں یہ شک ہے میں نہیں کہہ سکتا۔ تمھیں یہ شک کرنے کا میں نے کوئی موقعہ نہیں دیا۔ اور میں کہہ سکتا ہوں کہ میں اس سے کہیں بہتر شوہر بن سکتا ہوں جتنی تم بیوی بن سکتی ہو۔ میرے لیے صرف اعتبار کی ضرروت ہے اور تمھارے لیے زیادہ وزنی اور زیادہ مادی چیزوں کی۔ میری مستقل آمدنی پانسو سے زیادہ نہیں تم اس پر قناعت نہ کروگی میرے لیے صرف اس اطمینان کی ضرورت ہے کہ تم میری اور صرف میری ہو۔ بولو منظور ہے۔

مالتی کو امر ناتھ پر رحم آ گیا۔ اس کی باتوں میں جو صداقت بھری ہوئی تھی اس سے وہ انکار نہ کرسکی۔ اسے یہ بھی یقین ہو گیا کہ امرناتھ کی وفا میں لغزش نہ ہوگی۔ اسے اپنے اوپر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اسے رسی سے مضبوط جکڑ سکتی ہے۔ لیکن خود جکڑے جانے پر وہ اپنے کو آمادہ نہ کرسکی۔اس کی زندگی محبت کی بازی گری میں، الفت کی نمائش میں گذری تھی۔ وہ کبھی اِس کبھی اُس شاخ پر چہکتی پھرتی تھی۔ بے قید، آزاد، بے بند، کیا وہ طائر کنج قفس میں خوش رہ سکتا ہے جس کی زبان انواع واقسام کے مزوں کی عادی ہوگئی ہو۔ کیا وہ نانِ خشک پر آسودہ ہو سکتا ہے؟ اس احساس نے اسے نرم کر دیا۔ بولی:

''آج تم بڑی علمیت بگھارہے ہو''۔

امر ناتھ : میں نے تو صرف واقعات بیان کئے ہیں۔

مالتی : اچھا میں کل چلوں گی۔ مگر ایک گھنٹہ سے زیادہ وہاں نہ رہوں گی۔

امرناتھ کا دل شکریہ سے لبریز ہو گیا۔ بولا:

''میں تمھارے بے حد مشکور ہوں مالتی۔ اب میری آبرو بچ جائے گی۔ نہیں تو میرے لیے گھر سے نکلنا مشکل ہو جاتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اپنا پارٹ کتنی خوبصورتی سے ادا کرتی ہو؟

مالتی : اس کی طرف سے تم اطمینان رکھو۔ بیاہ نہیں کیا مگر براتیں دیکھی ہیں۔ مگر

میں ڈرتی ہوں کہیں تم مجھ سے دغا نہ کر رہے ہو۔ مردوں کا کیا اعتبار؟

امرناتھ نے خلوص دل سے کہا:

''نہیں مالتی، تمھارا شبہہ بے بنیاد ہے۔ اگر یہ زنجیر پیروں میں ڈالنے کا آرزومند ہوتا تو کبھی کا ڈال چکا ہوتا۔ پھر مجھ سے نفس کے بندوں کا وہاں گذر ہی کہاں؟

(۳)

دوسرے دن امر ناتھ دس بجے ہی درزی کی دکان پر جا پہنچے اور سر پر سوار ہو کر کپڑے تیار کرائے۔ پھر گھر آ کر نئے کپڑے پہنے اور مالتی کو بلانے چلے۔ وہاں دیر ہو گئی۔ اس نے ایسا بناؤ سنگار کیا گویا آج بہت بڑا معرکہ سر کرنا ہے۔

امرناتھ نے کہا ''وہ حسین نہیں جو تم اتنی تیاریاں کر رہی ہو''

مالتی نے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا ''تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ چپ چاپ بیٹھے رہو۔

امر ناتھ : لیکن دیر جو ہو رہی ہے۔

مالتی : کوئی مضائقہ نہیں۔

خطرہ کے اس فطری احتمال نے جو عورتوں کے لیے مخصوص ہے مالتی کو زیادہ محتاط کر دیا تھا۔ اب تک اس نے کبھی امرناتھ کی جانب خصوصیت کے ساتھ التفات نہ کیا تھا۔ اس سے بے پروائی سے سلوک کرتی تھی۔ لیکن کل امرناتھ کے بشرہ سے اسے ایک خطرہ کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ اس خطرہ کا اپنی پوری طاقت سے مقابلہ کرنا چاہتی تھی۔ دشمن کو حقیر اور بے چارا سمجھنا صنف نازک کے لیے مشکل ہے۔ آج امرناتھ کو اپنے ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر وہ اپنی گرفت کو مضبوط کر رہی تھی۔ اگر اس طرح اس کی چیزیں ایک ایک کر کے نکل گئیں تو پھر وہ اپنا وقار کب تک قائم رکھ سکے گی؟ جس چیز پر اس کا قبضہ ہے اس کی طرف کوئی آنکھ ہی کیوں اٹھائے؟ راجہ بھی تو ایک ایک انگلی زمین کے پیچھے جان دیتا ہے۔ وہ اس نئے شکاری کو ہمیشہ کے لیے اپنے راستہ سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ اس کے جادو کو توڑ دینا

چاہتی تھی۔

شام کو وہ غیرت حور بن کر اپنی خادمہ اور نوکر کو ساتھ لیے امر ناتھ کے گھر چلی۔ امرناتھ نے صبح دس بجے تک مردا نے گھر کو زنانے پن کا رنگ دینے میں صرف کیا تھا۔ ایسی تیاریاں کر رکھی تھیں گویا کوئی افسر معائنہ کر نے والا ہے۔ مالتی نے گھر میں قدم رکھا، تو اس کی صفائی اور سجاوٹ دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ زنانے حصہ میں کئی کرسیاں رکھی تھیں۔ بولی:

اب لاؤ اپنی دیوی جی کو۔ مگر جلد آنا۔ ورنہ میں چلی جاؤں گی۔

امرناتھ لپکے ہوئے ولایتی کپڑے کی دکان پر گئے۔ آج بھی دھرنا تھا تماشائیوں کا وہی ہجوم۔ وہاں دیوی جی نہ تھیں۔ پشت کی جانب گئے تو دیوی جی ایک لڑکی کے ساتھ اسی بھیس میں کھڑی تھیں۔

امرناتھ نے کہا ''معاف کیجیے گا۔ مجھے دیر ہو گئی۔ میں آپ کے وعدہ کی یاد دلانے آیا ہوں''

دیوی جی نے کہا ''میں تو آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ چلو سمترا ذرا آپ کے گھر ہو آئیں۔ کتنی دور ہے؟

امر ناتھ : بہت قریب ہے۔ ایک ٹانگہ کر لوں گا۔

پندرہ منٹ میں امر ناتھ دونوں کو لیے گھر جا پہنچے۔ مالتی نے دیوی جی کو دیکھا اور دیوی جی نے مالتی کو۔ ایک کسی رئیس کا محل تھا عالی شان۔ دوسرا کسی فقیر کی کٹیا تھی۔مختصر اور حقیر۔ رئیس کے محل میں تکلف اور نمائش تھی۔ فقیر کی کٹیا میں سادگی اور صفائی۔ مالتی نے دیکھا۔ معصوم دوشیزہ ہے جسے کسی صورت حسین نہیں کہہ سکتے۔ پر اس کی معصومیت اور سادگی میں جو کشش تھی اس سے وہ غیر متاثر نہ رہ سکی۔ دیوی جی نے بھی دیکھا ایک تکلف پسند، بے باک اور مغرور عورت ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے اس گھر میں بے گانہ سی معلوم ہو رہی ہے۔ جیسے کوئی جنگلی جانور پنجرے میں آ گیا ہو۔

امرناتھ سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑے تھے۔ اور ایشور سے دعا کر رہے تھے کہ کسی طرح آج پردہ رہ جائے۔

دیوی نے آتے ہی کہا ''بہن ! آپ اب بھی سر سے پاؤں تک بدیشی کپڑے پہنے ہوئی ہیں؟

مالتی نے امرناتھ کی طرف دیکھ کر کہا ''میں بدیشی اور دیسی کے پھیر میں نہیں پڑتی۔ جو یہ لاکر دیتے ہیں وہ پہنتی ہوں۔ لانے والے ہیں یہ میں تھوڑی بازار جاتی ہوں۔

دیوی نے گلہ آمیز نظروں سے امرناتھ کی طرف دیکھ کر کہا ''آپ تو کہتے تھے یہ ان کی فرمائش ہے۔ مگر آپ ہی کا قصور نکل آیا۔

مالتی : تو میرے سامنے ان سے کچھ نہ کہو ''تم بازار میں بھی دوسرے مردوں سے باتیں کر سکتی ہو۔ جب وہ باہر چلے جائیں تو جتنا جی چاہے کہہ سن لینا۔ میں اپنے کانوں سے نہیں سننا چاہتی۔

دیوی جی : میں کچھ کہتی نہیں۔ اور بہن جی میں کہہ ہی کیا سکتی ہوں؟ کوئی زبردستی تو ہے نہیں۔ صرف عرض کر سکتی ہوں۔

مالتی : اس کے معنی یہ ہیں کہ انھیں اپنے ملک کی بھلائی کا ذرا بھی خیال نہیں۔ اس کا ٹھیکہ تمھیں نے لے لیا ہے۔ پڑھے لکھے آدمی ہیں دس آدمی عزت کرتے ہیں۔ اپنا نفع نقصان سمجھ سکتے ہیں تمھیں مجاز نہیں کہ انھیں اپدیش دینے بیٹھو۔ یا سب سے زیادہ عقلمند تمھیں ہو؟

دیوی جی : آپ میرا منشاء غلط سمجھ رہی ہیں بہن!

مالتی : ہاں غلط تو سمجھوں گی ہی۔ اتنی تمیز کہاں سے لاؤں کہ آپ کی باتوں کا مطلب سمجھوں۔ کھدر کی ساڑھی پہن لی، جھولی لٹکالی، ایک بلا لگا لیا، بس اب اختیار ہے جہاں چاہیں آئیں جائیں، جس سے چاہیں ہنسیں بولیں، گھر میں کوئی پوچھتا نہیں تو جیل خانے کا بھی کیا ڈر؟ میں اسے ہٹروں گا پن سمجھتی ہوں۔ جو شریفوں کی بہو بیٹیوں کے لیئے جائز نہیں۔

امرناتھ دل میں کٹے جا رہے تھے۔ چھپنے کے لیے بل ڈھونڈ رہے تھے۔ دیوی کی پیشانی پر ذرا بل نہ تھا۔ لیکن آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔

امرناتھ نے مالتی سے ذرا تیز لہجہ میں کہا ''کیوں خواہ مخواہ کسی کا دل دکھاتی ہو۔ یہ

دیویاں اپنا عیش و آرام چھوڑ کر یہ کام کررہی ہیں۔ کیا تمھیں اس کی بالکل خبر نہیں؟

مالتی رہنے دو۔ بہت تعریف نہ کرو۔ زمانہ کا رنگ ہی بدلا جا رہا ہے۔ میں کیا کروں گی۔ اور تم کیا کروگے؟ تم مردوں نے عورتوں کو گھر میں اتنی بری طرح قید کیا کہ آج وہ رسم و رواج، شرم و حیا کو چھوڑ کر نکل آئی ہیں۔ اور کچھ دنوں میں تم لوگوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا جاتا ہے۔ ولایتی اوربدیشی تو دکھانے کے لیے ہے اصل میں یہ آزادی کی خواہش ہے جو تمھیں حاصل ہے۔ تم اگر دو چار شادیاں کر سکتے ہو تو عورت کیوں نہ کرے یہ ہے حقیقت۔ اگر آنکھیں ہیں تو اب کھول کر دیکھو۔ مجھے وہ آزادی نہ چاہیے۔ یہاں تو لاج دھوتے ہیں۔ اور میں شرم و حیا کو اپنا سنگار سمجھتی ہوں۔

دیوی جی نے امرناتھ کی طرف فریاد کی آنکھوں سے دیکھ کر کہا ''بہن نے عورتوں کو ذلیل کرنے کی قسم سی کھالی ہے۔ میں بڑی بڑی امیدیں لے کر آئی تھی مگر شاید یہاں سے ناکام جانا پڑے گا۔

امرناتھ نے وہ ساڑھی اسے دیتے ہوئے کہا'' نہیں بالکل ناکام تو آپ نہیں جائیں گی۔ ہاں متوقع کامیابی نہ ہو گی''۔

مالتی نے تحکمانہ انداز سے کہا ''وہ میری ساڑھی ہے۔ تم اسے نہیں دے سکتے۔

امر ناتھ نے خفت آمیز لہجہ میں کہا'' اچھی بات ہے نہ دوں گا۔ دیوی جی ایسی حالت میں تو شاید آپ مجھے معاف کریں گی۔

دیوی جی چلی گئیں تو امرناتھ نے تیوریاں بدل کر کہا ''یہ تم نے آج میرے منہ میں کالکھ لگادی۔ تم اتنی بدتمیز اور بدزبان ہو مجھے معلوم نہ تھا۔

مالتی نے تند لہجہ میں کہا ''تو اپنی ساڑھی اسے دے دیتی؟ میں ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہوں۔ اب تو بدتمیز بھی ہوں، بدزبان بھی، اس دن ان برائیوں میں سے ایک بھی نہ تھی جب میری جوتیاں سیدھی کرتے تھے۔ اس چھوکری نے موہنی ڈال دی۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ مبارک ہو۔''

یہ کہتی ہوئی مالتی باہر نکلی۔ اس نے سمجھا تھا چرب زبانی اور حسن کی طاقت سے وہ اس دوشیزہ کو اکھاڑ پھینکے گی۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ امرناتھ آسانی سے قابو

میں آنے والا نہیں تو اس نے پھٹکار بتائی۔ ان داموں اگر امرناتھ مل سکتا تھا تو برا نہ تھا۔ اس سے زیادہ قیمت وہ ان کے لیے دے نہ سکتی تھی۔

امرناتھ اس کے ساتھ دروازے تک آئے جب وہ تانگہ پر بیٹھی تو منت کر کے بولے۔

یہ ساڑھی دے دو نا مالتی۔ میں تمھیں کل اس سے بدرجہا بہتر ساڑھی لا دوں گا۔

مگر مالتی نے بے اعتنائی کے ساتھ کہا "یہ ساڑھی تو اب لاکھ روپے پر بھی نہیں دے سکتی۔

امرناتھ نے تیوریاں بدل کر جواب دیا۔" اچھی بات ہے۔ لے جاؤ مگر یہ سمجھ لو یہ میرا آخری تحفہ ہے۔

مالتی نے ہونٹ چبا کر کہا "اس کی پروا نہیں، تمھارے بغیر میں مر نہ جاؤں گی۔ اس کا تمھیں یقین دلاتی ہوں۔"

یہ افسانہ پہلی بار لاہور کے اردو ماہنامہ چندن کے اگست 1931 کے شمارے میں شائع ہوا۔ آخری تحفہ میں شامل ہے۔ ہندی میں یہ گپت دھن نمبر ا میں شامل ہے۔

تاوان

چھکوڑی لال نے دوکان کھولی اور کپڑے کے تھانوں کو نکال نکال کر رکھنے لگا کہ ایک مہیلا دو سویم سیوکوں کے ساتھ اس کی دکان چھیکنے آ پہنچی۔ چھکوڑی کے پران نکل گئے۔

مہیلا نے ترسکار کر کے کہا۔ کیوں لالا تم نے سیل توڑ ڈالی نا؟

اچھی بات ہے دیکھیں تم کیسے ایک گرہ کپڑا بھی بیچ لیتے ہو بھلے آدمی تمھیں شرم نہیں آتی کہ دیش میں یہ سنگرام چھڑا ہوا ہے اور توم ولایتی کپڑا بیچ رہے ہو، ڈوب مرنا چاہیے۔ عورتیں تک گھروں سے نکل پڑی ہیں۔ پھر بھی تمھیں لجا نہیں آتی تم جیسے کائر دیش میں نہ ہوتے تو اس کی یہ ادھوگتی نہ ہوتی۔

چھکوڑی نے واستو میں کل کانگریس کی سیل توڑ ڈالی تھی یہ ترسکار سن کر اس نے سر نیچا کر لیا۔ اس کے پاس کوئی صفائی نہ تھی کوئی جواب نہ تھا۔ اس کی دوکان بہت چھوٹی تھی۔ لہنے پر کپڑے لاکر بیچا کرتا تھا۔ یہی جیویکا تھی۔ اسی پر وردھ ماتا، روگنی استری اور پانچ بیٹے بیٹوں کا نرواہ ہوتا تھا۔ جب سوراجیہ سنگرام چھڑا اور سبھی بجاج ولایتی کپڑوں پر مہریں لگوانے لگے۔ تو اس نے بھی مہر لگوا لی۔ دس پانچ تھان سودیشی کپڑوں کے ادھار لاکر دوکان پر رکھ لیے۔ پر کپڑوں کا میل نہ تھا، اس لیے بکری کم ہوتی تھی۔ کوئی بھولا بھٹکا گاہک آجاتا تو روپیہ آٹھ آنے کی بکری ہوجاتی۔ دن بھر دکان میں تپسیا سی کر کے پہر رات گھر لوٹ جاتا تھا۔ گرہستی کا خرچ اس بکرّی میں کیا چلتا۔ کچھ دن قرض ورض لے کر کام چلایا پھر گہنے بیچنے کی

نوبت آئی یہاں تک کہ اب گھروں میں کوئی ایسی چیز نہ بچی، جس سے دو چار مہینے پیٹ کا بھوت سر سے ٹالا جاتا۔ ادھر استری کا روگ اسادھیہ ہوتا جاتا ہے۔ بنا کسی کشل ڈاکٹر کو دکھائے کام نہ چل سکتا تھا۔ اسی چنتا میں ڈوب اترا رہا تھا کہ ولایتی کپڑے کا ایک گاہک مل گیا جو ایک مشت دس روپے کا مال لینا چاہتا تھا۔ اس پرلوبھن کو وہ نہ روک سکا۔

استری نے سنا تو کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ میں مہر توڑنے کو کبھی نہ کہوں گی۔ ڈاکٹر تو کچھ امرت پلا نہ دے گا۔ تم نکو کیوں بنو۔ بچنا ہوگا بچ جاؤں گی مرنا ہوگا مرجاؤں گی۔ بے آبروئی تو نہ ہوگی۔ میں جی کر بھی گھر کا کیا اپکار کر رہی ہوں۔ اور سب کو دک کر رہی ہوں۔ دیش کو سوراجیہ ملے لوگ سکھی ہوں بَلا سے میں مرجاؤں گی۔ ہزاروں آدمی جیل جا رہے ہیں کتنے گھر تباہ ہو گئے تو کیا سب سے پیاری میری ہی جان ہے؟

پر چھکوڑی اتنا پکا نہ تھا اپنا بس چلتے وہ استری کو بھاگیہ کے بھروسے نہ چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے چپکے سے مہر توڑ ڈالی۔ اور لاگت کے داموں دس روپے کے کپڑے بیچ لیے۔

اب ڈاکٹر کو کیسے لے جائیں۔ استری سے کیا پردہ رکھنا۔ اسے جاکر صاف صاف سارا ورتانت کہہ سنایا اور ڈاکٹر کو بلانے چلا۔

استری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں اگر تم نے ضد کی تو میں دوا کی طرف ہاتھ بھی نہ اٹھاؤں گی۔

چھکوڑی اور اس کی ماں نے روگنی کو بہت سمجھایا۔ پر وہ ڈاکٹر کو بلانے پر راضی نہ ہوئی۔ چھکوڑی نے دسوں روپئے اٹھا کر گھر کٹیاں میں پھینک دیے۔ اور بنا کچھ کھاتے پیے قسمت کو روتا چھینکتا دوکان پر چلا آیا۔ اسی وقت پیکٹ کرنے والے آپہنچے اور اسے پھٹکارنا شروع کر دیا۔ پڑوس کے دوکان دار نے کانگریس کمیٹی میں جاکر چغلی کھائی تھی۔

(۲)

چھکوڑی نے مہیلا کے لیے اندر سے لوہے کی اک ٹوٹی بے رنگ کرسی نکالی اور لپک کر ان کے لیے لایا۔ جب وہ پان کھا کر کرسی پر بیٹھی تو اس نے اپنے اپرادھ کے لیے چھما مانگی۔ بولا۔ بہن جی، بے شک مجھ سے یہ اپرادھ ہوا ہے، لیکن میں نے مجبور ہو کر مہر توڑی۔ اب کی مجھے معافی دیجیے پھر ایسی خطا نہ ہوگی۔

دیش سیوکا نے تھانے داروں کے رعب کے ساتھ کہا۔ یوں اپرادھ چھما نہیں ہوسکتا۔ تمھیں اس کا تاوان دینا پڑے گا۔ تم نے کانگریس کے ساتھ وشواس گھات کیا ہے۔ اور اس کا تمھیں دنڈ ملے گا۔ آج ہی بائیکاٹ کمیٹی میں یہ معاملہ پیش ہوگا۔

چھکوڑی بہت ہی ونیت بہت ہی سہتنو تھا، لیکن چنتاگنی میں تپ کر اس کا ہردے اس دشا کو پہنچ گیا تھا، جب ایک چوٹ بھی چنگاریاں پیدا کرتی ہے۔ تنک کر بولا۔ تاوان تو میں نے دے سکتا ہوں، نہ دوں گا، ہاں، دوکان بھلے ہی بند کردوں۔ اور دوکان بھی کیوں بند کروں، اپنا مال ہے، جس جگہ چاہوں بیچ سکتا ہوں۔ ابھی جاکر تھانے میں لکھا دوں، تو بائیکاٹ کمیٹی کو بھاگنے کی راہ نہ ملے۔ جتنا ہی دبتا ہوں اتنا ہی آپ لوگ دباتی ہیں۔

مہیلا نے ستیاگرہ شکتی کے پردرشن کا اوسر پا کر کہا۔ ہاں ضرور پولیس میں رپٹ کرو۔ میں تو چاہتی ہوں۔ تم رپٹ کرو۔ تم ان لوگوں کو یہ دھمکی دے رہے ہو، جو تمھارے ہی لیے اپنے پرانوں کا بلیدان کر رہے ہیں۔ تم اتنے سوارتھا ندھ ہو کہ اپنے سوارتھ کے لیے دیش کا انہت کرتے ہنوے لجا نہیں آتی؟ اس پر مجھے پولیس کی دھمکی دیتے ہو۔ بائیکاٹ کمیٹی جائے یا رہے، پر تمھیں تاوان دینا پڑے گا۔ انیتھا دوکان بند کرنی پڑے گی۔

یہ کہتے کہتے مہیلا کا چہرہ غرو سے تزوان ہو گیا۔ کئی آدمی جمع ہوگئے اور سب کے سب چھکوڑی کو برا بھلا کہنے لگے۔ چھکوڑی کو بھی معلوم ہوگیا کہ پولیس کی دھمکی دے کر اس نے بہت بڑا اوویک کیا ہے۔ لجا اور اپمان سے اس کی گردن جھک گئی اور منھ ذرا سا نکل آیا۔ پھر اس نے گردن نہیں اٹھائی۔ سارا دن گزر گیا اور دھیلے

کی بکری نہ ہوئی۔ آخر ہار کر اس نے دوکان بند کر دی اور گھر چلا آیا۔

دوسرے دن پراتہ کال بائیکاٹ کمیٹی نے ایک سویم سیوک دوارا اسے سوچنا دے دی کہ کمیٹی نے اسے ۱۰۱ کا دنڈ دیا ہے۔

(۳)

چھکوڑی اتنا جانتا تھا کہ کانفریس کی شکتی کے سامنے وہ سروتھا شکت ہے۔ اس کی زبان سے جو دھمکی نکل گئی۔ اس پر اسے گھور پشچاتاپ ہوا، لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ دوکان کھولنا ویرتھ تھا۔ وہ جانتا تھا۔ اس کی دھیلے کی بھی بکری نہ ہوگی۔ ۱۰۱ دینا اس بوتے سے باہر کی بات تھی۔ دو تین دن چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایک دن رات کو دوکان کھول کر ساڑی گانٹھے گھر اٹھا لایا اور چپکے چپکے بیچنے لگا۔ پیسے کی چیز دھیلے میں لٹا رہا تھا۔ اور وہ بھی اودھار جینے کے لیے کچھ ادھار چاہیے۔

مگر اس کی یہ چال بھی کانگریس سے چھپی نہ رہی۔ چوتھے ہی دن گوئندوں نے کانگریس کو خبر پہنچا دی۔ اسی دن تیسرے پہر چھکوڑی کے گھر کی پیکٹنگ شروع ہوگئی۔ اب کی صرف پیکٹنگ شروع نہ تھی۔ سیاپا بھی تھا۔ پانچ چھ سویم سوکائیں اور اتنے ہی سویم سیوک دار پر سیاپا کرنے لگے۔

چھکوڑی آگن میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ کچھ عقل کام نہ کرتی تھی اس وپتی کو کیسے ٹالے۔ روگنی استری سائبان میں‌لیٹی ہوئی تھی۔ وردھا ماتا اس کے سرہانے بیٹھے پنکھا جھل رہی تھی اور بچے باہر سیاپے کا آنند اٹھا رہے تھے۔

استری نے کہا۔ ان سب سے پوچھتے نہیں۔ کھائے کیا؟

چھکوڑی بولا۔ کس سے پوچھو جب کوئی سنے بھی۔

جاکر کانگریس والوں سے کہو، ہمارے لیے کچھ انتظام کر دیں ہم ابھی کپڑے کو جلا دیں گے۔ زیادہ نہیں۔ ۔/۲۵ مہینہ کے دے دیں۔ وہاں بھی کوئی نہ سنے گا۔

تم جاؤ گے بھی، یا یہیں سے کانون بگھار نے لگے؟

کیا جاؤں، الٹے اور لوگ ہنسی اڑائیں گے، یہاں جس نے دوکان کھولی، اسے دنیا لکھپتی ہی سمجھنے لگتی ہے۔ تو کھڑے کھڑے یہ گالیاں سنتے رہوگے۔ تمھارے کہنے

سے چلا جاؤں مگر وہاں ٹھٹھولی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

ہاں میرے کہنے سے جاؤ۔ جب کوئی نہ سنے گا تو ہم بھی کوئی اور راہ نکالیں گے۔

چھکوڑی نے منھ لٹکائے کرتا پہنا اور اس طرح کانگریس دفتر چلا جیسے کوئی مرتا روگی کو دیکھنے کے لیے بیدھ کو بلانے جاتا ہے۔

(۴)

کانگریس کمیٹی کے پردھان نے پریچیہ کے بعد پوچھا۔ تمھارے ہی اوپر تو بائیکاٹ کمیٹی نے ۱۰۱ کا تاوان لگایا ہے؟

جی ہاں۔

تو روپیہ کب دوگے؟

مجھ میں تاوان دینے کی سامرتھیہ (طاقت) نہیں ہے۔ آپ سے میں ستیہ کہتا ہوں، میرے گھر میں دو دن سے چولہا نہیں جلا۔ گھر کی جو جمع جتھا تھی، وہ سب بیچ کر کھا گیا۔ اب آپ نے تاوان لگا دیا دوکان بند کرنی پڑی۔ گھر پر کچھ مال بیچنے لگا۔ وہاں سیاپا بیٹھ گیا۔ اگر آپ کی یہی اچھا ہو کہ ہم سب دانے بغیر مر جائیں تو مار ڈالیے اور مجھے کچھ نہیں کہنا ہے۔

چھکوڑی جو بات کہنے گھر سے چلا تھا وہ اس کے منھ سے نہ نکلے۔ اس نے دیکھ لیا کہ یہاں کوئی اس پر وچار کرنے والا نہیں ہے۔ پردھان جی گمبھیر بھاؤ سے کہا۔ تاوان تو دینا ہی پڑے گا۔ اگر تمھیں چھوڑ دوں تو اسی طرح اور لوگ بھی کریں گے۔ پھر ولایتی کپڑے کی روک تھام کیسے ہوگی؟

میں آپ سے جو کہہ رہا ہوں اس پر آپ کو وشواس نہیں آتا۔

میں جانتا ہوں تم مال دار آدمی ہو۔

میرے گھر کی تلاشی لے لیجیے۔

میں ان چکموں میں نہیں آتا۔

چھکوڑی نے ادنڈ (بے خوف) ہو کر کہا۔ تو یہ کہیے کہ آپ دیش سیوا نہیں کر

رہے ہیں، غریبوں کا خون چوس رہے ہیں۔ پولیس والے قانونی پہلو سے لیتے ہیں۔ آپ غیر قانونی پہلو سے لیتے ہیں۔ نتیجہ ایک ہے۔ آپ بھی ایمان کرتے ہیں وہ بھی ایمان کرتے ہیں۔ میں قسم کھا رہا ہوں کہ میرے گھر میں کھانے کے لیے دانا نہیں ہے میری استری کھاٹ پر پڑی پڑی مر رہی ہے۔ پھر بھی آپ کو وشواس نہیں آتا۔ آپ مجھے کانگریس کا کام کرنے کے لیے نوکر رکھ لیجیے۔ ۲۵/- مہینے دیجیے گا۔ اس سے زیادہ اپنی غریبی کا اور کیا پرمان دوں۔ اگر میرا کام سنتوش کے لائق نہ ہو تو ایک مہینے کے بعد مجھے نکال دیجیے گا۔ یہ سمجھ لیجیے کہ جب میں آپ کی غلامی کرنے کو تیار ہوا ہوں اس لیے کہ مجھے دوسرا کوئی ادھار نہیں ہے۔ ہم بیاپاری لوگ اپنا بس چلتے کسی کی چاکری نہیں کرتے۔ زمانہ بگڑا ہوا ہے، نہیں ۱۰۱ کے لیے اتنا ہاتھ پاؤں نہ جوڑتا۔ پردھان جی ہنس کر بولے یہ تو تم نے نئی چال چلی۔

چال نہیں چل رہا ہوں اپنی وپتی کتھا کہہ رہا ہوں۔ کانگریس کے پاس اتنے روپے نہیں ہیں کہ وہ موٹوں کو کھلاتی پھرے۔

اب بھی آپ مجھے موٹا کہے جائیں گے؟

تم موٹے ہو ہی۔

مجھ پر ذرا بھی دیا نہ کیجیے گا؟

پردھان زیادہ گہرائی سے بولے۔ چھکوڑی لال جی، مجھے پہلے تو اس کا وشواس نہیں آتا کہ آپ کی حالت اتنی خراب ہے اور اگر وشواس آبھی جائے تو بھی میں کچھ کر نہیں سکتا۔ اتنے مہان آندولن میں کتنے ہی گھر تباہ ہوئے اور ہوں گے۔ ہم لوگ سبھی تباہ ہو رہے ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں ہمارے سر کتنی بڑی ذمے داری ہے۔ آپ کا تاوان معاف کر دیا جائے تو کل ہی آپ کے بیسیوں بھائی اپنی مہریں توڑ ڈالیں گے اور ہم انھیں کسی طرح قائل نہ کر سکیں گے۔ آپ غریب ہیں لیکن آپ کے سبھی بھائی تو غریب نہیں ہیں۔ تب تو سبھی اپنی غریبی کے پرمان دینے لگیں گے۔ میں کس کس کی تلاشی لیتا پھروں گا۔ اس لیے جایئے کسی طرح روپیے کا پربندھ کیجیے اور دوکان کھول کر کاروبار کیجیے۔ ایشور چاہے گا تو وہ دن بھی آئے گا جب آپ کا نقصان پورا ہوگا۔

(۵)

چھکوڑی گھر پہنچا تو اندھیرا ہو گیا تھا۔ ابھی تک اس کے دوار پر سیاپا ہو رہا تھا۔ گھر میں جا کر استری سے بولا۔ آخر وہی ہوا جو میں کہتا تھا۔ پردھان جی کو میری باتوں پر وشواس ہی نہیں آتا۔

استری کا مرجھایا ہوا بدن اتجیت (مشتعل) ہو اٹھا۔ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ اچھی بات ہے۔ ہم انھیں وشواس دلا دیں گے۔ میں اب کانگریس دفتر کے سامنے ہی مروں گی۔ میرے بچے اسی دفتر کے سامنے وکل ہو ہو کر تڑپیں گے۔ کانگریس ہمارے ساتھ ستیاگرہ کرتی ہے۔ تو ہم بھی اس کے ساتھ ستیا گرہ کر کے دکھا دیں۔ میں اسی مری ہوئی دشا میں بھی کانگریس کو توڑ ڈالوں گی جو ابھی اتنے نروئی ہیں۔ وہ کچھ ادھیکار ہوجانے پر نیائے کریں گے؟ ایک ایکہ بلا لو کھاٹ کی ضرورت نہیں۔ وہیں سڑک کنارے میری جان نکلے گی۔ جنتا ہی کے بل پر تو وہ کود رہے ہیں۔ میں دکھا دوں گی جنتا تمھارے ساتھ نہیں میرے ساتھ ہے۔

اس اگنی کنڈ کے سامنے چھکوڑی کی گرمی شانت ہوگئی۔ کانگریس کے ساتھ اس روپ میں ستیا گرہ کرنے کی کلپنا ہی سے وہ کانپ اٹھا۔ سارے شہر میں ہلچل پڑ جائے گی۔ ہزاروں آدمی آکر یہ دشا دیکھیں گے۔ سمبھو ہے کوئی ہنگامہ ہی ہو جائے۔ یہ سبھی باتیں اتنی بھینکر تھیں کہ چھکوڑی کا من کاتر ہو گیا۔ اس نے استری کو شانت کرنے کی چیشٹا کرتے ہوئے کہا۔ اس طرح چلنا اوچت نہیں ہے۔ ابھے میں ایک بار پردھان جی سے پھر ملوں گا۔ اب رات ہوئی سیاپا بھی بند ہوجائے گا۔ کل دیکھی جائے گی۔ ابھی تو تم نے پتھیہ بھی نہیں لیا ہے۔ پردھان جی بے چارے بڑے اسمن جس میں پڑے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں، اگر آپ کے ساتھ رعایت کروں، تو پھر کوئی شاسن ہی نہ رہ جائے گا۔ موٹے موٹے آدمی بھی مہریں توڑ ڈالیں گے اور جب کچھ کہا جائے گا، تو آپ کی نظیر پیش کریں گے۔

امبا ایک چھڑ انشچت دشا میں کھڑی چھکوڑی کا منہ دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے سے کھاٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کی اتیجنا گہرے وچار میں لین ہوگئی۔ کانگریس کی اور اپنی

ذمے داری کا خیال آگیا۔ پردھان جی کے کتھن میں کتنا ستیہ تھا، یہ اس سے چھپا نہ رہا۔

اس نے چھکوڑی سے کہا۔ تم نے آکر یہ بات نہیں کہی تھی۔

چھکوڑی بولا۔ اس وقت مجھ اس کی یاد نہ تھی۔

یہ پردھان جی نے کہا ہے یا تم اپنی طرف سے ملا رہے ہو ؟

نہیں، انھوں نے خود کہا میں اپنی طرف سے کیوں ملاتا؟

بات تو انھوں نے ٹھیک ہی کہی۔

ہم تو مٹ جائیں گے۔

ہم تو یوں ہی مٹے ہوئے ہیں۔

روپے کہاں سے آویں گے۔ بھوجن کے لیے تو ٹھکانا ہی نہیں دنڈ کہاں سے دیں؟

اور کچھ نہیں ہے، گھر تو ہے، اسے ریہن رکھ دو۔ اور اب ولایتی کپڑے بھول کر بھی نہ بیچنا۔ سڑجائے، کوئی پرواہ نہیں۔ تم نے سیل توڑ کر یہ آفت سر لی۔ میری دوا۔ دارو کی چنتا نہ کرو۔ ایشور کی جو اچھا ہوگی، وہ ہوگا۔ بال بچے بھوکوں مرتے ہیں، مرنے دو۔ دیش میں کروڑوں آدمی ایسے ہیں جن کی دشا ہماری دشا سے بھی خراب ہے۔ ہم نہ رہیں گے دیش تو سکھی ہوگا۔

چھکوڑی جانتا تھا، امبا جو کہتی ہے، وہ کر کے رہتی ہے کوئی اجر نہیں سنتی۔ وہ سر جھکائے امبا پر جھجھلاتا ہوا گھر سے نکل کر مہاجن کے گھر کی اور چلا۔

نوٹ: یہ افسانہ ہندی میں پہلی بار ہنس ستمبر1931میں شائع ہوا۔ مانسرووور 1 میں شامل ہے۔ اردو میں شائع نہیں ہوا۔

دوسری شادی

جب میں اپنے چار سال کے لڑکے رام سواروپ کو غور سے دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں وہ بھولاپن اور آکرشن نہیں رہا، جو کہ دو سال پہلے تھا۔ وہ مجھے اپنی سرخ اور رنجیدہ آنکھو ں سے گھورتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کی اس حالت کو دیکھ کر میرا کلیجہ کانپ اٹھتا ہے اور مجھے وہ وعدہ یاد آجاتا ہے، جو میں نے دو سال ہوئے اس کی ماں کے ساتھ جب کہ وہ مرتیو شیا پر تھی، کیا تھا۔ آدمی اتنا سوارتھی اور اپنی اندریوں کا اتنا غلام ہے کہ اپنا فرض کسی کسی وقت ہی محسوس کرتا ہے۔

اس دن جب کہ ڈاکٹر ناامید ہوچکے تھے اس نے روتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا کیا تم دوسری شادی کر لوگے؟ ضرور کر لینا پھر چونک کر کہا میرے رام کا کیا بنے گا؟ اس کا خیال رکھنا اگر ہو سکے۔

میں نے کہا ہاں ہاں میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں کبھی دوسری شادی نہ کروں گا اور رام سواروپ تم اس کی فکر نہ کرو، کیا تم اچھی نہ ہوگی۔

اس نے میری طرف ہاتھ پھینک دیا۔ جیسے کہا، لو الوداع

دو منٹ بعد دنیا میری آنکھوں میں اندھیری ہوگئی۔ رام سواروپ بے ماں کا ہو گیا۔ دو تین دن اس کو کلیجے سے چمٹائے رکھا۔

آخرچھٹی پوری ہونے پر اس کو پتاجی کے سپردکرکے میں پھر اپنی ڈیوٹی پر

چلا گیا۔

دو تین مہینے دل بہت اداس رہا۔ نوکری کی، کیوں کہ اس کے سوائے چارہ نہ تھا۔ دل میں کئی منصوبے باندھتا رہا۔ دو تین سال نوکری کر کے روپے لے کر دنیا کی سیر کو نکل جاؤں گا۔ یہ کروں گا، وہ کروں گا، اب کہیں دل نہیں لگتا۔

گھر سے خط برابر آرہے تھے کہ فلاں فلاں جگہ سے ناطے آرہے ہیں۔ آدمی بہت اچھے ہیں، لڑکی عقل کی تیز اور خوبصورت ہے، پھر ایسی جگہ نہیں ملے گی آخر کرنا ہے ہی، کر لو۔ ہر بات میں میری رائے پوچھی جاتی تھی۔

لیکن برابر انکار کیے جاتا تھا۔ میں حیران تھا کہ انسان کس طرح دوسری شادی پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ جب کہ اس کی سندر اور پرتی پران استری کو جو کہ اس کے لیے سورگ کی ایک بھینٹ تھی بھگوان نے ایک بار چھین لیا۔

وقت بیتتا گیا۔ پھر یار دوستوں کے تقاضے شروع ہو گئے۔ کہنے لگے۔ جانے بھی دو، عورت پیر کی جوتی ہے جب ایک پھٹ گئی دوسری بدل لی۔ استری کا کتنا بھیانک اپمان ہے، یہ کہہ کر میں ان کا منھ بند کر دیا کرتا تھا۔ جب ہماری سوسائٹی جس کا اتنا بڑا نام ہے ہندو، ودھوا کو دوبارہ شادی کر لینے کی اجازت نہیں دیتی تو مجھ کو شوبھا نہیں دیتا کہ میں دوبارہ ایک کنواری سے شادی کرلوں جب تک یہ کلنک ہماری قوم سے دور نہیں ہوجاتا میں ہرگز کنواری تو دور کی بات ہے کسی ودھوا سے بھی بیاہ نہ کروں گا۔ خیال آیا چلو نوکری چھوڑ کر اسی بات کا پرچار کریں لیکن منچ پر اپنے دل کے خیالات زبان پر کیسے لاؤں، بھاؤناؤں کو ویوہارک روپ دینے میں، چرتر مضبوط بنانے میں، جو کہنا اسے کر کے دکھانے میں ہم میں کتنی کمی ہے یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا جب کہ چھ ماہ بعد میں نے ایک کنواری لڑکی سے شادی کرلی۔

گھر کے لوگ خوش ہو رہے تھے کہ چلو کسی طرح مانا۔ ادھر اس دن میری برادری کے دو تین پڑھے لکھے رشتے داروں نے ڈانٹ بتائی تم کہا کرتے تھے کہ میں بیوہ سے ہی شادی کروں گا، لمبا چوڑا، بیاکھیان دیا کرتے تھے، اب وہ تمام باتیں کدھر گئیں، تم نے تو ایک اداہرن بھی نہ رکھا جس پر ہم چل سکتے۔

مجھ پر جیسے گھڑوں پانی پھر گیا۔ آنکھیں کھل گئیں جوانی کے جوش میں کیا کر

گزرا۔ پرانی بھاؤنائیں پھر ابھر آئیں اور آج بھی میں انھیں وچاروں میں ڈوبا ہوا ہوں۔

سوچا تھا۔ نوکر لڑکے کو نہیں سنبھال سکتا۔ عورتیں ہی اس کام کے لیے ٹھیک ہیں۔ بیاہ کر لینے پر جب عورت گھر میں آئے گی تو رام سواروپ کو اپنے پاس باہر رکھ سکوں گا اور اس کا خاص خیال رکھوں گا۔ لیکن وہ سب کچھ غلط اکشر (لفظ) کی طرح مٹ گیا۔ رام سواروپ کو آج پھر واپس گاؤں پتا جی کے پاس بھیجنے پر مجبور ہوں۔ کیوں یہ کسی سے چھپی نہیں۔ عورت کا اپنے سوتیلے بیٹے سے پیار کرنا ایک اسمبھو بات ہے۔ بیاہ کے موقع پر سنتا تھا۔ لڑکی بڑی نیک ہے سواجنوں کا خاص خیال رکھے گی۔ اور اسے اپنے بیٹے کی طرح سمجھے گی۔ لیکن سب جھوٹ۔ عورت چاہے کتنی نیک دل ہو وہ کبھی اپنے سوتیلے بچے سے پیار نہیں کر سکتی۔ اور یہ ہارد ک دکھ وہ وعدہ توڑنے کی سزا ہے جو کہ میں نے ایک نیک بیوی سے اس کے آخری وقت میں کیا تھا۔

یہ افسانہ چندن ستمبر 1931 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مان سرودر 1 شامل ہے۔

مالکن

شیوداس نے بھنڈار کی کنجی اپنی بہو رام پیاری کے سامنے پھینک دی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''بہو آج سے گرہستی کی دیکھ بھال تمھارے ذمّے ہے۔ میرا سکھ بھگوان سے نہیں دیکھا گیا، نہیں تو کیا جو ان بیٹے کو یوں چھین لیتے؟ مگر اس کا کام کرنے والا تو کوئی چاہیے۔ اب ہل توڑدوں تو گذر نہ ہو گی، اس لیے برجو کا ہل اب میں ہی سنبھالوں گا۔ پھر گھر کی دیکھ بھال کرنے والا، رکھنے اٹھانے والا تمھارے سوا دوسرا کون ہے؟ روؤمت بیٹا! بھگوان کی جو مرضی تھی وہ ہوا اور جو مرضی ہوگی وہ ہوگا۔ ہمارا تمھارا کیا اختیار ہے۔ میرے جیتے جی تمھیں کوئی ٹیڑھی نگاہوں سے بھی نہ دیکھ سکے گا۔ تم کسی بات کی فکر نہ کرو برجو گیا تو میں ابھی بیٹھا ہی ہوں۔''

رام پیاری اور رام دلاری دو حقیقی بہنیں تھیں۔ دونوں کی شادی متھرا اور برجو دو حقیقی بھائیوں سے ہوئی۔ دونوں بہنیں میکے کی طرح سسرال میں بھی محبت اور آرام سے رہنے لگیں۔ شیوداس کو فرصت ملی۔ دن بھر دروازے پر بیٹھا گپ شپ کرتا۔ آباد گھر دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا۔ دھرم کے کاموں کی طرف طبیعت مائل ہونے لگی۔ لیکن خدا کی مرضی بڑا لڑکا برجو بیمار پڑا اور آج اسے مرے ہوئے پندرہ روز ہوگئے۔ آج اس کے آخری مراسم سے فرصت ملی اور شیوداس نے سچے بہادر کی طرح کارراز حیات کے لیے کمر باندھ لی۔ دل میں چاہے اسے کتنا ہی صدمہ ہوا ہو

اسے کسی نے روتے ہوئے نہیں دیکھا آج اپنی بہو کو دیکھ کر ایک آن کے لیے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، لیکن اس نے اپنی طبیعت کو سنبھالا اور بھرائی ہوئی آواز میں اسے دلاسا دینے لگا۔ شاید اس نے سوچا تھا کہ گھر کی مالکن بن کر بیوہ کے آنسو پچھ جائیں گے۔ کم سے کم اتنی محنت تو نہ کرنی پڑے گی۔

رام پیاری نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے دادا! تم محنت مزدوری کرو اور میں مالکن بن بیٹھوں۔ کام دھندے میں لگی رہوں گی تو دل بہلتا رہے گا۔ بیٹھے بیٹھے رونے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔''

شیوا داس نے سمجھایا۔ ''بیٹا! بھگوان کی مرضی سے تو کسی کا بس نہیں۔ رونے دھونے سے ہلکان ہونے کے سوا اور کیا ہاتھ آئے گا؟ گھر میں بھی تو بیسیوں کام ہیں کوئی سادھو سنت آجائے کوئی مہمان آپہنچے اس کی خاطر مدارات کے لیے کسی کو تو گھر پر رہنا ہی پڑے گا۔''

بہو نے بہت حیلے کیے پر شیوداس نے ایک نہ سنی۔

(۲)

شیوداس کے باہر چلے جانے کے بعد مالکن نے کنجی اٹھائی تو اس کے دل میں اختیار اور ذمہّ داری کا زبردست احساس پیدا ہوا۔ تھوڑی دیر کے لیے شوہر کی جدائی کا صدمہ اس کے دل سے محو ہو گیا۔ اس کی چھوٹی بہن اور دیور دونوں کام کرنے گئے ہوئے تھے۔ شیوداس باہر تھا۔ گھر بالکل خالی تھا۔ اس وقت وہ بے فکر ہو کر بھنڈار کو کھول سکتی ہے۔ اس میں کیا کیا سامان ہے کیا کیا چیز ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے اس کا دل بے تاب ہو گیا۔ اس مکان میں وہ کبھی نہیں آئی تھی۔ جب کسی کو کچھ دینا یا کسی سے کچھ لینا ہوتا تو شیوداس آکر اس کوٹھری کو کھولتا۔ پھر اسے بند کر کے کنجی اپنی کمر میں رکھ لیتا تھا۔رام پیاری کبھی کبھی کواڑ کی درازوں سے اندر جھانکتی تھی مگر اندھیرے میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ سارے گھر کے لیے وہ کوٹھری ایک طلسم یا راز تھی، جس کے بارے طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہتے تھے۔ آج رام پیاری کو وہ راز کھول کر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس نے باہر کا دروازہ بند

کر دیا کہ اسے کوئی بھنڈار کھولتے دیکھ نہ لے۔ نہیں تو سوچے گا کہ بے ضرورت اس نے کیوں کھولا۔ اس کا سینہ دھڑک رہا تھا کہ کوئی دروازہ نہ کھٹکھٹانے لگے۔ اندر پاؤں رکھا تو اسے اسی طرح کی لیکن اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوئی۔ جو اسے اپنے کپڑے اور زیور کی پٹاری کے کھولنے میں ہوتی تھی۔ مٹکوں میں گڑ، شکر، گیہوں، جو وغیرہ سب چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کنارے بڑے بڑے برتن رکھے ہوئے تھے، جو شادی بیاہ کے موقع پر نکالے جاتے تھے یا مانگے دیے جاتے تھے۔ ایک جگہ مالگذاری کی رسیدیں اور لین دین کے کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ کوٹھری پر شان وشوکت چھائی ہوئی تھی اسی کے سائے میں رام پیاری کوئی آدھ گھنٹے تک اپنے دل کو ٹھنڈک پہنچاتی رہی۔ لمحہ بہ لمحہ اس کے دل پر نشہ طاری ہوتا گیا۔ جب وہ اس کوٹھری سے نکلی تو اس کے دل کی حالت بدلی ہوئی تھی جیسے کسی نے اس پر سحر کر دیا ہو۔

اسی وقت دروازے پر کسی آدمی نے آواز دی۔ اس نے فوراً بھنڈارے کا دروازہ بند کیا اور جاکر صدر دروازہ کھول دیا، دیکھا تو پڑوسن چھینا کھڑی ایک روپیہ قرض مانگ رہی ہے۔

رام پیاری نے بے رخی سے کہا۔'' ابھی تو ایک پیسہ بھی گھر میں نہیں ہے۔ بہن کام کاج میں سب خرچ ہو گیا۔''

چھینا حیران رہ گئی۔ چودھری کے گھر میں اس وقت ایک روپیہ بھی نہیں ہے یہ یقین کرنے کی بات نہ تھی۔ جس کے یہاں سینکڑوں کا لین دین ہے، اس کا سارا اثاثہ کام کاج میں صرف نہیں ہوسکتا۔ اگر شیوداس نے یہ حیلہ کیا ہوتا تو اسے تعجب نہ ہوتا۔ رام پیاری تو اپنے سادہ اخلاق کے لیے گاؤں میں مشہور تھی۔ اکثر شیوداس کی نگاہیں بچا کر ہمسایوں کو ضرورت کی چیزیں دے دیا کرتی تھی۔ ابھی کل ہی اس نے جانکی کو سیر بھر دودھ دے دیا تھا یہاں تک کہ اپنے گہنے تک مانگے دے دیا کرتی تھی بخیل شیوداس کے گھر میں ایسی سخی بہو کا آنا لوگ اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔

چھینا نے متعجب ہو کر کہا۔'' ایسا نہ کہو بہن بڑی مصیبت میں پڑ گئی ہوں نہیں تو

تم جانتی ہو کہ میری عادت قرض مانگنے کی نہیں ہے۔ لگان کا ایک روپیہ دینا ہے۔'' پیادہ دروازے پر کھڑا بک جھک رہا ہے۔ روپیہ دے تو کسی طرح مصیبت ٹلے۔ میں آج کے آٹھویں روز آ کر دے جاؤں گی۔ گاؤں میں اور کون گھر ہے؟ جہاں مانگنے جاؤں۔''

رام پیاری ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اس کے جاتے ہی رام پیاری شام کے کھانے کا انتظام کرنے لگی۔ پہلے چاول دال چننا وبال معلوم ہو تا تھا۔ اور رسوئی میں جانا سولی پر چڑھنے سے کم نہ تھا۔ کچھ دیر دونوں بہنوں میں جھوڑ ہوتی آخر میں شیوداس آ کر کہتا کہ کیا آج کھانا نہ پکے گا؟ اس وقت دونوں میں سے ایک اٹھتی اور موٹے موٹے ٹکڑا پکا کر رکھ دیتی جیسے بیلوں کا راتب ہو۔ آج رام پیاری تن من سے کھانا پکانے کے کام میں لگی ہوئی ہے۔ اب وہ گھر کی مالکن ہے۔

اس نے باہر نکل کر دیکھا کتنا کوڑا کرکٹ پڑا ہوا ہے۔''بڈھے دادا دن بھر مکھی مارا کر تے ہیں۔ اتنا بھی نہیں ہو تا کہ ذرا جھاڑو ہی دے ڈالیں۔ اب کیا ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا دروازہ ایسا صاف ہونا چاہیے کہ دیکھ کر دل خوش ہوجائے۔ یہ نہیں کہ ابکائی آنے لگے۔ ابھی کہہ دوں تو تنک اٹھیں۔ اچھا! یہ منی ناند سے الگ کیوں کھڑی ہے۔''

اس نے منی گائے کے پاس جاکر ناند میں جھانکا۔ بدبو آرہی تھی۔ ٹھیک ہے۔ معلوم ہوتاہے۔ مہینوں سے پانی نہیں بد لا گیاہے۔ اس طرح تو گائے رہ چکی۔ اپنا پیٹ بھر لیا، چھٹی ہوئی اور کسی سے کیا مطلب؟ ہاں دودھ سب کو اچھا لگتا ہے، دادا دروازے پر بیٹھے چلم پی رہے ہیں۔ مگر اتنا نہیں ہوتا کہ چار گھڑے پانی ناند میں ڈال دیں۔ مزدور رکھا ہے وہ بھی تین کوڑی کا، کھانے کو ڈیڑھ سیر کام کرتے نانی مرتی ہے۔ آئے تو پوچھتی ہوں ناند میں پانی کیوں نہیں بدلتا۔ رہنا ہو رہے یا جائے۔ آدمی بہت ملیں گے۔ چاروں طرف تو لوگ مارے مارے پھر رہے ہیں۔

آخر اس سے نہ رہا گیا گھڑا اٹھا کر پانی لینے چلی۔

شیوداس نے پکارا۔''پانی کیا ہوگا، بہو؟ ناند میں پانی بھرا ہوا ہے۔''

پیاری نے کہا۔ ''ناند کا پانی سڑ گیا ہے۔ منی بھو سے میں منہ نہیں ڈالتی دیکھتے ہو کوس بھر پر کھڑی ہے۔''

شیو داس مسکرایا۔ دوڑ کر بہو کے ہاتھ سے گھڑا لے لیا۔

(۳)

کئی مہینے گذر گئے پیاری کے اختیار میں آکر جیسے اس گھر میں بہار آ گئی۔ اندر باہر جہاں دیکھئے ایک لائق منتظم کی سلیقہ شعاری، صفائی پسندی اور خوش مذاقی کے آثار نظر آنے لگے۔ پیاری نے گرہستی کی مشین کی ایسی کنجی کس دی کہ سب ہی پرزے ٹھیک ٹھیک چلنے لگے۔ کھانا پہلے سے اچھا ملتا ہے اور وقت پر ملتا ہے۔ دودھ زیادہ ہوتا ہے، گھی زیادہ ہوتا ہے۔ پیاری نہ خود آرام کرتی ہے نہ دوسروں کو آرام کرنے دیتی ہے۔ گھر میں کچھ ایسی برکت آ گئی ہے کہ جو چیز مانگو گھر ہی میں نکل آتی ہے۔ آدمی سے لے کر جانور تک سب ہی تندرست نظر آتے ہیں۔ اب وہ پہلی سی حالت نہیں ہے کہ کوئی چیتھڑے لپیٹے پھر رہا ہے کسی کو گہنے کی دھن سوار ہے ہاں! اگر کوئی متردد فکرمند اور پریشان ہے تو وہ پیاری ہے۔ پھر بھی سارا گھر اس سے جلتا ہے۔ یہاں تک کہ بوڑھے شیوداس بھی کبھی کبھی اس کی بدگوئی کرتے ہیں کسی کو پہر رات رہے اٹھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ محنت سے سب جی چراتے ہیں، پھر بھی اتنا سب ہی مانتے ہیں کہ پیاری نہ ہو تو گھر کا کام نہ چلے۔ اور تو اور اب دونوں بہنوں میں اتنا میل نہیں ہے۔ صبح کا وقت تھا دلاری نے ہاتھوں کے کڑے لاکر پیاری کے سامنے پٹک دیے اور بگڑ کر بولی۔ ''لے کڑے بھی بھنڈار میں بند کردے۔''

پیاری نے کڑے اٹھالیے اور نرم لہجے میں کہا۔ ''کہہ تو دیا، ہاتھ میں روپئے آنے دے بنوادوں گی۔ ابھی تو ایسے گھس نہیں گئے ہیں کہ آج ہی اتار کر پھینک دیے جائیں۔

دلاری لڑنے کے لیے تیار ہو کر آئی تھی، بولی۔'' تیرے ہاتھ میں کا ہے کو کبھی روپئے آئیں گے اور کاہے کو کڑے بنیں گے۔ جوڑ جوڑ رکھنے میں مزا آتا ہے۔''

پیاری نے ہنس کر کہا۔ ''جوڑ جوڑ رکھتی ہوں تو تیرے ہی لیے یا میرے کوئی اور بیٹھا ہوا ہے یا میں سب سے زیادہ کھا پہن لیتی ہوں۔؟ میرا بازو بند کب کا ٹوٹا پڑا ہے۔''

دلاری : تم نہ کھاؤ پہنو، نیک نامی تو ہوتی ہے۔ تمھاری۔ یہاں کھانے اور پہننے کے سوا اور کیا ہے؟ میں تمھارا حساب کتاب نہیں جانتی۔ میرے کڑے آج بننے کو بھیج دو۔

پیاری نے بالکل مذاق کے انداز میں پوچھا۔ ''روپے نہ ہوں تو کہاں سے لاؤں''؟

دلاری نے چیخ کر کہا۔'' مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ میں تو کڑے چاہتی ہوں''

اسی طرح گھر کے سبھی آدمی اپنے اپنے موقع پر پیاری کو دو چار سخت و ست سنا جاتے تھے اور وہ غریب سب کی دھونس ہنس کر برداشت کر لیتی تھی۔ مالکن کا تو یہ فرض ہے کہ سب کی دھونس برداشت کرلے اور کرے وہی جس میں گھر کی بھلائی ہو۔ مالکانہ ذمہّ داری کے احساس پر طعن وطنزا ور دھمکی کسی چیز کا اثر نہ ہوتا۔ اس کا مالکانہ احساس ان حملوں سے اور بھی قوی ہو جاتا تھا۔ وہ گھر کی منتظمہ ہے۔ سبھی اپنی اپنی تکلیف اسی کے سامنے پیش کرتے ہیں جو کچھ وہ کرتی ہے وہی ہوتا ہے۔ اس کے اطمینان کے لیے اتنا کافی تھا۔

گاؤں میں پیاری کی تعریف ہوتی تھی۔ ابھی عمر ہی کیا ہے۔ لیکن تمام گھر کو سنبھالے ہوئے ہے۔ چاہتی تو دوسرا گھر کر کے چین کرتی۔ اس گھر کے واسطے اپنے کو مٹا رہی ہے۔ کبھی کسی سے ہنستی بولتی بھی نہیں۔ جیسے کایا پلٹ ہو گئی۔

چند روز بعد دلاری کے کڑے بن کر آگئے۔ پیاری خود سنار کے گھر دوڑ دوڑ گئی۔

شام ہو گئی تھی۔ دلاری اور متھرا کھیت سے لوٹے۔ پیاری نے نئے کڑے دلاری کو دیے۔ دلاری نہال ہوگئی۔ چٹ پٹ کڑے پہنے اور دوڑی ہوئی جاکر کوٹھری میں متھرا کو کڑے دکھانے لگی۔ پیاری کوٹھری کے دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر یہ

منظر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ دلاری اس سے کل تین ہی سال تو چھوٹی ہے، لیکن دونوں میں کتنا فرق ہے۔ اس کی نظریں گویا اسی منظر پر جم گئیں، متاہلانہ زندگی کی وہ حقیقی مسرت، ان کی وہ محبت آگیں محویت ان کی وہ سرخوشی!

پیاری کی ٹکٹکی سی بندھ گئی۔ یہاں تک کہ چراغ کی دھندلی روشنی میں وہ دونوں اس کی نظر سے غائب ہوگئے۔ اسے اپنی گذشتہ زندگی کا ایک ایک واقعہ نگاہوں کے سامنے بار بار نئی صورت میں سامنے آنے لگا۔ ناگہاں شیوداس نے پکارا۔ بڑی بہو ایک پیسہ دو تمباکو منگاؤں۔

پیاری کا سلسلۂ تصور شکست ہوگیا۔ آنسو پونچھتی ہوئی بھنڈار میں پیسہ لینے چلی گئی۔

(۴)

ایک ایک کر کے پیاری کے گہنے اس کے ہاتھ سے نکلتے جاتے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا گھر گاؤں میں سب سے خوشحال سمجھا جائے اور اسی کو اس ہوس کی قیمت دینا پڑتی تھی۔کبھی مکان کی مرمت کے لیے۔ کبھی بیلوں کی نئی جوڑی خریدنے کے لیے، کبھی رشتہ داروں کی خاطر مدارات کے لیے اور کبھی مریضوں کے علاج کے لیے روپے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی اور جب بہت جوڑ توڑ کرنے پر بھی کام نہ چلتا تو وہ اپنی کوئی نہ کوئی چیز نکال دیتی۔ اور وہ چیز ایک بار ہاتھ سے نکل کر پھر واپس نہ آتی۔ وہ چاہتی تو ان میں سے بہت سے خرچوں کو ٹال جاتی۔ لیکن جہاں عزت کی بات آپڑتی وہ دل کھول کر خرچ کرتی تھی۔ اگر گاؤں میں ہیٹی ہو گئی تو کیا بات رہی، اسی کی تو بدنامی ہوگی! دلاری کے پاس بھی گہنے تھے، ایک دو چیزیں متھرا کے پاس بھی تھیں لیکن پیاری ان کی چیزیں نہ چھوتی۔ ان کے کھانے پہننے کے دن ہیں، وہ اس جھگڑے میں کیوں پھنسیں دلاری کے لڑکا پیدا ہوا تو پیاری نے دھوم دھام کے ساتھ خوشی منانے کا ارادہ کیا۔

شیو داس نے مخالفت کی۔"کیا فائدہ؟ جب بھگوان کی کرپا سے بیاہ بارات کا

موقع آئے گا تو دھوم دھام کر لینا۔"

پیاری کا حوصلہ مند دل بھلا کیوں مانتا؟ بولی۔ "کیسی بات کرتے ہو دادا! پہلونٹی کے لڑکے کے لیے بھی دھوم دھام نہ ہوئی تو کب ہوگی؟ دل تو نہیں مانتا پر دنیا کیا کہے گی؟ نام بڑے درشن تھوڑے۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی اپنا تمام سامان کر لوں گی۔"

"گہنے کے سرجائے گی اور کیا؟" شیوداس نے فکرمند ہو کر کہا۔ اس طرح ایک روز تار بھی نہ بچے گا۔ کتنا سمجھایا بیٹا! بھائی بھاوج کسی کے نہیں ہوتے۔ اپنے پاس دو چیزیں رہیں گی تو سب منہ تکیں گے نہیں تو کوئی سیدھے منہ بات بھی نہیں کرے گا۔

پیاری نے ایسا منہ بنایا گویا وہ ایسی بوڑھی باتیں بہت سن چکی ہے۔ بولی "جو اپنے ہیں وہ بات بھی نہ پوچھیں جب بھی اپنے ہی رہتے ہیں، میرا دھرم میرے ساتھ ہے ان کا دھرم ان کے ساتھ ہے۔ مرجاؤں گی تو کیا سینے پر لاد کے لے جاؤں گی۔"

دھوم دھام سے لڑکا پیدا ہونے کی خوشی منائی گئی۔ برھمی کے روز ساری برادری کا کھانا ہوا۔ لوگ کھاپی کر چلے گئے تو پیاری دن بھر کی تھکی ماندی آنگن میں ٹاٹ کا ایک ٹکڑا ڈال کر کمر سیدھی کرنے لگی۔ آنکھ لگ گئی۔ متھرا اسی وقت گھر میں آیا۔ نومولود بچے کے دیکھنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ دلاری زچہ خانے سے نکل چکی تھی۔ حمل کی حالت میں اس کا جسم لاغر ہو گیا تھا۔ چہرہ بھی اتر گیا تھا لیکن آج چہرے پر صحت کی سرخی چھائی ہوئی تھی۔ مادرانہ غرور و ناز نے اعضاء میں ایک نئی روح پیدا کر دی تھی۔ زچہ خانے کی احتیاط اور مقوی چیزوں کے استعمال نے بدن کو چکنادیا تھا۔ متھرا اسے آنگن میں دیکھتے ہی قریب آ گیا اور ایک بار پیاری کی طرف دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ وہ سو گئی ہے بچے کو گود میں لے لیا اور لگا اس کا منہ چومنے۔

آہٹ پا کر پیاری کی آنکھ کھل گئی لیکن نیند کے بہانے وہ نیم باز آنکھوں سے یہ پر لطف تماشا دیکھنے لگی۔ ماں اور باپ دونوں باری باری سے بچے کو چومتے

اور گلے لگاتے اور اس کے منہ کو تکتے تھے کیسی پرکیف مسرّت تھی۔ پیاری کی تشنہ تمنا ایک آن کے لیے مالکانہ حیثیت کو بھول گئی۔ جس طرح لگام سے منہ بند، بوجھ سے لدا ہوا، ہانکنے والے کے کوڑے سے تکلیف زدہ دوڑتے دوڑتے بے دم گھوڑا ہنہناہٹ کی آواز سن کر کان کھڑے کر لیتا ہے، وہ اپنی حالت کو فراموش کر کے ایک دبی ہوئی ہنہناہٹ سے اس کا جواب دیتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی پیاری کی حالت ہوگئی۔ اس کی مادریت جو پنجرے میں بند خاموش بے جان پڑی ہوئی تھی، قریب سے گذرنے والی مادریت کی چہکار سے بے دار ہو گئی اور تفکرات کے اس پنجرے سے نکلنے کے لیے بازو پھڑپھڑانے لگی۔

متھرا نے کہا۔ ''یہ میرا لڑکا ہے۔''

دلاری نے بچے کو سینے سے چمٹا کر کہا۔ ''ہاں، ہے کیوں نہیں؟ تم ہی نے تو نو مہینے پیٹ میں رکھا ہے۔ مصیبت تو میں نے بھگتی، باپ کہلانے کے لیے تم آگیے۔''

متھرا : میرا لڑکا نہ ہوتا تو میری صورت کا کیوں ہوتا؟ صورت وشکل سب میری سی ہے کہ نہیں۔''

دلاری : اس سے کیا ہوتا ہے؟ بیج بنئے کے گھر سے آتا ہے کھیت کسان کا ہوتا ہے۔ پیداوار بنئے کی نہیں ہوتی، کسان کی ہوتی ہے۔''

متھرا : باتوں میں تم سے کوئی نہ جیتے گا۔ میرا لڑکا بڑا ہو جائے گا تو میں دروازے پر بیٹھ کر مزے سے حقہ پیا کروں گا۔''

دلاری : میرا لڑکا پڑھے لکھے گا۔ کوئی بڑا عہدہ حاصل کرے گا۔ تمھاری طرح دن بھر بیل کے پیچھے نہ چلے گا۔ مالکن سے کہنا ہے کل ایک جھولا بنوادیں۔''

متھرا : اب بہت سویرے نہ اٹھا کرنا اور کلیجہ پھاڑ کر کام بھی نہ کرنا۔''

دلاری : یہ مہارانی جینے دے گی۔''

متھرا : مجھے تو اس بیچاری پر ترس آتا ہے۔ اس کے کون بیٹھا ہے ؟ہمیں لوگوں کے لیے مرتی ہے بھیاّ ہوتے تو اب تک دوتین لڑکوں کی ماں ہو گئی ہوتی۔''

پیاری کے گلے میں آنسوؤں کا ایسا سیلاب اٹدا کہ اس کے روکنے میں اس کا

تمام جسم کانپ اٹھا۔

اس کی بیوگی کا سونا پن کسی خوفناک جانور کی طرح اسے نگلنے لگا۔ تصور اس بنجر زمین میں ہرا بھرا باغ لگانے لگا۔

یکا یک شیوداس نے اندر آ کر کہا۔" بڑی بہو کیا سو گئی! باجے والوں کو ابھی کھانے کو نہیں ملا۔ کیا کہہ دوں؟"

(۵)

کچھ دنوں کے بعد شیوداس بھی مرگیا۔ ادھر دلاری کے دو بچے ہوئے۔ وہ بھی زیادہ تر بچوں کی پرورش وپرداخت میں رہنے لگی۔ کھیتی کا کام مزدوروں پر آپڑا۔ متھرا مزدور تو اچھا تھا مگر منتظم اچھا نہ تھا اسے آزادانہ طور پر کام لینے کا موقع نہ ملا تھا۔ خود پہلے بھائی کی نگرانی میں کام کرتا رہا۔ بعد کو باپ کی نگرانی میں کرنے لگا۔ کھیتی کا انداز بھی نہیں جانتا تھا۔ وہی مزدور اس کے یہاں ٹکتے تھے جو محنتی نہیں۔ خوشامد کرنے میں ہوشیار ہوتے تھے اس لیے اب پیاری کو دوچار چکر کھیت کے بھی لگانے پڑتے تھے، کہنے کو تو وہ اب بھی مالکن تھی مگر حقیقت میں گھر بھر کی خدمت گذار تھی۔ مزدور بھی اس سے تیوریاں بدلتے۔ زمیندار کا پیادہ بھی اس پر دھونس جماتا، کھانے میں بھی کفایت کرنی پڑتی۔ لڑکوں کو جتنی بار مانگیں کچھ نہ کچھ چاہیے۔ دلاری بچوں والی تھی، اسے بھی پوری خوراک چاہیے۔ متھرا گھر کا سردار تھا۔ اس حق کو اس سے کون چھین سکتا۔ مزدور بھلا کیوں رعایت کرنے لگے تھے۔ ساری کسر بے چاری پیاری پر نکلتی تھی۔ اسی کی ایک ذات فاضل تھی۔ آدھا ہی پیٹ کھائے جب بھی کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوسکتا تھا۔ تیس برس کے عمر میں اس کے بال سفید ہو گئے، کمر جھک گئی، آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی، مگر وہ خوش تھی۔ مالک ہونے کا احساس ان تمام زخموں پر مرہم کا کام کرتا تھا۔

ایک روز متھرا نے کہا۔" بھابی، اب تو کہیں پردیس جانے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں تو کمائی میں کوئی برکت نہیں۔کسی طرح پیٹ کی روٹیاں چلی جاتی ہیں، وہ بھی رو دھو کر۔ کئی آدمی پورب سے آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہاں دوتین روپے روز

کی مزدوری ہوتی ہے۔ چار پانچ سال بھی رہ گیا تو مالا مال ہو جاؤں گا۔ اب لڑکے بالے ہوئے ان کے لیے تو کچھ کرنا ہی چاہیے۔''

دلاری نے تائید کی۔ ''ہاتھ میں چار پیسے ہوں گے لڑکوں کو پڑھائیں گے لکھائیں گے۔ ہماری تو کسی طرح کٹ گئی۔ لڑکوں کو تو آدمی بنانا ہے۔

پیاری یہ رائے سن کر حیران رہ گئی۔ ان کا منہ تکنے لگی۔ اس سے پہلے اس طرح کی بات چیت کبھی نہیں ہوئی تھی۔ انھیں یہ دھن کیسے سوار ہو گئی۔ اسے شک ہوا کہ شاید میری وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا ہے۔

بولی۔ ''تو میں تو جانے کو نہ کہوں گی۔ آگے تمھاری جیسی خواہش ہو۔ لڑکوں کے پڑھانے لکھانے کے لیے یہاں بھی اسکول ہیں۔ پھر کیا ہمیشہ ایسا ہی وقت رہے گا دوتین سال میں کھیتی بن گئی تو سب کچھ ہو جائے گا۔''

متھرا: اتنے روز کھیتی کرتے ہوگئے۔ جب اب تک نہ بنی تو اب کیا بن جائے گی۔ اسی طرح ایک روز چل دیں گے۔ دل کی دل ہی میں رہ جائے گی۔ پھر اب ہاتھ پاؤں بھی تو تھک رہے ہیں۔ یہ کھیتی کون سنبھالے گا؟ لڑکوں کو اس چکی میں جوت کر ان کی زندگی خراب کرنی نہیں چاہتا۔''

پیاری نے آنکھو میں آنسو بھر کر کہا۔ ''بھیا، گھر پر جب تک آدھی ملے ساری کے لیے نہ دوڑنا چاہیے۔ اگر میری طرف سے کوئی بات ہو تو اپنا گھر بار اپنے ہاتھ میں لے لو مجھے ایک ٹکڑا دے دینا، پڑی رہوں گی۔''

متھرا۔ ''گلوگیر آواز سے بولا۔'' بھابی، یہ تم کیا کہتی ہو۔ تمھارے ہی سنبھالے یہ گھر اب تک سنبھلا ہے نہیں ختم ہو چکا ہوتا اس گرہستی کے پیچھے تم نے اپنے کو مٹی میں ملا دیا۔ اپنا جسم تک گھلا ڈالا۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ سب کچھ سمجھتا ہوں۔ ہم لوگوں کو جانے دو۔ بھگوان نے چاہا تو گھر پھر سنبھل جائے گا۔ تمھارے لیے ہم برابر خرچ بھیجتے رہیں گے۔''

پیاری نے کہا۔ ''اگر ایسا ہی ہے تو تم چلے جاؤ۔ بال بچوں کو کہاں کہاں باندھے پھروگے؟۔

دلاری بولی یہ کیسے ہو سکتا ہے بہن، یہاں دیہات میں لڑکے کیا پڑھیں لکھیں

گے۔ بچوں کے بغیر وہاں ان کا جی بھی نہ لگے گا۔ دوڑ دوڑ کر گھر آئیں گے اور ساری کمائی ریل کھا جائے گی۔ پردیس میں اکیلے جتنا خرچ ہوگا۔ اتنے میں سارا گھر آرام سے رہے گا۔"

پیاری بولی۔" تو میں ہی یہاں رہ کر کیا کروں گی؟ مجھے بھی لیتے چلو۔"

دلاری اسے ساتھ لے چلنے کو تیار نہ تھی۔ کچھ روز زندگی کا لطف اٹھانا چاہتی تھی۔ اگر پردیس میں بھی یہی ضابطہ رہا تو جانے سے فائدہ ہی کیا؟ بولی۔"بہن تو چلتی تو کیا بات تھی۔ پھر یہاں تو سارا کاروبار چوپٹ ہو جائے گا۔ تم تو کچھ نہ کچھ دیکھ بھال کرتی ہی رہو گی۔"

روانگی کی تاریخ سے ایک روز پہلے ہی رام پیاری نے رات بھر جاگ کر حلوا پوری پکائی جب سے اس گھر میں آئی کبھی ایک روز کے لیے بھی تنہا رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ دونوں بہنیں ہمیشہ ساتھ رہیں۔ آج اس ہولناک موقع کو سامنے آتے دیکھ کر پیاری کا دل بیٹھا جاتا تھا وہ دیکھتی تھی کہ متھرا خوش ہے۔ لڑکے باہر جانے کی خوشی میں کھانا پینا بھولے ہوئے ہیں تو اس کے جی میں آتا تھا کہ وہ بھی اسی طرح بے غم رہے۔ محبت وہمدری کو پیروں سے کچل ڈالے۔ لیکن وہ محبت جس غذا کو کھا کھا کر پلی تھی اسے سامنے سے ہٹتے جاتے دیکھ کر بے قرار ہونے سے نہ رک سکی۔ دلاری تو اس طرح بے فکر بیٹھی تھی جیسے کوئی میلہ دیکھنے جارہی تھی۔ نئی چیزوں کے دیکھنے، نئی دنیا کی سیر کرنے کے شوق نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ پیاری کے سر انتظام کا بار تھا۔ دھوبی کے گھر سے سب کپڑے آئے ہیں یا نہیں؟ کون کون سے برتن ساتھ جائیں گے؟ سفر خرچ کے لیے کتنے روپے کی ضرورت ہوگی؟ ایک بچے کو کھانسی آرہی تھی، دوسرے کو کئی روز سے دست آرہے تھے۔ ان دونوں کی دواؤں کو کوٹنا پیسنا وغیرہ سینکڑوں کام اسے مصروف کیے ہوئے تھے۔ لاولد ہو کر بھی وہ بچوں کی داشت وپرداخت میں دلاری سے ہوشیار تھی۔" دیکھو بچوں کو زیادہ مارنا پیٹنا مت۔ مارنے سے بچے ضدی اور بے حیا ہو جاتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ آدمی کو بچہ بن جانا پڑتا ہے۔ کبھی ان کے ساتھ کھیلنا پڑتا ہے۔ کبھی ہنسنا پڑتا ہے۔ اگر تم چاہو کہ ہم آرام سے پڑے رہیں اور بچے چپ بیٹھے رہیں ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں

تو یہ نہیں ہوسکتا۔ بچے تو طبیعت کے تیز ہوتے ہیں انھیں کسی نہ کسی کام میں پھنسائے رکھو۔ دھیلے کا ایک کھلونا ہزار گھڑکیوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔''

دلاری ان ہدایتوں کو اس بے توجہی سے سن رہی تھی گویا کوئی پاگل بک رہا ہو۔

رخصت کا روز پیاری کے لیے امتحان کا دن تھا۔ اس کے جی میں آتا تھا کہ کہیں چلی جائے تاکہ وہ منظر نہ دیکھنا پڑے۔ ہائے گھڑی بھر میں یہ گھر سونا ہوجائے گا۔ وہ دن بھر گھر میں تنہا پڑی رہے گی۔ کس سے ہنسے گی۔ کس سے بولے گی؟ یہ سوچ کر اس کا دل لرز جا تا۔ جوں جوں وقت قریب آتا تھا اس کے حواس معطل ہوتے جاتے تھے۔وہ کام کرتے کرتے جیسے کھو جاتی تھی اور ٹکٹکی باندھ کر کسی چیز کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ کبھی موقع پا کر تنہائی میں جاکر تھوڑا سا رو لیتی تھی۔ دل کو سمجھا رہی تھی کہ یہ لوگ اپنے ہو تے تو کیا اس طرح جا تے۔یہ مانا کہ ناتا ہے مگر کسی پر کوئی زور تو نہیں۔ دوسرے کے لیے کتنا ہی مرو پھر بھی اپنے نہیں ہوتے، پانی تیل میں کتنا ہی ملے، پھر بھی الگ ہی رہے گا۔ بچے نئے نئے کپڑے پہنے تو نواب بنے گھوم رہے تھے۔ پیاری انھیں پیار کرنے کے لیے گود میں لینا چاہتی تھی تو رونے کا سا منہ بنا کر چھڑا کر بھاگ جاتے۔ وہ کیا جانتی تھی کہ ایسے موقع پر اکثر بچے بھی ایسے ہی بے مروت ہو جاتے ہیں۔ دس بجتے بجتے دروازے پر بیل گاڑی آ گئی۔ لڑکے پہلے ہی سے اس پر جا بیٹھے۔ گاؤں کے کتنے ہی مرد عورتیں ملنے آئیں۔ پیاری کو اس وقت ان کا آنا برا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دلاری سے تھوڑی دیر تنہائی میں گلے مل کر رونا چاہتی تھی۔ متھرا سے ہاتھ جوڑ کر کہنا چاہتی تھی کہ میری کھوج خبر لیتے رہنا، تمھارے سوا اب دنیا میں میرا کون ہے ؟ لیکن گڑبڑ میں اسے ان باتوں کا موقع نہ ملا۔ متھرا اور دلاری دونوں گاڑی میں جا بیٹھے اور پیاری دروازے پر کھڑی روتی رہی گئی۔ وہ اتنی حواس باختہ تھی کہ اسے گاؤں کے باہر تک پہنچانے کا بھی ہوش نہ رہا۔

(۶)

کئی روز تک پیاری بے ہوش سی پڑی رہی۔ نہ گھر سے نکلی، نہ چولہا جلایا نہ ہاتھ منہ دھویا۔ اس کا ہلوایا جوکھو بار بار آکر کہتا۔" مالکن، اٹھو، منہ ہاتھ دھوؤ۔ کچھ کھاؤ پیو۔ کب تک اس طرح پڑی رہو گی"؟

اس طرح کی تسلی گاؤں کی اور عورتیں بھی دیتی تھیں۔ لیکن ان کی تسلّی میں ایک قسم کے بغض کا انداز پایا جاتا تھا اور جوکھو کی آواز میں سچی ہمدردی جھلکتی تھی۔ جوکھو کام چور باتونی اور نشے باز تھا۔ پیاری اسے برابر ڈانٹی رہتی تھی۔دو ایک بار اسے نکال بھی چکی تھی مگر متھرا کی سفارش سے پھر رکھ لیا تھا۔ آج بھی جوکھو کی ہمدردی بھری باتیں سن کر جھنجھلاتی۔ یہ کام کرنے کیوں نہیں جاتا۔ یہاں میرے پیچھے کیوں پڑا ہے مگر اسے جھڑکنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت اسے ہمدردی کی ضرورت تھی۔ پھل کانٹے دار درخت میں بھی ملیں تو کیا انھیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ طبیعت بہلنے لگی۔ زندگی کا کارو بار جاری ہوا۔ اب کھیتی کا سارا بار پیاری پر تھا۔لوگوں نے رائے دی کہ ایک ہل توڑ دو اور کھیتوں کو اٹھا دو لیکن پیاری کی وضع داری یوں ڈھول پیٹ کر اپنی شکست قبول نہ کرسکتی تھی۔ تمام کام سابق کی طرح چلنے لگے۔ ادھر متھرا کے خط وکتابت نہ کرنے سے اس کے جذبات کو اور اشتعال ہوا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے بھروسے بیٹھی ہوں۔ یہاں اس کے کھلانے کا بھی دعویٰ رکھتی ہوں۔ اس کے بھیجنے سے مجھے کوئی خزانہ نہ مل جاتا۔ اسے اگر میری فکر نہیں ہے تو میں اس کی کب پروا کرتی ہوں؟ گھر میں تو اب کوئی زیادہ کام رہا نہیں۔پیاری تمام دن کھیتی باڑی کے کاموں میں لگی رہتی۔ خربوزے بوئے تھے وہ خوب پھلے اور خوب بکے۔ پہلے سب دودھ گھر میں خرچ ہو جاتا تھا اب بکنے لگا۔پیاری کے خیالات میں بھی ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا وہ اب صاف ستھرے کپڑے پہنتی۔ مانگ چوٹی کی طرف سے بھی اتنی بے توجہ نہ تھی۔ زیوروں کا بھی شوق ہوا۔ روپے ہاتھ میں آتے ہی اس نے اپنے گروی گہنے چھڑائے اور کھانے میں بھی احتیاط کرنے لگی۔ تالاب پہلے کھیتوں کو سیراب کر کے خود خالی ہو جاتا تھا۔

اب نکاس کی نالیاں بند ہو گئی تھیں۔ تالاب میں پانی جمع ہونے لگا اس میں ہلکی ہلکی لہریں بھی تھیں، کھلے ہوئے کمل بھی تھے۔ ایک روز جوکھو کنویں سے لوٹا تو اندھیرا ہو گیا تھا۔ پیاری نے پوچھا ''اب تک وہاں کیا کرتا رہا؟''

جوکھو نے کہا۔ ''چار کیا ریاں بچ رہی تھیں میں نے سوچا دس موٹ اور کھینچ دوں کل کا جھنجھٹ کون رکھے۔؟

جوکھو اب کچھ دنوں سے کام میں جی لگانے لگا تھا۔ جب تک مالک اس کے سر پر سوار رہتے تھے وہ حیلے بہانے کرتا تھا۔ اب سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ پیاری سارے دن کنویں پر تھوڑے ہی رہ سکتی تھی۔اس لیے اب اس میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ پیاری نے پانی کا لوٹا رکھتے ہوئے کہا۔''اچھا ہاتھ منہ دھو ڈالو۔

''آدمی جان رکھ کر کام کرتا ہے۔ ہائے ہائے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کھیت آج نہ ہوتے کل ہوتے۔ کیا جلدی تھی''؟

جوکھو نے سمجھا پیاری بگڑ رہی ہے۔ اس نے تو اپنی سمجھ میں کارگذاری کی تھی اور سمجھا تھا تعریف ہوگی۔ یہاں اعتراض ہوا۔ چڑ کر بولا۔ ''مالکن تم داہنے بائیں دونوں طرف چلتی ہو۔ جو بات نہیں سمجھتی ہو، اس میں کیوں کودتی ہو کل کے لیے تو اونچے کے کھیت پڑے سوکھ رہے ہیں۔ آج بڑی مشکل سے کنواں خالی ہوا ہے۔ سویرے میں نہ پہنچتا تو کوئی اور اگر ڈٹ جاتا پھر ہفتہ بھر تک راہ دیکھنی پڑتی تب تک تو سب اوکھ بدا ہو جاتی۔''

پیاری اس کی سادگی پر ہنس کر بولی۔'' ارے تو میں تجھے کچھ کہہ تھوڑی ہی رہی ہوں۔ میں تو کہتی ہوں کہ جان رکھ کر کام کر کہیں بیمار پڑ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

جوکھو : کون بیمار پڑ جائے گا؟بیس برس سے کبھی سر تک تو نہیں دکھا۔ آئندہ کی نہیں جانتا۔ کہو رات بھر کام کرتا رہوں۔''

پیاری : میں کیا جانوں تمھیں آئے دن بیٹھے رہتے تھے اور پوچھا جاتا تھا۔ تو کہتے تھے کہ بخار آ گیا تھا۔ پیٹ میں درد تھا۔''

جوکھو جھینپتا ہوا بولا۔'' وہ باتیں جب تھیں جب مالک لوگ چاہتے تھے اسے پیس ڈالیں۔ اب تو جانتا ہوں میرے ہی سر ہے۔ میں نہ کروں گا تو چوپٹ ہو جائے گا۔''

پیاری : میں کیا دیکھ بھال نہیں کرتی''؟

جوکھو : تم بہت کروگی تو دو وقت چلی جاؤ گی۔ تمام دن تم وہاں بیٹھی تو نہیں رہ سکتیں۔'' پیاری کو اس کی اخلاص بھری باتوں نے فریفتہ کر لیا۔ بولی۔ ''اتنی رات گئے چولہا جلاؤ گے۔ بیاہ کیوں نہیں کر لیتے۔''

جوکھو نے منہ دھوتے ہوئے کہا۔'' تم بھی خوب کہتی ہو مالکن! اپنے پیٹ بھر کو تو ہوتا نہیں بیاہ کرلوں! سوا سیر کھاتا ہوں ایک وقت پورا سوا سیر۔ دونوں وقت کے لیے ڈھائی سیر چاہیے۔''

پیاری : اچھا آج میری رسوئی میں کھاؤ۔ دیکھوں کتنا کھاتے ہو''؟

جوکھو نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''نہیں مالکن! تم پکاتے پکاتے تھک جاؤ گی۔ ہاں آدھ آدھ سیر کی دو روٹیاں پکا دو تو کھالوں۔ میں تو یہی کرتا ہوں۔ بس آٹا گوندھ کر دو روٹ بنا لیتا ہوں اور اوپر سے سینک لیتا ہوں۔ کبھی میٹھے سے، کبھی پیاز سے کھا لیتا ہوں اور آ کر پڑ رہتا ہوں۔''

پیاری : میں تمھیں آج پھلکے کھلاؤں گی۔''

جوکھو : تب تو ساری رات کھاتے ہی گذر جائے گی۔''

پیاری : بکو مت، جلدی آ کر بیٹھ جاؤ۔''

جوکھو : ذرا بیلوں کو چارہ پانی دیتا آؤں تو بیٹھوں۔''

(۷)

جوکھو اور پیاری میں ٹھنی ہوئی تھی۔

پیاری نے کہا۔'' میں کہتی ہوں کہ دھان روپنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جھڑی لگ جائے تو کھیت ڈوب جائے۔ بارش رک جائے تو کھیت سوکھ جائے۔ جوار، باجرا، سن، ارہر تو ہیں۔ دھان نہ سہی''۔

جوکھو نے اپنے کندھے پر پھاوڑا رکھتے ہوئے کہا۔'' جب سب کا ہو گا تو میرا بھی ہوگا، سب کا ڈوب جائے گا تو میرا بھی ڈوب جائے گا۔ میں کیوں کسی سے پیچھے رہوں؟ بابا کے زمانے میں پانچ بیگھے سے کم نہیں رویا جاتا تھا۔ برجو بھیا نے اس میں ایک دوبیگھے اور بڑھا دیے۔ متھرا نے بھی ہر سال تھوڑے بہت روپے۔ تو کیا میں سب سے گیا گذرا ہوں۔ میں پانچ بیگھے سے کم نہ لگاؤں گا۔''

''تب گھر کے دو جوان کام کرنے والے تھے۔''

''میں تنہا ان دونوں کے برابر کھاتا ہوں۔ دونوں کے برابر کام کیوں نہ کروں گا۔''

''چل جھوٹا کہیں کا۔ کہتا تھا دوسیر کھاتا ہوں۔ چار سیر کھاتا ہوں۔ آدھ سیر میں ہی رہ گیا۔''

''کیسی روز تولو تو معلوم ہو۔''

''تولا ہے، بڑے کھانے والے! میں کہے دیتی ہوں دھان نہ روپو، مزدور ملیں گے نہیں، تمھیں ہلکان ہونا پڑے گا۔''

''تمھاری بلا سے میں ہلکان ہوں گا نا! یہ بدن کس روز کام آئے گا۔''

پیاری نے اس کے کندھے سے پھاوڑا لے لیا اور بولی۔ ''پہر رات سے پہر رات تک تال میں رہو گے نہ، میرا دل گھبرائے گا۔''

جوکھو کو دل کے گھبرانے کا تجربہ نہ تھا۔ کوئی کام نہ ہو تو آدمی پڑ کر سورہے، دل کیوں گھبرائے گا۔ بولا۔ ''جی گھبرائے تو سو رہنا میں گھر رہوں گا۔ تب تو اور جی گھبرائے گا۔ میں بے کار بیٹھتا ہوں تب مجھے بار بار کھانے کی سوجھتی ہے۔ باتوں میں دیر ہو رہی ہے۔ اور بادل گھرے آتے ہیں۔''

پیاری نے کہا۔ ''اچھا کل جانا۔ آج بیٹھو۔''

جو کھو نے گویا مجبور ہو کر کہا۔ ''اچھا بیٹھ گیا۔ کہو کیا کہتی ہو۔''

پیاری نے تمسخر کے انداز سے پوچھا۔ ''کہنا کیا ہے میں تم سے پوچھتی ہوں اپنا بیاہ کیوں نہیں کر ڈالتے؟ میں اکیلی مرا کرتی ہوں، تب ایک سے دو تو ہو جائیں گے۔''

جوکھو شرماتا ہوا بولا۔''تم نے پھر وہی بات چھیڑ دی مالکن! کس سے بیاہ کروں؟ میں ایسی جورو لے کر کیا کروں جو گہنے کے لیے جان کھاتی رہے۔''

پیاری۔ ''یہ تو تم نے بڑی کڑی شرط لگائی! ایسی عورت کہاں ملے گی جو گہنا نہ چاہتی ہو۔''

جوکھو یہ میں تھوڑا ہی کہتا ہوں کہ گہنا نہ مانگے۔ ہاں میری جان نہ کھائے۔ تم نے تو کبھی گہنے کے لیے ضد نہیں کی بلکہ اپنے گہنے دوسروں کو دے دیے۔''

پیاری کے رخسار پر ہلکا سا رنگ آ گیا۔ بولی۔ ''اچھا اور کیا چاہتے ہو۔''

جوکھو۔ ''میں کہنے لگوں گا تو بگڑ جاؤ گی۔''

پیاری کی آنکھو میں شرم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بولی۔ ''بگڑنے کی بات ہو گی تو ضرور بگڑوں گی۔''

جوکھو۔ ''تو میں نہ کہوں گا۔''

پیاری نے اسے پیچھے کی طرف ڈھکیلتے ہوئے کہا۔ ''کہوگے کیسے نہیں۔ میں کہلا کر چھوڑوں گی۔''

جوکھو۔ ''اچھا توسنو۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تمھاری طرح ہو، ایسی ہی لجانے والی ہو، ایسی ہی بات چیت میں ہوشیار ہو۔ ایسا ہی اچھا کھانا پکاتی ہو، ایسی ہی کفایت شعار ہو، ایسی ہی ہنس مکھ ہو، بس ایسی مورت ملے گی۔ تو بیاہ کروں گا نہیں تو اسی طرح پڑا رہوں گا۔''

پیاری کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا پیچھے ہٹ کر بولی۔''تم بڑے دل لگی باج ہو۔''

یہ افسانہ پہلی بار کلکتہ کے ہندی ماہنامہ وشال بھارت کے ستمبر 1931 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا سدامنی۔ یہ مانسرور کے نمبر ا میں شامل ہے۔ اردو میں یہ واردات میں شامل ہے۔

دو بَیل

جانوروں میں گدھا سب سے بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ جب ہم کسی شخص کو پرلے درجے کا احمق کہنا چاہتے ہیں۔ تو اسے گدھا کہتے ہیں۔ گدھا واقعی بے وقوف ہے۔ یا اس کی سادہ لوحی اور انتہائی درجہ کی قوت برداشت نے اسے یہ خطاب دلوایا ہے۔ اس کا تصفیہ نہیں ہوسکتا۔ گائے شریف جانور ہے۔ مگر سینگ مارتی ہے۔ کتّا بھی غریب جانور ہے لیکن کبھی کبھی اسے غصّہ بھی آجاتا ہے۔ مگر گدھے کو کبھی غصّہ نہیں آتا جتنا جی چاہے مارلو۔ چاہے جیسی خراب، سڑی ہوئی گھاس سامنے ڈال دو۔ اس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار کبھی نظر نہ آئیں گے۔ اپریل میں شاید کبھی کلیل کر لیتا ہو۔ پر ہم نے اسے کبھی خوش ہوتے نہیں دیکھا۔ اس کے چہرہ پر ایک مستقل مایوسی چھائی رہتی ہے۔ سکھ، دکھ نفع، نقصان سے کبھی اسے شاد ہوتے نہیں دیکھا۔ رشی مینوں کی جس قدر خوبیاں ہیں۔ سب اس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ لیکن آدمی اسے بے وقوف کہتا ہے۔ اعلیٰ خصلتوں کی ایسی توہین ہم نے اور کہیں نہیں دیکھی۔ ممکن ہے دینا میں سیدھے پن کے لیے جگہ نہ ہو۔

لیکن گدھے کا ایک بھائی اور بھی ہے۔ جو اس سے کچھ کم ہی گدھا ہے۔ اور وہ ہے بیل۔ جن معنوں میں ہم گدھے کا لفظ استعمال کرتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو بیل کو بے وقوفوں کا سردار کہنے کو تیار ہیں۔ مگر ہمارا خیال ایسا نہیں۔ بیل

کبھی کبھی مارتا ہے۔ کبھی کبھی اڑیل بیل بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور کبھی کئی طریقوں سے وہ اپنی ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کا درجہ گدھے سے نیچے ہے۔

جھوری کاچھی کے پاس دو بیل تھے۔ ایک کا نام ہیرا تھا۔ دوسرے کا موتی۔ دونوں پچھائیں نسل کے تھے۔ دیکھنے میں خوب صورت۔ کام میں چوکس۔ ڈیل ڈول میں اونچے۔ بہت دنوں سے ایک ساتھ رہتے رہتے دونوں میں محبت سی ہو گئی۔ دونوں آمنے سامنے یا ایک دوسرے کے پاس بیٹھے زبان خاموش میں ایک دوسرے سے بات چیت کیا کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے دل کی بات کیوں کر سمجھ جاتے تھے؟ یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ضرور ان میں کوئی نہ کوئی ناقابل فہم قوت تھی۔ جس کے سمجھنے سے اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی انسان محروم ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو چاٹ کر اور سونگھ کر اپنی محبت کا اظہار کرتے تھے۔ کبھی دونوں سینگ ملا لیا کرتے تھے۔ عناد سے نہیں محض زندہ دلی سے محض ہنسی مذاق سے جیسے یار دوستوں میں کبھی کبھی دھول دھپا ہو جاتاہے۔ اس کے بغیر دوستی کچھ پھیکی اور ہلکی سی رہتی ہے۔جس پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

جس وقت یہ دونوں بیل ہل یا گاڑی میں جوتے جاتے اور گردنیں ہلا ہلا کر چلتے۔ تو ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی تھی، کہ زیادہ بوجھ میری ہی گردن پر رہے۔ کام کے بعد دوپہر یا شام کو کھلتے تو ایک دوسرے کو چوم چاٹ کر اپنی تکان اتار لیتے۔ ناند میں کھلی بھوسا پڑجانے کے بعد دونوں ایک ساتھ اٹھتے۔ ایک ساتھ ناند میں منہ ڈالتے۔ اور ایک ہی ساتھ بیٹھتے۔ ایک منہ ہٹا لیتا۔ تو دوسرا بھی ہٹا لیتا تھا۔

ایک مرتبہ جھوری نے دونوں بیل چند دنوں کے لیے اپنے سسرال بھیجے۔ بیلوں کو کیا معلوم، وہ کیوں بھیجے جاتے ہیں؟ سمجھے مالک نے ہمیں بیچ دیا۔ کون جانے بیلوں کو اپنا بیچاجانا پسند آیا یا نہیں۔ لیکن جھوری کے سالے کو انھیں اپنے گاؤں تک لے جانے میں دانتوں پسینہ آ گیا۔ پیچھے سے ہانکتا تو دونوں دائیں بائیں بھاگتے، آگے سے پکڑ کر کھینچتا تو دونوں پیچھے کو زور لگاتے۔ مارتا تو دونوں سینگ نیچے کر کے پھنکارتے۔ اگر ان بے زبانوں کی زبان ہوتی تو جھوری سے پوچھتے۔ تم نے ہم

غریبوں کو کیوں نکال دیا۔ ہم نے تمھاری خدمت کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر اتنی محنت سے کام نہ چلتا تھا تو اور کام لے لیتے۔ ہم کو انکار نہ تھا۔ ہمیں تمھاری خدمت میں مرجانا بھی قبول تھا۔ ہم نے کبھی دانے چارے کی شکایت نہیں کی۔ تم نے جو کچھ کھلایا سر جھکا کر کھالیا۔ پھر تم نے ہمیں اس ظالم کے ہاتھ کیوں بیچ دیا؟

شام کے وقت دونوں بیل گیا کے گاؤں میں جا پہونچے۔ دن بھر کے بھوکے تھے۔ لیکن جب ناند میں لگائے گئے۔ تو کسی نے بھی اس میں منہ نہ ڈالا۔ دونوں کا دل بھاری ہو رہا تھا۔ جسے انھوں نے اپنا گھر سمجھا تھا وہ آج ان سے چھوٹ گیا۔ یہ نیا گھر، نیا گاؤں، نئے آدمی، سب انھیں بے گانے لگتے تھے۔ دونوں نے چپ کی زبان میں کچھ باتیں کیں۔ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا اور لیٹ گئے۔

جب گاؤں میں سوتا پڑ گیا تو دونوں نے زور مار کر پگھے تڑالیے اور گھر کی طرف چلے۔ پگھے مضبوط تھے۔ کسی کو شبہہ بھی نہ ہو سکتا تھا، کہ بیل انھیں توڑ سکیں گے۔ پر ان دونوں میں اس وقت دگنی طاقت آ گئی تھی۔ ایک جھٹکے میں رسیاں ٹوٹ گئیں۔

جھوری نے صبح اٹھ کر دیکھا کہ دونوں بیل چرنی پر کھڑے تھے۔ دونوں کی گردنوں میں آدھا آدھا رسہ لٹک رہا تھا۔ گھٹنوں تک پاؤں کیچڑ میں بھرے ہوئے تھے۔ اور دونوں کی آنکھوں میں محبت اور ناراضگی جھلک رہی تھی۔ جھوری ان کو دیکھ کر محبت سے باؤلا ہو گیا۔ اور دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گیا۔ انسان اور حیوان کی محبت کا یہ منظر نہایت دلکش تھا۔

گھر اور گاؤں کے لڑکے جمع ہو گئے اور تالیاں بجا بجاکر ان کا خیر مقدم کرنے لگے۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی قسم کا پہلا نہ تھا۔ مگر اہم ضرور تھا۔ بال سبھا نے فیصلہ کیا کہ ان دونوں بہادروں کو ایڈریس دیا جائے۔ کوئی اپنے گھر سے روٹیاں لایا۔ کوئی گڑ، کوئی چوکر، کوئی بھوسی۔

ایک لڑکے نے کہا۔ ''ایسے بیل اور کسی کے پاس نہ ہوں گے۔''
دوسرے نے تائید کی۔ ''اتنی دور سے دونوں اکیلے چلے آئے۔''
تیسرا بولا۔ ''پچھلے جنم میں ضرور آدمی ہوں گے۔''

اس کی تردید کرنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ سب نے کہا:

''ہاں بھائی ضرور، ہوں گے۔''

جھوری کی بیوی نے بیلوں کو دروازہ پر دیکھا تو جل اٹھی۔ اور بولی:

''کیسے نمک حرام بیل ہیں۔ ایک دن بھی وہاں کام نہ کیا۔ اور بھاگ کھڑے ہوئے''۔

جھوری اپنے بیلوں پر یہ الزام برداشت نہ کرسکا۔ بولا''نمک حرام کیوں ہیں؟ چارہ دانہ نہ دیا ہوگا۔ کیا کرتے؟

عورت نے تنگ آ کر کہا۔'' بس تم ہی بیلوں کو کھلانا جانتے ہو۔ اور تو سبھی پانی پلا پلا کر رکھتے ہیں۔''

جھوری نے چڑایا۔ ''چارہ ملتا تو کیوں بھاگتے''؟

عورت چڑی۔ ''بھاگے اس لیے کہ وہ لوگ تم جیسے بدھوؤں کی طرح بیلوں کو سہلاتے نہیں۔ کھلاتے ہیں تو توڑ کر جوتتے بھی ہیں۔ یہ دونوں ٹھہرے کام چور بھاگ نکلے۔ اب دیکھتی ہوں کہاں سے کھلی اور چوکر آتا ہے۔ خشک بھوسے کے سوا کچھ نہ دوں گی۔ کھائیں چاہے مریں۔''

وہی ہوا۔ مزدور کو تاکید کر دی گئی، کہ بیلوں کو صرف خشک بھوسا دیا جائے۔ بیلوں نے ناند میں منہ ڈالا تو پھیکا پھیکا۔ نہ چکنا ہٹ نہ رس۔ کیا کھائیں؟ پر امید نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

جھوری نے مزدور سے کہا۔'' تھوڑی سی کھلی کیوں نہیں ڈال دیتا ہے؟

مزدور: مالکن مجھے مار ہی ڈالیں گی۔

جھوری: ڈال دے تھوڑی سی۔

مزدور: نہ دا دا۔ بعد میں تم بھی انھیں کی سی کہوں گے۔

(۲)

دوسرے دن جھوری کا سالا پھر آیا اور بیلوں کو لے چلا۔ اب کے اس نے دونوں کو گاڑی میں جوتا۔ دو چار مرتبہ موتی نے گاڑی کو کھائی میں گرانا چاہا۔ مگر ہیرا

نے سنبھال لیا۔ اس وقت دونوں میں قوّت برداشت زیادہ تھی۔

شام کے وقت گھر پہنچ کر گیا نے دونوں کو موٹی رسّیوں سے باندھا اور کل کی شرارت کا مزہ چکھایا۔ پھر وہی خشک بھوسہ ڈال دیا۔ اپنے بیلوں کو کھلی چونی سب کچھ کھلایا۔

ہیرا اور موتی اس برتاؤ کے عادی نہ تھے۔ جھوری انھیں پھول کی چھڑی سے بھی نہ مارتا تھا۔ اس کی آواز پر دونوں اڑنے لگتے تھے۔ یہاں مار پڑی۔ اس پر خشک بھوسہ ناند کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائی۔

دوسرے دن گیا نے بیلوں کو ہل میں جوتا۔ پر ان دونوں نے جیسے پاؤں اٹھانے کی قسم کھالی تھی۔ وہ مارتے مارتے تھک گیا۔ مگر انھوں نے قدم نہ اٹھایا۔ ایک مرتبہ جب اس ظالم نے ہیرا کی ناک پر ڈنڈا جمایا۔ تو موتی غصّہ کے مارے آپے سے باہر ہو گیا۔ہل لے بھاگا۔ ہل، رسّی اور جوا جوت سب ٹوٹ کر برابر ہو گئے۔ گلے میں بڑی بڑی رسّیاں نہ ہوتیں تو دونوں نکل گئے تھے۔

ہیرا نے زبان خاموش سے کہا۔'' بھاگنا مشکل ہے۔''

موتی نے بھی نگاہوں سے جواب دیا۔'' تمھاری تو اس نے جان لے لی تھی۔ اب کے بڑی مار پڑے گی۔''

ہیرا پڑنے دو۔ بیل کا جنم لیا ہے تو مار سے کہاں بچیں گے۔''

گیا دو آدمیوں کے ساتھ دوڑا آرہا ہے۔ دونوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہیں۔

موتی: کہو تو میں بھی دکھادوں کچھ مزا۔؟

ہیرا: نہیں بھائی کھڑے ہوجاؤ۔

موتی: مجھے مارے گا، تو میں ایک آدھ کو گرادوں گا۔

ہیرا: یہ ہمارا دھرم نہیں ہے۔

موتی: دل میں اینٹھ کر رہ گیا۔ اتنے میں گیا آپہونچا اور دونوں کو پکڑ کرلے چلا۔

خیریت ہوئی کہ اس نے اس وقت مارپیٹ نہ کی نہیں تو موتی بھی تیار تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر سہم گیا۔ اور اس کے ساتھی سمجھ گئے کہ اس وقت ٹال جانا ہی مصلحت ہے۔

آج دونوں کے سامنے پھر وہی خشک بھوسا لایا گیا۔ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ گھر کے لوگ کھانا کھانے لگے۔ اسی وقت ایک چھوٹی سی لڑکی دو روٹیاں لیے نکلی اور دونوں کے منہ میں دے کر چلی گئی۔ اس ایک ایک روٹی سے ان کی بھوک تو کیا مٹتی۔ مگر دونوں کے دل کو کھانا مل گیا۔ معلوم ہوا یہاں بھی کوئی صاحب دل رہتا ہے۔ یہ لڑکی گیا کی تھی۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ سوتیلی ماں اسے مارتی رہتی تھی۔ اس لیے ان بیلوں سے اسے ہمدردی تھی۔

دونوں دن بھر جوتے جاتے اڑتے ڈنڈے کھاتے، شام کو تھان پر باندھ دیے جاتے۔ اور رات کو وہی لڑکی انھیں ایک ایک روٹی دے جاتی۔ محبت کے اس کھانے کی یہ برکت تھی، کہ دوچار خشک بھوسے کے لقمے کھا کر بھی دونوں کمزور نہ ہوتے تھے۔ مگر دونوں کی آنکھوں کی نس نس میں سرکشی بھری تھی۔

ایک دن چپ کی زبان میں موتی نے کہا۔ ”اب تو نہیں سہا جاتا ہیرا۔“

ہیرا : کیا کرنا چاہیے؟۔

موتی : گیا کو سینگ پر اٹھا کر پھینک دوں؟۔

ہیرا : مگر وہ لڑکی اسی کی بیٹی ہے۔ اسے مار کر گراؤگے، تووہ یتیم ہوجائے گی۔“

موتی : تو مالکن کو پھینک دوں، وہ لڑکی کو ہر روز مارتی ہے۔

ہیرا : عورت کو مارو گے، بڑے بہادر ہو۔

موتی : تم کسی طرح نکلنے ہی نہیں دیتے۔ تو آؤ آج رسا تڑا کر بھاگ چلیں۔

ہیرا : ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن ایسی موٹی رسّی ٹوٹے گی کیوں کر۔؟

موتی : پہلے رسّی کو چبالو۔ پھر جھٹکادے کر تڑا لو۔

رات کو جب لڑکی روٹیاں دے کر چلی گئی۔ دونوں رسّیاں چبانے لگے۔ پر موٹی رسّی منہ میں نہ آتی تھی۔ بچارے بار بار زور لگا کر رہ جاتے۔

معاً گھر کا دروازہ کھلا۔ اور وہی لڑکی نکلی۔ دونوں سر جھکا کر اس کے ہاتھ چاٹنے لگے۔ دونوں کی دُ میں کھڑی ہوگئیں۔ اس نے ان کی پیشانی سہلائی اور بولی:

”کھول دیتی ہوں۔ بھاگ جاؤ نہیں تو یہ لوگ تمھیں مار ڈالیں گے۔ آج گھر میں مشہور ہو رہا ہے، کہ تمھاری ناک میں ناتھ ڈال دی جائیں۔“

اس نے دونوں کے رسّے کھول دیے۔ پر دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔

موتی نے اپنی زبان میں پوچھا۔'' اب چلتے کیوں نہیں۔؟

ہیرا نے جواب دیا۔'' اس غریب پر آفت آجائے گی۔ سب اسی پر شبہہ کریں گے۔''

یکا یک لڑکی چلائی۔ ''او دادا! او دادا! دونوں پھوپھا والے بیل بھا گے جا رہے ہیں۔دوڑو۔ دونوں بیل بھاگے جا رہے ہیں۔''

گیا گھبرا کر باہر نکلا اور بیلوں کو پکڑنے چلا۔ بیل بھاگے۔ گیا نے پیچھا کیا۔ وہ اور بھی تیز ہو گئے۔ گیا نے شور مچایا۔ پھر گاؤں کے کچھ اور آدمیوں کو ساتھ لانے کے لیے لوٹا۔دونوں بیلوں کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ سیدھے دوڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ راستہ کا خیال نہ رہا۔جس راہ سے یہاں آئے تھے۔ اس کا پتہ نہ تھا نئے نئے گاؤں ملنے لگے۔ تب دونوں ایک کھیت کے کنارے کھڑے ہو کر سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے؟

ہیرا نے اپنی زبان میں کہا۔ ''معلوم ہو تا ہے راستہ بھول گئے۔''

موتی: تم بھی بے تحاشا بھاگے۔ وہیں اسے مار گراتے۔

ہیرا: اسے مار گراتے تو دینا کیا کہتی۔ وہ اپنا دھرم چھوڑ دے لیکن ہم اپنا دھرم کیوں کر چھوڑ دیں۔

دونوں بھوک سے بے حال ہو رہے تھے۔ کھیت میں مٹر کھڑی تھی۔ چرنے لگے۔ رہ رہ کر آہٹ لے رہے تھے کہ کوئی آتو نہیں رہا۔ جب پیٹ بھر گیا اور دونوں کو آزادی کا احساس ہوا۔ تو اچھلنے کودنے لگے۔ پہلے ڈکار لی۔ پھر سینگ ملائے اور ایک دوسیر کو دھکیلنے لگے۔موتی نے ہیرا کو کئی قدم پیچھے ہٹا دیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک کھائی میں گر گیا۔ تب اسے بھی غصّہ آیا۔سنبھل کر اٹھا اور پھر موتی سے لڑنے لگا۔ موتی نے دیکھا کہ کھیل میں جھگڑا ہوا چاہتا ہے تو ایک طرف ہٹ گیا۔

(۳)

ارے یہ کیا! کوئی سانڈ ڈوونکتا چلا آتا ہے! ہاں سانڈ ہی تو ہے۔ وہ سامنے

آ پہنچا۔ دونوں دوست تعجب میں پڑ گئے۔

سانڈ بھی پورا ہاتھی۔ اس سے لڑنا جان سے ہاتھ دھونا تھا۔ لیکن نہ لڑنے سے بھی جان بچتی نظر نہ آتی تھی۔ انھیں کی طرف آرہا تھا۔ کتنا جسیم تھا!

موتی نے کہا۔''بُرے پھنسے۔ جان کیسے بچے گی؟ کوئی طریقہ سوچو۔''

ہیرا نے کہا۔'' غرور سے اندھا ہو رہا ہے۔ منت سماجت کبھی نہ سنے گا۔''

موتی: بھاگ کیوں نہ چلیں؟

ہیرا : بھاگنا پست ہمتی ہے۔

موتی : تو تم یہیں مرو۔ بندہ نو دو گیارہ ہوتا ہے۔

ہیرا : اور جو دوڑ آئے تو پھر؟

موتی : کوئی طریقہ بتاؤ۔ لیکن ذرا جلدی۔ وہ تو آ پہنچا۔

ہیرا : طریقہ یہی ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ حملہ کردیں۔ میں آگے سے دھکیلوں تم پیچھے سے دھکیلو۔ دیکھتے دیکھتے بھاگ کھڑا ہوگا۔ جونہی مجھ پر حملہ کرے تم پیٹ میں سینگ چبھو دینا۔ جان جوکھوں کا کام ہے۔ لیکن دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔

دونوں دوست جان ہتھیلیوں پر لے کر آگے بڑھے۔ سانڈ کو کبھی منظّم دشمن سے لڑنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ وہ انفرادی جنگ کا عادی تھا۔ جونہی ہیرا پر جھپٹا۔ موتی نے پیچھے سے ہلّہ بول دیا۔ سانڈ اس کی طرف مڑا تو ہیرا نے دھکیلنا شروع کیا۔ سانڈ چاہتا تھا۔ ایک ایک کر کے دونوں کو گرالے پر یہ بھی استاد تھے۔ اسے یہ موقعہ ہی نہ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ سانڈ جھلّا کر ہیرا کو ہلاک کرنے چلا۔ تو موتی نے بغل سے آ کر اس کے پیٹ میں سینگ رکھ دے بے چارہ زخمی ہو کر بھاگا اور دونوں فتحیاب دوستوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ سانڈ بے دم ہو کر گر پڑا۔ تب دونوں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔

دونوں بیل فتح کے نشہ میں جھومتے چلے جاتے تھے۔ موتی نے اپنے اشاروں کی زبان میں کہا۔''میرا جی تو چاہتا تھا، کہ بچّہ جی کو مار ہی ڈالوں۔''

ہیرا : گرے ہوئے دشمن پر سینگ چلانا نامناسب ہے۔

موتی : یہ سب فضول ہے۔ اگر اس کا داؤ چلتا تو کبھی نہ چھوڑتا۔

ہیرا : اب کیسے گھر پہنچیں گے؟ یہ سوچو۔
موتی : پہلے کچھ کھالیں تو سوچیں۔ ابھی تو عقل کام نہیں کرتی۔

یہ کہہ کر موتی مٹر کے کھیت میں گھس گیا۔ ہیرا منع کرتا ہی رہ گیا۔ لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ ابھی دو ہی چار منہ مارے تھے۔ کہ وہ آدمی لاٹھیاں لیے آ گئے اور دونوں بیلوں کو گھیر لیا۔ ہیرا تو منڈیر پر تھا۔ نکل گیا۔ موتی کھیت میں تھا اس کے پیر کیچڑ میں دھنسنے لگے۔ نہ بھاگ سکا۔ پکڑا گیا۔ ہیرا نے دیکھا۔ دوست تکلیف میں ہے، تو لوٹ پڑا۔ پھنسیں گے تو اکٹھے۔ رکھوالوں نے اسے بھی پکڑ لیا۔ دوسرے دن دونوں دوست کانجی ہاؤس میں تھے۔

(۴)

ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا، کہ سارا دن گذر گیا۔ اور کھانے کو ایک تنکا بھی نہ ملا۔ سمجھ نہ آتا تھا۔ یہ کیسا مالک ہے۔ اس سے تو گیا ہی اچھا تھا۔ وہاں کئی بھینسیں تھیں، کئی بکریاں، کئی گھوڑے، کئی گدھے، مگر چارہ کسی کے سامنے بھی نہ تھا۔ سب زمین پر مردے کی طرح پڑے تھے۔ کئی تو اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔ سارا دن دروازہ کی طرف دیکھتے رہے۔ مگر چارہ لے کر نہ آیا۔تب غریبوں نے دیوار کی نمکین مٹی چاٹنی شروع کی۔ مگر اس سے کیا تسکین ہو سکتی تھی۔

جب رات کو بھی کھانا نہ ملا۔ تو ہیرا کے دل میں سرکشی کے خیالات پیدا ہوئے موتی سے بولا۔"مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جان نکل رہی ہے۔"
موتی : اتنی جلدی ہمت نہ ہارو بھائی۔ یہاں سے بھاگنے کا طریقہ سوچو۔
ہیرا : آؤ دیوار توڑ ڈالیں۔
موتی : مجھ سے تو اب کچھ نہ ہوگا۔
ہیرا : بس اسی بوتے پر اکڑتے تھے۔
موتی : ساری اکڑ نکل گئی بھائی۔

باڑے کی دیوار کچی تھی۔ ہیرا نے اپنے نوکیلے سینگ دیوار میں گاڑ دیے۔ اور

زور مارا تو مٹی کا ایک چپڑ نکل آیا۔ اس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے دوڑ دوڑ کر دیوار سے ٹکّریں ماریں۔ ہر ٹکّر میں تھوڑی تھوڑی مٹی گرنے لگی۔

اتنے میں کانجی ہاؤس کا چوکیدار لالٹین لے کر جانورں کی حاضری لینے آنکلا۔ ہیرا کی وحشت دیکھ کر اس نے اسے کئی ڈنڈے رسید کیے۔ اور موٹی سی رسی سے باندھ دیا۔

موتی نے پڑے پڑے اس کی طرف دیکھا۔ گویا زبان حال سے کہا ''آخر مار کھائی، کیا ملا؟''

ہیرا : زور تو آزمالیا۔

موتی : ایسا زور مارنا کس کام کا۔ اور بندھن میں پڑ گئے۔

ہیرا : اس سے باز نہ آؤں گا۔ خواہ بندھن بڑھتے جائیں۔

موتی : جان سے ہاتھ دھو بیٹھوگے۔

ہیرا : اس کی مجھے پرواہ نہیں۔ یوں بھی تو مرنا ہے۔ ذرا سوچو اگر دیوار گرجاتی تو کتنی جانیں بچ جاتیں۔ اتنے بھائی یہاں بند ہیں۔ کسی کے جسم میں جان ہی نہیں۔ دو چار دن یہی حال رہا تو سب مرجائیں گے۔

موتی نے بھی دیوار میں اسی جگہ سینگ مارا۔ تھوڑی سی مٹی گری اور ہمّت بڑھی۔ تو وہ دیوار میں سینگ لگا کر اسی طرح زور کرنے لگا۔ جیسے کسی سے لڑ رہا ہو۔ آخر کوئی دو گھنٹہ کی زور آزمائی کے بعد دیوار کا کچھ حصّہ گر گیا۔ اس نے دوگنی طاقت سے دوسرا دھکّا لگایا۔ تو آدھی دیوار گڑ پڑی۔

دیوار کا گرنا تھا۔ کہ نیم جان فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں گھوڑیاں بھاگ نکلیں۔ بھیڑ بکریاں نکلیں۔ اس کے بعد بھینسیں بھی کھسک گئیں۔ پر گدھے ابھی کھڑے تھے۔

ہیرا نے پوچھا۔'' تم کیوں نہیں جاتے''؟

ایک گدھے نے کہا۔'' کہیں پھر پکڑ لیے جائیں تو ''؟

ہیرا : پکڑ لیے جاؤ۔ پھر دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو موقعہ ہے۔

گدھا : ہمیں ڈر لگتا ہے۔ ہم نہ بھاگیں گے۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ دونوں گدھے کھڑے سوچ رہے تھے۔ بھاگیں یا نہ بھاگیں؟ موتی اپنے دوست کی رسی کاٹنے میں مصروف تھا۔ جب وہ ہار گیا تو ہیرا نے کہا۔" تم جاؤ مجھے یہیں رہنے دو۔ شاید کبھی ملاقات ہو جائے۔

موتی نے آنکھوں میں آنسو ں لاکر کہا۔" تم مجھے خود غرض سمجھتے ہو ہیرا، ہم اور تم اتنے دنوں ساتھ رہے۔ آج تم مصیبت میں پھنسے تو میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔

ہیرا : بہت مار پڑے گی۔ سمجھ جائیں گے یہ تمھاری شرارت ہے۔

موتی : جس قصور کے لیے تمھارے گلے میں رسا پڑا ہے اس کے لیے اگر مجھ پر مار پڑے گی۔ تو کیا بات ہے۔ اتنا تو ہو گیا کہ نو دس جانوروں کی جان بچ گئی۔

یہ کہہ کر موتی نے دونوں گدھوں کو سینگ مار مار کر باہر نکال دیا اور اپنے دوست کے پاس آکر سو گیا۔

صبح ہوتے ہوتے منشیوں، چوکیداروں اور دوسرے ملازموں میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے بعد موتی کی مرمت ہوئی اور اسے بھی موٹی رسّی سے باندھ دیا گیا۔

(۵)

ایک ہفتہ تک دونوں بیل بندھے پڑے رہے۔ خدا جانے اس کانجی ہاؤس کے آدمی کیسے بے درد تھے، کہ کسی نے چارے کا ایک تنکا تک نہ ڈالا۔ ہاں ایک مرتبہ پانی دکھا دیا جاتا تھا۔ یہی ان کی خوراک تھی۔ دونوں اتنے کمزور ہو گیے کہ اٹھا تک نہ جاتا تھا۔ ہڈیاں نکل آئیں۔

ایک دن باڑے کے سامنے ڈگڈگی بجنے لگی۔ اور دوپہر ہوتے ہوتے پچاس ساٹھ آدمی جمع ہوگئے۔ تب دونوں بیل نکالے گئے اور ان کی دیکھ بھال ہونے لگی۔ لوگ آ آ کر ان کی صورت دیکھتے۔ اور چلے جاتے تھے۔ ایسے نیم جان بیلوں کو کون خریدتا؟

معاً ایک آدمی جس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اور جس کے چہرہ پر سخت دلی کے آثار نمایاں تھے آیا اور منشی جی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی شکل دیکھ کر کسی

نامعلوم احساس سے دونوں بیل کانپ اٹھے۔ وہ کون ہے اور انھیں کیوں خریدتا ہے؟ اس کے متعلق انھیں کوئی شبہہ نہ رہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور سر جھکا لیا۔

ہیرانے کہا۔ ’’ گیا کے گھر سے ناحق بھاگے۔ اب جان نہ بچے گی۔‘‘

موتی نے جواب دیا۔’’ کہتے ہیں بھگوان سب پر مہربانی کرتے ہیں۔ انھیں ہماری حالت پر رحم کیوں نہیں آتا۔؟

ہیرا : بھگوان کے لیے ہمارا مرنا جینا دونوں برابر ہیں۔

موتی : چلو اچھا ہے کچھ دن ان کے پاس رہیں گے۔

ہیرا : ایک مرتبہ بھگوان نے اس لڑکی کے روپ میں بچایا تھا۔ کیا اب نہ بچائیں گے۔؟

موتی : یہ آدمی چھری چلائے گا۔ دیکھ لینا۔

ہیرا : معمولی بات ہے۔ مرکر ان دکھوں سے چھوٹ جائیں گے۔

نیلام ہوجانے کے بعد دونوں بیل اس آدمی کے ساتھ چلے۔ دونوں کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ بے چارے پاؤں تک نہ اٹھا سکتے تھے۔ مگر ڈر کے مارے چلے جاتے تھے۔ ذرا بھی آہستہ چلتے تو وہ ڈنڈا جما دیتا تھا۔

راہ میں گائے بیلوں کا ایک ریوڑ مرغزار میں چرتا نظر آیا۔ سبھی جانور خوش تھے۔ کوئی اچھلتا تھا، کوئی بیٹھا جگالی کرتا تھا۔ کیسی پرمسرت زندگی تھی۔ لیکن وہ کیسے خود غرض تھے۔ کسی کو ان کی پروا نہ تھی۔ کسی کو خیال نہ تھا، کہ ان کے دو بھائی موت کے پنجہ میں گرفتار ہیں۔

معاً انھیں ایسا معلوم ہوا، کہ یہ رستہ دیکھا ہوا ہے۔ ہاں ادھر ہی سے تو گیا ان کو اپنے گاؤں لے گیا تھا۔ وہی کھیت ہیں، وہی باغ، وہی گاؤں، اب ان کی رفتار تیز ہونے لگی، ساری تکان، ساری کمزوری، ساری مایوسی، رفع ہو گئی۔ ارے یہ تو اپنا کھیت آ گیا۔ یہ اپنا کنواں ہے جہاں ہر روز پانی پیا کرتے تھے۔

موتی نے کہا۔ ’’ ہمارا گھر نزدیک آ گیا۔‘‘

ہیرا بولا۔ ’’ بھگوان کی مہربانی ہے۔‘‘

موتی : میں تو اب گھر کو بھاگتا ہوں۔
ہیرا : یہ جانے بھی دے گا۔ اتنا سوچ لو۔
موتی : اسے مار گراتا ہوں۔ جب تک سنبھلے تب تک ہم گھر جا پہنچیں گے۔
ہیرا : نہیں دوڑ کر تھان تک چلو وہاں سے آگے نہ چلیں گے۔

دونوں مست ہو کر بچھڑوں کی طرح کلیلیں کرتے ہوئے گھر کی طرف دوڑے اور اپنے تھان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ آدمی بھی پیچھے پیچھے دوڑا آتا تھا۔

جھوری دروازہ پر بیٹھا دھوپ کھا رہا تھا۔ بیلوں کو دیکھتے ہی دوڑا۔ اور انھیں پیار کرنے لگا۔ بیلوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک جھوری کا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ دوسرا پیر۔

اس آدمی نے آکر بیلوں کی رسیاں پکڑ لیں۔ جھوری نے کہا۔ "یہ بیل میرے ہیں۔"

"تمھارے کیسے ہیں۔ میں نے نیلام میں لیے ہیں۔"

جھوری۔ "میرا خیال ہے چرا کر لائے ہو۔ چپکے سے چلے جاؤ۔ بیل میرے ہیں۔ میں بیچوں گا تو بکیں گے، کسی کو میرے بیل بیچنے کا کیا حق ہے۔

"میں نے تو خرید ے ہیں۔"

"خریدے ہوں گے"

اس پر وہ آدمی زبردستی بیلوں کو لے جانے کے لیے آگے بڑھا۔ اسی وقت موتی نے سینگ چلایا۔ وہ آدمی پیچھے ہٹا۔ موتی نے تعاقب کیا اور اسے ریلتا ہوا گاؤں کے باہر تک لے گیا۔ اور تب اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمی دور کھڑا دھمکیاں دیتا تھا۔ گالیاں دیتا تھا۔ پتھر پھینکتا تھا۔ اور موتی اس کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ گاؤں کے لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔

جب وہ آدمی ہار کر چلا گیا تو موتی اکڑتا ہوا لوٹ آیا۔

ہیرا نے کہا۔"میں ڈر رہا تھا کہ کہیں تم اسے مار نہ بیٹھو۔"

موتی : اگر نزدیک آتا تو ضرور مارتا۔
ہیرا : اب نہ آئے گا۔

موتی : آئے گا تو دور ہی سے خبر لوں گا۔ دیکھو کیسے لے جاتا ہے۔

ذرا دیر بعد ناند میں کھلی، بھوسہ، چوکر، دانہ سب کچھ بھر دیا گیا۔ دونوں بیل کھانے لگے۔ جھوری کھڑا ان کی طرف دیکھتا اور خوش ہوتا تھا۔ بیسوں لڑکے تماشا دیکھ رہے تھے۔ سارا گاؤں مسکرا تا معلوم ہو تا تھا۔

اسی وقت مالکن نے آ کر اپنے دونوں بیلوں کے ماتھے چوم لیے۔

یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ ہنس کے اکتوبر 1931 کے شمارے میں شائع ہوا۔ چندن کے نومبر 31 میں شائع ہوا۔ مانسروور نمبر 3 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ آخری تحفہ میں شامل ہے۔

نجات

دکھی چمار دروازے پر جھاڑو لگا رہا تھا اور اس کی بیوی جھریا گھر کو لیپ رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے کام سے فراغت پا چکے تو چمارن نے کہا:

''تو جاکر پنڈت بابا سے کہہ آؤ۔ ایسا نہ ہو کہیں چلے جائیں۔''

دکھی : ہاں جاتا ہوں لیکن یہ تو سوچ کہ بیٹھیں گے کس چیز پر؟

جھڑیا : کہیں سے کوئی کھٹیا نہ مل جائے گی، ٹھکرانی سے مانگ لانا۔

دکھی : تو کبھی کبھی ایسی بات کہہ دیتی ہے کہ بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ بھلا ٹھکرانے والے مجھے کھٹیا دیں گے؟ جا کر ایک لوٹا پانی مانگوں تو نہ ملے۔ بھلا کھٹیا کون دے گا۔ ہمارے اوپلے، ایندھن، بھوسا لکڑی تھوڑے ہی ہیں کہ جو چاہے اٹھالے جائے۔ اپنی کھٹولی دھو کر رکھ دے۔ گرمی کے تو دن ہیں ان کے آتے آتے سوکھ جائے گی۔

جھریا : ہماری کھٹولی پر وہ نہ بیٹھیں گے، دیکھتے نہیں کتنے نیم دھرم سے رہتے ہیں۔

دکھی نے کسی قدر مغموم لہجہ میں کہا۔ ''ہاں یہ بات تو ہے مہوے کے پتے توڑ کر ایک پتل بنالوں، تو ٹھیک ہوجائے۔ پتل میں بڑے آدمی کھاتے ہیں۔ وہ پاک ہے۔ لا تو لاٹھی پتے توڑ لوں۔''

جھریا : پتل میں بنالوں گی۔تم جاؤ لیکن ہاں انھیں سیدھا بھی جائے اور تھالی بھی۔ چھوٹے بابا تھالی اٹھا کر پٹک دیں گے۔ وہ بہت جلد غصہ میں آجاتے ہیں۔ غصہ میں

پنڈتانی تک کو نہیں چھوڑتے۔ لڑکے کو ایسا پیٹا کہ آج تک ٹوٹا ہاتھ لیے پھرتا ہے۔ پتّل میں سیدھا بھی دے دینا۔ مگر چھونا مت۔ بھوری گونڈ کی لڑکی کو لے کر شاہ کی دکان سے چیزیں لے آنا۔ سیدھا بھرپور۔ سیر بھر آٹا، آدھ سیر چاول، پاؤ بھر دال، آدھ پاؤ گھی، نمک، ہلدی اور پیتل میں ایک کنارے چار آنہ کے پیسے رکھ دینا۔ گونڈ کی لڑکی نہ ملے تو پھر جن کے ہاتھ پیر جوڑ کر لے آنا۔ تم کچھ نہ چھونا ورنہ غجب ہو جائے گا۔

ان باتوں کی تاکید کر کے دکھی نے لکڑی اٹھالی اور گھاس کا ایک بڑا سا گٹھا لے کر پنڈت جی سے عرض کرنے چلا۔ خالی ہاتھ باباجی کی خدمت میں کس طرح جاتا۔ نذرانے کے لیے اس کے پاس گھاس کے سوا اور کیا تھا۔ اسے خالی دیکھ کر تو بابا جی دور ہی دھتکار دیتے۔

(۲)

پنڈت گھاس رام ایشور کے پرم بھگت تھے۔ نیند کھلتے ہی ایشور اپاسنا میں لگ جاتے۔ منہ ہاتھ دھوتے دھوتے آٹھ بجتے۔ تب اصلی پوجا شروع ہوتی۔ جس کا پہلا حصہ بھنگ کی تیاری تھی۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک چندن رگڑتے۔ پھر آئینے کے سامنے ایک تنکے سے پیشانی پرتلک لگاتے۔ چندن کے متوازی خطوں کے درمیان لال روئی کا ٹیکہ ہوتا۔ پھر سینہ پر دونوں بازوؤں پر چندن کے گول گول دائرے بناتے اور ٹھاکرجی کی مورتی نکال کر اسے نہلاتے۔ چندن لگاتے، پھول چڑھاتے آرتی کرتے اور گھنٹی بجاتے۔ دس بجتے بجتے وہ پوجن سے اٹھتے۔ اور بھنگ چھان کر باہر آتے۔ اس وقت دو چار ججمان دروازے پر آجاتے۔ ایشور اپاسنا کا فی الفور پھل مل جاتا۔ یہی ان کی کھیتی تھی۔

آج وہ عبادت خانے سے نکلے تو دیکھا، دکھی چمار گھاس کا ایک گٹھا لیے بیٹھا ہے۔ انھیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور نہایت ادب سے ڈنڈوت کر کے ہاتھ باندھ کرکھڑا ہو گیا۔ ایسا پرجلال چہرہ دیکھ کر اس کا دل عقیدت سے پر ہو گیا۔ کتنی تقدس مآب صورت تھی۔ چھوٹا سا گول مول آدمی۔ چکنا سر، پھولے ہوئے رخسار، روحانی

جلال سے منور آنکھیں اس پر روئی اور چندن نے دیوتاؤں کی تقدیس عطا کر دی تھی۔ دکھی کو دیکھ کر شیریں لہجہ میں بولے۔'' آج کیسے چلا آیا رے دکھیا''؟

دکھی نے سر جھکا کر کہا۔''بیٹا کی سگائی کر رہا ہوں مہاراج! ساعت شگن بچارنا ہے۔ کب مرجی ہوگی''؟

گھاسی : آج تو مجھے چھٹی نہیں ہے۔ شام تک آجاؤں گا۔

دکھی : نہیں مہاراج! جلدی مرجی ہوجائے۔ سب سامان ٹھیک کر آیا ہوں۔ یہ گھاس کہاں رکھ دوں؟

گھاسی : اس گائے کے سامنے ڈال دے۔ اور ذرا جھاڑو لے کر دروازہ تو صاف کر دے۔ یہ بیٹھک بھی کئی دن سے لیپی نہیں گئی۔ اسے بھی گوبر سے لیپ دے۔ تب تک میں بھوجن کرلوں۔ پھر ذرا آرام کرکے چلوں گا۔ ہاں یہ لکڑی بھی چیر دینا۔ کھلیان میں چار کھانچی بھوسہ پڑا ہے۔ اسے بھی اٹھا لانا اور بھوسیلے میں رکھ دینا۔''

دکھی فوراً حکم کی تعمیل کرنے لگا دروازے پر جھاڑو لگائی۔ بیٹھک کو گوبر سے لیپا۔ اس وقت بارہ بج چکے تھے۔ پنڈت جی بھوجن کرنے چلے گئے۔ دکھی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسے بھی زور کی بھوک لگی۔ لیکن وہاں کھانے کو دھرا ہی کیا تھا؟ گھر یہاں سے میل بھر تھا۔وہاں کھانے چلا جائے تو پنڈت جی بگڑ جائیں بے چارے نے بھوک دبائی اور لکڑی پھاڑ نے لگا۔ لکڑی کی موٹی سے گروہ تھی۔ جس پر کتنے ہی بھگتوں نے اپنا زور آزما لیا تھا۔ وہ اسی دم خم کے ساتھ لوہے سے لوہا لینے کے لیے تیار تھی۔دکھی گھاس چھیل کر بازار لے جاتا۔ لکڑی چیر نے کا اسے محاورہ نہ تھا۔ گھاس اس کے کھرپے کے سامنے سر جھکا دیتی تھی۔یہاں کس کس کر کلہاڑی کا بھر پور ہاتھ جماتا لیکن اس گرہ پر نشان تک نہ پڑتا تھا۔ کلہاڑی اچٹ جاتی۔ پسینہ سے تر تھا۔ ہانپتا تھا۔ تھک کر بیٹھ جاتا تھا۔ پھر اٹھتا تھا۔ ہاتھ اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔پاؤں کانپ رہے تھے۔ ہوائیاں اڑرہی تھیں، پھر بھی اپنا کام کیے جاتا تھا۔ اگر ایک چلم تمباکو پینے کو مل جاتا تو شاید کچھ طاقت آجاتی۔ اس نے سوچا یہاں چلم اور تمباکو کہاں ملے گا۔ برہمنوں کا گاؤں ہے۔ برہمن ہم سب نیچ جاتوں کی طرح تمباکو تھوڑی ہی پیتے ہیں۔ یکایک اسے یاد آیا کہ گاؤں میں ایک گونڈ بھی رہتا

ہے۔ اس کے یہاں ضرور چلم تمباکو ہوگی۔ فوراً اس کے گھر دوڑا۔ خیر محنت سپھل ہوئی۔ اس نے تمباکو اور چلم دی۔ لیکن آگ وہاں نہ تھی دکھی نے کہا۔ ''آگ کی فکر نہ کرو بھائی پنڈت جی کے گھر سے آگ مانگ لوں گا۔ وہاں تو ابھی رسوئی بن رہی تھی۔''

یہ کہتا ہوا وہ دونوں چیزیں لے کر چلا اور پنڈت جی کے گھر میں دالان کے سامنے دروازہ پر کھڑا ہوکر بولا۔''مالک ذرا سی آگ مل جائے تو چلم پی لیں۔''

پنڈت جی بھوجن کر رہے تھے۔ پنڈتانی نے پوچھا۔'' یہ کون آدمی آگ مانگ رہا ہے''؟

''ارے وہی سسرا دکھیا چمار ہے۔ کہا ہے تھوڑی سی لکڑی چیر دے۔ آگ ہے تو دے دو !''

پنڈتانی نے بھنویں چڑھا کر کہا۔'' تمھیں تو جیسے پوتھی پترے کے پھیر میں دھرم کرم کی سدھ بھی نہ رہی۔ چمار ہو، دھوبی ہو، پاسی ہو، منہ اٹھائے گھر میں چلے آئے۔ پنڈت کا گھر نہ ہوا کوئی سرائے ہوئی۔ کہہ دو ڈیوڑھی سے چلاجائے۔ ورنہ اسی آگ سے منہ جھلس دوں گی۔ بڑے آگ مانگنے چلے ہیں۔''

پنڈت جی نے انھیں سمجھا کر کہا۔'' اندر آگیا تو کیا ہو ا۔ تمھاری کوئی چیز تو نہیں چھوئی۔ زمین پاک ہے۔ ذرا سی آگ کیوں نہیں دے دیتیں؟ کام تو ہمارا ہی کر رہا ہے۔ کوئی لکڑہارا یہی لکڑی پھاڑتا تو کم از کم چار آنے لیتا۔''

پنڈتانی نے گرج کر کہا۔'' وہ گھر میں آیا ہی کیوں''؟

پنڈت نے ہار کر کہا۔'' سسرے کی بدقسمتی تھی۔''

پنڈتانی۔'' اچھا اس وقت تو آگ دے دیتی ہوں لیکن پھر جو اس گھر میں آئے گا تو منہ جھلس دوں گی۔

دکھی کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک پڑ رہی تھی۔ بے چارا پچھتا رہا تھا۔ ناحق آیا۔ سچ تو کہتی ہیں۔ پنڈت کے گھر چمار کیسے چلا آئے۔ یہ لوگ پاک صاف ہوتے ہیں تب ہی تو اتنا مان ہے۔ چہ چمار تھوڑے ہی ہیں۔ اسی گاؤں میں بوڑھا ہوگیا مگر مجھے اتنی اکل (عقل) بھی نہ آئی۔ اسی لیے جب پنڈتانی جی آگ

لے کر نکلیں تو جیسے اسے جنت مل گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر سر جھکاتا ہوا بولا۔ ''پنڈتانی ماتا، مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ گھر سے چلا آیا۔ چمار کی اکل (عقل) ہی تو ٹھہری۔ اتنے مورکھ نہ ہوتے تو سب کی لات کیوں کھاتے؟

پنڈتانی چمٹے سے پکڑ کر آگ لائی تھی۔ انھوں نے پانچ ہاتھ کے فاصلہ پر گھونگھٹ کی آڑ سے دکھی کی طرف آگ پھینکی۔ ایک بڑی سی چنگاری اس کے سر پر پڑگئی۔ جلدی سے پیچھے ہٹ کر جھاڑنے لگا۔ اس کے دل نے کہا۔ یہ ایک پاک برہمن کے گھر کو ناپاک کرنے کا نتیجہ ہے۔ بھگوان نے کتنی جلدی سزا دے دی۔ اسی لیے تو دنیا پنڈتوں سے ڈرتی ہے اور سب کے روپے مارے جاتے ہیں برہمن کے روپے بھلا کوئی مار تو لے۔ گھر بھر کا ستیا ناس ہو جائے۔ ہاتھ پاؤں گل گل کر گرنے لگیں۔

باہر آکر اس نے چلم پی اور کلہاڑی لے کر مستعد ہو گیا۔ کھٹ کھٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ سر پر آگ پڑ گئی تو پنڈتانی کو کچھ رحم آ گیا۔ پنڈت جی کھانا کھا کر اٹھے تو بولیں۔''اس چمرا کو بھی کچھ کھانے کو دے دو۔ بے چارہ کب سے کام کر رہا ہے۔ بھوکا ہوگا۔

پنڈت جی نے اس تجویز کو فنا کر دینے کے ارادے سے پوچھا۔

''روٹیاں ہیں۔

پنڈتانی : دوچار بچ جائیں گی۔

پنڈت : دوچار روٹیوں سے کیا ہوگا۔ یہ چمار ہے۔ کم از کم سیر بھر چڑھا جائے گا۔

پنڈتانی کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔'' ارے باپ رے! سیر بھر! تو پھر رہنے دو۔''

پنڈت جی نے اب شیر بن کر کہا۔'' کچھ بھوسی چوکر ہو تو آٹے میں ملا کر موٹی موٹی روٹیاں توے پر ڈال دو۔ سالے کا پیٹ بھر جائے گا۔ پتلی روٹیوں سے ان کمینوں کا پیٹ نہیں بھرتا۔ انھیں تو جوار کا ٹکّر چاہیے۔''

پنڈتانی نے کہا۔'' اب جانے بھی دو۔ دھوپ میں مرے۔''

(۳)

دکھی نے چلم پی کر کلہاڑی سنبھالی۔ دم لینے سے ذرا ہاتھوں میں طاقت آ گئی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک پھر کلہاڑی چلاتا رہا۔ پھر بے دم ہو کر وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں وہی گونڈ آ گیا۔ بولا۔ ''بوڑھے دادا جان کیوں دیتے ہو تمھارے پھاڑے یہ گانٹھ نہ پھٹے گی۔ ناحق ہلکان ہو تے ہو۔''

دکھی نے پیشانی کا پسینہ صاف کر کے کہا۔ ''بھائی، ابھی گاڑی پر بھوسہ ڈھونا ہے۔''

گونڈ : کچھ کھانے کو بھی دیا یا کام ہی کروانا جانتے ہیں، جاکے مانگتے کیوں نہیں؟

دکھی : تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ بھلا برہمن کی روٹی ہم کو پچے گی؟

گونڈ : پچنے کو تو پچ جائے گی۔ مگر ملے تو۔ خود تو مونچھوں پرتاؤ دے کر کھانا کھایا۔ اور آرام سے سو رہے ہیں۔ تمھارے لیے لکڑی پھاڑنے کا حکم لگادیا۔ زمیندار بھی کچھ کھانے کو دیتا ہے۔ حاکم بھی بیگار لیتاہے تو تھوڑی بہت مزدوری دے دیتا ہے۔ یہ ان سے بھی بڑھ گئے۔ اس پر دھرماتما بنتے ہیں۔''

دکھی نے کہا۔'' بھائی آہستہ بولو۔ کہیں سن لیں گے، تو بس !''

یہ کہہ کر دکھی پھر سنبھل پڑا۔ اور کلہاڑی چلانے لگا۔گونڈ کو اس پر رحم آ گیا۔ کلہاڑی ہاتھ سے چھین کر تقریباً نصف گھنٹہ تک جی توڑ کر چلاتا رہا۔ لیکن گانٹھ پر ذرا بھی نشان نہ ہوا۔ بالآخر اس نے کلہاڑی پھینک دی اور یہ کہہ کر چلا گیا۔'' یہ تمھارے پھاڑنے سے نہ پھٹے گی۔ خواہ تمھاری جان ہی کیوں نہ نکل جائے۔''

دکھی سوچنے لگا۔ یہ گانٹھ انھوں نے کہاں سے رکھ چھوڑی تھی کہ پھاڑے نہیں پھٹتی۔ میں کب تک اپنا خون پسینہ ایک کروں گا۔ ابھی گھر پر سو کام پڑے ہیں۔ کام کاج والا گھرہے ایک نہ ایک چیز گھٹتی رہتی ہے۔ مگر انھیں ان کی کیا فکر؟ چلوں جب تک بھوسہ ہی اٹھا لاؤں۔ کہہ دوں گا آج تو لکڑی نہیں پھٹتی۔ کل آ کر پھاڑ دوں گا۔''

اس نے ٹوکرا اٹھا یا اور بھوسہ ڈھونے لگا۔کھلیان یہاں سے دو فرلانگ سے کم نہ تھا۔ اگر ٹوکرا خوب خوب بھر بھر کر لاتا تو کام جلد ہو جاتا مگر سر پر اٹھاتا کون؟ خود اس سے نہ اٹھ سکتا تھا۔ اس لیے تھوڑا تھوڑا لاتا تھا۔ چار بجے کہیں بھوسہ ختم ہوا۔ پنڈت جی کی نیند بھی کھلی۔ منہ ہاتھ دھوئے پان کھایا۔ اور باہر نکلے۔ دیکھا تو دکھی ٹوکرے پر سر رکھے سو رہا ہے۔ زور سے بولے۔

ارے دکھیا! تو سو رہا ہے۔ لکڑی تو ابھی جوں کی توں پڑی ہے۔ اتنی دیر تو کیا کرتا رہا؟ مٹھی بھربھوسہ اٹھانے میں شام کر دی۔ اس پر سو رہا ہے۔ کلہاڑی اٹھالے۔ اور لکڑی پھاڑ ڈال۔ تجھ سے قط بھر لکڑی بھی نہیں پھٹتی۔ پھر ساعت بھی ویسی ہی نکلے گی۔ مجھے دوش مت دینا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جہاں نیچ کے گھر کھانے کو ہوا اس کی آنکھ بدل جاتی ہے۔''

دکھی نے پھر کلہاڑی اٹھائی جو باتیں اس نے پہلے سوچ رکھی تھیں۔ وہ سب بھول گیا۔ پیٹ پیٹھ میں دھنسا جاتا تھا۔ آج صبح ناشتہ تک نہ کیا تھا۔ فرصت ہی نہ ملی۔ اٹھنا بیٹھنا تک پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ دل ڈوبا جاتا تھا۔ پر دل کو سمجھا کر اٹھا۔ پنڈت ہیں۔ کہیں ساعت ٹھیک نہ بچاریں تو پھر ستیہ ناس ہو جائے۔ جب بھی تو ان کا دنیا میں اتنا مان ہے۔ ساعت ہی کا تو سب کھیل ہے جسے چاہیں بنادیں جسے چاہیں بگاڑدیں۔ پنڈت جی گانٹھ کے پاس آکر کھڑے ہو گئے اور حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ ہاں مار کس کے اور کس کے مار، ابے زور سے مار تیرے ہاتھ میں تو جیسے دم ہی نہیں۔ لگا کس کے، کھڑا کھڑا سوچنے کیا لگتا ہے۔ ہاں بس پھٹا ہی چاہتی ہے۔ اسی سوراخ میں۔''

دکھی اپنے ہوش میں نہ تھا۔ نہ معلوم کوئی غیبی طاقت اس کے ہاتھوں کو چلا رہی تھی۔ تکان، بھوک، پیاس، کمزوری، سب کے سب جیسے ہوا ہو گئی تھیں۔ اسے اپنے قوت بازو پر خود تعجب ہو رہا تھا۔ ایک ایک چوٹ پہاڑ کی مانند پڑتی تھی۔ آدھ گھنٹے تک وہ اسی طرح بے خبری کی حالت میں ہاتھ چلاتا رہا۔ حتی کہ لکڑی بیچ سے پھٹ گئی۔ اور دکھی کے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ کر گر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی وہ لمبی چکر کھا کر گر پڑا۔ بھوکا پیاسا، تکان خوردہ جسم جواب دے گیا۔ پنڈت جی

نے پکارا ''اٹھ کر دو چار ہاتھ اور لگا دے۔ پتلی پتلی چیلیاں ہو جائیں۔''

دکھی نہ اٹھا۔

پنڈت جی نے اب اسے دق کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اندر جاکر بوٹی چھانی۔ حاجات ضروری سے فارغ ہوئے۔ نہایا اور پنڈتوں کا لباس پہن کر باہر نکلے۔

دکھی ابھی تک وہیں پڑا ہوا تھا۔ زور سے پکارا ''ارے دکھی، کیا پڑے ہی رہوگے؟

چلو تمھارے ہی گھر چل رہا ہوں۔ سب سامان ٹھیک ہے نا؟

دکھی پھر بھی نہ اٹھا۔

اب پنڈت جی کو کچھ فکر ہوا۔ پاس جا کر دیکھا تو دکھی اکڑا ہوا پڑا تھا۔ بدحواس ہو کر بھاگے اور پنڈتانی سے بولے۔''دکھیا تو جیسے مر گیا۔''

پنڈتانی جی تعجب انگیز لہجہ میں بولیں۔'' ابھی تو لکڑی چیر رہا تھا نا!؟

ہاں لکڑی چیرتے چیرتے مر گیا۔ اب کیا ہو گا؟

پنڈتانی نے مطمئن ہو کر کہا۔'' ہو گا کیا، چمرونے میں کہلا بھیجو، مردہ اٹھا لے جائیں۔

دم کے دم میں یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی۔ گاؤں میں زیادہ تر برہمن ہی تھے۔ صرف ایک گھر گونڈ کا تھا۔ لوگوں نے ادھر کا راستہ چھوڑ دیا۔ کنوئیں کا راستہ ادھر ہی سے تھا۔ پانی کیوں کر بھرا جائے؟ چمار کی لاش کے پاس ہو کر پانی بھرنے کون جائے۔ ایک بڑھیا نے پنڈت جی سے کہا۔'' اب مردہ کیوں نہیں اٹھواتے۔ کوئی گاؤں میں پانی پئے گا یا نہیں''؟

ادھر گونڈ نے چمرونے میں جاکر سب سے کہہ دیا۔''خبردار مردہ اٹھانے مت جانا۔ ابھی پولیس کی تحقیقات ہوگی۔ دل لگی ہے کہ ایک غریب کی جان لے لی۔پنڈت ہوں گے۔ تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ لاش اٹھاؤ گے تو تم بھی پکڑے جاؤ گے۔

اس کے بعد ہی پنڈت جی پہنچے۔ پر چمرونے میں کوئی آدمی لاش اٹھا لانے کو تیار نہ ہوا۔ ہاں دکھی کی بیوی اور لڑکی دونوں ہائے ہائے کرتی وہاں سے چلیں۔ اور

پنڈت جی کے دروازے پر آ کر سر پیٹ پیٹ کر رونے لگیں۔ ان کے ساتھ دس پانچ اور چمارنیں تھیں۔ کوئی روتی تھی، کوئی سمجھاتی تھی۔ پر چمار ایک بھی نہ تھا۔ پنڈت جی نے ان سب کو بہت دھمکایا، سمجھایا، منت کی، پر چماروں کے دل پر پولیس کا ایسا رعب چھایا کہ ایک بھی من نہ سکا۔ آخر ناامید ہو کر لوٹ آئے۔

(۴)

آدھی رات تک رونا پیٹنا جاری رہا۔ دیوتاؤں کا سونا مشکل ہوگیا۔ مگر لاش اٹھانے کوئی چمار نہ آیا۔ اور برہمن چمار کی لاش کیسے اٹھائے؟ بھلا ایسا کسی شاستر پوران میں لکھا ہے۔ کہیں کوئی دکھاوے۔

پنڈتانی نے جھنجھلا کر کہا۔ ''ان ڈائنوں نے تو کھوپری چاٹ ڈالی سبھوں کا گلا بھی نہیں تھکتا۔''

پنڈت نے کہا۔ ''چڑیلوں کو رونے دو۔ کب تک روئیں گی۔ جیتا تھا تو کوئی بات نہ پوچھتا تھا۔ مرگیا تو شور و غل مچانے کے لیے سب کی سب آ پہنچیں۔''

پنڈتانی : چماروں کا رونا منحوس ہے۔

پنڈت : ہاں بہت منحوس۔

پنڈتانی : ابھی سے بو آنے لگی۔

پنڈت : چمار تھا، سسرا کہیں کا۔ ان سبھوں کو کھانے پینے میں کوئی بچار نہیں ہوتا۔

پنڈتانی : ان لوگوں کو نفرت بھی نہیں معلوم ہوتی۔

پنڈت : سب کے سب بھرشٹ ہیں۔

رات تو کسی طرح کٹی۔ مگر صبح بھی کوئی چمار نہ آیا۔ چمارنی بھی رو پیٹ کر چلی گئی۔ بدبو پھیلنے لگی۔

پنڈت جی نے ایک رسی نکالی۔ اس کا پھندا بنا کر مردے کے پیر میں ڈالا اور پھندے کو کھینچ کر کس دیا۔ ابھی کچھ کچھ اندھیرا تھا۔ پنڈت جی نے رسی پکڑ کر لاش کو گھسیٹنا شروع کیا اور گھسیٹ کر گاؤں کے باہر لے گئے۔

وہاں سے آ کر فوراً نہائے۔ درگا پاٹھ پڑھا اور سر میں گنگا جل چھڑکا۔

ادھر دکھی کی لاش کو کھیت میں گیدڑ، گدھ، اور کوے نوچ رہے تھے یہی اس کی تمام زندگی کی بھگتی، خدمت اور اعتقاد کا انعام تھا۔

یہ افسانہ پہلی بار کلکتہ کے ہندی ماہنامہ وشال بھارت کے اکتوبر 1931 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا سدگتی۔ مانسرور نمبر 4 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ آخری تحفہ میں شامل ہے۔

ادیب کی عزت

صبح کے وقت حضرت قمر نے بیس دفعہ اُبالی ہوئی چائے کا پیالہ تیار کیا۔ اور بغیر چینی اور دودھ کے پی گئے۔ یہی ان کا ناشتہ تھا۔ دودھ اور چینی ان کے نزدیک ضروریات زندگی میں نہ تھیں۔ گھر میں گئے ضرور کہ بیوی کو جگا کر پیسے مانگیں پر اسے پھٹے میلے لحاف میں سوتے دیکھ کر جگانے کو جی نہ چاہا۔ سوچا شاید مارے سردی کے رات بھر نیند نہ آئی ہوگی،اس وقت جا کر آنکھ لگی ہے۔کچی نیند جگا دینا مناسب نہ تھا چپکے سے لوٹ گئے۔

چائے پی کر انھوں نے قلم دوات سنبھالی اور وہ کتاب لکھنے میں محو ہو گئے جو ان کے خیال میں اس صدی کی بہترین تصنیف ہوگی۔ جس کی اشاعت ان کو قعرِ گمنامی سے نکال کر شہرت اور ناموری کے آسمان پر پہنچا دے گی۔ آدھ گھنٹہ کے بعد بیوی آنکھیں ملتے ہوئے آ کر بولی:

''چائے پی چکے ؟''

قمر نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ہاں پی چکا بہت اچھی بنی تھی۔

مگر دودھ اور چینی کہاں سے لائے۔

آج کل سادہ چائے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ دودھ اور چینی ملانے سے چائے کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے ہے۔ یورپ میں تو دودھ کا بالکل رواج نہیں۔ یہ تو ہمارے ہاں کے چینی نواز رئیسوں کی ایجاد ہے۔

نہ جانے آپ کو پھیکی چائے کیوں کر اچھی معلوم ہوتی ہے؟ مجھے جگا کیوں نہ لیا؟ پیسے تو رکھے تھے۔

قمر نے جواب نہ دیا اور پھر لکھنے لگے۔ جوانی ہی میں انھیں یہ بیماری لگ گئی تھی اور آج بیس سال سے وہ اسے پالے ہوئے تھے۔ اس بے نیازی کی شان سے جو ادیبوں کی امتیازی صفت ہے انھوں نے کسب معاش کے کسی اور ذریعہ کی طرف توجہ نہ کی۔ اس بیماری میں جسم گھل گیا، صحت گھل گئی اور چالیس سال کی عمر ہی میں بڑھاپے نے آ کر گھیر لیا۔ مگر یہ مرض لاعلاج ہے۔ طلوع آفتاب سے آدھی رات تک یہ ادب کا پجاری دنیا و مافیہا سے بے خبر، فکر سخن میں غرق رہتا۔ پر ہندوستان میں سرسوتی کی پوجا لکشمی کی ناراضی کے مترادف ہے۔ دل تو ایک ہی تھا دونوں دیویوں کو ایک ساتھ کیوں کر خوش کرتے؟ اور لکشمی کی ناراضی صرف افلاس کی شکل وصورت ہی میں ظاہر نہ ہوتی تھی بلکہ اس کی سب سے بھیانک صورت یہ تھی کہ اخبارات ورسائل کے ایڈیٹر بھی دل کھول کر داد نہ دیتے تھے جیسے ساری دنیا نے ان کے خلاف سازش کرلی ہو۔ یہاں تک کہ انھیں اپنے اوپر مطلق اعتماد نہ تھا اور اب انھیں یہ شبہہ ہونے لگا تھا کہ میرے مضامین میں کوئی خوبی کوئی معنی ہی نہیں اور یہ انکشاف بدرجہ غایت ہمت شکن تھا۔ یہ عمر عزیز یوں ہی تلف ہو گئی، یہ تسکین بھی نہیں کہ دنیا نے ناقدری کی ہو مگر ان کا کارنامۂ حیات حقیر نہیں۔ ضروریات زندگی گھٹتے گھٹتے زہد کی حدود کو بھی پار کر چکی تھی۔ اگر کوئی تسکین تھی تو محض یہ کہ ان کی رفیقۂ حیات ترک و ایثار میں ان سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ سکینہ اس تباہ حالی میں بھی مطمئن تھی۔ قمر کو دنیا سے شکایت ہو مگر سکینہ ہمیشہ اس کی دلجوئی کرتی رہتی تھی۔ اپنے نصیبوں کو رونا تو دور کی بات تھی اس دیوی نے کبھی ماتھے پر بل بھی نہ آنے دیا۔ سکینہ نے چائے کا پیالہ سمیٹتے ہوئے کہا:

تو جا کر گھنٹہ آدھ گھنٹہ کہیں گھوم پھر کیوں نہیں آتے؟ جب معلوم ہو گیا کہ جان دے کر کام کرنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں تو بے کار کیوں سر کھپاتے ہو؟

قمر نے بغیر قلم اٹھائے کہا ''لکھنے میں کم از کم یہ تسلی تو ہوتی ہے کہ کچھ کر رہا ہوں سیر کرنے میں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔

یہ اتنے لکھے پڑھے آدمی جو ہر روز ہوا کھانے جاتے ہیں تو یہ کیا اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟

مگر ان میں زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو سیر کرنے سے مالی نقصان نہیں ہوتا۔ اکثر تو سرکاری ملازم ہوتے ہیں جن کو ماہوار تنخواہ مل جاتی ہے یا ایسے پیشوں کے لوگ ہوتے ہیں جن کی عوام میں عزت ہے۔ میں تو مل کا مزدور ہوں تم نے کبھی مزدوروں کو بھی ہوا کھاتے دیکھا ہے۔ جنھیں کھانے کی کمی نہیں ان کو ہوا کی ضرورت ہے۔ جنھیں روٹیوں کے لالے ہیں وہ ہوا کیا کھائیں گے؟ پھر تندرستی اور لمبی عمر کی بھی ان ہی کو ضرورت ہے۔ اس بار کو سر پر کچھ دن اور اٹھائے رکھنے کی خواہش مجھے کیا ضرور ہے؟

سکینہ نے مایوسی میں ڈوبی ہوئی باتیں سن کر آنکھوں میں آنسو بھرے اور اندر چلی گئی۔ اس کا دل کہتا تھا۔ اس تپ کے پھل ایک دن انھیں ضرور ملے گا۔ دولت حاصل ہو یا نہ ہو۔ لیکن قمرصاحب یاس کی اس حدتک جا پہنچے تھے جہاں سے سمت مخالف میں طلوع ہونے والی امید کی سرخی بھی نہیں دکھائی دیتی۔

(۲)

ایک رئیس کے یہاں کوئی تقریب ہے۔ اس نے حضرت قمر کو بھی مدعو کیا ہے۔ آج ان کا دل خوشی کے گھوڑے پر بیٹھا ہوا ناچ رہا ہے۔ سارے دن وہ اسی تخیل میں محو رہے۔ راجہ صاحب کن الفاظ میں ان کا خیرمقدم کریں گے۔ اور وہ کن الفاظ میں ان کا جواب دیں گے۔ کن مضامین پر گفتگو ہوگی اور کن کن اصحاب سے ان کا تعارف کرایا جائے گا۔ سارا دن وہ انھیں خیالات کے لطف اٹھاتے رہے اس موقع کے لیے انھوں نے ایک نظم بھی تیار کی۔ جس میں انھوں نے زندگی کو ایک باغ سے تشبیہ دی تھی سراب ہستی ان کے زور طبع کے لیے زیادہ موزوں چیز تھی۔ مگر وہ آج رئیسوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگا سکتے تھے۔

دوپہر ہی سے انھوں نے تیاریاں شروع کیں۔ حجامت بنائی، صابن سے نہائے، سر میں تیل ڈالا، دقّت کپڑوں کی تھی۔ مدّت گذری جب انھوں نے ایک اچکن

بنوائی تھی۔ اس کی حالت بھی ان کی سی تھی جیسے ذرا سی سردی یا گرمی سے انھیں زکام یا سر درد ہوجاتا تھا۔ اسی طرح وہ اچکن بھی نازک مزاج تھی۔ اسے نکالا اور جھاڑ پونچھ کر رکھا۔

سکینہ نے کہا'' تم نے ناحق وہاں جانا منظور کیا۔ لکھ دیتے میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ان پھٹے حالوں جانا تو اور بھی برا ہے۔

قمر نے فلاسفروں کی سی سنجیدگی سے کہا'' جنھیں خدا نے دل اور سمجھ دی ہے وہ آدمیوں کا لباس نہیں دیکھتے۔ ان کے ہنر دیکھتے ہیں۔ آخر کچھ بات تو ہے کہ راجہ صاحب نے مدعو کیا ہے۔ میں کوئی عہدے دار نہیں، زمیندار نہیں، جاگیردار نہیں، ٹھیکہ دار نہیں معمولی ایک شاعر ہوں۔ شاعر کی قیمت اس کی نظمیں ہوتی ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے مجھے کسی شاعر کے سامنے نادم ہونے کی ضرورت نہیں۔

سکینہ ان کی سادگی پر ترس کھا کر بولی ''تم خیالات کی دنیا میں رہتے رہتے حقیقی دنیاسے بالکل بے گانہ ہوگئے ہو۔ میں کہتی ہوں راجہ صاحب کے یہاں لوگوں کی نگاہ سب سے زیادہ کپڑوں ہی پر پڑے گی۔ سادگی ضرور اچھی چیز ہے لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کہ آدمی بے وقوف ہی بن جائے۔''

قمر کو اس دلیل میں کچھ جان نظر آئی۔ اہل نظر کی طرح انھیں اپنی غلطیوں کے اعتراف میں پس و پیش نہ ہوتا تھا۔ بولے:''میرا خیال ہے۔ چراغ جل جانے کے بعد جاؤں۔''

''میں تو کہتی ہوں جاؤ ہی کیوں؟''

اب تم کو کیسے سمجھاؤں ہر شخص کے دل میں اعزاز و احترام کی بھوک ہوتی ہے۔ تم پوچھوگی یہ بھوک کیوں ہوتی ہے؟ اس لیے کہ یہ ہماری روح کے ارتقا کی ایک منزل ہے۔ ہم اس عظیم الشان طاقت کا لطیف حصہ ہیں جو ساری دنیا میں حاضر و ناظر ہے۔ جزو میں کل کی خوبیاں ہونا لازمی امر ہے۔ اس لیے جاہ و رفعت، علم و فضل کی جانب ہمارا فطری میلان ہے۔ میں اس ہوس کو معیوب نہیں سمجھتا۔ ہاں چونکہ دل میں ضعف ہے۔ اہل دنیا کے حرف گیریوں کا خیال قدم قدم پر دامنگیر ہوجاتا ہے۔

سکینہ نے گلا چھڑانے کے لیے کہا ''اچھا بھئی جاؤ۔ میں تم سے بحث نہیں کرتی لیکن کل کے لیے کوئی سبیل سوچتے جاؤ کیوں کہ میرے پاس صرف ایک آنہ اور رہ گیا ہے جن سے قرض مل سکتا تھا ان سے لے چکی اور جس سے لیا، اسے دینے کی نوبت نہیں آئی مجھے تو اب اور کوئی صورت نظر نہیں آتی''۔

قمر نے ایک لمحہ کے بعد کہا ''دو ایک اخباروں سے روپیہ آنے والا ہے شاید کل تک آجائے اور اگر فاقہ کشی ہی کرنی پڑے تو کیا فکر ہے۔ ہمارا فرض کام کرنا ہے ہم کام کرتے ہیں اور دل و جان سے کرتے ہیں اگر اس کے باوجود فاقہ کرنا پڑے تو میرا قصور نہیں۔ مر ہی تو جاؤں گا ہمارے جیسے لاکھوں آدمی آئے دن مرتے رہتے ہیں۔ دنیا کا کوئی کام بند نہیں ہوتا میں تو کبیر پنتھیوں کا قائل ہوں۔ جو گاتے بجاتے ہوئے جنازے کو لے جاتے ہیں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ تم ہی کہو میں جو کچھ کرتا ہوں اس سے زیادہ میرے امکان میں کیا ہے؟ ساری دنیا میٹھی نیند سوتی ہے اور میں قلم لیے بیٹھا رہتا ہوں۔ لوگ سیروتفریح کرتے ہیں، کھیلتے کودتے ہیں۔ میرے لیے سب کچھ حرام ہے۔ یہاں تک کہ مہینوں سے ہنسنے کی نوبت نہیں آئی۔ عید کے دن بھی میں نے تعطیل نہیں منائی۔ بیمار ہوتا ہوں جب بھی لکھتا ہوں۔ سوچو تم بیمار تھیں اور میرے پاس حکیم کے پاس جانے کے لیے بھی وقت نہ تھا۔ اگر دنیا نہیں قدر کرتی نہ کرے اس میں دنیا ہی کا نقصان ہے۔ میرا تو کوئی نقصان نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے اس کی روشنی پھیلتی ہے یا اس کے سامنے کوئی دیوار ہے اسے اس سے مطلب نہیں۔ میرا بھی ایسا کون دوست شناسا یا رشتہ دار ہے جس کا میں شرمندہ احسان نہیں؟ یہاں تک کہ اب گھر سے نکلتے بھی شرم آتی ہے۔ اطمینان صرف اتنا ہے کہ لوگ مجھے بدنیت تصور نہیں کرتے خواہ وہ میری کچھ زیادہ امداد نہ کرسکیں مگر انھیں مجھ سے ہمدردی ہے۔ میری خوشی کے لیے اسی قدر کافی ہے کہ آج مجھے ایک رئیس نے بلایا ہے۔

پھر معاً ان پر نشہ سا چھا گیا۔ غرور سے بولے:

''نہیں اب رات کو نہ جاؤں گا۔ میرا افلاس رسوائی کی حد تک پہنچ چکا ہے اس کی پردہ پوشی بے کار ہے۔ میں اسی وقت جاؤں گا جسے راجہ لوگ مدعو کریں۔ وہ

ایسا ویسا آدمی نہیں ہو سکتا۔ راجہ صاحب معمولی رئیس نہیں۔ وہ اسی شہر کے نہیں ہندوستان بھر کے مشہور آدمی ہیں۔ اگر اب بھی کوئی مجھے معمولی آدمی سمجھے تو اس کی عقل کا فتور ہے۔"

(۳)

شام کے وقت حضرت قمر اپنی پھٹی پرانی اچکن اور سڑے ہوئے جوتے اور بے تکی سے ٹوپی پہنے گھر سے نکلے تو گنوار اُچکّے سے معلوم ہوتے تھے۔ ڈیل ڈول اور چہرے مہرے کے آدمی ہوتے تو اس ٹھاٹھ میں بھی ایک شان ہوتی۔ فربہی بجائے خود ایک بارُعب شے ہے مگر ادبی خدمت اور فربہی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب موٹا تازہ ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس میں سوز نہیں، لوچ نہیں، دل نہیں۔ پھر بھی اکڑے جاتے تھے۔ ایک ایک عضو سے غرور ٹپکتا تھا۔

یوں گھر سے نکل کر وہ دکان داروں سے آنکھ بچا کر نکل جاتے تھے مگر آج وہ گردن اٹھائے ان کے سامنے سے جا رہے تھے۔ آج وہ ان کے تقاضوں کا دنداں شکن جواب دینے کو تیار تھے۔ مگر شام کا وقت تھا ہر ایک دکان پر خریداروں کا ہجوم تھا کوئی ان کی طرف نہیں دیکھتا جس رقم کو وہ بہت زیادہ سمجھتے تھے وہ دکان داروں کی نگاہوں میں معمول تھی کم از کم ایسی نہ تھی جس کی خاطر وہ کسی کی عزت اتار کر رکھ دیں۔ حضرت قمر نے ایک مرتبہ سارے بازار کا چکر لگایا پر جی نہ بھرا تب دوسرا چکر لگایا اس سے بھی کچھ نہ بنا تب وہ خود حافظ صمد کی دکان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ حافظ صاحب بساطی کا کام کرتے تھے۔ بہت دن ہوئے قمر کو دیکھ کر بولے "واہ حضرت ابھی تک چھاتے کے دام نہیں ملے ایسے سو پچاس گاہک مل جائیں تو دیوالہ نکل جائے۔ اب تو دن بہت ہو گئے۔"

حضرت قمر کی باچھیں کھل گئیں۔ دل کی مراد پوری ہوئی بولے "میں بھولا نہیں ہوں حافظ صاحب، ان دنوں کام کی اس قدر زیادتی رہی کہ گھر سے نکلنا دشوار تھا۔ روپیہ تو ہاتھ نہیں آتا۔ پر آپ کی دعا سے قدر شناسوں کی کمی نہیں۔ دو چار آدمی گھیرے ہی رہتے ہیں۔ زندگی وبال ہے۔ اس وقت بھی راجہ صاحب .... اجی

وہی جو ٹکڑے والے بنگلے میں رہتے ہیں انھیں کے یہاں جا رہا ہوں۔ روز کوئی نہ کوئی ایسا ہی موقعہ آتا رہتا ہے۔

حافظ صاحب مرعوب ہو گئے۔ اچھا آپ راجہ صاحب کے ہاں تشریف لے جارہے ہیں؟ ٹھیک ہے آپ جیسے با کمالوں کی قدر رئیس ہی کر سکتے ہیں اورکون کرے گا؟ سبحان اللہ! آپ اس وقت یکتا ہیں۔اگر کوئی موقعہ ہاتھ آئے تو غریب کو بھول نہ جایئے گا۔ راجہ صاحب کی اگر ادھر نگاہ ہو جائے تو پھر کیا پوچھنا ایک پورا بساط خانہ تو ان ہی کے لیے در کار ہے۔ ڈھائی تین لاکھ سالانہ کی آمدنی ہے۔

قمرصاحب کو ڈھائی تین لاکھ کی آمدنی حقیر سی معلوم ہوئی۔ زبانی جمع خرچ ہے تو بیس لاکھ کہنے میں کیا حرج ہے؟ بولے ''ڈھائی تین لاکھ، آپ تو انھیں گالیاں دیتے ہیں۔ ان کی آمدنی دس لاکھ سے کم نہیں۔ ایک صاحب کا اندازہ تو بیس لاکھ کا ہے۔ مکان ہیں، دکانیں ہیں، ٹھیکہ ہے۔ امانتی روپۓ ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سرکار بہادر کی نگاہ ہے۔

حافظ نے بڑے عجز سے کہا'' یہ دکان آپ کی ہے جناب، بس اتنی ہی عرض ہے۔ اے مرادی! ذرا دو پیسے کے اچھے پان تو بنوالا، آپ کے لیے۔آیئے دو منٹ بیٹھیۓ کوئی چیز دکھاؤں گا آپ سے تو گھر کا معاملہ ہے۔

قمر نے پان کھاتے ہوئے کہا'' اس وقت تو معاف رکھیۓ وہاں دیر ہوگی۔ پھر کبھی حاضر ہوں گا''۔

یہاں سے اٹھ کر وہ ایک کپڑے والے کی دکان پر رکے۔ منوہر داس نام تھا۔ انھیں دیکھ کر آنکھیں اٹھائیں۔ بے چارہ ان کے نام کو رو بیٹھا تھا۔ سوچتا تھا شاید کہیں چلے گئے۔ سمجھا روپۓ دینے آئے ہیں۔ بولا:

'' بھائی آپ تو بہت دنوں سے درشن ہی نہیں دیے۔ کئی بار رقعہ بھیجا مگر آدمی کو آپ کے مکان کا پتہ نہ ملا۔ منیم جی، ذرا دیکھو تو آپ کے نام نکلنا ہے؟

قمر کی روح تقاضوں سے کانپتی تھی لیکن آج اس طرح بے فکر کھڑے تھے جیسے کوئی آہنی خود پہن لیاہو۔ جس پر کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہوتا۔ بولے ''ذرا راجہ صاحب کے یہاں ہو آؤں تو بے فکر ہوکر بیٹھوں اس وقت وقت نہیں، جلدی میں ہوں''۔

راجہ صاحب پر منو ہر داس کے کئی ہزار روپے نکلتے تھے۔ پھر بھی ان کا دامن نہ چھوڑتا تھا ایک کے تین وصول کرتا۔ اس نے قمر کو بھی اسی جماعت میں رکھ لیا۔ جس کا پیشہ رئیسوں کو لوٹنا ہے۔ بولا:

''پان تو کھاتے جائیے۔ جناب راجہ صاحب ایک دن کے ہیں۔ ہم تو بارہ مہینوں کے ہیں۔ کچھ کپڑا درکار ہو تو لے جائیے۔ عید آ رہی ہے۔ موقعہ ملے تو راجہ صاحب کے خزانچی سے کہنا ''پرانا حساب بہت دنوں سے پڑا ہے اب تو صاف ہو جائے۔ اب ہم ایسا کون سا نفع لے لیتے ہیں کہ دو دو سال تک حساب ہی نہ ہو''۔

قمر بولے: ''اس وقت تو پان دان رہنے دو بھائی دیر ہو جائے گی۔ جب انھیں مجھ سے ملنے کا اس قدر اشتیاق ہے اور میرا اتنا ادب کرتے ہیں تو میرا بھی فرض ہے کہ انھیں تکلیف نہ ہونے دوں۔ ہم تو قدر دانی چاہتے ہیں۔ دولت کے بھوکے نہیں۔ کوئی ہمیں چاہے تو ہم اس کے غلام ہیں۔ کسی کو ریاست کا غرور ہے تو ہمیں بھی اپنے علم وکمال کا غرور ہے۔

(۴)

حضرت قمر راجہ صاحب کے بنگلے کے سامنے پہنچے تو دیے جل چکے تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی موٹریں کھڑی تھیں۔ دروازے پر وردی پوش دربان کھڑے تھے۔ ایک صاحب مہمانوں کا استقبال کررہے تھے قمر کو دیکھ کر وہ جھجکے۔ پھر انھیں سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولے ''آپ کے پاس کارڈ ہے''۔

قمر صاحب کی جیب میں کارڈ تھا مگر اس مطالبے پر انھیں غصہ آ گیا۔ انھیں سے کیوں کارڈ مانگا گیا؟ اوروں سے تو کوئی پوچھتا نہیں۔ بولے:

''میرے پاس تو کوئی کارڈ نہیں اگر آپ دوسروں سے کارڈ مانگتے تو میں بھی دکھا دیتا۔ ورنہ میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ آپ راجہ صاحب سے کہہ دیجیے گا قمر آیا تھا۔ لوٹ گیا۔

وہ صاحب بولے ''نہیں نہیں جناب، اندر چلیے آپ سے تعارف نہ تھا۔ معاف

فرمائیے۔ آپ ہی جیسے اصحاب سے تو محفل کی رونق ہے، خدا نے آپ کو وہ کمال عطا فرمایا ہے کہ سبحان اللہ!''

اس شخص نے قمر کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ مگر اس نے جو کچھ کہا وہ ہر ایک مصنف ہر ایک شاعر کے متعلق کہا جا سکتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ کوئی ادیب اس داد سے مستغنی نہیں۔

قمر اندر پہنچے تو دیکھا کہ بارہ دری کے سامنے وسیع اور آراستہ احاطہ میں بجلی کے لیمپ روشن ہیں۔ وسط میں ایک حوض ہے اور حوض میں سنگ مرمر کی ایک پری۔ پری کے سر پر فوّارہ۔ فوّارہ کی پھواریں رنگین لیمپوں سے رنگین ہو کر ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے قوس قزح پگھل کر برس رہا ہو۔ حوض کے چاروں طرف میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر سفید میز پوش ان پر خوبصورت گلدستے............

قمر کو دیکھتے ہی راجہ صاحب نے خیر مقدم کیا ''آیئے آیئے۔ اب کے انیس ہند میں آپ کی نظم دیکھ کر تو دل خوش ہو گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا اس شہر میں آپ جیسے رتن بھی چھپے ہوئے ہیں۔

پھر بیٹھے ہوئے احباب سے ان کا تعارف کرانے لگے۔ آپ نے حضرت قمر کا نام تو سنا ہوگا؟ وہ آپ ہی ہیں۔ کیا شیرینی ہے، کیا جدت ہے، کیا تخیل ہے، کیا روانی ہے، کیا ندرت ہے کہ واہ وا! میرا دل تو آپ کی چیزیں پڑھ کر ناچنے لگتا ہے۔

ایک صاحب نے جو انگریزی سوٹ میں تھے قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا وہ چڑیا گھر کا کوئی جانور ہو۔ اور بولے'' آپ نے انگریزی شاعری کا بھی مطالعہ کیا؟ بائرن، شیلے، ٹینیسن وغیرہ''۔

قمر نے بے اعتنائی سے جواب دیا ''جی ہاں، تھوڑا بہت دیکھا ہے''

آپ نے استادان فن کی کتابوں میں سے کسی کا ترجمہ کردیں تو آپ اپنی زبان کی بڑی خدمت کریں۔''

قمر اپنے آپ کو بائرن، شیلے سے جو بھر کم نہ سمجھتے تھے۔ بولے ''ہمارے یہاں روحانیت کا ابھی اتنا فقدان نہیں ہوا کہ مغربی شاعروں سے بھیک مانگیں۔ میرا خیال

ہے کم از کم اس مضمون میں ہم اب بھی مغرب کو بہت کچھ سکھا سکتے ہیں''۔

انگریزی پوش صاحب نے قمر کو پاگل سمجھا۔ راجہ صاحب نے قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا کہہ رہے ہوں ذرا موقعہ و محل دیکھ کر باتیں کرو۔ اور بولے ''انگریزی لٹریچر کا کیا کہنا۔ شاعری میں تو اس کا جواب نہیں ہے''

انگریزی پوش'' ہمارے شاعروں کو ابھی تک اتنا بھی معلوم نہیں کہ شاعری کے کیا معنے ہیں۔ وہ ابھی تک ہجر و وصال کو شاعری کا منتہائے مقصود سمجھ بیٹھے ہیں''۔

قمر نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا ''میرا خیال ہے آپ نے ہندوستانی شعراء کا کلام ابھی تک دیکھا ہی نہیں اور اگر دیکھا ہے تو سمجھا نہیں''۔

راجہ صاحب نے قمر کا منہ بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بولے ''آپ مسٹر پرانچے ہیں۔ آپ کے مضامین انگریزی اخبارات میں شائع ہوتے ہیں اور لوگ انھیں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔

اس کے معنی یہ تھے کہ اب آپ زیادہ نہ بہکئے۔ غریب قمر کو پرانچے کے سامنے نیچا دیکھنا پڑا۔ ایک اور دیسی صاحب آئے۔ راجہ صاحب نے تپاک سے ان کا بھی استقبال کیا۔ آیئے ڈاکٹر چڈھا، مزاج تو اچھے ہیں''۔

چڈھا صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے ہاتھ ملایا اور قمر کی طرف دیکھ کر بولے:

''آپ کی تعریف''؟

راجہ صاحب نے قمر کا تعارف کرایا ''آپ حضرت قمر شاعر ہیں''۔

ڈاکٹر صاحب نے خاص انداز سے کہا:

''اچھا آپ شاعر ہیں۔'' اور بغیر کچھ کہے سنے آگے بڑھ گئے۔

یہ تماشا کئی مرتبہ ہوا اور ہر بار قمر کو یہی داد ملی'' اچھا آپ شاعر ہیں''۔

یہ الفاظ ہر مرتبہ قمر کے دل پر نیا صدمہ پہنچاتے تھے۔ ان کا باطنی مفہوم قمر سے چھپا نہ تھا۔ ان کا عام فہم الفاظ میں یہ مطلب تھا ''تم اپنے خیالی پلاؤ پکاتے ہو، پکاؤ۔ یہاں تمھارا کیا کام ؟ تمھارا اتنا حوصلہ کہ اس محفل میں چلے آؤ''۔

قمر اپنے اوپر جھنجھلا رہے تھے۔ دعوتی کارڈ پا کر وہ پھولے نہ سمائے تھے لیکن یہاں آ کر ان کی جس قدر تذلیل ہوئی اس کو دیکھ کر اپنا اطمینان کا جھونپڑا جنت

سے کم نہ تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو طعن کی ''تمھارے جیسے عزت کے ہوس مندوں کی یہی سزا ہے۔ اب تو آنکھیں کھلیں کہ تم کتنی عزت کے مستحق ہو۔ تم خود اس غرض مند دنیا میں کسی کے کام نہیں آسکتے۔ وکیل، بیرسٹر تمھارا احترام کیوں کریں؟ تم ان کے مؤکل نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر اور حکیم تمھاری طرف کیوں دیکھیں؟ انھیں بغیر فیس کے تمھارے گھر آنے کی ضرورت نہیں۔ تم لکھنے کے لیے بنے ہو۔ لکھتے جاؤ بس، دنیا میں تمھارا اور کوئی مصرف نہیں۔''

یکا یک لوگوں میں ہل چل مچ گئی۔ آج کا جلسہ جن صاحب کے اعزاز میں تھا وہ آ گئے۔ یہ صاحب یورپ سے کوئی بڑی ڈگری لے کر آئے تھے۔

راجہ صاحب نے لپک کر ان سے ہاتھ ملایا اور قمر سے بولے ''آپ اپنی نظم تو لکھ ہی لائے ہوں گے؟

''قمر نے جواب دیا ''میں نے کوئی نظم تیار نہیں کی''۔

سچ! تب تو آپ نے غضب ہی کر ڈالا۔ ارے بھلے آدمی، تو اب ہی بیٹھ کر کوئی چیز لکھ لو۔ دو چار شعر ہی ہو جائیں۔ ایسے موقعہ پر ایک آدھ نظم کا پڑھا جانا لازمی ہے۔

میں اس قدر جلدی کوئی چیز نہیں لکھ سکتا۔

میں نے بے کار اتنے آدمیوں سے آپ کا تعارف کرایا۔

بالکل بے کار۔

ارے بھائی جان۔ کسی پرانے شاعر ہی کی کوئی چیز سنا دیجیے۔ یہاں کون جانتا ہے؟

جی نہیں، معاف فرمایئے۔ میں بھاٹ یا میراثی نہیں ہوں۔ یہ کہتے کہتے حضرت قمر وہاں سے چل دیئے۔

گھر پہونچے تو ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ سکینہ نے خوش ہو کر پوچھا:

''اتنی جلدی کیوں کر چلے آئے''۔

''میری وہاں ضرورت نہ تھیں''۔

''چہرہ کھلا ہوا ہے۔ خوب عزّت افزائی ہوئی ہوگی''۔

''ایسی کہ خواب میں بھی امید نہ تھی''۔

''خوب خوش ہو رہے ہو''۔

اس لیے کہ آج مجھے ہمیشہ کے لیے سبق مل گیا۔ میں چراغ ہوں اور جلنے کے لیے بنا ہوں۔ میں یہ بات بھول گیا تھا۔ مگر خدا نے مجھے زیادہ بھٹکنے نہ دیا۔ میرا یہ جھونپڑا ہی میرے لیے جنت ہے۔ میں نے آج سمجھ لیا کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے۔

یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ ہنس کے نومبر 1931 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا لیکھک۔ مجموعہ کفن میں شامل ہے۔ اردو میں یہ لاہور کے ماہنامہ چندن کے دسمبر 1931 کے شمارے میں پروین کے عنوان سے شائع ہوا۔ آخری تحفہ میں شامل ہے۔

سَوت

جب رضیہ کے دو تین بچے ہو کر مر گئے اور عمر ڈھل چلی۔ تو راموں کا پریم اس سے کچھ کم ہونے لگا اور دوسرے بیاہ کی دھن سوار ہوئی۔ آئے دن رضیہ سے جھک جھک ہونے لگی۔ راموں ایک نہ ایک بہانا کھوج کر رضیہ پر بگڑتا اور اسے مارتا۔ اور انت کو وہ نئی استری لے ہی آیا۔ اس کا نام تھا داسی۔ چمپئی رنگ تھا، بڑی بڑی آنکھیں، جوانی کی عمر، پیلی کرشانگی رضیہ بھلا اس نویونا کے سامنے کیا جچتی۔ پھر بھی وہ جاتے ہوئے سوامتو کو، جتنے دن ہو سکے، اپنے ادھیکار میں رکھنا چاہتی تھی۔ گرتے ہوئے چھپر کو تھونیوں سے سمہالنے کی چیشٹا کر رہی تھی۔ اس گھر کو اس نے مر مر کر بنایا ہے۔ اسے سہج ہی میں نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ اتنی بے سمجھ نہیں ہے کہ گھر چھوڑ کر چلی جائے اور داسی راج کرے۔

(۲)

ایک دن رضیہ نے راموں سے کہا۔ میرے پاس ساڑی نہیں ہے جاکر لادو۔ راموں اس کے ایک دن پہلے داسی کے لیے اچھی سی چندری لایا تھا۔ رضیہ کی مانگ سن کر بولا۔ میرے پاس ابھی روپیہ نہیں ہے۔

رضیہ کو ساڑی کی اتنی چاہ نہ تھی جتنی راموں اور دسیا کے آنند میں ودھن ڈالنے کی۔ بولی روپیہ نہیں تھے تو کل اپنی چہیتی کے لیے چندری کیوں لائے؟ چندری

کے بدلے اسی دام میں دو ساڑیاں لاتے۔ تو ایک میرے کام نہ آجاتی؟

راموں نے سوچھا بھاؤ سے کہا۔ میری اچھا جو چاہوں گا، کروں گا، تو بولنے والی کون ہے؟ ابھی اس کے کھانے کھیلنے کے دن ہیں۔ تو چاہتی ہے، اسے ابھی سے نون۔تیل کی چنتا میں ڈال دوں۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا تجھے اوڑھنے۔پہننے کی سادھ ہے تو کام کر، بھگوان نے کیا ہاتھ پیر نہیں دیے۔ پہلے تو گھڑی رات اٹھ کر کام دھندھے میں لگ جاتی تھی۔ اب اس کی ڈاہ میں پہر دن تک پڑی رہتی ہے۔ تو روپیے کیا اکاش سے گریں گے؟ میں تیرے لیے اپنی جان تھوڑے ہی دے دوں گا۔

رضیہ نے کہا تو کیا میں اس کی لونڈی ہوں کہ وہ رانی کی طرح پڑی رہے اور میں گھر کا سارا کام کرتی رہوں۔ اتنے دنوں چھاتی پھاڑ کر کام کیا اس کا یہ پھل ملا، تو اب میری بلا کام کرنے جاتی ہے۔

میں جیسے رکھوں گا، ویسے ہی تجھے رہنا پڑے گا۔

میری اچھا ہوگی رہوں گی، نہیں الگ ہو جاؤں گی۔

جو تیری اچھا ہو، کر، میرا گلا چھوڑ۔

اچھی بات ہے ۔ آج سے تیرا گلا چھوڑتی ہوں۔ سمجھ لوں گی ودھوا (بیوہ) ہو گئی۔

(۳)

راموں دل میں اتنا تو سمجھتا تھا کہ یہ گرہستھی رضیہ کی جوڑی ہوئی ہے۔ چاہے اس کے روپ میں اس کے لوچن۔ ولاس کے لیے آکرشن نہ ہو۔ سمجھو تھا، کچھ دیر کے بعد وہ جا کر رضیہ کو منا لیتا، پر داسی بھی کوٹ نیتی میں کوشل تھی۔ اس نے گرم لوہے پر چوٹیں جمانا شروع کیں۔ بولی آج دیوی جی کس بات پر بگڑ رہی تھیں؟

راموں نے اداس من سے کہا۔ تیری چندری کے پیچھے رضیہ مہابھارت مچائے ہوئے ہیں۔ اب کہتی ہیں الگ رہوں گی۔ میں نے کہہ دیا تیری جو اچھا ہوکر۔

دسیا نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔ یہ سب نخرے ہیں کہ آکر ہاتھ پاؤں جوڑے

مناون کریں اور کچھ نہیں۔ تم چپ چاپ بیٹھے رہو۔ دو چار دن میں آپ ہی گرمی اتر جائے گی، تم کچھ بولنا نہیں، نہیں ان کا مزاج اور آسمان پر چڑھ جائے گا۔

راموں نے گمبھیر بھاؤ سے کہا۔ داسی تم جانتی نہیں ہو وہ کتنی گھمنڈن ہے۔ وہ منھ سے جو بات کہتی ہے اسے کر کے چھوڑتی ہے۔

رضیہ کو بھی راموں سے ایسی کرتگھنتا کی آشا نہ تھی۔ وہ اب پہلے کی سی سندری نہیں، اس لیے راموں کو اب اس سے پریم نہیں ہے۔ پروش چرتر میں یہ کوئی اسادھارن بات نہ تھی، لیکن راموں اس سے الگ رہے گا، اس کا اسے وشواس نہ آتا تھا۔ یہ گھر اسی نے پیسا۔پیسا جوڑ کر بنوایا۔ گرہستھی بھی اسی کی جوڑی ہوئی ہے۔ اناج کا لین دین اسی نے شروع کیا۔ اس گھر میں آکر اس نے کون کون سے کشٹ نہیں جھیلے، اسی لیے تو کہ پورخ تھک جانے پر ایک ٹکڑا چین سے کھائے گی اور پڑی رہے گی، اور آج وہ اتنی نردیتا سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دی گئی۔ راموں نے اتنا بھی نہیں کہا، تو الگ نہیں رہنے پائے گی۔ میں یا خود مرجاؤں گا یا تجھے مار ڈالوں گا۔ پر تجھے الگ نہ ہونے دوں گا ۔ تجھ سے میرا بیاہ ہوا ہے۔ ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے۔ تو جب راموں کو اس کی پرواہ نہیں ہے۔ تو وہ راموں کی کیوں پرواہ کرے؟ کیا سبھی استریوں کے پروش بیٹھے ہوتے ہیں، سبھی کے ماں باپ بیٹے پوتے ہوتے ہیں؟ آج اس کے لڑکے جیتے ہوتے، تو مجال تھی کہ یہ نئی استری لاتے، اور میری یہ درگتی کرتے؟ اس نردئی کو میرے اوپر اتنی بھی دیا نہیں آئی۔

ناری: ہردے کی ساری پروشتا اس اتیاچار سے وِدروہ کرنے لگی۔ وہی آگ جو موٹی لکڑی کو اسپرش بھی نہیں کرسکتی، پھول کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔

(۴)

دوسرے دن رضیہ ایک دوسرے گاؤں میں چلی گئی ۔ اس نے اپنے ساتھ کچھ نہ لیا۔ جو ساڑی اس کی دیہہ (جسم) پر تھی، وہی اس کی ساری سمپتی تھی۔ ودھاتا نے اس کے بالکوں کو پہلے ہی چھین لیا تھا۔ آج گھر بھی چھین لیا تھا۔

راموں اس سمے داسی کے ساتھ بیٹھا ہوا آمود۔ونود کر رہا تھا۔ رضیہ کو جاتے دیکھ کر شاید وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ چلی جا رہی ہے۔ رضیہ نے یہی سمجھا۔ اس طرح چوروں کی بھانتی وہ جانا بھی نہ چاہتی تھی۔ وہ داسی کو، اس کے پتی کو اور سارے گاؤں کو دکھا دینا چاہتی تھی۔ کہ وہ اس گھر سے دھیلے کی بھی چیز نہیں لے جارہی ہے۔ گاؤں والوں کے درشٹ میں راموں کا اپمان کرنا ہی اس کا لکشیہ تھا۔ اس کے چپ چاپ چلے جانے سے تو کچھ بھی نہ ہوگا۔ راموں الٹا سب سے کہے گا، رضیہ گھر کی ساری سمپدا اٹھا لے گئی۔ اس نے راموں کو پکار کر کہا۔ سمبھالو اپنا گھر۔ میں جاتی ہوں۔ تمھارے گھر کی کوئی بھی چیز اپنے ساتھ نہیں لے جاتی۔

راموں ایک چھڑ کے لیے کرتویہ بھرشٹ ہوگیا۔ کیا کہے، اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اسے آشا نہ تھی کہ وہ یوں جائے گی۔ اس نے سوچا تھا۔ جب وہ گھر ڈھو کر لے جانے لگے گی تب وہ گاؤں والوں کو دیکھا کر ان کی سہانو بھوتی پراپت کرے گا۔ اب کیا کرے۔

دسیا بولی: جاکر گاؤں میں ڈھنڈھورا پیٹ آؤ۔ یہاں کسی کا ڈر نہیں ہے۔ تم اپنے گھر سے لے ہی کیا آئی تھیں، جو کچھ لے کر جاؤ گی۔

رضیہ نے اس کے منھ نہ لگ کر راموں ہی سے کہا۔ سنتے ہو، اپنی چہیتی کی باتیں پھر بھی منھ نہیں کھلتا۔ میں تو جاتی ہوں، لیکن دسو رانی تم بھی بہت دن راج نہ کروگی۔ ایشور کے دربار میں انیائے نہیں پھلتا۔ وہ بڑے بڑے گھمنڈیوں کا گھمنڈ چور کردیتے ہیں۔ دسیا ٹھٹھا مار کر ہنسی، پر راموں نے سر جھکالیا۔ رضیہ چلی گئی۔

(۵)

رضیہ جس نئے گاؤں میں آئی تھی۔ وہ راموں کے گاؤ سے ملا ہی ہوا تھا۔

ات ایو (چنانچہ) یہاں کے لوگ اس سے پرچت ہیں۔ وہ کیسی کوشل گرہنی ہے، کیسی محنتی کیسی بات کی سچی یہ یہاں کسی سے چھپا نہ تھا۔ رضیہ کو مزوری ملنے میں کوئی بادھا نہ ہوئی۔ جو ایک لے کر دو کا کام کرے اسے کام کی کیا کمی؟

تین سال تک رضیہ نے کیسے کاٹے۔ کیسے ایک نئی گرہستھی بنائی۔ کیسی کھیتی

شروع کی۔ اس کا بیان کرنے بیٹھے، تو پوتھی ہوجائے۔ سنچیہ کے جتنے منتر ہیں، جتنے سادھن ہیں، وے رضیہ کو خوب معلوم تھے۔ پھر اب اسے لاگ ہوگئی تھی۔ اور لاگ میں آدمی کی شکتی کا وارا پار نہیں رہتا۔ گاؤں والے اس کا پری شرم دیکھ کر دانتوں انگلی دباتے تھے۔ وہ راموں کو دکھا دینا چاہتی ہے۔ میں تجھ سے الگ ہو کر بھی آرام سے رہ سکتی ہوں۔ وہ اب پرادھین ناری نہیں ہے۔ اپنی کمائی کھاتی ہے۔

رضیہ کے پاس بیلوں کی ایک اچھی جوڑی ہے۔ رضیہ انھیں کیول کھالی بھوسی دے کر نہیں رہ جاتی روز دو دو روٹیاں بھی کھلاتی ہے پھر انھیں گھنٹوں سہلاتی ہے۔ کبھی کبھی ان کے کندھے پر سر رکھ کر روتی ہے۔ اور کہتی ہے اب بیٹے ہو تو پتی ہو تو تمھیں ہو۔ میری لاج اب تمھارے ہاتھ ہے۔ دونوں بیل شاید رضیہ کے بھاشا اور بھاؤ سمجھتے ہیں۔ وے منشیہ نہیں، بیل ہیں۔ دونوں سر نیچے کر کے رضیہ کے ہاتھ چاٹ کر اسے آشواسن دیتے ہیں۔ وے اسے دیکھتے ہی کتنے پریم سے اس کی اور تاکنے لگتے ہیں۔ کتنے ہرش سے کندھا جھلا کر اس پر جوا رکھواتے ہیں۔ اور کیسا جی توڑ کام کرتے ہیں۔ یہ وے ہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، جنھوں نے بیلوں کی سیوا کی ہے اور ان کے ہردے کو اپنایا ہے۔

رضیہ اس گاؤں کی چودھرائین ہے۔ اس کی بدھی جو پہلے نتیہ آدھار کھوجتی رہتی تھی اور سوچھند روپ سے اپنا وکاش نہ کرسکتی تھی، اب چھایا سے نکل کر پروڑھ اور انت (اونچا) ہو گئی ہے۔

ایک دن رضیہ گھر لوٹی تو ایک آدمی نے کہا۔ تم نے نہیں سنا چودھرائین راموں تو بہت بیمار ہے۔ سنا دس لنگھن ہو گئے ہیں۔ رضیہ نے اداسینتا سے کہا۔ جوڑی ہے کیا؟ جوڑی نہیں کوئی دوسرا روگ ہے۔ باہر کھاٹ پر پڑا تھا۔ میں نے پوچھا کیسا جی ہے راموں، تو رونے لگا۔ برا حال ہے۔ گھر میں ایک پیسا بھی نہیں کہ دوا دارو کریں۔ دسیا کے ایک لڑکا ہوا ہے وہ تو پہلے بھی کام دھندا نہ کرتی تھی۔ اور اب تو لڑکوری ہے، کیسے کام کرنے جائے۔ ساری مار راموں کے سر جاتی ہے۔ پھر گہنے چاہیے کپڑے چاہیے نئی دلہن یوں کیسے رہے۔

رضیہ نے گھر میں جاتے ہوئے کہا۔ جو جیسا کرے گا، آپ بھوگے گا۔

لیکن اندر اس کا جی نہ لگا۔ وہ ایک چھڑ (لمحہ) میں پھر باہر آئی شاید اس آدمی سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ اور اس انداز سے پوچھنا چاہتی تھی مانو اسے کچھ پرواہ نہیں ہے۔

پر وہ آدمی چلا گیا تھا۔ رضیہ نے پورب پچھم جا جا کر دیکھا۔ وہ کہیں نہ ملا۔ تب رضیہ دوار کے چوکھٹ پر بیٹھ گئی۔ اسے وے شبدے یاد آئے جو اس تین سال پہلے راموں کے گھر سے چلتے سمے کہے تھے۔ اس وقت جلن میں اس نے وہ شاپ دیا تھا۔ اب وہ جلن نہ تھی سمے نے اسے بہت کچھ شانت کر دیا تھا۔ راموں اور داسی کی ہینا وستھا اب اریشیا (حد) کے یوگیہ نہیں، دیا کے یوگیہ تھی۔

اس نے سوچا راموں کو دس لنگھن ہوگئے ہیں تو اوشیہ ہی اس کی دشا اچھی نہ ہوگی۔ کچھ ایسا موٹا۔تازہ تو پہلے بھی نہ تھا۔ دس لنگھن نے تو بل کُل ہی گھلا ڈالا ہوگا۔ پھر ادھر کھیتی باری میں بھی ٹوٹا ہی رہا۔ کھانے پینے کو بھی ٹھیک۔ٹھیک نہ ملا ہوگا۔ پڑوس کی ایک استری نے آگ لینے کے بہانے آکر پوچھا۔ سنا، راموں بہت بیمار ہے۔ جو جیسا کرے گا ویسا پائے گا۔ تمھیں اتنی بے دردی سے نکالا کہ کوئی اپنے بیری کو بھی نہ نکالے گا۔ رضیہ نے ٹوکا نہیں دی دی۔ ایسی بات نہ تھی۔ وے تو بے چارے کچھ بولے ہی نہیں۔ میں چلی تو سر جھکا لیا۔ دسیا کے کہنے میں آکر وہ چاہے جو کچھ کر بیٹھے ہوں، یوں مجھے کبھی کچھ نہیں کہا۔ کسی کی برائی کیوں کروں۔ پھر کون مرد ایسا ہے جو عورتوں کے بس نہیں ہوجاتا۔ دسیا کے کارن ان کی یہ دسا ہوئی ہے۔ پڑوسن نے آگ نہ مانگی منہ پھیر کر چلی گئی۔

رضیہ نے کلسا اور رسی اٹھائی اور کنوئیں پر پانی کھینچنے گئی۔ بیلوں کو سانی پانی دینے کی بیلا آگئی تھی۔ پر اس کی آنکھیں اس راستے کی اور لگی ہوئی تھیں۔ جو ملسی (راموں کا گاؤں) کو جاتا تھا۔ کوئی اسے بلانے اوشیہ آرہا ہوگا۔ نہیں بنا بلائے وہ کیسے جاسکتی ہے۔ لوگ کہیں گے، آخر دوڑ آئی نہ۔

مگر راموں تو اچیت پڑا ہوگا۔ دس لنگھن تھوڑے نہیں ہوتے۔ اس کی دیہہ (جسم) میں تھا ہی کیا۔ پھر اسے کون بلائے گا؟ دسیا کو کیا غرض پڑی ہے۔ کوئی دوسرا گھر کر لے گی جوان ہے، سو گاہک نکل آویں گے، اچھا وہ آتو رہا ہے کوئی۔

ہاں آرہا ہے۔ کچھ گھبرایا سا جان پڑتا ہے۔ کون آدمی ہے۔ اسے تو کبھی ملسی میں نہیں دیکھا، مگر اس وقت سے ملسی کبھی گئی بھی تو نہیں۔ دو چار نئے آدمی آکر بسے ہی ہوں گے۔ بٹوہی چپ چاپ کنوئیں کے پاس سے نکلا۔ رضیہ نے کلسا جگت پر رکھ دیا اور اس کے پاس جا کر بولی۔ راموں مہتوں نے بھیجا ہے۔ تمھیں؟ اچھا تو چلو گھر، میں تمھارے ساتھ چلتی ہوں۔ نہیں، ابھی مجھے کچھ دیر ہے۔ بیلوں کو سانی پانی دینا ہے۔ دیا۔بتی کرنی ہے۔ تمھیں روپے دے دوں۔ جاکر دسیا کو دے دینا کہہ دینا کوئی کام ہو تو بلا بھیجے۔

بٹوہی راموں کو کیا جانے۔ کسی دوسرے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ پہلے تو چکرایا، پھر سمجھ گیا۔ چپکے سے رضیہ کے ساتھ چلا گیا اور روپے لے کر لمبا ہوا۔ چلتے چلتے رضیہ نے پوچھا اب کیا حال ہے ان کا؟

بٹوہی نے اٹکل سے کہا۔ اب تو کچھ سمہل رہے ہیں۔

دسیا بہت رو۔دھو تو نہیں رہی ہے۔؟

روتی تو نہیں تھی۔

وہ کیوں روئے گی، معلوم ہوگا پیچھے۔

بٹوہی چلا گیا تو رضیہ نے بیلوں کا سانی پانی کیا پر من راموں ہی کی اور لگا ہوا تھا۔ سنیہ سمرتیاں چھوٹی چھوٹی تاریکاؤں کی بھانتی من میں اودیت ہوتی جاتی تھی۔ ایک بار جب وہ بیمار پڑی تھی، وہ بات یاد آئی۔ دس سال ہوگئے۔ وہ جیسے رات۔دن اس کے سرہانے بیٹھا رہتا تھا۔ کھانا پینا تک بھول گیا تھا۔ اس کے من میں آیا کیوں نہ چل کر دیکھ ہی آوے۔ کوئی کیا کہے گا؟ کس کا منہ ہے، جو کچھ کہے۔ چوری کرنے نہیں جا رہی ہوں۔ جس کے پاس پندرہ بیس سال رہی ہوں۔ دسیا ناک سیکوڑے گی۔ سیکوڑے۔ مجھے اس سے کیا مطلب۔

رضیہ نے کیواڑ بند کیے۔ گھر مزور کو سجاجا، اور راموں کو دیکھنے چلی۔ کانپتی جھجھکتی چھما کا دان لیے ہوئے۔

(۶)

راموں کو تھوڑے ہی دنوں میں معلوم ہوگیا کہ اس کے گھر کی آتما نکل گئی ہے۔ اور وہ چاہے کتنا زور کرے کتنا ہی سر کھپائے اس میں سپھرتی نہیں آتی۔ داسی سندر تھی، شوقین تھی، اور پھوہڑ تھی۔ جب پہلا نشہ اترا تو ٹھائیں ٹھائیں شروع ہوئی۔ کھیتی کی اوپج کم ہونے لگی، اور جو ہوتی بھی تھی وہ اوٹ پٹانگ خرچ ہوتی تھی۔ رن (قرض) لینا پڑتا تھا۔ اسی چنتا اور شوق میں اس کا سواستھے (آسودگی صحت) بگڑنے لگا۔ شروع میں کچھ پرواہ نہ کی۔ پرواہ کر کے ہی کیا کرتا۔ گھر میں پیسے نہ تھے۔ اتائیوں کی چکتسا (علاج) نے بیماری کے جڑ اور مضبوط کر دی اور آج دس بارہ دن سے اس کا دانا پانی چھوٹ گیا تھا۔ موت کے انتظار میں کھاٹ پر پڑا کراہ رہا تھا اور اب وہ دشا ہوگئی تھی۔ جب ہم بھویشیہ (مستقبل) سے نشچت ہو کر اتیت میں وشرام کرتے ہیں، جیسے کوئی گاڑی آگے کا راستہ بند پاکر پیچھے لوٹے۔ رضیہ کو یاد کر کے وہ بار بار روتا اور داسی کو کوستا۔ تیرے ہی کارن میں نے اسے گھر سے نکالا۔ وہ کیا گئی لکشمی چلی گئی۔ میں جانتا ہوں، اب بھی بلاؤں تو دوڑی آئے گی لیکن بلاؤں کس منہ سے، ایک بار وہ آجاتی اور اس سے اپنے اپرادھ چھما (معافی) کرا لیتا، پھر میں خوشی سے مرتا۔ اور لال سا نہیں ہے۔

سہسا رضیہ نے آکر اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ کیسا جی ہے تمھارا؟ مجھے تو آج حال ملا۔ راموں نے سجل نیتروں سے اسے دیکھا پر کچھ نہ کہہ سکا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا پر ہاتھ جوڑے ہی رہ گئے اور آنکھیں الٹ گئیں۔

(۷)

لاش گھر میں پڑی تھی۔ رضیہ روتی تھی۔ دسیا چنّت (فکرمند) تھی۔ گھر میں روپے کا نام نہیں۔ لکڑی تو چاہیے ہی، اٹھانے والے بھی جل پان کریں گے ہی، کفن کے بغیر لاش اٹھے گی کیسے۔ دس سے کم کا خرچ نہ تھا۔ یہاں گھر میں دس پیسے بھی

نہیں۔ ڈر رہی تھی کہ آج گہنوں پر آفت آئی۔ ایسے قیمتی بھاری گہنے ہی کون تھے۔ کسان کی وسات ہی کیا۔ دو تین ٹنگ بیچنے سے دس مل جائیں گے مگر اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ اس نے چودھری کے لڑکے کو بلا کر کہا۔ دیور جی یہ بیڑا کیسے پار لگے۔ گاؤں میں کوئی دھیلے کا بھی وشواس کرنے والا نہیں۔ میرے گہنے ہیں۔چودھری سے کہو۔ انھیں گروی رکھ کر آج کا کام چلائے۔ پھر بھگوان مالک ہے۔

رضیہ سے کیوں نہیں مانگ لیتی؟

سہسا رضیہ آنکھیں پوچھتی ہوئی آنکلی۔ کان میں بھنک پڑی۔

پوچھا : کیاہے جوکھو، کیا صلاح کرر ہے ہو؟اب مٹی اٹھاؤ گے کہ صلاح کی بیلا ہے؟

ہاں اسی کا سارا جام کر رہا ہوں۔

روپے پیسے تو یہاں ہوں گے نہیں۔ بیماری میں خرچ ہو گئے ہوں گے۔ اس بے چاری کو تو انھوں نے بیچ منجھدار میں لاکر چھوڑ دیا۔ تم لپک کر اس گھر چلے جاؤ بھیا۔ کون دور ہے کنجی لیتے جاؤں۔ مزور سے کہنا بھنڈار سے پچاس روپے نکال دے۔ کہنا اوپر کی پٹری پر رکھے ہیں۔

وہ تو کنجی لے ادھر گیا۔ ادھر دسیا راجوں کے پیر پکڑ کر رونے لگی۔ بہناپے کے یہ شبد اس کے ہردے میں بیٹھ گئے۔ اس نے دیکھا، رضیہ میں کتنی دیا کتنی چھما ہے۔

رضیہ نے اسے چھاتی سے لگا کر کہا۔ کیوں روتی ہے بہن؟ وہ چلا گیا، میں تو ہوں۔ کسی بات کی چنتا نہ کر۔ اسی گھر میں ہم اور تم دونوں اس کے نام پر بیٹھے گی۔ میں وہاں بھی دیکھوں گی۔یہاں بھی دیکھوں گی دھاپ بھر کی بات ہی کیا؟ کوئی تم سے گہنے پاتے مانگے تو مت دینا۔ دسیا کا جی ہوتا تھا۔ سر پٹک کر مرجائے۔ اسے اس نے کتنا جلایا کتنا رُلایا اور گھر سے نکال کر چھوڑا۔

رضیہ نے پوچھا جس جس کے روپے ہوں صورت کر کے مجھے بتا دینا۔ میں جھگڑا نہیں رکھنا چاہتی۔ بچہ دبلا کیوں ہو رہا ہے۔

دسیا بولی میرے دودھ ہوتا ہی نہیں گائے جو تم چھوڑ گئی تھی وہ مر گئی۔ دودھ نہیں پاتا۔ رام رام بے چارہ مرجھا گیا۔ میں کل ہی گائے لاؤں گی سبھی گرہستھی اٹھا لاؤ گی۔ وہاں کیا رکھا ہے۔ لاس دھوم سے اٹھی۔ رضیہ اس کے ساتھ گئی۔ داہ کرم کیا بھوج ہوا۔ کوئی دو سو روپیہ خرچ ہوگئے۔ کسی سے مانگنے نہ پڑے۔

دسیا کے جوہر بھی اس تیاگ کی آنچ میں نکل آئے۔ ویلاسنی سیوا کی مورتی بن گئی۔

(۸)

آج راموں کو مرے سات سال ہوئے ہیں۔ رضیہ گھر سمبھالے ہوئے ہے۔ دسیا کو وہ سوت نہیں، بیٹی سمجھتی ہے۔ پہلے اسے پہنا کر تب آپ پہنتی ہے۔ اسے کھلا کر آپ کھاتی ہے۔ جوکھو پڑھنے جاتا ہے۔ اس کی سگائی کی بات چیت پکی ہو گئی ہے۔ اس جاتی میں بچپن میں ہی بیاہ ہو جاتا ہے۔ دسیا نے کہا۔ بہن گہنے بنوا کر کیا کروگی۔ میرے گہنے تو دھرے ہی ہیں۔

رضیہ نے کہا، نہیں ری۔ اس کے لیے نئے گہنے بنواؤں گی۔ ابھی تو میرا ہاتھ چلتا ہے۔ جب تھک جاؤں تو جو چاہے کرنا۔ تیرے ابھی پہنے اوڑھنے کے دن ہیں تو اپنے گہنے رہنے دے۔ نائن ٹھاکر سوہاتی کر کے بولی۔ آج جوکھو کے باپ ہوتے تو کچھ اور ہی بات ہوتی۔

رضیہ نے کہا وے نہیں ہیں تو میں تو ہوں وے جتنا کرتے میں اس کا دونا کروں گی۔ جب میں مرجاؤں تب کہنا جوکھو کا باپ نہیں ہے۔

بیاہ کے دن دسیا کو روتے دیکھ کر رضیہ نے کہا۔ بہو، تم کیوں روتی ہو؟ ابھی تو میں جیتی ہوں۔ گھر تمھارا ہے جیسا چاہو رہو۔ مجھے ایک روٹی دے دو، بس اور مجھے کیا کرنا ہے۔ میرا آدمی مر گیا۔ تمھارا تو ابھی جیتا ہے۔ دسیا نے اس کی گود میں سر رکھ دیا اور خوب روئی۔ جی جی، تم میری ماتا ہو، تم نہ ہوتی تو میں کس کے دوار پر کھڑی ہوتی۔ گھر میں تو چوہے لوٹتے تھے۔ ان کے راج میں مجھے دکھ ہی دکھ اٹھانے پڑے۔ سہاگ کا سکھ تو مجھے تمھارے راج سے ملا۔ میں دکھ سے نہیں روتی،

روتی ہوں بھگوان کی دیا پر کہ کہاں میں اور کہاں یہ خوشیالی۔

رضیہ مسکرا کر رو دی۔

نوٹ: یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں وشال بھارت دسمبر 1931 میں شائع ہوا۔
گپت دھن نمبر 2 میں شامل ہے اردو کے کسی مجموعہ میں نہیں ہے۔

زادِ راہ

سیٹھ رام ناتھ نے بستر علالت پر پڑے ہوئے مایوس نظروں سے اپنی بیوی سوشیلا کی طرف دیکھ کر کہا، میں بڑا بدقسمت ہوں، سوشیلا میرے ساتھ تمھیں ہمیشہ تکلیف اٹھانی پڑی جب گھر میں کچھ نہ تھا تو شب وروز دنیاداری کے بکھیڑوں اور بچوں کے لیے مرتی رہتی تھیں جب معاملہ ذرا کچھ سنبھلا اور تمھارے آرام کرنے کے دن آئے تو تمھیں چھوڑ کر چلا جارہا ہوں آج تک مجھے زندگی کی امید تھی۔ وہ امید جاتی رہی۔ دیکھو سوشیلا رو مت دنیا میں سبھی مرتے ہیں کوئی دوسال آگے کوئی دوسال پیچھے۔ اب عیال داری کا بوجھ تمھارے سر پر ہے میں نے نقدروپے نہیں چھوڑا، لیکن جو کچھ اثاثہ ہے تمھاری زندگی اس سے کسی طرح کٹ جائے گی، یہ موہن کیوں رو رہا ہے؟

سوشیلا نے آنسو پونچھ کر کہا، ضدی ہوگیا ہے اور کیا، آج سویرے سے رٹ لگائے ہوئے ہے کہ موٹر لوں گا، پانچ روپے سے کم میں آئے گی موٹر۔

سیٹھ جی کو کچھ دنوں سے دونوں بچوں سے محبت ہوگئی تھی۔ بولے تو منگادو نا ایک بے چارہ کب سے رو رہا ہے کیا ارمان دل میں تھے، سب خاک میں مل گئے۔ رانی کے لیے ولایتی گڑیا منگوادی دوسروں کے کھلونے دیکھ کر ترستی رہتی ہے۔ جس دولت کو جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھا وہ آخر ڈاکٹروں نے کھائی۔ بچے مجھے کیا یاد کریں گے کوئی باپ تھا، آہ بدقسمت باپ نے تو مال و زر کو لڑ کے لڑکی سے

پیارا سمجھا۔ ایک پیسہ کی چیز لاکر بھی نہیں دی افسوس۔

آخری وقت جب دنیا کی ناپائداری حقیقت بن کر آنکھوں کے سامنے کھڑی ہوجاتی ہے۔

جو کچھ نہ کیا اس کا افسوس اور جو کچھ کیا اس پر پچھتاوا دل کو فراخ اور درد مند بنادیتا ہے۔ سوشیلا نے راجہ کو بلایا اور اسے چھاتی سے لگا کر رونے لگی، وہ مامتا جو شوہر کی کنجوس طبیعت کے سبب اندر ہی اندر تڑپ کر رہ جاتی تھی، اس وقت جیسے ابل پڑی، لیکن موٹر کے لیے روپے کہاں تھے۔

سیٹھ جی نے پوچھا، موٹر لے لو بیٹا، اپنی اماں سے روپے لے کر بہن کے ساتھ چلے جاؤ خوب عمدہ لانا۔

موہن نے ماں کے آنسو اور باپ کا پیار دیکھا، تو اس کی ضد پگھل گئی، ابھی نہیں لونگا سیٹھ جی نے پوچھا کیوں؟

جب آپ اچھے ہوجائیں گے تب لوں گا۔"

سیٹھ جی پھوٹ کر رونے لگے۔

(۴)

تیسرے روز سیٹھ رام ناتھ دنیا سے رخصت ہوگئے۔

دولت مند کے زندہ رہنے سے دکھ بہتوں کو ہوتا ہے اور سکھ تھوڑوں کو، ان کے مرنے سے دکھ چند کو ہوتا ہے، اور سکھ زیادہ کو، اب مہا برہمنوں کا گروہ الگ خوش ہے پنڈت جی الگ بشاش ہیں اور شاید برادری کے لوگ بھی خوش ہیں اس لیے ایک برابر کا آدمی کم ہوگیا دل سے ایک کانٹا نکل گیا۔ اور پٹی داروں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ اب وہ پرانی کسر نکالیں گے دل کو ٹھنڈا کرنے کا ایسا موقع بہت دنوں کے بعد ملا ہے۔

آج پانچواں دن ہے وہ عالی شان مکان سونا پڑا ہے بچے نہ روتے ہیں نہ ہنستے ہیں من مارے ماں کے پاس بیٹھے ہیں اور بیوہ ماں مستقبل کے لاانتہا تفکرات کے بوجھ سے دبی ہوئی مردہ سی پڑی ہے گھر میں جو روپے بچ رہے تھے وہ تجہیز

وتکفین کی نذر ہوگئے اور ابھی سارے رسوم باقی ہیں۔ خدا کیسے بیڑا پار لگے گا۔
کسی نے دروازہ پر آواز دی، مہرا نے آکر سیٹھ دھنی رام کے آنے کی خبردی، دونوں بچے باہر دوڑے سوشیلا کا دل بھی ایک لمحہ کے لیے تازہ ہوگیا۔ سیٹھ دھنی رام برادری کے چودھری تھے بے کس بیوہ کا دل سیٹھ جی کی اس دلجوئی سے خوش ہوگیا آخر برادری کے سرپنچ ہیں ایسے لوگ بے کس بیوہ اور یتیم بچوں کی خبر نہ لیں تو اور کون لے، آفرین ہے ایسے نیک بندوں پر جو مصیبت کے وقت بے کسوں کی دستگیری کرتے ہیں۔ سوشیلا گھونگھٹ نکال کر برآمدہ میں آکر کھڑی ہوگئی دیکھا تو علاوہ دھنی رام کے اور بھی کئی بھلے آدمی کھڑے ہیں۔
دھنی رام بولے، بھو.جی بھائی رام ناتھ کی بے وقت موت سے ہم لوگوں کو جو رنج ہوا ہے وہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔ ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی، لیکن پرماتما کی مرضی، اب تو ہمارا یہی فرض ہے کہ پرمیشور پر بھروسہ رکھیں اور آگے کے لیے کوئی راستہ نکالیں۔ کام ایسا کرنا چاہیے کہ گھر کی عزت بنی رہے اور ہمارے مرحوم بھائی کی روح کو تسکین ہو۔
کبیرداس نے سوشیلا کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا، عزت کے سوا دنیا میں اور ہے کیا، اس کو نبھانا، اس کی حفاظت ہمارا دھرم ہے لیکن چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے کتنے روپے تمھارے پاس ہیں بہو!
سوشیلا: گھر میں روپے کہاں ہیں سیٹھ جی، جو تھوڑے بہت تھے بیماری میں اٹھ گئے
دھنی رام تو یہ نئی الجھن پیدا ہوگئی۔ ایسی حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔
کبیر چند: جو کچھ سہی دعوت تو دینی ہوگی، ہاں اپنی بساط دیکھ کر کام کرنا چاہیے میں قرض لینے کی صلاح نہ دوں گا۔ گھر میں جتنے روپے کا انتظام ہوسکے اس میں کوئی کسر نہیں رکھنی چاہیے۔ مرنے والے کے ساتھ ہمارا بھی تو کوئی فرض ہے۔ اب تو وہ پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس سے ہمیشہ کے لیے رشتہ ٹوٹ رہاہے۔ اس لیے سب کچھ حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ برہمنوں کو تو دہی اور مٹھائیاں دی جائیں گی، لیکن برادری کی دعوت اسی اعتبار سے کرنی چاہیے کہ عزت میں فرق نہ آئے۔

دھنی رام تو کیا تمھارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ تم نے تو ایک بڑی عجیب بات کہہ دی بھوجی! دوچار ہزار بھی نہیں۔

سوشیلا : میں آپ سے سچ کہتی ہوں میرے پاس کچھ نہیں ہے، بھلا ایسے وقت جھوٹ بولوں گی دھنی رام نے کبیر چند کی طرف دیکھ کر کہا۔ تب تو یہ مکان بیچنا پڑے گا۔

کبیر چند : اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ ناک کٹانا تو اچھا نہیں ہے۔ رام ناتھ کا کتنا نام تھا۔ برادری کے ستون تھے۔ یہی اس وقت ایک علاج ہے بیس ہزار میرے نکلتے ہیں۔ سود بٹہ لگا کر کوئی پچیس ہزار ہوں گے۔ باقی روٹی میں خرچ ہوجائیں گے۔ اگر کچھ بچ رہا تو بال بچوں کے کام آجائے گا۔

دھنی رام آپ کے پاس یہ گھر کتنے میں رہن تھا۔

کبیر : بیس ہزار روپے ایکڑ سود۔

دھنی رام : میں نے تو کم سنا ہے۔

کبیر : اس کا تو رہن نامہ رکھا ہے۔ زبانی بات چیت تھوڑی ہے میں دو چار ہزار کے لیے جھوٹ نہ بولوں گا۔

دھنی : نہیں نہیں، یہ میں کب کہتا ہوں، توتونے سن لیا بائی، پنچوں کی صلاح ہے کہ مکان بیچ دیا جائے۔

سوشیلا کا چھوٹا بھائی سنت لال بھی اس وقت آ پہنچا۔ یہ آخری الفاظ اس کے کان میں پہنچ گئے وہ بول اٹھا، کس لیے مکان بیچ دیا جائے، برادری کی روٹی کے لیے، برادری تو کھاپی کر راستہ لے گی ان یتیموں کی کون پرورش کرے گا، یہ بھی تو سوچنا چاہیے۔

دھنی رام نے غصہ بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ آپ کو ان معاملوں میں ٹانگ اڑانے کا کوئی حق نہیں، صرف آئندہ کا فکر کرنے سے کام نہ چلے گا، مرحوم کا پیچھا بھی کسی طرح سدھارنا پڑے گا ہنسی تو ہماری ہوگی، دنیا میں عزت سے زیادہ کوئی چیز نہیں، وقار کے لیے لوگ جان تک قربان کر دیتے ہیں، جب وقار ہی نہ رہا تو کیا رہ گیا۔ اگر ہماری صلاح پوچھوگے تو ہم یہی کہیں گے آگے بائی کو اختیار ہے، جیسا چاہے کرے، پرہم سے سروکار نہ ہوگا، چاہئے کبیر چند جی چلیں۔

سوشیلا نے خوفزدہ ہوکر کہا۔ بھیا کی باتوں کا خیال نہ کیجیے سیٹھ جی! ان کی تو عادت ہے میں نے تو آپ کی بات نہیں ٹالی۔ آپ میرے بزرگ ہیں، گھر کا حال آپ کو معلوم ہی ہے، میں اپنے مالک کی روح کو رنجیدہ کرنا نہیں چاہتی لیکن جب ان کے بال بچے ٹھوکریں کھائیں گے تو ان کی روح رنجیدہ نہ ہوگی؟ بیٹی کا بیاہ کرنا ہی ہوگا، لڑکے کو لکھنا پڑھنا ہوگا ہی، برہمنوں کو کھلا دیجیے لیکن روٹی کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔

دونوں اصحاب کو گویا تھپڑ لگ گیا۔ بھلا ایسی بات کبھی زبان سے نکالی جاتی ہے۔ پنچ لوگ اپنے منہ پر سیاہی نہ لگنے دیں گے، دنیا بیوہ عورت پر نہیں ہنسے گی، ہنسی ہوگی پنچوں کی، یہ جگ ہنسائی وہ کیسے سہہ سکتے ہیں، ایسے گھر کے دروازہ پر جھانکنا بھی گناہ ہے۔

سوشیلا رو کر بولی، میں غریب ہوں، نادان ہوں، مجھ پر غصہ نہ کیجئے، آپ لوگ ہی مجھے چھوڑ دیں گے تو میرا گذارہ کیسے ہوگا۔

اتنے میں دو اصحاب اور آگئے۔ ایک بہت موٹے، دوسرے بہت دبلے، نام بھی بامسمیٰ، بھیم چند اور وریل داس، دھنی رام نے چند لفظوں میں ساری کیفیت انھیں سمجھادی، ردیل داس نے بہت ہمدردی سے کہا، تو ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ہم لوگ مل کر کچھ روپے دے دیں اس کا لڑکا سیانا ہوجائے گا تو روپے مل ہی جائیں گے، اگر نہ بھی ملیں تو ایک دوست کے لیے کچھ کھا جانا کوئی بڑی بات نہیں۔

سنت لال نے خوش ہوکر کہا، اتنی مہربانی آپ لوگ کریں تو کیا کہنا۔

کبیر چند تیوری چڑھا کر بولے، تم بے سر پیر کی باتیں کرنے لگے۔ دریل داس جی، اس وقت بازار میں کسی کے پاس فالتو روپے رکھے ہوئے ہیں جو دے دے گا۔ زمانہ کا رنگ نہیں دیکھتے۔

بھیم چند : یہ تو ٹھیک ہے، ایسا مندا بازار تو کبھی دیکھا ہی نہیں، مگر نبھاؤ تو کرنا چاہیے۔

کبیر چند : اکڑ گئے، وہ سوشیلا کے مکان پر دانت لگائے ہوئے تھے۔ ایسی باتوں سے شکار ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ اپنے روپے وصول کرکے چھوڑیں

گے۔ عورتوں کے جھمیلے میں پڑ کر نقصان کیوں کریں۔ بھیم چند نے بہت اچھا کیا، انھیں ہوشیار کردیا، لیکن ضیافت تو دینی ہی پڑے گی پنچ لوگ برادری کی ناک نہیں کٹوا سکتے۔

سوشیلا نے دریل داس میں ہمدردی کا شائبہ دیکھا۔ ان کی طرف بے کسانہ نظروں سے دیکھ کر بولی، میں آپ لوگوں سے باہر تھوڑا ہی ہوں۔ آپ لوگ مالک ہیں جیسا مناسب سمجھیں کریں۔

دریل داس نے پوچھا تیرے پاس کچھ تھوڑے بہت زیور تو ہوں گے ہی۔

سوشیلا نے قبول کیا۔ ہاں تھوڑے سے گہنے پڑے ہوں گے، بیماری میں آدھے سے زیادہ بک گئے ہیں، یہ کہہ کر اس نے سارے زیور لاکر پنچوں کے سامنے رکھ دیئے۔

دھنی رام بولے، مگر یہ تو مشکل سے تین ہزار میں اٹھیں گے۔

دریل داس نے پوٹلی کو ہاتھ میں تول کر کہا، تین ہزار کیسے میں ساڑھے تین ہزار لادوں گا۔

بھیم چند نے پھر پوٹلی کو جانچ کر کہا۔ میری بولی چار ہزار کی ہے۔

کبیر چند کو مکان کے فروخت کرنے کا سوال چھیڑنے کا موقع ملا۔ بولے چار ہزار میں کیا ہوا جاتا ہے۔ برادری کا کھانا ہے یا کوئی بلا ٹالنا ہے۔ کم سے کم دس ہزار کا خرچ ہے مکان تو نکالنا ہی پڑے گا۔

سنت لال نے ہونٹ چبا کر کہا، میں کہتا ہوں آپ لوگ کیا اتنے بے رحم ہیں۔ آپ لوگوں کو یتیم بچوں پر بھی رحم نہیں آتا۔ کیا انھیں بھکاری بنا کر چھوڑو گے۔

لیکن سنت لال کی فریاد پر کسی نے دھیان نہ دیا۔ بلا مکان فروخت کئے کسی طرح کام نہیں چل سکتا۔ بازار آج کل مندا ہے۔ تیس ہزار سے زائد نہیں مل سکتے۔ پچیس ہزار تو کبیر داس کے ہیں، پانچ ہزار بچیں گے۔ اس طرح نو ہزار میں بڑی کفایت سے برہم بھوج بھی ہوجائے گا اور برادری کی دعوت بھی ہوجائے گی پنچوں کو آخر مرحوم کے بال بچوں کا خیال بھی تو کرنا ہے۔

سوشیلا نے دونوں بچوں کو سامنے کر کے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ پنچو میرے بچوں کا

منہ دیکھو! میرے گھر میں جو کچھ ہے سب لے لیجیے لیکن مکان چھوڑ دیجیے۔ مجھے ٹھکانہ نہ ملے گا، میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں مکان اس وقت نہ بیچیں؟

اس بے وقوفی کا کیا جواب دیا جائے۔ پنچ لوگ تو چاہتے تھے کہ مکان نہ بیچنا پڑے انھیں یتیم بچوں سے کچھ دشمنی نہیں لیکن برادری کا کھانا اور کس طریقے سے کیا جائے، اگر بیوہ پانچ ہزار کا انتظام اور کردے تو مکان فی الحال بچ سکتا ہے۔ جب وہ ایسا نہیں کرسکتی تو مکان فروخت کرنے کے سوا اور کوئی علاج نہیں ہے۔

کبیر داس نے کہا، دیکھ بائی، بازار کی حالت آج کل خراب ہے، روپیہ کسی سے ادھار نہیں مل سکتا۔ بال بچوں کے بھاگ میں لکھا ہوگا تو بھگوان اور کسی حیلے سے دے دیں گے۔ حیلے روزی، بہانے موت، بھگوان جس کو پیدا کرتے ہیں اس کے رزق کا انتظام بھی کر دیتے ہیں۔ ہم تجھے سمجھا کر ہار گئے اگر تو اپنی ہٹ نہیں چھوڑے گی تو ہم بات بھی نہ کریں گے۔ پھر یہاں تیرا رہنا مشکل ہو جائے گا۔ شہر والے تیرے پیچھے پڑ جائیں گے۔

بیوہ سوشیلا اور کیا کرتی، پنچوں سے لڑ کر وہ کیسے رہ سکتی تھی، پانی میں رہ کر مگر مچھ سے کون دشمنی کرسکتا ہے۔ اندر جانے کے لیے اٹھی، مگر وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑی، ابھی تک کچھ امید قائم تھی، بچوں کی پرورش میں وہ اپنی بیوگی کو بھول سکتی تھی مگر اب تو چاروں طرف اندھیرا تھا۔

(۳)

سیٹھ رام ناتھ کے دوستوں کا ان کے گھر پر پورا حق تھا، دوستوں کا حق نہ ہو تو کس کا ہو عورت کون ہوتی، جب وہ اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتی کہ برادری کو روٹی دینا اور دھوم دھام دینا لازمی ہے تو اس کا زیادہ سمجھنا فضول ہے۔ اب زیورات کون خریدے بھیم چند چار ہزار لگا چکے تھے، لیکن اب ان کو معلوم ہوا ان سے بھول ہوئی تھی، ردیل داس نے ساڑھے تین ہزار لگائے تھے، اس لیے سودا انھیں کے ہاتھ ہوا، اس بات پر بھیم چند اور دریل داس میں تکرار بھی ہوگئی، لیکن بھیم چند کو منہ کی کھانی پڑی، انصاف ردیل کی طرف تھا۔

دھنی رام نے ذرا چٹکی لی، دیکھو دریل داس مال تو لے جاتے ہو مگر ساڑھے تین ہزار سے زائد کا ہے۔ میں انصاف کا خون نہ ہونے دوں گا۔

کبیر داس بولے، اجی تو گھر میں ہی تو ہے کہیں باہر تو نہیں گیا۔ ایک دن دوستوں کی دعوت ہوجائے۔ اس پر چاروں اصحاب ہنس پڑے، اس کام سے فرصت پاکر اب مکان کا سوال اٹھا، کبیر داس تیس ہزار دینے پر تیار تھے۔ لیکن قانونی کارروائی کے بغیر معاملہ پختہ نہ تھا، یہ خامی کیوں رکھی جائے۔ فوراً ایک دلال بلایا گیا، پستہ قد آدمی، پوپلا منہ، کوئی ستر سال کی عمر، نام چوکھے لال۔''

کبیر داس نے کہا۔ چوکھے لال سے ہماری تیس سال کی دوستی ہے۔ آدمی کیا ہیرا ہے۔''

بھیم چند دیکھو چوکھے لال یہ مکان بیچنا ہے۔ اس کے لیے کوئی اچھا خریدار لاؤ۔ تمھاری دلالی پکی۔

کبیر داس : بازار کا حال اچھا نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی ہمیں تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ رام ناتھ کے بچوں کو خسارہ نہ رہے (چوکھے لال کے کان میں) تیس سے آگے نہ جانا۔

بھیم چند : دیکھئے کبیر داس یہ اچھی بات نہیں ہے۔

کبیر داس : تو میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں تو یہی کہہ رہا تھا کہ اچھے دام لگانا۔

چوکھے لال : آپ لوگوں کو مجھ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں، میں اپنا دھرم سمجھتا ہوں۔ رام ناتھ میرے بھی دوست تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس مکان کے بنوانے میں ایک لاکھ سے ایک پائی بھی کم خرچ نہیں ہوئی۔ لیکن بازار کا حال کیا آپ لوگوں سے چھپا ہوا ہے اس وقت اس کے پچیس ہزار سے زائد نہیں مل سکتے۔ سیتھے سے کوئی گاہک مل جائے تو دس پانچ ہزار اور مل جائیں گے لیکن اس وقت پچیس ہزار بھی بہت ہیں۔

دھنی رام پچیس ہزار تو بہت کم ہیں بھائی اور نہ سہی تو تیس ہزار تو کرادو۔

چوکھے لال : تیس کیا میں چالیس کرادوں، کوئی گاہک تو ملے آپ لوگ کہتے ہیں تو میں تیس ہزار کی بات چیت کروں گا۔

دھنی رام : جب تیس ہزار میں دینا ہے تو کبیر داس ہی کیوں نہ لے لیں، اتنا سستا مال دوسروں کو کیوں دیا جائے۔

کبیر داس : آپ سب لوگوں کی جیسی رائے ہو۔ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ بائی کے ساتھ جہاں تک ہوسکے رعایت کی جائے۔

دھنی رام جی نے ہاں ہاں کہہ کر منظوری دے دی، بھیم چند من میں اینٹھ کر رہ گیا۔

یہ سودا بھی پکا ہوگیا۔ اسی دن وکیل نے بیع نامہ لکھا۔ جھٹ رجسٹری ہوگئی۔ سوشیلا کے سامنے بیع نامہ لایا گیا۔ تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے دستخط کر دیئے۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا بے وفا دوست کی طرح یہ گھر بھی سکھ کے دنوں میں اس کا ساتھ دیکر دکھ میں ساتھ چھوڑ رہا ہے۔

پنچ لوگ سوشیلا کے صحن میں بیٹھے برادری کے رقعے لکھ رہے ہیں اور لاوارث بیوہ جھروکے میں اپنی قسمت کو رورہی ہے۔ ادھر رقعہ تیار ہوا، ادھر بے کس بیوہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر رقعے پر گرے۔

دھنی رام نے اوپر دیکھ کر کہا۔ پانی کی چھینٹ کہاں سے آئی۔

سنت رام : بائی بیٹھی رو رہی ہے۔ اس نے رقعے پر اپنے خون کے آنسوؤں کی مہر لگادی ہے۔

دھنی رام (اونچی آواز میں) ارے تو کیوں رو رہی ہے۔ بائی یہ رونے کا وقت نہیں تجھے تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ پنچ لوگ تیرے گھر میں آج نیک کام کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ جس خاوند کے ساتھ تو اتنے دنوں عیش و آرام سے رہی اس کی آتما کے لیے کچھ ''زاد راہ'' دے گی۔ اس کی مکتی کی طرف تیرا ذرا بھی دھیان نہیں؟

برادری میں رقعہ پھرا، اور پھر تین چار دن پنچوں نے دعوت کی تیاری میں صرف کئے۔ گھی دھنی رام جی کی آڑھت سے آیا۔ میدے اور چینی کی آڑھت بھی انھیں کی تھی، پانچویں دن صبح کے وقت برہمنوں کا کھانا ہوا، شام کی برادری کی روٹی ہوئی،

سوشیلا کے دروازہ پر گاڑیوں اور موٹروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ صحن، بیٹھک دالان، برآمدہ، اوپر کی چھت سب مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے، لوگ کھانا کھاتے تھے، اور پنچوں کی تعریف کرتے تھے۔ خرچ تو سبھی کرتے ہیں مگر انتظام کا سلیقہ چاہیے۔ ایسی مزیدار چیزیں کم کھانے میں آتی ہیں، لوگ تعریفیں کر رہے تھے۔

سیٹھ چمپا رام کی روٹی کے بعد ایسی روٹی ہوئی ہے۔

''امرتیاں کیسی خستہ ہیں''

''رس گلے میوے سے بھرے ہیں۔''

سار انتظام پنچوں کا ہے۔''

دھنی رام نے انکساری سے کہا، رام ناتھ سے بھائی پیارہ تھا، ہم نہ کرتے تو کون کرتا، یہ سمجھ لو کہ چاردن سے سونا نصیب نہیں ہوا۔

''آفریں ہے دوست ہوں تو ایسے ہوں۔''

کیا بات ہے، آپ نے رام ناتھ جی کا نام رکھ لیا، برادری یہی کھانا کھلانادیکھتی ہے۔ رقم کو دیکھنے نہیں آتی۔

''مہمان لوگ تعریفیں کر کر کے ترمال اڑاتے ہیں۔ اور ادھر کوٹھری میں بیٹھی ہوئی سوشیلا سوچ رہی تھی۔ دنیا میں ایسے خود غرض لوگ بھی ہیں۔ ساری دنیا مطلب پرست بن گئی ہے۔ سب پیٹوں پر ہاتھ پھیر کر کھانا کھارہے ہیں۔ کوئی اتنا بھی نہیں پوچھتا کہ غریب یتیموں کے لیے کچھ بچا یا نہیں۔

ایک مہینہ گذر گیا، سوشیلا پیسے پیسے کو محتاج ہو رہی تھی، نقد تھا ہی نہیں، زیور نکل ہی گئے۔ اب صرف تھوڑے سے برتن بچ رہے تھے ادھر بہت سے چھوٹے چھوٹے بل چکانے تھے، کچھ روپے ڈاکٹر کو دینے تھے، کچھ بنئے کو، کچھ درزی کو، سوشیلا کو رقمیں گھر کا بچا کھچا سامان بیچ کر چکانا پڑیں۔ اور مہینہ پورا ہوتے ہوتے اس کے پاس کچھ نہ بچا۔ بیچارہ سنت لال ایک دکان میں منیم تھا، کبھی کبھی دوچار روپے دے دیتا، اور خرچ کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ بچے تو صورت حال کو سمجھتے تھے۔ ماں کو دق نہ کرتے تھے، لیکن مکان کے سامنے سے کوئی خوانچے والا نکل جاتا اور دونوں دوسرے بچوں کو پھل یا مٹھائیاں کھاتے دیکھتے تو ان کے منہ میں چاہے پانی

نہ آئے، آنکھوں میں ضرور آجاتا تھا۔ ایسی للچائی مجبور نظروں سے دیکھتے کہ رحم آجاتا۔ وہی بچے جو چند روز پہلے میوے اور مٹھائیوں کی طرف تکتے بھی نہ تھے اب ایک ایک پیسے کی چیز کو ترستے تھے۔ وہی حضرات جنھوں نے برادری کو دعوت کروائی تھی، مکان کے سامنے سے نکل جاتے تھے، پر کوئی جھانکتا تک نہ تھا۔

(۴)

شام ہوگئی تھی، سوشیلا چولہا جلائے روٹیاں سینک رہی تھی۔ اور دونوں بچے چولہے کے پاس بیٹھے روٹیوں کو گرسنہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دال پکنے کا انتظار تھا لڑکی گیارہ سال کی تھی، لڑکا آٹھ سال کا۔

موہن بے صبر ہوکر بولا، اماں مجھے روکھی، روٹیاں ہی دے دو، بڑی بھوک لگی ہے۔ سوشیلا نے محبت آمیز انداز سے کہا، ذرا اور صبر کرو بیٹا، ابھی دال پکی جاتی ہے۔

ریوتی کو بھائی پر رحم آگیا، بولی میرے پاس ایک پیسہ ہے، میں وہی لے آتی ہوں۔

سوشیلا نے پوچھا۔ تونے پیسہ کہاں پایا۔

ریوتی نے معصومانہ انداز سے کہا۔ مجھے کل اپنی گڑیوں کی پٹاری میں ملا تھا۔

سوشیلا مطمئن ہوکر بولی، اچھا جا، مگر جلدی آئیو۔

ریوتی دوڑی ہوئی باہر گئی اور ایک پتے پر ذرا سی دہی لے آئی۔ ماں نے روٹی دے دی موہن دہی سے روٹی کھانے لگا۔ عام لڑکوں کی طرح وہ خود بھی خود غرض تھا۔ بہن سے پوچھا بھی نہیں۔

سوشیلا نے تیوریاں چڑھاکر کہا۔اکیلا ہی کھاجائے گا بہن کو بھی دے دے۔

موہن شرمندہ ہوگیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

ریوتی بولی۔ نہیں اماں کتنا ملا ہے تم کھا لو موہن تمھیں جلد نیند آجاتی ہے۔ میں تو دال کے ساتھ کھاؤں گی۔

اسی وقت دو آدمیوں نے باہر سے آواز دی، ریوتی نے باہر جاکر پوچھا، معلوم

ہوا سیٹھ کبیر داس کے آدمی ہیں۔ مکان خالی کرانے آئے ہیں۔ سوشیلا کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہوگئیں۔ بروٹھے میں آکر بولی۔ ابھی میرے شوہر کی وفات کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا اور ابھی مکان خالی کرانے کی دھن سوار ہوگئی۔ میرا پچاس ہزار کا مکان تیس ہزار میں لے لیا۔ اس پر پانچ ہزار سود کے ہضم کئے، پھر بھی پیٹ نہیں بھرا، کہہ دو میں ابھی مکان خالی نہ کروں گی۔

منیم نے ملائمیت سے کہا۔ بائی جی میں تو نوکر ہوں۔ میرا کیا اختیار ہے جب ملکیت دوسرے کی ہوگئی تو آپ کو مجبوراً چھوڑنی ہی پڑے گی۔ قانون کسی کی حالت کو نہیں دیکھتا۔

سوشیلا سمجھ گئی منیم بجا کہتا ہے۔ رحم اور انسانیت کے بل پر کب تک گذارہ ہوگا نرم ہو کر بولی اتنا میں بھی جانتی ہوں منیم جی، تم سیٹھ جی سے میری طرف سے عرض کرنا، دس دن مہلت اور دے دیں لیکن نہیں کچھ عرض معرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں دس پانچ دن کے لیے کسی کا احسان لوں، میری تقدیر میں اس گھر کا رہنا لکھا ہوتا تو کیوں ہاتھ سے نکل جاتا۔

منیم نے پوچھا تو کل سویرے تک خالی ہوجائے گا؟

سوشیلا بولی، ہاں ہاں کہتی تو ہوں اور سویرے تک کیوں میں ابھی خالی کئے دیتی ہوں۔ میرے پاس ایسا اثاثہ ہی کیا ہے۔ تمھارے سیٹھ جی کے رات بھر کے کرایہ کا کیوں نقصان ہو۔ جاکر قفل لاؤ یا لائے ہو؟

ایسی کیا جلدی ہے بائی جی، کل اطمینان سے خالی کر دیجیے گا۔

جب خالی ہی کرنا ہے تو کل کا جھگڑا کیوں رکھوں، منیم جی آپ جایئے اور تالا لاکر ڈال دیجیے۔

یہ کہتی ہوئی سوشیلا اندر گئی۔ بچوں کو کھانا کھلایا، ایک روٹی خود آنسوؤں کے ساتھ نگلی برتن مانجھے، پھر ایک یکہ منگوا کر اس پر مختصر سا سامان لادا اور بادل پُردرد اس گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی۔ جسے اس نے اتنے ارمانوں سے کئی پشتوں کے لیے بنوایا تھا۔ اس وقت دل میں کتنی امنگیں تھیں اینٹ اول درجہ کی ہو، چونا خالص کنکر کا، لکڑی پختہ، سیٹھ جی مرحوم تو دن بھر اپنی آڑھت میں رہتے تھے۔

مزدوروں کی نگرانی اور دیکھ بھال وہ خود کرتی تھی جس دن مکان تیار ہوگیا اور آبادی کی رسم اداہوئی، اس دن کئی ہزار برہمنوں کا بھوج ہوا تھا، سوشیلا کو اتنی دوڑ دھوپ کرتی پڑی تھی کہ وہ ایک مہینہ تک بیمار رہی۔ اس گھر سے اتنے ہی دنوں میں کتنی یادیں وابستہ ہوگئی تھیں اس گھر میں اس کے دو لڑکے مرے تھے یہیں اس کے شوہر نے دنیا کو خیر باد کہا۔ مرنے والوں کی روحیں گویا اس کے در و دیوار پر منڈلا رہی ہوں۔ اس کا ایک ایک گوشہ گو اس کے دکھ سے دکھی اور اس کے سکھ سے سکھی ہوتا ہوا معلوم ہوا تھا۔ وہ پرانا رفیق آج اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہا ہے۔

اس نے رات ایک ہمسایہ کے گھر میں کاٹی۔ اور دوسرے دن دس روپے ماہوار پر ایک گلی میں دوسرا مکان لے لیا۔

(۵)

اس نئے مکان میں ان مصیبت زدوں نے تین مہینے جس عذاب میں کاٹے وہ سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جو ہوا دار پر فضا، وسیع اور ہر موسم میں آرام دہ مکان میں رہنے کا عادی ہو، اس کے لیے یہ نیا مکان تنگ و تاریک زنداں خانہ سے کم تکلیف دہ نہ تھا۔ مگر بھلا ہو بچارے سنت لال کا وہ اپنی قلیل آمدنی میں بھی ان غریبوں کی کچھ نہ کچھ مدد کرتا رہتا تھا۔ اگر سوشیلا شروع ہی سے افلاس کی عادی ہوتی تو چکی پیستی، یا کسی کا کھانا پکا کر گذر کرتی، مگر خوشحال ماں باپ کی لاڈلی بیٹی اور خوشحال شوہر کی بیوی، یہ کام اسے ذلیل معلوم ہوتے تھے، پھر اپنے مرحوم شوہر کے وقار کا بھی تو خیال تھا۔ حیثیت سے گر کر رہنے میں کتنی سبکی تھی۔ لوگ یہی کہتے یہ سیٹھ رام ناتھ کی بیوی ہے۔ کل کیا تھے آج کیا ہوگئے۔ اس نام کی لاج تو رکھنی ہی تھی۔ سماج کی سخت گیریوں سے کسی طرح بھی تو نجات نہیں۔ لڑکی کے دو ایک زیور بچ گئے تھے، وہ بھی بک گئے۔ جب روٹیوں ہی کے لالے تھے تو گھر کا کرایہ ماہوار کہاں سے آتا۔ تین مہینے تک تو مالک مکان نے کسی طرح صبر کیا وہ بھی اسی برادری کا ایک فرد تھا جس نے ضیافت میں خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے تھے۔ اور سوشیلا کی زبوں حالی سے واقف تھا۔ مگر بیچارہ کہاں تک صبر کرتا تیس روپے کا معاملہ

تھا۔ روپیہ آٹھ آنے کی بات نہ تھی، اتنی بڑی رقم تو نہیں چھوڑی جاسکتی۔

آخر جب چوتھا مہینہ لگ گیا تو ایک دن سیٹھ جی بہ نفس نفیس وارد ہوئے اور سانڈ کی طرح ڈکارتے ہوئے بولے ''اگر تو کرایہ نہیں دے سکتی تو مکان خالی کردے۔ میں نے برادری کے ناتے اتنی مروت کی لیکن تو پرواہ نہیں کرتی۔ کھاتی ہے، پیتی ہے،کپڑے پہنتی ہے پھر گھر کا کرایہ دیتے ہوئے کیوں نانی مرتی ہے۔ بچارے رام ناتھ کی آتما کو بدنام کر رہی ہے۔

سوشیلا دردناک لہجہ میں بولی، میرے پاس روپے ہوتے تو آپ کا کرایہ ادا کر کے تب پانی پیتی آپ نے اتنی مروت کی، اس لیے میرا سر آپ کے قدموں پر ہے۔ لیکن ابھی میں بالکل تنگ دست ہوں، یہ سمجھ لیجیے کہ بس ایک بھائی میرے بچوں کی پرورش کر رہے ہیں اور کیا کہوں۔

سیٹھ جی کچی گولیاں نہ کھیلے تھے، پور نماشی کو ہمیشہ ست نرائن کی کتھا سنتے تھے۔ اب اور کہاں تک دھرم کے نام کو روتے۔ غضبناک ہوکر بولے'' چل چل، اس طرح کے بہانے بہت سن چکا ہوں میں برادری کا آدمی ہوں نہ، اس لیے چاہتی ہے کہ مجھے چوس لے اگر کوئی دوسرا ہوتا اسے چپکے سے مہینے مہینے کرایہ دیتی۔ نہیں اس نے نکال باہر کیا ہوتا۔ اس برادری کا ہوں مجھے کرایہ دینے کی ضرورت نہیں مجھے مانگنا ہی نہ چاہیے کیوں برادری کے ساتھ یہی سلوک، اسی کے سایہ میں رہتی ہے اسی کی جڑ کھودتی ہے۔

ریوتی بھی کہیں سے کھیلتی ہوئی آکر کھڑی ہوگئی، سیٹھ جی نے اسے سر سے پاؤں تک مبصرانہ اندازسے دیکھا، اور تب ذرا رقیق ہو کر بولے ''اچھا تو یہ لڑکی سیانی ہوگئی، کہیں اس کی سگائی کی بات چیت نہیں کی؟''

ریوتی شرماکر بھاگ گئی، سوشیلا نے ان الفاظ میں ہمدردی کی جھلک پا کر پر اعتماد لہجہ میں کہا۔ ابھی تو کہیں بات چیت نہیں ہوئی، سیٹھ جی، گھر کا کرایہ تک تو ادا کرنہیں سکتی، سگائی کہاں سے کروں، پھر ابھی چھوٹی بھی تو ہے۔

سیٹھ جی نے فوراً شاستروں کا حوالہ دیا۔ لڑکیوں کی شادی بارہ سال کے اندر کردینی چاہیے۔ شاستروں کی یہی منشا ہے۔ دھرم سب کے لیے ایک ہے۔ کیا

غریب، کیا امیر، اس کا یزاورنہ کرنا چاہیے، کرایہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر دے دینا، مجھے معلوم نہ تھا کہ سیٹھ رام ناتھ کی کنیا ابھی تک کنواری بیٹھی ہے۔

سوشیلا کو جیسے آنکھیں مل گئیں، بولی 'تو آپ کی نگاہ میں کوئی اچھا لڑکا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں۔ میرے پاس لینے دینے کو کچھ نہیں ہے۔

سیٹھ جھابر مل جی (آپ کا یہی مبارک نام تھا) کی مردانہ حمیت جوش میں آگئی۔ آواز میں قند وشکر گھول کر بولے، لینے دینے کی کوئی بات نہیں بائی جی، سیٹھ رام ناتھ بھائی تھے ان کی کنیا کنواری بیٹھی رہے، یہ میں نہیں دیکھ سکتا۔ ایسا گھر ہے کہ لڑکی زندگی بھر آرام سے رہے گی۔ تمھارا لڑکا بھی وہیں آرام سے رہ سکتا ہے۔ اس کی تعلیم کا انتظام ہوجائے گا۔ بس یہی سمجھ لو کہ تمھارے نصیب کھل جائیں گے۔ گھرانا بہت ہی شریف اور اونچا ہے۔ ہاں لڑکا دوہا جو ہے۔

''عمر اچھی ہونی چاہیے۔ دوہا جو ہونے سے کیا ہوتا ہے۔''

''عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہے ابھی چالیسواں سال ہے۔ دیکھنے میں تیس ہی کا لگتا ہے۔ ہٹا کٹا مضبوط آدمی ہے اور مرد کی عمر تو اس کی غذا ہے۔ اچھی غذا ملتی جائے تو عمر کی پرواہ نہیں بس یہی سمجھ لو کہ تمھار بیڑا پار لگ جائے گا۔''

سوشیلا تشویشناک لہجہ میں بولی۔ اچھا میں سوچ کر جواب دوں گی۔ ایک بار مجھے دکھا دینا۔

سیٹھ جھابر مل جی مسکرا کر بولے، دیکھنے کو کہیں جانا ہے بائی جی وہ تو تیرے سامنے ہی کھڑا ہے۔

سوشیلا کے منہ پر طمانچہ سا پڑ گیا۔ نفرت آمیز نظروں سے سیٹھ کو دیکھا، یہ پچاس سال کا بوڑھا کھوسٹ اور اس کی یہ ہوس، سینہ کا گوشت لٹک کر ناف تک آپہنچا ہے۔ ٹھوڑی سینہ کا بوسہ لے رہی ہے، دانت کے ستون جیسے کوئٹہ کے زلزلے میں منہدم ہو گئے ہیں اور اس پر یہ بڑبھس، یہ احمق سمجھتا ہے کہ میں لالچ میں آکر اپنی پھول سی لڑکی اس کے گلے میں باندھ دوں گی۔ میں اسے عمر بھر کنواری رکھوں گی پر اس مرد کے ساتھ شادی کر کے اس کی زندگی برباد نہ کروں گی، مگر اس نے ضبط کیا، یہ زمانے کی خوبی ہے کہ ایسے کھوسٹوں کو ذلیل کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے۔

بولی آپ کی اس عنایت کے لیے آپ کی مشکور ہوں۔ سیٹھ جی، مگر میں اپنی لڑکی کی شادی آپ سے نہیں کرسکتی۔

جھابر مل تند ہو کر بولے تو اور تو کیا سمجھتی ہے کہ تیری لڑکی کے لیے برادری میں کنوارا لڑکا مل جائے گا۔

''تو میری لڑکی کنواری ہی رہے گی۔''

''نام کے لیے اپنی ساری جائیداد کھوئی۔ زیور کھوئے۔ مکان کھویا۔ لیکن لڑکی کو کنویں میں نہیں ڈال سکتی، نام رہے یا جائے۔''

''تو پھر میرا کرایہ اسی وقت دے دے۔''

''ابھی میرے پاس روپے نہیں ہیں۔''

جھابر مل اسی غیظ کے عالم میں مکان کے اندر گھس گئے۔ اور خانہ داری کی ایک ایک چیز نکال کر گلی میں پھینک دی۔ گھڑا پھوٹ گیا، مٹکے چور چور ہوگئے۔ برتن ٹوٹ گئے۔ صندوق کے کپڑے بکھر گئے۔ چیتھڑوں کو جوڑ کر ریوتی نے کھیلنے کے لیے خوبصورت سی گڑیا بنا رکھی تھی اس کے اعضاء منتشر ہوگئے اور اس کے ریزے ہوا میں اڑ گئے۔ سوشیلا ایک بے حسی کے عالم میں دور کھڑی اپنی تباہی کا یہ جگر دوز نظارہ دیکھتی رہی۔

گھر کو خاک میں ملا کر جھابر مل نے مکان میں قفل ڈال دیا۔ اور عدالت سے روپے وصول کرنے کی دھمکی دے کر چلے گئے۔

(٦)

بڑوں کے پاس دولت ہے۔ چھوٹوں کے پاس دل ہوتا ہے۔ دولت سے عالیشان محل بنتے ہیں، عیاشیاں ہوتی ہیں۔ مقدمہ بازی کی جاتی ہے۔ رعب جتایا جاتا ہے، اور انسانوں کو کچلا جاتا ہے، دل سے ہمدردی ہوتی ہے، زخم پر مرہم رکھا جاتا ہے اور آنسو نکلتے ہیں۔

اس مکان سے ملی ہوئی ایک سبزی والی کنجڑن کی دوکان تھی، بوڑھی بیوہ ضعیف بے اولاد تھی، ظاہر میں آگ، باطن میں پانی، جھابر مل کو خوب صلواتیں سنائیں اور

سوشیلا کی ٹوٹی پھوٹی بکھری ہوئی کام کی چیزوں کو سمیٹ کر اپنے گھر میں لے گئی اور پیار سے بولی، تم چل کر میرے گھر میں رہو بہو، ملاحظہ میں آگئی، نہیں نگوڑے کی مونچھیں اکھاڑ لیتی، موت سر پر ناچ رہی ہے۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا، اور موا پیسے کے کئے مرا جاتا ہے، جانے چھاتی پر لاد کر لے جائے گا، چار دن میں گنگا میں جائیں گے، انھیں بیاہ کی دھن سوار ہے۔ پیسہ پاکر آدمی کی آنکھیں بھی بند ہوجاتی ہیں۔ کیا؟ تم آرام سے گھر میں رہو۔ میرے ہاں کسی بات کا کھٹکا نہیں، بس میں اکیلی ہوں۔ ایک ٹکڑا مجھے بھی دے دینا۔

سوشیلا نے ڈرتے ڈرتے کہا، ماتا جی میرے پاس ان ٹوٹے پھوٹے سامانوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے کرایہ کہاں سے دوں گی۔

بڑھیا مادرانہ شفقت سے بولی، میں جھابر مل نہیں ہوں بیٹی، نہ کبیر داس ہوں میں دل رکھتی ہوں اچھے برے دن سب کے آتے ہیں۔ سکھ میں اتراؤ مت، دکھ میں گھبراؤ مت، تمھیں اس دن بھی دیکھا تھا جب تم محل میں رہتی تھی، اور آج بھی دیکھ رہی ہوں، جب تم اناتھ ہو۔ جو مزاج جب وہی اب ہے، میرے دھن بھاگ کہ تم میرے گھر میں آؤ میری آنکھیں کیا پھوٹ گئی ہیں کہ میں تم سے کرایہ مانگنے جاؤں گی۔

ان تشفی سے بھرے الفاظ نے سوشیلا کے دل کا بوجھ ہلکا کردیا۔ اس نے آج دیکھا سچی انسانیت اور محبت غریبوں رذیلوں میں رہتی ہے۔ بڑوں کا دل بھی بڑا ہوتا ہے تکبر اور خود نمائی سے پر۔

اس کنجڑن کے ساتھ رہتے رہتے سوشیلا کو چھ مہینے ہوگئے تھے۔ اس کی مادرانہ الفت میں سوشیلا کا اپنا رنج وغم بہت کچھ بھول گیا تھا۔ وہ جو کچھ پاتی لاکر سوشیلا کے ہاتھ پر رکھ دیتی دونوں بچے اس کی دو آنکھیں تھے، مجال نہ تھی کہ پڑوس کا کوئی آدمی انھیں ترچھی آنکھوں سے دیکھ بھی سکے، بڑھیا آسمان سر پر اٹھالیتی، سنت لال ہر مہینے کچھ نہ کچھ لا دیا کرتا تھا اس سے فراغت کے ساتھ گذر ہوجاتی تھی۔ سوشیلا گھر کی مالکن تھی۔

کاتک کا مہینہ تھا، فصلی بخار پھیلا ہوا تھا۔ موہن ایک دن ہنستا کھیلتا بیمار پڑ گیا

اور تین دن تک بیہوش پڑا رہا۔ بخار اتنی شدت کا تھا کہ پاس کھڑے ہونے سے لپٹ سی لگتی تھی۔ سوشیلا کو ٹائیفائڈ کا اندیشہ تھا، اس کی جان سوکھی جاتی تھی، کیا کرے کس سے کہے۔

پانچویں دن اس نے ریوتی سے کہا، بیٹی تو نے پنچ جی کا گھر دیکھا ہے۔ جاکر ان سے میرا پرنام کہنا، اور کہنا بھیا کو پانچ دن سے زور کا بخار ہے، چھن بھر کو بھی نہیں اترتا کوئی ڈاکٹر بھیج دیجیے۔

ریوتی کو کہنے کی دیر تھی۔ دوڑی ہوئی سیٹھ کبیر داس کے پاس گئی، کبیر داس نے حال سنا اپنے منیم سے بولے ایسا حکم بھیجتی ہے جیسے میں اس کے باپ کا نوکر ہی تو ہوں۔ کھانے کو ٹھکانہ نہیں انھیں ڈاکٹر چاہیے۔ چڑیل۔

ریوتی سے بولے۔ جاکر کہدے ڈاکٹر کی فیس سولہ روپے ہوگی۔ راضی ہو تو بھیج دوں ریوتی نے دل شکستہ ہوکر کہا۔ اماں کے پاس روپے کہاں ہیں سیٹھ جی!۔

کبیر داس جھڑک کر بولے۔ تو پھر کس منہ سے ڈاکٹر بھیجنے کو کہتی ہے۔ تیرا ماموں کہاں ہے اس سے جاکر کہہ، سیوا سمتی سے کوئی ڈاکٹر بلا لے جائے۔ یا خیراتی ہسپتال میں کیوں نہیں لڑکے کو لے جاتی یا ابھی وہی پرانی بو سمائی ہے۔ کتنی بے سمجھ عورت ہے گھر میں ٹکا نہیں ڈاکٹر کی فرمائش کردی۔ سمجھتی ہوگی فیس پنچ جی دے دیں گے۔ پنچ جی کیوں فیس دیں، پنچایت کا مال دھرم کاج کے لیے ہے۔ یوں اڑانے کے لیے نہیں، شہر کے لاکھوں آدمی اسپتال میں اچھے ہوجاتے ہیں پھر یہ کہاں کی بڑی رانی ہیں۔ ابھی بھاگوت کی کتھا بیٹھنے والی ہے۔ کئی ہزار کا خرچ ہے، اس طرح ہر ایک کے لیے ڈاکٹر بھیجنے لگوں تو ثواب کا کوئی کام ہی نہ ہو۔

ریوتی آنکھوں میں آنسو بھرے لوٹی، مگر جو کچھ سنا تھا وہ کہہ کر ماں کے زخم پر نمک نہ چھڑکنا چاہتی تھی۔ بہانہ کردیا۔ سیٹھ جی ملے نہیں کہیں باہر گئے ہیں۔

سوشیلا نے ڈانٹ کر کہا تو نے منیم جی سے کیوں نہیں کہا۔ یہاں کوئی مٹھائی رکھی تھی جو دوڑی ہوئی آگئی۔

اسی وقت سنت لال ایک وید کو لے کر آئے۔

(۷)

مگر ویدجی ایک دن آکر دوسرے دن نہ لوٹے۔ جب پوری فیس کی جگہ آدھی بھی نہ ملے اور نہ اس تعلق سے کسی موٹے مریض کے پھنسنے کی امید ہی ہو تو پھر وہ کس تحریک سے روز آئیں۔ سیواسمتی کے ڈاکٹر صاحب بھی دو دن بڑی منتوں سے آئے۔ پھر انھیں بھی فرصت نہ رہی۔ جھابر مل کو بخار آنے لگا تھا اور جھابر مل برادری کے ذی اثر آدمی تھے، ان کے معالجہ میں ہر طرح کا فائدہ تھا۔

ادھر موہن کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ ایک مہینہ یوں ہی گذر گیا۔ مگر بخار نے اترنے کا نام نہ لیا۔ پیر تسمیہ پا کی طرح گردن پر سوار ہوگیا تھا کہ ہلتا تک نہ تھا، موہن کا چہرہ اتنا زرد اور افسردہ ہوگیا تھا گویا خون کا ایک قطرہ جسم میں نہ ہو۔ اسے دیکھ کر رحم آتا تھا۔ لمبا سا چہرہ نکل آیا تھا جس پر طفلانہ بے کسی روتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، نہ کچھ بولتا نہ کہتا، یہاں تک کہ کچھ سنتا بھی نہ تھا، پڑا پڑا بے نور آنکھوں سے چھت کی طرف تاکتا رہتا۔ پڑے پڑے جلد میں خراش ہوگیا تھا، سر کے بال گر گئے تھے، ہاتھ پاؤں لکڑی جیسے چارپائی پر ایسا سمٹا ہوا تھا گویا ہے ہی نہیں،تصویر مٹ گئی، صرف اس کا عکس باقی تھا۔ ماں رات دن اس کی تیمارداری میں لگی رہتی بڑھیا بھی دعائیں دیا کرتی مگر تیمارداری اور دعا سے دوا کا کام تو نہیں ہوسکتا۔

ایک دن شام کے وقت موہن کے ہاتھ پاؤں سرد ہوگئے۔ سوشیلا تو پہلے ہی سے ٹھونک رہی تھی یہ حالت دیکھی تو چھاتی پیٹنے لگی اسے بے بسی میں کچھ اور نہ سوجھا، کھڑی ہوگئی اور موہن کے کھاٹ کے گرد سات بار گھوم کر دست بدعا ہوکر بولی، بھگوان یہی میری اس جنم کی کہانی ہے۔ اپنا سب کچھ کھو کر بھی اپنے لال کو چھاتی سے لگائے ہوئے اپنی قسمت پر شاکر تھی۔ یہ چوٹ نہ سہی جائے گی۔ تم اسے اچھا کردو، اس کے بدلے مجھے اٹھالو، بس میں تمھاری اتنی ہی دیا چاہتی ہوں۔''

غیب کے کرشمے کون سمجھ سکتا ہے، کیا ہم میں بہتیروں کو اس کا تلخ تجربہ نہیں کہ جس دن ہم نے بے ایمانی سے کوئی رقم اڑادی اسی دن ہمیں اس رقم کا دوگنا

نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اسے اتفاق کہو یا دعا کا اثر، اسی رات کو موہن کا بخار اتر گیا۔ اور سوشیلا کو بخار آ گیا، بچے کی تیمارداری میں آدھی تو یوں ہی ہو رہی تھی، بخار نے ایک ہی جھٹکے میں بستر مرگ پر سلادیا۔ معلوم نہیں دیوتا بیٹھے سن رہے تھے یا کیا۔ اس کی دعا حرف بحرف پوری ہوئی، تیسرے دن موہن چارپائی سے اٹھا اور ماں کے پاس جاکر اس کی چھاتی پر سر رکھ کر رونے لگا طویل بیماری کے بعد جو ہم میں ایک روشن ضمیری آجاتی ہے اس سے اسے آنے والے سانحہ کا الہام سا ہوگیا تھا، ماں نے اسے چھاتی سے لگا لیا اور بولی ''کیوں روتے ہو بیٹا، میں اچھی ہو جاؤں گی جب تم کو بھگوان نے اچھا کردیا تو میری کیا فکر، وہی بھگوان تمھارے ماتا پتا ہیں وہی تمھاری پرورش کریں گے، اب مجھے کوئی فکر نہیں، بہت جلد اچھی ہوجاؤں گی۔''

''موہن سسکیاں بھر کر بولا۔ بیاں......کہتی ہے اماں اچھی نہ ہوں گی۔''

سوشیلا نے بچہ کا بوسہ لے کر کہا ''جیسا پگلی ہے، اسے بکنے دو میں تمھیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی، تمھارے ساتھ رہوں گی، ہاں جس دن تم کسی کو ستاؤ گے، کسی کا دل دکھاؤ گے، اپنی نیت خراب کروگے، کسی کی کوئی چیز چراؤ گے، اسی دن میں مرجاؤں گی۔''

موہن خوش ہو کر بولا ''میں کبھی کسی کی چیز نہ چراؤں گا اماں کبھی کسی کو گالی نہ دوں گا تم میرے ساتھ ہمیشہ رہوگی نا؟''

''ہاں بیٹا ہمیشہ''

اسی رات کو مصیبت کی ستائی ہوئی وہ غم نصیب بیوہ دونوں یتیم بچوں کو خدا کے سائے میں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئی۔

(۸)

اس سانحہ کو تین سال ہوگئے۔ موہن اور ریوتی ابھی تک اس پاک نفس کنجڑن کے پاس رہتے ہیں۔ بڑھیا ماں تو نہیں ہے مگر ماں سے بڑھ کر ہے۔ روز علی الصباح موہن کو باسی روٹیاں مکھن کے ساتھ کھلا کر گوروجی کی پاٹھ شالہ میں پہنچا

آتی ہے چھٹی کے وقت خود جاکر لے آتی ہے، ریوتی کا چودھواں سال ہے، وہ گھر کا سارا کام پیسنا لوٹا، چوکا برتن، جھاڑو بھاڑو کرتی ہے اور اس کا من ذرا بھی میلا نہیں ہوتا جب بڑھیا سودا لے کر بازار چلی جاتی ہے تو وہ دکان پر آکر بیٹھتی ہے۔

ایک دن بڑے پنچ سیٹھ کبیر داس نے اسے بلوا بھیجا، اور بولے کیوں ری تو اتنی سیانی ہوگئی تجھے کنجڑن کی دوکان پر بیٹھے شرم نہیں آتی، ساری برادری کی ناک کٹوادی ہے خبر دار جو کل سے دکان پر بیٹھی، میں نے تیری شادی کیلیے سیٹھ جھابڑ مل جی کو پکا کر لیا ہے۔ رانی بن جائے گی، رانی۔''

سیٹھانی نے تائید کی۔'' تو اب سیانی ہوئی بیٹی، تیرا اب اس طرح دکان پر بیٹھنا اچھا نہیں لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ تہمت لگتے کتنی دیر لگتی ہے۔ بڑی مشکل سے جھابر مل جی کو راضی کیا ہے۔ کہتے تھے ایسی بلکی چھوکری سے شادی کر کے کون بدنامی مول لے مگر ہم نے بہت سمجھا بجھا کر انھیں سیدھا کیا ہے، بس یہ سمجھ لے کہ بھاگ جاگ جائیں گے، لاکھوں کی جائیداد ہے، لاکھوں کی، تیرے دھن بھاگ کہ ایسا برملا، تیرا چھوٹا بھائی ہے اسے بھی پڑھا لکھا کر کوئی دکان کرادی جائے گی۔''

سیٹھ نے پیشانی کو اوپر چڑھا کر کہا، ''برادری کی کتنی ہنسی ہورہی ہے۔''

سیٹھانی نے تصدیق کی ''ہے ہی''

ریوتی نے لجا کر کہا' میں کیا جانوں، یہ سب آپ ماما سے کہیں۔''

کبیر داس بگڑ کر بولے ''ماما کون ہوتا ہے، ٹکے کا آدمی، اس سے کیا پوچھوں میں برادری کا پنچ ہوں۔ مجھے اختیار ہے کہ جس کام میں برادری کی بہتری دیکھوں وہ کروں میں نے اور پنچوں سے رائے لے لی ہے سب راضی ہے، اگر یوں نہ مانے گی تو ہم عدالتی کارروائی کریں گے، پاگل نہ بن ہمارا کہنا مان، تیرے ہی بھلے کو کہتے ہیں۔ خرچ برچ کے لیے کچھ درکار ہو تو یہ لیتی جا۔''

یہ کہہ کر انھوں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ صندوق سے نکال کر ریوتی کے طرف پھینک دیا ریوتی نے نوٹ اٹھا کر وہیں پرزے پرزے کرڈالا اور تمتماتے ہوئے منہ سے بولی برادری نے اس وقت ہماری بات نہ پوچھی، جب ہم روٹیوں کو

محتاج تھے، میری بدنصیب ماں مرگئی، برادری کا کوئی آدمی جھانکنے تک نہ گیا۔ میرا بھائی بیمار ہوا کسی نے خبر تک نہ لی، ایسی برادری کی مجھے پرواہ نہیں''

ریوتی چلی گئی تو جھابڑ مل پاس کی کوٹھری سے نکل آئے جہاں وہ پہلے ہی سے چھپے بیٹھے تھے، چہرے پر جھاڑو پھری ہوئی تھی۔

مسز کبیر داس بولیں، لڑکی کتنی گھمنڈی ہے۔ آنکھ کا پانی مر گیا۔''

جھابڑ مل نے نوٹ کے پرزوں کو چنتے ہوئے رونا منہ بناکر کہا، پچاس روپیوں پر پانی پھر گیا سسری نے ایسا پھاڑا ہے کہ جڑ بھی نہیں سکتے۔

کبیر داس نے ان کے آنسو پونچھے۔ تم گھبراؤ نہیں جھابڑ مل جی۔ اسے عدالت سے ٹھیک کروں گا، جاتی کہاں ہے۔

جھابڑ مل نے دانت نکال کرکہا ''اب تو آپ ہی کا بھروسہ ہے۔''

برادری کے بڑے پنچ نے یہ الفاظ محض عتاب میں نہ کہے تھے۔ انھوں نے جلدی ہی عملی کارروائی شروع کردی اور قانون نے ان کے حق میں فیصلہ کردیا۔ ریوتی نابالغ تھی اور یتیم ایسی حالت میں پنچوں کو اس کی نگرانی اور حفاظت کا استحقاق تھا۔ وہ برادری کی لونڈی بن کرنہیں رہنا چاہتی نہ چاہے، اس کی سنتا کون ہے، قانون برادری کے حقوق کو کیونکر پامال کرسکتا ہے۔

سنت لال نے یہ ماجرا سنا تو غصہ ضعیف کے عالم میں دانت پیس کر بولے ''یہ برادری نہ جانے کب جہنم میں جائے گی''، ریوتی نے تیوریاں چڑھا کر کہا تو کیا برادری مجھے جبرا اپنی حمایت میں لے سکتی ہے۔''

''ہاں بیٹی جس کے ہاتھ میں روپے ہیں اسی کے ہاتھ میں قانون بھی ہے۔''

''میں صاف کہہ دوں گی، میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔''

''تیرے کہنے سے کچھ نہ ہوگا، تیری تقدیر میں یہی لکھا ہے تو اس کا کیا علاج۔ ایسی برادری میں پیدا ہونے کی یہی سزاہے''ایک لمحہ کے بعد وہ کھڑا ہوکر بولا۔

''میں جاتا ہوں سیٹھ کبیر داس کے پاس''

''نہیں ماما جی! تم کہیں نہ جاؤ جب بھاگ کا ہی بھروسہ ہے تو جو کچھ بھاگ میں ہوگا۔''

رات تو ریوتی نے کروٹیں بدل کر اور رو کر کاٹی، بار بار نیند کی آغوش میں سوئے ہوئے پیارے بھائی کو گلے لگاتی اور روتی، یہ اناتھ اکیلے کیسے رہے گا۔ یہ سوچ کر اس کا دل کمزور ہوجاتا، مگر جھابڑ مل کی وہ منحوس صورت یاد کر کے اس کا عزم پھر قوی ہوجاتا۔

علی الصباح ریوتی گوکل اشنان کرنے گئی۔ ادھرکئی مہینوں سے اس کا یہ روز کا معمول تھا۔ آج ذرا اندھیرا تھا، پر یہ کوئی کھٹکے والی بات نہ تھی، شبہ تو جب ہوا جب آٹھ بج گئے اور وہ لوٹ کر نہ آئی۔ تیسرے پہر تک ساری برادری میں خبر پھیل گئی سیٹھ رام ناتھ کی کنیا گنگا میں ڈوب گئی۔'' اس کی لاش معائنہ کے لیے پولیس اٹھا لے گئی۔

کبیر داس بولے ''چلو جھگڑا پاک ہوا۔ برادری کی بدنامی تو نہ ہوگی۔''

جھابڑ مل نے مایوسانہ انداز سے کہا ''میں تو لٹ گیا سیٹھ جی، میرے لیے اب کوئی اور راستہ نکالیے۔''

ادھر موہن سر پیٹ پیٹ کر رو رہا تھا۔ اور بڑھیا اسے سمجھا رہی تھی ''بیٹا اس دیوی کے لیے کیوں روتے ہو، زندگی میں اس کے لیے کون سا سکھ تھا۔ اب وہ اپنی ماں کی گود میں آرام کر رہی ہے۔ ان پنچوں کا ستیا ناس جائے میری لاڈلی کی جان ہی لے کر چھوڑی۔''

موہن معصومانہ سادگی سے بولا ''یہ لوگ جیا کو کیوں اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے اور میری خبر کیوں نہیں لیتے، میری پڑھائی کا کیوں انتظام نہیں کرتے۔''

بڑھیا نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اور پیار سے بولی۔ ''تم میری آنکھوں کے تارے ہو بیٹا!''

یہ قصہ پہلی بار ہندی کے مجموعہ پریرنا میں جنوری 1932 میں شائع ہوا۔ عنوان تھا۔ مرتک بھوج۔ یہ مانسروور نمبر 4 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ مجموعہ زاد راہ میں شامل ہے۔

راجیہ بھکت

سندھیا کا سمے تھا۔ لکھنؤ کے باشادہ ناصرالدین اپنے مصاحبوں اور درباریوں کے ساتھ باغ کی سیر کر رہے تھے۔ ان کے سر پر رتن جٹت مکٹ کی جگہ انگریزی ٹوپی تھی۔ وستر بھی انگریزی ہی تھے۔ مصاحبوں میں پانچ انگریز تھے۔ ان میں سے ایک کے کندھے پر سر رکھ کر بادشاہ چل رہے تھے۔ تین چار ہندوستانی بھی تھے۔ ان میں سے ایک راجا بختاور سنگھ تھے وہ بادشاہی سینا کے ادھیکش تھے۔ انھیں سب لوگ جنرل کہا کرتے تھے۔ وہ ادھیڑ آدمی تھے۔ شریر خوب گٹھا ہوا تھا۔ لکھنوی پہناوا ان پر بہت سجتا تھا۔ مکھ سے وچار شیلتا جھلک رہی تھی۔ دوسرے مہاشے کا نام روشن الدولہ تھا۔ یہ راجیہ کے پردھان منتری تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں اور ناٹا ڈیل تھا۔ جسے اونچا کرنے کے لیے وہ تن کر چلتے تھے۔ نیتروں سے گرو ٹپک رہا تھا۔ شیش لوگوں میں ایک کوتوال تھا اور دو بادشاہ کے رکھچک۔ یدّپی ابھی ۱۹ویں شتابدی کا آرمبھ ہی تھا پر بادشاہ نے انگریزی رہن سہن اختیار کر لی تھی۔ بھوجن بھی پرایہ انگریزی ہی کرتے تھے۔ انگریزوں پر ان کا اسیم وشواس تھا۔ وہ سدیو ان کا پکش لیا کرتے تھے۔ مجال نہ تھی کہ کوئی بڑے سے بڑا راجا یا کرمچاری کسی انگریز سے برابری کرنے کا ساہس کر سکے۔

اگر کسی میں یہ ہمت تھی تو وہ راجا بختاور سنگھ تھے۔ ان سے کمپنی کا بڑھتا ہوا اُدھیکار نہ دیکھا جاتا تھا۔ کمپنی کی اس سینا کی سنکھیا جو اس نے اودھ کے راجیہ کی

رکھچھا کے لیے لکھنؤ میں نیوکت کی تھی، دن دن بڑھتی جاتی تھی۔ اسی پرینام سے سینا کا ویے بھی بڑھ رہا تھا۔ راج دربار اسے چکا نہ سکنے کے کارن کمپنی کا رنی ہوتا جاتا تھا۔ بادشاہی سینا کی دشا ہین سے ہین تر ہوتی جاتی تھی۔ اس میں نہ سنگٹھن تھا نہ بل۔ برسوں تک سپاہیوں کا ویتن نہ ملتا تھا۔ ششتر سبھی پرانے تھے۔ وردی پھٹی ہوئی۔ قوائد کا نام نہیں۔ کوئی ان کا پوچھنے والا نہ تھا۔ اگر راجا بختاور سنگھ ویتن وِردھی یا نئے ششتروں کے سمبندھ میں کوئی پریتن کرتے تو کمپنی کا ریزیڈنٹ اس کا گھور ورودھ اور راجیہ پر وِدّروہ آتمک شکتی سنچار کا دوشاروپن کرتا تھا۔ ادھر سے ڈانٹ پڑتی تو بادشاہ اپنا غصہ راجا صاحب پر اتارتے۔ بادشاہ کے سبھی انگریز مصاحب راجا صاحب سے شنکت رہتے۔ اور ان کی جڑ کھودنے کا پریاس کیا کرتے تھے۔ پر وہ راجیہ کا سیوک ایک اُور اوہیلنا اور دوسری اُور سے گھور وِرودھ سہتے ہوئے بھی اپنے کرتویہ کا پالن کرتا جاتا تھا۔ مزا یہ کہ سینا بھی ان سے سنتشٹ نہ تھی۔ سینا میں ادھیکانش لکھنؤ کے شوہدے اور غنڈے بھرے ہوئے تھے۔ راجا صاحب جب انھیں ہٹا کر اچھے اچھے جوانوں کی بھرتی کرنے کی چیشٹا کرتے تو ساری سینا میں ہاہاکار مچ جاتا۔ لوگوں کو شنکا ہوتی کہ یہ راجپوتوں کی سینا بنا کر کہیں راجیہ ہی پر تو ہاتھ نہیں بڑھانا چاہتے؟ اس لیے مسلمان بھی ان سے بدگمان رہتے تھے۔ راجاصاحب کے من میں بار بار پریرنا ہوتی کہ اس پد کو تیاگ کر چلے جائیں۔ پر یہ بھئے انھیں روکتا تھا کہ میرے ہٹتے ہی انگریزوں کی بن آئے گی اور بادشاہ ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن جائیں گے۔ رہی سہی سینا کے ہاتھ اودھ راجیہ کا استتو بھی مٹ جائے گا۔ اَت اَیو اتنی کٹھنائیوں کے ہوتے ہوئے بھی چاروں اُور بیر وَرودھ سے گھرے ہونے پر بھی، وہ اپنے پد سے ہٹنے کا نشچے نہ کر سکتے تھے۔ سب سے کٹھن سمسیہ یہ تھی کہ روشن الدولہ بھی راجا صاحب سے خار کھاتا تھا۔ اسے سدیو شنکا رہتی کہ یہ مراٹھوں سے میتری کر کے اودھ راجیہ کو مٹانا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ راجا صاحب کے پرتیک کاریہ میں بادھا ڈالتا رہتا تھا۔ اسے اب بھی آشا تھی کہ اودھ کا مسلمانی راجیہ اگر جیوِت رہ سکتا ہے۔ تو انگریزوں کے سن رکھچھن میں، انیتھا وہ اوشیہ ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی شکتی کا گراس بن جائے گا۔

واستو میں بختاور سنگھ کی دشا اتینت کرون تھی۔ وہ اپنی چترائی سے جہاں کی بھانتی دانتوں کے بیچ میں پڑے ہوئے اپنا کام کیے جاتے تھے۔ یوں تو وہ سوابھاؤ کے اکھڑ تھے۔ اپنا کام نکالنے کے لیے مدھرتا اور مرولتا، شیل اور وینے کا آواہن کرتے رہتے تھے۔ اس سے ان کے ویوہار میں کری نرمتا آجاتی تھی۔ اور وہ شتروؤں کو ان کی اُور سے اور بھی سشنک بنا دیتی تھی۔

باشادہ نے ایک انگریز مصاحب سے پوچھا۔ تم کو معلوم ہے میں متھاری کتنی خاطر کرتا ہوں؟ میری سلطنت میں کسی کی مجال نہیں کہ وہ کسی انگریز کو کڑی نگاہوں سے دیکھ سکے۔

انگریز مصاحب نے سر جھکا کر کہا۔ ہم حضور کی اس مہربانی کو کبھی نہیں بھول سکتے۔

بادشاہ۔ امام حسینؓ کی قسم، اگر یہاں کوئی آدمی تمھیں تکلیف دے، تو میں اسے فوراً زندہ دیوار میں چنوا دوں۔

بادشاہ کی عادت تھی کہ وہ بھودھا اپنی انگریزی ٹوپی ہات ہمیں لے کر اسے انگلی پر نچانے لگتے تھے۔ روز روز نچاتے نچاتے ٹوپی میں انگلی کا گھر ہو گیا تھا۔ اس سمے جو انھو ں نے ٹوپی اٹھا کر انگلی پر رکھی تو ٹوپی میں چھید ہوگیا۔ بادشاہ کا دھیان انگریزوں کی طرف تھا۔ بختاور سنگھ بادشاہ کے منہ سے ایسی بات سن کر کباب ہوئے جاتے تھے۔ اُکت کتھن میں کتنی خوشامد، کتنی نیچتا اور اودھ کی پرجا تتھا راجوں کا کتنا اپمان تھا اور لوگ تو ٹوپی کا چھید دیکھ کر ہنسنے لگے۔ پر راجا بختاور سنگھ نے منہ سے انیاس نکل گیا۔ حضور، تاج میں سوراخ ہو گیا۔

راجا صاحب کے شتروؤں (دشمنوں) نے تُرنت کانوں پر انگلیاں رکھ لیں۔ بادشاہ کو بھی ایسا معلوم ہوا کہ راجا نے مجھ پر وینگ (طنز) کیا ہے۔ ان کے تیور بدل گئے۔ انگریزوں اور اَنیہ سبھا سدوں نے اس پرکار کانا پھوسی شروع کی، جیسے کوئی مہان (بڑا) انرتھ ہو گیا ہو۔ راجا صاحب کے منہ سے انرگل (بے ہودہ) شبد اوشیہ نکلے۔ اس میں کوئی سندیہہ نہیں تھا۔ سمبھو (ممکن) ہے۔ انھوں نے جان بوجھ کر وینگ نہ کیا ہو۔ ان کے دُکھی ہردے نے سادھارن (معمولی) چے تاونی کو یہ تیور

(تیز) روپ دے دیا۔ پر بات بگڑ ضرور گئی تھی۔ اب ان کے شترو انھیں کچلنے کے ایسے سندر اوسر (موقع) کو ہاتھ سے کیوں جانے دیتے؟

راجا صاحب نے سبھا کا یہ رنگ دیکھا، تو خون سرد ہوگیا۔ سمجھ گئے آج شترووٴں کے پنجے میں پھنس گیا اور ایسا بُرا پھنسا کہ بھگوان ہی نکالے، تو نکل سکتا ہوں۔

بادشاہ نے کوتوال سے لال آنکھیں کر کے کہا۔ اس نمک حرام کو قید کر لو اور اسی وقت اس کا سر اُڑا دو۔ اسے معلوم ہو جائے کہ بادشاہوں سے بے ادبی کرنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔

کوتوال کو سہسا (آسانی سے) جنرل پر ہاتھ بڑھانے کی ہمت نہ پڑی روشن الدولہ نے اس سے اشارے سے کہا۔ کھڑے سوچتے کیا ہو، پکڑ لو نہیں تو تم بھی اسی آگ میں جل جاوٴ گے۔ تب کوتوال نے آگے بڑھ کر بختاور سنگھ کو گرفتار کر لیا۔ ایک چھن (پل) میں ان کی مشکیں کس دی گئیں۔ لوگ انھیں چاروں اُور سے گھیر کر قتل کرنے لے چلے۔

بادشاہ نے مصاحبوں سے کہا۔ میں بھی وہیں چلتا ہوں ذرا دیکھوں گا کہ نمک حراموں کی لاش کیوں کر تڑپتی ہے۔

کتنی گھور پشوتا تھی! یہی پران ذرا دیر پہلے بادشاہ کا وشواس پاتر تھا۔

یکا یک بادشاہ نے کہا۔ پہلے اس نمک حرام کی خلعت (بادشاہ کے دیے ہوئے کپڑے) اُتار لو۔ میں نہیں چاہتا کہ میر خلعت کی بے عزتی ہو۔

کس کی مجال تھی، جو ذرا بھی زبان ہلا سکے۔ سپاہیوں نے راجا صاحب کے وستر اُتارنے شروع کیے۔ دُربھاگیہ وَش (بدقسمتی سے) ان کے جیب سے پستول نکل آئی۔ اس کی دونوں نالیاں بھری ہوئی تھیں۔ پستول دیکھتے ہی بادشاہ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ بولے قسم ہے حضرت امام حسینؑ کی، اب اس کی جاں بخشی نہیں کروں گا۔ میرے ساتھ بھری ہوئی پستول کی کیا ضرورت! ضرور اس کی نیت میں فتور تھا اب میں اسے کتوں سے نچواؤں گا۔ (مصاحبوں کی طرف دیکھ کر) دیکھا تم لوگوں نے اس کی نیت! میں اپنی آستین میں سانپ پالے ہوئے تھا۔ آپ لوگوں کے

خیال میں اس کے پاس بھری ہوئی پستول کا نکلنا کیا معنی رکھتا ہے۔

انگریزوں کو کیولٗ راجا صاحب کو نیچا دکھانا منظور تھا۔ وے انھیں اپنا متر بنا کر جتنا کام نکال سکتے تھے۔ اتنا ان کے مارے جانے سے نہیں۔ اسی سے ایک انگریز مصاحب نے کہا۔ مجھے تو اس میں کوئی غیر مناسب بات نہیں معلوم ہوتی۔ جنرل آپ کا باڈی گارڈ (رکشک) ہے۔ اسے ہمیشہ ہتھیار بند رہنا چاہیے۔ خاص کر جب آپ کی خدمت میں ہو۔ نہیں معلوم، کس وقت اس کی ضرورت آپڑے۔

دوسرے انگریز مصاحبوں نے بھی اس وِچار کی پُشٹی کی۔ (تائید کی) بادشاہ کی کرودھ (غصہ) کی جوالہ کچھ شانت ہوئی۔ اگر یہ ہی باتیں کسی ہندوستانی مصاحب کی زبان سے نکلی ہوتیں۔ تو اس کی جان کی خیریت نہ تھی۔ کداچت (شاید) انگریزوں کو اپنی نیائے پرتا کا نمونہ دکھانے ہی کے لیے انھوں نے یہ پرشن کیا تھا۔ بولے! قسم حضرت امام کی، تم سب کے سب شیر کے منہ سے اس کا شکار چھیننا چاہتے ہو! پر میں ایک نہ مانوں گا۔ بلاؤ کپتان صاحب کو! میں ان سے یہی سوال کرتا ہوں۔ اگر انھو ں نے بھی تم لوگوں کے خیال کی تائید کی، تو اس کی جان نہ لوں گا۔ اور اگر ان کی رائے ا سکے خلاف ہوئی تو اس مکّار کو اسی وقت جہنم بھیج دوں گا۔ مگر خبردار، کوئی ان کی طرف کسی طرح کا اشارہ نہ کرے۔ ورنہ میں ذرا بھی رو رعایت نہ کروں گا۔ سب کے سب سر جھکائے بیٹھے رہے۔

کپتان صاحب تھے تو راجا صاحب کے آؤردے، پر ان دنوں بادشاہوں کی ان پر وشیش (خاص) کرپا (مہربانی) تھی۔ وہ ان سچے راج بھکتوں میں تھے۔ جو اپنے کو راجا کا نہی راجیہ کا سیوک سمجھتے ہے۔ وہ دربار سے الگ رہتے تھے بادشاہ ان کے کاموں سے بہت سن تشٹ (مطمئن) تھے۔ ایک آدمی تُرنت کپتان صاحب کو بلایا۔ راجا صاحب کی جان ان کی مٹھی میں تھی۔ روشن الدولہ کو چھوڑ کر ایسا شاید ایک ویکتی بھی نہ تھا جس کا ہردے آشا اور نراشا سے نہ دھڑک رہا ہو۔ سب من میں بھگوان سے یہی پرارتھنا کر رہے تھے کہ کپتان صاحب کسی کسی طرح سے اس سمسیہ (پریشانی) کو سمجھ جائیں۔ کپتان صاحب آئے ار اُڑتی ہوئی درشٹ سے سبھا کی اُور دیکھا۔ سبھی کی آنکھیں نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ انشچت بھاؤ (غیر معین انداز)

سے سر جھکا کر کھڑے ہوگئے۔

بادشاہ نے پوچھا۔ میرے مصاحبوں کو اپنی جیب میں بھری ہوئی پستول رکھنا مناسب ہے یا نہیں؟

درباریوں کی نیروتا، ان کے آشنکت (شک) چہرے اور ان کی چنتائیت ادھیرتا (اضطرابی کیفیت) دیکھ کر کپتان صاحب کو ورتمان (موجودہ) سمسیہ کی کچھ ٹوہ مل گئی۔ وہ نربھیک (نڈر) بھاؤ سے بولے۔ حضور، میرے خیال میں تو یہ ان کا فرض ہے۔ بادشاہ کے دوست دشمن سبھی ہوتے ہیں۔ اگر مصاحب لوگ ان کی رکشا کا بھار نہ لیں گے تو کون لے گا؟ انھیں صرف پستول ہی نہیں اور بھی چھپے ہوئے ہتھیاروں سے لیس رہنا چاہیے۔ نہ جانے کب ہتھیاروں کی ضرورت آپڑے، تو وہ عین وقت پر کہاں دوڑے پھریں گے؟

راجا صاحب کے جیون کے دن باقی تھے۔ بادشاہ نے نراش ہو کر کہا۔ روشن، اسے قتل مت کرنا۔ کال کوٹھری میں قید کردو۔ مجھ سے پوچھے بغیر اسے دانا پانی کچھ نہ دیا جائے۔ جاکر اس کے گھر کا سارا مال اسباب ضبط کرلو اور سارے خاندان کو جیل میں بند کردو۔ اس کے مکان کی دیواریں زمین دوز کرا دینا۔ گھر میں ایک پھوٹی ہانڈی بھی نہ رہنے پائے۔

اس سے تو یہی کہیں اچھا تھا کہ راجا صاحب ہی کی جان جاتی۔ خاندان کی بے عزتی تو نہ ہوتی۔ مہلاؤں کا اپمان تو نہ ہوتا۔ دَرِدْرتا (غریبی) کی چوٹیں تو نہ سہنی پڑتی۔ وکار (تکالیف) کو نکلنے کا مارگ نہیں ملتا تو وہ سارے شریر میں پھیل جاتا ہے۔ راجا کے پران تو بچے، پر سارے خاندان کو وپتی میں ڈال کر۔

روشن الدولہ کو منہ مانگی مراد ملی۔ اس کی ایرشیا (حسد) کبھی اتنی سنتشٹ (اطمینان) نہ ہوئی تھی۔ وہ مگن تھا کہ آج وہ کانٹا نکل گیا۔ جو برسوں سے ہردے میں چھپا ہوا تھا۔ آج ہندو راجیہ کا انت ہوا۔ اب میرا سکّہ چلے گا۔ اب میں سمست راجیہ کا دوھاتا ہوں گا۔ سندھیا سے پہلے ہی راجا صاحب کی ساری ستھاور اور جنگم (چل اور اچل) سمپتی قُرق ہوگئی۔ وِردھ ماتا پتا سُکومل رمنیاں (حسین عورتیں) چھوٹے چھوٹے بالک سب کے سب قید کر دیے گئے۔ کتنی کروں (دردناک) دشا

تھی، وے مہلائیں،جن پر کبھی دیوتاؤں کی بھی نگاہ نہ پڑی تھی۔ کھلے منہ ننگے۔پیر، پاؤں گھسٹتی، شہر کی بھری ہوئی سڑکوں اور گلیوں سے ہوتی ہوئی، سر جھکائے، شوک چتروں کی بھانتی۔ جیل کی طرف چلی جاتی تھیں۔ سشستر (ہتھیار بند) سپاہیوں کا ایک بڑا دل ساتھ تھا۔ جس پُرش کے ایک اشارے پر کئی گھنٹے پہلے سارے شہر میں بل چل مچ جاتی، اسی کے خاندان کی یہ دُر دشا!

(۲)

راجا بختاور سنگھ کو بندی ‌گرہ (جیل) میں رہتے ہوئے ایک ماس بیت گیا۔ وہاں انھیں سبھی پرکار کے کشٹ دیے جاتے تھے، یہاں تک کی بھوجن بھی یتھا سے نہ ملتا تھا۔ ان کے پریوار کو بھی اَسہہ (جو سہا نہ جا سکے) یاتنائیں دی جاتی تھیں۔ لیکن راجا صاحب کو بندی ‌گرہ میں ایک پرکار کی شانتی کا انوبھو ہوتا تھا۔ وہاں پرتی چھن (ہر لمحہ) یہ کھٹکا تو نہ رہتا تھا کہ بادشاہ میری کسی بات سے ناراض نہ ہو جائیں۔ مصاحب لوگ کہیں میری شکایت تو نہیں کر رہے ہیں۔ شاریرک کشٹوں کا سہنا اُتنا کٹھن نہیں۔ جتنا کہ مانسک کشٹوں کا۔ یہاں سب تکلیفیں تھیں۔ پر سر پر تلوار تو نہیں لٹک رہی تھی۔ انھوں نے من میں نشچے کیا کہ اب چاہے بادشاہ مجھے مُکت بھی کردیں مگر میں راج کاج سے الگ ہی رہوں گا۔ اس راجیہ کا سوریہ است ہونے والا ہے۔ کوئی مانوی شکتی اسے وِناش دشا میں لین ہونے سے نہیں روک سکتی یہ اسی پتن کے لکشن ہیں۔ نہیں تو کیا میری راج بھکتی کا یہی پُرسکار ملنا چاہیے تھا؟ میں نے اب تک کتنی کٹھنائیوں سے راجیہ کی رکشا کی ہے۔ یہ بھگوان ہی جانتے ہیں۔ ایک اُور تو بادشاہ کی نر نکشتا، دوسری اُور بلوان اور یُکتی۔ سمپن شترووُں کی کوٹ نیتی اس شلا اور بھنور کے بیچ میں راجیہ کی نوکا کو چلاتے رہنا کتنا کشٹ سادھیہ (تکلیف دہ) تھا۔ شاید ہی ایسا کوئی دن گزرا ہوگا۔ جس دن میرا چت (دل) پران شنکا سے آندولِت نہ ہوا ہو۔ اس سیوا بھکتی اور تلّینتا (عقیدت سے منہمک رہنا) کا یہ پُرسکار ہے میرے منہ سے وینگ (طنز) شبد اوشیہ نکلے، لیکن ان کے لیے اتنا کٹھور دنڈ؟ اس سے تو یہ کہیں اچھا تھا کہ میں قتل کر دیا گیا ہوتا۔ اپنی آنکھوں سے

اپنے پریوار کی یہ دُرگتی تو نہ دیکھتا؟ سنتا ہوں پتاجی کو سونے کے لیے چٹائی نہیں دی گئی ہے، نہ جانے استریوں پر کیسے کیسے اتیاچار ہو رہے ہوں گے۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ پیاری سکھدا انت تک اپنے ستیوا (عصمت) کی رکچھا کرے گی۔ اینتھا پران تیاگ دے گی۔ مجھے بیڑیوں کی پرواہ نہیں۔ پرسُنتا ہوں لڑکوں کے پیروں میں بھی بیڑیاں ڈالی گئی ہیں۔ یہ سب اسی کُٹِل (بدمعاش) روشن الدولہ کی شرارت ہے۔ جس کا جی چاہے اس سمے ستالے، کُچل لے مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ بھگوان سے یہی پرارتھنا ہے کہ اب سنسار سے اُٹھالے۔ مجھے اپنے جیون میں جو کچھ کرنا تھا کرچکا اور اس کا خوب پھل پا چکا۔ میرے جیسے آدمی کے لیے سنسار میں استھان نہیں ہے۔

راجا انھیں وچاروں میں ڈوبے تھے۔ سہسا (اچانک) انھیں اپنی کال کوٹھری کی اُور کسی کے آنے کی آہٹ ملی۔ رات بہت جا چکی تھی۔ چاروں اُور سناٹا چھایا تھا۔ اور اس اندھکارمے سناٹے میں کسی کے پیروں کی چاپ اسپشٹ سنائی دیتی تھی۔ کوئی بہت پاؤ دبا دبا کر چلا آرہا تھا۔ راجا صاحب کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ ہم نہہ شستر (بغیر ہتھیار کے) اور پر تِکار کے لیے اسمرتھ ہونے پر بھی بیٹھے بیٹھے واروں کا نشانہ نہیں بنا چاہتے۔ کھڑے ہو جانا آتم رکچھا کا انتم پرتیں ہے۔ کوٹھری میں ایسی کوئی وستو نہ تھی جس سے وہ اپنی رکشا کر سکتے۔ سمجھ گئے انتم سمے آگیا شتروؤں نے اس طرح میرے پران لینے کی ٹھانی ہے۔ اچھا ہے۔ جیون کے ساتھ اس وپتی کا بھی انت ہوجائے گا۔

ایک چھن میں ان کے سمکھ ایک آدمی آکر کھڑا ہو گیا۔ راجا صاحب نے پوچھا۔ کون ہے

اُتر ملا۔ میں ہوں آپ کا سیوک۔

راجا او۔ ہو، تم ہو کپتان! میں شنکا میں پڑا ہوا تھا کہ کہیں شتروؤں نے میرا ودھ (قتل) کرنے کے لیے کوئی دوت نہ بھیجا ہو!

کپتان۔ شتروؤں نے کچھ اور ہی ٹھانی ہے۔ آج بادشاہ سلامت کی جان بچتی نہیں نظر آتی۔

راجا ارے! یہ کیوں کر۔

کپتان۔ جب سے آپ کو یہاں نظر بند کیا گیا ہے۔ سارے راجیہ میں ہاہاکار مچا ہوا ہے۔ سوارتھی (خود غرض) کرم چاریوں نے لوٹ مچا رکھی ہے۔ انگریزوں کی خدائی پھر رہی ہے۔ جو جی میں آتا ہے کرتے ہیں کسی کو مجال نہیں کہ چوں کر سکیں۔ اس ایک مہینے میں شہر کے سینکڑوں بڑے بڑے رئیس مٹ گئے روشن الدولہ کی بادشاہی ہے۔ بازاروں کا بھاؤ چڑھتا جاتا ہے۔ باہر سے ویاپاری لوگ ڈر کے مارے کوئی چیز ہی نہیں لاتے۔ دوکانداروں سے منمانی رقمیں محصول کے نام پر وصول کی جارہی ہے۔غلّے کا بھاؤ اتنا چڑھ گیا ہے کہ کتنے ہی گھروں میں چولہا جلنے کی نوبت نہیں آتی۔ سپاہیوں کو ابھی تک تنخواہ نہیں ملی۔ وے جاکر دکانداروں کو لوٹے ہیں سارے راجیہ میں بدامنی ہو رہی ہے۔ میں نے کئی بار یہ کیفیت بادشاہ سلامت کے کانوں تک پہنچانے کی کوشش کی، مگر وہ یہ تو کہہ دیتے ہیں کہ میں اس کی تحقیقات کردں گا اور پھر بے خبر ہو جاتے ہیں۔ آج شہر کے بہت سے دوکاندار فریاد لے کر آئے تھے کہ ہمارے حال پر نگاہ نہ کی گئی تو ہم شہر چھوڑکر کہیں اور چلے جائیں گے۔ ․کرستانوں نے ان کو سخت کہا۔ دھمکایا لیکن انھوں نے جب تک اپنی ساری مصیبت نہ بیان کرلی۔ وہاں سے نہ ہٹے۔ آخر بادشاہ سلامت نے ان کو دلاسا دیا تو چلے گئے۔

راجا۔ بادشاہ پر اتنا اثر ہوا۔ مجھے تو یہی تعجب ہے۔

کپتان۔ اثر وثر کچھ نہیں ہوا یہ بھی ان کی ایک دل لگی ہے۔ شام کو خاص مصاجوں کو بلا کر حکم دیا کہ آج میں بھیس بدل کر گشت کروں گا، تم لوگ بھی بھیس بدلے ہوئے میرے ساتھ رہنا میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ رعایا کیوں اتنی گھبرائی ہوئی ہے۔ سب لوگ مجھ سے دور رہیں، کسی کو نہ معلوم ہو کہ میں کون ہوں۔ روشن الدولہ اور پانچوں انگریز مصاحب ساتھ رہیں گے۔

راجا۔ تمھیں کیوں کر یہ بات معلوم ہوگئی؟

کپتان۔ میں نے اسی انگریز حجام کو ملا رکھا ہے دربار میں جو کچھ ہوتا ہے اس کا پتہ مجھے مل جاتا ہے۔ اسی کی سفارش سے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا

موقع ملا (گھڑیال میں ۱۰ بجے ہیں) ۱۱ بجے چلنے کی تیاری ہے۔ بارہ بجتے بجتے لکھنؤ کا تخت خالی ہوجائے گا۔

راجا۔ (گھبرا کر) کیا ان سبھوں نے انھیں قتل کرنے کی سازش کر رکھی ہے؟

کپتان۔ جی نہیں، قتل کرنے سے ان کا منشا پورا نہ ہوگا۔ بادشاہ کو بازار کی سیر کراتے ہوئے گومتی کی طرف لے جائیں گے۔ وہاں انگریز سپاہیوں کا ایک دستہ تیار رہے گا۔ وہ بادشاہ کو فوراً ایک گاڑی پر بٹھا کر ریجڈنسی میں لے جائے گا۔ وہاں ریجڈنٹ صاحب بادشاہ سلامت کی سلطنت سے استعفا دینے پر مجبور کریں گے۔ اسی وقت ان سے استعفا لکھا لیا جائے گا اور اس کے بعد راتوں رات انھیں کلکتہ بھیج دیا جائیگا۔

راجا۔ بڑا غضب ہوگیا۔ اب تو وقت بہت کم ہے، بادشاہ سلامت نکل پڑے ہوں گے؟

کپتان۔ غضب کیا ہوگیا؟ ان کی ذات سے کسے آرام تھا۔ دوسری حکومت چاہے کتنی ہی خراب ہو۔ اس سے اچھی ہی ہوگی۔

راجا۔ انگریز کی حکومت ہوگی؟

کپتان۔ انگریز ان سے کہیں بہتر انتظام کریں گے۔

راجا۔ (کروں سُور سے)۔ کپتان! ایشور کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ تم نے مجھ سے ذرا دیر پہلے کیوں نہ یہ کیفیت بیان کی؟

کپتان۔ (آشچریہ سے) آپ کے ساتھ تو بادشاہ نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔

راجا میرے ساتھ کتنا ہی بُرا سلوک کیا ہو۔ لیکن ایک راجیہ کی قیمت ایک آدمی یا ایک خاندان کی جان سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ تم میرے پیروں کی بیڑیاں کھولوا سکتے ہو؟

کپتان۔ سارے اودھ راجیہ میں ایک بھی ایسا آدمی نہ نکلے گا۔ جو بادشاہ کو سچے دل سے دعا دیتا ہو۔ دنیا ان کے ظلم سے تنگ آگئی ہے۔

راجا۔ میں اپنوں کے ظلم کو غیروں کی بندگی سے کہیں بہتر خیال کرتا ہوں۔ بادشاہ کی یہ حالت غیروں ہی کے بھروسے پر ہوئی ہے۔ وہ اسی لیے کسی کی پرواہ

نہیں کرتے۔ کہ انگریزوں کی مدد کا یقین ہے۔ میں ان فرنگیوں کی چالوں کو غور سے دیکھتا آیا ہوں۔ بادشاہ کے مزاج کو انھوں نے بگاڑا ہے۔ ان کی منشا یہی تھی جو ہوا۔ رعایا کے دل سے بادشاہ کی عزت اور محبت اُٹھ گئی۔ آج سارا ملک بغاوت کرنے پر آمادہ ہے، یہ لوگ اسی موقع کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ جانتے ہیں کہ بادشاہ کی معزولی (گدّی سے ہٹائے جانے) پر ایک آدمی بھی آنسو نہ بہاوے گا۔ لیکن میں جتائے دیتا ہوں کہ اگر اس وقت تم نے بادشاہ کو دشمنوں کے ہاتھوں سے نہ بچایا تو تم ہمیشہ کے لیے اپنے ہی وطن میں غلامی کی زنجیروں میں بندھ جاؤ گے کسی غیر قوم کے چاکر بن کر اگر تمھیں عافیت بھی ملی، تو وہ عافیت نہ ہوگی۔ موت ہوگی۔ غیروں کے بے رحم پیروں کے نیچے پڑ کر تم ہاتھ بھی نہ ہلا سکوگے۔ اور یہ امید کہ کبھی ہمارے ملک میں آئینی سلطنت (ویدھ شاسن) قائم ہوگی۔ حسرت کا داغ بن کر رہ جائے گی؟ نہیں۔ مجھ میں ابھی ملک کی محبت باقی ہے۔ میں ابھی اتنا بے جان نہیں ہوا ہوں۔ میں اتنی آسانی سے سلطنت کو ہاتھ سے نہ جانے دوں گا۔ اپنے کو اتنے سستے داموں غیر کے ہاتھوں نہ بیچوں گا ملک کی عزت کو نہ مٹنے دوں گا۔ چاہے اس کوشش میں میری جان ہی کیوں نہ جائے۔ کچھ اور نہیں کر سکتا، تو اپنی جان تو دے ہی سکتا ہوں۔ میری بیڑیاں کھول دو۔

کپتان۔ میں آپ کا خادم ہوں۔ مگر مجھے یہ مجاز نہیں ہے۔

راجا۔ (جوش میں آکر) ظالم یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ ایک ایک پل ہمیں تباہی کی طرف لیے جا رہا ہے۔ کھول دے یہ بیڑیاں جس گھر میں آگ لگی ہے۔ اس کے آدمی خدا کو نہیں یاد کرتے، کنوئیں کی طرف دوڑتے ہیں۔

کپتان۔ آپ میرے محسن ہیں۔ آپ کے حکم سے منہ نہیں موڑ سکتا لیکن!

راجا۔ جلدی کرو جلدی۔ اپنی تلوار مجھے دے دو۔ اب ان تکلف کی باتوں کا موقع نہیں ہے۔

کپتان صاحب نِرُتّر (لاجواب) ہوگئے۔ بجیو اُتساہ میں بڑی سنکرامک شکتی ہوتی ہے۔ یدّپی راجا صاحب کے نیتی پورن وارتالاپ نے انھیں ماقول نہیں کیا۔ تتھاپی وہ انیواریہ روپ سے ان کی بیڑیاں کھولنے پر تتپر ہوگئے۔ اسی وقت جیل کے داروغہ کو

بلا کر کہا۔ صاحب نے حکم دیا ہے کہ راجا صاحب کو فوراً آزاد کر دیا جائے۔ اس میں ایک پل کی بھی تاخیر (وِلمب) ہوئی تو تمھارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

داروغہ کو معلوم تھا کہ کپتان صاحب اور جناب..........میں گاڑھی میتری ہے۔ اگرصاحب ناراض ہوجائیں گے، تو روشن الدولہ کی کوئی سفارش میری رکچھا نہ کر سکے گی۔ اس نے راجا صاحب کی بیڑیاں کھول دیں۔

راجا صاحب جب تلوار ہاتھ میں لے کر جیل سے نکلے تو ان کا ہردے راجیہ بھکتی کی ترنگوں سے آندولت ہو رہا تھا۔ اسی وقت گھڑیال نے ۱۱ بجائے۔

آدھی رات کا سمے تھا مگر لکھنؤ کی تنگ گلیوں میں خوب چہل پہل تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھاکہ ابھی نو بجے ہوں گے۔ صرافہ میں سب سے زیادہ رونق تھی۔ مگر آشچریہ یہ تھا کہ کسی دوکان پر جوہرات یا گہنے نہیں دکھائی دیتے تھے۔ کیول آدمیوں کے آنے جانے کی بھیڑ تھی۔ جسے دیکھو، پانچوں شستروں سے سو سجت مونچھیں کھڑی کیے اینٹھتا ہوا چلا جاتا تھا۔ بازار کے معمولی دُکان دار بھی نِہہ شستر نہ تھے۔

سہسا (اچانک) ایک آدمی بھاری صافہ باندھے، پیر کی گھٹنیوں تک نیچی قبا پہنے، کمر میں پٹکہ باندھے۔ آکر ایک صراف کی دُکان پر کھڑا ہو گیا۔ جان پڑتا تھا کوئی ایرانی سوداگر ہے۔ اُن دنوں ایران کے دیاپاری لکھنؤ میں بہت آتے جاتے تھے۔ اس سمے ایسے آدمی کا آجانا اَسادھارن بات نہ تھی۔

صراف کا نام مادھو داس تھا۔ بولا۔ کہیے میر صاحب کچھ دکھاؤں؟

سوداگر۔ سونے کا کیا نرخ ہے؟

مادھو۔ (سوداگر کے کان کے پاس منہ لے جاکر) نرخ کی کچھ نہ پوچھیے آج قریب ایک مہینہ سے بازار کا نرخ بگڑا ہوا ہے۔ مال بازار میں آتا ہی نہیں لوگ دبائے ہوئے ہیں۔ بازار میں خوف کے مارے نہیں لاتے۔ اگر آپ کو زیادہ مال درکار ہو تو میرے ساتھ غریب خانے تک تکلیف کیجیے۔ جیسا مال چاہیے لیجیے۔ نرخ مناسب ہی ہوگا۔ اس کا اطمینان رکھیے۔

سوداگر۔ آج کل بازار کا نرخ کیوں بگڑا ہوا ہے؟

مادھو۔ کیا آپ حال ہی میں وارد ہوئے ہیں؟

سوداگر۔ ہاں، میں آج ہی آیا ہوں۔ کہیں پہلے کی سی رونق نہیں نظر آتی۔ کپڑے کا بازار بھی سُست تھا۔ ڈھاکے کا ایک قیمتی تھان بہت تلاش کرنے پر بھی نہ ملا۔

مادھو۔ اس کے بڑے قصے ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔

سوداگر۔ ڈاکوؤں کا زور تو نہیں ہے؟ پہلے تو یہاں اس قسم کی وارداتیں نہ ہوتی تھیں۔

مادھو۔ اب وہ کیفیت نہیں ہے، دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں۔ انھیں کوتوال کیا، بادشاہ سلامت بھی گرفتار نہیں کر سکتے۔ اب اور کیا کہوں، دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں کہیں کوئی سُن لے تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔

سوداگر۔ سیٹھ جی آپ تو پہیلیاں بجھوانے لگے۔ میں پردیسی آدمی ہوں۔ یہاں کس سے کہنے جاؤں گا۔ آخر بات کیا ہے؟ بازار کیوں اتنا بگڑا ہوا ہے؟ اناج کی منڈی کی طرف گیا تھا۔ سنّاٹا چھایا ہوا ہے۔ موٹی جنس بھی دونے داموں پر بک رہی تھی۔

مادھو۔ (اِدھر اُدھر چوکنّی آنکھوں سے دیکھ کر) ایک مہینہ ہوا روشن الدولہ کے ہاتھ میں سیاہ سفید کا اختیار آگیا ہے۔ یہ سب انھیں کی بدانتظامی کا پھل ہے۔ ان کے پہلے راجا بختاور سنگھ ہمارے مالک تھے۔ ان کے وقت میں کسی کی مجال نہ تھی کہ دیاپاریوں کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ سکے۔ ان کا رعب سبھی پر چھایا ہوا تھا۔ فرنگیوں پر ان کی کڑی نگاہ رہتی تھی۔ حکم تھا کہ کوئی فرنگی بازار میں آوے تو تھانے کا سپاہی ان کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ اسی وجہ سے فرنگی ان سے جلا کرتے تھے۔ آخر سبھوں نے روشن الدولہ کو ملا کر بختاور سنگھ کو بے قصور قید کرا دیا۔ بس تب سے بازار میں لوٹ مچی ہوئی ہے۔ سرکاری عملے الگ لوٹتے ہیں۔ فرنگی الگ نوچتے کھسوٹتے ہیں۔ جو چیز چاہتے ہیں اٹھا لے جاتے ہیں۔ دام مانگو تو دھمکیاں دیتے ہیں۔ شاہی دربار میں فریاد کرو، تو الٹے سزا ہوتی ہے۔ ابھی حال ہی میں ہم سب مل کر بادشاہ سلامت کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ پہلے تو وہ بہت ناراض ہوئے پر آخر رحم آگیا۔ بادشاہوں کا مزاج ہی تو ہے۔ ہماری سب شکایتیں سنی اور تسکین دی کہ ہم تحقیقات

کریں گے۔ مگر ابھی تک وہی لوٹ کھسوٹ جاری ہے۔

اتنے میں تین آدمی راجپوتی ڈھنگ کی مرزئی پہنے آکر دکان کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ مادھو داس ان کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر چونکا۔ شاہی فوج کے سپاہی بھدا اسی سج دھج سے نکلتے تھے تینوں آدمی سوداگر کو دیکھ کر ٹھٹھکے پر اس نے انھیں کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ تینوں آگئے چلے گئے۔

تب سوداگر نے مادھو داس سے پوچھا۔ انھیں دیکھ کر تم کیوں چونکے؟

مادھو داس نے کہا۔ یہ فوج کے سپاہی ہیں جب سے راجا بختاور سنگھ نظر بند ہوئے ہیں ان پر کسی کی داب ہی نہیں رہی کھلے سانڈ کی طرح بازاروں میں چکر لگایا کرتے ہیں۔ سرکار سے طلب ملنے کا کچھ ٹھیک تو نہیں ہے۔ سب نوچ کھسوٹ کر کے گزر کرتے ہیں۔ ہاں تو پھر اگر مرضی ہو تو میرے ساتھ گھر تک چلیے، آپ کو مال دکھاؤں۔

سوداگر۔ نہیں بھائی اس وقت نہیں۔ صبح آؤں گا۔ دیر ہو گئی ہے۔ اور مجھے بھی یہاں کی حالت دیکھ کر خوف معلوم ہونے لگا ہے۔

یہ کہہ کر سوداگر اسی طرف چلا گیا۔ جدھر وے تینوں راجپوت گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں تین آدمی اور صرافے میں آئے ایک تو پنڈتوں کی طرح نیچی چکن پہنے ہوئے تھا۔ سر پر گول پگیا تھی اور کندھے پر زری کے کام کا شال۔ اس کے دونوں ساتھی خدمت گاروں کے سے کپڑے پہنے ہوئے۔ تینوں اس طرح ادھر ادھر تاک رہے تھے مانوں کسی کو کھوج رہے ہوں۔ یوں تاکتے ہوئے تینوں آگے چلے گئے۔ ایرانی سوداگر تیور نیتروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا ایک میل چلا گیا۔ وہاں ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ ایک پرانی مسجد بھی تھی۔ سوداگر وہاں ٹھہر گیا۔ یکایک تینوں راج پوت مسجد سے باہر نکل آئے اور بولے۔ حضور تو بہت دیر تک صراف کی دکان پر بیٹھے رہے۔ کیا باتیں ہوئیں۔

سوداگر نے ابھی کچھ جواب نہ دیا تھا کہ پیچھے سے پنڈت اور ان کے دونوں خدمت گار بھی آپہنچے۔ سوداگر نے پنڈت کو دیکھتے ہی بھترسنا پورن (مذمتی انداز) شبدوں میں کہا۔ میاں روشن الدولہ، مجھے اس وقت تمھارے اوپر اتنا غصہ آرہا ہے کہ

تمھیں کتوں سے نچوا دوں۔ نمک حرام کہیں کا۔ دغا باز! تو نے میری سلطنت کو تباہ کر دیا۔ سارا شہر تیرے ظلم کا رونا رو رہا ہے مجھے آج معلوم ہوا کہ تو نے کیوں راجا بختاور سنگھ کو قید کرایا۔ میری عقل پر نہ جانے کیوں پتھر پڑ گئے تھے کہ میں تیری چکنی چپڑی باتوں میں آگیا ایسی نمک حرامی کی تجھے وہ سزا دوں گا کہ دیکھنے والوں کو بھی عبرت (شکچھا) ہو۔ روشن الدولہ نے نربھیکتا (نڈر ہو کر) اُتر دیا۔ آپ میرے بادشاہ ہیں اس لیے آپ کا ادب کرتا ہوں۔ ورنہ اسی وقت اس بدزبانی کا مزا چکھا دیتا۔ خود آپ تو محل میں حسینوں کے ساتھ عیش کیا کرتے ہیں۔ دوسروں کو کیا غرض پڑی ہے کہ سلطنت کی فکر سے دُبلے ہوں؟ خوب، ہم اپنا خون جلائیں اور آپ جشن منائیں ایسے احمق کہیں اور رہتے ہوں گے۔

بادشاہ (کرودھ سے کانپتے ہوئے) جناب ...... میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ اس نمک حرام کو ابھی گولی مار دو۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ اور اسی وقت جاکر اس کی ساری جائداد ضبط کرلو، اس کے خاندان کا ایک بچہ بھی زندہ نہ رہنے پائے۔

روشن۔ جناب میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ اس ملک اور قوم کے دشمن، رعیت کے قاتل اور بدکار آدمی کو فوراً گرفتار کرلو۔ یہ اس قابل نہیں کہ تاج اور تخت کا مالک بنے۔

اتنا سنتے ہی پانچوں انگریز مصاحبوں نے جو بھیس بدلے ہوئے ساتھ تھے۔ بادشادہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور کھینچتے ہوئے گومتی ندی کی طرف لے چلے۔ تب بادشاہ کی آنکھیں کھلیں۔ سمجھ گئے کہ پہلے ہی سے یہ شڈینتر (سازش) رچا گیا تھا۔ ادھر اُدھر دیکھا کوئی آدمی نہیں۔ شور مچانا ویرتھ تھا۔ بادشاہی کا نشا اُتر گیا۔ دُروَیوستھا ہی وہ پرچھا اگنی ہے۔ جو ملمّے اور روغن کو اتار کر منشیہ کا یتھارتھ (اصلی) روپ دکھا دیتی ہے۔ ایسے ہی اوسروں پر وِدت ہوتا ہے کہ مانو ہردے پر کرترم (بناوٹی) بھاؤوں کا کتنا گہرا رنگ چڑھا ہوتا ہے۔ ایک چھن میں بادشاہ کی اُدّنڈتا اور گھمنڈ نے ویئتا اور وِنئے شیلتا کا آشرے لیا۔ بولے میں نے تو آپ لوگوں کی مرضی کے

خلاف ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ جس کی یہ سزا ملے۔ میں نے آپ لوگوں کو ہمیشہ اپنا دوست سمجھا ہے۔

روشن۔ تو ہم لوگ جو کچھ کر رہے ہیں وہ بھی آپ کے فائدے ہی کے لیے کر رہے ہیں۔ ہم آپ کے سر سے سلطنت کا بوجھ اُتار کر آپ کو آزاد کر دیں گے تب آپ کے عیش میں خلل نہ پڑے گا آپ بے فکر ہو کر حسینوں کے ساتھ زندگی کی بہار لوٹیئے گا۔

بادشاہ۔ تو کیا آپ لوگ مجھے تخت سے اتارنا چاہتے ہیں؟

روشن۔ نہیں، آپ کو بادشاہی کی ذمہ داریوں سے آزاد کردینا چاہتے ہیں۔

بادشاہ۔ حضرت امام کی قسم، میں یہ ذلت نہ برداشت کروں گا۔ میں اپنے بزرگوں کا نام نہ ڈباؤں گا۔

روشن۔ آپ کے بزرگوں کے نام کی فکر ہمیں آپ سے زیادہ ہے۔ آپ کی عیش پرستی بزرگوں کا نام روشن نہیں کر رہی ہے۔

بادشاہ۔ (وینتا سے) (ناداری سے) وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ سے آپ لوگوں کو شکایت کا کوئی موقع نہ دوں گا۔

روشن۔ نشے بازوں کے وعدوں پر کوئی دیوانہ ہی یقین کر سکتا ہے۔

بادشاہ۔ تم مجھے زبردستی تخت سے نہیں اتار سکتے۔

روشن۔ ان دھمکیوں کی ضرورت نہیں۔ چپ چاپ چلے چلیے آگے آپ کو سبز گاڑی مل جائے گی۔ ہم آپ کو عزت کے ساتھ رخصت کریں گے۔

بادشاہ۔ آپ جانتے ہیں رعایا پر اس کا کیا اثر ہوگا؟

رشن۔ خوب جانتا ہوں، آپ کی حمایت میں ایک انگلی بھی نہ اٹھے گی۔ کل ساری سلطنت میں گھی کے چراغ جلیں گے۔

اتنی دیر میں سب لوگ اس استھان پر آپہنچے، جہاں بادشاہ کو لے جانے کے لیے سواری تیار کھڑی تھی۔ لگ بھگ (تقریباً) ۲۵ سشستر (مع اسلحہ) گورے سپاہی بھی کھڑے تھے۔ بادشاہ سبز گاڑی کو دیکھ کر مچل گئے۔ ان کے رودھر (خون) کی گتی تیور ہو گئی بھوگ اور ولاس کے نیچے دبی ہوئی مریادا سجگ ہو گئی۔ انھوں نے

زور سے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اور نیہ راشیہ پورن (مایوس کن) دُساہس کے ساتھ ، پرنام بھے کو تیاگ کر، اُچ سور میں بولے۔ اے لکھنؤ کے بسنے والو! تمھارا بادشاہ یہاں دشمنوں کے ہاتھوں قتل کیا جا رہا ہے۔ اسے ان کے ہاتھ سے بچاؤ دوڑو ورنہ پچھتاؤگے۔

یہ آرت (تکلیف زدہ) پکار آکاش کی نیروتا کو چیرتی ہوئی گومتی کی لہروں میں دِلین نہیں ہوئی بلکہ لکھنؤ والوں کے ہردیوں میں جا پہنچی۔ راجا بختاور سنگھ بندی گرہ سے نکل کر نگر نواسیوں کو اتجت کرتے اور پرتی چھن رکچھا کاریوں کے دل کو بڑھاتے بڑے دیگ سے دوڑے چلے آرہے تھے ایک پل کا وِلمب بھی شڈ یتر کاریوں کے گھاتک وردوھ کو سپھل کرسکتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ان کے ساتھ دو تین ہزار سشستر منُشیوں کا دل ہو گیا تھا۔ یہ ساموہک شکتی بادشاہ کا اور لکھنؤ راجیہ کا ادھار کر سکتی تھی۔ سمے سب کچھ تھا۔ بادشاہ گوری سینا کے چنگل میں پھنس گئے تو پھر سمست لکھنؤ بھی انھیں مکت نہ کرا سکتا تھا۔ راجا صاحب جیوں جیوں آگے بڑھتے جاتے تھے۔ نیراشیہ سے دل بیٹھا جاتا تھا۔ وِپھل منورتھ (ناکام آرزو) ہونے کی شنکا سے اُتساہ بھنگ ہوا جاتا تھا۔ اب تک کہیں ان لوگوں کا پتہ نہیں اوشیہ ہم دیر میں پہنچے۔ وِدروہیوں نے اپنا کام پورا کر لیا، لکھنؤ راجیہ کی سوادھینتا سدا کے لیے وسرجت ہوگئی۔

یہ لوگ نراش ہو کر لوٹنا ہی چاہتے تھے کہ اچانک بادشاہ کا آرتناد (نالہ) سنائی دیا۔ کئی ہزار کنٹھوں سے آکاش بھیدی دھونی نکلی حضور کو خدا سلامت رکھے، ہم فدا ہونے کو آپہنچے۔ سمست دَل ایک ہی پربل اچھا سے پریرت ہوکر، ویگ وتی جل دھارا کی بھانتی، گھٹنا ستھل کی اور دوڑا۔ اشکست لوگ بھی سشکت ہوگئے پچھڑے ہوئے لوگ آگے نکل جانا چاہتے تھے۔ آگے کے لوگ چاہتے تھے کہ اُڑ کر جا پہنچے۔

ان آدمیوں کی آہٹ پاتے ہی گوروں نے بندوقیں بھری اور ۲۵ بندوقوں کی باڑھ سر ہو گئی۔ رکشا کاریوں میں کتنے ہی لوگ گر پڑے۔ مگر قدم پیچھے نہ ہٹے۔ ویرمد نے اور بھی متوالا کر دیا۔ ایک چھن میں دوسری باڑھ آئی۔ کچھ لوگ پھر ویرگتی کو پراپت ہوئے لیکن قدم آگے بڑھتے ہی گئے۔ تیسری باڑھ چھوٹنے ہی والی تھی کہ

لوگوں نے وِدروہیوں کو جا لیا۔ گورے بھاگے۔

جب لوگ بادشاہ کے پاس پہنچے، تو اوبھت درشیہ دیکھا۔ بادشاہ روشن الدولہ کی چھاتی پر سوار تھے۔ جب گورے جان لے کر بھاگے تو بادشاہ نے اس نرپشاچ کو پکڑ لیا اور اسے بل پوروک بھومی پر گرا کر اس کی چھاتی پر بیٹھ گئے۔ اگر ان کے ہاتھوں میں ہتھیار ہوتا تو اس وقت روشن کی لاش تڑپتی ہوئی دکھائی دیتی۔

راجا بختاور سنگھ آگے بڑھ کر بادشاہ کو آداب بجا لائے۔لوگوں کی جے دھونی سے اکاش ہل اٹھا۔ کوئی بادشاہ کے پیروں کو چومتا تھا کوئی انھیں آشیرواد دیتا تھا۔ اور روشن الدولہ کا شریر تو لاتوں اور گھوسوں کا لکش بنا ہوا تھا۔ کچھ بگڑے دل ایسے بھی تھے جو اس کے منہ پر تھوکنے میں بھی سنکوچ نہ کرتے تھے۔

(۶)

پراتہ کال تھا۔ لکھنؤ میں آنند اُتسو منایا جا رہا تھا۔ بادشاہی محل کے سامنے لاکھوں آدمی جمع تھے۔ سب لوگ بادشاہ کو یتھا یوگیہ نظر دینے آئے تھے۔ جگہ جگہ غریبوں کو بھوجن کرایا جا رہا تھا شاہی نوبت خانے میں نوبت جھڑ رہی تھی۔

دربار سجا، بادشاہ ہیرے اور جواہرات سے جگمگاتے رتن جڑت آبھوشنوں سے سجے ہوئے سنہاسن پر براجے۔ رئیسوں اور امیروں سے نظریں گزاریں۔ کوجنوں نے قصیدے پڑھے۔ یکایک بادشاہ نے پوچھا۔ راجا بختاور سنگھ کہاں؟ کپتان نے جواب دیا۔ قید خانے میں۔

بادشاہ نے اسی وقت کئی کرم چاریوں کو بھیجا کہ راجا صاحب کو جیل خانے سے عزت کے ساتھ لائیں، جب تھوڑی دیر کے بعد راجا نے آکر بادشاہ کو سلام کیا۔ تو وے تخت سے اتر کر ان سے گلے ملے اور انھیں اپنی داہنی اُور سنہاسن پر بٹھایا۔ پھر دربار میں کھڑے ہو کر ان کی سُکیرتی اور راج بھکتی کی پرشنسا کرنے کے اپرانت اپنے ہی ہاتھو ں سے انھیں خلعت پہنائی۔ راجا صاحب کے کُٹمب کے پرانی آدر اور سمّان کے ساتھ بدا کیے گئے۔

انت کو جب دوپہر کے سمے دربار برخاست ہونے لگا تو بادشاہ نے راجا

صاحب سے کہا۔ آپ نے مجھ پر اور میری سلطنت پر جو احسان کیا ہے اس کا صلہ (پرسکار) دینا میرے امکان سے باہر ہے۔ میری آپ سے یہی التجا (انورودھ) ہے کہ آپ وزارت کا قلم دان اپنے ہاتھ میں لیجیے اور سلطنت کا جس طرح مناسب سمجھیے انتظام کیجیے۔ میں آپ کے کسی کام میں دخل نہ دوگا۔ مجھے ایک گوشے میں پڑا رہنے دیجیے۔ نمک حرام روشن کو بھی میں آپ کے سپرد کیے دیتا ہوں۔ آپ اسے جو سزا چاہیں دیں۔ میں اسے کب کا جہنم بھیج چکا ہوتا پر یہ سمجھ کر کہ یہ آپ کا شکار ہے اسے چھوڑے ہوئے ہوں۔

لیکن بختاور سنگھ بادشاہ کے اُچ شرنکھل (بے باک) سوابھاؤ سے بھلی بھانتی پرچت تھے وہ جانتے تھے بادشاہ کی یہ سدا چھائیں تھوڑے ہی دنوں کی مہمان ہیں۔ مانو چرتر میں آکسمک پری ورتن بہت کم ہوا کرتے ہیں۔ دو چار مہینے میں دربار کا پھر وہی رنگ ہو جائے گا۔ اس لیے میرا تٹستھ رہنا ہی اچھا ہے۔ راجیہ کے پرتی میرا جو کرتویہ تھا۔ وہ میں نے پورا کر دیا۔ میں دربار سے الگ رہ کر نسکام بھاؤ سے جتنے سیوا کر سکتا ہوں۔ اتنی دربار میں رہ کر کداپی نہیں کر سکتا۔ ہتیشی متر کا جتنا سمان ہوتا ہے۔ سوامی بھکت سیوک کا اتنا نہیں ہو سکتا۔

وہ ونیت بھاؤ سے بولے۔ حضور مجھے اس عہدے سے معاف رکھیں۔ میں یوں ہی آپ کا خادم ہوں۔ اس منصب پر کسی لائق آدمی کو مامور (نیوکت) کیجیے۔ میں اکھڑ راجپوت ہوں۔ ملکی انتظام کرنا کیا جانوں۔

بادشاہ۔ مجھے تو آپ سے زیادہ لائق اور وفادار آدمی نظر نہیں آتا۔

مگر راجا صاحب ان کی باتوں میں نہ آئے۔ آخر مجبور ہو کر بادشاہ نے انھیں زیادہ نہ دبایا۔ چھن بھر بعد جب روشن الدولہ کو سزا دینے کا پرشن اٹھا۔ تب دونوں آدمیوں میں اتنا مت بھید ہوا کہ واد وواد کی نوبت آگئی۔ بادشاہ آگرہ کرتے تھے کہ اسے کتے سے نچوا دیا جائے۔ راجا صاحب اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ اسے جان سے نہ مارا جائے۔ کیول نظر بند کر دیا جائے۔ انت میں بادشاہ نے کرودھ ہو کر کہا۔ یہ ایک دن آپ کو ضرور دغا دے گا۔

راجا۔ اس خوف سے میں اس کی جان نہ لوں گا۔

بادشاہ۔ تو جناب، آپ چاہے اسے معاف کردیں۔ میں ابھی معاف نہیں کرسکتا۔

راجا۔ آپ نے تو اسے میرے سپرد کر دیا تھا۔ دی ہوئی چیز کو آپ واپس کیسے لیں گے؟

بادشاہ نے کہا۔ تم نے میرے نکلنے کا کہیں راستہ ہی نہیں رکھا۔

روشن الدولہ کی جان بچ گئی۔ وزارت کا پد کپتان صاحب کو ملا۔ مگر سب سے وچتر بات یہ تھی کہ ریزیڈنٹ نے اس شڈینتر سے پورن اَن بھگتا پرکٹ کی اور صاف لکھ دیا کہ بادشاہ سلامت اپنے انگریز مصاحبوں کو جو سزا چاہیں دیں کوئی آپتی نہ ہوگی۔ میں انھیں پاتا، تو سیوم بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیتا۔ لیکن پانچوں مہان بھاؤ میں سے ایک کا بھی پتا نہ چلا۔ شاید وے سب کے سب راتوں رات کلکتے بھاگ گئے۔ اتہاس میں اُکت گھٹنا کا کہیں اُلیکھ نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن کن وندتیاں (افواہ) جو اتہاس سے ادھک وشوسنیہ ہیں۔ اس کی ستیتہ کی ساکچھی ہیں۔

یہ افسانہ ہندی مادھوری لکھنؤ کے فروری 1932 میں شائع ہوا مان سرو ور میں شامل ہے۔ اردو میں پہلی بار شائع ہورہا ہے۔

جیون سار

میری زندگی ہموار میدان کی طرح ہے جس میں کہیں کہیں گڈھے تو ہیں لیکن ٹیلوں، پہاڑوں، گہری گھاٹیوں اور غاروں کا پتہ نہیں ہے۔ جن حضرات کو پہاڑوں کی سیر کا شوق ہو انھیں یہاں مایوسی ہوگی۔

میرا جنم ستمبر ۱۹۳۷ء میں ہوا۔ والد ڈاک خانہ میں کلرک تھے، والدہ مریض
سمان ۔ ایک بڑی بہن بھی تھی۔ اس وقت والد شاید بیس روپئے پاتے تھے۔ چالیس
ـ پہنوچتے پہونچتے تک ان کا انتقال ہو گیا۔ یوں تو وہ بڑے دور اندیش محتاط
ہی آپ میں آنکھیں کھول کر چلنے والے آدمی تھے۔ لیکن آخری عمر میں ایک ٹھوکر کھا
اکھڑ را ئے اور خود تو گرے ہی تھے اسی دھکے میں مجھے بھی گرا دیا۔ پندرہ برس کی عمر
ُں نے میری شادی کردی جس کے چند سال بعد ہی انھیں سفر آخرت کے
مگر ہو گیا اس وقت میں نویں کلاس میں پڑھتا تھا، گھر میں میری بیوی، سوتیلی
زیادہ ور ان کے دو لڑکے تھے۔ مگر آمدنی ایک پیسے کی نہ تھی، گھر میں جو کچھ تھا
آ چھ ماہ تک والد کی علالت اور اس کے بعد تجہیز و تکفین میں خرچ ہو گیا۔ مجھے ایم اے پاس کرکے وکیل بننے کا ارمان تھا۔ سرکاری ملازمت اس زمانہ میں بھی اتنی ہی مشکل سے ملتی تھی جتنی کہ اب۔ دوڑ دھوپ کر کے شاید دس بارہ روپیہ کی کوئی جگہ پا جاتا، مگر یہاں تو آگے پڑھنے کی دھن تھی۔ مگر پاؤں میں لوہے کی نہیں اشٹ دھان کی بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور میں پہاڑ پر چڑھنا چاہتا تھا۔

پاؤں میں جوتے نہ تھے، بدن پر ثابت کپڑے نہ تھے، گرانی الگ، دس سیر کے جو تھے۔ اسکول سے ساڑھے تین بجے چھٹی ملتی تھی۔ کوئنس کالج بنارس میں پڑھتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے فیس معاف کر دی تھی۔ امتحان سر پر تھا اور میں بانس کے پھاٹک پر ایک لڑکے کو پڑھانے جا یا کرتا تھا، جاڑے کا موسم تھا، چار بجے شام کو پہونچ جاتا اور چھ بجے چھٹی پاتا تھا۔ وہاں سے میرا گھر پانچ میل پر تھا۔ تیز چلنے پر بھی آٹھ بجے رات سے پہلے گھر نہ پہونچ سکتا۔ سویرے پھر آٹھ بجے گھر سے چل دیتا ورنہ وقت پر اسکول نہ پہونچتا۔ رات کو کھا نا کھا کر کپّی کے سامنے پڑھنے بیٹھتا اور نہ معلوم کب سو جاتا۔

میٹریکلولیشن تو کسی طرح پاس ہوگیا لیکن سکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا اور کوئینس کالج میں داخلہ کی کوئی امید نہ رہی۔ فیس صرف اول درجہ میں پاس ہونے والوں کی معاف ہو سکتی تھی۔ خوش قسمتی سے اسی سال ہندو کالج کھل گیا تھا۔ میں نے اس نئے کالج میں پڑھنے کا ارادہ کیا۔ مسٹر رچرڈ سن پرنسپل تھے۔ ان کے مکان پر گیا وہ سر سے پاؤں تک ہندوستانی لباس میں ملبوس تھے۔ اور دھوتی پہنے فرش پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ لیکن مزاج تبدیل کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ میری گذارش سن کر ابھی میں آدھی ہی بات کہہ پایا تھا۔ بولے کہ ”گھر پر میں کالج کی بات نہیں سنتا“ ناچار کالج گیا۔ ملاقات تو ہوئی مگر ناامیدی کے سوائے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب کیا کروں؟ اگر کسی کی سفارش لے آتا تو شاید میری درخواست پرغورہو تا لیکن ایک دیہاتی لڑکے کو شہر میں جانتا ہی کون تھا؟

روز گھر سے اسی ارادہ سے نکلتا کہ کہیں سے سفارش لکھا لاؤں لیکن بارہ میل کی منزل مار کر شام کو یوں ہی گھر واپس آ جاتا شہر میں کوئی بات پوچھنے والا بھی نہ تھا۔

کئی دنوں کے بعد ایک سفارش ملی، ایک صاحب ٹھاکر اندر ناراین سنگھ ہندو کالج کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔ ان سے جاکر رویا، انھیں مجھ پر رحم آ گیا اور انھوں نے سفارشی چٹھی لکھ دی، اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ بہر حال خوش خوش گھر آیا، دوسرے دن پرنسپل صاحب سے ملنے کا ارادہ تھا لیکن گھر پہونچتے ہی

مجھے بخار آ گیا اور دو ہفتہ سے پہلے نہ ٹلا۔ نیم کا کاڑھا پیتے پیتے ناک میں دم آ گیا۔ ایک دن دروازہ پر بیٹھا ہوا تھا کہ میرے پروہت جی آ گئے۔ میری حالت دیکھ کر مزاج پرسی کی اور فوراً کسی کھیت سے ایک جڑ کھود لائے اور اسے دھو کر سات دانے کالی مرچ کے ساتھ پسوا کر مجھے پلا دیا۔ اس نے جادو کا اثر کیا۔ بخار چڑھنے میں گھنٹے بھر کی دیر تھی مگر اس دوا نے گویا گھنٹہ بھر کے اندر ہی اس کا گلا گھونٹ دیا۔ میں نے پنڈت جی سے باربار اس جڑی کا نام پوچھا مگر انھوں نے نہ بتایا، کہا نام بتا دینے سے اس کا اثر جاتا رہے گا۔

غرض ایک مہینہ کے بعد دوبارہ مسٹر رچرڈسن سے ملا اور انھیں ٹھاکر صاحب کا سفارشی خط دکھلایا۔ انھوں نے میری طرف گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا:

''اتنے دنوں تک کہاں تھے''؟

بیمار ہو گیا تھا۔

کیا بیماری تھی؟

میں اس سوال کے لیے تیار نہ تھا، اگر بخار بتاتا ہوں تو شاید صاحب مجھے جھوٹا سمجھیں، بخار میری سمجھ میں معمولی بات تھی جس کے لیے اتنی لمبی غیر حاضری کی ضرورت نہ تھی۔ کوئی ایسی بیماری بنانے کی فکر ہوئی جو مجبوری اور تکلیف کے علاوہ رحم کے جذبات کو بھی ابھار سکے۔ اس وقت مجھے اور کسی بیماری کا نام یاد نہ آیا، ٹھاکر اندر نارائن سنگھ سے جب میں سفارش کے لیے ملا تھا تو انھوں نے اپنے اختلاج قلب کے مرض کا ذکر کیا تھا، ان کے الفاظ مجھے یاد آ گئے۔

میں نے کہا '' پلپٹیشن آف ہاٹ سر''(Palpitation of Heart Sir)

صاحب نے متعجب ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا ''اب تم بالکل اچھے ہو''؟

''جی ہاں''

''اچھا فارم داخلہ بھر لاؤ''

میں نے سمجھا چلو بیڑا پار ہوا، فارم لیا، خانہ پری کی اور پیش کر دیا۔ صاحب اس وقت کسی کلاس میں پڑھا رہے تھے۔ تین بجے مجھے فارم واپس ملا، اس پر لکھا تھا ''اس کی لیاقت کی جانچ کی جائے''۔

یہ نیا مرحلہ پیش آیا تو میرا دل بیٹھ گیا، انگریزی کے سوا اور کسی مضمون میں پاس ہونے کی امید نہ تھی اور حساب و ریاضی سے تو میری روح کانپتی تھی، جو کچھ یاد تھا وہ بھی بھول گیا تھا۔اب کوئی دوسری صورت کیا ہو سکتی تھی، تقدیر پر بھروسہ کر کے کلاس میں گیا اور اپنا فارم دکھایا۔ پروفیسر صاحب بنگالی تھے، انگریزی پڑھا رہے تھے، واشنگٹن ارونگ کا ''Rip Van Winkle'' کا سبق تھا میں پیچھے کی قطار میں جاکر بیٹھ گیا اور دو ہی چار منٹ میں مجھے معلوم ہو گیا کہ پروفیسر صاحب اپنے مضمون پر پوری طرح حاوی ہیں۔ گھنٹہ ختم ہونے پر انھوں نے آج کے سبق پر مجھ سے مختلف سوالات کئے اور میرے جوابات سن کر میری عرضی پر''اطمینان بخش'' کا لفظ لکھ دیا۔

دوسرا گھنٹہ حساب کا تھا اس کے پروفیسر بھی بنگالی تھے۔ میں نے اپنا فارم دکھایا، نئی درسگاہوں میں عموماً وہی طلبا آتے ہیں جنھیں کہیں جگہ نہیں ملتی، یہاں بھی یہی حال تھا۔ کلاسوں میں کم استعداد اور ناقابل طلباء بھرے پڑے تھے، پہلے ریلے میں جو آیا وہ بھرتی ہو گیا، بھوک میں ساگ پات سبھی لذیذ معلوم ہوتا ہے، مگر اب پیٹ بھر گیا تھا۔ طلباء چن چن کر لیے جاتے تھے۔ ان پروفیسر صاحب نے حساب میں میرا امتحان لیا اور میں فیل ہو گیا۔ فارم پرحساب کے خانہ میں ناقابل اطمینان لکھ دیا گیا۔

میں اتنا ناامید ہوا کہ فارم لے کر پھر دو بارہ پرنسپل کے پاس نہ گیا سیدھا گھر چلا آیا حساب میرے لیے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی تھی جس پر میں کبھی نہ چڑھ سکا۔ انٹرمیڈیٹ میں کے امتحان حساب میں دو مرتبہ فیل ہوا اور ناامید ہوکر امتحان دینا چھوڑ دیا۔ دس بارہ سال کے بعد جب ریاضی کا مضمون اختیاری ہو گیا تو میں نے دوسرے سبجکٹ لے کر آسانی سے انٹرمیڈیٹ پاس کرلیا۔ اس وقت تک ریاضی کی بدولت صدہا طلباء کی آرزوؤں کا خون ہوا۔ خیر میں ناامید ہو کر گھر تو لوٹ آیا لیکن پڑھنے کی تمنا باقی رہی، گھر بیٹھ کر کیا کرتا، کسی طرح حساب پختہ کرکے پھر کالج میں داخل ہوجاؤں۔ یہی دھن تھی مگر اس کے لیے شہرمیں رہنا ضروری تھا۔ اتفاق سے ایک وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھانے کا کام مل گیا، پانچ روپے تنخواہ

ٹھہری۔ میں نے دو روپیہ میں گزر کر کے تین روپیہ گھر دینے کا مصمم ارادہ کیا۔ وکیل صاحب کے اصطبل کے اوپر ایک چھوٹی سے کچی کوٹھری تھی اسی میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ ایک ٹاٹ کا ٹکڑا بچھا لیا، بازار سے ایک چھوٹا سا لیمپ لے آیا اور شہر میں رہنے لگا۔ گھر سے کچھ برتن بھی لایا۔ ایک وقت کھچڑی پکا لیتا اور برتن دھو مانج کر لائبریری چلا جاتا۔ حساب تو بہانہ تھا ناول وغیرہ پڑھا کرتا۔ پنڈت رتن ناتھ در کا ''فسانۂ آزاد'' انھیں دنوں پڑھا۔ چندر کانتا سنتت بھی پڑھا، بنکم بابو کے اردو ترجمے بھی جتنے لائبریری میں ملے سب پڑھ ڈالے۔ جن وکیل صاحب کے لڑکوں کو پڑھاتا تھا ان کے سالے میٹریکولیشن میں میرے ساتھ پڑھتے تھے۔ انھیں کی سفارش سے مجھے یہ ٹیوشن ملا تھا۔ اس دوستی کی وجہ سے جب ضرورت ہوتی ان سے پیسے ادھار لے لیا کرتا اور تنخواہ ملنے پرحساب بے باق کر دیتا۔ کبھی دو روپے ہاتھ آتے، کبھی تین، جس دن تنخواہ کے دو تین روپے ملتے میری قوت ارادی کی باگ ڈھیلی ہوجاتی، للچائی آنکھیں حلوئی کی دوکان کی طرف کھینچ لے جاتیں اور دو تین آنے کے پیسے ختم کیے بغیر واپس نہ آتا۔ پھر اسی دن گھرجاتا اور دو ڈھائی روپے دے آتا۔ دوسرے دن سے پھر ادھار لینا شروع کر دیتا لیکن کبھی کبھی ادھار لینے میں پس و پیش بھی ہوتا جس کی وجہ سے سارا دن روزہ رکھنا پڑتا۔

اس طرح چار پانچ مہینے گذر گئے۔ اسی درمیان ایک بزاز سے دو ڈھائی روپے کے کپڑے لیے تھے روز ادھر سے نکلنا ہوتا تھا۔ اس کا مجھ پر پورا بھروسہ تھا، جب مہینے دو مہینے ہو گئے اور میں روپے نہ چکا سکا تو پھر میں نے ادھر سے نکلنا ہی چھوڑدیا، چکر دے کرنکل جاتا۔ تین سال کے بعد اس کے روپے ادا کر سکا۔ اسی زمانہ میں شہر کا ایک بیلدار مجھ سے کچھ ہندی پڑھنے آیا کرتا تھا، اس کا گھر وکیل صاحب کے مکان کی پشت پر تھا'' جان لو بھیا'' اس کا سخن تکیہ تھا۔ چنانچہ سب لوگ اسے جان لو بھیا ہی کہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے آٹھ آنے پیسے ادھار لے لیے تھے۔ یہ پیسے اس نے مجھ سے میرے گھر گاؤں میں جاکر پانچ برس کے بعد وصول کئے۔ اب بھی میری پڑھنے کی خواہش تھی لیکن روز بروز ناامید ہوتا جاتا تھا، جی چاہتا تھا کہ کہیں نوکری مل جائے تو کرلوں، لیکن نوکری

کس طرح اور کہاں ملتی ہے یہ مجھے معلوم نہ تھا۔

جاڑے کا موسم تھا مگر کوڑی پاس نہ تھی۔ دو دن تک تو ایک ایک پیسے کے بھنے ہوئے چنے کھاکر کاٹے، میرے مہاجن نے ادھار دینے سے انکار کردیا تھا اور میں لحاظ کے مارے اس سے مانگنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ چراغ جل چکے تھے، اس وقت میں ایک بک سیلر کی دکان پر ایک کتاب بیچنے گیا جو پروفیسر چکرورتی کی بنائی ہوئی ارتھمیٹک کی شرح تھی اور جسے میں نے دوسال ہوئے خریدی تھی، اب تک اسے بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔ لیکن آج جب چاروں طرف سے مایوس ہو گیا تو اسے فروخت کرنے کا ارادہ کیا، کتاب کی قیمت دو روپے تھی لیکن ایک روپیہ پر سودا ہوا۔ میں روپیہ لے کر دکان سے اترا ہی تھا کہ لمبی مونچھوں والے ایک متین شخص نے مجھ سے پوچھا:

''تم یہاں کہاں پڑھتے ہو''؟

میں نے کہا ''پڑھتا تو کہیں نہیں۔ پر کہیں نام لکھانے کی فکر میں ہوں''۔

''میٹریکلولیشن پاس ہو''۔

''جی ہاں''۔

''نوکری تو نہیں چاہتے''۔

''نوکری کہیں ملتی ہی نہیں''۔

یہ بھلے مانس کسی چھوٹے سے اسکول کے ہیڈماسٹر تھے اور انھیں ایک اسسٹنٹ ماسٹر کی ضرورت تھی، اٹھارہ روپے تنخواہ پر مجھے ملازم رکھ لیا۔ اس وقت یہ اٹھارہ روپے میری مایوس تمنا کی معراج تھے۔ دوسرے دن ہیڈماسٹر صاحب کے پاس حاضرہونے کا وعدہ کرکے چلا تو پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ یہ ۱۸۹۹ء کی بات ہے۔ میں گردوپیش کے حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا اور اگر ریاضی کی وجہ سے اٹک نہ جاتا تو ضرور آگے تک جاتا، مگر ریاضی نے سارے ارمان خاک میں ملادیے۔

(۲)

پہلے پہل ۱۹۰۷ء میں میں نے کہانیاں لکھنا شروع کی۔ ڈاکٹر رابیندرناتھ کی کئی کہانیاں میں نے انگریزی میں پڑھی تھیں۔ان میں سے بعض کا ترجمہ کیا اور پہلا ناول تو میں نے ۱۹۰۱ء ہی میں لکھنا شروع کیا۔ میرا ایک ناول ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا اور دوسرا ۱۹۰۴ء میں لیکن کہانیاں سب سے پہلے ۱۹۰۷ء ہی میں لکھیں۔ میری پہلی کہانی کا نام تھا'' دنیا کا سب انمول رتن'' وہ ۱۹۰۷ء میں رسالہ '' زمانہ'' میں چھپی۔ اس کے بعد میں نے زمانہ میں چارپانچ کہانیاں اور لکھیں۔ ۱۹۰۹ء میں پانچ کہانیوں کا مجموعہ ''سوز وطن'' کے نام سے زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا۔ اس وقت ملک میں تقسیم بنگالہ کی شورش برپا تھی اور کانگریس میں ''گرم دل'' کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ان پانچوں کہانیوں میں حب وطن کا ترانہ گایا گیا تھا۔

اس وقت میں سر شتۂ تعلیم میں سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھا اور ہمیر پور کے ضلع میں تعینات تھا۔ کتاب کو نکلے چھ مہینے ہو چکے تھے۔ ایک دن رات کو میں اپنے کیمپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر صاحب کا پروانہ پہونچا کہ ''فوراً آکر مجھ سے ملو جاڑے کا موسم تھا میں نے بیل گاڑی جتوائی اور راتوں رات تیس چالیس میل کا سفر طے کر کے دوسرے دن صاحب سے ملا۔ ان کے سامنے'' سوزوطن '' کی ایک جلد رکھی ہوئی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا، اس وقت میں ''نواب رائے '' کے نام سے لکھا کرتا تھا، مجھے اس کا کچھ کچھ پتہ مل چکا تھا کہ خفیہ پولیس اس کتاب کے مصنف کی کھوج میں ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے مجھے کھوج نکالا اور صاحب کلکٹر نے اسی کی جواب دہی کے لیے مجھے بلا یا ہے۔

صاحب نے مجھ سے پوچھا ''کیا یہ کتاب تم نے لکھی ہے ''۔

میں نے کہا: ''ہاں''

صاحب نے ایک ایک کہانی کا مجھ سے مطلب پوچھا اور آخر میں بگڑ کر بولے ''تمھاری کہانیوں مین سڈیشن بھرا ہوا ہے، اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریزی عملداری میں ہو۔ مغلوں کا راج ہوتا تو تمھارے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے جاتے۔

تمھاری کہانیاں یک طرفہ ہیں، تم نے انگریزی سرکار کی توہین کی ہے وغیرہ۔ آخرکار فیصلہ یہ ہوا کہ میں ''سوز وطن'' کی کل کاپیاں سرکار کے حوالے کر دوں اور آئندہ صاحب سے اجازت لیے بغیر کچھ نہ لکھوں، میں سمجھا کہ چلو سستا چھوٹ گیا، کل ہزار کاپیاں چھپی تھیں اور ابھی مشکل سے تین سو جلدیں فروخت ہو سکی تھیں۔ میں نے بقیہ سات سو کاپیاں زمانہ پریس سے منگا کر صاحب کی نذر کردیں۔

میں سمجھا بلا ٹل گئی، لیکن افسران محکمہ کی اس سے سیری نہ ہوئی،چنانچہ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کلکٹر صاحب نے ضلع کے دوسرے افسروں سے بھی میرے بارے میں مشورہ کیا۔ سپر نٹنڈنٹ پولیس، دو ڈپٹی کلکٹر اور ڈپٹی انسپکٹر مدارس جن کا میں ماتحت تھا میری تقدیر کا فیصلہ کرنے بیٹھے۔ ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب نے میری کہانیوں سے ثابت کیا کہ ان میں شروع سے لے کر آخر تک باغیانہ خیالات اور انقلاب انگیز جذبات کے سوا اور کچھ نہیں۔ محکمہ پولیس کے خداوند نے کہا کہ ایسا خطر ناک آدمی سخت سزا کا مستحق ہے۔ ڈپٹی انسپکٹر صاحب کو مجھ سے بڑی محبت تھی۔ اس ڈر سے کہ کہیں معاملہ طول نہ پکڑے انھوں نے کہا کہ وہ دوستانہ طریقہ پر میرے سیاسی خیالات کا پتہ لگا کر کمیٹی کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کریں گے۔ در اصل ان کا ارادہ تھا کہ مجھے سمجھا بجھا کر رپورٹ میں لکھ دیں کہ مصنف صرف قلم کا مرد ہے مگر سیاسی امورسے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کمیٹی نے اس مشورہ کو پسند کیا حالانکہ پولیس کے خداوند اس وقت بھی پینترے بدلتے رہے۔

مگر کلکٹر صاحب نے ڈپٹی صاحب سے پوچھا'' آپ کو امید ہے کہ وہ اپنے دل کی باتیں آپ سے کہہ دے گا۔

ڈپٹی صاحب نے کہا'' ان سے میری گہری دوستی ہے''۔

آپ دوست بن کر اس کے دل کی تھاہ لینا چاہتے ہیں۔ میں اسے کمینہ پن سمجھتا ہوں۔

ڈپٹی صاحب اس جواب کے لیے تیار نہ تھے، صاحب کی باتوں سے مرعوب ہوکر بولے'' میں تو حضور کے حکم...... مگر صاحب نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی ،نہیں یہ میرا حکم نہیں ہے۔ میں ایسا حکم نہیں دینا چاہتا۔ اگر کتاب سے سڈیشن ثابت

ہوتا ہو تو مصنف پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے ورنہ تنبیہ کر کے چھوڑ دیجیے۔ منھ میں رام اور بغل میں چھری مجھے پسند نہیں''۔

جب کئی دن بعد یہ واقعہ ڈپٹی صاحب نے مجھ سے بیان کیا تو میں نے پوچھا ''کیا آپ سچ مچ میری مخبری کرتے ''۔

وہ ہنس کر بولے ''نہیں یہ ناممکن تھا کوئی لاکھ روپے بھی دیتا تو بھی میں ایسا نہ کرتا میں تو صرف عدالتی کارروائی روکنا چاہتا تھا اور میں خوش ہوں کہ وہ رک گئی۔ مقدمہ عدالت میں جاتا تو سزا ہوجانا یقینی تھی۔ یہاں آپ کی پیروی کرنے والا کوئی نہ تھا مگر صاحب بڑے شریف آدمی ہیں'' میں نے بھی منظور کیا کہ واقعی بہت شریف ہیں''۔

(۳)

میں ہمیر پور ہی میں تھا کہ مجھے پیچش کی شکایت پیدا ہو گئی۔ گرمی کے دنوں میں یہاں کوئی سبز ترکاری نہ ملتی تھی۔ ایک بار کئی دن لگاتار خشک اروی کھانا پڑی۔ ایک روز پیٹ میں ایسا درد ہوا کہ تمام دن مچھلی کی طرح تڑپتا رہا۔ چورن کھایا، پیٹ پرگرم بوتل پھیری، جامن کا عرق پیا، غرض دیہات میں جتنی دوائیں مل سکتی تھیں سب کھائیں لیکن درد کم نہ ہوا۔ دوسرے دن پیچش ہو گئی لیکن درد جاتا رہا۔

اسی طرح ایک مہینہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد میں ایک قصبہ میں پہونچا تو وہاں کے تھانہ دار صاحب نے مجھ سے تھانہ ہی میں ٹھہرنے اور کھانے کو کہا۔ کئی دن سے مونگ کی دال کھاتے کھاتے اور پرہیز کرتے کرتے پریشان ہوگیا تھا۔ سوچا کیا ہرج ہے آج یہیں ٹھہر جاؤ، کھانا تو لذیذ ملے گا۔ تھانہ میں ہی اڈا جمادیا۔ داروغہ جی نے زمیں قند پکوایا، پکوڑیاں، دہی بڑے، پلاؤ سب کچھ بنوایا۔ میں نے بھی خاص طور پر کھایا لیکن کھا پی کر جب تھانے میں داروغہ جی کے پھوس کے بنگلے میں لیٹا تو دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پھر پیٹ میں درد ہونے لگا ساری رات اور اگلے دن پھر کراہتا رہا سوڈے کی دو بوتلیں پینے کے بعد قے ہو گئی تو چین ملا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ تمام زمین قند کی خرابی ہے۔ تب سے اروی اور زریں قند دونوں

کی صورت دیکھ کر کانپ جاتا ہوں۔ درد تو خیر جاتا رہا لیکن پیچش کی دائمی شکایت ہوگئی۔ پیٹ چوبیس گھنٹے تنا رہتا۔ پھران کی شکایت برابر قائم رہی۔کچھ دنوں تک روزانہ بلا ناغہ چار پانچ میل ٹہلنے جانا، کسرت کرنا، پرہیزی کھانا کھاتا اور کوئی نہ کوئی دوا بھی کھایا کرتا۔ لیکن پیچش میں کوئی کمی نہ ہوئی اور بدن بھی سوکھا جاتا تھا۔ کئی مرتبہ کانپور آکر علاج کرایا۔ ایک بارمہینے بھر الہ آباد میں آیورویدک اور ڈاکٹری دوائیں کھاتا رہا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

تب میں نے اپنے تبادلہ کی درخواست کی۔ چاہتا تو یہ تھا کہ روہیلکھنڈ میں تبدیلی ہو مگر پٹکا گیا بستی کے ضلع میں اور وہ حلقہ ملا جو نیپال کی ترائی کے قریب ہے۔ خوش قسمتی سے یہاں میرا تعارف پنڈت منّن دویدی گجپوری سے ہوا جو ڈمریا گنج میں تحصیلدار تھے۔ ان کے ساتھ اکثر علمی مباحث پر بات چیت ہوتی رہی۔ لیکن بستی آکر پیچش کی شکایت اور بڑھ گئی تب میں نے چھ مہینے کی چھٹی لی اور لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں علاج کرایا۔ یہاں فائدہ نہ ہوا تو بنارس کے ایک حکیم کا علاج کیا۔ تین چارمہینے کے بعد تھوڑا فائدہ معلوم ہوا لیکن بیماری جڑ سے نہ گئی۔ رخصت کے بعد جب پھر بستی پہونچا تو وہی حالت ہوگئی تب میں نے دور کی نوکری چھوڑ کر بستی ہائی اسکول میں اسکول ماسٹری قبول کر لی۔ یہاں سے تبدیل ہو کر گورکھپور پہونچا مگر پیچش کی شکایت حسب سابق قائم رہی۔ یہاں میرا تعارف مہابیر پرشاد جی پوتدار سے ہوا جو ہندی لٹریچر کے فاضل مادر وطن کے سچے خادم اور بڑے جفا کش ومحنتی شخص ہیں۔ میں نے بستی میں ہی ہندی کے رسالہ سرسوتی میں کئی کہانیاں چھپوائیں۔ پوتدارجی کی صلاح سے میں نے ''سیوا سدن'' نامی ناول لکھا۔ گورکھپور ہی میں میں نے پرائیویٹ طور پر بی اے بھی پاس کیا۔ سیواسدن کی جو قدرو منزلت ہوئی اس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور میں نے دوسرا ناول '' پریم آشرم'' لکھا اس اثنا میں کہانیاں بھی برابر لکھتا رہا۔

پوتدارجی کے مشورے سے میں نے پانی کا علاج شروع کیا لیکن تین چارمہینے کے غسل اور پرہیز کا الٹا اثر یہ ہوا کہ میرا پیٹ بڑھ گیا اور مجھے پیدل چلنے میں تکلیف محسوس ہونے لگی۔ ایک مرتبہ کئی دوستوں کے ساتھ مجھے ایک زینہ پر چڑھنا

پڑا اور لوگ تو دھڑا دھڑ چڑھ گئے مگر میرے پاؤں اٹھتے ہی نہ تھے۔ بڑی شکل سے ہاتھوں کا سہارا لیتے ہوئے اوپر پہونچا۔ اسی دن مجھے اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔ سمجھ گیا کہ اب تھوڑے دنوں کا مہمان اور ہوں، پانی کا علاج بند کر دیا۔

ایک دن شام کے وقت اردو بازار میں شری جیت دسرتھ پرشاد جی دویدی ایڈیٹر سودیش سے ملاقات ہو گئی، کبھی کبھی ان سے بھی لٹریچر کا تذکرہ ہو تا رہتا تھا۔ انھوں نے میری زرد صورت دیکھ کر کہا ''بابو جی آپ تو بالکل ہی پیلے پڑ گئے ہیں اس کا علاج کیجیے۔

مجھے اپنی بیماری کا ذکر بہت برا لگتا تھا میں اپنی بیماری کو بھول جانا چاہتا تھا۔ جب دو ہی چار مہینے کی زندگی ہے تو پھر کیوں نہ ہنستے ہوئے مروں، میں نے چڑھ کر کہا، مرہی تو جاؤں گا بھائی یا اور کچھ؟ میں موت کے خیر مقدم کو تیار ہوں۔ بے چارے دویدی جی نے ندامت سے سر نیچے کر لیا، بعد کو مجھے بھی اپنی اس تلخ گفتاری پر بڑا افسوس ہوا۔ یہ ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے۔ ان دنوں تحریک عدم اشتراک عمل زوروں پر تھی۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ ہوچکا تھا۔ انھیں دنوں مہاتما گاندھی نے گورکھپور کا دورہ کیا۔ غازی میاں کے میدان میں اونچا پلیٹ فارم تیار کیا گیا، دولاکھ سے کم کا مجمع نہ تھا۔ تمام ضلع کی عقیدت مند پبلک دوڑی آئی تھی۔ایسا مجمع اس سے پہلے میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ مہاتما جی کے درشنوں کی یہ برکت تھی کہ میرے ایسے مردہ دل آدمی میں بھی جان آ گئی۔ اس کے دو ہی چار دن کے بعد میں نے اپنی بیس سال کی سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

اب دیہات میں کچھ کام کرنے کی طبیعت ہوئی۔ پوتدار جی کا دیہات میں ایک مکان تھا ہم اور وہ دونوں وہاں چلے گئے اور چرخے چلانے لگا۔ ایک ہی ہفتہ بعد میری پیچش کم ہو گئی یہاں تک کہ ایک مہینے کے اندر بالکل صحت ہوگئی۔ مگر اس کے بعد میں بنارس چلا آیا اور اپنے دیہات میں بیٹھ کر پرچار اور ادبی خدمت میں زندگی بسر کرنے لگا۔ غلامی سے نجات پاتے ہی میں نوسال کے پرانے مرض سے چھٹکارا پاگیا۔ اس تجربہ نے مجھے پورے طور پر قسمت پرست بنادیا۔

اب مجھے کامل یقین ہے کہ جو مالک کی مرضی ہوتی ہے وہی ہوتا ہے۔ انسان کی کوئی کوشش اس کی مرضی کے بغیر کامیاب نہیں ہوتی۔

یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ ہنس کے فروری 1932 کے سوانحی شمارے میں شائع ہوا۔ یہ کفن میں شامل ہے۔ اردو میں اسے زمانہ کے پریم چند نمبر میں شائع کیا گیا۔

زیور کا ڈبہ

(۱)

بی اے پاس کرنے کے بعد چندر پرکاش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا اور کچھ نہ سوجھا اس کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ اسی سال والد بھی چل بسے اور پرکاش زندگی کے جو شیریں خواب دیکھا کرتا تھا وہ مٹی میں مل گئے۔ والد اعلیٰ عہدے پر تھے۔ ان کی وساطت سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری امید تھی مگر وہ سب منصوبے دھرے ہی رہ گئے اور اب گزر اوقات کے لیے صرف تیس روپے ماہوار کی ٹیوشن ہی رہ گئی تھی۔ والد نے کوئی بھی جائداد نہ چھوڑی، الٹا بھوکا بوجھ اور سر پر لاد دیا، اور عورت بھی ملی تو تعلیم یافتہ، شوقین اور زبان کی طرارہ جسے موٹا کھانے اور موٹا پہننے کی نسبت مرجانا قبول تھا۔ چندر پرکاش کو تیس کی نوکری کرتے شرم آتی تھی لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لیے مکان دیکر اس کے آنسو پونچھ دیئے۔ یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ تھا پختہ ہوا دار، صاف ستھرا اور ضروری سامان سے آراستہ، ایسا مکان بیس روپے ماہوار سے کم میں نہ مل سکتا تھا کام صرف دو گھنٹہ کا تھا۔ لڑکا تو لگ بھگ انہیں کی عمر کا تھا مگر بڑا کند ذہن، کام چور، ابھی نویں درجہ میں پڑھتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ٹھاکر اور ٹھاکرائن دونوں پرکاش کی بڑی عزت کرتے تھے بلکہ اپنا ہی لڑکا سمجھتے تھے۔ گویا وہ ملازم نہیں

گھر کا آدمی تھا۔ اور گھر کے ہر ایک معاملہ میں اسی سے مشورہ کیا جاتا تھا۔

(۲)

شام کے وقت جب پرکاس نے اپنے شاگرد ویراندر کو پڑھا کر چلنے کے لیے چھڑی اٹھائی تو ٹھکرائن نے کہا۔

ابھی نہ جاؤ بیٹا ذرا میرے ساتھ آؤ تم سے کچھ کہنا ہے۔''

پرکاش نے دل میں سوچا۔ وہ کیا بات ہے جو ویرندر کے سامنے نہیں کہی جا سکتی پرکاش کو علیحدہ لے جا کر اما دیوی نے کہا۔ تمھاری کیا اصلاح ہے۔ ویرو کا بیاہ کردوں ایک بہت اچھے گھر کا پیغام آیا ہے۔''

پرکاش نے مسکراکر کہا۔'' یہ تو ویرو بابو ہی سے پوچھئے۔''

''نہیں میں تم سے پوچھتی ہوں۔''

پرکاش نے ذرا تذبذب میں کہا۔ میں اس معاملہ میں کیا صلاح دے سکتا ہوں ان کا بیسواں سال تو ہے لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ بیاہ کے بعد پڑھنا ہو چکا۔

''تو ابھی نہ کروں تمھاری یہی صلاح ہے۔''

''جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں میں نے تو دونوں باتیں عرض کردیں۔''

''توکر ڈالوں۔ مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ لڑکا کہیں بہک نہ جائے۔ پھر پچھتانا پڑے گا۔''

''کیوں۔''

''میرے رہتے ہوئے تو اس کی آپ فکر نہ کریں۔ ہاں مرضی ہو تو کر ڈالیے کوئی حرج بھی نہیں ہے۔''

''سب تیاریاں تمہیں کرنی پڑیں گی۔''

''تو میں کب انکار کرتا ہوں۔''

روٹی کی خیر منانے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک کمزوری ہوتی ہے جو انھیں تلخ سچائی کے اظہار سے روکتی ہے۔ پرکاش میں بھی یہی کمزوری تھی۔

بات پکی ہوگئی اور شادی کا سامان ہونے لگا،ٹھاکر صاحب ان اصحاب میں

سے تھے جنھیں اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہ میں پرکاش کی ڈگری اپنے ساٹھ سالہ تجربے سے زیادہ قیمتی تھی۔ شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھوں میں تھا۔ دس بارہ ہزار روپیہ خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی عزت کی بات نہیں تھی۔ دیکھتے دیکھتے ایک خستہ حال نوجوان ذمہ دار منیجر بن بیٹھا۔ کہیں بزاز اسے سلام کرنے آیا ہے کہیں محلّہ کا بنیا گھیرے ہوئے۔ کہیں گیس اور شامیانہ والاخوشامد کررہا ہے۔ وہ چاہتا تو دو سو چار سو روپے آسانی سے اڑا سکتا تھا۔ لیکن اتنا کمینہ نہ تھا۔ پھر اس کے ساتھ کیا دغا کرے جس نے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیا ہو۔ مگر جس دن اس نے پانچ ہزار کے زیور خریدے اس کے کلیجہ پر سانپ لوٹنے لگا۔

گھر آکر چمپا سے کہا۔ ''ہم تو یہاں روٹیوں کے محتاج ہیں اور دنیا میں ایسے ایسے آدمی پڑے ہیں جو ہزاروں لاکھوں روپے کے زیورات بنوا ڈالتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب نے آج بہو کے چڑھاوے کے لیے پانچ ہزار کے زیور خریدے۔ ایسی ایسی چیزیں کہ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ سچ کہتا ہوں بعض چیزوں پر تو آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔

چمپا ''حاسدانہ لہجہ میں بولی۔'' اونہہ ہمیں کیا کرنا ہے جنھیں ایشور نے دیا ہے وہ پہنیں۔ یہاں تو رو رو کر مرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔''

چندر پرکاش۔ یہی لوگ مزے اڑاتے ہیں۔ نہ کمانا نہ دھمانا باپ دادا چھوڑ گئے ہیں۔ مزے سے کھاتے ہیں اور چین کرتے ہیں۔ اسی لیے کہتا ہوں ایشور بڑا غیرمنصف ہے۔''

چمپا۔'' اپنا اپنا مقدر ہے۔ تمھارے باپ دادا چھوڑ گئے ہوتے تو تم بھی مزے اڑاتے۔ یہاں تو روز مرہ کا خرچ چلانا مشکل ہے۔ گہنے کپڑے کو کون روئے۔ کوئی ڈھنگ کی ساڑی بھی نہیں کہ کسی بھلے آدمی کے گھر جانا ہو تو پہن لوں۔ میں تو اسی سوچ میں ہوں کہ ٹھکرائن کے یہاں شادی میں کیسے جاؤں گی۔ سوچتی ہوں بیمار پڑجاتی تو جان بچتی۔''

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پرکاش نے تسلی دی۔ ساڑی تمھارے لیے ضرور لاؤں گا۔ یہ مصیبت کے دن ہمیشہ نہ رہیں گے۔ زندہ رہا تو ایک دن تم

سر سے پاؤں تک زیور سے لدی ہوگی۔''

چمپا مسکرا کر بولی۔'' چلو میں ایسی من کی مٹھائی نہیں کھاتی۔ گزر ہوتی جائے یہی بہت ہے۔''

پرکاش نے چمپا کی بات سن کر شرم اور غم سے سر جھکا لیا۔ چمپا اسے اتنا کاہل الو سمجھتی ہے۔

(۳)

رات کو دونوں کھانا کھا کر سوئے تو پرکاش نے پھر زیوروں کا ذکر چھیڑا۔ زیور اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے۔'' اس شہر میں ایسے بڑھیا زیور بنتے ہیں مجھے اس کی امید نہ تھی۔''

چمپا نے کہا۔'' کوئی اور بات کرو۔ زیوروں کی بات سن کر دل جلتا ہے۔''

''ویسی چیزیں تم پہنو تو رانی معلوم ہونے لگو۔''

''زیوروں سے کیا خوبصورتی معلوم ہوتی ہے میں نے ایسی بہت سی عورتیں دیکھی ہیں جو زیور پہن کر بھی بھدّی معلوم ہوتی ہیں۔''

''ٹھاکر صاحب بھی مطلب کے یار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ نہ ہوا کہ کہتے۔'' اس میں سے کوئی چیز چمپا کے لیے لیتے جاؤ۔''

''تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔''

''اس میں بچپن کی کیا بات ہے کوئی فراخ دل آدمی کبھی اتنی کنجوسی نہ کرتا۔''

''میں نے ایسا سخی کوئی نہیں دیکھا جو اپنی بہو کے زیور کسی غیر کو بخش دے۔''

''میں غیر نہیں ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ میں ان کے لڑکے کو پڑھاتا ہوں اور شادی کا سارا انتظام کررہا ہوں۔ اگر سو دو سو کی کوئی چیز دے دیتے تو کونسی بڑی بات تھی۔ مگر اہل ثروت کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر سکڑ جاتا ہے۔اس میں سخاوت اور فراخ حوصلگی کے لیے جگہ ہی نہیں رہتی۔''

رات کے بارہ بج گئے ہیں۔ پھر بھی پرکاش کو نیند نہیں آتی۔ باربار وہی چمکیلے زیور آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔کچھ بادل گھر آئے ہیں اور باربار بجلی چمک اٹھتی ہے۔

یکا یک پرکاش چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آہ چمپا کے نازک جسم پر ایک گہنا بھی نہیں پھر بھی وہ کتنی شاکر ہے۔ اسے چمپا پر رحم آگیا۔ یہی تو کھانے پینے کی عمر ہے اور اس عمر میں اس بچاری کو ہر ایک چیز کے لیے ترسنا پڑتا ہے۔ وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر چھت پر آیا۔ ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

اس نے سوچا پہلے زینہ سے اتر کر کمرے میں چلوں۔ اگر وہ جاگ گئے تو زور سے ہنس دوں گا اور کہوں گا کیا چرکا دیا۔ کہہ دوں گا، میرے گھر کی چھت سے کوئی آدمی ادھر آتا دکھائی دیا۔ اس لیے میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ادھر آیا۔ دیکھوں کیا کرتا ہے۔ کسی کا مجھ پر شک ہی نہیں ہوگا۔ اگر صندوق کی کنجی مل گئی تو پو بارہ ہے۔ سب نوکروں پر شبہ کریں گے۔ میں بھی کہوں گا صاحب نوکروں کی حرکت ہے ان کے سوا اور کون لے جاسکتا ہے۔ مین نلوہ نکل جاؤں گا۔ شادی کے بعد کوئی دوسرا گھر لے لوں گا۔ آہستہ آہستہ ایک ایک زیور چمپا کو دوں گا جس سے کوئی شک نہ گزرے۔

پھر بھی وہ جب زینہ سے اترنے لگا تو اس کا دل دھڑک رہا ہے۔

(۴)

دھوپ نکل آئی تھی۔ پرکاش ابھی سورہا تھا کہ چمپانے اسے جگا کر کہا۔ غضب ہوگیا رات کو ٹھاکر صاحب کے گھر میں چوری ہوگئی۔چور زیور کا ڈبہ اٹھاکر لے گیا۔

پرکاش نے پڑے پڑے کہا۔ کسی نے پکڑا نہیں چور کو۔"

"کسی کو خبر بھی نہیں ۔ وہی ڈبے لے گئے جس میں شادی کے زیور تھے۔ نہ جانے کیسے چابی اڑالی اور انھیں کیسے معلوم ہوا کہ اس صندوق میں ڈبہ رکھا ہے۔"

"نوکروں کی کارستانی ہوگی۔ باہر کے آدمی کا یہ کام نہیں ہے۔"

"نوکر تو ان کے تینوں پرانے ہیں۔"

"نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے، آج موقع دیکھا اڑالے گئے۔"

"تم جاکر ان کو تسلی دو۔ ٹھکرائن بیچاری رورہی تھیں۔ تمھارا نام لیکر کہتی تھیں کہ

بیچارہ مہینوں ان زیوروں کے لیے دوڑا۔ ایک ایک چیز اپنے سامنے بنوائی اور چور موئے کاٹنے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔

پرکاش جھٹ پٹ اٹھ بیٹھا اور گھبرایا ہوا سا جاکر ٹھکرائن سے بولا۔ یہ تو بڑا غضب ہوگیا ماتا جی۔ مجھے تو ابھی ابھی چمپا نے بتلایا۔

ٹھاکر صاحب سر پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے کہیں سیندھ نہیں کوئی تالا نہیں ٹوٹا۔ کسی دروازے کی چول نہیں اتری سمجھ میں نہیں آیا کہ چور آیا کدھر سے۔

ٹھکرائن نے روکر کہا۔ میں تو لٹ گئی بھیا۔ بیاہ سر پر ہے کیا ہوگا بھگوان۔ تم نے کتنی دوڑ دھوپ کی تھی تب کہیں جاکر چیزیں تیار ہوکر آئی تھیں۔ نہ جانے کس منحوس ساعت میں بنوائی تھیں۔

پرکاش نے ٹھاکر صاحب کے کان میں کہا۔ مجھے تو کسی نوکر کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔ ٹھکرائن نے مخالفت کی۔ ارے نہیں بھیا نوکروں میں ایسا کوئی نہیں۔ دس دس ہزار یوں ہی اوپر رکھے رہتے ہیں کبھی ایک پائی کا نقصان نہیں ہوا۔

ٹھاکر صاحب نے ناک سکوڑ کر کہا۔ تم کیا جانو آدمی کا دل کتنی جلدی بدل جایا کرتا ہے۔جس نے اب تک چوری نہیں کی ۔ وہ چوری نہیں کرے گا ۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا میں پولیس میں رپورٹ کروں گا۔ اور ایک ایک نوکر کی تلاشی کراؤں گا۔ کہیں مال اڑادیا ہوگا جب پولیس کے جوتے پڑیں گے تو آپ اقبال کریں گے۔

پرکاش نے پولیس کا گھر میں آنا خطرناک سمجھا۔ کہیں ان کے گھر کی تلاشی لیں تو ستم ہوجائے گا۔ بولے پولیس میں رپورٹ کرنا اور تحقیقات کرانا بالکل بے فائدہ ہے۔

ٹھاکر صاحب نے منھ بناکر کہا۔ تم بھی کیا بچوں کی سی باتیں کررہے ہو۔

پرکاش بولا۔ بھلا چوری کرنے والا خود بخود اقبال کرے گا۔ تم زود کوب بھی تو نہیں کر سکتے ہاں پولیس میں رپورٹ کرنا مجھے بھی فضول معلوم ہوتا ہے۔ مال چلا گیا۔ اب نہ ملے گا۔

پرکاش۔ لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔

ٹھاکر۔ کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں اگر کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہو جو چپکے چپکے پتہ لگا دے تو البتہ مال نکل آئے لیکن یہاں ایسے آدمی کہاں۔ نصیبوں کو رو کر بیٹھ رہو اور کیا۔

پرکاش۔ آپ بیٹھ رہئے لیکن میں تو بیٹھنے والا نہیں۔ میں انھیں نوکروں کے سامنے چور کا نام نکلواؤں گا۔

ٹھکرائن۔ نوکروں پر مجھے پورا یقین ہے کسی کا نام بھی نکل آیا تو مجھے یہی خیال رہے گا کہ یہ کسی باہر کے آدمی کا کام ہے۔ چاہے وہ جدھر سے آیا ہو۔ پر چور آیا باہر سے۔ تمھارے کوٹھے سے بھی آسکتا ہے۔

ٹھاکر۔ ''ہاں ! ذرا اپنے کوٹھے پر تو دیکھو شاید کچھ نشان ملے۔ کل دروازہ تو کھلا ہوا نہیں رہ گیا۔''

پرکاش کا دل دھڑکنے لگا۔ بولا '' میں تو دس بجے دروازہ بند کرلیتا ہوں۔ ہاں کوئی پہلے سے موقع پاکر کوٹھے پر چلا گیا ہو اور وہاں چھپا بیٹھا رہا ہو ۔ تو دوسری بات ہے۔''

تینوں آدمی چھت پر گئے تو بیچ کی منڈیر پر کسی کے پاؤں کے نشان دکھائی دیئے جہاں پرکاش کا پاؤں پڑا تھا وہاں کا چونا لگ جانے سے چھت پر پاؤں کا نشان پڑگیا تھا۔

پرکاش کی چھت پر جاکر منڈیر کی دوسری طرف دیکھا تو ویسے ہی نشان وہاں بھی دکھائی دیئے۔ ٹھاکر صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ لحاظ کے مارے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ پرکاش نے ان کے دل کی بات کھول دی۔ اب تو کوئی شک ہی نہیں رہا۔

ٹھاکرصاحب نے کہا۔ ''ہاں ! میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ لیکن اتنا پتہ لگ جانے سے کیا۔ مال تو جاناتھا۔ وہ گیا۔ اب چلو آرام سے بیٹھو۔ آج روپیہ کی کوئی تجویز کرنی ہوگی۔''

پرکاش ۔''میں آج ہی یہ گھر چھوڑ دوں گا۔''

ٹھاکر ۔''کیوں اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔''

پرکاش۔ ''آپ نہ کہیں۔ لیکن میں تو سمجھتا ہوں میرے سر پر بہت بڑی جواب دہی آ گئی۔ میرا دروازہ نو دس بجے تک کھلا ہی رہتا ہے چور نے راستہ دیکھ لیا ہے ممکن ہے دو چار دن میں پھر آ گھسے۔ گھر میں اکیلی ایک عورت سارے گھر کی نگرانی نہیں کر سکتی۔ ادھر وہ تو باورچی خانہ میں بیٹھی ہے۔ ادھر کوئی چپکے سے اوپر چڑھ گیا تو ذرا بھی آہٹ نہیں مل سکتی۔ میں گھوم گھوم کر کبھی ۹ بجے آیا کبھی دس بجے اور شادی کے دنوں میں دیر ہوتی رہے گی۔ ادھر کا راستہ بند ہی ہو جانا چاہیے میں تو سمجھتا ہوں چوری کی ساری ذمہ داری میرے اوپر ہے۔''

ٹھکرائن ڈریں۔ ''تم چلے جاؤ گے بھیا تب تو گھر اور بھی پھاڑ کھائے گا۔''

پرکاش۔ ''کچھ بھی ہو ماتاجی مجھے بہت جلد گھر چھوڑ دینا ہے۔ میری غفلت سے چوری ہوگئی۔ اس کا خمیازہ مجھے اٹھانا پڑے گا۔''

پرکاش چلا گیا تو ٹھاکر کی عورت نے کہا۔ بڑا لائق آدمی ہے چور ادھر سے آیا یہی بات اسے کھا گئی۔ کہیں یہ چور کو پکڑ پائے تو کچا ہی کھا جائے۔''

''مار ہی ڈالے''

''دیکھ لینا کبھی نہ کبھی مال برآمد کر لے گا۔''

''اب اس گھر میں ہرگز نہ رہے گا کتنا ہی سمجھاؤ۔''

''کرایہ کے بیس روپے دینے پڑیں گے۔''

''ہم کیوں کرایہ دیں۔ وہ آپ ہی گھر چھوڑ رہے ہیں ہم تو کچھ کہتے نہیں۔''

''کرایہ تو دینا ہی پڑے گا۔ ایسے آدمی کے لیے کچھ غم بھی کھانا پڑے تو برا نہیں لگتا۔''

''میں سمجھتی ہوں وہ کرایہ لیں گے ہی نہیں۔''

''تیس روپے میں گزر بھی تو نہ ہوگی۔

(۵)

پرکاش نے اسی دن وہ گھر چھوڑ دیا۔ اس گھر میں رہنے میں خدشہ تھا۔ لیکن جب تک شادی کی دھوم رہی۔ اکثر تمام دن یہیں رہتے تھے۔ پیش بندی کے لیے

چمپا سے کہا ''ایک سیٹھ جی کے ہاں پچاس روپے ماہوار کا اور کام مل گیا ہے۔ مگر وہ روپیہ میں ان ہی کے پاس جمع کرتا جاؤں گا۔ وہ آمدنی صرف زیوروں میں خرچ ہوگی۔ اس میں سے ایک پیسہ گھر کے خرچ میں نہ آنے دوں گا۔ خاوند کی محبت کا یہ ثبوت پاکر اسے اپنی قسمت پر ناز ہوا دیوتاؤں میں اس کا اعتقاد اور بھی زیادہ پختہ ہوگیا۔

اب تک پرکاش اور چمپا میں کوئی راز نہ تھا۔ پرکاش کے پاس جو کچھ تھا وہ چمپا کا تھا۔ چمپا ہی کے پاس اس کے ٹرنک صندوق اور الماریوں کی چابیاں رہتی تھیں۔ مگر اب پرکاش کا ایک صندوق ہمیشہ بندرہتا تھا۔ اس کی چابی کہاں ہے اس کا چمپا کو پتہ نہیں۔ وہ پوچھتی ہے۔ اس صندوق میں کیا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کچھ نہیں پرانی کتابیں ہیں، ماری ماری پھرتی تھیں اٹھا کے صندوق میں بند کردی ہے ۔ چمپا کو شک کی گنجائش نہ تھی۔

ایک دن چمپا انھیں پان دینے گئی تو دیکھا وہ اس صندوق کو کھولے کچھ دیکھ رہے ہیں اسے دیکھتے ہی اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ شبہے کا اکھوا سا نکلا مگر پانی بن کر سوکھ گیا۔ چمپا کسی ایسے راز کا خیال ہی نہ کرسکی جس سے شبہے کو غذا ملتی۔

لیکن پانچ ہزار کی پونجی کو اس طرح چھوڑ دینا کہ اس کا دھیان ہی نہ آئے پرکاش کے لیے ناممکن تھا۔ وہ کہیں باہر جاتا تو ایک بار صندوق کو ضرور کھولتا۔

ایک دن پڑوسی میں چوری ہوگئی۔ اس دن سے پرکاش کمرے میں ہی سونے لگا۔ جون کا مہینہ تھا، گرمی کے مارے دم گھٹا تھا۔ چمپا نے کئی بار باہر سونے کو کہا لیکن پرکاش نہ مانا۔ اکیلا گھر کیسے چھوڑدے۔

چمپا نے کہا ''چوری ایسوں کے گھر نہیں ہوتی ۔ چور کچھ دیکھ کرہی جان خطرے میں ڈالتے ہیں۔ یہاں کیا رکھا ہے۔

پرکاش نے غصہ سے کہا '' کچھ نہیں ہے۔ برتن تو ہیں۔ غریب کے لیے تو اپنی ہنڈیا ہی بہت ہے ۔

ایک دن چمپا نے کمرہ میں جھاڑو لگائی تو صندوق کو کھسکا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پرکاش نے صندوق کی جگہ بدلی ہوئی دیکھی تو بولا:

صندوق تم نے ہٹایا تھا۔
یہ پوچھنے کی بات نہ تھی۔ جھاڑو لگاتے وقت اکثر چیزیں اِدھر اُدھر کھسکا دی جاتی ہیں۔ بولی ''میں کیوں ہٹانے لگی''۔
پھر کس نے ہٹایا۔
میں نہیں جانتی۔
گھر میں تم رہتی ہو جانے کون؟
اچھا اگر میں نے ہی ہٹادیا تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔
کچھ نہیں یوں ہی پوچھتا تھا۔
مگر جب تک صندوق کھول کر دیکھ نہ لے پرکاش کو چین کہاں؟ چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی وہ صندوق کھول کر دیکھنے لگا۔ آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی تھیں۔ پکوڑیاں گرم گرم ہی مزہ دیتی ہیں۔ پرکاش کو پکوڑیاں پسند بھی بہت تھیں۔ اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے گئی۔ پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھماکے سے بند کردیا اور اسے بہلانے کے لیے بولا ''طشتری میں کیا لائیں آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی۔ پیٹ میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔
اچھا! پکوڑیاں ہیں۔
آج چمپا کے دل میں شبہ کا وہ اکھوا جیسے ہرا ہو کر لہلہا اٹھا۔ صندوق میں کیا ہے؟ یہ دیکھنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو گیا۔ پرکاش اس کی چابی چھپاکر رکھتا تھا۔ چمپا کو وہ تالی کسی طرح نہ ملی۔ ایک دن پھر پھیری والا بساطی پرانی چابیاں بیچنے آ نکلا۔ چمپا نے اس تالے کی چابی خرید لی اور صندوق کھول ڈالا۔ ارے یہ تو زیور ہیں۔ اس نے ایک ایک زیور نکال کر دیکھا، یہ کہاں سے آئے ہیں۔ مجھ سے تو کبھی ان کے متعلق بات چیت نہیں کی۔ معاً اس کے دل میں خیال گزرا۔ یہ زیورات ٹھاکر صاحب کے تو نہیں۔ چیزیں وہی تھیں جن کا ذکر وہ کرتے رہتے تھے۔ اسے اب کوئی شک نہیں رہا۔ لیکن اتنی بڑی شرم و ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ اس نے ایک دم صندوق بند کردیا اور پلنگ پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ ان کی اتنی ہمت پڑی کیسے؟ یہ کمینہ خواہش ان کے من میں آئی کیسے؟ میں نے تو کبھی

زیوروں کے لیے انھیں تنگ نہیں کیا اگر تنگ بھی کرتی تو کیا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ چوری کر کے لائیں۔ چوری کے زیوروں کے لیے ان کا ضمیر اتنا کمزرو کیوں ہوگیا۔

(٦)

اس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی۔ پرکاش سے اسے وہ محبت نہ رہی۔ یہ وہ عزت کا جذبہ، بات بات پر تکرار ہو جاتی، پہلے دونوں ایک دوسرے سے دل کی باتیں کہتے تھے۔ مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے، آپس میں ہمدردی تھی۔ مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں ایک بات بھی نہ ہوتی۔

کئی مہینے گزر گئے شہر کے ایک بینک میں اسسٹنٹ منیجر کی جگہ خالی ہوئی۔ پرکاس نے اکاؤنٹنٹ کا امتحان پاس کیا ہوا تھا۔لیکن شرط یہ تھی کہ نقد دس ہزار روپے کی ضمانت داخل کی جائے، اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے پرکاش تڑپ تڑپ کر رہ جاتا۔

ایک دن ٹھاکر صاحب سے اس معاملہ پر بات چیت چل پڑی۔ ٹھاکر صاحب نے کہا تم کیوں نہیں درخواست بھیجتے۔

پرکاش نے سر جھکا کر کہا۔ دس ہزار روپے کی نقد ضمانت مانگتے ہیں۔ میرے پاس روپے کہاں رکھے ہیں۔

اجی تم درخواست تو دو۔ اگر وہ سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی جائے گی۔ اس کا فکر نہ کرو۔

پرکاش نے کہا آپ زر ضمانت داخل کردیں گے۔

''ہاں ہاں یہ کونسی بڑی بات ہے۔

پرکاش گھر کی طرف چلا تو بڑا اداس تھا۔ اس کو یہ نوکری ضرور ملے گی ۔ مگر پھر بھی وہ خوش نہیں ہے ۔ٹھاکر صاحب کی صاف دلی اور ان کے اس پر اتنے زبردست اعتماد سے دلی صدمہ ہو رہا ہے ان کی شرافت اس کے کمینے پن کو روندے ڈالتی ہے۔

اس نے گھر آکر چمپا کو خوشخبری سنائی۔ چمپا نے سن کر منہ پھیر لیا پھر ایک منٹ بعد بولی، ٹھاکر صاحب سے تم نے کیوں ضمانت دلوائی جگہ ملتی نہ سہی روٹیاں تو مل ہی جاتی ہیں، روپے پیسے کا معاملہ ہے کہیں بھول چوک ہو جائے تو تمھارے ساتھ ان کے ساتھ پیسے بھی جائیں۔

یہ تم کیسے سمجھتی ہو کہ بھول چوک ہوگی، کیا میں ایسا اناڑی ہوں؟

چمپا نے کہا آدمی کی نیت بھی تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔

پرکاش سناٹے میں آ گیا، اس نے چمپا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا مگر چمپا نے منھ پھیرلیا تھا۔ وہ اس کے اندرونی خیال کا اندازہ نہ لگا سکا۔ مگرایسی خوشخبری سن کربھی چمپا کا اداس رہنا اس کو کھٹکنے لگا۔ اس کے دل میں سوال پیدا ہوا۔ اس کے الفاظ میں کہیں طنز تو نہیں چھپا ہے۔ چمپا نے صندوق کھول کر کہیں دیکھ تو نہیں لیا اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے وہ اس وقت اپنی ایک آنکھ بھی نظر کر سکتا تھا۔

کھانے کے وقت پرکاش نے چمپا سے پوچھا۔ تم نے کیا سوچ کر کہا کہ آدمی کی نیت تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی؟ جیسے اس کی زندگی اورموت کا سوال ہو۔

چمپا نے آزردہ ہوکر کہا کہ کچھ نہیں میں نے دنیا کی بات کہی تھی۔

پرکاش کوتسلی نہ ہوئی۔ اس نے پوچھا:

کیا جتنے آدمی بنک میں ملازم ہیں ان کی نیت بدلتی رہتی ہے۔

چمپا نے گلا چھڑانا چاہا تم تو زبان پکڑتے ہو۔ ٹھاکر صاحب کے ہاں شادی ہی پر تم اپنی نیت ٹھیک نہ رکھ سکے۔ سو دو سو کی چیز گھر میں رکھ ہی لی۔

پرکاش کے دل کا بوجھ سا اتر گیا، مسکرا کر بولا ''اچھا تمھارا اشارہ اس طرف تھا لیکن میں کمیشن کے سوائے ان کی ایک پائی بھی نہیں چھوئی اور کمیشن لینا تو کوئی پاپ نہیں۔ بڑے بڑے حکام کھلے خزانے کمیشن لیا کرتے ہیں۔

چمپا نے نفرت کے لہجہ میں کہا کہ جو آدمی اپنے اوپر اتنا یقین رکھے اس کی آنکھ بچا کر ایک پائب بھی لینا گناہ سمجھتی ہوں۔ تمھاری شرافت جب جانتی کہ تم کمیشن کے روپے لے جا کر ان کے حوالے کردیتے ان چھ مہینوں میں انھوں نے

تمھارے ساتھ کیا کیا سلوک کیے کچھ دیا ہی ہے؟ مکان تم نے خود چھوڑا لیکن وہ بیس روپئے ماہوار دیے جاتے ہیں علاقے سے کوئی سوغات آتی ہے تمھارے لیے ضرور بھیجتے ہیں۔ تمھارے پاس گھڑی نہیں تھی اپنی گھڑی تمھیں دے دی۔ تمھاری کہارن جب ناغہ کرتی ہے خبر پاتے ہی اپنا نوکر بھیج دیتے ہیں۔ میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس انھوں نے ادا کی، اور دن میں دو دفعہ پوچھنے آیا کرتے تھے۔ یہ ضمانت کی کیا چھوٹی بات ہے۔ اپنے رشتہ داروں کی ضمانت جلدی سے کوئی دیتا ہی نہیں تمھاری ضمانت کے لیے نقد دس ہزار روپئے نکال کر دیئے۔اسے تم چھوٹی بات سمجھتے ہو۔ آج تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو ان کے روپئے تو ضبط ہو جائیں جو آدمی اپنے اوپر اتنی مہربانی کرے اس کے لیے ہمیں جان قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

پرکاش کھانا کھا کر لیٹا تو اس کا ضمیر اس کو ملامت کر رہا تھا۔ دکھتے ہوئے پھوڑے میں کتنا مواد بھرا ہوا ہے یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب نشتر لگایا جاتاہے۔ دل کی سیاہی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کوئی اسے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ کوئی سوشل پولیٹکل کارٹون دیکھ کر کیوں ہمارے دل پر چوٹ لگ جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ تصویر ہماری حیوانیت کو کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے، وہ جو دل کے اتھاہ سمندر میں بکھرا ہوا پڑا تھا اکٹھا ہو کر گھر سے نکلنے والے کوڑے کی طرح اپنی جسامت سے ہمیں متوحش کردیتا ہے۔ تب ہمارے منھ سے نکل پڑتا ہے۔ چمپا کے ان ملامت آمیز الفاظ نے پرکاش کی انسانیت کو بے دار کردیا۔ وہ صندوق کئی گنا بھاری ہو کر پتھر کی طرح اسے دبانے لگا۔ دل میں پھیلی ہوئی حرارتیں ایک نقطہ پرجمع ہو کر شعلہ گیر ہوگئیں۔

(۷)

کئی روز گذر گئے پرکاش کو بنک میں ملازمت مل گئی۔ اس تقریب میں اس کے ہاں مہمانوں کی دعوت ہے۔ ٹھاکر صاحب ان کی اہلیہ، ویراندر اور اس کی نئی دلہن بھی آئی ہوئی ہے۔ باہر یاردوست گابجا رہے ہیں، کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر

صاحب چلنے کو تیار ہوئے۔

پرکاش نے کہا ''آج آپ کو یہاں رہنا ہوگا، دادا میں اس وقت نہ جانے دوں گا۔

چمپا کو اس کی یہ ضد بری معلوم ہوئی۔ چار پائیاں نہیں ہیں۔ بچھونے نہیں ہیں اور نہ کافی جگہ ہی ہے۔ رات بھر ان کو تکلیف دینے اورخود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت اس کی سمجھ میں نہیں آئی لیکن پرکاش برابر ضد کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہوگئے۔

بارہ بجے ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے اور پرکاش باہر برآمدہ میں۔ تینوں عورتیں اندر کمرے میں تھیں۔ پرکاش جاگ رہا تھا۔ ویر کے سرہانے چابیوں کا گچھا پڑا ہوا تھا۔ پرکاش نے گچھا اٹھا لیا۔ پھرکمرہ کھول کر اس میں سے زیورات کا ڈبہ نکالا اور ٹھاکر صاحب کے گھر کی طرف چلا۔ کئی ماہ پیشتر اسی طرح لرزتے ہوئے دل کے ساتھ وہ ٹھاکر صاحب کے گھر میں گھسا تھا۔ اس کے پاؤں تب بھی اسی طرح تھر تھرا رہے تھے لیکن تب کانٹا چبھنے کا درد تھا آج کانٹا نکلنے کا۔ تب بخار کا چڑھاؤ تھا، حرارت اضطراب اور خلش سے پر۔ اب بخار کا اتار تھا۔ سکون، فرحت اور امنگ سے بھرا ہوا۔ تب قدم پیچھے ہٹتا تھا آج آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ویر اندر کا کمرہ کھولا اور اندر جاکر ٹھاکر صاحب کے پلنگ کے نیچے ڈبہ رکھ دیا۔ پھر فوراً باہر آکر دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ پڑا۔ ہنومان جی سنجیونی بوٹی والا پہاڑ کا ٹکڑا اٹھائے جس روحانی سرور کا لطف اٹھا رہے تھے ویسی ہی خوشی پرکاش کو بھی ہو رہی تھی۔ زیوروں کو اپنے گھر لے جاتے ہوئے اس کی جان سوکھی ہوئی تھی۔ گویا کہ کسی گہرائی اتھاہ گہرائی میں گرا جارہا ہو۔ آج ڈبہ کو لوٹا کر اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ایروپلین میں بیٹھا ہوا فضا میں اڑا جارہا ہے اوپر اوپر...... اور اوپر۔

وہ اوپر پہنچا تو ویر سویا ہوا تھا۔ چابیوں کا گچھا اس کے سرہانے رکھ دیا۔

(۸)

ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے۔

پرکاش شام کو پڑھانے جایا کرتا تھا آج وہ بے صبر ہو کر تیسرے پہر ہی جا پہنچا دیکھنا چاہتا تھا وہاں آج کیا گل کھلتا ہے؟

ویر اندر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا ''بابو جی کل آپ کے یہاں کی دعوت بڑی مبارک تھی۔ جو زیورات چوری گئے تھے سب مل گئے۔

ٹھاکر صاحب بھی آ گئے اور بولے ''بڑی مبارک دعوت تھی تمھاری۔ پورا کا پورا ڈبہ مل گیا ایک چیز بھی نہیں گئی۔ جیسے امانت رکھنے کے لیے ہی لے گیا ہو۔

پرکاش کو ان باتوں پر یقین کیسے آئے جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے۔ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چوری کیا ہوا مال چھ ماہ بعد مل جائے اور جوں کا توں۔

ڈبہ کھول کر اس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا تعجب کی بات ہے میری عقل تو کام نہیں کرتی۔

ٹھاکر۔ کسی کی عقل کام نہیں کرتی بھائی تمھاری ہی کیوں؟ ویرو کی ماں تو کہتی ہے کوئی غیبی معجزہ ہے۔ آج سے مجھے بھی معجزات پر یقین ہوگیا۔

پرکاش : اگر آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے یقین نہ آتا۔

ٹھاکر : آج اس خوشی میں میرے یہاں دعوت ہوگی۔

پرکاش : آپ نے کوئی منتر ونتر تو نہیں پڑھوا لیا کسی سے ۔

ٹھاکر : کئی پنڈتوں سے ۔

پرکاش : تو یہ اسی کی برکت ہے۔

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خبر سنائی تو وہ دوڑ کر اس کے گلے سے چمٹ گئی اور نہ جانے کیوں رونے لگی؟ جیسے اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدت کے بعد گھر آ گیا ہو۔

پرکاش نے کہا ''آج ان کے ہاں ہماری دعوت ہے۔

میں بھی ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی۔
تم سینکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو۔
مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ لاکھوں روپے خرچ کرنے پر بھی ارمان پورا نہ ہوگا۔
پرکاش کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

یہ افسانہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری کے مارچ 1932 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا چمتکار۔ یہ مانسرور نمبر2 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ لاہور کے چندن میں اگست 1932 میں شائع ہوا۔ یہ زاد راہ میں شامل ہے۔

شکوہ شکایت

زندگی کا بڑا حصہ تو اسی گھر میں گزر گیا مگر کبھی آرام نہ نصیب ہوا۔ میرے شوہر دنیا کی نگاہ میں بڑے نیک اور خوش خلق اور فیاض اور بے دار مغز ہوں گے۔ لیکن جس پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔ دنیا کو تو ان لوگوں کی تعریف میں مزہ آتا ہے جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے آپ کو تباہ کئے ڈالتے ہوں۔ جو گھر والوں کے لیے مرتا ہے اس کی تعریف دنیا والے نہیں کرتے۔وہ تو ان کی نگاہ میں خود غرض ہے، بخیل ہے، تنگ دل ہے، مغرور ہے، کورباطن ہے۔ اسی طرح جو لوگ باہر والوں کے لیے مرتے ہیں ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے؟اب انھیں کو دیکھو، صبح سے شام تک مجھے پریشان کیا کرتے ہیں۔ باہر سے کوئی چیز منگواؤ تو ایسی دوکان سے لائیں گے جہاں کوئی گاہک بھول کر بھی نہ جاتا ہو۔ ایسی دوکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے نہ دام ہی مناسب۔ یہ نقائص نہ ہوتے تو وہ دوکان بدنام ہی کیوں ہوتی؟انھیں ایسی ہی دوکانوں سے سودا سلف خریدنے کا مرض ہے۔ بارہا کہا کسی چلتی ہوئی دوکان سے چیزیں لایا کرو۔ وہاں مال زیادہ کھپتا ہے۔ اس لیے تازہ مال آتا رہتا ہے۔ مگر نہیں ٹٹپونجیوں سے ان کو ہمدردی ہے۔ اور وہ انھیں الٹے استرے سے مونڈتے ہیں۔ گیہوں لائیں گے تو سارے بازار سے خراب، گھنا ہوا، چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے، دال میں کنکر بھرے ہوئے۔ منوں لکڑی جلا ڈالو۔ کیا مجال کہ گلے گھی

لائیں گے تو آدھوں آدھ تیل، اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم۔ تیل لائیں گے تو ملاوٹ کا، بالوں میں ڈالوں تو چکٹ جائیں، مگر دام دے آئیں گے اعلی درجے کے چنبیلی کے تیل کے۔ چلتی ہوئی دکان پر جاتے تو جیسے انھیں ڈر لگتا ہے۔ شاید اونچی دکان اور پھیکے پکوان کے قائل ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں۔

ایک دن کی بات ہو تو برداشت کرلی جائے۔ روز روز کی یہ مصیبت نہیں ہوتی۔ میں کہتی ہوں آخر ٹٹپونجیوں کی دکان پر جاتے ہی کیوں ہیں؟ کیا ان کی پرورش کا ٹھیکہ تمھیں نے لے لیا ہے؟ آپ فرماتے ہیں" مجھے دیکھ کر بلانے لگتے ہیں"خوب! ذرا انھیں بلا لیا اور خوشامد کے دو چار الفاظ سنا دیے پس آپ کا مزاج آسمان پر جا پہنچا۔ پھر انھیں سدھ نہیں رہتی کہ وہ کوڑا کرکٹ باندھ رہا ہے یا کیا۔ پوچھتی ہوں کہ تم اس راستے سے جاتے ہی کیوں ہو؟ کیوں کسی دوسرے راستے سے نہیں جاتے؟ ایسے اٹھائی گیروں کو منہ ہی کیوں لگاتے ہو؟ اس کا کوئی جواب نہیں ایک خموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

ایک بار ایک زیور بنوانا تھا۔ میں تو حضرت کو جانتی تھی ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک پہچان کے سنار کو بلارہی تھی اتفاق سے آپ بھی موجود تھے۔ بولے" یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں۔ دھوکا کھاؤ گی۔ میں ایک سنار کو جانتاہوں میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں میرے ساتھ چال بازی نہیں کر سکتا۔ میں نے سمجھا جب ان کا دوست ہے اور وہ بھی بچپن کا تو کہاں تک دوستی کا حق نہ نبھائے گا۔ سونے کا ایک زیور اور پچاس روپئے ان کے حوالے کئے۔ اور اس بھلے آدمی نے وہ چیز اور روپئے نہ جانے کس بے ایمان کو دے دیئے کہ برسوں کے پیہم تقاضوں کے بعد جب چیز بن کر آئی تو روپئے میں آٹھ آنے تانبا، اور اتنی بدنما کہ دیکھ کر گھن آتی تھی، برسوں کا ارمان خاک میں مل گیا۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہی، ایسے ایسے وفادار تو ان کے دوست ہیں جنھیں دوست کی گردن پر چھری پھیرنے میں عار نہیں۔ ان کی دوستی بھی انھیں لوگوں سے ہے جو زمانہ بھر کے فاقہ مست، قلانچ، بے سروسامان ہیں۔ جن کا پیشہ ہی ان جیسے آنکھ کے اندھوں

سے دوستی کرنا ہے۔ روز ایک نہ ایک صاحب مانگنے کے لیے سر پر سوار رہتے ہیں، اور بلا لیے گلا نہیں چھوڑتے، مگر ایسا کبھی نہ ہوا کہ کسی نے روپے ادا کئے ہوں۔ آدمی ایک بار کھوکر سیکھتا ہے، دوبارکھو کر سیکھتا ہے، مگر یہ بھلے مانس ہزار بار کھو کر بھی نہیں سیکھتے، جب کہتی ہوں روپے تو دے آئے اب مانگ کیوں نہیں لاتے؟ کیا مرگئے تمھارے دوست، تو بس بغلیں جھانک کر رہ جاتے۔ آپ سے دوستوں کو سوکھا جواب نہیں دیا جاتا۔ خیر سوکھا جواب نہ دو میں بھی نہیں کہتی کہ دوستوں سے بے مروتی کرو۔ مگر ٹال تو سکتے ہو۔ کیا بہانے نہیں بنا سکتے ہو؟ مگر آپ انکار نہیں کرسکتے۔ کسی دوست نے کچھ طلب کیا اور آپ کے سر پر بوجھ پڑا۔ بیچارے کیسے انکار کریں۔ آخر لوگ جان جائیں گے یہ حضرت بھی فاقہ مست ہیں۔ دنیا انھیں امیر سمجھتی ہے چاہے میرے زیور ہی کیوں نہ گرو رکھنے پڑیں۔ سچ کہتی ہوں بعض اوقات ایک ایک پیسے کی تنگی ہو جاتی ہے۔ اور اس بھلے آدمی کو روپے جیسے گھر میں کاٹتے ہیں۔ جب تک روپیوں کے وارے نیارے نہ کرلے اسے کسی پہلو قرار نہیں۔ ان کے کرتوت کہاں تک کہوں ؟ میرا توناک میں دم آگیا۔ ایک نہ ایک مہمان روز بلائے بے درماں کی طرح پر سوار۔ نہ جانے کہاں کے بے فکرے ان کے دوست ہیں؟ کوئی کہیں سے آکر مرتا ہے، کوئی کہیں سے۔گھر کیا ہو اپاہجوں کا اڈا ہے۔ ذرا سا تو گھر، مشکل سے دو تو چار پائیاں، اوڑھنا بچھونا بھی باافراط نہیں مگر آپ ہیں کہ دوستوں کو دینے کے لیے تیار۔ آپ تو مہمان کے ساتھ لیٹیں گے۔ اس لیے انھیں چارپائی بھی چاہیے۔ اوڑھنا بچھونا بھی چاہیے ورنہ گھر کا پردہ کھل جائے۔ جاتی ہے تو میرے اور بچوں کے سرزمیں پر پڑے سکڑ کر رات کاٹتے ہیں۔ گرمیوں میں تو خیر مضائقہ نہیں لیکن جاڑوں میں تو بس قیامت ہی آجاتی ہے، گرمیوں میں بھی کھلی چھت پر تو مہمانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اب میں بچوں کو لیے قفس میں پڑی تڑپا کروں۔ اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جب گھر کی یہ حالت ہے تو کیوں ایسوں کو مہمان بنائیں؟ جن کے پاس کپڑے لتے تک نہیں خدا کے فضل سے ان کے سبھی دوست ایسے ہی ہیں۔ ایک بھی خدا کا بندہ ایسا نہیں جو ضرورت کے وقت انھیں دھیلے سے بھی مدد کر سکے۔ دو ایک بار حضرت کو اس کا تجربہ اور بے حد تلخ تجربہ ہو چکا

ہے۔ مگر اس مرد خدانے تو آنکھیں کھولنے کی قسم کھالی ہے۔ ایسے ہی ناداروں سے ان کی پٹتی ہے، ایسے ایسے لوگوں سے آپ کی دوستی ہے کہ کہتے شرم آتی ہے۔ جسے کوئی اپنے دروازے پر کھڑا بھی نہ ہونے دے، وہ آپ کا دوست ہے۔ شہر میں اتنے امیرکبیر ہیں آپ کا کسی سے بھی ربط ضبط نہیں، کسی کے پاس نہیں جاتے امراء مغرور ہیں، مدمغ ہیں، خوشامد پسند ہیں، ان کے پاس کیسے جائیں دوستی گانٹھیں گے ایسوں سے جن کے گھر میں کھانے کو بھی نہیں۔

ایک بار ہمارا خدمت گار چلا گیا اور کئی دن دوسرا خدمت گار نہ ملا۔ میں کسی ہوشیار اور سلیقہ مند نوکر کی تلاش میں تھی مگر بابو صاحب کو جلد سے جلد کوئی آدمی رکھ لینے کی فکر سوار ہوئی۔ گھر کے سارے کام بدستور چل رہے تھے مگر آپ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی رکی ہوئی ہے، ایک دن جانے کہاں سے ایک بانگڑو کو پکڑ لائے اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی جانگلو ہے مگر آپ نے اس کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ کیا کہوں! بڑا فرماں بردار ہے، پر لے سرے کا ایمان دار، بلا کا محنتی، غضب کا سلیقہ شعار اور انتہا درجہ کا باتمیز، خیر میں نے رکھ لیا۔ میں بار بار کیوں کر ان کی باتوں میں آجاتی ہوں، مجھے خود تعجب ہے۔ یہ آدمی صرف شکل سے آدمی تھا آدمیت کی کوئی علامت اس میں نہ تھی۔ کسی کام کی تمیز نہیں، بے ایمان نہ تھا مگر احمق اول نمبر کا، بے ایمان ہوتا تو کم سے کم اتنی تسکین تو ہوتی کہ خود کھاتا ہے۔ کم بخت دکانداروں کی فطرتوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ اسے دس تک گنتی بھی نہ آتی تھی۔ایک روپیہ دے کر بازار بھیجوں تو شام تک حساب نہ سمجھا سکے۔ غصہ پی پی کر رہ جاتی تھی۔ خون جوش کھانے لگتا تھا کہ سور کے کان اکھاڑ لوں مگر ان حضرت کو کبھی اسے کچھ کہتے نہیں دیکھا۔ آپ نہا کر دھوتی چھانٹ رہے ہیں اور وہ دور بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے۔ میرا خون کھولنے لگتا لیکن انھیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ جب میرے ڈانٹنے پر دھوتی چھانٹنے جاتا تو بھی تو آپ اسے قریب نہ آنے دیتے۔ اس کے عیبوں کو ہنر بنا کر دکھایا کرتے تھے اور اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو ان عیوب پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ کم بخت کو جھاڑو دینے کی بھی تمیز نہ تھی۔ مردانہ کمرہ ہی تو سارے گھر میں ڈھنگ کا ایک کمرہ ہے، اس میں جھاڑو دیتا تو ادھر کی چیز

ادھر، اوپر کی نیچے گویا سارے کمرے میں زلزلہ آ گیا ہو اور گرد کا یہ عالم کہ سانس لینی مشکل۔ مگر آپ کمرے میں اطمینان سے بیٹھے رہتے گویا کوئی بات ہی نہیں۔ ایک دن میں نے اسے خوب ڈانٹا اور کہہ دیا ''اگر کل سے تونے سلیقہ سے جھاڑو نہ دی تو کھڑے کھڑے نکال دوں گی''۔ سویرے سو کر اٹھی تو دیکھتی ہوں کمرے میں جھاڑو دی ہوئی ہے، ہر ایک چیز قرینے سے رکھی ہے، گرد و غبار کا کہیں نام نہیں۔ آپ نے فوراً ہنس کر کہا۔ ''دیکھتی کیا ہو آج گھورے نے بڑے سویرے جھاڑو دی ہے۔ میں نے سمجھا دیا تم طریقہ تو بتاتی نہیں ہو۔ الٹی ڈانٹنے لگتی ہو''۔ لیجیے صاحب یہ بھی میری ہی خطا تھی، خیر میں نے سمجھا اس نالائق نے کم سے کم ایک کام تو سلیقے کے ساتھ کیا۔ اب روز کمرہ صاف ستھرا ملتا، اور میری نگاہوں میں گھورے کی کچھ وقعت ہونے لگی۔ اتفاق کی بات ایک دن میں ذرا معمول سے سویرے اٹھ بیٹھی اور کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گھورے دروازے پر کھڑا ہے اور خود بدولت بڑی تندہی سے جھاڑو دے رہے ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، ان کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور گھورے کے سر پر پٹک دی۔ حرام خور کو اسی وقت دھتکار بتائی۔ آپ فرمانے لگے اس کی تنخواہ تو بے باق کردو۔ خوب۔ ایک تو کام نہ کرے دوسرے آنکھیں دکھائے اس پر تنخواہ بھی دے دوں۔ میں نے ایک کوڑی بھی نہ دی۔ ایک کرتا دیا تھا وہ بھی چھین لیا۔ اس پر حضرت کئی دن مجھ سے روٹھے رہے۔ گھر چھوڑ کر بھاگے جارہے تھے بڑی مشکلوں سے رکے۔

ایک دن مہتر نے اتارے کپڑے کا سوال کیا۔ اس بے کاری کے زمانہ میں فالتو کپڑے کس کے گھر میں ہیں۔ شاید رئیسوں کے گھر میں ہوں۔ میرے یہاں تو ضروری کپڑے بھی کافی نہیں۔ حضرت ہی کا توشہ خانہ ایک بقچی میں آجائے گا جو ڈاک کے پارسل سے کہیں بھیجا جا سکتا ہے۔ پھر اس سال سردی کے موسم میں نئے کپڑے بنوانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ میں نے مہتر کو صاف جواب دے دیا۔ سردی کی شدت تھی اس کا مجھے خود احساس تھا، غریبوں پر کیا گزرتی ہے اس کا بھی علم تھا لیکن میرے یا آپ کے پاس اس کا افسوس کے سوا اور کیا علاج ہے۔ جب رؤساء اور امراء کے پاس ایک ایک مال گاڑی کپڑوں سے بھری ہوئی ہے تو

پھر غرباء کیوں نہ برہنگی کا عذاب جھیلیں خیر، میں نے تو اسے جواب دے دیا۔ آپ نے کیا کیا اپنا کوٹ اتار کر اس کے حوالے کردیا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ حضرت کے پاس یہی ایک کوٹ تھا۔ یہ خیال نہ ہوا کہ پہنیں گے کیا۔ مہتر نے سلام کیا، دعائیں دیں اور اپنی راہ لی۔ آخرکئی دن سردی کھاتے رہے۔ صبح کو گھومنے جایا کرتے تھے، وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ مگر دل بھی قدرت نے انھیں عجیب قسم کا دیا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنتے آپ کو شرم نہیں آتی، میں تو کٹ جاتی ہوں آپ کو مطلق احساس نہیں۔ کوئی ہنستا ہے تو ہنسے۔ آپ کی بلاسے، آخر مجھ سے دیکھا نہ گیا تو ایک کوٹ بنوا دیا۔ جی تو جلتا تھا کہ خوب سردی کھانے دوں مگر ڈری کہ کہیں بیمار پڑجائیں تو اور بھی آفت آجائے۔ آخر کام تو انھیں کو کرنا ہے۔

یہ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے میں کتنا نیک نفس اور منکر مزاج ہوں شاید انھیں ان اوصاف پر ناز ہو میں انھیں نیک نفس نہیں سمجھتی ہوں۔ یہ سادہ لوحی ہے۔ سیدھی سادی حماقت جس مہتر کو آپ نے اپنا کوٹ دیا اسی کو میں نے کئی بار رات شراب کے نشے میں بدمست جھومتے دیکھا ہے اور آپ کو دکھا بھی دیا ہے۔ تو پھر دوسروں کی کج روی کا تاوان ہم کیوں دیں؟ اگر آپ نیک نفس اور فیاض ہوتے تو گھر والوں سے بھی تو فیاضانہ برتاؤ کرتے یا ساری فیاضی باہر والوں کے لیے ہی مخصوص ہے۔ گھر والوں کو اس کا عشر عشیر بھی نہ ملنا چاہیے۔ اتنی عمر گزر گئی مگر اس شخص نے کبھی اپنے دل سے میرے لیے ایک سوغات بھی نہ خریدی۔ بے شک جو چیز طلب کروں اسے بازار سے لانے میں انھیں کلام نہیں۔ مطلق عذر نہیں مگر روپیہ بھی دے دوں یہ شرط ہے۔ انھیں خود کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ یہ میں مانتی ہوں کہ بے چارے اپنے لیے بھی کچھ نہیں لاتے۔ میں جو کچھ منگوا دوں اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ مگر انسان کبھی کبھی شوق کی چیزیں چاہتا ہی ہے اور مردوں کو دیکھتی ہوں گھر میں عورت کے لیے طرح طرح کی زیور، کپڑے، شوق سنگار کے لوازمات لاتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ رسم ممنوع ہے۔ بچوں کے لیے بھی مٹھائی، کھلونے، باجے، بگل شاید اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہ لائے ہوں۔ قسم سی کھالی ہے۔ اس لیے میں تو انھیں بخیل کہوں گی،مردہ دل کہوں گی،فیاض نہیں کہہ سکتی۔ دوسروں کے ساتھ ان کا

جو فیاضانہ سلوک ہے اسے میں حرص، نمود اور سادہ لوحی پر محمول کرتی ہوں۔ آپ کی منکسر مزاجی کا یہ حال ہے کہ جس دفتر میں آپ ملازم ہیں اس کے کسی عہدہ دار سے آپ کا میل جول نہیں۔ افسروں کو سلام کرنا تو آپ کے آئین کے خلاف ہے۔ نذر یا ڈالی کی بات ہے اور تو اور کبھی کسی افسر کے گھر جاتے ہی نہیں۔ اس کا خمیازہ آپ نہ اٹھائیں تو کون اٹھائے؟ اوروں کو رعایتی چھٹیاں ملتی ہیں، آپ کی تنخواہ کٹتی ہے۔ اوروں کی ترقیاں ہوتی ہیں آپ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ حاضری میں پانچ منٹ بھی دیر ہو جائے تو جواب طلب ہو جاتا ہے۔ بے چارے جی توڑ کر کام کرتے ہیں۔ کوئی پیچیدہ، مشکل کام آ جائے تو انھیں کے سر منڈھا جاتا ہے۔ انھیں مطلق عذر نہیں۔ دفتر میں انھیں گھسّو اور پسّو وغیرہ خطابات ملے ہوئے ہیں۔ مگر منزل کتنی ہی دشوار طے کریں ان کی تقدیر میں وہی سوکھی گھاس لکھی ہے۔ یہ انکسار نہیں ہے۔ میں تو اسے زمانہ شناسی کا فقدان کہتی ہوں۔ آخر کیوں کوئی شخص آپ سے خوش ہو؟ دنیا میں مروت اور رواداری سے کام چلتا ہے اگر ہم کسی سے کھنچے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم سے نہ کھنچا رہے، پھر جب دل میں کبیدگی ہوتی ہے تو وہ دفتری تعلقات میں ظاہر ہو جاتی ہے۔جو ماتحت افسر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے جس کی ذات سے افسر کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچتا ہے جس پر اعتبار ہوتاہے اس کا لحاظ وہ لازمی طور پر کرتا ہے۔ ایسے بے غرضوں سے کیوں کسی کو ہمدردی ہو نے لگی؟ افسر بھی انسان ہیں، ان کے دل میں جو اعزاز و امتیاز کی ہوس ہوتی ہے وہ کہاں پوری ہو جب اس کے ماتحت ہی فرنٹ رہیں۔ آپ نے جہاں ملازمت کی وہیں سے نکالے گئے کبھی کسی دفتر میں سال دو سال سے زیادہ نہ چلے یا تو افسروں سے لڑ گئے یا کام کی کثرت کی شکایت کر بیٹھے۔

آپ کو کنبہ پروری کا دعویٰ ہے۔ آپ کے کئی بھائی بھتیجے ہیں۔ وہ کبھی آپ کی بات بھی نہیں پوچھتے مگر آپ برابر ان کا منہ تاکتے رہتے ہیں۔ ان کے ایک بھائی صاحب آج کل تحصیلدار ہیں۔ گھر کی جائداد انھیں کی نگرانی میں ہے۔ وہ شان سے رہتے ہیں۔موٹر خرید لی ہے، کئی نوکر ہیں، مگر یہاں بھولے سے بھی خط نہیں لکھتے۔ ایک بار ہمیں روپئے کی سخت ضرورت ہوئی، میں نے کہا اپنے برادر مکرم

سے کیوں نہیں مانگتے۔ کہنے لگے کیوں انھیں پریشان کروں؟ آخر انھیں بھی تو اپنا خرچ کرنا ہے۔کون سی ایسی بچت ہو جاتی ہوگی؟ میں نے بہت مجبور کیا تو آپ نے خط لکھا معلوم نہیں خط میں کیا لکھا لیکن روپے نہ آنے تھے نہ آئے۔ کئی دنوں کے بعد میں نے پوچھا ''کچھ جواب آیا حضور کے بھائی صاحب کے در بارے'' آپ نے ترش ہو کر کہا ''ابھی ایک ہفتہ تو خط پہنچے ہوئے ہوا۔ ابھی کیا جواب آسکتا ہے؟ ایک ہفتہ اور گزرا اب آپ کا یہ حال ہے کہ مجھے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں عطا فرماتے۔ اتنے بشاش نظر آتے ہیں کہ کیا کہوں۔ باہر سے آتے ہیں تو خوش خوش۔ کوئی نہ کوئی شگوفہ لیے ہوئے۔ میری خوشامد بھی خوب ہورہی ہے۔ میرے میکے والوں کی بھی تعریف ہو رہی ہے۔ میں حضرت کی چال سمجھ رہی تھی۔ یہ ساری دلجوئیاں محض اس لیے تھیں کہ آپ کے برادر مکرم کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھوں۔ سارے ملکی، ہائی، اخلاقی، تمدنی مسائل میرے سامنے بیان کیے جاتے تھے۔ اتنی تفصیل اور شرح کے ساتھ کہ پروفیسر بھی دنگ رہ جائے۔ محض اس لیے کہ مجھے اس امر کی بابت کچھ پوچھنے کا موقعہ نہ ملے لیکن میں کیا چوکنے والی تھی۔ جب پورے دو ہفتے گذر گئے اور بیمہ کمپنی کے روپے روانہ کرنے کی تاریخ موت کی طرح سر پر آپہنچی تو میں نے پوچھا کیا ہوا؟ تمھارے بھائی صاحب نے ذہن مبارک سے کچھ فرمایا یا ابھی تک خط ہی نہیں پہنچا۔ آخر ہمارا حصہ بھی گھر کی جائداد میں کچھ ہے یا نہیں؟ یا ہم کسی لونڈی باندی کی اولاد ہیں؟ پانچ سو روپے سال کا منافع نو دس سال قبل تھا،اب ایک ہزار سے کم نہ ہوگا۔ کبھی ایک جھنجی کوڑی بھی ہمیں نہیں ملی۔ موٹے حساب سے ہمیں دو ہزار ملنا چاہیے۔ دوہزار نہ ہو، ایک ہزار ہو، پانچسو ہو، ڈھائی سو ہو، کچھ نہ ہو تو بیمہ کمپنی کے پریمیم بھرنے کو تو ہو۔ تحصیلدار کی آمدنی ہماری آمدنی سے چوگنی ہے۔ رشوتیں بھی لیتے ہیں۔ تو پھر ہمارے روپے کیوں نہیں دیتے؟ آپ ہیں ہیں، ہاں ہاں کرنے لگے۔ بچارے گھر کی مرمت کراتے ہیں، عزیز و اقارب کی مہمانداری کا بار بھی تو انھیں پر ہے۔ خوب! گویا جائداد کا منشاء محض یہ ہے کہ اس کی کمائی اسی میں صرف ہو جائے۔ اس بھلے آدمی کو بہانے بھی گھڑنے نہیں آتے۔ مجھ سے پوچھتے میں ایک نہیں ہزار بار بتا

دیتی۔ کہہ دیتے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا اثاثہ جل کر خاک ہوگیا۔ یا چوری ہوگئی۔ چور نے گھر میں تنکا تک نہ چھوڑا۔ یا دس ہزار کا غلہ خریدا تھا اس میں خسارہ ہوگیا۔ گھاٹے سے بیچنا پڑا۔ یا کسی سے مقدمہ بازی ہوگئی اس میں دیوالیہ پٹ گیا۔ آپ کو سوجھی بھی تو لچرسی بات۔ اس جولانی طبع پر آپ مصنف اور شاعر بھی بنتے ہیں۔ تقدیر ٹھونک کر بیٹھ رہی۔ پڑوس کی بی بی سے قرض لیے تب جا کر کہیں کام چلا۔ پھر بھی آپ بھائی،بھتیجوں کی تعریف کے پل باندھتے ہیں تو میرے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔ایسے برادران یوسف سے خدا بچائے۔

خدا کے فضل سے آپ کے دو بچے ہیں، دو بچیاں بھی ہیں، خدا کا فضل کہوں یا خدا کا قہر کہوں، سب کے سب اتنے شریر ہو گئے ہیں کہ معاذ اللہ۔ مگر کیا مجال کہ یہ بھلے مانس کسی بچے کو تیز نگاہ سے بھی دیکھیں۔رات کے آٹھ بج گئے ہیں، بڑے صاحب زادے ابھی گھوم کر نہیں آئے۔ میں گھبرا رہی ہوں آپ اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جھلائی ہوئی آتی ہوں اور اخبار چھین کر کہتی ہوں'' جاکر ذرا دیکھتے کیوں نہیں؟ لونڈا کہاں رہ گیا۔ نہ جانے تمھارے دل میں کچھ قلق ہے بھی یا نہیں؟ تمھیں تو خدا نے اولاد ہی ناحق دی۔ آج آئے تو خوب ڈانٹنا'' تب آپ بھی گرم ہوجاتے ہیں۔ ابھی تک نہیں آیا۔ بڑا شیطان ہے۔ آج بچا آتے ہیں تو کان اکھاڑ لیتا ہوں، مارے تھپڑوں کے کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ یوں بگڑ کر طیش کے عالم میں آپ اس کی تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ اتفاق سے آپ ادھر جاتے ہیں ادھر لڑکا آجاتا ہے۔ میں کہتی ہوں کدھر سے آ گیا۔ وہ بچارے تجھے ڈھونڈنے گئے ہوئے ہیں۔ دیکھنا آج کیسی مرمت ہوتی ہے۔ یہ عادت ہی چھوٹ جائے گی۔ دانت پیس رہے تھے۔ آتے ہی ہوں گے۔ چھڑی بھی ہاتھ میں ہے۔ تم اتنے شریر ہوگئے ہو کہ بات نہیں سنتے۔ آج قدر و عافیت معلوم ہو گی۔ لڑکا سہم جاتا ہے اور لیمپ جلا کر پڑھنے لگتا ہے۔ آپ ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتے ہیں۔ حیران و پریشان اور بدحواس، گھر میں قدم رکھتے ہی پوچھتے ہیں ''آیا کہ نہیں۔''

میں ان کا غصہ بھڑکانے کے ارادے سے کہتی ہوں'' آکر بیٹھا تو ہے، جا کر پوچھتے کیوں نہیں؟ پوچھ کر ہار گئی کہاں گیا تھا؟ کچھ بولتا ہی نہی۔

''آپ گرج پڑتے ہیں''منو یہاں آؤ۔''

لڑکا تھر تھر کانپتا ہوا آ کر آنگن میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں بچیاں گھر میں چھپ جاتی ہیں کہ خدا جانے کیا آفت نازل ہونے والی ہے۔چھوٹا بچہ کھڑکی سے چوہے کی طرح جھانک رہا ہے۔ آپ جامہ سے باہر ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی ہے۔ میں بھی وہ غضبناک چہرہ دیکھ کر پچھتانے لگتی ہوں کہ کیوں ان سے شکایت کی۔ آپ لڑکے کے پاس جاتے ہیں مگر بجائے اس کے کہ چھڑی سے اس کی مرمت کریں آہستہ سے اس کے کندھے پرہاتھ رکھ کربناوٹی غصہ سے کہتے ہیں ''تم کہاں گئے تھے جی؟ منع کیا جاتا ہے مانتے نہیں ہو۔ خبردار جو اب اتنی دیر کی۔ آدمی شام کو گھر چلا آتا ہے یا ادھر ادھر گھومتا ہے؟

میں سمجھ رہی ہوں یہ تمہید ہے۔ قصیدہ اب شروع ہو گا؟ گریز تو بری نہیں لیکن یہاں تمہید ہی خاتمہ ہو جاتی ہے۔ بس آپ کا غصہ فرو ہو گیا۔ لڑکا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے اور غالبا خوشی سے اچھلنے لگتاہے۔

میں احتجاج کی صدا بلند کرتی ہوں ''تم تو جیسے ڈر گئے بھلا دو چار طمانچے تو لگائے ہوتے۔ اس طرح تو لڑ کے شیر ہو جاتے ہیں۔ آج آٹھ بجے آیا ہے کل نو کی خبرلائے گا۔ اس نے بھی دل میں کیا سمجھا ہو گا۔

آپ فرماتے ہیں ''تم نے سنا نہیں میں نے کتنی زورسے ڈانٹا بچے کی روح ہی فنا ہو گئی ہوگی۔ دیکھ لینا جو پھر کبھی دیر میں آئے گا۔

''تم نے ڈانٹا تو نہیں ہاں آنسو پوچھ دیے''۔

آپ نے ایک نئی اپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہوجاتے ہیں، آپ کے خیال میں لڑکوں کو آزاد رہنا چاہیے۔ ان پر کسی قسم کی بندش یا دباؤ نہ ہونا چاہیے۔ بندش سے آپ کے خیال میں لڑکے کی دماغی نشو ونما میں رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ لڑکے شتر بے مہار بنے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک منٹ بھی کتاب کھول کر نہیں بیٹھتا۔ کبھی گلی ڈنڈا ہے، کبھی گولیاں، کبھی کنکوے، حضرت بھی انھیں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ چالیس سال سے تو متجاوز آپ کی عمر ہے مگر لڑکپن دل سے نہیں گیا۔ میرے باپ کے سامنے مجال تھی کوئی لڑکا کنکوا اڑا لے یا گلی ڈنڈا

کھیل سکے۔ خون پی جاتے۔ صبح سے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جاتے۔ اسکول سے جوں ہی لڑکے واپس آتے پھرے بیٹھتے۔ بس شام کو آدھ گھنٹے کی چھٹی دیتے۔ رات کو پھر کام میں جوت دیتے۔ یہ نہیں کہ آپ تو اخبار پڑھیں اور لڑکے گلی گلی کی خاک چھانتے پھریں۔ کبھی آپ بھی سینگ کٹا کر بچھڑے بن جاتے ہیں لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے باپ کا لڑکوں پر کیا رعب ہو سکتا ہے۔ ابا جان کے سامنے میرے بھائی سیدھے آنکھ اٹھا کر دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی قیامت آجاتی تھی انھوں نے گھر میں قدم رکھا اور خاموشی طاری ہوئی۔ ان کے روبرو جاتے ہوئے لڑکوں کی جان نکلتی تھی اور اسی تعلیم کی برکت ہے کہ سبھی اچھے عہدوں پر پہنچ گئے۔ صحت البتہ کسی کی بہت اچھی نہیں ہے تو ابا جان کی صحت ہی کون بہت اچھی تھی بے چارے ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتے پھر لڑکوں کی صحت کہاں سے اچھی ہوجاتی لیکن کچھ بھی ہو تعلیم و تادیب میں انھوں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی۔

ایک روز میں نے حضرت کو بڑے صاحب زادے کو کنکوا کی تعلیم دیتے دیکھا۔ یوں گھماؤ، یوں غوطہ دو، یوں کھینچوں، یوں ڈھیل دو، ایسا دل و جان سے سکھا رہے تھے گویا گرو منتر دے رہے ہوں۔ اس دن میں نے بھی ان کی ایسی خبر لی کہ یاد کرتے ہوں گے۔ میں نے صاف کہہ دیا تم کون ہوتے ہو میرے بچوں کو بگاڑنے والے۔ تمھیں گھر سے کوئی مطلب نہیں ہے، نہ ہو۔ لیکن آپ میرے بچوں کو خراب مت کیجیے۔ برے برے شوق نہ پیدا کیجیے۔ اگر آپ انھیں سدھار نہیں سکتے تو کم سے کم بگاڑ یئے مت۔ لگے باتیں بنانے، ابا جان کسی لڑکے کو میلے تماشے نہ لے جاتے تھے۔ لڑکا سر پٹک کر مر جائے مگر ذرا بھی نہ پسیجتے تھے اور ان بھلے آدمی کا یہ حال ہے کہ ایک ایک سے پوچھ کر میلے لے جاتے ہیں۔ چلو چلو، وہاں بڑی بہار ہے، خوب آتش بازیاں چھوٹیں گی۔ غبارے اڑیں گے۔ ولائتی چرخیاں بھی ہیں ان پر مزے سے بیٹھنا اور تو اور آپ لڑکوں کو ہاکی کھیلنے سے بھی نہیں روکتے۔ یہ انگریزی کھیل بھی کتنے خوفناک ہوتے ہیں۔ کرکٹ، فٹ بال، ہاکی ایک سے ایک مہلک، گیند لگ جائے تو جان ہی لے کر چھوڑے۔ مگر آپ کو ان

کھیلوں سے بڑی رغبت ہے۔ کوئی لڑکا میچ میں جیت کر آجاتا تو کتنے خوش ہوتے ہیں گویا کوئی قلعہ فتح کر آیا ہو۔ حضرت کو ذرا بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کسی لڑکے کے چوٹ لگ گئی تو کیا ہو گا؟ ہاتھ، پاؤں ٹوٹ گیا تو بچاروں کی زندگی کیسے پار لگے گی؟

پچھلے سال لڑکی کی شادی تھی۔ آپ کو یہ ضد تھی کہ جہیز کے نام کافی کوڑی بھی نہ دیں گے۔ چاہے لڑکی ساری عمر کنواری بیٹھی رہے۔ آپ اہل دنیا کی خبیث النفسی آئے دن دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر بھی چشم بصیرت نہیں کھلتی۔ جب تک سماج کا یہ نظام قائم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے اس وقت تک یہ رسم فنا نہیں ہو سکتی۔ دو چار افراد بھلے ہی ایسے بے دار مغز نکل آئیں جو جہیز لینے سے انکار کریں، لیکن اس کا اثر عام حالات پر کم ہوتا ہے اور برائی بدستور قائم رہتی ہے۔ جب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لیے بھی بیس پچیس کی عمر تک کنواری رہنا بدنامی کا باعث نہ سمجھا جائے گا اس وقت آپ ہی آپ یہ رسم رخصت ہو جائے گی۔ میں نے جہاں جہاں پیغام دے۔ جہیز کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اور آپ نے ہر موقع پر ٹانگ اڑادی۔ جب اس طرح ایک سال پورا گذر گیا اور لڑکی کا سترھواں سال شروع ہو گیا تو میں نے ایک جگہ بات پکی کر لی۔ حضرت بھی راضی ہو گئے کیوں کہ ان لوگوں نے قرار داد نہیں کی! حالانکہ دل میں انھیں پورا یقین تھا کہ ایک اچھی رقم ملے گی اور میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ اپنے مقدور بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھوں گی۔ شادی کے بخیر و عافیت انجام پانے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن ان مہاشے کے آگے میری ایک نہ چلتی تھی۔ یہ رسم بے ہودہ ہے، یہ رسم بے معنی ہے، یہاں روپئے کی کیا ضرورت؟ یہاں گیتوں کی کیا ضرورت؟ ناک میں دم تھا۔ یہ کیوں وہ کیوں؟ یہ تو صاف جہیز ہے۔ تم نے میرے منھ میں کالک لگادی۔ میری آبرو مٹادی۔ ذرا خیال کیجیے بارات دروازے پر پڑی ہوئی ہے اور یہاں بات بات پر رد و قدح ہو رہی ہے۔ شادی کی ساعت رات کے بارہ بجے تھے اس دن لڑکی کے ماں باپ برت رکھتے ہیں۔ میں نے بھی برت رکھا۔ لیکن آپ کو ضد تھی کہ برت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب لڑکے کے والدین برت نہیں

رکھتے تو لڑکی کے والدین کیوں رکھیں؟اور سارا خاندان ہر چند منع کرتا رہا۔ لیکن آپ نے حسب معمول ناشتہ کیا، کھانا کھایا۔ خیر رات کو شادی کے وقت کنیا دان کی رسم آئی۔ آپ کو کنیا دان کی رسم پر ہمیشہ سے اعتراض ہے اسے آپ مہمل سمجھتے ہیں لڑکی دان کی چیز نہیں۔ دان روپئے پیسے کا ہوتا ہے جانور بھی دان دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن لڑکی کا دان ایک لچر سی بات ہے۔ کتنا سمجھاتی ہوں''صاحب پرانا رواج ہے، شاشتروں میں صاف اس کا حکم ہے'' عزیز و اقارب سمجھا رہے ہیں مگر آپ ہیں کہ کان پر جوں نہیں رینگتی۔ کہتی ہوں دنیا کیا کہے گی؟ یہ لوگ کیا بالکل لامذہب ہو گئے مگر آپ کان ہی نہیں دیتے۔ پیروں پڑی، یہاں تک کہا کہ بابا تم کچھ نہ کرنا جو کچھ کرنا ہوگا میں کرلوں گی تم صرف چل کر منڈپ میں لڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ اور اسے دعا دو۔ مگر اس مرد خدا نے مطلق سماعت نہ کی۔ آخر مجھے رونا آ گیا۔ باپ کے ہوتے میری لڑکی کا کنیا دان چچا یا ماموں کرے یہ مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے تنہا کنیا دان کی رسم ادا کی آپ گھر جھانکے تک نہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ آپ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے۔ بارات کی رخصتی کے بعد مجھ سے مہینوں بولے نہیں۔ جھک مار کر مجھی کو منانا پڑا۔

مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انھیں پیار کرتی ہوں۔ ان میں وہ کونسی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں۔ مجھے خود نہیں معلوم۔ مگر کوئی چیز ہے ضرور جو مجھے ان کا غلام بنائے ہوئے ہے۔ وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں تو میں بے صبر ہو جاتی ہوں۔ ان کا سر بھی درد کرے تو میری جان نکل جاتی ہے۔آج اگر تقدیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پتلا، حسن اور دولت کا دیوتا بھی دے تو میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھوں۔ یہ فرض کی بیٹری نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ رواجی وفاداری بھی نہیں ہے بلکہ ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں، کچھ ایسی صلاحیتیں پیدا ہو گئی ہیں گویا کسی مشین کے کل پرزے گھس گھسا کر فٹ ہو گئے ہوں۔ اور ایک پرزے کی جگہ دوسرا پرزہ کام نہ دے سکے چاہے وہ پہلے سے کتنا ہی سڈول، نیا اور خوشنما کیوں نہ ہو؟

جانے ہوئے رستہ سے ہم بے خوف آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں۔ اس کے نشیب و فراز، موڑ اور گھماؤ اب ہماری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس کسی انجان رستے پر چلنا کتنی زحمت کا باعث ہوسکتا ہے ؟ قدم قدم پرگمراہ ہو جانے کے اندیشے، ہر لمحہ چور اور رہزن کا خوف، بلکہ شاید آج میں ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کر نے پر بھی تیار نہیں۔

یہ افسانہ بنارس کے ہندی ماہنامہ ہنس کے اپریل 1932 کے شمارے میں شائع ہوا عنوان تھا گلا۔ اردو میں واردات میں شامل ہے ہندی میں مانسروور نمبر ا میں شامل ہے۔ اور چندن 1932 میں شائع ہوا۔

ستی

ملیا کو دیکھتے ہوئے اس کا شوہر کلّو کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ملیا خوش و خرم ہے۔ اور کلو مغموم اور متفکر۔ ملیا کو کوڑی ملی ہے۔ اسے دوسرا کون پوچھے گا؟ کلو کو جواہر ملا ہے۔ اس کے سینکڑوں خریدار ہو سکتے ہیں۔ خاص کر اسے اپنے چچازاد بھائی راجہ سے بڑا اندیشہ تھا۔ راجہ خوب صورت ہے اور رنگین مزاج۔ باتیں کرنے میں چالاک ہے اور عورتوں کو رجھانا خوب جانتا ہے۔ اس لیے کلّو ملیا کو باہر نہیں نکلنے دیتا۔ اس پر کسی کی نظر بھی پڑ جائے یہ وہ برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ اب شب و روز محنت کرتا ہے تا کہ ملیا کو کسی بات کی تکلیف نہ ہو۔ اسے نہ جانے کس جزائے خیر میں یہ عورت ملی ہے۔ اور وہ اس پر دل و جان قربان کر دینا چاہتا ہے۔ ملیا کا کبھی سر بھی دکھتا ہے تو اس کی جان نکل جاتی ہے۔ ملیا کا بھی یہی حال ہے کہ جب تک کلو گھر واپس نہیں آتا ماہیٔ بے آب بنی رہتی ہے۔

گاؤں میں کتنے ہی نوجوان ہیں جو ملیا سے چھیڑکیا کرتے ہیں مگر اس کی نظر میں بد صورت کلو دنیا کے ہر انسان سے بہتر ہے۔

ایک دن راجہ نے کہا'' بھابی، بھیا تمھارے قابل نہیں ہیں''۔

ملیا نے فوراً جواب دیا ''قسمت میں تو وہی لکھے تھے۔ تمھیں کیوں کر پاتی؟

راجہ نے دل میں سوچا۔ اب مار لیا۔ بولا ''بھگوان نے بھی تو غلطی کی ہے''۔

ملیا مسکرا کر بولی'' اپنی غلطی کو وہی ٹھیک کرے گا''۔

راجہ خوش ہو گیا۔

(۲)

تیج کے دن کلو ملیا کے لیے لٹھے کی ساڑھی لا یا۔ جی تو چاہتا تھا کہ کوئی عمدہ سی ساڑھی لے مگر روپئے نہ تھے اور بزاز نے ادھار نہ مانا۔

راجہ بھی اسی دن قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ ایک عمدہ سی چندری لا کر ملیا کی نذر کی۔

ملیا نے کہا'' میرے لیے تو ساڑھی آ گئی ہے''۔

راجہ بولا'' میں نے دیکھی ہے۔ جبھی تو اسے لایا ہوں۔ وہ تمھارے لائق نہیں۔ بھیا کو کفایت بھی سوجھتی ہے تو ایسی باتوں میں''۔

ملیا نے ترچھی آنکھوں سے دیکھ کر کہا'' تم سمجھا کیوں نہیں دیتے''؟

راجہ پر ایک پیالے کا نشہ چڑھ گیا۔ بولا'' بڈھا طوطا کہیں پڑھتا ہے''؟

ملیا : مجھے تو لٹھے کی ساڑھی پسند ہے''۔

راجہ : ذرا یہ چندری پہن کر تو دیکھو۔ کیسی کھلتی ہے ؟

ملیا : جو لٹھا پہنا کر خوش ہوتا ہے وہ چندری پہننے سے خوش نہ ہو گا۔ اسے چندری پسند ہوتی تو وہ چندری ہی لاتا۔

راجہ : انھیں دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ملیا نے تعجب سے کہا ''تو کیا میں ان سے بغیر پوچھے لے لوں گی؟

راجہ : اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے؟ جب وہ کام پر چلے جائیں تب پہن لینا۔ میں بھی دیکھ لوں گا۔

ملیا قہقہہ مار کر ہنستی ہوئی بولی''یہ نہ ہو گا دیورجی،کہیں دیکھ لیں تو میری شامت ہی آ جائے۔ اسے تم لیتے جاؤ۔

راجہ نے بضد ہو کر کہا''ایسے نہ لوگی بھابی تو میں زہر کھا کر سو رہوں گا''۔

ملیا نے ساڑھی اٹھا کر طاق پر رکھ دی اور بولی'' لو، اب تو خوش ہو''۔

راجہ نے انگلی پکڑی '' ابھی تو بھیا نہیں ہیں، ذرا پہن لو''۔

ملیا نے اندر جا کر چندری پہن لی اور پھول کی طرح مہکتی دمکتی باہر آئی۔

راجہ نے بازو پکڑ نے کو ہاتھ بڑھا کر کہا '' ایسا جی چاہتا ہے کہ تمھیں لے کر کہیں بھاگ جاؤں۔

ملیا نے اسی سرور انگیز انداد سے جواب دیا''جانتے ہو تمھارے بھیا کا کیا حال ہو گا''؟

یہ کہہ کر ملیا نے کواڑ بند کر لیے۔

راجہ کو ایسا معلوم ہوا گویا سامنے سے پروسی ہوئی تھالی اٹھالی گئی۔

(۳)

ملیا کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ چندری کلو کو دکھا دے۔ مگر نتیجہ سوچ کر ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس نے چندری رکھ کیوں لی؟ اسے اپنے اوپر غصہ آرہا ہے۔ لیکن راجہ کو کتنا رنج ہوتا؟ کیا ہوا اس کی چندری ذرا دیر پہن لینے سے اس کا دل تو رہ گیا۔ لیکن اس کے دل کی ساکت گہرائیوں میں یہ ایک کیڑا جیسے اسے متھ رہا تھا۔ اس نے کیوں چندری رکھ لی کیا یہ کلو کے ساتھ دغا نہیں تھی؟ اس کا دل اس خیال سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے دل کو سمجھایا۔ دغا کیوں ہوئی؟ اس میں دغا کی کون سی بات ہے؟ کیا وہ راجہ سے بولی؟ ذرا ہنس دینے سے اگر کسی کا دل خوش ہو جاتا ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟

کلو نے پوچھا'' آج راجہ کیا کرنے آیا تھا؟

ملیا کا بدن کانپنے لگا۔ بہانہ کر کے بولی''تمبا کو مانگنے آئے تھے''۔

کلو نے ناک سکوڑکر کہا''اسے اندر مت آنے دیا کرو۔ اچھا آدمی نہیں ہے''۔

ملیا : میں نے کہہ دیا۔ تمبا کو نہیں ہے۔ تو چلے گئے

کلو نے کسی قدر تیز ہو کرکہا''کیوں جھوٹ بولتی ہو ؟ وہ تمباکو مانگنے نہیں آیا''۔

ملیا : تو اور یہاں کیا کر نے آئے تھے؟

کلو : اور کسی کام سے آیا ہو مگر تمباکو مانگنے نہیں آیا۔ وہ جانتا تھا میرے گھر میں تمباکو نہیں ہے۔ میں تمباکو کے لیے خود ہی اس کے گھر گیا تھا۔

ملیا کے بدن میں کاٹو تو خون نہیں چہرے کا رنگ اڑ گیا۔سر جھکا کر بولی ''میں کسی کے من کا حال کیا جانوں''؟

آج تیج کا برت تھا۔ ملیا پوجا کا سامان کر رہی تھی۔ پر اس طرح گویا اس کے دل میں ذرا بھی اعتقاد، ذرا بھی شوق نہیں ہے۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا اس کے منھ میں کالکھ پُت گئی ہے۔ اور اب وہ کلو کی آنکھوں سے گر گئی ہے۔ اسے اپنی زندگی ویران نظر آتی ہے۔

سوچنے لگی۔ بھگوان نے مجھے یہ حسن کیوں دیا؟ یہ روپ نہ ہوتا تو راجہ کیوں میرے پیچھے پڑتا؟ اور کیوں آج میری یہ حالت ہوتی؟ میں کالی اور بد صورت ہو کر اس سے کہیں زیادہ سکھی ہوتی۔ تب تو دل اتنا چنچل نہ ہوتا۔ جنھیں روپ کی کمائی کھانی ہو وہ روپ کو لے جائیں۔ یہاں اس نے زندگی برباد کر دی۔

نہ جانے کب اسے نیند آ گئی دیکھتی ہے، کلو مر گیا اور راجہ گھر میں گھس کر اسے پکڑنا چاہتا ہے۔ اسی وقت ایک بوڑھی عورت نہ جانے کدھر سے آ کر اسے گود میں لے لیتی ہے۔ اور کہتی ہے ''تو نے کلو کو کیوں مارڈالا''؟

ملیا رو روکر جواب دیتی ہے '' ماں میں نے انھیں نہیں مارا''۔

بڑھیا جواب میں کہتی ہے ''ہاں تونے انھیں چھری کٹار سے نہیں مارا لیکن تیری دغا کٹار سے زیادہ قاتل تھی''۔

ملیا رو دی۔

ملیا نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ تو سامنے صحن میں کلو سو رہا تھا۔ وہ دوڑی ہوئی اس کے پاس گئی اور اس کی چھاتی پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کلونے گھبرا کر پوچھا ''کون ہے؟ مولا کیوں روتی ہے؟ کیا ڈر گئیں؟ میں تو جاگ ہی رہا ہوں۔

ملیا نے سسکی لے کر کہا ''مجھ سے آج ایک خطا ہو گئی۔ اسے معاف کردو''۔

کلو اٹھ بیٹھا اور بولا '' کیا بات ہے ؟ کہو تو کیوں روتی ہو''؟

ملیا : راجہ تمبا کو مانگنے نہیں آیا تھا۔ میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا۔

کلو ہنس کر بولا '' وہ تو میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا''۔

ملیا : وہ میرے لیے ایک چندری لائے تھے۔

تم نے لوٹا دی نہ۔

ملیا کانپتی ہوئی بولی''میں نے لے لی، کہتے تھے میں زہر کھالوں گا''

کلو لمبی سانس لے کر چارپائی پر گر پڑا، اور بولا'' روپ تو میرے بس کی بات نہیں ہے۔ بھگوان نے بد صورت بنا دیا تو سندر کہاں سے ہوجاؤں؟

کلو نے اگر ملیا کو کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا ہوتا تو بھی اسے اتنا درد نہ ہوتا۔

(۴)

کلو اس دن سے کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ زندگی میں نہ وہ شوق رہا نہ مزا۔ ہنسنا بولنا گویا بھول گیا۔ ملیا نے اس کے ساتھ جتنی دغا کی تھی اس سے کہیں زیادہ اس نے سمجھ لیا اور یہی شبہہ اس کے دل میں سرطان کی طرح چمٹ گیا وہ گھر اب اس کے لیے صرف اٹھنے بیٹھنے کی جگہ تھی اور ملیا صرف کھانا پکا نے والی مشین، حظ نفس کے لیے وہ کبھی کبھی تاڑی خانے چلا جاتا، یا چرس کے دم لگاتا۔

ملیا اس کی یہ حالت دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی تھی۔ وہ اس شبہہ کو اس کے دل سے نکال دینا چاہتی تھی۔ اس لیے دل و جان سے اس کی خدمت کرتی۔ اسے خوش رکھنے کی مسلسل کوشش کرتی رہتی۔ مگر وہ جتنا ہی اسے کھینچنے کی کوشش کرتی۔ اتنا ہی دور وہ اس سے کھنچتا تھا۔ گو یا کوئی کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی ہو۔ غنیمت یہ ہوئی کہ راجہ جس انگریز کے یہاں نو کر تھا اس کا تبادلہ ہو گیا اور وہ اس کے ساتھ چلا گیا۔ نہیں تو دونوں بھائیوں میں سے کسی نہ کسی کا ضرور خون ہو جاتا۔ اس طرح سال بھر اور گذر گیا۔

ایک دن کلو رات کو گھر لوٹا تو اسکو بخار تھا۔ دوسرے دن اس کے جسم میں دانے نکل آئے۔ ملیا نے خیال کیا ماتا ہے۔ ماں منوتی کرنے لگی مگر چار پانچ دن ہی میں دانے بڑھ کر آبلے ہو گئے۔ اور معلوم ہوا یہ ماتا نہیں گرمی ہے۔ کلو کی خرمستی یہ رنگ لائی تھی۔

بیماری سیلاب کی رفتار سے بڑھنے لگی۔ آبلوں میں مواد پڑ گیا اور ان میں سے ایسی بد بو نکلنے لگی کہ پاس بیٹھتے ناک پھٹتی تھی۔دیہات میں جس طرح کا علاج ہو سکتا تھا وہ ملیا کرتی تھی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اور کلو کی حالت روز بروز بگڑتی جاتی تھی۔۔ علاج کے لیے پیسے کی بھی ضرروت تھی اور ملیا کو اب محنت مزدوری کرنی پڑ تی تھی۔ کلو ادھر اپنے کئے کا پھل بھوگ رہا تھا۔ ملیا ادھر دوا دارو میں مری جارہی تھی۔ اگر کچھ صبر تھا تو یہی کہ کلو کا اندیشہ اورشبہہ اس کی اس خدمت گذاری سے دور ہوتا جاتا تھا۔ اسے اب یقین ہو رہا تھا کہ ملیا اب بھی اسی کی ہے۔ وہ اگر کسی طرح اچھا ہو جاتا تو پھر اسے دل میں رکھتا۔ اور اس کی پرستش کرتا

صبح کا سہانا وقت تھا۔ ملیا نے کلو کا ہاتھ منھ دھلا کر دوا پلائی اور کھڑی پنکھا جھل رہی تھی کہ کلو نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا'' مولا، میں نے پچھلے جنم میں کوئی بھاری تپ کیا تھا کہ تم مجھے مل گئیں۔ اگر تمھاری جگہ مجھے دنیا کا راج بھی ملے تو نہ لوں''۔

ملیا نے دونوں ہاتھوں سے اس کا منھ بند کر لیا۔ اور بولی'' اگر اس طرح کی باتیں کرو گے تو میں رونے لگوں گی۔ میں بڑی قسمت ورتھی کہ تم جیسا شوہر پایا''۔

یہ کہتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھ شوہر کے گلے میں ڈال دیئے اور بولی ''بھگوان نے مجھے میرے پاپوں کا بدلہ دیا ہے''۔

کلو نے پرخلوص نظروں سے دیکھ کر پوچھا ''سچ کہو مولا'' راجہ اور تم میں کیا معاملہ تھا ''؟

ملیا نے حیرت میں آ کر کہا'' میرے اور ان میں اگر کوئی اور معاملہ ہو تو بھگوان میری اس سے بری حالت کریں۔ اس نے مجھے چندری دی تھی وہ میں نے

لے لی۔ پھر میں نے اسے آگ میں جلا دیا۔ تب سے میں اس کے ساتھ نہیں بولی''۔

کلو نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا'' میں نے کچھ اور ہی سمجھ رکھا تھا نہ جانے میری سمجھ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ تمھیں پاپ لگا کر خود ہی پاپ میں پھنس گیا اور اب اس کا پھل بھوگ رہا ہوں''۔

اس نے رورو کر اپنی بے راہ روی کا پردہ فاش کرنا شروع کیا اور ملیا آنسوؤں کی لڑیاں بہابہاکر سننے لگی۔ اگر شوہر کی فکر نہ ہوتی تو اس نے زہر کھا لیا ہوتا۔

کئی مہینے بعد راجہ چھٹی لے کر آیا اور کلو کی مہلک بیماری کا حال سنا تو بہت خوش ہوا۔ تیما داری کے بہانے سے کلو کے گھر آنے جانے لگا۔ کلو اسے دیکھ کر منھ پھیر لیتا لیکن وہ دن میں دو چار بار پہنچ ہی جاتا تھا۔

ایک دن ملیا کھانا پکارہی تھی کہ راجہ نے رسوئی خانہ کے دروازے پر آکر کہا:

''بھابی، کیا اب بھی مجھ پر مہربانی نہ ہوگی؟ کتنی بے رحم ہو تم؟ کئی دن سے میں تمھیں تلاش کررہا ہوں مگر تم مجھ سے بھاگتی پھرتی ہو۔ بھیا اب اچھے نہ ہوں گے۔ انھیں گرمی ہوگئی ہے۔ ان کے ساتھ کیوں اپنی زندگی خراب کر رہی ہو؟ تمھارا گلاب سا بدن سوکھ گیا ہے۔ میرے ساتھ چلو کچھ زندگی کے مزے اڑائیں۔ یہ جوانی بہت دن نہ رہے گی۔ یہ دیکھو تمھارے لیے ایک کرن پھول لایا ہوں۔ ذرا پہن کر مجھے دکھا دو''۔ اس نے کرن پھول ملیا کی طرف بڑھا دیا۔ ملیا نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں چولھے کی طرف دیکھتی ہوئی بولی: لالہ تمھارے پیروں پڑتی ہوں مجھے مت چھیڑو۔ یہ ساری مصیبت تمھاری ہی لائی ہوئی ہے۔ تمھیں میرے دشمن ہو۔ پھر بھی تمھیں شرم معلوم نہیں ہوتی۔ کہتے ہو بھیا اب کس کام کے ہیں؟ مجھے تو اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ تب میں نہ ہوتی تو وہ دوسری سگائی کر لیتے۔ اپنے ہاتھوں ٹھونک کھاتے۔آج میں ہی ان کا سہارا ہوں۔ وہ میرے سہارے زندہ ہیں۔ اگر اس مصیبت میں میں ان سے دگا کروں تو مجھ سے بڑھ کر پاپی اور کون ہو گا؟ اور جب میں جانتی ہوں کہ اس مصیبت کا کارن بھی میں ہی ہوں۔

راجہ نے ہنس کر کہا"یہ تو وہی ہوا جیسے کسی کی ڈال گرگئی تو اس نے کہا مجھے تو سوکھی ہی اچھی لگتی ہے"۔

ملیا نے نفرت انگیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا "تم ان کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہو، بکتے کیا ہو؟ اجلے کپڑے اور چکنے مکھڑے سے کوئی آدمی نہیں ہو جاتا۔ میری آنکھوں میں اب ان کے سامنے کوئی جچتا نہیں"۔

کلو نے پکارا "مولا تھوڑا پانی دے"۔

ملیا پانی لے کر دوڑی۔ چلتے چلتے کرن پھول ایسا ٹھکرایا کہ صحن میں جاکر گرا۔ راجہ نے جلدی سے کرن پھول اٹھا لیا۔ اور غصہ میں چلا گیا۔

(۵)

کلو کی بیماری روز بروز بڑھتی گئی۔ معقول علاج ہوتا تو شاید اچھا ہوجاتا مگر اکیلی ملیا کیا کیا کرتی۔ غریبی میں بیماری کوڑھ میں کھاج ہے۔

آخر ایک دن ملک الموت کا پیغام آ ہی پہونچا۔ ملیا گھر کا کام کاج کر کے آئی تو دیکھا کلو کی سانس زور زور سے چل رہی ہے۔ گھبرا کر بولی:

"کیسی طبیعت ہے تمھاری"؟

کلو نے آنکھوں میں آنسو بھرکر ہاتھ جوڑے اور سر نیچا کر لیا۔ یہ دم واپس تھا۔

ملیا اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ اور ہذیان کے عالم میں بولی" تم سے اتنا بھی نہ دیکھا گیا بھگوان۔ اور اس پر دیا لو کہلاتے ہو۔ اسی لیے مجھے پیدا کیا تھا، یہی تماشا دکھانے کے لیے؟ ہائے میرے سر تاج! تم تو اتنے بے درد نہ تھے۔ مجھے اکیلی چھوڑ کر چلے جا رہے ہو۔ ہائے اب کون مو لا کہہ کر پکارے گا؟ اب کس کے لیے کنوئیں سے پانی بھر کر لاؤں گی؟ کسے بٹھا کر کھلاؤں گی؟ کسے پنکھا ڈلاؤں گی؟ بھگوان سب کچھ لیا تو مجھے کیوں نہیں لے چلتے؟

سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ سبھی سمجھا رہے تھے۔ ملیا کو صبر نہ ہوتا تھا۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ یہ بات اسے نہ بھولتی تھی۔

(۶)

کلو کو مرے چھ مہینے ہو گئے۔ ملیا کماتی ہے، کھاتی ہے اور اپنے گھر میں پڑی رہتی ہے۔ دن بھر کام کاج سے فرصت نہیں ملتی۔ ہاں رات کو اکیلے میں بیٹھ کر کچھ دیر رو لیا کرتی ہے۔

ادھر راجہ کی عورت بھی مر گئی۔ مگر دو ہی چار دن کے بعد وہ پھر چھیلا بنا گھومنے لگا۔اب اور بھی چھوٹا سانڈ ہو گیا۔ پہلے عورت سے لڑائی ہو جانے کا خوف تھا۔ اب وہ بھی نہیں رہا۔ اب کے نوکری سے لوٹا تو سیدھا ملیا کے گھر پہنچا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بولا:

''بھابی، اب تو میری امید پوری کروگی یا ابھی کچھ اور بھی باقی ہے ؟ اب تو بھیا بھی نہیں رہے۔ اور ادھر میرے گھر والی بھی مر گئی۔ میں نے تو اس کا غم بھلا دیا۔ تم کب تک بھیا کے نام کو روتی رہوگی؟

ملیا نے نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا ''بھیا نہیں رہے تو کیا ہوا؟ بھیا کی یاد تو ہے، ان کی محبت تو ہے، ان کی صورت تو دل میں ہے، ان کی باتیں تو کانوں میں ہیں، میرے لیے وہ ابھی ویسے ہی جیتے جاگتے ہیں، میں اب بھی انھیں ویسا ہی بیٹھا ہوا دیکھتی ہوں، پہلے تو بدن کا بیچ تھا۔ اب تو وہ مجھ سے اور بھی قریب ہو گئے ہیں اور جیوں جیوں دن گذریں گے اور بھی قریب ہوتے جائیں گے۔ بھرے پرے گھر میں دانے کی قدر کون کرتا ہے۔ جب گھر خالی ہو جاتا ہے تب معلوم ہوتا ہے کہ دانہ کیا چیز ہے؟ پیسے والے پیسے کی قدر کیا جانیں؟ پیسے کی قدر تب ہوتی ہے جب ہاتھ خالی ہوتا ہے اس وقت آدمی ایک ایک کوڑی کو دانت سے اٹھاتا ہے۔ تمھیں بھگوان نے دل ہی نہیں دیا تم کیا جانو؟ محبت کیا چیز ہے؟ گھر والی کو مرے ابھی چھ مہینے بھی نہیں ہوئے اور تم سانڈ بنے پھرتے ہو۔ تم مر گئے ہوتے تو اسی طرح وہ بھی اب تک کسی کے پاس چلی گئی ہوتی۔ مگر جانتی ہوں۔ میں مر جاتی تو میرا سرتاج عمر بھر میرے نام کو رویا کرتا۔ایسے ہی مردوں کی عورتیں ان پر جان دیتی ہیں۔ تم جیسے شہدوں کی قسمت میں دوسروں کا جھوٹا کھانا ہی بدا ہے۔

کھاؤ، مگر خبردار! آج سے میرے گھر میں پاؤں مت رکھنا نہیں تو جان سے ہاتھ دھوؤ گے۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔

اس کے چہرے پر اتنا جلال اور لہجہ میں اتنی تندی تھی کہ راجہ کو زبان کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چپکے سے نکل گیا۔

یہ افسانہ پہلی بار لاہور کے اردو ماہنامہ چندن کے مئی 1932 کے شمارے میں شائع ہوا۔ آخری تحفہ میں شامل ہے۔ ہندی میں یہ مانسرودر نمبر 4 میں شامل ہے۔

نئی بیوی

(۱)

ہمارا جسم پرانا ہے لیکن اس میں ہمیشہ نیا خون دوڑتا رہتا ہے۔ اس نئے خون پر زندگی قائم ہے۔ دینا کے قدیم نظام میں یہ نیاپن اس کے ایک ایک ذرے میں، ایک ایک ٹہنی میں، ایک ایک قطرے میں، تار میں چھپے ہوئے نغمے کی طرح گونجتا رہتا ہے اور یہ سو سال کی بڑھیا آج بھی نئی دلہن بنی ہوئی ہے۔

جب سے لالہ ڈنگا مل نے نئی شادی کی ہے ان کی جوانی ازسرنو عود کر آئی ہے۔ جب پہلی بیوی بقید حیات تھی وہ بہت کم گھر رہتے تھے۔ صبح سے دس گیارہ بجے تک تو پوجا پاٹ ہی کرتے رہتے تھے۔ پھر کھانا کھا کر دکان چلے جاتے۔ وہاں سے ایک بجے رات کو لوٹتے اور تھکے ماندے سوجاتے۔ اگر لیلا کبھی کہتی کہ ذرا اور سویرے آجایا کرو تو بگڑ جاتے ''تمھارے لیے کیا دکان بند کردوں یا روزگار چھوڑ دوں یہ وہ زمانہ نہیں کہ ایک لوٹا جل چڑھا کر لکشمی کو خوش کرلیا جائے۔ آج کل لکشمی کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑنا پڑتا ہے تب بھی ان کا منھ سیدھا نہیں ہوتا'' لیلا بے چاری خاموش ہوجاتی۔

ابھی چھ مہینے کی بات ہے۔ لیلا کو زور کا بخار تھا لالہ جی دکان پر چلنے لگے تو لیلا نے ڈرتے ڈرتے کہا...... ''دیکھو میری طبیعت اچھی نہیں ہے ذرا سویرے آجانا''۔

لالہ جی نے پگڑی اتار کر کھونٹی پر لٹکا دی اور بولے .... ''اگر میرے بیٹھے رہنے سے تمھارا جی اچھا ہو جائے تو میں دکان نہ جاؤں گا۔''

لیلا رنجیدہ ہو کر بولی: ''میں یہ کب کہتی ہوں کہ تم دکان نہ جاؤ۔ میں تو ذرا سویرے آجانے کو کہتی ہوں۔''

''تو کیا میں دکان پر بیٹھا موج کرتا ہوں؟''

لیلا کچھ نہ بولی: شوہر کی بے اعتنائی اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ادھر کئی دن سے اس کا دل دوز تجربہ ہو رہا تھا کہ اس گھر میں اس کی قدر نہیں ہے۔ اگر اس کی جوانی ڈھل چکی تھی تو اس کا کیا قصور تھا کس کی جوانی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ لازم تو یہ تھا کہ پچپن سال کی رفاقت اب ایک گہرے روحانی تعلق میں تبدیل ہوجاتی جو ظاہر سے بے نیاز رہتی ہے جو عیب کو بھی حسن دیکھنے لگتی ہے جو پکے پھل کی طرح زیادہ شیریں زیادہ خوشنما ہوجاتی ہے لیکن لالہ جی کا تاجر دل ہر ایک چیز کو تجارت کے ترازو پر تولتا تھا۔ بوڑھی گائے جب نہ دودھ دے سکتی ہو نہ بچے تو اس کے لیے گئو شالہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ ان کے خیال میں لیلا کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ وہ گھر کی مالکن بنی رہے، آرام سے کھائے پہنے اور پڑی رہے، اسے اختیار ہے چاہے جتنے زیور بنوائے چاہے جتنی خیرات اور پوجا کرے روزے رکھے، صرف ان سے دور رہے۔ فطرت انسانی کی نیرنگیوں کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ لالہ جی جس دلجوئی اور حظ سے لیلا کو محروم رکھنا چاہتے تھے خود اسی کے لیے والہانہ سرگرمی سے متلاشی رہتے تھے۔ لیلا چالیس کی ہو کر بوڑھی سمجھ لی گئی تھی مگر وہ پینتالیس سال کے ہو کر ابھی جوان تھے۔ جوانی کے ولولوں اور مسرتوں سے بے قرار لیلا سے اب انھیں ایک طرح کی کراہیت ہوتی تھی اور وہ غریب جب اپنی خامیوں کے حسرتناک احساس کی وجہ سے فطری بے رحمیوں کے ازالے کے لیے رنگ و روغن کی آڑ لیتی تو وہ اس کی بوالہوسی سے اور بھی متنفر ہو جاتے۔'' چہ خوش! سات لڑکوں کی تو ماں ہو گئیں، بال کھچڑی ہو گئے، چہرہ دھلے ہوئے فلالین کی طرح پرشکن ہوگیا۔ مگر آپ کو ابھی مہادر اور سیندور مہندی اور ابٹن کی ہوس باقی ہے۔ عورتوں کو بھی کیا فطرت ہے! نہ جانے کیوں آرائش پر اس قدر جان دیتی ہیں۔ پوچھو اب

تمھیں اور کیا چاہیے؟ کیوں نہیں دل کو سمجھا لیتیں کہ جوانی رخصت ہوگئی اور ان تدبیروں سے اسے واپس نہیں بلایا جاسکتا''۔ لیکن وہ خود جوانی کا خواب دیکھتے رہتے تھے۔ طبیعت جوانی سے سیر نہ ہوتی۔ جاڑوں میں کشتوں اور معجونوں کا استعمال کرتے رہتے تھے۔ ہفتہ میں دوبار خضاب لگاتے اور کسی ڈاکٹر سے بندر کے غدوودوں کے متعلق خط و کتابت کررہے تھے۔

لیلا نے انھیں شش وپنچ کی حالت میں کھڑا دیکھ کر مایوسانہ انداز سے کہا، کچھ بتلا سکتے ہو کئے بجے آؤگے''؟

لالہ جی نے ملائم لہجے میں کہا'' تمھاری طبیعت آج کیسی ہے''؟

لیلا کیا جواب دے؟ اگر کہتی ہے بہت خراب ہے توشاید یہ حضرت یہیں بیٹھ جائیں اور اسے جلی کٹی سنا کر اپنے دل کا بخار نکالیں۔اگر کہتی ہے اچھی ہوں تو شاید بے فکرہو کر دوبجے رات کی خبر لائیں۔ ڈرتے ڈرتے بولی ''اب تک تو اچھی تھی لیکن اب کچھ بھاری ہو رہی ہے۔ لیکن تم جاؤ دکان پر لوگ تمھارے منتظر ہوں گے۔ مگر ایشور کے لیے ایک دو نہ بجا دینا، لڑکے سو جاتے ہیں، مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگتا، طبیعت گھبراتی ہے''۔

سیٹھ جی نے لہجے میں محبت کی چاشنی دے کر کہا ''بارہ بجے تک آجاؤں گا ضرور''۔

لیلا کا چہرہ اتر گیا''دس بجے تک نہیں آسکتے''؟

''ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے کسی طرح نہیں''

''ساڑھے دس بھی نہیں''؟

''اچھا گیارہ بجے''

گیارہ پرمصالحت ہوگئی۔ لالہ جی وعدہ کر کے چلے گئے، لیکن شام کو ایک دوست نے مجرا سننے کی دعوت دی۔ اب بے چارے اس دعوت کوکیسے رد کرتے جب ایک آدمی آپ کو خاطر سے بلاتا ہے تو یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ آپ اس کی دعوت نامنظور کردیں۔ وہ آپ سے کچھ مانگتا نہیں آپ سے کسی طرح کی رعایت کا خواستگار نہیں محض دوستانے بے تکلفی سے آپ کو اپنی بزم میں شرکت کی دعوت دیتا

ہے آپ پر اس کی دعوت قبول کرنا ضروری ہو جاتاہے۔ گھر کے جنجال سے کسے فرصت ہے ایک نہ ایک کام تو روز لگا ہی رہتا ہے۔ کبھی کوئی بیمار ہے، کبھی مہمان آئے ہیں، کبھی پوجا ہے، کبھی کچھ کبھی کچھ۔ اگر آدمی یہ سوچے کہ گھر سے بے فکر ہو کر جائیں گے تو اسے سارے دوستانہ مراسم منقطع کر لینے پڑیں گے اسے شاید یہ گھر سے کبھی فراغت نصیب ہو۔ لالہ جی مجرا سننے چلے گئے تو دو بجے لوٹے۔ آتے ہی اپنے کمرے کی گھڑی کی سوئیاں پیچھے کردیں۔ لیکن ایک گھنٹہ سے زیادہ کی گنجائش کسی طرح نہ نکال سکے۔ دو کو ایک تو کہہ سکتے ہیں، گھڑی کی تیزی کے سرالزم رکھا جاتا ہے لیکن دو کو بارہ نہیں کہہ سکتے۔ چپکے سے آکر نوکر کو جگایا۔ کھانا کھا کر آئے تھے اپنے کمرے میں جاکر لیٹ رہے۔ لیلا ان کی راہ دیکھتی، ہرلمحہ درد اور بے چینی کی بڑھتی ہوئی شدت کا احساس کرتی نہ جانے کب سو گئی تھی۔ اسے جگانا سوئے فتنہ کو جگانا تھا۔

غریب لیلا اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکی۔ لالہ جی کو اس کی وفات کا بے حد روحانی صدمہ ہوا۔ دوستوں نے تعزیت کے تار بھیجے۔ کئی دن تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ ایک روزانہ اخبار نے مرنے والی کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے اس کی دماغی اور اخلاقی خوبیوں کی مبالغہ آمیز تصویر کھینچی۔ لالہ جی نے ان سب ہمدردوں کا دلی شکریہ ادا کیا اور ان کے خلوص و وفاداری کا اظہار جنت نصیب لیلا کے نام سے لڑکیوں کے لیے پانچ وظیفے قائم کرنے کی صورت میں نمودارہوا۔ وہ نہیں مریں صاحب میں مرگیا، زندگی کی شمع ہدایت گل ہو گئی۔ اب تو جینا اور رونا ہے میں تو ایک حقیر انسان تھا۔ نہ جانے کس کارخیر کے صلے میں مجھے یہ نعمت بارگاہ ایزدی سے عطا ہوئی تھی۔ میں تو اس کی پرستش کرنے کے قابل بھی نہ تھا۔ وغیرہ۔

چھ مہینے کی عزلت اورنفس کشی کے بعد لالہ ڈنگا مل نے دوستوں کے اصرار سے دوسری شادی کرلی۔ آخر غریب کیا کرتے۔ زندگی میں ایک رفیق کی ضرورت تو تھی ہی اور اس عمر میں تو رفیق کی ضرورت اور زیادہ ہوگئی تھی۔ لکڑی کی ضرورت تو جبھی ہوتی ہے جب پاؤں میں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رہتی۔

(۲)

جب سے نئی بیوی آئی ہے لالہ جی کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب ہو گیا ہے۔ دکان سے اب انھیں اس قدر انہماک نہیں ہے۔ متواتر ہفتوں نہ جانے سے بھی ان کے کاروبار میں کوئی ہرج واقع نہیں ہوتا۔ زندگی سے طلف اندوز ہونے کی صلاحیت جو ان میں روز بروز مضمحل ہوتی جاتی تھی۔اب یہ تشریح پاکر پھر سبز ہو گئی ہے اس میں نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں۔ موٹر نیا آ گیا ہے، کمرے نئے فرنیچر سے آراستہ کردیے گئے ہیں نوکروں کی تعداد میں معقول اضافہ ہو گیا ہے۔ ریڈیو بھی لگادیا گیا ہے لالہ جی کی بوڑھی جوانی نوجوانوں سے بھی زیادہ پرجوش اور ولولہ انگیز ہورہی ہے۔ اسی طرح جیسے بجلی کی روشنی چاند کی روشنی سے زیادہ شفاف اور نظر فریب ہوتی ہے۔ لالہ جی کو ان احباب ان کی اس جواں طبع پرمبارک باد دیتے ہیں تو وہ تفاخر کے انداز سے کہتے ہیں''بھئی ہم تو ہمیشہ جوان رہے اورہمیشہ جوان رہیں گے۔ بڑھاپا میرے پاس آئے تو اس کے منھ پر سیاہی لگاکر گدھے پر الٹا سوار کر کے شہربدر کردوں۔ جوانی اور بڑھاپے کو لوگ نہ جانے عمر سے کیوں منسوب کرتے ہیں۔ جوانی کا عمر سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا مذہب کا اخلاق سے، روپے کا ایمانداری سے، حسن کا آرائش سے۔ آج کل کے جوانوں کو آپ جوان کہتے ہیں، ارے صاحب! میں ان کی ایک ہزار جوانیوں کو اپنی جوانی کے ایک گھنٹہ سے نہ تبدیل کروں۔ معلوم ہوتا ہے زندگی میں کوئی دلچسپی ہی نہیں،کوئی شوق ہی نہیں،زندگی کیا ہے گلے میں پڑا ہوا ڈھول ہے۔ یہی الفاظ وہ کچھ ضروری ترمیم کے بعد آشادیوی کے لوح دل پر نقش کرتے رہتے ہیں۔ اس سے ہمیشہ سینما، تھیٹر، سیر دریا کے لیے اصرار کرتے ہیں، لیکن آشا نہ جانے کیوں ان دلچسپیوں سے ذرا بھی متاثر نہیں، وہ جاتی تو ہے مگر بہت اصرار کے بعد۔

ایک دن لالہ جی نے آکر کہا'' چلو آج بجرے پردریا کی سیر کر آئیں''۔

بارش کے دن تھے، دریا چڑھا ہوا تھا، ابر کی قطاریں بین الاقوامی فوجوں کی سی رنگ برنگ وردیاں پہنے آسمان پر قواعد کر رہی تھیں، سڑک پر لوگ ملار اور بارہ

ماسے گاتے چلے جارہے تھے۔ باغوں میں جھولے پڑگئے تھے۔
آشا نے بے دلی سے کہا'' میرا تو جی نہیں چاہتا''۔
لالہ جی نے تادیب آمیز اصرار سے کہا...... ''تمھاری کیسی طبیعت ہے، جو سیرو تفریح کی جانب مائل نہیں ہوتی''۔
آپ جائیں، مجھے اور کئی کام کرنے ہیں۔
کام کرنے کو ایشور نے آدمی دے دیے ہیں۔ تمھیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے ؟
مہراج اچھا سالن نہیں پکاتا، آپ کھانے بیٹھیں گے تو یوں ہی اٹھ جائیں گے۔
آشا اپنی فرصت کا بیشتر حصہ لالہ جی کے لیے انواع واقسام کے کھانے پکانے میں صرف کرتی تھی، کسی سے سن رکھا تھا کہ ایک خاص عمر کے بعد مردوں کی زندگی کی خاص دلچسپی لذت زبان رہ جاتی ہے۔ لالہ جی کے دل کی کلی کھل گئی۔ آشا کو ان سے کس قدر محبت ہے کہ وہ سیر کو ان کی خدمت پر قربان کررہی ہے۔ ایک لیلا تھی کہ کہیں جاؤں پیچھے چلنے کو تیار، پیچھا چھڑانا مشکل ہوجاتا تھا۔ بہانے کرنے پڑتے تھے، خواہ مخواہ سر پر سوار ہو جاتی تھی اور سارا مزہ کرکرا کردیتی تھی۔
بولے'' تمھاری بھی عجیب طبیعت ہے اگر ایک دن سالن بے مزہ ہی رہا تو ایسا کون سا طوفان آجائے گا! تم اس طرح میرے رئیسانہ چونچلوں کا لحاظ کرتی رہوگی تو مجھے بالکل آرام طلب بنادوگی۔ اگر تم نہ چلو گی تو میں بھی نہ جاؤں گا۔
آشا نے جیسے گلے سے پھندا چھڑاتے ہوئے کہا ''آپ بھی تو ادھر اُدھر گھما کر میرا مزاج بگاڑے دیتے ہیں۔ یہ عادت پڑجائے گی تو گھر کے دھندے کون کرے گا؟
لالہ جی نے فیاضانہ لہجے میں کہا'' مجھے گھر کے دھندوں کی ذرہ برابر پروا نہیں ہے، بال کی نوک برابر بھی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمھارا مزاج بگڑے اور تم اس گھر کی چکی سے دور رہو اور تم مجھے بار بار، آپ، کیوں کہتی ہو؟ میں چاہتا ہوں تم مجھے، تم، کہو، تو کہو۔ محبت کی گالیاں دو، غصے کی صلوٰتیں سناؤں، لیکن تم مجھے آپ کہہ کر جیسے دیوتا کے سنگھاسن پر بٹھا دیتی ہو۔ میں اپنے گھرمیں دیوتا نہیں شریر چھوکرا

بن کر رہنا چاہتا ہوں۔

آشا نے مسکرانے کی کوشش کر کے کہا'' اے نوج! بھلا میں آپ کو،تم، کہوں گی۔ تم برابر والوں کو کہا جاتا ہے۔ یا بڑوں کو۔

منیم جی نے ایک لاکھ کے گھاٹے کی پرملال خبرسنائی ہوتی تب بھی لالہ جی کو شاید اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا آشا کے بھولے بھولے الفاظ سے ہوا۔ ان کا سارا جوش سارا ولولہ ٹھنڈا پڑگیا، جیسے برف کی طرح منجمد ہوگیا۔ سر پر بانکی رکھی ہوئی رنگین پھول دار ٹوپی، گلے میں پڑی ہوئی جوگئے رنگ کی ریشمی چادر، وہ تن زیب کا بیل دار کرتہ جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے یہ سارا ٹھاٹ جیسے مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا۔ جیسے شارا نشہ کسی منتر سے اتر گیاہو۔

دل شکستہ ہوکر بولے: تو تمھیں چلنا ہے یا نہیں؟

میرا جی نہیں چاہتا۔

تو میں بھی نہ جاؤں۔

میں آپ کو کب منع کرتی ہوں۔

پھر،آپ، کہا۔

آشانے جیسے اندر سے زور لگاکرکہا''تم ''اور اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔

ہاں اسی طرح تم، کہا کرو۔ تو تم نہیں چل رہی ہو۔ اگر میں کہوں کہ تمھیں چلنا پڑے گا، تب۔؟

تب چلوں گی۔ آپ کے حکم کی پابندی میرا فرض ہے۔

لالہ جی حکم نہ دے سکے فرض اور حکم جیسے الفاظ سے ان کے کانوں پر خراش سی ہونے لگی۔ کھسیانے ہو کر باہر چلے۔ اس وقت آشا کو ان پر رحم آ گیا۔ بولی ''تو کب تک لوٹو گے''

میں نہیں جارہا ہوں۔

اچھا تو میں بھی چلتی ہوں۔

جس طرح کوئی ضدی لڑکا رونے کے بعد اپنی مطلوبہ چیز پا کر اسے پیروں سے ٹھکرا دیتا ہے اسی طرح لالہ جی نے رونا منھ بنا کر کہا'' تمھارا جی نہیں چاہتا تو

نہ چلو۔ میں مجبور نہیں کرتا۔

آپ.........نہیں تم برامان جاؤ گے۔

آشا سیر کرنے گئی لیکن امنگ سے نہیں جو معمولی ساڑی پہنے ہوئے تھی وہی پہنے چل کھڑی ہوئی، نہ کوئی نفیس ساڑی نہ کوئی مرصع زیور، نہ کوئی سنگار جیسے بیوہ ہو۔

ایسی ہی باتوں سے لالہ جی دل میں جھنجلا اٹھتے تھے۔ شادی کی تھی زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے جھلملاتے ہوئے چراغ میں تیل ڈال کر اسے اور روشن کرنے کے لیے۔ اگر چراغ کی روشنی تیز نہ ہوئی تو تیل ڈالنے سے کیا فائدہ؟ نہ جانے اس کی طبیعت کیوں اس قدر خشک اور افسردہ ہے، جیسے کوئی اوسر کا درخت ہو۔ کتنا ہی پانی ڈالو اس میں ہری پتیوں کے درشن ہی نہیں ہوتے۔ جڑاؤں زیوروں کے بھرے صندوق رکھے ہیں، کہاں کہاں سے منگوائے، دہلی سے، کلکتے سے، فرانس سے، کیسی کیسی بیش قیمت ساڑیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک نہیں سینکڑوں، مگر صندوق میں کیڑوں کی خوراک بننے کے لیے۔ غریب خاندان کی لڑکیوں میں یہی عیب ہوتا ہے ان کی نگاہ ہمیشہ تنگ رہتی ہے۔ نہ کھا سکیں، نہ پہن سکیں، نہ دے سکیں، انھیں تو خزانہ بھی مل جائے تو یہی سوچتی رہیں گی کہ بھلا اسے خرچ کیسے کریں؟

دریا کی سیر تو ہوئی مگر کچھ لطف نہ آیا۔

(۳)

کئی ماہ تک آشا کی طبیعت کو ابھارنے کی ناکام کوشش کر کے لالہ جی نے سمجھ لیا کہ یہ محرم کی پیدائش ہے لیکن پھر بھی برابر مشق جاری رکھی۔ اس بیوپار میں ایک خطیر رقم صرف کرنے کے بعد وہ اس سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھانے کے تاجرانہ تقاضے کو کیسے نظر انداز کرتے۔ دلچسپی کی نئی نئی صورتیں پیدا کی جاتیں۔ گراموفون اگر بگڑ گیا ہے، گاتا نہیں یا آواز صاف نہیں نکالتا تو اس کی مرمت کرانی پڑے گی۔ اسے اٹھا کر رکھ دینا یہ تو حماقت ہے۔

ادھر بوڑھا مہراج بیمار ہو کر چلا گیا تھا اور اس کی جگہ اس کا سولہ سترہ سال کا

لڑکا آ گیا تھا۔ کچھ عجیب مسخرا سا، بالکل اجڈ اور دہقانی، کوئی بات ہی نہ سمجھتا اس کے پھلکے اقلیدس کی شکلوں سے بھی زیادہ مختلف الاشکال ہوجاتے بیچ میں موٹے، کنارے پتلے، دال کبھی تو اتنی پتلی جیسے چائے اور کبھی اتنی گاڑھی جیسے دہی، کبھی نمک اتنا کم کہ بالکل پھیکا کبھی اتنا تیز کہ نیبو کا نمکین اچار۔ آشا سویرے ہی سے رسوئی میں پہنچ جاتی اور اس بدسلیقے مہراج کو کھانا پکانا سکھاتی، تم کتنے نالائق آدمی ہو جگل؟ اتنی عمر تک تم کیا گھاس کھودتے رہے یا بھاڑ جھونکتے رہے کہ پھلکے تک نہیں بنا سکتے۔

جگل آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتا'' بہوجی! ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ سترھواں ہی سال تو ہے''

آشا ہنس پڑی ''تو روٹیاں پکانا کیا دس بیس سال میں آتا ہے۔

آپ ایک مہینہ سکھا دیں بہوجی، پھر دیکھنا میں آپ کو کیسے پھلکے کھلاتا ہوں کہ جی خوش ہوجائے۔ جس دن مجھے پھلکے بنانے آجائیں گے میں آپ سے کوئی انعام لوں گا۔ سالن تو اب میں کچھ کچھ پکانے لگا ہوں نہ؟

آشا حوصلہ افزائی تبسم سے بولی '' سالن نہیں، وہ پکانے آتا ہے۔ ابھی کل ہی نمک اتنا تیز تھا کہ کھایا نہ گیا''۔

میں جب سالن بنا رہا تھا تو آپ یہاں کب تھیں؟

اچھا تو جب میں یہاں بیٹھی رہوں تب تمھارا سالن لذیذ پکے گا۔

آپ بیٹھی رہتی ہیں تو میری عقل ٹھکانے رہتی ہے۔

اور میں نہیں رہتی تب؟

تب تو آپ کے کمرے کے دروازے پر جا بیٹھتی ہے۔

تمھارے دادا آجائیں گے تو تم چلے جاؤگے۔

نہیں بہو جی، کسی اور کام میں لگا دیجئے گا۔ مجھے موٹر چلانا سکھوا دیجیے گا۔

نہیں نہیں آپ ہٹ جائیے۔ میں پتیلی اتار لوں گا۔ ایسی اچھی ساری آپ کی کہیں داغ لگ جائے تو کیا ہو؟

دور ہو، پھوہڑ تو تم ہی ہو۔کہیں پتیلی پیر پر گر پڑے تو مہینوں جھیلوگے!

جگل افسردہ ہوگیا۔ نحیف چہرہ اور بھی خشک ہوگیا۔

آشا نے مسکرا کر پوچھا ''کیوں منھ کیوں لٹک گیا سرکار کا؟

آپ ڈانٹ دیتی ہیں بہو جی تو میرا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ سیٹھ جی کتنا ہی گھڑکیں مجھے ذرا بھی صدمہ نہیں ہوتا۔ آپ کی نظر کڑی دیکھ کر جیسے میرا خون سرد ہوجاتا ہے۔

آشا نے تشفی دی۔ میں نے تمھیں ڈانٹا نہیں صرف اتنا ہی کہا کہ کہیں پتیلی تمھارے پاؤں پر گر پڑے تو کیا ہو؟

ہاتھ تو آپ کا بھی ہے۔ کہیں آپ کے ہاتھ سے ہی چھوٹ پڑے تب ؟

سیٹھ جی نے رسوئیں کے دروازے پر آکر کہا'' آشا ذرا یہاں آنا۔ دیکھو تمھارے لیے کتنے خوشنما گملے لایا ہوں۔ تمھارے کمرے کے سامنے رکھے جائیں گے۔ تم وہاں دھوئیں دھکڑ میں کیا پریشان ہوتی ہو۔ لونڈے سے کہہ دو کہ مہراج کو بلائے ورنہ میں کوئی دوسرا انتظام کرلوں گا۔ مہراج کی کمی نہیں ہے۔ آخر کب تک کوئی رعایت کرے اس گدھے کو ذرا بھی تو تمیز نہ آئی۔ سنتا ہے جنگل آج لکھ دے اپنے باپ کو۔ چولھے پر تواتر رکھا ہوا تھا، آشا روٹیاں بیل رہی تھی، جنگل توے کے لیے روٹیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ ایسی حالت میں بھلا وہ کیسے گملے دیکھنے جاتی؟ کہنے لگی ''ابھی آتی ہوں ذرا روٹی بیل رہی ہوں چھو دوں گی تو جنگل ٹیڑھی میڑھی بیلے گا۔

لالہ جی نے کچھ چڑھ کر کہا ''اگر روٹیاں ٹیڑھی میڑھی بیلے گا تو نکال دیا جائے گا۔

آشا ان سنی کر کے بولی ''دس پانچ دن میں سیکھ جائے گا۔ نکالنے کی کیاضرورت ہے۔

تم چل کر بتادو گملے کہاں رکھے جائیں؟

کہتی ہوں روٹیاں بیل کر آئی جاتی ہوں۔

نہیں میں کہتا ہوں تم روٹیاں مت بیلو۔

تم خواہ مخواہ ضد کرتے ہو۔

لالہ جی سناٹے میں آگئے۔ آشا نے کبھی اتنی بے التفاتی سے انھیں جواب نہ دیا تھا۔اور یہ محض بے التفاتی نہ تھی اس میں ترشی بھی تھی خفیف ہو کر چلے گئے۔

انھیں ایسا غصہ آرہا تھا کہ ان گملوں کو توڑ کر پھینک دیں۔ اور سارے پودوں کو چولھے میں ڈال دیں۔

جنگل نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا'' آپ چلی جائیں بہو جی! سرکار ناراض ہوں گے۔

بکو مت! جلدی روٹیاں سینکو نہیں تو نکال دیے جاؤگے اور آج مجھ سے روپے لے کر اپنے لیے کپڑے بنوالو، بھک منگوں کی سی صورت بنائے گھومتے ہو اور بال کیوں اتنے بڑھا رکھے ہیں؟ تمھیں نائی بھی نہیں جڑتا۔

کپڑے بنوالوں تو دادا کو کیاحساب دوں گا۔

ارے بے وقوف میں حساب میں نہیں دینے کو کہتی مجھ سے لے جانا۔

آپ بنوائیں گی تو اچھے کپڑے لوں گا۔ مہین کھدر کا کرتہ، کھدر کی دھوتی ریشمی چادر اچھاسا چپل۔

آشا نے مٹھاس بھرے تبسم سے کہا ''اور اگر اپنے دام سے بنوانا پڑے تو؟

تب کپڑے بنواؤں گا ہی نہیں۔

بڑے چالاک ہو تم۔

آدمی اپنے گھر پر روکھی روٹی کھاکر سو رہتا ہے۔لیکن دعوت میں اچھے اچھے پکوان ہی کھاتا ہے۔

یہ سب میں نہیں جانتی۔ ایک گاڑھے کا کرتہ بنوالو اور ایک ٹوپی۔ حجامت کے لیے دو آنے پیسے لے لو۔

رہنے دیجیے، میں نہیں لیتا۔ اچھے کپڑے پہن کر نکلوں گا تو آپ کی یاد آئے گی۔ سڑیل کپڑے ہوئے تو جی جلے گا۔

تم بڑے خود غرض ہو مفت کے کپڑے لوگے اور اعلی درجے کے۔

جب یہاں سے جانے لگوں گا تو آپ مجھے اپنی تصویر دے دیجیے گا۔

میری تصویر لے کر کیا کروگے؟

اپنی کوٹھری میں لگادوں گا اور دیکھا کروں گا بس وہی ساڑھی پہن کر کھنچوانا جو کل پہنی تھی اور وہی موتیوں والی مالا بھی ہو مجھے ننگی ننگی صورت اچھی نہیں لگتی۔ آپ

کے پاس تو بہت گہنے ہوں گے آپ پہنتی کیوں نہیں؟

تو تمھیں گہنے اچھے لگتے ہیں؟

''بہت۔''

لالہ جی نے پھر آ کر خفت آمیز لہجے میں کہا'' ابھی تک تمھاری روٹیاں نہیں پکیں جگل! اگر کل سے تم نے اپنے آپ اچھی روٹیاں نہ بنائیں تو میں تمھیں نکال دوں گا۔

آشا نے فوراً ہاتھ دھوئے اور بڑی مسرت آمیز تیزی سے لالہ جی کے ساتھ جا کر گملوں کو دیکھنے لگی۔ آج اس کے چہرے پر غیر معمولی شگفتگی نظر آ رہی تھی۔ اس کے انداز گفتگو میں بھی دل آویز شیرینی تھی۔ لالہ جی کی ساری خفت غائب ہوگئی۔ آج اس کی باتیں زبان سے نہیں دل سے نکلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ بولی ''میں ان میں سے کوئی گملا نہ جانے دوں گی، سب میرے کمرے کے سامنے رکھوانا۔ سب کتنے سندر پودے ہیں۔ واہ! ان کے ہندی نام بھی بتا دینا۔

لالہ جی نے چھیڑا ''سب لے کر کیا کروگی؟ دس پانچ پسند کرلو۔ باقی باہر باغیچے میں رکھوا دوں گا۔

جی نہیں۔ میں ایک بھی نہیں چھوڑوں گی سب یہیں رکھے جائیں گے۔

بڑی حریص ہو تم۔

حریص سہی، میں آپ کو ایک بھی نہ دوں گی۔

دس پانچ تو دے دو۔ اتنی محنت سے لایا ہوں۔

جی نہیں ان میں سے ایک بھی نہ ملے گا۔

(۴)

دوسرے دن آشا نے اپنے کو زیوروں سے خوب آراستہ کیا اور فیروزی ساڑھی پہن کر نکلی تو لالہ جی کی آنکھوں میں نور آ گیا۔ اب ان کی عاشقانہ دلجوئیوں کا کچھ اثر ہو رہا ہے ضرور، ورنہ ان کے بار بار تقاضہ کرنے پر منّت کرنے پر بھی اس نے کوئی زیور نہ پہنا تھا۔ کبھی کبھی موتیوں کا ہار گلے میں ڈال لیتی تھی وہ بھی بے

دلی سے۔ آج ان زیوروں سے مرصع ہو کر وہ پھولی نہیں سماتی، اتراتی جاتی ہے۔ گویا کہتی ہے دیکھو میں کتنی حسین ہوں۔ پہلے جو کلی تھی وہ آج کھل گئی ہے۔

لالہ صاحب پرگھڑوں کا نشہ چڑھا ہوا ہے وہ چاہتے ہیں ان کے احباب و اعزہ آکر اس سونے کی رانی کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن کریں دیکھیں کہ ان کی زندگی کتنی پرلطف ہے۔ جو انواع واقسام کے شکوک دشمنوں کے دلوں میں پیدا ہوئے تھے آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ اعتماد، رواداری اور فراست نے کتنا خلوص پیدا کردیا ہے۔

انھوں نے تجویز کی''چلو کہیں سیر کرآئیں۔ بڑی مزیدار ہوا چل رہی ہے۔

آشا اس وقت کیسے آسکتی ہے ابھی اسے رسوئیں جانا ہے۔ وہاں سے کہیں بارہ ایک بجے فرصت ملے گی۔ پھر گھر کے کام دھندے سر پرسوار ہوجائیں گے اسے کہاں فرصت ہے پھر کل سے اس کے کلیجے میں کچھ درد بھی ہو رہا ہے۔ رہ رہ کر درد اٹھتا ہے۔ ایسا درد کبھی نہ ہوتا تھا۔ رات نہ جانے کیوں درد ہونے لگا۔

سیٹھ جی ایک بات سوچ کر دل ہی دل میں پھول اٹھے۔ وہ گولیاں رنگ لا رہی ہیں۔ راج وید نے آخر کہا بھی تھا کہ ذرا سوچ سمجھ کر ان کا استعمال کیجیے۔ کیوں نہ ہو خاندانی وید ہے۔ اس کا باپ مہاراجہ بنارس کا معالج تھا۔ پرانے مجرّب نسخے ہیں اس کے پاس۔

چہرے پر سراسیمگی کا رنگ بھر کر پوچھا '' تو رات ہی سے درد ہو رہا ہے تم نے مجھ سے کہا نہیں ورنہ وید جی سے کوئی دوا منگوادیتا۔

میں نے سمجھا تھا کہ آپ ہی آپ اچھا ہوجائے گا۔ مگر اب بڑھ رہا ہے۔

''کہاں درد ہورہا ہے؟ ذرا دیکھوں تو کچھ آماس تو نہیں ہے۔

سیٹھ جی نے آشا کے آنچل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ آشا نے شرماکر سر جھکا لیا اور بولی'' یہی تمھاری شرارت مجھے اچھی نہیں لگتی۔ جاکر کوئی دوا لادو۔''

سیٹھ جی اپنی جواں مردی کا یہ ڈپلوما پاکر اس سے کہیں زیادہ محظوظ ہوئے جتنا شاید رائے بہادر کا خطاب پاکر ہوتے، اپنے اس کار نمایاں کی داد لیے بغیر انھیں کیسے چین ہو جاتا۔ جو لوگ ان کی شادی سے متعلق شبہ آمیز سرگوشیاں کرتے تھے

انھیں زک دینے کا کتنا نادر موقع ہاتھ آیا ہے۔ پہلے پنڈت بھولا ناتھ کے گھر پہونچے اور بادل درد مند بولے"میں تو بھئی سخت مصیبت میں مبتلا ہوگیا۔ کل سے ان کے سینے میں درد ہورہا ہے۔ کچھ عقل کام نہیں کرتی۔ کہتی ہیں ایسا درد پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

بھولا ناتھ نے کچھ زیادہ ہمدردی کا اظہار کیا۔ نہیں۔ بولے "ہوا لگ گئی ہوگی اور کیا؟"۔

سیٹھ جی نے ان سے اختلاف کیا "نہیں پنڈت جی ہوا کا فساد نہیں ہے" کوئی اندرونی شکایت ہے۔ ابھی کم سن ہیں نہ؟ راج وید سے کوئی دوا لیے لیتا ہوں۔

میں تو سمجھتا ہوں آپ ہی آپ اچھا ہو جائے گا۔

آپ بات نہیں سمجھتے، یہی آپ میں نقص ہے۔

آپ کا جو خیال ہے وہ بالکل غلط ہے مگر خیر دوا لاکر دیجیے اور اپنے لیے بھی کوئی دوا لیتے آیئے گا۔

سیٹھ یہاں سے اٹھ کر اپنے دوسرے دوست لالہ پھاگ مل کے پاس پہنچے اور ان سے بھی قریب قریب انھیں الفاظ میں پرملال خبر کہی۔ پھاگ مل بڑا شہدہ تھا " مسکرا کر بولا "مجھے تو آپ کی شرارت معلوم ہوتی ہے"۔

سیٹھ جی کی باچھیں کھل گئیں " میں اپنا دکھ سنا رہا ہوں اور تمھیں مذاق سوجھتا ہے۔ ذرا بھی انسانیت تم میں نہیں ہے۔

"میں مذاق نہیں کررہا ہوں۔ بھلا اس مذاق کی کیا بات ہے وہ ہیں کم سن، نازک اندام! آپ ٹھہرے آزمودہ کار، مردمیدان، بس اگر یہ بات نہ نکلے تو مونچھیں منڈوا ڈالوں۔"

سیٹھ جی نے متین صورت بنائی " میں تو بھئی بڑی احتیاط کرتا ہوں۔ تمھارے سر کی قسم۔"

جی رہنے دیجیے۔ میرے سر کی قسم نہ کھایئے۔ میرے بھی بال بچے ہیں۔ گھر کا اکیلا آدمی ہوں۔ کسی قاطع دوا کا استعمال کیجیے۔"

"انھیں راج وید سے کوئی دوا لیے لیتا ہوں۔"

اس کی دوا وید جی کے پاس نہیں آپ کے پاس ہے۔

سیٹھ جی کی آنکھوں میں نور آگیا، شباب کا احساس پیدا ہوا اور اس کے ساتھ چہرے پر بھی شباب کی جھلک آگئی۔ سینہ جیسے کچھ فراخ ہو گیا۔ چلتے وقت ان کے پیر کچھ زیادہ مضبوطی سے زمین پر پڑنے لگے اور سر کی ٹوپی بھی خدا جانے کیوں کج ہوگئی۔ بشرے سے ایک بانکپن کی شان برس رہی تھی۔ راج وید نے مژدہ جانفزا سنایا تو بولے ''میں نے کہا تھا ذرا سوچ سمجھ کر ان گولیوں کا استعمال کیجیے گا۔ آپ نے میری ہدایت پر توجہ نہ کی۔ ذرا مہینے دو مہینے ان کا استعمال کیجیے اور پرہیز کے ساتھ رہیئے پھر دیکھئے ان کا اعجاز۔ اب گولیاں بہت کم رہی ہیں لوٹ مچی رہتی ہے لیکن ان کا بنانا اتنا مشکل اور دقت طلب ہے کہ ایک بارختم ہوجانے پر مہینوں تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ ہزاروں بوٹیاں ہیں۔ کیلاش، نیپال اور تبت سے منگانی پڑتی ہیں اور اس کا بنانا تو آپ جانتے ہیں کتنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ آپ احطیاطاً ایک شیشی لیتے جایئے۔

(۵)

جگل نے آشا کو سر سے پاؤں تک جگمگاتے دیکھ کر کہا ''بس بہوجی! آپ اسی طرح پہنے اوڑھے رہا کریں۔ آج میں آپ کو چولھے کے پاس نہ آنے دوں گا۔

آشا نے شرارت آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا'' کیوں آج یہ سختی کیوں؟ کئی دن تو تم نے منع نہیں کیا۔

آج کی بات دوسری ہے۔

ذرا سنوں تو کیا بات ہے۔

میں ڈرتا ہوں کہیں آپ ناراض نہ ہوجائیں۔

نہیں نہیں کہو۔ میں ناراض نہ ہوں گی۔

آج آپ بہت سندر لگ رہی ہیں۔

لالہ ڈگا مل نے سیکڑوں ہی بار آشا کے حسن انداز کی تعریف کی تھی مگر ان کی تعریف میں اسے تصنع کی بو آتی تھی۔ وہ الفاظ ان کے منھ سے کچھ اس طرح لگتے

تھے جیسے کوئی، ہیجڑا تلوار لے کر چلے۔ جگل کے ان الفاظ میں ایک کیفیت تھی، ایک سرور تھا، ایک ہیجان تھا، ایک اضطراب تھا، آشا کے سارے جسم میں رعشہ آ گیا۔ آنکھوں میں جیسے نشہ چھا جائے۔

تم مجھے نظر لگا دوگے۔ اس طرح کیوں گھورتے ہو؟

جب یہاں سے چلا جاؤں گا تب آپ کی بہت یاد آئے گی۔

روٹی بنا کر تم کیا کیا کرتے ہو؟ دکھائی نہیں دیتے۔

سرکار رہتے ہیں اسی لیے نہیں آتا۔ پھر اب تو مجھے جواب مل رہا ہے، دیکھئے بھگوان کہاں لے جاتے ہیں۔

آشا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کون تمھیں جواب دیتا ہے ؟

سرکار ہی تو کہتے ہیں تجھے نکال دوں گا۔

اپنا کام کیے جاؤ کوئی نہیں نکالے گا۔ اب تو تم روٹیاں بھی اچھی بنانے لگے۔

سرکار ہیں بڑے کٹہ ور۔

دو چار دن میں ان کا مزاج ٹھیک کیے دیتی ہوں۔

''آپ کے ساتھ چلتے ہیں تو جیسے آپ کے باپ سے لگتے ہیں۔''

تم بڑے بد معاش ہو۔ خبردار! زبان سنبھال کر باتیں کرو۔

مگر خفگی کا یہ پردہ اس کے دل کا راز نہ چھپا سکا۔ وہ روشنی کی طرح اس کے اندر سے باہر نکلا پڑتا تھا۔ جگل نے اسی بے باکی سے کہا ''میری زبان کوئی بند کرلے۔ یہاں تو سب ہی کہتے ہیں میرا بیاہ کوئی پچاس سال کی بڑھیا سے کر دیے تو میں گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں، یا خود زہر کھالوں یا اسے زہر دے کر مار ڈالوں پھانسی ہی تو ہوگی۔

آشا مصنوعی غصہ قائم نہ رکھ سکی۔ جگل نے اس کے دل کے تاروں پر مضراب کی ایک ایسی چوٹ ماری تھی کہ اس کے بہت مضبوط کرنے پر بھی درد دل باہر نکل ہی آیا۔ قسمت بھی تو کوئی چیز ہے۔

ایسی قسمت جائے جہنم میں۔

تمھاری شادی کسی بڑھیا سے کروں گی، دیکھ لینا۔

تو میں بھی زہر کھالوں گا، دیکھ لیجئے گا۔

کیوں؟ بڑھیا تمھیں جوان سے زیادہ پیار کرے گی، زیادہ خدمت کرے گی، تمھیں سیدھے راستے پر رکھے گی۔

یہ سب ماں کا کام ہے۔ بیوی جس کام کے یے ہے اسی کے لیے ہے۔

آخر بیوی کس کام کے لیے ہے۔

آپ مالک ہیں نہیں تو بتلادیتا بیوی کس کام کے لیے ہے۔

موٹر کی آواز آئی۔ نہ جانے کیسے آشا کے سرکا آنچل کھسک کر کندھے پر آگیا تھا۔ اس نے جلدی سے آنچل سر پر کھینچ لیا اور یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی '' لالہ کھانا کھاکر چلے جائیں گے تم ذرا آجانا۔

یہ قصہ پہلی بار الہ آباد کہ ہندی ماہنامہ سرسوتی کے مئی 1932 کے شمارے میں شائع ہوا۔ عنوان تھا نیا وِواہ۔ یہ مانسرور نمبر 2 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ لاہور کے رسالہ افسانہ میں شائع ہوا۔ یہ واردات میں شامل ہے۔

بیمار بہن

سیوتی آج کئی دن سے بیمار ہے چارپائی سے اٹھ نہیں سکتی۔ کہیں کھیلنے نہیں جاسکتی۔

بھوندو اس کا چھوٹا بھائی ہے۔ جب سیوتی پانی مانگتی ہے تو بھوندو دوڑ کر کٹورے میں پانی لاتا ہے۔

جب سیوتی گرمی سے بے چین ہوجاتی ہے، تو وہ اسے پنکھا جھلنے لگتاہے۔ وہ چاہتا ہے، میری پیاری بہن جلدی سے اچھی ہو جائے۔ اکیلے کھیلنے میں اس کا جی نہیں لگتا۔

بھوندو کو جیوں ہی مدرسے سے چھٹی ہوتی ہے، دوڑا ہوا سیوتی کے پاس آتا ہے اور اسے کہانیاں سناتا ہے۔ سویتی شوق سے سنتی اور خوش ہوتی ہے۔

کل شام کو سیوتی کی طبعیت بہت خراب ہوگئی۔ زور زور سے کراہنے لگی۔ بھوندو گھبرا گیا۔ ماں باپ سے سنا تھا۔ ایشور بڑا دیالو ہے تو کیا وہ ایک بالک کی پرارتھنا نہ سنے گا؟

جیوں ہی مندر میں آرتی ہونے لگی، وہ وہاں گیا اور پرتی ماں کے سامنے بھومی پر سر رکھ کر ایشور کی پرارتھنا کرنے لگا، ''بھگوان! تم دیالو ہو، دین پر کرپا رکھتے ہو، میری سیوتی کو جلدی اچھا کردو۔''

نوٹ: یہ جزو ہندی کے رسالہ کمار کے پرجے شمارے میں مئی 1932 میں شائع ہوا۔ ابھی تک کسی مجموعہ میں شائع نہیں ہواہے۔

کتسا

اپنے گھر میں آدمی بادشاہ کو بھی گالی دیتا ہے۔ ایک دن میں اپنے دو تین متروں کے ساتھ بیٹھا ہوا ایک راشٹریہ سنستھا کے ویکتیوں کی آلوچنا کر رہا تھا۔ ہمارے وچار میں راشٹریہ کاریہ کرتاؤں کو سوارتھ اور لوبھ سے اوپر رہنا چاہیے۔ اونچا اور پوتر آدرش سامنے رکھ کر ہی راشٹر کی سچی سیوا کی جا سکتی ہے۔ کئی ویکتیوں کے آچرن نے ہمیں چھبدھ کر دیا تھا اور ہم اس سمے بیٹھے اپنے دل کا غبار نکال رہے تھے۔ سمبھو تھا، اس پرستھتی میں پڑ کر ہم اور بھی گرجاتے، لیکن اس وقت تو ہم وچارک کے استھان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور وچارک اودار بنے لگے، تو نیایے کون کرے؟ وچارک کو یہ بھول جانے میں ولمب نہیں ہوتا کہ اس میں بھی کمزوریاں ہیں۔ اس میں اور ابھی یوکت میں کیول اتنا ہی انتر ہے کہ یا تو وچارک مہاشیہ اس پرستھیتی میں پڑے نہیں یا پڑ کر بھی اپنی چترائی سے بے داغ نکل گئے۔

پدیا دیوی نے کہا: مہاشیہ 'ک' کام تو بڑے اتساہ سے کرتے ہیں۔ لیکن اگر حساب دیکھا جائے تو ان کے ذمہ ایک ہزار سے کم نہ نکلے گا۔ ارملا دیوی بولیں، خیر 'ک' کو تو چھما کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بال بچے ہیں۔ آخر ان کا پالن پوشن کیسے کریں؟ جب وہ چوبیسوں گھنٹے سیوا کاریہ ہی میں لگا رہتا ہے تو اسے کچھ نہ کچھ تو ملنا چاہیے۔ اس یوگیتا کا آدمی ۵۰۰ ویتن پر بھی نہ ملتا۔ اگر اس سال بھر میں اس نے ایک ہزار خرچ کر ڈالا تو بہت نہیں ہے۔ مہاشیہ 'کھ' تو بالکل نہنگ

ہیں۔ 'جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا' پر ان کے ذمے بھی ایک ہزار سے کم نہ ہوں گے۔ کسی کو کیا ادھیکار ہے کہ وہ غریبوں کا دھن موٹر کی سواری اور یار دوستوں کی دعوت میں اڑا دے؟

شیاما دیوی اُدّنڈ ہو کر بولیں مہاشے 'گ' کو اس کا جواب دینا پڑے گا، بھائی صاحب۔ یوں بچ کر نہیں نکل سکتے۔ ہم لوگ بھیکشا مانگ کر پیسے لاتے ہیں، اسی لیے کہ یار دوستوں کی دعوتیں ہوں، شرابیں اڑائی جائیں اور مجرے دیکھے جائیں؟ روز سنیما کی سیر ہوتی ہے۔ غریبوں کا دھن یوں اڑانے کے لیے نہیں ہے۔ یہاں پائی پائی کا لیکھا سمجھنا پڑے گا۔ میں بھری سبھا میں رگیدوں گی۔ انھیں جہاں پانچ سو ویتن ملتا ہو، وہاں چلے جائیں۔ راشٹر کے سیوک بہتیرے نکل آویں گے۔

میں بھی ایک بار اسی سنستھا کا منتری رہ چکا ہوں۔ مجھے گرو ہے کہ میرے اوپر کبھی کسی نے اس طرح کا آکچھیپ نہیں کیا۔ پر نہ جانے کیوں لوگ میرے منترتو سے سنتوشٹ نہیں تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ میں بہت کم سمے دیتا ہوں۔ اور میرے سمے میں سنستھا نے کوئی گورو بڑھانے والا کاریہ نہیں کیا۔ اسی لیے میں نے روٹھ کر استعفا دے دیا تھا۔ میں اسی پد سے بے لوث رہ کر بھی نکالا گیا۔ مہاشیہ 'گ' ہزاروں ہڑپ کر کے بھی اسی پد پر جمے ہوئے ہیں۔ کیا یہ میرے ان سے کنیہ رکھنے کی کافی وجہ نہ تھی۔ میں چتر کھلاڑی کی بھانتی خود تو کچھ نہ کرنا چاہتا تھا، کنتو پردے کی آڑ سے رسی کھینچتا رہتا تھا۔

میں نے رڈّا جمایا۔ دیوی جی، آپ انیائے کر رہی ہیں۔ مہاشیہ 'گ' سے زیادہ دلیر اور ....

ارملا نے میری بات کاٹ کر کہا: میں ایسے آدمی کو دلیر نہیں کہتی جو چھپ کر جنتا کے روپے سے شراب پیے۔ جن شراب کی دوکانوں پر ہم دھرنا دینے جاتے تھے، انھیں دوکانوں سے ان کے لیے شراب آتی تھی۔ اس سے بڑھ کر بے وفائی اور کیا ہو سکتی ہے؟ میں ایسے آدمی کو دیش دروہی کہتی ہوں۔

میں نے اور کھینچی۔ لیکن یہ تو تم بھی مانتی ہو کہ مہاشیہ 'گ' کیول اپنے پربھاؤ سے ہزاروں روپے چندہ وصول کر لاتے ہیں۔ ولایتی کپڑے کو روکنے کا انھیں جتنا

شرے دیا جائے تھوڑا ہے۔

ارملا دیوی کب ماننے والی تھیں۔ بولیں۔ انھیں چندے اس سنستھا کے نام پر ملتے ہیں۔ ویکتی گت روپ سے ایک دھیلا بھی لاویں تو کہوں۔ رہا ولایتی کپڑا۔ جنتا ناموں کو پوجتی ہے اوز مہاشیہ کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ پر سچ پوچھیے تو یہ شریے ہمیں ملنا چاہیے۔ وہ تو کبھی کسی دوکان پر گئے بھی نہیں۔ آج سارے شہر میں اس بات کی چرچا ہو رہی ہے۔ جہاں چندہ مانگنے جاؤ وہیں لوگ یہی آکھیپ کرنے لگتے ہیں۔ کس کس کا منہ بند کیجیے گا؟ آپ بنتے تو ہیں جاتی کے سیوک، مگر آچرن ایسا کہ شہدوں کا بھی نہ ہوگا۔ دیش کا ادھار ایسے ولاسیوں کے ہاتھوں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے تیاگ ہونا چاہیے۔

(۲)

یہی آلوچنائیں ہو رہی تھیں کہ ایک دوسری دیوی آئیں۔ بھگوتی۔ بے چاری چندہ مانگنے آئی تھیں۔ تھکی ماندی چلی آرہی تھیں۔ یہاں جو پنچایت دیوی تو رم گئیں۔ ان کے ساتھ ان کی بالیکا بھی تھیں۔ کوئی دس سال عمر ہوگی۔ ان کاموں میں برابر ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ اسے زور کی بھوگ لگی ہوئی تھی۔ گھر کی کنجی بھی بھگوتی دیوی کے پاس تھی۔ پتی دیو دفتر سے آگئے ہوں گے۔ گھر کا کھلنا بھی ضروری تھا۔ اس لیے میں نے بالیکا کو اس کے گھر پہنچانے کی سیوا سویکار کی۔

کچھ دور چل کر بالیکا نے کہا: آپ کو معلوم ہے، مہاشیہ 'گ' شراب پیتے ہیں؟

میں اس آکھیپ کا سمرتھن نہ کر سکا۔ بھولی بھالی بالیکا کے ہردے میں کٹورتا، دویس اور پرپنچ کا وِش بونا میری ایرشیالو پرکرتی کو بھی روچی کر نہ جان پڑا۔ جہاں کوملتا اور سارلیہ، وشواش اور مادھوریہ کا راجیہ ہونا چاہیے، وہاں کوتسا اور چھوورتا کا مریادت ہونا کون پسند کرے گا؟ دیوتا کے گلے میں کانٹوں کی مالا کون پہنائیگا؟

میں نے پوچھا۔ تم سے کس نے کہا کہ مہاشیہ 'گ' شراب پیتے ہیں؟

'واہ پیتے ہی ہیں، آپ کیا جانیں؟'

'تمھیں کیسے معلوم ہوا؟'

'سارے شہر کے لوگ کہہ رہے ہیں۔'

'شہر والے جھوٹ بول رہے ہیں۔'

بالیکا نے میری اور اوشواش کی آنکھوں سے دیکھا۔ شاید وہ سمجھی میں بھی مہاشیہ 'گ' کے ہی بھائی بندوں میں ہوں۔

'آپ کہہ سکتے ہیں مہاشیہ 'گ' شراب نہیں پیتے؟'

'ہاں۔ وہ کبھی شراب نہیں پیتے۔'

'اور مہاشیہ 'ک' نے جنتا کے روپے بھی نہیں اڑائے؟'

'یہ بھی استیہ ہے۔'

'اور مہاشیہ 'کھ' موٹر پر ہوا کھانے نہیں جاتے؟'

'موٹر پر ہوا کھانا اپرادھ نہیں ہے۔'

'اپرادھ نہیں ہے راجاؤں کے لیے، رئیسوں کے لیے، افسروں کے لیے، جو جنتا کا خون چوستے ہیں، دیش بھکتی کا دم بھرنے والوں کے لیے وہ بہت بڑا اپرادھ ہے۔

'لیکن یہ تو سوچوں ان لوگوں کو کتنا دوڑنا پڑتا ہے۔ پیدل کہاں تک دوڑیں؟'

'پیر گاڑی پر تو چل سکتے ہیں۔ یہ کچھ بات نہیں ہے۔ یہ لوگ شان دکھانا چاہتے ہیں۔ جس میں لوگ سمجھیں کہ یہ بھی بہت بڑے آدمی ہیں۔ ہماری سنستھا غریبوں کی سنستھا ہے۔ یہاں موٹر پر اسی وقت بیٹھنا چاہیے جب اور کسی طرح کام ہی نہ چل سکے اور شرابیوں کے لیے تو یہاں استھان ہی نہ ہونا چاہیے۔ آپ تو چندے مانگنے جاتے نہیں، ہمیں کتنا لجّت ہونا پڑتا ہے، آپ کو کیا معلوم۔

میں نے گمبھیر ہو کر کہا۔ تمھیں لوگوں سے کہہ دینا چاہیے، یہ سراسر غلط ہے۔ ہم اور تم اس سنستھا کے شبھ چنتک ہیں۔ ہمیں اپنے کاریہ کرتاؤں کا اپمان کرنا اوچت نہیں۔ ہمیں تو اتنا ہی دیکھنا چاہیے کہ وہ ہماری کتنی سیوا کرتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ ک، کھ، گ، میں برائیاں نہیں ہیں۔ سنسار میں ایسا کون ہے جس میں برائیاں نہ ہوں۔ لیکن برائیوں کے مقابلے میں ان میں گن کتنے ہیں، یہ تو دیکھو، ہم سبھی سوارتھ پر جان دیتے ہیں۔ مکان بناتے ہیں، جائیداد خریدتے ہیں اور

کچھ نہیں تو آرام سے گھر میں سوتے ہیں۔ یہ بے چارے چوبیسوں گھنٹے دیش ہت کی فکر میں ڈوبے رہتے ہیں۔ تینوں ہی سال سال بھر کی سزا کاٹ کر کئی مہینے ہوئے لوٹے ہیں، تینوں ہی کے ادھیوگ سے اسپتال اور پستکالیہ کھلے۔ انھیں ویروں نے آندولن کر کے کسانوں کا لگان کم کرایا۔ اگر انھیں شراب پینا اور دھن کمانا ہوتا، تو اس جھمیلے میں آتے ہی کیوں؟

بالیکا نے وچارپورن درشٹی سے مجھے دیکھا۔ پھر بولی: یہ بتلایئے مہاشیہ 'گ' شراب پیتے ہیں یا نہیں؟

میں نے وچارپوروک کہا: نہیں۔ جو یہ کہتا ہے وہ جھوٹ بولتا ہے۔

بھگوتی دیوی کا مکان آ گیا۔ بالیکا چلی گئی۔ میں آج جھوٹ بول کر جتنا پرسن تھا، اتنا کبھی سچ بول کر بھی نہ ہوا تھا۔ میں نے بالیکا کے نرمل ہردے کو کُتسا کے پنک میں گرنے سے بچا لیا تھا۔

یہ افسانہ پہلی بار جاگرن بنارس کے جولائی 1932 میں مان سروور نمبر 2 میں شامل ہے۔ اردو میں پہلی بار شائع ہو رہا ہے۔

ٹھاکر کا کنواں

جوکھو نے لوٹا منھ سے لگایا تو پانی میں سخت بدبو آئی۔ گنگی سے بولا۔ یہ کیسا پانی ہے؟ مارے باس کے پیا نہیں جاتا۔ گلا سوکھا جا رہا ہے۔ اور تو سڑا ہوا پانی پلائے دیتی ہے۔

گنگی پرتی دن شام کو پانی بھر لیا کرتی تھی۔ کنواں دور تھا۔ بار بار جانا مشکل تھا۔ کل وہ پانی لائی تو اس میں بو بالکل نہ تھی آج پانی میں بدبو کیسی؟ لوٹا ناک سے لگایا تو سچ مچ بدبو تھی، ضرور کوئی جانور کنوئیں میں گر کر مر گیا ہوگا، مگر دوسرا پانی آوے کہاں سے؟

ٹھاکر کے کنوئیں پر کون چڑھنے دے گا۔ دور سے لوگ ڈانڈ بتائے گئے ساہو کا کنواں گاؤں کے اس سرے پر ہے، پرنتو وہاں بھی کون پانی بھرنے دے گا؟ چوتھا کنواں گاؤں میں ہے نہیں۔

جوکھو کئی دن سے بیمار ہے۔ کچھ دیر تک تو پیاس روکے چپ پڑا رہا، پھر بولا، اب تو مارے پیاس کے رہا نہیں جاتا۔ لا، تھوڑا پانی ناک بند کر کے پی لوں۔

گنگی نے پانی نہ دیا۔ خراب پانی پینے سے بیماری بڑھ جائے گی۔ اتنا جانتی تھی، پرنتو یہ نہ جانتی تھی کہ پانی کو ابال دینے سے اس کی خرابی جاتی رہتی ہے۔ بولی یہ پانی کیسے پیوگے؟ نہ جانے کون جانور مرا ہے۔ کنوے سے میں دوسرا پانی لائے دیتی ہوں۔

جوکھو نے آشچریہ سے اس کی اور دیکھا۔ دوسرا پانی کہاں سے لائے گی؟
ٹھاکر اور ساہو کے دو کنوئیں تو ہیں۔ کیا ایک لوٹا پانی نہ بھرنے دیں گے؟
ہاتھ۔پاؤں توڑوا آئے گی اور کچھ نہ ہوگا۔ بیٹھ چپکے سے۔ برہمن دیوتا آشیرواد (دعا) دیں گے۔ ٹھاکر لاٹھی ماریں گے، ساہو جی ایک کے پانچ لے گئے۔ غریبوں کا درد کون سمجھتا ہے۔ ہم تو مر بھی جاتے ہیں، تو کوئی دوار پر جھانکنے نہیں آتا، کندھا دینا تو بڑی بات ہے، ایسے لوگ کنوئیں سے پانی بھرنے دیں گے۔
ان شبدوں میں کڑوا ستیہ تھا۔ گنگی کیا جواب دیتی، کنتو اس نے وہ بدبودار پانی پینے کو نہ دیا۔

(۲)

رات کے نو بجے تھے۔ تھکے ماندے مزدور تو سو چکے تھے۔ ٹھاکر کے دروازے پر دس پانچ بے فکر جمع تھے۔ میدانی بہادری کا تو اب زمانہ رہا ہے۔ نہ موقع۔ کانونی بہادری کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کتنی ہوشیاری سے ٹھاکر نے تھانے دار کو ایک خاص مقدمے میں رشوت دے دی۔ اور صاف نکل گئے۔ کتنی عقلمندی سے ایک معرکے کے مقدمے کی نقل لے آئے۔ ناظر اور مہتمم سبھی کہتے تھے۔نقل نہیں مل سکتی۔ کوئی پچاس مانگتا کوئی سو یہاں بے پیسے۔ کوڑی نقل اڑا دی ۔ کام کرنے کا ڈھنگ چاہیے۔
کسی سمے گنگی کنوئیں سے پانی لینے پہنچی۔
کوپی کی دھندلی روشنی کنوئیں پر آرہی تھی۔ گنگی جگت کی آڑ میں بیٹھی موقع کا انتظار کرنے لگی۔ اسی کنوئیں کا پانی سارا گاؤں پیتا ہے۔ کسی کے لیے روک نہیں، صرف یہ بدنصیب نہیں بھر سکتے۔
گنگی کا وِدْروہی دل رواجی پابندیوں اور مجبوریوں پر چوٹیں کرنے لگا۔ ہم کیوں نیچ ہیں۔ یہ لوگ کیوں اونچے ہیں؟ اس لیے کہ یہ لوگ گلے میں تاگا ڈال لیتے ہیں یہاں تو جتنے ہیں، ایک سے ایک چھنٹے ہیں؟ چوری یہ کریں، جال فریب یہ کریں، جھوٹے مقدمے یہ کریں، ابھی اس ٹھاکر نے تو اس دن بے چارے گڑریا کی ایک بھیڑ چرا لی تھی۔ اور بعد میں مار کر کھا گیا۔ انہی پنڈت جی کے گھر میں تو بارہوں

مانس جواں ہوتا ہے۔ یہی ساہو جی تو گھی میں تو تیل ملا کر بیچتے ہیں۔ کام کرا لیتے ہیں مزدوری دیتے نانی مرتی ہے کس بات میں ہیں ہم سے اونچے ہاں، منہ میں ہم سے اونچے ہیں۔ ہم گلی۔گلی چلاتے نہیں کہ ہم اونچے ہیں، ہم اونچے کبھی گاؤں میں آجاتی ہوں، تو رس بھری آنکھوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ جیسے سب کی چھاتی پر سانپ لوٹنے لگتا ہے۔ پرنتو گھمنڈ یہ کہ ہم اونچے ہیں۔

کنوئیں پر کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی ۔ گنگی کی چھاتی دھک۔دھک کرنے لگی۔ کہیں دیکھ لیں، تو غضب ہوجائے۔

ایک لات بھی تو نیچے نہ پڑے۔ اس نے گھڑا اور رسی اٹھا لی۔ اور جھک کر چلتی ہوئی ایک ورکش (درخت) کے اندھیرے سائے میں جا کھڑی ہوئی۔ کب ان لوگوں کو دیا آتی ہے کسی پر۔ بے چارے مہنگو کو اتنا مارا کہ مہینوں لہو تھوکتا رہا۔ اس لیے تو کہ اس نے بے گار نہ دی تھی۔ اس پر یہ لوگ اونچے بنتے ہیں۔

کنوئیں پر دو استریاں پانی بھرنے آئی تھی۔ ان میں باتیں ہو رہی تھیں۔

کھانا کھانے چلے اور حکم ہوا کہ تازہ پانی بھر لاؤ۔ گھڑے کے لیے پیسے نہیں ہے۔

ہم لوگوں کو آرام سے بیٹھے دیکھ کر جیسے مردوں کو جلن ہوتی ہے۔

ہاں، یہ تو نہ ہوا کہ کلسا اٹھا کر بھر لاتے۔ بس حکم چلا دیا کہ تازہ پانی لاؤ۔ جیسے ہم لوڑیاں ہی تو ہیں۔

لوڑیاں نہیں تو اور کیا ہو تم؟ روٹی کپڑا نہیں پاتی؟ دس پانچ روپے چھین جھپٹ کرلے ہی لیتی ہو۔ اور لوڑیاں کیسی ہوتی ہیں۔

مت لاجاؤ دی دی۔ چھن بھر آرام کرنے کو جی ترس کر رہ جاتاہے۔ اتنا کام کسی دوسرے کے گھر کر دیتی تو اس سے کہیں آرام سے رہتی۔ اوپر سے وہ احسان مانتا۔ یہاں کام کرتے کرتے مر جاؤ پر کسی کا منہ ہی سیدھا نہیں ہوتا۔ دونوں پانی بھر کر چلی گئی تو گنگی ورکش کی چھایا سے نکلی اور کنوئیں کے جگت کے پاس آئی۔ بے فکر چلے گئے تھے۔ ٹھاکر بھی دروازہ بند کر اندر آنگن میں سونے جا رہے تھے۔ گنگی نے چھڑک (وقتی عارضی) سکھ کی سانس لی۔ کسی طرح میدان تو صاف ہوا۔

امرت چرا لانے کے لیے جو راج کمار کسی زمانے میں گیا تھا وہ بھی شاید اتنی ساؤدھانی کے ساتھ اور سمجھ بوجھ کر نہ گیا ہوگا۔ گنگی دبے پاؤں کنوئیں کے جگت پر چڑھی۔ وجے کا ایسا انوبھو اسے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

اس نے رسی کا پھندا گھڑے میں ڈالا۔ دائیں بائیں چوکنی درشٹ سے دیکھا۔ جیسے کوئی سپاہی رات کو سترو کے قلعے میں سوراکھ کر رہا ہو۔ اگر اس سمے وہ پکڑ لی گئی تو پھر اس کے لیے معافی یا رعایت کی رتی بھر امید نہیں۔ انت میں دیوتاؤں کو یاد کر کے اس نے کلیجا مزبوت کیا اور گھڑا کنوئیں میں ڈال دیا۔

گھڑے نے پانی میں غوطہ لگایا، بہت ہی آہستہ ذرا بھی آواز نہ ہوئی، گنگی نے دو چار ہاتھ جلدی جلدی مارے۔ گھڑا کنوئیں کے منہ تک آپہنچا کوئی بڑا شہزور پہلوان بھی اتنی تیزی سے اسے نہ کھینچ سکتا تھا۔

گنگی جھکی کہ گھڑے کو پکڑ کر جگت پر رکھے کہ یکایک ٹھاکر صاحب کا دروازہ کھل گیا۔ شیر کا منہ اس سے ادھیک بھیانک نہ ہوگا۔

گنگی کے ہاتھ سے رسی چھوٹ گئی۔ رسی کے ساتھ گھڑا دھڑام سے پانی میں گرا اور کئی چھڑ تک پانی میں ہلکورے کی آوازیں سنائی دیتی رہی۔

ٹھاکر کون ہے، کون ہے؟ پکارتے ہوئے کنوئیں کے پاس آرہے تھے اور گنگی جگت سے کود کر بھاگی جا رہی تھی۔ گھر پہنچ کر دیکھا کہ جوکھو لوٹا منہ سے لگائے وہی میلا گندا پانی پی رہا ہے۔

نوٹ: یہ افسانہ ہندی میں جاگرن اگست 1932 میں شائع ہوا۔ مان سرودر 1 میں شامل ہے اور اردو میں شائع نہیں ہوا۔

جھانکی

کئی دنوں سے گھر میں قلعہ مچا ہوا تھا۔ ماں الگ منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ استری الگ، گھر کی وایو میں جیسے وِش بھرا ہوا تھا۔ رات کو بھوجن نہیں بنا، دن کو میں نے اسٹوپ پر کھچڑی ڈالی۔ پر کھایا کسی نے نہیں۔ بچوں کو بھی آج بھوک نہ تھی۔ چھوٹی لڑکی کبھی میرے پاس آکر کھڑی ہوجاتی، کبھی ماتا کے پاس، کبھی دادی کے پاس، پر کہیں اس کے لیے پیار کی باتیں نہ تھیں، کوئی اسے گود میں نہ اٹھاتا، مانو اس نے بھی کوئی اپرادھ کیا ہو۔ لڑکا شام کو اسکول سے آیا کسی نے اسے کچھ کھانے کو نہ دیا، نہ اس سے بولا، نہ کچھ پوچھا۔ دونوں برآمدے میں من مارے بیٹھے ہوئے تھے شاید سوچ رہے تھے۔ گھر میں آج کیوں لوگوں کے ہردے ان سے اتنے پھر گئے ہیں۔ بھائی بہن دن میں کتنی ہی بار لڑتے ہیں، رونا پیٹنا بھی کئی بار ہوجاتا ہے، پر ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ گھر میں کھانا نہ پکے یا کوئی کسی سے بولے نہیں۔ یہ کیسا جھگڑا ہے کہ چوبیس گھنٹے گذر جانے پر بھی شانت نہیں ہوتا، یہ شاید اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

جھگڑے کی جڑ کچھ نہ تھی، اماں نے میری بہن کے گھر تیز بھیجنے کے لیے جن سامانوں کی سوچی لکھائی وہ پتنی جی کو گھر کی ستھتی (کیفیت) دیکھتے ہوئے ادھک معلوم ہوئی۔ اماں خود سمجھدار ہیں۔ انھوں نے تھوڑی بہت کاٹ چھانٹ کر دی تھی لیکن پتنی جی کے وچار میں اور کاٹ چھانٹ ہونا چاہیے تھی۔ پانچ ساڑیوں کی جگہ

تین رہے، تو کیا برائی ہے، کھلونے اتنے کیا ہوں گے، اتنی مٹھائی کی کیا ضرورت۔ ان کا کہنا تھا جب روزگار میں کچھ ملتا نہیں، دینک کاریوں میں کھینچ تان کرنی پڑتی ہے۔ دودھ گھی کے بجٹ میں تکلیف ہوگئی۔ تو پھر تیز.......... میں کیوں اتنی ادارتا کی جائے؟ پہلے گھر میں دیا جلا کر تب مسجد میں جلاتے ہیں یہ نہیں کہ مسجد میں تو دیا جلا دیں اور گھر میں اندھیرا پڑا رہے۔ اسی بات پر ساس بہو میں تکرار ہوگئی، پھر شاخیں پھوٹ نکلیں، بات کہاں سے کہاں جا پہنچی، گڑے ہوئے مردے اکھاڑے گئے انیوکیتوں کی باری آئی، ونگیہ کا دورا شروع ہوا۔ اور مون النکار پر ساپت ہوگیا۔ میں بڑے سنکٹ میں تھا۔ اگر اماں کی طرف سے کچھ کہتا ہوں تو پتنی جی رونا دھونا شروع کرتی ہیں، اپنے نصیبوں کو کوسنے لگتی ہے، پتنی کی سی کہتا ہوں، تو جن مرید کی اپادھی ملتی ہے۔ اس لیے باری باری سے دونوں پکشوں کا سمرتھن کرتا جاتا تھا، پر سوارتھ وش میری سہانوبھوتی پتنی کے ساتھ ہی تھی۔ میرے سنیما کا بجٹ ادھر سال بھر سے بالکل غائب ہوگیا تھا۔ پان پتے کے خرچ میں بھی کمی کرنی پڑتی تھی۔ بازار کی سیر بند ہوگئی تھی۔ کھل کر تو اماں سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ پر دل میں سمجھ رہا تھا کہ زیادتی انھیں کی ہے۔ دکان کا یہ حال ہے کہ کبھی کبھی بوہنی بھی نہیں ہوتی۔ آسامیوں سے ٹکا وصول نہیں ہوتا، تو ان پرانی لکیروں کو پیٹ کر کیوں اپنی جان سنکٹ میں ڈالی جائے۔ باربار گرہستھی کے جنجال پر طبعیت جھنجھلاتی تھی گھر میں تین سو پرانی ہیں۔ اور ان میں بھی پریم بھاؤ نہیں۔ ایسا گرہستھی میں آگ لگا دینی چاہیے۔ کبھی کبھی ایسی سنک سوار ہو جاتی تھی کہ سب کو چھوڑ چھاڑ کر کہیں بھاگ جاؤں تب اپنے سر پڑے گی۔ تب ان کو ہوش آئے گا۔ تب معلوم ہوگا کہ گرہستھی کیسے چلتی ہے۔ کیا جانتا تھا کہ وہ وپتی جھلنی پڑے گی، نہیں وواہ کا نام ہی نہ لیتا۔ طرح طرح کے کت ست بھاؤ من میں آرہے تھے۔ کوئی بات نہیں، اماں مجھے پریشان کرنا چاہتی ہیں۔ بہو ان کے پاؤں نہیں دباتی۔ ان کے سر میں تیل نہیں ڈالتی، تو اس میں میرا کیا دوش؟ میں نے اسے منع تو نہیں کردیا۔ مجھے تو سچا آنند ہوگا یدی ساس بہو میں اتنا پریم ہوجائے لیکن یہ میرے وش کی بات تو نہیں کہ دونوں میں پریم ڈال دوں۔ اگر اماں نے اپنی ساس کی ساڑی دھوئی ہے ان کے پاؤں دبائے ہیں

ان کی گھڑکیاں کھائی ہیں، تو آج وہ پرانا حساب بہو سے کیوں چکانا چاہتی ہیں؟ انھیں کیوں دکھائی نہیں دیتا کہ اب سمے بدل گیا ہے۔ بہوئیں اب بھے وش ساس کی غلامی نہیں کرتیں۔ پریم سے چاہے ان کے سر کے بال نوچ لو، لیکن جو رعب دکھا کر ان پر شاسن کرنا چاہا تو وہ دن لد گئے۔

سارے شہر میں جنم اسٹمی کا اتسو ہو رہا تھا۔ میرے گھر میں سنگرام چھڑا ہوا تھا۔ سندھیا ہوگئی تھی پر سارا گھر اندھیرا پڑا تھا۔ نحوست چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اپنی پتنی پر کرودھ آیا۔ لڑتی ہو، لڑو، لیکن گھر میں اندھیرا کیوں کر رکھا ہے۔ جاکر کہا کیا آج گھر میں چراغ نہ جلے گا؟

پتنی نے منہ پھلا کر کہا: جلا کیوں نہیں لیتے تمھارے ہاتھ نہیں ہیں؟

میری دیہہ (بدن) میں آگ لگ گئی۔ بولا۔ تو کیا جب تمھارے چرن نہیں آئے تھے تب گھر میں چراغ نہ جلتے تھے؟

اماں نے آگ کو ہوا دی۔ نہیں تب سب لوگ اندھیرے ہی میں پڑے رہتے تھے۔

پتنی جی کو اماں کی اس ٹپنی نے جامے سے باہر کر دیا۔ بولی جلاتے ہو گے۔ مٹی کی کوپی لال ٹین، تو میں نے نہیں دیکھی۔ مجھے بھی اس گھر میں آئے دس سال ہوگئے۔

میں نے ڈانٹا۔ اچھاچپ رہو، بہت بڑھو نہیں۔

اوہ ہو، تم ایسا ڈانٹ رہے ہو، جیسے مجھے مول لائے ہو، میں کہتا ہوں چپ رہوں۔ کیوں چپ رہوں اگر ایک کہوگے تو دو سنوگے؟

اسی کا نام پتی ورت ہے۔

جیسا منہ ہوتاہے، ویسے ہی بیڑے ملتے ہیں۔

میں پراست ہو کر باہر چلا آیا۔ اور اندھیری کوٹھری میں بیٹھا ہوا اس منحوس گھڑی کو کوسنے لگا جب اس کو پھنی سے میرا وواہ ہوا تھا۔ اس اندھیکار میں بھی دس سال کا جیون سیما چتروں کی بھانتی میرے سمرتی نیتروں کے سامنے دوڑ گیا۔

اس میں کہیں پرکاش کی جھلک نہ تھی، کہیں اسنہ کی مردیتا نہ تھی۔

(۲)

سہسا میرے چتر پنڈت جے دیوی نے دوار پر پکارا۔ ارے آج یہ اندھیرا کیوں کر رکھا ہے جی؟ کچھ سوجھتا ہی نہیں کہاں ہوں؟

میں نے کوئی جواب نہ دیا سوچا یہ آج کہاں سے آ کر سر پر سوار ہو گئے ہیں۔

جے دیو نے پھر پکارا۔ ارے کہاں ہو بھائی؟ بولتے کیوں نہیں؟ کوئی گھر میں ہے یا نہیں؟

کہیں سے کوئی جواب نہ ملا۔

جے دیو نے دوار کو اتنی زور سے جھنجھوڑا کہ مجھے بھے ہوا کہیں دروازہ چوکھٹ بازو سمیت گر نہ پڑے۔ پھر بھی میں بولا نہیں ان کا آنا کھل رہا تھا۔

جے دیو چلے گئے میں نے آرام کی سانس لی۔ وارے شیطان ٹلا، نہیں گھنٹوں سر کھاتا ہے۔

مگر پانچ ہی منٹ میں پھر کسی کے پیروں کی آہٹ ملی اور اب کی ٹارچ کے تیز پرکاش سے میرا سارا کمرہ بھر اٹھا۔ جے دیو نے مجھے بیٹھے دیکھ کر کوتوہل سے پوچھا۔ تم کہاں گئے تھے جی؟ گھنٹوں چیخا، کسی نے جواب تک نہ دیا۔ یہ آج کیا معاملہ ہے۔ چراغ کیوں نہیں جلے؟

میں نے بہانا کیا۔ کیا جانے، میرے سر میں درد تھا، دوکان سے آکر لیٹا تو نیند آ گئی۔

اور سوئے تو گھوڑا بیچ کر، مردوں سے شرط لگا کر؟ ہاں یار نیند آ گئی۔

مگر گھر میں چراغ تو جلانا چاہیے۔ یا ان کا retrenchment کر دیا؟

آج گھر میں لوگ ورت سے ہیں۔ نہ ہاتھ خالی ہوگا۔ خیر چلو کہیں جھانکی دیکھنے چلتے ہو؟ سیٹھ گھورے لال کے مندر میں ایسی جھانکی بنی ہے کہ دیکھتے ہی بنتا ہے۔ ایسے شیشے اور بجلی کے سامان سجائے ہیں کہ آنکھیں جھپک اٹھتی ہیں۔ اشوک کے ستمبھوں میں لال ہری، نیلی بتیوں کی انوکھی بہار ہے۔ سنگھاسن کے ٹھیک سامنے

ایسا نوارہ لگایا ہے کہ اس میں سے گلاب جل کی فوہاریں نکلتی ہے میرا تو چولا مست ہوگیا۔ سیدھے تمھارے پاس دوڑا آرہا ہوں، بہت جھانکیاں دیکھی ہوں گی تم نے، لیکن یہ اور ہی چیز ہے۔ عالم پھٹا رہا ہوں، بہت جھانکیاں دیکھی ہوگی تم نے لیکن یہ اور ہی چیز ہے عالم پھٹا پڑتا ہے۔ سنتے ہیں دلی سے کوئی چتر کاری گر آیا ہے اسی کی یہ کرامات ہے۔

میں نے اداسین بھاؤ سے کہا۔ میری تو جانے کی اچھا نہیں ہے۔ بھائی سر میں زور کا درد ہے۔ تب تو ضرور چلو بھائی۔ درد بھاگ نہ جائے تو کہنا۔

تم تو یار بہت دق کرتے ہو اسی مارے میں چپ چاپ پڑا تھا کہ کسی طرح یہ بلا ٹلے لیکن تم سر پر سوار ہی ہوگئے کہہ دیا میں نہ جاؤ ں گا۔

اور میں نے کہہ دیا میں ضرور لے جاؤں گا۔

مجھ پر وجے پانے کا میرے متروں کو بہت آسان نسخہ یاد ہے۔ یوں ہاتھا پائی دھینگا مشتی، دھول دھپا میں کسی سے پیچھے رہنے والا نہیں ہوں، لیکن کسی نے مجھے گدگدایا اور میں پراست ہوا۔ پھر میری کچھ نہیں چلتی۔ میں ہاتھ جوڑنے لگتا ہوں، گھگھیانے لگتا ہوں اور کبھی کبھی رونے لگتا ہوں۔ جے دیو نے وہی نسخہ آزمایا اور اس کی جیت ہوگئی۔

سندھی کی یہ شرط ٹھہری کہ میں چپکے سے جھانکی دیکھنے چلا چلوں۔

(۳)

سیٹھ گھورے لال ان آدمیوں میں ہیں جن کا پراتا کو نام لے لو، تو دن بر بھوجن نہ ملے ان کے مکھی چوس پنے کی سیکڑوں ہی دنت کتھائیں نگر میں پراچلت ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ماروان کا ایک بھکاری ان کے دوار پر ڈٹ گیا کہ بھکشا لے کر ہی جاؤں گا۔ سیٹھ جی بھی اڑ گئے تھے کہ بھکشا نہ دوں گا۔ چاہے کچھ ہو مارواںی انھیں کے دیش کا تھا۔ کچھ دیر تو ان کے پوروجوں کا بکھان کرتا رہا۔ پھر ان کی نندا کرنے لگا، انت میں دوار پر لیٹ رہا۔ سیٹھ جی نے رتی بھر پرواہ نہ کی۔ بھیکشک بھی اپنی دھن کا پکا تھا۔ سات دن دوار پر بے دانہ، پانی پڑا رہا اور انت میں وہیں پر مر گیا۔ تب سیٹھ جی پسیجے اور اس کی کریا اتنی دھوم دھام سے کی کہ

بہت کم کسی نے کی ہوگی۔ ایک لاکھ برہمنوں کو بھوجن کرایا اور لاکھ ہی انھیں دکشنا میں دیا۔ بھیکشک کا ستیہ گرہ سیٹھ جی کے لیے وردان ہوگیا۔ ان کے انت کرن میں بھگتی کا جیسے سروت کھل گیا۔ اپنی ساری سمپتی دھرمارتھ (بھلائی کے لیے) اپرن کردی۔

ہم لوگ ٹھاکر دوارے میں پہنچے تو درشکوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ کندھے سے کندھا چھلتا تھا۔ آنے اور جانے کے مارگ الگ تھے پھر بھی ہمیں آدھ گھنٹے کے بعد بھیتر جانے کا اوسر ملا جے دیو سجاوٹ دیکھ دیکھ کر لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے پر مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بناوٹ اور سجاوٹ کے میلے میں کرشنا کی آتما کہیں کھو گئی ہے۔ ان کی وہ رتن جڑت بجلی سے جگمگاتی مورتی دیکھ کر میرے من میں گلانی اُتپن ہوئی۔ اس روپ میں بھی پریم کا نواس (گھر) ہوسکتا ہے۔

ہم نے تو رتنوں میں درپ اور اہنکار ہی بھرا دیکھا ہے مجھے اس وقت یہ یاد نہ رہی کہ یہ ایک کروڑپتی سیٹھ کا مندر ہے اور دھنی منشیہ دھن میں لوٹنے والے ایشور ہی کی کلپنا کر سکتا ہے دھنی ایشور میں ہی ان کی شردھا ہوسکتی ہے جس کے پاس دھن نہیں وہ ان کی دیا کا پاتر ہو سکتا ہے۔ شردھا کا کداپی نہیں۔

مندر میں جے دیو کو سبھی جانتے ہیں۔ انھیں تو سبھی جگہ سبھی جانتے ہیں۔ مندر کے آنگن میں سنگیت منڈلی بیٹھی ہوئی تھی کیل کر جی اپنے گھرور ودیالیہ کے کئی ششیوں کے ساتھ تمبورا لیے بیٹھے تھے، پکھا وج، ستار، سارود، وینا اور جانے کون کون سے باجے جن کے نام بھی نہیں جانتا۔ ان ششیوں کے پاس تھے، کوئی گیت بجانے کی تیاریاں ہورہی تھیں، جے دیو کو دیکھتے ہی کیل کر جی نے پکارا۔ میں بھی طفیل میں جا بیٹھا۔ ایک چھڑ (لمحہ) میں گیت شروع ہوا۔ سماں بندھ گیا۔ جہاں اتنا شور و غل تھا کہ توپ کی آواز بھی نہ سنائی دیتی۔ وہاں جیسے مادھریہ کے اس پرواہ نے سب کسی کو اپنے میں ڈُبا لیا۔ جو جہاں تھا وہیں منتر مگدھ سا کھڑا تھا۔ میری کلپنا کبھی اتنی ساچتر اور سجیو نہ تھی۔ میرے سامنے نہ وہ بجلی کی چکاچوند تھی نہ وہ رتنوں کی جگمگاہٹ، نہ وہ بھوتک وبھوتیوں کا سماروہ میرے سامنے وہی یمنا کا تٹ تھا گلم لتاؤں کا گھونگھٹ منہ پر ڈالے ہوئے، وہی موہنی گائیں تھیں، وہی گوپیوں کی

بل کیریرنا۔ وہی ونشی کی مادھر دھونی، وہی شیتل چاندنی اور وہی پیارا نندکشور۔ جس کی مکھ چھوی میں پریم اور واتسلیہ کی جیوتی تھی جس کے درشنوں ہی سے ہردے نرمل ہوجاتے تھے۔

(۴)

میں اسی آنند وسمتی کی دشا میں تھا کہ کن سرڈ بند ہوگیا اور آچاریہ کیل کر کے ایک کشور ششیہ نے دھرپد الاپنا شروع کیا۔ کلاکاروں کی عادت ہے کہ وہ شبدوں کو کچھ اس طرح توڑ مروڑ دیتے ہیں کہ ادھیکانس سننے والوں کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا گا رہے ہیں۔ اس گیت کا ایک شبد بھی میری سمجھ میں نہ آیا، لیکن کنٹھ سور میں کچھ ایسا مادکتا بھرا لالیتہ تھا کہ پرتیک سور مجھے رومانچت کر دیتا تھا۔ کنٹھ سور میں اتنی جادو بھری شکتی ہے اس کا مجھے آج کچھ انوبھو ہوا۔ من میں ایک نئے سنسار کی سرشٹ ہونے لگی۔ جہاں آنند ہی آنند، پریم ہی پریم، تیاگ ہی تیاگ ہے۔ ایسا جان پڑا، دکھ کیول چت کی ورت ہے۔ ستیہ ہے۔ کیول آنند ایک سوچھ کرونا بھری کوملتا جیسے من کو مسوسنے لگی۔ ایسی بھاؤنا من میں اٹھی کہ وہاں جتنے بجّن بیٹھے ہوئے تھے۔ سب میرے اپنے ہیں، ابھنے ہیں پھر اتیت کے گربھ میں میرے بھائی کی سمرتی مورتی نکل آئی۔ میرا چھوٹا بھائی بہت دن ہوئے، مجھ سے لڑ کر گھر کی جمع جتھا لے کر رنگون بھاگ گیا تھا۔ اور وہی اس کا دہانت ہو گیاتھا۔ اس کے پاشوک ویوہاروں کو یاد کر کے میں انمت ہو اٹھتا تھا۔ اسے جیتا پا جاتا تو شاید اس کا خون پی جاتا، پر اس سمے اس سمرتی مورتی کو دیکھ کر میرا من جیسے نکھرت ہو اٹھا۔ میں اسے آلنگن کرنے کے لیے بیاکل ہوگیا۔ اس نے میرے ساتھ میری استری کے ساتھ، میری ماتا کے ساتھ، میرے بچوں کے ساتھ جو جو کنٹو نیچ اور گھرڑا سپرد ویوہار کیے تھے، وہ سب مجھے بھول گئے۔ من میں کیول یہی بھاؤنا تھی میرا بھیا کتنا دکھی ہے، مجھے اس بھائی کے پرتی کبھی اتنی ممتا نہ ہوئی تھی پھر تو من کی وہ دشا ہوگئی جسے ووہلتا کہہ سکتے ہیں، شترو بھاؤ جیسے من سے مت گیا ہو، جن جن پرانیوں سے میرا بیر بھاؤ تھا، جن سے گالی گلوج مار پیٹ مقدمے بازی سب کچھ ہو چکی تھی۔ وہ سبھی جیسے میرے گلے میں لپٹ لپٹ کر ہنس رہے تھے۔ پھر ودا پتنی کی

مورتی میرے سامنے آ کھڑی ہوئی، وہ مورتی جسے دس سال پہلے میں نے دیکھا تھا۔ ان آنکھوں میں وہی وکل کمپن تھا۔ وہی سن دکھد، وشواس، کاپولوں پر وہی لجا لالیما جیسے پریم کے سرور سے نکلا ہوا کوئی کمل پشپ ہو۔ وہی انوراگ، وہی آویش، وہی انماد، وہی یاچنا بھری اتسکتا، جس سے میں نے اسے نہ بھولنے والی رات کو اس کا سواگت کیا تھا۔ ایک بار پھر میرے ہردے میں جاگ اٹھی۔ مدھر سمرتیوں کا جیسے سروت سا کھل گیا، جی ایسا تڑپا کہ اسی سمے جاکر ودا کے چرنوں پر سر رگڑ کر روؤں۔ اور روتے روتے بے سدھ ہو جاؤں۔ میری آنکھیں سجل ہوگئیں، میرے منہ سے جو کٹھو شبد نکلے تھے وہ سب جیسے میرے ہی ہردے میں گڑنے لگے۔ اسی دشا میں جیسی ممتا مئی ماتا نے آکر مجھے گود میں اٹھا لیا بالپن میں جس واتسیتہ کا آنند اٹھانے کی مجھ میں شکتی نہ تھی۔ وہ آنند آج میں نے اٹھایا۔ گانا بند ہوگیا۔ سب لوگ اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ میں کلپنا ساگر میں ہی ڈوبا بیٹھا رہا۔

-سہسا جے دیو نے پکارا، چلتے ہو یا بیٹھے ہی رہوگے؟

یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں جاگرن اگست 1932 میں شائع ہوا۔ مان سروورا میں شامل ہے۔ اردو میں شائع نہیں ہوا۔

ڈائل کا قیدی

(۱)

دس بجے رات کا وقت، ایک عالیشان محل میں ایک سجا ہوا کمرہ صاف شفاف فرش مسند تکیے، بجلی کی انگیٹھی،،بجلی کی روشنی، کرسمس کے ایام میں شدت کی گرمی پڑ رہی ہے۔ سیٹھ خوب چند افسروں کی خدمت میں ڈالیاں بھیجنے کا انتظام کر رہے ہیں، پھلوں، میووں، کیلوں، مٹھائیوں اور کھلونوں کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ان کے سامنے کھڑی ہیں۔بغل میں ایک بوڑھے محنتی منیم جی افسروں کے نام بولتے جاتے ہیں اورسیٹھ جی اپنے ہاتھوں سے حسب حیثیت لگاتے جاتے ہیں،چکنی چاند، دوہرا بدن، بند کالر کا کوٹ پہنے ہوئے۔

خوب چند ایک مل کے مالک ہیں اور بمبئی کے بڑے کنٹریکٹر، ایک بار شہر کے میئر بھی رہ چکے ہیں، اس وقت بھی کئی تجارتی انجمنوں کے سکریٹری اور صدر ہیں۔ شہرت، اعزازوثروت کس حد تک ڈالیوں کا طفیل ہے، کون جانے، مگر اس تقریب میں ان کے دس پانچ ہزار ضرور بگڑ جاتے ہیں اور سیٹھ نیکی کر دریا میں ڈال والے انسان نہیں ہیں، ان کے چہرہ سے ان کی کارپردازی صاف جھلک رہی ہے اگر دنیا انھیں خوشامدی، ٹوڈی، جی حضوری کہتی ہے تو کہے اور اپنا دل خوش کرے، سیٹھ جی تاجر ہیں اور تاجر کاکام نفع حاصل کرنا ہے جیسے بھی ملے۔

پجاری نے آکر عرض کی۔ سرکار بڑی دیر ہوگئی، ٹھاکر جی کا بھوگ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''

عام اہل ثروت اصحاب کی طرح سیٹھ جی نے بھی ایک مندر بنوایا تھا، ٹھاکر جی کی پوجا کرنے کے لیے ایک پجاری نوکر رکھ لیا تھا اور روزانہ درشن کیا کرتے تھے، رات کو دنیا کے دھندوں سے فارغ ہو کر۔

پجاری کو قہر کی نظروں سے دیکھ کر بولے، دیکھتے نہیں ہو کیا کر رہا ہوں۔ یہ بھی ایک کام ہے کھیل نہیں ہے، تمھارے ٹھاکر جی ہی سب کچھ نہ دے دیں گے۔ پیٹ بھرنے پر ہی پوجا پاٹ بھی سوجھتی ہے، گھنٹے دو گھنٹے کی دیر ہو جانے سے ٹھاکر جی بھوکوں نہ مر جائیں گے اور نہ ٹھنڈا بھوگ انھیں بدہضمی کرے گا۔

پجاری اپنا سامنہ لے کر چلا گیا اور سیٹھ جی پھر ڈالیاں لگانے میں مصروف ہو گئے۔

ایک ہی منٹ بعد ان کے ایک خاص دوست لالہ کیشورام تشریف لائے، خوب چند اُٹھ کر ان کے گلے لپٹ گئے۔ اور پوچھا کدھر سے؟میں تو ابھی تمھیں بلانے والا تھا۔

کیشورام نے مسکرا کر کہا اتنی رات تک ڈالیاں ہی لگ رہی ہیں۔ بھلے آدمی اب تو سمیٹو۔ کل کا سارا دن پڑاہے، لگا لینا اور ان ڈالیوں سے ہوتا کیا ہے۔ مفت کی زحمت آج کیا پروگرام تھا۔ یاد ہے؟

خوب چند نے گردن اٹھا کر یاد کرنے کی کوشش کی۔ کیا کوئی خاص پروگرام تھا۔ یکا یک حافظہ بے دار ہو جاتا ہے۔

''اچھا وہ بات، ہاں یاد آ گیا، ابھی تو دیر نہیں ہوئی۔''

''تو چلو پھر میں نے تو سمجھا تھا، تم وہاں پہنچ گئے ہوگے''۔

لیلا ناراض تو نہ ہوگی''۔

''یہ تو وہاں پہنچنے پر معلوم ہوگا ''۔

''تم میری طرف سے معذرت کر دینا''۔

(۲)

سیٹھ جی کا سدیشی مل ممتاز ملوں میں ہے جب سے سدیشی تحریک شروع ہوئی ہے مال کی کھپت دوگنی ہوگئی ہے اور سیٹھ جی نے موقع دیکھ کر قیمتوں میں اضافہ کردیا ہے اور اس کے ساتھ ہی آدمیوں کی مزدوری میں تخفیف کا اعلان بھی کردیا ہے۔ کیوں کہ غلہ ارزاں ہوگیا ہے اور نصف مزدوری پر کثرت سے آدمی مل رہے ہیں۔ کاشتکار دیہاتوں سے بھاگے ہوئے ممبئ چلے آرہے ہیں، تخفیف کا اعلان محض پرانے آدمیوں کو برطرف کرنے کا حیلہ تھا۔

صبح کا وقت ہے، مل کے احاطہ کے باہر مزدوروں کا ہجوم ہے، پھاٹک پر کانسٹبلوں کا پہرا، مل میں پوری ہڑتال ہے، مزدوروں کے سرغنہ نے سیٹھ جی سے بہت کچھ آرزو منت کی مگر سیٹھ جی نہ دیے۔

اس وقت بھی سرغنہ سیٹھ جی کے پاس آخری شرطیں لے گیا ہے۔ لوگ اس کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک نوجوان سا مزدور سائکل پر دوڑا ہوا احاطہ کے سامنے آیا، مزدوروں نے چاروں طرف سے اسے گھیر لیا۔ اور سوالوں کی بوچھاڑ ہونے لگی ہے یہی لمبا، دبلا، سانولا نوجوان مزدوروں کا سرغنہ ہے۔

اس نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ ''سیٹھ جی بالکل سماعت نہیں کرتے تو پھر ہم کیوں ان کی خوشامد کریں۔ ہڑتال سے ان کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اور ہم مرمٹیں گے لیکن ہم خود جان دے کر دوسروں کے لیے راستہ صاف کر دیں گے ہم خود مریں گے تا کہ دوسرے جیئیں۔ دوستو! زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں جب مرجانا ہی زندگی کی دلیل ہوتی ہے، نئے آدمیوں کی بھرتی شروع ہوگئی ہے۔ آج ہمیں عہد کرنا پڑے گا کہ ہم کسی باہر کے آدمی کو مل میں نہ گھسنے دیں گے چاہے ہمارے اوپر لاٹھیاں چلیں، گولیاں برسیں بھائیو!

''ایک طرف سے آواز آئی سیٹھ جی آگئے''۔

سبھی پیچھے پھر پھر کے دیکھنے لگے۔ چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں کتنے ہی تو بدحواس ہو کر کانسٹبلوں سے مل کے اندر جانے کے لیے منت کرنے لگے، کچھ لوگ

روئی کی گانٹھوں کی آڑ میں جا چھپے جو ذرا دیر پہلے ریل سے آئی تھیں اور مزدوروں کے ہجوم کے باعث اندر نہ جا سکی تھیں، صرف مٹھی بھر آدمی سہمے ہوئے سے نوجوان سرغنہ کے ساتھ رہے۔ گویا اپنی جان ہتھیلیوں پر لیے ہوئے۔

سیٹھ جی نے کار سے اترتے ہی کانسٹبلوں کو حکم دیا۔'' ان بدمعاشوں کو مار کر بھگا دو۔''

فوراً ہڑتالیوں پر ڈنڈے پڑنے لگے۔ دس پانچ تو گر پڑے، باقی اپنی جانیں لے کر بھاگے نوجوان سرغنہ دو آدمیوں کے ساتھ ڈٹا کھڑا تھا۔

ثروت میں اتنا تحمل کہاں۔ سیٹھ جی خود ڈنڈا لے کر دوڑے، کانسٹبلوں نے ان تینوں آدمیوں کی گردن ناپی، حراست میں لے لیا اور لاری کی طرف لے چلے جو اسی لیے لائی گئی تھی۔ ان کا گرفتار ہونا تھا کہ ایک ہزار آدمیوں کا مجمع چاروں طرف سے آ پہنچا اور انھیں رہا کرانے کے لیے مصر ہوا، کانسٹبلوں نے آدمیوں کے تیور دیکھے تو فراست سے کام لیا۔ انھیں چھوڑ دیا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ سیٹھ جی نے دانت پیس لیے ایک ہی لمحہ میں صورت حال میں اتنا تغیر ہوجائے گا۔اس کا انھیں گماں نہ تھا، اب وہ تنہا ہیں، اور ایک ہزار آمیوں کا مقابلہ صرف ریوالور اُن کا رفیق ہے۔

مجمع نوجوان سرغنہ کی سرکردگی میں سیٹھ جی کی طرف چلا، سیٹھ جی کے اوسان خطا ہوگئے موقع و محل کا امتیاز نہ رہا، سمجھا یہ سب کے سب مجھے قتل کرنے آرہے ہیں، نوجوان کی طرف نشانہ کیا اور ریوالور داغ دیا۔ وہ لڑکھڑایا اور زمین پر گر پڑا۔

اس کے گرتے ہی مزدوروں کے سر پر جیسے خون سوار ہو گیا، اس کے قبل تک انھیں اہنسا (تشدد) کا شائبہ بھی نہ تھا۔ وہ منظم ہو کر سیٹھ جی کو دکھا دینا چاہتے تھے کہ آپ ہماری مزدوری کاٹ کر چین سے نہیں بیٹھ سکتے، لیکن اہنسا نے اہنسا کو مشتعل کر دیا سب کے سب قاتلانہ ارادہ سے سیٹھ جی کی طرف لپکے، گویا ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ پہلا وار کرنے کا اعزاز اسے ملے۔ سیٹھ جی نے دیکھا ہموار زمین پر ریوالور سے وہ اپنی جان نہیں بچا سکتے مگر بھاگنے کا کہیں راستہ نہ تھا جب کچھ نہ سوجھا تو روئی کی گانٹھوں پر چڑھ گئے اور ریوالور دکھا دکھا کر نیچے والوں کو اوپر چڑھنے سے روکنے لگے نیچے پانچ چھ سو آدمی کا محاصرہ ہے اوپر سیٹھ جی تنہا ریوالور

لیے کھڑے ہیں، کہیں سے کوئی مدد نہیں آرہی ہے ہر لمحہ زندگی کی امید نفی میں ڈوبتی جاتی ہے پر پچھتا رہے ہیں کہ بندوق کیوں نہ لیتا آیا ایک ایک کو بھون کر رکھ دیتا۔ مگر کیا معلوم تھا اس مصیبت کا سامنا ہوگا۔

دفعتاً یہی زخمی نوجوان پیچھے سے آکر سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس کے پاؤں میں پٹی بندھی ہوئی تھی اور خون جاری تھا۔ اس کا چہرہ درد سے خاکستر ہو گیا تھا اور آثار سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ درد سے بے چین ہے اسے دیکھتے ہی لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ اسے بچانا سیٹھ جی کو قتل کرنے سے زیادہ اہم تھا، اس اہنسا کے جنون میں بھی اپنے سردار کو جیتا جاگتا دیکھ کر ان کے دل تشکر سے پُر ہوگئے ایک فلک دوز نعرہ بلند ہوا۔ ''گوپی ناتھ کی جے۔''

زخمی گوپی ناتھ نے مجمع کو مخاطب کرکے ضعیف آواز میں کہا، میں اب چند لمحوں کا اور مہمان ہوں، بھائیو! شاید پھر مجھے نہ دیکھو، اس لیے میری تم سے یہ آخری درخواست ہے کہ تم لوگ اپنے گھر جاؤ اور سیٹھ جی سے مزاحم نہ ہو، میرا کہنا مانو اگر سیٹھ جی کا بال بیکا ہوا تو میری آتما کو وہاں بھی چین نہ آئے گا۔

لوگوں نے اعتراض کئے، سرگوشیاں کیں، مخالفانہ آوازیں بھی کسے، لیکن گوپی ناتھ کا حکم کیسے ٹالیں، جس نے انھیں کے لیے اپنی زندگی قربان کردی۔

میدان صاف ہونے لگا، صرف تھوڑے سے جان نثار باقی رہ گئے تو گوپی ناتھ نے سیٹھ جی سے عاجزی کے ساتھ کہا۔

سرکار آپ چلے جائیں میں جانتا ہوں آپ نے گھبراہٹ میں مجھے مارا ہے اس وقت بھی آپ سے یہی کہنے جا رہا تھا جو اب کہہ رہا ہوں۔ ''مگر بھگوان کی مرضی۔''

سیٹھ جی کو گوپی ناتھ سے عقیدت ہوگئی، نیچے اترنے میں کچھ اندیشہ ضرور تھا لیکن اوپر بھی تو جان بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ ادھر اُدھر چوکنی نظروں سے تاکتے ہوئے وہ اترے اب بھی پچاس ساٹھ آدمی کھڑے ہیں ہر ایک آنکھ میں اشتعال ہے۔ کچھ لوگ فحش کلامی بھی کر رہے ہیں، مگر کوئی ان سے بول نہیں سکتا۔ شہید کی تحریک میں یہ اثر ہے۔

سیٹھ جی کار پر بیٹھے اور گوپی ناتھ زمین پر گر پڑا۔ اور پھر نہ اٹھا۔

(۳)

سیٹھ جی کی کار جتنی تیزی سے اڑی جارہی تھی۔ اتنی ہی تیزی سے زمین پر گرتے ہوئے گوپی ناتھ کی تصویر بھی ان کی آنکھوں کے سامنے دوڑتی چلی آتی تھی، اگر گوپی ان کا دشمن تھا تو اس نے ان کی جان کیوں بچائی اور ایسی حالت میں جب وہ خود مر رہا تھا۔ اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ بے گناہ جیسے ہاتھ باندھے ہوئے ان کے روبرو کھڑا کہہ رہا تھا آپ نے مجھے بے گناہ کیوں مارا؟

نفس کے بندے بالعموم لطیف احساسات سے محروم ہوجاتے ہیں۔ لیکن سیٹھ جی کا ضمیر اتنا بے حس نہ ہوا تھا کہ ایک بے گناہ کا خون کر کے انھیں افسوس نہ ہوتا۔ وہ گھر پہنچے تو ان کے چہرہ پر دہشت چھائی ہوئی تھی مسند پر لیٹ گئے۔ اور ایک لمبی سانس کھینچ کر پرمیلا سے بولے ''بڑا غضب ہوگیا پرمیلا میں نے ایک بے گناہ کا خون کردیا، وہی گوپی جو مزدوروں کا سردار تھا معلوم نہیں کیوں مزدوروں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میں بدحواس ہوگیا اور گوپی پر ریوالور چھوڑ دیا۔ حالاں کہ اس غریب نے آخری دم تک مجھے بچانے کی کوشش کی اور اسی کے سمجھانے کا یہ اثر ہے کہ مزدوروں نے مجھے یہاں تک آنے دیا۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے وہ کوئی دیوتا تھا ضرور مرگیا ہوگا حالاں کہ زخم پاؤں میں تھا مگر وہ بچے گا نہیں میں کار میں بیٹھا ہوں تو میں نے اسے گرتے دیکھا تھا۔ میں نے اسے قتل کر دیا۔ مجھے سمجھانے آرہا تھا۔''

سیٹھ جی کا چہرہ سرخ ہو گیا، آنکھیں مشتعل ہوگئیں، زور زور سے سانس کھینچنے لگے، پیشانی پر عرق کے قطرے چھلک پڑے، بولے پنکھا کھول دو۔ پرمیلا گرمی لگ رہی ہے جسم پھنکا جاتاہے۔ اب مجھ سے نہیں رہا جاتا۔ میں جاکر پولیس میں اپنے جرم کا اقبال کروں گا میں نے گوپی کو بے گناہ مارا۔ بالکل بے گناہ۔

باہر شور ہو رہا تھا۔ گوپی کے مرتے ہی مزدوروں نے اس کا جلوس نکالا تھا اور سیٹھ جی کے دروازہ پر مظاہرہ کرنے آرہے تھے۔ سیٹھ جی نے شور سنا اور اٹھ کر کھڑکی سے جھانکا۔

پُرمیلا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ تمھارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ بھیتر آجاؤ مزدور تمھیں دیکھ لیں گے تو اور بھی طوفان مچائیں گے۔

سیٹھ جی نے ہاتھ چھڑا لیا اور بولے میں چھپنا نہیں چاہتا۔ میں نے ایک بے گناہ کو قتل کیا ہے اور مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے اس لیے جان بچاؤں کہ میں نے دولت جمع کی ہے اور عزت حاصل کی ہے۔ گوپی مجھ سے زیادہ دولتمند تھا۔ مجھ سے زیادہ معزز تھا میں نے اس کا خون کیا ہے۔ دیکھو پولیس مزدوروں کے پیچھے ہے۔ مسلح پولیس، مزدور میرے دروازہ پر آکر ماتم کریں گے۔ شاید میرے دفتر میں آگ لگا دیں، لوٹ مچادیں، پولیس ان پر گولی چلائے گی نہیں میں اپنی جان بچانے کے لیے بے شمار جانیں نہ لوں گا۔ مزدور میرے خون کے پیاسے ہیں مجھے پولیس کے ہاتھوں میں دیکھ کر ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا شاید تم سے پھر ملاقات نہ ہو مجھے معاف کرنا، تمھیں ایشور کوسونپا.....................

وہ زینہ کی طرف چلے پرمیلا ان کی طرف دوڑی مگر سیٹھ جی نکل گئے اور پرمیلا وہیں کھڑی روتی رہ گئی۔

(۴)

مجرم خود اپنے جرم کا اقبال کر رہا ہو تو وکیل اور بیرسٹر کیا کرے سارا شہر عدالت میں آتا تھا اور سیٹھ کا بیان سن کر دانتوں میں انگلی دیتا تھا۔ کچھ لوگ ان کی اخلاق جرأت کی تعریف کرتے تھے زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ انھیں خلل دماغ ہوگیا ہے صفائی کے بیرسٹر نے ہرچند کوشش کی سیٹھ جی سے یہ کہلائیں کہ انھوں نے اپنی محافظت میں ریوالور چلایا۔ لیکن سیٹھ جی نے یہ کسی طرح تسلیم نہ کیا۔ ایک ماہر نفسیات نے لکھا ہے زاہد اور گنہگار دونوں ہی دماغی توازن کے اختلال ہیں جب کوئی مشین بگڑ جاتی ہے تو وہ بالکل بند ہوجاتی ہے یا سوگنی رفتار سے چلنے لگتی ہے۔ سرسام کا مریض اس اختلال کی ایک مثال ہے یا تو وہ دیوار پھاند جائے گا یا حرکت بھی نہ کرسکے گا وغیرہ، عدالت کو اب سزا دینے کے سوا چارہ نہ رہا۔ اور سیٹھ جی کو حبس دوام کی سزا ملی۔

سیٹھ جی کے جاتے ہی تمول اور ثروت کی دیوی بھی روٹھ گئی مل تو پہلے ہی بند ہوچکا تھا لینا دینا چکانے کے بعد معلوم ہوا یہ شان و شکوہ محض طلسم تھا۔ ان طلسموں میں سے ایک جو بڑے بڑے مہاجن آئے دن باندھتے رہتے ہیں جس کی بدولت وہ ہوا میں محل کھڑے کر دیتے ہیں پانی پر نقش بنا دیتے ہیں ساری دنیا کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر تاریک کو روشن دکھا سکتے ہیں مگر خوب چند کا یہ طلسم ٹوٹا تو گھر بھی سلامت نہ بچا۔ پرمیلا کے پاس اب بھی ہزاروں کے زیور تھے۔ اس کے گذارہ کے لیے یہ اثاثہ بھی کافی تھا مگر شوہر کے نام کی لاج تو رکھنی ہی تھی کسی کو انگشت نمائی کا موقع کیوں ملے۔ اس نے زیور بھی بیچ ڈالے اور سب دینے چکا دیئے وہ حاملہ تھی۔جب پرماتما نے اس پر اتنا رحم کیا اور اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری کر دی تو وہ کیوں نہ خوش معاملہ بنے کیوں نہ سب کچھ پرماتما کے قدموں پر ہی نثار کر دے ساتویں مہینے جب روز سعید آیا تو پرمیلا ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں تھی مگر یہ نعمت پا کر وہ ساری مصیبتیں بھول گئی اب وہ سب کچھ خوشی سے جھیل لے گی۔ اس تنکے کے سہارے وہ اپنی کشتی کنارے پر پہنچا دے گی۔ جس نیک نیتی سے اس نے شوہر کے قرضے ادا کئے تھے۔ اس سے لوگوں کو اس کے ساتھ حسن اعتقاد ہو گیا تھا کچھ لوگ تو اسے ماہوار وثیقہ دینے پر بھی آمادہ تھے لیکن پرمیلا نے کسی کا احسان نہ لیا۔ شریف گھرانوں میں اس کی رسائی تھی ہی وہ ان گھروں میں سدیشی چیزیں مہیا کر کے اپنی گذر بسر کو کمالیا کرتی تھی۔ جب تک بچہ دودھ پیتا تھا اسے بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا لیکن دودھ چھڑا دینے کے بعد وہ آزاد ہوگئی بچہ کو دائی کی سپرد کر کے وہ معاش کی فکر میں نکل جاتی اور دن بھر کی دوا و دوش کے بعد جب وہ شام کو گھر آتی اور بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگتی تو اس کا دل مسرت سے پھول اٹھتا اور عالم خیال میں وہ اپنے شوہر کے پاس پہنچ جاتی اسے دولت کے لٹ جانے کا ذرہ بھر غم نہیں ہے۔ ایشور نے اس کی تلافی کردی ہے اب اس کی اتنی ہی آرزو ہے کہ سیٹھ جی زندہ و سلامت لوٹ آئیں اور بچے کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں پھر تو اس بے نوائی میں بھی شاکر رہے گی وہ روز ٹھاکر جی کے قدموں پر سر جھکا کر اپنے شوہر کے لیے دعا

مانگتی ہے۔ اسے یقین ہے کہ ایشور اس پر مہربان ہیں۔ عبودیت میں اسے صبر اور ہمت اور سکون کا القاسا ہوتا رہتا ہے دعا ہی اب اس کی امیدوں کا مرکز ہے۔

(۵)

ایام مصیبت امید کے سائے میں کٹ گئے۔ پورے چودہ سال، شام کا وقت ہے ہونہار کرشن چندر اپنی ماں کے پاس اداس بیٹھا ہوا ہے۔ وہ نہ ماں کو پڑھے نہ باپ کو۔

پرمیلا نے اس کی پیشانی پر پھیلے ہوئے بالوں کو سلجھا کر پوچھا۔ کیوں بیٹا تمھارا امتحان توختم ہوگیا۔

کرشن چندر نے مایوسانہ انداز سے کہا، ہاں اماں امتحان تو ہوگیا لیکن میرے پرچے اچھے نہیں ہوئے۔ میری طبعیت پڑھنے میں نہیں لگتی۔

اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ پرمیلا نے شفقت آمیز لہجہ میں کہا۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے بیٹا۔ مجھے یہ سن کر رنج ہوتا ہے۔

کرشن چندر نے قصور وار نظروں سے دیکھا۔ مجھے بار بار بابو.جی کی یاد آتی رہتی ہے۔ اماں وہ تو بہت بوڑھے ہوگئے ہوں گے، میں سوچا کرتا ہوں وہ آئیں گے تو دل و جان سے ان کی خدمت کروں گا۔ اتنی عظیم الشان قربانی کس کی ہوگی، اماں اس پر بھی کچھ لوگ انھیں بے رحم کہتے ہیں۔ میں کئی بار گوپی ناتھ کے گھر گیا ہوں اماں، ان کی بیوی ہے، ماں ہے، اور لڑکی ہے، جو مجھ سے دو سال بڑی ہے، ماں بیٹی اسی مل میں کام کرتی ہیں۔ دادی بہت بوڑھی ہوگئی ہیں۔

پرمیلا نے تعجب سے پوچھا۔ تجھے ان کے گھر کا پتہ کیسے لگا۔

کرشن چندر خوش ہو کر بولا۔ میں ایک دن مل میں گیا تھا۔ میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا تھا۔ جہاں مزدوروں نے بابو.جی کو گھیر لیا تھا۔ اور وہ جگہ بھی جہاں گوپی ناتھ گولی کھا کر گرا تھا۔ مگر ان جگہوں کا اب وہاں پر نشان تک نہیں ہے، عمارتیں بن گئی ہیں مل کا کام زوروں سے چل رہا ہے مجھے دیکھتے ہی بہت سے آدمیوں نے گھیر لیا۔ سب کہتے تھے تم بھیا.جی گوپی ناتھ کا روپ بھر کر آئے ہو لوگوں نے

وہاں شہید گوپی ناتھ کی تصویر لٹکا رکھی ہے میں اسے دیکھ کر حیرت میں آگیا جیسے میری تصویر ہو، ہو بہو میری، بس مونچھوں کا فرق ہے جب میں نے گوپی ناتھ کے گھروالوں کا حال پوچھا تو ایک آدمی دوڑ کر اس کی بیوی کو بلا لایا، وہ مجھے دیکھتے ہی رونے لگی اور نہ جانے کیوں مجھے بھی رونا آگیا عورتیں بڑی تکلیف اٹھا رہی ہیں اماں، مجھے تو ان پر ترس آتا ہے ہم ان کی کچھ مدد نہیں کر سکتے اماں۔

پرمیلا ڈری ان جھگڑوں میں پڑ کر لڑکا کہیں پڑھنا نہ چھوڑ بیٹھے۔ بولی''ابھی ہم ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں، بیٹا دولت ہوتی تو کہتی دس پانچ روپے دے دیا کرو۔ لیکن گھر کا حال تو تم جانتے ہی ہو، ابھی جی لگا کر پڑھو جب تمھارے بابوجی آجائیں تب شاید ہمارے اچھے دن آجائیں۔

اس وقت کرشن چندر خاموش ہو گیا۔ لیکن آج سے اس کا یہ معمول ہو گیا کہ اسکول سے لوٹ کر ایک بار گوپی ناتھ کے گھر ضرور جاتا۔ پرمیلا اسے جیب سے خرچ کے لیے جو پیسے دیتی ان سے ان بے کسوں کی مدد کرتا کبھی پھل لے لیے کبھی سبزی لے لی کبھی کچھ۔

ایک دن کرشن کو گھر آنے میں دیر ہوئی تو پرمیلا بہت گھبرائی، پوچھتی پاچھتی گوپی ناتھ کے گھر پہنچی تو دیکھا۔ ایک تنگ گلی میں ایک بوسیدہ میلے متعفن گھر کے اندر گوپی ناتھ کی بیوہ ایک ٹوٹی کھاٹ پر پڑی ہوئی ہے اور کرشن چندر کھڑا اسے پنکھا جھل رہا ہے۔ بولی، آج تم یہاں کب تک رہوگے بیٹا۔ دیا بتی کا وقت آگیا۔ چلو اب دیر نہ کرو۔

کرشن چندر کو اس کا آنا ناگوار ہوا۔ بولا میں تو ابھی نہ جاؤں گا۔ اماں دیکھو کاکی کتنی بیمار ہے، دادی کو کچھ سوجھتا نہیں بنی کھانا پکا رہی ہے ان کے پاس کون بیٹھے۔

''لیکن یہاں پھر بھی تین آدمی ہیں، میں تو اکیلی ہوں، اس وقت چلو، سویرے آجاتا''

مریضہ نے پرمیلا کی آواز سن کر آنکھیں کھول دیں اور نقیہ آواز میں بولی۔ آؤ ماتا جی! بیٹھو، میں تو بھیا سے کہہ رہی تھی۔ دیر ہو رہی ہے۔ اب گھر جاؤ مگر یہ

گئے ہی نہیں۔ مجھ ابھاگن پر نہ جانے کیوں اتنی دیا آتی ہے۔

مکان میں دم گھٹ رہا تھا۔ ہوا کا کہیں گذر نہیں۔ لیکن کرشن چندر ایسا خوش تھا گویا کوئی پردیسی چاروں طرف سے ٹھوکریں کھا کر اپنے گھر میں آگیا ہو۔

پرمیلا نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں تو ایک دیوار پر اسے ایک تصویر نظر آئی اس نے قریب جاکر تصویر دیکھی تو اس کا سینہ دھک سے ہو گیا بیٹے کی طرف دیکھ بولی تو نے یہ تصویر کب کھنچوائی تھی۔ کرشنا اور مجھے سے کہا بھی نہیں۔

کرشن مسکرا کر بولا۔ یہ میری تصویر نہیں ہے۔اماں گوپی ناتھ کی تصویر ہے۔

پرمیلا کو یقین نہ آیا۔ چل جھوٹا کہیں کا۔

مریضہ نے حسرت ناک لہجہ میں کہا۔ بھیا ٹھیک کہتے ہیں، ماتاجی، میرے آدمی ہی کی تصویر ہے۔ بھگوان کی لیلا کوئی نہیں جانتا۔ مگر بھیا کی صورت ان سے اتنی ملتی ہے کہ مجھے اشچرج ہوتا ہے۔ اور سبھاؤ بھی بالکل وہی ہے۔

پرمیلا پر ایک نامعلوم دہشت کا غلبہ ہوا جیسے اس نے کوئی برا خواب دیکھا ہو۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا، کرشن چندر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی دروازہ کی طرف چلی، گویا کوئی اسے اس کے ہاتھوں سے چھینے لیے جاتا ہو۔

مریضہ نے صرف اتنا کہا ماتا جی کبھی کبھی انھیں میرے پاس آنے دیا کرو، نہیں تو میں مرجاؤں گی۔

پندرہ سال کے بعد سیٹھ خوب چند اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔ ہرا بھرا درخت ٹھونٹھ ہو کر رہ گیا تھا۔ چہرہ پر جھریاں پڑی ہوئیں۔ سر کے بال سن، داڑھی جنگل کی طرح بڑھی ہوئی۔ دانت گویا کہیں کھوگئے، کمر کمان، ٹھونٹھ دیکھ کر کون پہچان سکتاہے یہ وہی تناور درخت ہے جس کی گھنی ٹہنیوں میں چڑیاں بسیرا کر لیتی تھیں۔

اسٹیشن کے باہر نکل کر وہ سوچنے لگے کہاں جائیں، اپنا نام لیتے شرم آتی تھی بے حیا ابھی زندہ ہے۔ عاقبت کے بوریئے بٹورنے کے لیے کس سے پوچھیں، پرمیلا جیتی ہے یا مرگئی ہے اگر ہے تو کہاں ہے۔ انھیں دیکھ کر خوش ہوگی یا منھ پھیرے گی۔

خوب چند کی کوٹھی ابھی تک خوب چند کی کوٹھی کہلاتی تھی۔ زبان خلق قانون

کے الٹ پھیر کیا جانے۔ اپنی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر انھوں نے ایک پان والے سے پوچھا! کیوں بھیا۔ یہی تو خوب چند سیٹھ کی کوٹھی ہے؟

پان والے نے ہمدردانہ انداز سے پان لگاتے ہوئے کہا۔ سیٹھ خوب چند کی جب تھی تب تھی۔ اب تولالہ دیسراج کی ہے۔

اچھا مجھے یہاں آئے بہت دن ہوگئے، سیٹھ جی کے یہاں نوکر تھا۔ سنا سیٹھ جی کو کالا پانی ہوگیا تھا۔

ہاں بے چارہ بھلی مانسی میں مارا گیا چاہتے تو بے داغ بچ جاتے مگر نصیب سارا گھر مٹی میں مل گیا۔

'سیٹھانی تو ابھی ہوں گی؟''

'ہاں سیٹھانی کیوں نہیں ہیں۔ سیٹھ جی کا ایک لڑکا بھی ہے۔''

سیٹھ جی کے چہرے پر جوانی ناچ اٹھی۔ زندگی کا وہ جوش اور ولولہ جو آج پندرہ سال سے کنبھ کرن کی طرح پڑا سو رہا تھا۔ گویا نئی زندگی پا کر اٹھ بیٹھا ہے اور اس وقت تو وہ استخوان میں سما نہیں رہا ہے۔

انھوں نے اس بے تکلفی سے پان والے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گویا پرانی دوستی ہے۔ اور بولے اچھا ان کے لڑکا بھی ہے کہاں رہتی ہیں سیٹھانی، ذرا بتا دو کہ سلام کر آؤں بہت دنوں ان کا نمک کھایا ہے۔

تنبولی نے پرمیلا کے مکان کا پتہ دیا۔ وہ اسی محلہ میں رہتی تھی۔ سیٹھ جی گویا آسمان میں اڑتے ہوئے یہاں سے چلے، پرمیلا کے گھر کی طرف۔

راستے میں ٹھاکر جی کا مندر نظر آیا سیٹھ جی نے مندر میں جاکر مورتی کے سامنے سر جھکا دیا ان کے لیے ایک ایک روئیں سے عقیدت اور استحسان کے نغمے سے نکل رہے تھے۔ اس طولانی کوفت اور یاس کے عالم میں ان کی مجروح اور مجبور آتما کو اگر کہیں عافیت ملتی تھی تو وہ یہی عبادت اور جبیں سائی تھی۔ دن بھر ایکھ کے کولھوں میں جتے رہنے یا پھاوڑے چلانے کے بعد جب وہ رات کو زمین کی آغوش میں سوتے تو ان کی روح کی گہرائیوں سے درد اور سوز میں ڈوبی ہوئی صدا نکلتی تھی۔ ایشور مجھ پر رحم کرو۔'' جب ان کے پاس ثروت تھی عیش کے سامان تھے جوانی

تھی صحت تھی اختیار تھا۔ انھیں عبادت کے لیے موقع نہ ملتا تھا۔ دل ماسوا ہی کی طرف لپکتا تھا اب محروم اور پامال ہو کر انھیں خدا کے سوا اور کہیں سایہ نہ ملتا تھا۔ پانی پر جب تک کائی کا پردہ ہے اس میں روشنی کا گزر کہاں؟

سیٹھ جی مندر سے نکلے ہی تھے کہ ایک عورت نے مندر میں قدم رکھا۔ خوب چند کا دل اچھل پڑا۔ خون کا ایک ایک قطرہ ناچ اٹھا۔ وہ ایک ازخود رفتگی کی حالت میں ایک ستون کی آڑ میں چھپ گئے معلوم ہوا دل کی مسرت آنکھوں سے باہر نکل پڑی ہے یہ پرمیلا تھی۔

ان پندرہ سالوں میں ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا۔ جب انھیں پرمیلا کی یاد نہ آئی ہو وہ حسن اور شباب کی تصویر ہمیشہ ان کی نظروں کے سامنے رہتی تھی، آج اس تصویر اور اس حقیقت میں کتنا فرق نظر آیا۔ تصویر زمانہ کے اثرات سے ماموں تھی۔ اس پر سکھ دکھ کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہی شرمیلی نگاہیں تھیں، وہی دل فریب تبسم اس حقیقت میں انھیں عالم کا جلال نظر آیا۔ اور ان کا دل وجد میں ڈوبے ہوئے ترنم کی طرح تھرتھرا اٹھا۔ ایک ولولہ سا اٹھا کہ اس کے قدموں پر گر پڑوں اور کہوں اس بدنصیب کو اپنے آنچل میں پناہ دو۔ مگر اس ہیبت کذائی میں اس کے روبرو جاتے انھیں شرم دامنگیر ہوئی۔

پرمیلا نے ٹھاکر جی کی پوجا کے تلسی جل لیا اور مندر کے باہر نکلی، خوب چند بھی اس کے پیچھے چلے کچھ دور آگے چل کر ایک کئی منزل کا چال ملا۔ پرمیلا چال میں داخل ہوئی، سیٹھ جی بھی اندر گھسے، مگر وہ تو ایک پوری بستی تھی۔ پرمیلا کدھر گئی کیا خبر، دفعتاً ایک نوعمر لڑکے کو اندر سے نکلتے دیکھ کر وہ پکار اٹھے۔ ذرا سنو تو بیٹا! تم سے کچھ پوچھنا ہے۔

لڑکا آہستہ آہستہ ان کی طرف آیا۔ ایک لمحہ غائر نظروں سے ان کی طرف دیکھا پھر چشم پر آب ہو کر ان کے قدموں سے لپٹ گیا۔ سیٹھ جی کا کلیجہ دھک سے ہوگیا یہ تو گوپی ہے۔ صرف عمر میں اس سے کچھ کم، وہی صورت، وہی قد و قامت، وہی خدوخال جیسے وہ عالم بالا سے اتر آیا ہو اور تازہ جوان ہو کر انھیں رعشہ سا آگیا ہیبت ان کے سامنے مجسم کھڑی تھی۔

کرشن چندر نے ایک لمحہ میں اٹھ کر کہا۔ ہم کئی دن سے آپ کا انتظار کر رہے تھے آیئے اندر آیئے میں آپ کو دیکھتے ہی پہچان گیا۔ کہیں بھی دیکھ کر پہچان جاتا۔

خوب چند اس کے ساتھ اندر چلے تو، مگر ان کا دل، جیسے خیالات کے بھنور میں پڑا ہوا تھا۔ گوپی کی صورت کیا کبھی ذہن سے اتر سکتی تھی اس چہرے کو انھوں نے کتنی ہی بار خواب میں دیکھا تھا۔ وہ سانحہ ان کی زندگی کا سب سے یادگار وقوعہ تھا۔ گوپی کی صورت اس وقت بھی ان کی نگاہوں کے سامنے کھڑی تھی۔

کرشن چندر زینے کے پاس رک کر بولا، جاکر اماں سے کہہ آؤں، آپ کے نئے نئے کپڑے بنے رکھے ہیں۔

خوب چند نے لڑکے کو گود میں لے کر اس طرح اس کا بوسہ لیا جیسے وہ بچہ ہو اور اسے گود میں لیے ہوئے زینے پر چڑھے اور بے تکان چڑھتے چلے گئے۔

(٦)

آج سیٹھ جی کو آئے ساتواں دن ہے۔ صبح کا وقت ہے سیٹھ جی سندھیا کرنے جارہے ہیں کہ گوپی ناتھ کی بنی نے آکر پرمیلا سے کہا۔ ماتاجی اماں کا جی اچھا نہیں ہے بھیا کو بلا رہی ہیں۔

پرمیلا نے کہا آج وہ نہ آسکے گا۔ اس کے پتا جی آگئے ہیں ان سے باتیں کر رہاہے۔

کرشن چندر نے کمرہ سے اس کی باتیں سن لیں، فوراً برآمدہ میں آکر بولا نہیں اماں میں دادا سے پوچھ کر ذرا دیر کے لیے چلا جاؤں گا۔

پرمیلا نے خفا ہو کر کہا۔ تو وہاں جاتاہے۔ تو تجھے گھر کی سدھ نہیں رہتی، نہ جانے ان سبھوں نے تجھے کیا بوٹی سنگھا دی ہے۔

''میں بہت جلد چلا آؤں گا۔ اماں تمھارے پیروں پڑتاہوں''

''تو بھی عجیب لڑکا ہے۔ وہ بے چارے اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں اور تجھے وہاں جانے کی پڑی ہے سیٹھ جی نے یہ باتیں سنیں باہر آکر بولے کیا ہرج ہے جلدی

آنے کو کہہ رہے ہیں تو جانے دو۔

کرشن چندر خوش ہو کر نبی کے ساتھ چلاگیا۔ پرمیلا بولی جب سے میں نے گوپی کی تصویر دیکھی ہے، مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ بھگوان نہ جانے کیا کرنے والے ہیں بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسی کی تصویر ہے سیٹھ جی نے بھی تشویش ظاہر کی، میں تو پہلی بار اسے دیکھ کر چونک گیا تھا معلوم ہوا گوپی ناتھ ہی کھڑا ہے۔

گوپی ناتھ کی گھر والی کہتی ہے، اس کی چال ڈھال بھی گوپی جیسی ہے۔

''بھگوان کی لیلا ہے کہ جس کی میں نے جان لی وہ میرے بیٹے کے روپ میں جنم لے۔

دو گھنٹے گزر گئے اور کرشن چندر گھر نہیں آیا۔ ماں بے تاب ہونے لگی، سیٹھ جی کو بھی تشویش ہوئی کیا کرنے لگا۔ اس کی عادت ہے گوپی کے گھر جاتا ہے تو اسے کھانے پینے کی سدھ نہیں رہتی۔

دوپہر ہوئی شہر میں خبریں باہر آنے لگیں کہ مل میں ہڑتال ہوگئی پولیس لاریوں میں دوڑی جا رہی ہے، پرمیلا دہشت سے لرزنے لگی۔ بار بار کھڑکی سے دیکھتی۔ ابھی تک نہیں آیا کہیں ہڑتالیوں کے ساتھ نہ مل گیا ہو۔

اچھا یہ مجمع کیسا چلا آرہا ہے۔ اسی طرف آتا ہے کوئی ایک ہزار آدمی ہوں گے کوئی ارتھی معلوم ہوتی ہے ارتھی ہے سیٹھ جی بھی جھانکنے لگے ضرور کوئی بڑا رئیس مر گیا ہے۔ وہ جلوس پرمیلا کے مکان کے نیچے رک گیا اور آواز آئی شہید کرشن زندہ باد''

پرمیلا کا خون جیسے خشک ہوگیا۔ وہ مدہوشی کے عالم میں زینے کی طرف دوڑی اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

سیٹھ جی نے بھی یہ نعرہ سنا۔ مگر ان کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ زاہدانہ توکل، صبر اور سکون کے ساتھ نیچے آئے۔ لاش کو گلے سے لگا کر اس کا بوسہ لیا دریافت حال کیا معلوم ہوا مل میں آج ہڑتال تھی منیجر نے حاضری کے متعلق کچھ نئے قاعدے نافذ کئے تھے، مزدوروں نے اسے منظور نہ کیا مل میں ہڑتال ہوئی۔ کرشن چندر کو مزدوروں نے اپنا سرغنہ بنا لیا اس کی کم عمری کے باوجود مزدوروں کو اس پر کامل اعتماد تھا۔ ان کو یقین تھا کہ یہ گوپی کا اوتار ہے گوپی کی بیوی نے اسی

معاملہ میں مشورہ کرنے کے لیے آج کرشنا کو بلایا تھا۔ کرشنا مزدوروں کا نمائندہ بن کر کئی آدمیوں کے ساتھ پولیس کی مزاحمت کے باوجود منیجر سے ملنے جا رہا تھا۔ ہنگامہ ہوگیا پولیس نے گولیاں چلائیں اور کرشن چندر ان کی بندوقوں کا نشانہ بن گیا۔

سیٹھ جی اسی اطمینان کے ساتھ اوپر گئے اور پرمیلا کو سنبھال کر نیچے لائے۔ پرمیلا بیٹے کی لاش سے لپٹ گئی۔ اور بیان کر کے رونے لگی۔ کوئی ایسی آنکھ نہ تھی جس سے آنسو نہ نکل رہے ہوں۔

کئی منٹ گذر گئے۔ پرمیلا لاش کو سینے سے لگائے روتی رہی جس نعمت کو پاکر اس نے مصیبت کو راحت سمجھا تھا، اس سے آج وہ محروم ہوگئی۔ یاس کی تاریکی میں جس شمع سے امید اور صبر کی روشنی پا رہی تھی وہ شمع بجھ گئی۔

سیٹھ جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ کیا کرتی ہو پرمیلا جس کی موت پر ایشور کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ اس کی موت پر روتی ہو۔ ظلم کے سامنے سینہ سپر ہوجانے سے بہتر موت کس کو نصیب ہوتی ہے۔

پرمیلا نے وحشت زدہ آنکھوں سے شوہر کو دیکھا اور بولی تم سمجھتے ہوگے کہ ایشور جو کچھ کرتا ہے ہماری بھلائی کے لیے کرتا ہے میں ایسا نہیں سمجھتی۔ کیوں سمجھوں ہائے میرا لال، میرا راجہ، میرا سورج، میرا چاند، میری زندگی کے سہارے تجھے کھو کر کیسے صبر کروں، جسے گود میں دیکھ کر شانت ہوگئی تھی اسے زمین پر پڑا دیکھ کر دل کو کیسے سنبھالوں۔

اسی رات کو وہ غم نصیب ماں دنیا سے رخصت ہوگئی۔ چڑیا اپنے بچے کی تلاش میں پنجرے سے نکل گئی اور سیٹھ خوب چند آج بھی مزدوروں کے محال میں ان کی خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں۔

یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ ہنس کے اکتوبر نومبر 1932 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مانسرور نمبر 2 میں شامل ہے۔ اردو میں یہ زاد راہ میں شامل ہے۔

پریم چند کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں مدن گوپال کی اہمیت مسلم ہے پریم چند کے خطوط کے حوالے سے بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی پہلی کتاب انگریزی میں بہ عنوان "پریم چند" 1944 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کی وجہ سے غیر ممالک میں بھی پریم چند کے بارے میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ "ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ لندن" نے لکھا ہے کہ مدن گوپال وہ شخصیت ہے جس نے مغربی دنیا کو پریم چند سے روشناس کرایا۔ اردو، ہندی ادیبوں کو غیر اردو ہندی حلقے سے متعارف کرانے میں مدن گوپال نے تقریباً نصف صدی صرف کی ہے۔

مدن گوپال کی پیدائش اگست 1919میں (ہانسی) ہریانہ میں ہوئی۔ 1938میں سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ انگریزی، اردو اور ہندی میں تقریباً 60 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پریم چند پر اکسپرٹ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ویسے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے ماہر ہیں۔ مختلف اخبارات، سول ملیٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین اور جن ستہ میں بھی کام کیا۔ بعدازاں حکومتِ ہند کے پبلکیشن ڈویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے 1977 میں ریٹائر ہوئے اس کے علاوہ دینک ٹریبون چندی گڈھ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے 1982میں سبکدوش ہوئے۔